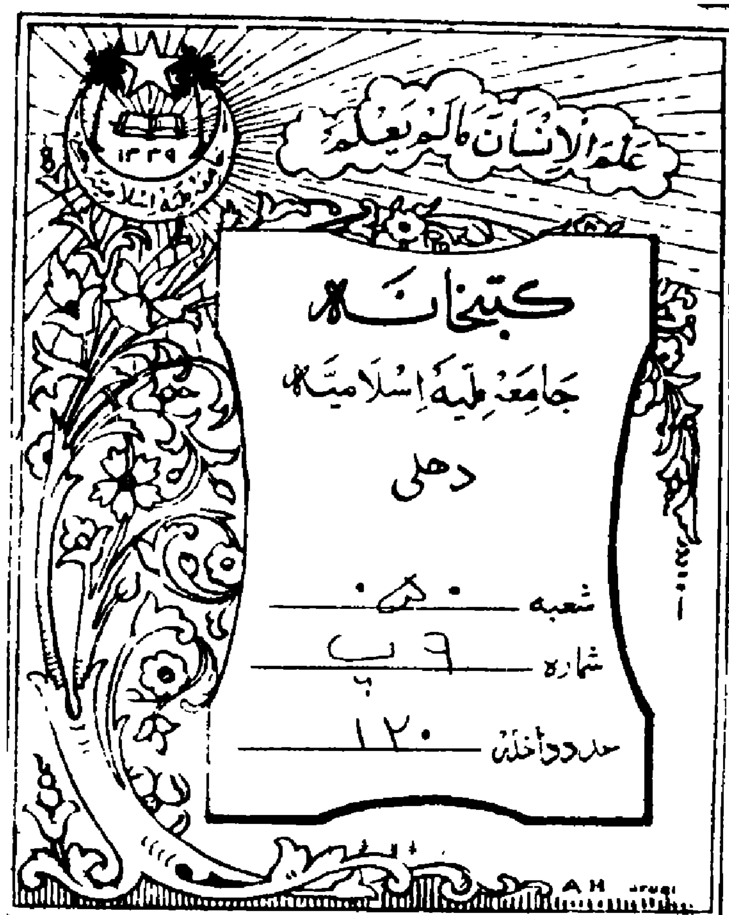


اُمید کا پیام ۔ "اُٹھو ۔ اُٹھو ۔ اور آگے بڑھو!"

امید پیام

نمبر ۷	ایٹہ ۔ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء	جلد ۲

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے اسمیں جنس کی قید نہیں

عرضِ حال

ہمارا ارادہ تھا کہ ہمارا نومبر نمبر ممالک متحدہ کی مستقل اشاعت کا قطعی فیصلہ کرا کے ہندوستان کے اور صوبوں میں نمونہ کے طور پر گشت کرایا جاے۔ مگر بعض وجوہ سے ہم اس ارادہ کی تکمیل سے قاصر رہے۔ اور آجتک ہمیں یہ ارادہ ملتوی ہی رکھنا پڑا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہمارا مارچ نمبر اس وعدہ کو پورا کرے۔ جو معروضات ہمنے اپنے ناظرین سے مخاطب ہوکر دسمبر نمبر کے ذریعہ سے پیش کئے تھے وہ انکی نظر سے نہیں گذر سکے۔ لہذا ہم دسمبر نمبر کے صفحات میں سے وہ حصہ ذیل میں نقل کر کے پیش کرتے ہیں۔

معزز ناظرین سے جنکی خدمت میں ہمارا ماہنامہ پہلے پہل حاضر ہو رہا ہے۔
گذارش ہے کہ ممالک متحدہ کی طرح یہاں بھی ہم دو نمبر بطور نمونہ پیش کرینگے
اور آپکی قدردانی اور جوہر شناسی سے ہمیں قوی امید ہے کہ وہ پرچے ملاحظہ
فرماکے ہمیں اجازت دینگے کہ آپ کے اسمار گرامی بھی جملہ خریداران رسالہ میں
درج کرلئے جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ رسالے کے اغراض و مقاصد جو ہمارے اس نمبر
کے سرورق کے سب سے دو آخری صفحات پر ترمیم شدہ صورت میں شائع
ہوئے ہیں آپ ضرور بغور ملاحظہ فرمائیں گے۔

ایک گمنام ویرانے میں ایک گمنام وجود گمنامی کے پردہ میں چھپا ہوا پڑا
تھا۔ اُسکا کالبدِ خاکی اس کے دل پر ایک اور حجاب اضافہ کرکے اس کے لئے
حجاب اکبر بنا ہوا تھا۔ یہ بےچین دل ایک مدت سے لذت گیر درد ہو رہا تھا۔ درد
ہی اس کا مونس اور درد ہی اس کا دمساز تھا۔ دل اور درد ہی ایک دوسرے
کے رفیق و ہمدم مونس اور ہمقدم تھے۔ دل کبھی کبھی اُکتاکر اُٹھتا تھا کہ ؎

سینہ پہ کوئی زخم کاری ہو	چشمۂ خون جس سے جاری ہو
سبکو دکھلائے سب کو سمجھائے	جو کوئی پوچھے اُس سے بتلائے
دردِ پنہاں کو کوئی کیا بتلائے	کیا کہے کوئی کس طرح سمجھائے
پائے وحشی کے آبلوں کی جلن	سب پہ ظاہر ہے سب پہ روشن
چھالے تو سب کے دیکھے بھالے ہیں	پر یہاں ڈھنگ ہی نرالے ہیں
ہو کوئی آبلہ تو دکھلاؤں	کیا کہوں کیسے کیا میں بتلاؤں
کھینچوں کس طرح درد کی تصویر	حال دل کی سناؤں کیا تفسیر

بیقراری کی شکل ہو تو بتاؤں — پیکرِ اضطرار کیا دکھلاؤں
دردِ دل جیتا جاگتا پاؤں — تب تو البتہ تم کو سمجھاؤں
پر کروں کیا کہ یہ نہیں ممکن — ہوا ایسا بھی ہے کہیں ممکن

اگر اس دردِ بے چین دل کی تصویر کسی طرح کچھ بھی تھوڑی بہت الفاظ میں کھینچ سکتی ہے۔ تو شاید یہ شعر کسی حد تک کارآمد ثابت ہو سکے۔

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو سک جاتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

آخر کار مریض مرض سے مغلوب ہوا۔ درد نے دل پھاڑ کر نکل آنے کی دھمکی دی۔ دل نے تار پود ہستی کو چاک ہونے سے بچا کر گمنامی کا پردہ پاش پاش کر ڈالا۔ اور ایک دن اس گمنام ویرانہ سے ایک جگر خراش آہ اُٹھی۔ ایک دل ہلا دینے والا نامہ نکلا۔ صبا ایک مدت سے اسی دن کی منتظر کھڑی تھی اُس نے پاتے ہی اُسے اپنے کاندھوں پر بٹھالیا۔ اور بوئے گل بنا کر اُسے لے اُڑی۔ آج یہ درد سے لبریز صدا دفتر "پیام امید" سے اُٹھکر نسیم مست خرام سے دوش بدوش ہوتی ہوئی ملک کے مختلف حصوں کو جا رہی ہے۔ گویا ہمارا نامہ "امید" صبا کے کبوتر کے گلے میں بندھ کر منزل مقصود کی سمت جا رہا ہے۔ ہماری امیدیں دست بدعا ہیں۔ کہ

لئے جاتا ہے نامۂ "اُمید"
بال بیکا نہ ہو کبوتر کا

اسکے بعد ہیں اپنے معزز نئے ناظرین کی اطلاع کے لئے کہ اسوقت تک

رسالہ کس حد تک مقبول عام ہو چکا ہے اپنے گذشتہ نمبر سے کچھ حصہ نقل کر کے پیش کرنا ہے۔ البتہ ہمارے لئے یہ بات تو بیشک دشوار ہے کہ گذشتہ چھ اشاعتوں کے ذریعہ سے جن بلند پایہ اور قابل احترام برادران و خواہران وطن کی بیش بہا خیالات رسالہ کے متعلق شایع ہو چکے ہیں انکی نقلیں از سر نو پیش کر سکیں۔ اسوقت ہم صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اُن معززین کے اسمار گرامی بتا دیں جو ایسے خیالات ظاہر فرما چکے ہیں۔ ہم ایسے معزز ناموں کی صرف ایک مختصر سی فہرست دینگے تاکہ بڑے سے بڑے ناموں میں سے بعض بعض آپکے پیش نظر ہو سکیں۔

عالیجناب آر۔ پی۔ ڈیوہرسٹ صاحب بہادر۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ایم۔ آر۔ جی۔ ایس۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ڈسٹرکٹ و سشن جج گونڈہ۔ یو۔ پی

بیگم صاحبہ عالیجناب آنریبل جسٹس شاہ دین صاحب جج ہائی کورٹ پنجاب

جناب مولوی حبیب الدین صاحب۔ اکاونٹنٹ جنرل حیدرآباد دکن۔

جناب مولانا عبدالرحیم صاحب۔ صیغہ امور مذہبی دکن۔

جناب مولوی سید خورشید علی صاحب پرسنل اسسٹنٹ معین المہام صاحب فینانس دکن۔

جناب مولانا کیفی صاحب حیدرآبادی۔

مسس شاہ نواز صاحب بنت آنریبل میاں محمد شفیع صاحب و اہلیہ مسٹر شاہ نواز صاحب بیرسٹر پنجاب۔

مس ہمایوں مرزا صاحب - بیرسٹر ایٹ لاء کن۔

مس رضا اللہ صاحب - انجنیر - بھاولپور۔

سعیدہ بیگم صاحبہ اہلیہ مولوی احسان الحق صاحب بیرسٹر سکرٹری لیڈیز کلب لاہور۔

بیگم صفدر علی صاحب انجنیر اورئی جالون۔

جناب سید رضا علی صاحب - ایم - اے - ایم - آر - اے - ایس - سب ڈپٹی اوپیم ایجنٹ - یو - پی

بیگم صاحبہ جناب نواب سید امجد علیخانصاحب - خاقان منزل لکھنو۔

بیگم صاحبہ جناب مرزا واحد علی بیگ صاحب دہلوی سول جج ریاست اودے پور۔

جناب پروفیسر فیروزالدین مراد صاحب علیگڈھ کالج -

جناب چودھری خوشی محمد صاحب گورنر کشمیر۔

جناب محمد احسن اللہ صاحب ثاقب پروفیسر عربی و فارسی - وکٹوریہ کالج گوالیار۔

جناب مسٹر ایشور سرن صاحب - بی - اے - ایل - ایل - بی - وکیل ہائی کورٹ الہ آباد۔

خوف طوالت ہمیں اختصار پر مجبور کر رہا ہے - اب ہم ایک اور ایسی ہی مختصر فہرست خریداران رسالہ کی آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں - اور بڑے سے بڑے ناموں کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کرکے دکھائے ہیں

کہ آج آپ جس معزز طبقہ میں داخل ہو رہے ہیں اسمیں آپ سے پہلے کیسے کیسے بزرگ داخل ہو چکے ہیں۔

عالیجناب آر۔ پی۔ ڈیو ہرسٹ صاحب بہادر۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ایم۔ آر۔ جی۔ ایس۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ڈسٹرکٹ وسشن جج گونڈہ۔ یو۔ پی

بیگم صاحبہ عالیجناب آنریبل جسٹس شاہ دین صاحب جج ہائیکورٹ پنجاب

عالیجناب آنریبل مہاراجہ سر بھگوتی پرشاد سنگہ صاحب بہادر۔ سی۔ آئی۔ ای۔ والی ریاست بلرام پور۔ اودھ۔

عالیجناب رائے سادھارمن بہادر۔ ایم۔ اے۔ کلکٹر ومجسٹریٹ ضلع مین پوری۔ یو۔ پی

عالیجناب آنریبل خان بہادر مولوی سید محمد ہادی صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر پرتاب گڈھ۔

عالیجناب مولوی محمد اعجاز رسول صاحب تعلقہ دار جہانگیر آباد۔ بارہ بنکی اودھ

عالیجناب مولوی محمد امتیاز رسول صاحب۔ " "

عالیجناب چودھری محمد نصرت علی صاحب۔ تعلقہ دار سندیلہ۔ ہردوئی۔

عالیجناب خان بہادر مولوی محمد انعام علیصاحب۔ بی۔ اے۔ ڈسٹرکٹ وسشن جج حصار۔ پنجاب۔

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب۔ رئیس۔ دہلی۔

بیگم صاحبہ جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب۔ انصاری۔ کوٹھی۔ بہشت دہلی

عالی جناب نواب عبدالمجید صاحب - سی - آئی - ای - بیرسٹرایٹ لا الہ آباد

عالیجناب آنریبل خان بہادر خواجہ محمد شریف شاہ صاحب ممبر کونسل لاہور

عالی جناب نواب فتح علی خانصاحب قزلباش - سی - آئی - ای - رئیس لاہور

ہمیں اس بات کا حد سے زیادہ افسوس ہے کہ ہم اپنے معزز نئے ناظرین کی خدمت میں اپنی گزشتہ اشاعت کا پرچہ پیش نہ کر سکے - کیونکہ جو مضمون اس اشاعت میں "حافظ شیرازی اور ڈاکٹر اقبال" کے عنوان سے شایع ہو رہا ہے خاصکر اس قابل ہے کہ پڑھا جائے - نمونہ کے طور پر ہم اس مضمون کا ایک مختصر حصہ اس اشاعت میں "آٹھویں جام" کے عنوان کی تحت میں نقل کر کے ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی اندازہ فرماسکیں کہ صوفی صاحب کا حاشیہ کس پایہ کا تھا - حافظ شیرازی کے اشعار کے مطالب جیسے کچھ ہمارے مضمون نگار صوفی عبداللہ صاحب نے بیان کئے ہیں انکی قدر پبلک نے ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ کی - اور وہ پرچے اتنی جلد ہمارے ہاتھ سے نکل گئے کہ خود ہمیں حیرت ہو گئی - تقاضوں پر تقاضے ہو رہے ہیں جن سے مجبور ہو کر ہمیں اعلان کرنا پڑتا ہے کہ ہم پورا مضمون ایک جداگانہ مختصر رسالہ کی صورت میں ہدیہ ناظرین کرنے کے لئے ہم طیار ہیں اس مضمون کی قیمت فی جلد ۴ر ہوگی - شائقین کرام فوراً درخواستیں بھیجدیں - پورے مضمون کا حجم ۴۰ صفحے سے کم نہوگا - غالباً زیادہ ہی ہوگا - صوفی عبداللہ صاحب کے مطالب کے متعلق عام رائے ہے کہ یہ رموز طریقت پہلے مرتبہ افشار کئے گئے ہیں - اور پہلے مرتبہ اس علم سینہ نے سفینہ کی صورت دیکھی

ہے۔ حافظ کے خم خانے کے جرعہ نوش مزے لے لیکر اس جام سرشار کی حلاوت کی داد دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حصہ اہل دل صوفیوں ہی کا ہے۔ اور جنکا حصہ ہے وہی اس حصہ کے متلاشی بھی ہیں۔ اور تو ہم نہیں جانتے مگر اتنا ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ صوفی عبداللہ صاحب نے حافظ کے دیوان کے ساتھ جو احسان کیا ہے کچھ اونھیں کا دل جانتا ہوگا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہونا ممکن ہے کہ دیوان شریف کھولئے اور رموز حقیقت کے حجابات سے کرتے کرتے آخر میں جناب سرور کائنات صلعم کی زیارت سے مشرف ہو جائے۔ اور ایسی صاف دوبدو زیارت کہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔ پھر کیا یہ کوئی بات ہی نہیں ہے!

ہماری نعتیہ نظمیں اور میلاد شریف



بیسویں صدی کی نئی طرز معاشرت نے ہماری کاہلی اور افلاس سے سازش کر کے فارسی تعلیم اور فارسیت کا تو قلع قمع کر ڈالا۔ مگر ہماری فارسی تعلیم ہماری قوم پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئی جسکے مٹنے کے آثار میں سے ابتک ایک بھی نظر نہیں آتا۔ فارسی تعلیم کے بہت کچھ اوصاف بھی تھے اور عیوب بھی۔ مگر جب کوئی قوم زوال کی حالت میں ہوتی ہے تو کاہلی کا متعدی مرض اُسمیں اور بہت سے چھوٹے بڑے اخلاقی عوارض پیدا کر دیتا ہے تن آسانی اُسے سہل الحصول باتوں کی طرف راغب کر لیتی ہے اور ایک غیر

محسوس مگر سریع رفتار کے ساتھ اسکے جسم کے اندر جو مختلف عوارض داخل ہوچکے تھے ترقی پکڑتے جاتے ہیں۔ اور آخر کار چونکہ برائی کا فطرتی میلان برائی ہی کی جانب ہوا کرتا ہے وہ ہر ایسی بات کے اختیار کرنے میں جسمیں عیب اور خوبیاں دونوں شامل ہوں برائی ہی اختیار کرتی ہے۔ خوبیوں کی طرف کبھی راغب نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم میں فارسی تعلیم کے سارے نقائص اور عیوب تو صاف نمایاں اور واضح طور پر عیاں اور عام ہورہے ہیں مگر اسکے اوصاف اور خوبیاں اگر ہوں بھی تو پنہاں اور کمیاب ہیں۔

مثلاً فارسی تعلیم کا حسن یہ ہے کہ انسان میں فراخ دلی۔ خلوص۔ صفائی قلب خدا شناسی سخاوت اور رحم دلی پیدا کرے۔ فارسی تعلیم کا عیب یہ ہے کہ کسب معلومات یا معلومات پر اضافہ کرنے کا شوق کبھی نہ پیدا ہو شوق تحصیل علم ہو۔ مگر علم کی پیاس سطح تک پہونچتے ہی پہونچتے بجھ جائے۔ تہ میں غوطہ لگانے کا کبھی خیال بھی پیدا نہ ہو۔ بعید از عقل اور خارج از امکان مبالغوں سے دلچسپی پیدا ہو تم فارسی علم ادب کے کسی مستند ادیب کی کوئی کتاب نظم ہو یا نثر کھولو۔ اور ان نکات کو ذہن نشین کرکے غور سے اُسے مطالعہ کرو۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ تم جتنا ہی غور کرکے پڑھوگے اُتنی ہی صداقت ان سادہ فقرات کی تمھارے دلپر نقش ہوتی جائیگی۔

آجکے مضمون میں ہمیں ان عیوب میں سے صرف ایک عیب یعنی اُسی بعید از عقل اور خارج از امکان مبالغہ سے بحث ہے جسکی مشہور مثال

زمیں سست شد و آسماں گشت ہشت" ہے۔

فارسی تعلیم جہاں ہمارے علم ادب میں۔ خیالی معشوق۔ اسکے فراق کا افسانہ۔ اسکی کج ادائیوں کا رونا۔ اُسکا رقیبوں سے التفات اور ہم پر عتاب۔ اُسکی بیوفائیاں اور اُسکے مظالم کی داستان اپنے ساتھ لائی۔ فارسی تعلیم جہاں دنیا کی بے ثباتی اور ہماری فانی ہستی کے چند روزہ قیام کا سبق دیکر ہمیں کاہل بناکے الگ ہوگئی۔ جہاں اُس نے دنیا دار وں کو اہل اللہ بنانیکی کوشش کی مگر بجائے اسکے وہ انھیں قوم کے وجود کا ایک عضو معطل بناکے رخصت ہوگئی۔ جہاں اُس نے صرف اتنا ہی سبق سکھا دیا کہ خیرات کو ایک کار آمد مشین بناکے قومی ترقی کا آلہ بنادو۔ کیونکہ سطح کے نیچے پہونچنے کی کرو۔ مگر یہ نہ بتایا کہ کیونکر خیرات کرو اور کیونکر خیرات کی اُسے دسترس نہ تھی ...... وہاں اس نے ہمارے لئے اپنا بیکار لغو اور بے مصرف مبالغہ بھی چھوڑ دیا جس نے ہماری رفتار تنزل کو بھی تیز کر دیا

اس سے پہلے کہ ہم نفس مضمون پر کچھ عرض کریں ہمیں یہ امر ظاہر کر دینا لازمی اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم "پیام امید" کو مذہبی رنگ میں رنگنا نہیں چاہتے۔ ہم اس ضرورت کو اچھی طرح تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری موجودہ زندگی کے ضروریات کے لحاظ سے ایک زبردست مگر بالکل بے تعصب مذہبی رسالہ کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ ایسا رسالہ جو مذہب کے صحیح احکام۔ صحیح ارشادات اور صحیح روایات پر روشنی ڈال سکے۔ جو یہ دکھا سکے کہ اسلام دنیا میں صلح اور امن کا پیام لیکے آیا تھا۔ وہ اسلئے آیا تھا کہ غیروں کو اپنا اور دشمنوں کو دوست بنائے نہ اسلئے کہ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلائے۔ ہم ایسا رسالہ نہیں چاہتے

جو ہندو مسلمان اور شیعہ سنی کے قضیے پیدا کرے اور ناخن سے گوشت کو جدا کرنا چاہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ نہ ہم میں ایسی اہم ذمہ داری اپنے سر لینے کی کافی قابلیت ہے اور نہ ہمیں اتنی فرصت ہے۔ قوم میں بہت سے افراد ایسے موجود ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ انھیں کا کام ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

فارسی تعلیم میں ایک اور بڑا نقص یہ تھا کہ اوس نے دنیاوی اور دینی تعلیم کے بین فرق کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور کوئی کتاب ایسی ہمارے سامنے پیش نہ کرسکی جو خالص دنیادار کے لفظ نظر لکھی گئی ہوتی۔ جسکا اخلاقی پایہ گو نہایت ہی اعلیٰ و افضل ہوتا مگر با وجود اسکے اسمیں دینیات سے بالکل بحث نہ کی گئی ہوتی۔ تاکہ ہم دینیات سیکھنے کے وقت دینیات پر وقت صرف کرتے اور دنیوی علوم کو دنیوی علوم کی طرح حاصل کرنا سیکھتے مثلاً کسی اخلاقی کتاب میں اس بات کے تذکرہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے تاوقتیکہ ہم زبردستی اسمیں دینیات نہ ٹھونس دیں کہ۔ ہم اس بے ثبات دنیا۔ اس دار ناپائدار میں محض چند روزہ طور پر آئے ہیں یہاں کی باتیں سب خواب و خیال ہیں۔ کسی عقلمند کو اسمیں نہ الجھنا چاہئے۔ اگر فارسی ادیب بغیر فلسفہ کے نوالہ ہی نہیں توڑ سکتے تھے تو وہ کم سے کم ہمیں دو ایک تو ایسی کتابیں دیجاتے جیسی سلف ہلپ یا سلف کلچر ہیں۔ یا جیسا لٹریچر اڈیسن کا پکٹیٹر ہمارے لئے چھوڑ گیا ہے۔ دنیاوی تعلیم میں مذہب کی آمیزش کرکے فارسی ادیب جو شتر گربہ ہمارے

لئے چھوڑ گئے ہیں وہ ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ سوا اسکے کہ ہمارے تنزل کی رفتار میں اور ترقی دے۔

فارسی تعلیم ہماری اردو پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئی ہے۔ اور ترقی کے راستوں پر جس سمت سے ہو کر ہم جانا چاہتے ہیں وہاں ان بدنما نقشوں کے خس و خاشاک ہماری راہ میں حائل ہوتے ہیں اور ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ اگر ہم آگے بڑھتے ہیں تو یہ خس و خاشاک ہمارے دامن میں الجھ کر ہمارے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں اور کسی طرح ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

مگر آج ہم صرف اس فارسی مبالغہ کے مذہبی پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اسلئے ہمیں جلد اپنے نقش مطلب پر پہونچ جانا چاہئے۔ فارسی تعلیم نے ہمیں حمد و نعت کا عادی بنا دیا ہے۔ اسوجہ سے کہ کوئی فارسی کتاب جو ہمارے درس میں آئی ہے اس سے خالی نہیں ملی۔ حمد سے ہمیں اسوقت بحث نہیں ہے۔ مگر یہ نعت کیسی ہوتی تھی؟ نعت لکھنے والے کا کیا مقصد ہوا کرتا تھا؟ وہ کیوں لکھی جاتی تھی؟ اس کے لکھے جانے سے کیا مقصد ہوتا تھا؟ اسکا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ نعت کیا تھی؟ جناب سرورِ کائنات کی تعریف۔ کس بات کی تعریف؟ کسی بات کی نہیں محض بیکار لفاظی۔ نہ زمین کی نہ آسمان کی۔ نہ اس سے کوئی مقصد نتیجہ نکل سکتا تھا نہ کوئی کارآمد بات پیدا ہوتی تھی۔ بس بڑی تعریف ہی تعریف تھی۔ اس سے کیا فائدہ لکھنے والا ہی اسے سمجھے ہم تو خاک بھی نہ سمجھے۔ ہمنے فارسی شعرا کی اپنی زبان میں تقلید کر کے اس نعت کیساتھ

اور بھی ناقابل معافی بدعت کی۔ اگر فارسی شعراء نے اتنا ہی کہا تھا کہ آپ ہی کا وجود باجود ہیجدہ ہزار عالم کی تخلیق کا باعث ہوا تو ہمنے اتنے ہی پر بس نہیں کیا۔ ہمنے اس سے بہت دور تک ترقی کی۔ کیا ترقی کی ہم ہمنے آپ کے خط و خال کی تعریف میں غزلیں قصائد سراپا لکھنا شروع کرکے وہ ہر بونگ مچا دیا کہ الامان والحفیظ! ہم نے اسپر بھی بس نہیں کیا۔ ہم عاشق جمال پاک بنگئے اور ہجر و فراق کی داستان میں اشکباری بھی شروع کر دی۔ ہوتے ہوتے یہ نوبت پہونچگئی کہ ہر گلی کوچے میں پھرنے والا یوتھ گو نہ صرف نعت گو بھی بنگیا بلکہ عاشق رسول اللہ بنکر آپ کے حضور اقدس میں ایسی ایسی ناقابل معافی گستاخیاں کرنے لگا جنکے لئے بُری سے بُری سب سے سزا بھی ناکافی سے بھی اقل قلیل درجہ رکھ سکتی ہے۔ اوجس انداز سے کوئی زمانہ حال کا بے تمیز آوارہ مزاج بدوضع کمینہ چھوکرا کسی بدچلن بازاری عورت سے ہجر و فراق کا گلہ شکوہ کرسکتا ہے بلاتشبیہ اسی طریق پر (نعوذباللہ) آپ مخاطب کئے جانے لگے!۔

ہمنے مانا کہ فقراء اور کاملین کے طبقہ میں خدا رسی کے لئے درجے رکھے گئے ہیں۔ یعنی فنافی الشیخ۔ فنافی الرسول۔ فنافی اللہ۔ ہمنے مانا کہ کوئی شخص بلاتوسل آپ کی جناب کے وہ حیات ابدی نہیں پاسکتا جسکے سرچشمہ کی ساقی گری آپ کے دست مبارک میں دیگئی ہے۔ ہمنے مانا کہ فقراء اور کاملین عاشق رسول اللہ ہوتے ہیں۔ مگر ہمنے تو کسی فقیر یا اہل اللہ کو سر بازار شور و اویلا مچاتے نہ دیکھا کہ تمہاری طرح وہ آپکے عشق میں سرشار ہیں۔ مر رہے ہیں۔ اور مٹ رہے ہیں ہجر و فراق کی داستانوں نے یہ ہمان سر پر اٹھالئے لیتے ہیں اور ایک طوفان بے تمیزی مچا رکھا ہے۔ پھر تم کون ہو

کہاں کے ولی اللہ ہو کہ تمھیں ایسا عشق چڑایا ہے! چھوٹا منہ اور بڑی بات!
ہمیں کامل یقین ہے کہ جو باتیں حصول ثواب کی امید میں کی جا رہی ہیں وہ
ضرور بالضرور داخل عذاب ہیں اور ایسے بیہودہ نعتوں کے لکھنے والے
بجائے ثواب پانیکے بدترین گناہ گاروں میں سے ہیں۔

بے ادبو! تم کسے مخاطب کر رہے ہو۔ اور کیا بک رہے ہو! عقل سے
ناخن لو! اور یہ دنیاکی واہ واہ کے لالچ میں پڑ کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ نکراؤ۔
اگر تم چاہتے ہو کہ اُس ذات منبع کمالات کی تعریف و توصیف کرو تو اُسکا
طریقہ یہ نہیں ہے۔ اسکا انداز ہی اور ہے۔ تم آپ کے صحیح اور تواریخی حالات
مستند کتابوں سے لے کر جمع کرو۔ آپ کی رفتار آپ کی گفتار۔ آپ کا اخلاق
آپ کے عادات آپکے اطوار۔ غرضکہ آپ کے خوارق عادات میں سے
ہر ہر چھوٹی بڑی بات جہاں کہیں پاؤ لعل و جواہر کی طرح نایاب سمجھکر اُسے
جمع کرو اور عوام میں اُنھیں باتوں کا علم پھیلاؤ تاکہ آپ کی روشن مثال
کا نمونہ ہر بچے بچے کے دل پر نقش کا الحجر ہو جائے اور تم میں سے ہر ہر متنفس
آپ ہی کے نقش قدم پر چلکر حیات ابدی کا مستحق بن سکے۔ تم اگر تلاش کرو گے
تو اُس بے مثل حیات کے زریں واقعات میں سے تمھیں ہزاروں لاکھوں
ایسے ایسے بیش بہا سبق ملیں گے کہ اگر آج سے تم اُنپر عمل کرنا شروع کر دو
تو کل ہی تمھارے ایک زندہ قوم بنجانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔
اور یہی جناب رسالت مآب کی سچی نعت ہے۔ اسی نعت کے لئے آپ
دنیا میں بھیجے گئے تھے اور ہم سے آپ ایسکے وہ امید رکھتے ہیں۔

یاد رکھو کہ کوئی سمجھدار مسلم یا غیر مسلم اُس نعت کو نعت نہیں سمجھ سکتا جسمیں آپکے خال وخط چال ڈھال کی تعریف کی گئی ہو۔ ایسی تعریف ایک برگزیدہ نبی کی شان پاک کے شایاں نہیں ہے بلکہ برعکس آپکی ایسی تعریف کرنا گویا ایک طرح کی مذمت کرنا ہے۔ خلاصہ در خلاصہ یہ کہ آپ کے حسن صورت سے تمھیں کوئی بحث نہیں ہے۔ تم آپکا حسن سیرت دیکھو اور اُس پاک سیرت پہ دل وجان سے فدا ہو جاؤ۔ اسلام تم سے یہی چاہتا ہے رسول اللہ تم سے یہی چاہتے ہیں۔ اور اور اللہ پاک بھی تم سے یہی چاہتا ہے۔

ہمارے میلاد شریف کی محفلیں بے نور نہیں اگر ہمنے آپ کے حسن صورت ہی کی تعریف پر آپ کی اوصاف حمیدہ کا خاتمہ کر دیا۔ اگر ہمنے مبالغہ آمیز روایات اور بعید از قیاس واقعات کا پل باندھ دیا۔ جو باتیں سب سے کم توجہ کے قابل تھیں انھیں میں لپٹ کے رہ گئے۔ فروعات ہی کو اصل واقعہ سمجھ لیا۔ اور اصلی واقعات جنپر آپ کی بزرگی کا مدار ہے اُنکا نام بھی آنے نہ دیا۔ کیا یہی میلاد شریف کی محفلیں ہیں جنھیں قائم کرکے ہم ثواب دارین حاصل کرنا چاہتے ہیں ؟ کر چکے۔ افسوس ہم اُس اسلام کو بدنام کر رہے ہیں جسکا دم بھرنے پر ہم مر رہے ہیں۔ افسوس ہماری عقلوں پر جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں جو کام ہمارے کرنیکا ہے ہم اسکا نام بھی نہیں لیتے اور جو ہمیں کبھی نکرنا چاہئے تھا اسی پر ہمنے دین واسلام کا خاتمہ سمجھ رکھا ہے! نعتیہ نظموں کے متعلق بھی میری مودبانہ گذارش ہے کہ ایسی نظمیں جنمیں آپ کے خط وخال اور چال ڈھال سے بحث

کی گئی ہو یا جنہیں آپ کے عشق کا مصنوعی افسانہ سنایا گیا ہو ہمیں کبھی کسی حال میں نہ سننا چاہئے۔ ہمیں ایک مستحکم ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔ اور بغیر اسکے اس شکایت کا سدباب بالکل ہی غیر ممکن ہے۔ جو بے ادب عاشق جمال پاک بنتے ہیں انھیں سمجھا دینا چاہئے کہ یہ نعت نہیں ہے یہ اس بارگاہ میں بے ادبی کیجا رہی ہے جسے اللہ پاک کبھی نہیں معاف کرسکتا۔ کہاں تم اور کہاں عشق رسول! اگر تمھیں اسکا دعوی ہے تو آپکے احکام کی تلاش کرو۔ انھیں چشم باطن سے قبول کرتے رہو۔ اور دل کے خزانہ میں بند کرلو۔ اسپر عمل کرکے دنیا کے سامنے ایک قابل تقلید نمونہ پیش کرو۔ عاشق رسول اللہ کون تھے؟ کس پایہ کے لوگ تھے؟ صحابۂ کرام۔ کاش جو جو اوصاف حمیدہ اُن کے غلامانِ غلام میں پائے جاتے تھے اُسمیں سے دو چار کی تو ہم جھوٹی سچی نقل کرسکتے۔ کاش مسلمانانِ قرونِ اولے کے سے دو چار افراد بھی آج ہم میں موجود ہوتے تو ہم اس بری حالت افلاس اور ادبار میں نہ ہوتے جیسے آج ہم ہیں۔ وہ لوگ ہماری طرح اپنے رسولِ پاک کے خال وخط پر مرنے والے نہیں تھے۔ وہ آپ کے عادات و اطوار کے مقلد تھے۔ اس تقلید نے انھیں بہترین انسان بنا دیا تھا اور یہی تقلید ہمیں بھی بہترین انسان بنا سکتی ہے۔ لہذا ہمیں بھی انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا چاہئے اور یہی راہ نجات کی ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ جن رسول کریم کے عشق کی ہم مضحکہ آمیز نقل کر رہے ہیں جنکی ولادت کے حالات کے متعلق ہمارے پاس متعدد نسخے

میلاد شریف کے موجود ہیں انکی سوانح عمری کے صحیح اور تواریخی حالات کے کارنامے ہم میں سے ایک کے پاس بھی موجود نہیں ہے۔ متقدمین کو محفل میلاد مبارک میں قصداً اور روایات غیر معتبر پڑھ کر عوام کی واہ واہ سے کہاں فرصت ملتی تھی کہ ان صحیح واقعات کے جمع کرنے کا خیال انہوں نے کبھی پیدا کیا ہوتا۔ کیا آج بھی اس معاملہ میں کوئی عملی کام کرنا قبل از وقت ہے!
ہم اپنے معزز علماء کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کار خیر پر توجہ مبذول فرماکر ثواب دارین حاصل کریں۔ جہانتک ہمارے امکان میں ہے ہم ہر ممکن خدمت کے لئے طیار ہیں۔ اور ہر وقت دامے درمے سخنے قدمے حاضر ہیں۔ ہم بے حد مشکور ہونگے اگر کوئی صاحب اس کام پر آمادگی ظاہر کرکے ہمسے مراسلت فرمائینگے۔

(ایڈیٹر)

حافظ شیرازی اور ڈاکٹر اقبال

ناظرین کرام جنکی نظر سے ہمارا مشترکہ جنوری و فروری نمبر گذر چکا ہے انہیں معلوم ہے کہ کن مجبوریوں سے ہمیں اس مضمون پر قلم اُٹھانے کی ضرورت پڑی ہے۔ ایسے حضرات جنکی نظر مبارک سے وہ نمبر نہیں گذرا ہے انکی خدمت میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمیں یا ہمارے مضمون نگار صوفی عبداللہ صاحب کو ڈاکٹر اقبال صاحب سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال سالہا سال سے اپنا کلام شائع کرا رہے ہیں اور پبلک اسے پڑھ رہی ہے کسی کو اس سے

کچھ بحث نہیں ہے وہ شوق سے شعر کہیں اور شائع کرائیں۔ مگر خود انہیں نے ہمیں مجبور کر دیا جب وہ ہمارے اکابر اسلام کی اس طرح کھلم کھلا توہین اور تذلیل پر کمر باندھ لینگے تو آخر دنیا کہاں تک اور کب تک صبر کر سکتی ہے ؟

حافظ شیرازی کوئی معمولی شاعر نہیں ہیں کہ جنہیں جسکا جی چاہے برا بھلا کہہ جائے اور ہم سن لیں۔ حافظ نہ صرف ایک صاحب باطن صوفی اہل دل اور اہل اللہ تھے۔ بلکہ اکابر اسلام کے بلند پایہ اور قابل احترام بزرگوں میں سے تھے۔ اگر کوئی شخص انہیں یوں علانیہ گالیاں دینا شروع کر دے تو آپ ہی انصاف کیجئے کوئی کہاں تک صبر کر سکتا ہے۔

مثنوی اسرار خودی کے ذریعہ سے ڈاکٹر اقبال صاحب نے حافظ شیرازی کی جو بری گت بنائی ہے اسکا خلاصہ سن لیجئے

(۱) حافظ شرابی تھا اور سوا شراب و کباب کے اسکے پاس کچھ نہ تھا۔ حافظ تو مرگیا مگر شراب اور مےخواری اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ

نیست غیر از بادہ در بازار او — از دو جام آشفتہ شد دستار او
رفت و شغل ساغر و ساقی گذاشت — بزم رندان و مے باقی گذاشت

(۲) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ حافظ کافر تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ

مسلم و ایمان او زنار دار — رخنہ اندر دینش از مژگان یار

(۳) پھر فتویٰ دیا جاتا ہے کہ حافظ کالا سانپ تھا اور اسکی تعلیم اسکا زہر تھا۔ فرماتے ہیں کہ

ایں فسوں خوان زندگی از ما ربود — جام او شان جمے از ما ربود

(۴) سب سے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ

گوسفند است و نوآموختست　　عشوۂ و ناز و ادا آموختست

آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے تو کیا دنیا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ معزز ڈاکٹر صاحب سے سوال کرے کہ خیر حافظ تو اچھا یا برا جیسا بھی تھا اُسے اللہ میاں نے بنا دیا تھا ویسا تھا مگر پہلے ذرا یہ تو فرمائیے کہ آپ جو اتنے بڑے بول بول رہے ہیں آپ کیا ہیں۔ پہلے دنیا کو یہ تو معلوم ہو!

صوفی عبداللہ صاحب نے گذشتہ اشاعت میں دیوان حافظ میں سے ایسے ایسے اشعار منتخب کرکے پبلک کے سامنے پیش کئے ہیں جنہیں شراب ہی شراب کا ذکر آیا ہے۔ اور دنیا کو دکھایا ہے کہ جو شراب حافظ مانگتے ہیں وہ کون سی شراب ہے۔ حافظ کے ادق اشعار کے مطالب حل کرکے بتایا ہے کہ انکا اصلی مطلب کیا ہے جس سے عوام الناس میں جو غلط فہمیاں ہو رہی ہیں انکا باب بند ہو یہ ضرورت خاص کر اسوجہ سے اور بھی محسوس ہوئی کہ ایسے ایسے لوگ جنہیں دنیا مستند ادیب اور قابل سمجھ رہی ہے وہ بھی حافظ کا کلام سمجھنے میں شدید اور فاش غلطیاں کر رہے ہیں مثلاً

(۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے حافظ کو میخوار لکھا ہے۔

(۲) مولانا ابوالکلام صاحب بھی اُن کی رائے سے اتفاق فرماتے ہیں۔

(۳) اخبار زمیندار لاہور کے موجودہ ایڈیٹر صاحب حافظ کو رقاص بخر کرنے والے کا خطاب دے رہے ہیں۔

مگر سب سے زیادہ ظلم حافظ پر ڈاکٹر اقبال صاحب ہی نے کیا ہے یہی

کچھ بحث نہیں ہے وہ شوق سے شعر کہیں اور شائع کرائیں۔ مگر خود انہیں نے ہمیں مجبور کر دیا جب وہ ہمارے اکابر اسلام کی اس طرح کھلم کھلا توہین اور تذلیل پر کمر باندھ لینگے تو آخر دنیا کہاں تک اور کب تک صبر کر سکتی ہے؟

حافظ شیرازی کوئی معمولی شاعر نہیں ہیں کہ جنہیں جسکا جی چاہے بُرا بھلا کہہ جائے اور ہم سُن لیں۔ حافظ نہ صرف ایک صاحب باطن صوفی اہل دل اور اہل اللہ تھے بلکہ اکابر اسلام کے بلند پایہ اور قابل احترام بزرگوں میں سے تھے۔ اگر کوئی شخص انہیں یوں علانیہ گالیاں دینا شروع کر دے تو آپ ہی انصاف کیجئے کوئی کہاں تک صبر کر سکتا ہے۔

مثنوی اسرار خودی کے ذریعہ سے ڈاکٹر اقبال صاحب نے حافظ شیرازی کی جو بری گت بنائی ہے اسکا خلاصہ سُن لیجئے

(۱) حافظ شرابی تھا اور سوا شراب و کباب کے اسکے پاس کچھ نہ تھا۔ حافظ تو مر گیا مگر شراب اور میخواری اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ

نیست غیر از بادہ در بازار او | از دو جام آشفتہ شد دستار او
رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت | بزم رندان و مے باقی گذاشت

(۲) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ حافظ کافر تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ

مُسلم و ایمان او زنار دار | رخنہ اندر دینش از مژگان یار

(۳) پھر فتویٰ دیا جاتا ہے کہ حافظ کالا سانپ تھا اور اسکی تعلیم اسکا زہر تھا۔ فرماتے ہیں کہ

ایں فسوں خواں زندگی از مار بود | جامِ او شانِ ہجے از مار بود

(۴) سب سے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ

گو سفندا ست و نو آموز بیست   عشوہ و ناز و ادا آموختست

آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جب نوبت یہانتک پہونچ چکی ہے تو کیا دنیا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ معزز ڈاکٹر صاحب سے سوال کرے کہ خیر حافظ تو اچھا یا برا جیسا بھی اُسے اللہ میاں نے بنادیا تھا ویسا تھا مگر پہلے ذرا یہ تو فرمائیے کہ آپ جو اتنے بڑے بول بول رہے ہیں آپ کیا ہیں۔ پہلے دنیا کو یہ تو معلوم ہو!

صوفی عبداللہ صاحب نے گذشتہ اشاعت میں دیوان حافظ میں سے ایسے ایسے اشعار منتخب کرکے پبلک کے سامنے پیش کئے ہیں جنمیں شراب ہی شراب کا ذکر آیا ہے اور دنیا کو دکھایا ہے کہ جو شراب حافظ مانگتے ہیں وہ کون سی شراب ہے۔ حافظ کے ادق اشعار کے مطالب حل کرکے بتایا ہے کہ انکا اصلی مطلب کیا ہے جس سے عوام الناس میں جو غلط فہمیاں ہو رہی ہیں انکا باب بند ہو یہ ضرورت خاصکر اسوجہ سے اور بھی محسوس ہوئی کہ ایسے ایسے لوگ جنہیں دنیا مستند ادیب اور قابل سمجھ رہی ہے وہ بھی حافظ کا کلام سمجھنے میں شدید اور فاش غلطیاں کر رہے ہیں مثلاً

(۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے حافظ کو میخوار لکھا ہے۔

(۲) مولانا ابوالکلام صاحب بھی اُن کی رائے سے اتفاق فرماتے ہیں۔

(۳) اخبار زمیندار لاہور کے موجودہ ایڈیٹر صاحب حافظ کو رقاص بھر کنے والے کا خطاب دے رہے ہیں۔

مگر سب سے زیادہ ظلم حافظ پر ڈاکٹر اقبال صاحب ہی نے کیا ہے یہی

وجہ ہے کہ ہمارے کرمفرما صوفی عبد اللہ صاحب بُری طرح اُنکی خبر لے رہے ہیں
صوفی صاحب کا یہی جواب ہے کہ اگر ڈاکٹر اقبال صاحب کو حافظ کے کلام
سے عداوت ہے تو صوفی صاحب کو بھی ڈاکٹر اقبال کے کلام سے عداوت
ہے۔ ورنہ یوں ڈاکٹر صاحب کی ذات سے انہیں کوئی عناد نہیں بلکہ برعکس
اسکے وہ اُنکے دلی ہی خواہ اور سچے خیراندیش ہیں۔ صوفی صاحب نے اپنے
مضمون کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے جنمیں سے دو حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں
اور ایک آج شائع ہو رہا ہے۔ وہ چار حصے یہ ہیں :(۱) حافظ کی شراب (۲) ڈاکٹر
اقبال کی شراب (۳) ڈاکٹر اقبال کا نشہ (۴) ڈاکٹر اقبال کا علاج۔ تیسرے
حصہ کا ایک جزو " پہلا دور " کے عنوان سے گذشتہ اشاعت میں شائع
ہو چکا ہے

ہمیں اپنے نئے ناظرین کا پاس خاطر حد سے زیادہ منظور ہے۔ ہم اپنی
کمزوری اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب تک ہم صوفی عبد اللہ
صاحب ہی کے الفاظ معزز ناظرین کے نظر کے سامنے نہ لائینگے ہم میں ہرگز اتنی
قابلیت نہیں ہے کہ اپنے الفاظ سے اُن کی تشفی کر سکیں۔ نئے ناظرین کی خاطر
سے ہم اِس اشاعت میں بھی کچھ حصہ صوفی عبد اللہ صاحب کے حاشیہ کا
نقل کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کہاں ہیں حافظ کے جام سرشار
کے بادہ آشام! آئیں۔ اور مزے اڑائیں۔

آٹھواں جام

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

نشہ۔ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ حافظ نے میخواری کی تعلیم دی جو مے وہ مانگتے ہیں وہ دوسری ہی مے ہے دیوان حافظ میں مے سے مراد شراب معرفت یا شراب محبت حق سبحانہ تعالیٰ ہے۔ اسی طرح عشق سے بھی مراد عشق مجازی نہیں بلکہ عشق حقیقی ہے یعنی عشق جمال جناب باری عز اسمہٗ۔ اس شعر میں " الا" حرف تنبیہ ہے جس کے ذریعہ سے متکلم اپنے مخاطب کو اپنے جانب متوجہ اور اپنے اوپر مہربان کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ارشاد آیا ہے کہ " سقاہم ربہم شراباً طہوراً" ساقی کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ شراب شوق سے ساغر تحمل لبریز کرکے عطا فرمائے کہ منزل عشق سخت اور دشوار ہے گو پہلے آسان نظر آتی تھی (آساں نمود اول) منزل عشق (حقیقی) کی دشواری کی شکایت (ولے افتاد مشکلہا) سے اشارہ اُن سخت اور دشوار امتحانات سے ہے جو اس کوچہ کے مسافر کو قدم قدم پر پیش آتے رہتے ہیں۔ ساقی سے مراد مرشد کامل ہے جو شراب معرفت کا ساقی ہوتا ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عشق پہلے کیوں آسان نظر آتا تھا۔ اور اب کیوں مشکل معلوم ہونے لگا؟ اِس منزل کا مسافر جو پہلے اِس کوچہ سے نابلد ہوتا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ عشق کی ایک سیدھی شاہ راہ ہے۔ اسے طے کرتے چلے جاؤ۔ آپ منزل مقصود

پر پہونچ جاؤ گے۔ مگر اس کوچہ میں داخل ہونے کے بعد اسکی دشواریاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی غزل میں آگے چلکر لسان الغیب فرماتے ہیں

"کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا"

اِس مصرعہ کو اس شعر کے ساتھ ملا کے پڑھنے میں نے عرض کیا ہے کہ اس کوچہ میں داخل ہونے کے بعد اسکی دشواریاں نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ کیا دشواریاں ہیں؟ ہمارے مسافر کو یہ علم ہوتا ہے کہ جس کوچہ کو وہ ایک سیدھی شاہراہ سمجھ رہا تھا وہ کئی پرخطر منزلوں پہ تقسیم ہے۔ اور پھر ہر منزل طے کرنے سے پہلے سیکڑوں کڑے سے کڑے اور سخت سے سخت امتحانات میں پورے اُترنا ہے۔ اگر ان سب امتحانات میں انسان ثابت قدم رہ سکے اور یہ سب منزلیں طے کر لے تو سب سے آخری منزل عشق کی آتی ہے یہ سالک فقرائے مسلک کے رموز طریقت ہیں جنکو محض علم ظاہر کا عالم نہیں سمجھ سکتا۔ انکے سمجھنے کے لئے علم باطن درکار ہے یا فقراء۔ صوفیائے کرام اور اہل اللہ سے رجوع کرے۔ خلاصہ یہ کہ دس مختلف منازل طے کر چکنے کے بعد گیارھویں اور سب سے اخیر منزل عشق کی آتی ہے جو انتہائی حد محبت کی ہے۔ منازل عشق کے مدارج حسب ذیل ہیں۔

(۱) منزل اول کا نام "موافقت" ہے اِس منزل پر پہونچکر سالک فقیر دشمنانِ خدا مثلاً دنیا، شیطان، نفس امّارہ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اور اُسکے دوستوں کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔

(۲) دوسری منزل کا اصطلاحی نام فقراء نے "میل" رکھا ہے یعنی فقیر کا

میلانِ طبع اُس ذات پاک کی جانب ہوجائے۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ متوجہ الا اللہ ہوجائے۔

(۳) تیسری منزل کا نام "موانست" رکھا گیا ہے۔ اِس منزل پر پہونچ کر فقیر سالک سب سے بھاگتا اور کنارہ کش ہوجاتا ہے اور صرف اُس ایک ذات پاک سے لو لگا کے ہردم اُسی کا جویاں رہتا ہے۔

(۴) چوتھی منزل کا نام "مودت" ہے۔ یہاں پہونچکر فقیر عجز وزاری اور اشتیاق و بیقراری سے خلوتِ دل میں مصروف رہتا ہے۔ سکون کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا ہے۔ اور بجائے اسکے بے صبری اور بے قراری آتی ہے۔

(۵) پانچویں منزل کا نام "ہوا" ہے۔ یہاں پہونچکر فقیر دریافت ومجاہدہ میں مصروف ہوجاتا ہے۔

(۶) چھٹی منزل کا نام "دخلت" ہے۔ یہاں پہونچکر فقیر کا ہر ہر عضو بدن جدا جدا فریفتہ تسبیح وتحلیل ادا کرنا شروع کردیتا ہے اور غیر سے خالی ہوکر صرف اسی ایک ذات کے وجود سے پُر ہوجاتا ہے۔

(۷) ساتویں منزل "الفت" ہے یہاں پہونچکر چھوٹی بڑی خامیاں اور آلائشات جنکا خفیف سا شائبہ بھی باقی تھا انہیں دور اور علیحدہ کردینا پڑتا ہے۔ اور فقیر ذات باری تعالیٰ عز اسمہٗ کے اوصاف حمیدہ سے متصف ہوجاتا ہے۔

(۸) آٹھویں منزل "شغف" ہے۔ یہاں پہونچکر حرارت شوق میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جو دل کے اندرونی حجابات کو پارہ پارہ کرڈالتا ہے۔

(۹) اس منزل کا نام "فنا فی الشیخ" رکھا گیا ہے۔ اسوجہ سے اِس منزل

میں کامیابی کا مدار پیر طریقت کی دستگیری پر منحصر ہے اور پیر طریقت اُسی وقت دستگیری کر سکتا ہے جب مرید ہر دم اور ہر لحظہ پیر طریقت کے وجود میں اپنے کو داخل رکھ سکے۔ سب سے پہلے اُسے اپنے پیر کے ظاہری اوصاف سے متصف ہونا پڑتا ہے۔ اسکے بعد پھر قلبی اور باطنی حالت میں اُس سے دوش بدوش ہوکر اسکے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ یہانتک کہ فقیر بندۂ محبت ہوجاتا ہے اور تفرید صوری و معنوی حاصل کرتا ہے۔

(۱۰) الیہ الیہ! یہہ منزل "فنافی الرسول" کہلاتی ہے۔ پہلے فقیر پیر طریقت سے تفرید صوری و معنوی حاصل کرلیتا ہے پھر اسکے بعد پیر طریقت کی دستگیری کے سہارے پر حضور کی بارگاہ عالی میں باریابی سے مشرف ہوتا ہے۔ زہے نصیب اُسکے! اِس آستان تک پہونچنے ہی کی دیر تھی۔ پہونچتے ہی آئینہ دل جلوہ گاہِ جمالِ کبریائی بن جاتا ہے اور وہی شکل ہوتی ہے کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(۱۱) گیارھویں منزل عشق کی ہے جسکا دوسرا نام "فنافی اللہ" ہے جس طرح دسویں منزل تک بغیر پیر طریقت کی دستگیری کے رسائی غیر ممکن تھی اِسی طرح اس آخری منزل تک بغیر حضور کی دستگیری کے رسائی غیر ممکن ہے۔ یہاں پہونچکر وہ حاصل ہوتا ہے کہ زبان بندکرو دل بفکر کا مضمون صادق آتا ہے۔ اور یہی منزل محویت در ذات کی ہے جسکا دوسرا نام فنافی اللہ ہے چنانچہ آیۂ کریمہ "اناعرضنا الامانۃ" کا اشارہ اسی منزل کی جانب فقراء اور کاملین اور صوفیاے کرام بتاتے ہیں۔ اور وہ صورت ہوجاتی ہے کہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ڈاکٹر اقبال کا نشہ

دوسرا دور

انیسویں صدی کے اخیر تک اقبال کا دماغ نشہ سے بالکل ہی خالی تھا بیسویں صدی کے قرن اولیں کے اندر تک اقبال صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اگر اسکا مقابلہ اُنکی آج کی تصانیف سے کیا جاے تو اسبات کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہوگا کہ دونوں نظموں کا مصنف ایک ہی ہے یا دو مختلف لکھنے والے مثلاً مخزن کا اکتوبر نمبر ۱۹۰۴ء دیکھئے اور صفحہ ۴۹ پر "ہمارا دیس" کے عنوان کے تحت میں دیکھئے کیا ملتا ہے۔ ہم اپنے ناظرین کو دو چار شعر ہیں سناتے ہیں۔ مگر اِس دور سے کچھ نشہ آنا شروع ہوتا ہے۔ شاعری کے دعوے کا بنیادی پتھر رکھا جاتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اِسکی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہو دل وطن میں ۔۔۔ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔۔۔ صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

ان سادہ اشعار کو اقبال صاحب کے تازہ تصنیف کے پتھر توڑ خارا شگاف اشعار سے مقابلہ کر کے پڑھئے۔

وسعت گردوں میں تھی اُنکی تڑپ نظارہ سوز ۔۔۔ بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کش گلزار کیوں　　　　اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہوگئیں

نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی　　　　پھر دکاں تیری ہے لبِ بر صدائے ناؤ نوش

اکتوبر ۱۹۰۸ء تک ڈاکٹر اقبال آدمیوں کی زبان بولتے تھے سیدھی سادھی اُردو تھی ایک دلکش سادگی ہی اُسکی خوبی تھی۔ اور جو بات وہ کہتے تھے سیدھی دِل کے اندر تک پہونچ کے رہتی تھی۔ کہاں ایک سیدھا سادھا مصرع

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

اور کہاں تصنع اور بناوٹ کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی شاعری کا نمونہ

"پھر دکاں تیری ہے لب زیر صدائے ناؤ نوش"

بھلا انمیں سے ایک کو دوسرے سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ کہاں اُردو اور کہاں یہ دلندیزی جسکی کوئی رگ سیدھی نہیں۔ جسکا کچھ مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ "دوکان" کو "لب" فرمارہے ہیں۔ "لب زیر صدا" یعنی چہ! پھر ارشاد ہوتا ہے "ناؤ نوش" حضرت یہاں ناؤ اور کشتی کا ذکر نہیں ہے۔

آپ ۱۹۰۴ء تک اچھی خاصی اُردو لکھتے پڑھتے تھے مگر کیا ولایت سے واپس آکے آپ اُردو بالکل ہی بھول گئے ہیں۔ صرف فارسی ہی یاد رہ گئی ہے جو آپ یوں غالب کا چربہ اڑانے پر تُل گئے ہیں۔ "ناؤ نوش نہیں کہتے" "نائے و نوش" کہئے۔ فارسی لغت ملاحظہ فرمالیجیے۔ اور یہ بھی سن لیجیے کہ آپ کی کوئی کاریگری "دکان" کو "لب" یا "لب زیر صدا" کی صورت میں تبدیل نہیں کرسکتی۔ عام اس سے کہ لب زیر صدا کے کچھ معنی بھی ہوں یا نہوں۔

آگے چلئے آپ مخزن کا دسمبر نمبر ۱۹۰۴ء کھول کر صفحہ ۴۶ پڑھئے "جگنو" کے عنوان کی تحت میں آپ فرماتے ہیں۔ (ہم دو ہی شعر سنائینگے)

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

سیدھا سادھا اردو زبان کا شعر ہے خیر اچھا ہے۔ گو یہاں بھی اتنی بات قابل ذکر ہے کہ چاند کی چاندنی آسمان پر نہیں ہوتی زمین پر پھیلتی ہے نہ کہ آسمان پر۔ اب اسکے مقابلہ میں حضور کی فارسیت ملاحظہ فرمائیے جسکا پہلا دور اسی دسمبر ۱۹۰۴ء اور اسی نظم سے شروع ہوتا ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دئیے ہیں ورنہ

جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی

گو ابھی تک فارسیت نے پورا زور نہیں باندھا ہے مگر کچھ شد بد شروع ہو چلی ہے۔ مگر ملاحظہ فرماتے چلئے کہ فارسیت ہی کے ساتھ ساتھ ٹھوکریں بھی چلتی ہیں۔ یہاں بھی دو ٹھوکروں کے نمونے حاضر ہیں۔ تلاش کی بھی ضرورت نہیں پڑتی "نغمہ ہے بوئے بلبل"۔ اول تو دنیا کو نہیں معلوم ہے کہ "بوئے بلبل" کس چڑیا کا نام ہے۔ اسکے بعد ایسی "بوئے بلبل" جو "نغمہ کہی جا سکے اور بھی دیدہ ہے نہ شنید! شاید یہ کوئی پہیلی ہے یا چیستان جو زبان سیستان میں ادا فرمائی گئی ہے۔ اسے آپ ہی جانیں۔ پھر اس سے زیادہ مزے کی بات تو یہ ہے کہ "بو پھول کی چہک ہے" اے سبحان اللہ وصل علیٰ۔

اب دوسرا شعر دیکھئے۔ پہلے مصرعہ سے اتنی بات تو سمجھ میں آگئی کہ آپنے دو نئے لفظ سیکھ لئے ہیں۔ "کثرت" اور "وحدت" یہ آپ کو بہت پسند آئے۔ اور آپ نے انہیں زبردستی کھینچ بلایا بچارے ہاتھ باندھے چلے آئے اور جہاں اُٹھا کے انہیں دھر دیا وہیں بیٹھ گئے۔ بابہ کہ اپنے ٹھکانے پر بیٹھے ہیں یا زبردستی کہیں ٹھونس دئے گئے ہیں۔ یہ آپ کسی سمجھدار سے پوچھ لیجئے۔ کیا آپ اتنا بتانے کی زحمت گوارا فرما سکتے ہیں کہ جگنو کی چمک "وحدت" کی مثال ہے یا پھول کی مہک؟ اور پھول کی مہک "کثرت" ہے یا جگنو کی چمک؟

اسکے بعد آگے چلکر مخزن کا مارچ نمبر ۱۹۰۸ء کھولئے اور صفحہ ۵۰ پر نظر ڈالئے۔ "نیا شوالہ" کے عنوان سے آپ فرماتے ہیں

سچ کہدوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا　　جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا　　واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر۔ مالی ہے تو چمن کا　　بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

کیا صاف زبان ہے کیا سیدھی سادی طرز ادا ہے۔ کچھ ہندی کی آمیزش اگر ہے تو مناسب موقع ہے۔ "اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا" روزمرہ کی اُردو ہے۔ آپ ہی بتائے یہ طرز دلکش ہے یا وہ جو آپ نے اب اختیار کیا ہے آپ کے فارسی اُردو کے کنکر پتھر آپ کے مُنھ کے اندر سے کچھ کھڑ بڑ کی آواز پیدا

کر کے دماغ پریشان کر دیتے ہیں۔ اور بس۔ یہ آوازیں کانوں تک پہونچکر باہر ہی کے باہر ہی واپس جاتی ہیں۔ دل کے اندر راہ پائیں یہ ممکن نہیں۔ برعکس اسکے سیدھا سادہ کلام موثر ہوتا ہے اور سیدھا دل کے اندر راہ پاتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی ساری تصانیف میں انکا ترانہ اور قومی گیت ہی مقبول عام ہیں۔ اور وجہ کیا ہے؟ دونوں صاف سیدھے سادہ اُردو زبان میں لکھے گئے ہیں مثلاً

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اِسکی یہ گلستاں ہمارا
چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اگر ایسا ہی سیدھا سادہ کلام اور سب بھی ہوتا تو کیا کہنا تھا۔ مگر فارسیت کا بُرا ہو جس نے اقبال کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ ان سیدھے سادہ اشعار کے بعد تازہ کلام پڑھ کے دیکھئے۔

قابل عشرت دلِ خوکردۂ حسرت نہیں ۔۔۔ درخورِ بزمِ طرب شمع سرِ تربت نہیں
زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صورت نہیں ۔۔۔ غیر حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبح عشرت بھی ہماری غیرت صد شام ہے
ہستی انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

یہ جبل اسود کے جہاڑ سر پر لادے پھرنا کسنے سکھایا تھا؟ اسکی کیا ضرورت تھی۔ ٹیپ کا آخری مصرعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"ہستی انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے"

"غبارِ خاطرِ آرام" کیا بلا ہوتی ہے اور اِس کو ہستی انساں سے کیا علاقہ ہے؟ اِس مصرعہ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

ــــــ ۰٫۰٫۰ تیسرا دور ۰٫۰٫۰ ــــــ

گو ہمنے "نالۂ یتیم" کے بعض اشعار دوسرے دور میں بطور نمونہ پیش کر دئے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ اسی نقطہ سے ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسہ کے لئے ۱۹۰۰ء میں یہ نظم لکھی گئی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کھلم کھلا سیدھی سادی آدمیوں کی بولی بولنا چھوڑ کر پشتو اور ولندیزی بولی بولنا شروع کر دیا تھا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب نے اپنی فارسی دانی کا امتحان لیا تھا۔ یہہ وہ وقت تھا کہ ان کی اردو زباندانی پر کئی بار نقادانِ سخن کے قلم چل چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ یہہ کوچہ ٹھوکروں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی سیدھی شاہراہ تلاش کرنا چاہیئے جہاں ان منھ توڑ ٹھوکروں سے پناہ مل سکے۔ آپنے اردو کا ساتھ چھوڑا اور فارسی اور فارسیت کی جھونپڑی میں پناہ لینے دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نظم کے ذریعہ سے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل پنجاب کہاں تک فارسی کے علم میں معلومات رکھتے ہیں۔ اگر اس طبقہ میں فارسی دانوں کی کافی تعداد سامنے آگئی ہوتی تو شائد فارسی کی جھونپڑی میں بھی پناہ نہ مل سکتی تھی۔ مگر ہاں اگر اردو کے لئے یہ عذر ہے کہ "اردو ہماری زبان نہیں" تو فارسی کے لئے بھی یہ عذر موجود ہے کہ

"یہ ایران کی زبان ہے یا ہندوستان کی! ہم پنجابی ہیں۔ فارسی ہماری زبان نہیں" چلئے سستے چھوٹے۔ اب میدان صاف ہے۔

قصہ مختصر "نالۂ یتیم" انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھا گیا۔ ایک ایک شعر پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ اور حاضرین جلسہ میں سے اکثر حضرات نے اس نظم پر سیکڑوں روپے قربان کر دئے۔ بہتوں نے آنسوؤں کے ندی نالے بہا دئے۔ ہر دل ہر ہاتھ نے قدر کی۔ یہاں تک کہ اس مختصر نظم کی ایک ایک کاپی چار چار روپیہ پر بکی۔

یہ ڈاکٹر اقبال کا پہلا کھیل فارسیت کے ساتھ تھا جب فارسیت اتنی کامیاب ثابت ہوئی اور اردو زباندانی نے کئی بار منھ توڑ ٹھوکریں کھا چکے تھے پھر آخر کیا ہونا تھا؟ آخر فارسی اردو کا خچر بچہ جنا گیا جو گھوڑے میں ہے نہ گدہے میں۔ نہ اونٹ ہے نہ بلی۔ نالۂ یتیم کا دوسرا ہی بند نمونہ ہے اس نظم کا جو اسی تاریخ سے ڈاکٹر صاحب نے نکالی تھی۔ اب ناظرین دیکھ کے پہچانیں کہ یہ نوزائیدہ بچہ کس جنس میں داخل ہوتا ہے۔ اور یہی صورت ہے جو ڈاکٹر صاحب کی زبان نے اس تاریخ سے اختیار کر لی ہے۔

خارِ حسرت غیرتِ نوکِ سناں ہونے لگا　　　یوسفِ غم زینتِ بازارِ جاں ہونے لگا

دل مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا　　　نالۂ دل روشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ سرائے رشکِ صد فریاد ہو

جو سرودِ عندلیبِ گلشنِ ایجاد ہو

مذاق صحیح کے رکھنے والے ٹیپ کا شعر غور سے پڑھیں۔

اس واہ واہ کی بوچھار اور تعریفوں کی بھرمار نے تیر سے مقلد بھی پیدا کردئے۔ انمیں سے دو ایک مشہور نام میں بھی گنوائے دیتا ہوں جنہیں پنجاب سے باہر تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ مگر پنجاب والے جنسے خوب واقف ہیں ان مقلدوں میں اول نمبر پر تو ایک منصف صاحب بہادر ہیں جنکا نام نامی احمد حسین خانصاحب ہے۔ اور جو ایکبار اپنی تصنیف کے ساتھ اپنی شبیہ مبارک بھی شائع فرما چکے ہیں۔ ہماری نظر سے آپکی تین نظمیں گذر چکی ہیں (۱) "ہمارا قرآن" (۲) "میرا خواب" (۳) "اخوت" آپ کے کلام کے نمونے بھی حاضر ہیں۔ سنئے آپ کیا ارشاد فرمارہے ہیں۔ مگر میں آپکو قسم دیتا ہوں کہ ہنسئے گا نہیں۔ "میرا خواب"

کونسا گوہر نایاب دکھاؤں تم کو کون سا نغمۂ دل سوز سناؤں تم کو
کونسا عطر دل آویز سنگھاؤں تم کو کون سا نکتۂ پر مغز سناؤں تم کو

جائے سجدہ ہے وہی اور نمازی ہیں وہی
کاکر یزی ہیں وہی۔ اور پیازی ہیں وہی

ٹیپ کا اخیر مصرعہ کشت زار زعفران کا نمونہ ہے یا نہیں! یہ اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کی نقل ہے۔ ایک بند اور سن لیجئے۔ "اخوت"

ہو گئی شام تہِ خارِ مغیلاں ہم ہیں جامۂ صبر چھنا لعبتِ عریاں ہم ہیں
ہاں در بعض پہ اب ناصیہ کوباں ہم ہیں ہمنشیں دود در کلبۂ احزاں ہم ہیں

دشت ادبار میں گنگھور گھٹا چھائی ہے
ہو کا عالم ہے سراسیمہ ہیں تنہائی ہے

ہم اتنا ہی کہہ کے انہیں رخصت کئے دیتے ہیں کہ ایسے موجد سے مقلد ہی بھلے

اب ایک دوسرے مقلد صاحب اسٹیج پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ آپ کی ایک نظم میں سے کچھ نمونہ محض اس غرض سے پیش کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے ایک مقلد کا کلام سنا دیا جائے بس اور کچھ نہیں۔ آپ اردو اسٹیج سے تعلق رکھتے ہیں اور آغا حشر صاحب کاشمیری کے نام نامی سے موسوم ہیں۔ آپ ڈاکٹر اقبال کے تیسرے دور کے مقلد ہیں۔ آپکا کلام پڑھ کر کوئی صاحب کبھی پہچان نہ سکینگے کہ اقبال کا کلام نہیں ہے سنئے۔ "شکریہ یورپ"

خاک کو بھر دے سرور آسمان پرواز سے
گرم کردے روح مستی شعلہ آواز سے
حسن آرایش سے زینت عالم امکاں کو دے
خلقت تجدید آئین کہن ساماں کو دے
کلیات دہر کی اک شرح نو تحریر کر
نظم مستی کے لئے الفاظ میں تفسیر کر
طرح نو انداز و بنیاد جہاں از سر فگن
شعلہ در پیراہنی آتش بخشک و تر فگن

چوتھا دور

اگر پہلا دور ایسا مست تھا کہ نشہ تھا ہی نہیں۔ تو دوسرے دور سے کچھ کچھ سرور ہو چلا تھا۔ تیسرے دور نے نشہ حد کو پہونچا دیا۔ پیمانہ ایسا لبریز ہو گیا کہ چھلک پڑا۔ پہلے دور میں سیدھی سادی اردو تھی۔ دوسرے دور میں فارسی کی آمیزش شروع ہوئی۔ تیسرے دور میں اردو فارسی کا معجون مرکب بنا کے مریض کے منھ میں ٹھونس دیا گیا۔ یا یوں کہئے کہ پہلے دور میں آپکی بکر فکر باکرہ رہی۔ دوسرے دور میں حاملہ ہوئی تیسرے دور میں اسنے اردو فارسی کا بچہ جنا۔ یہ

اسکا پہلا بچہ تھا۔ اسے اہل پنجاب نے فوراً بچہ بنالیا۔ اب وقت آگیا کہ دوسرا بچہ نکلے۔ یہ بچہ چوتھے دور میں نکلا۔ سالوتریوں نے فوراً ہی اس کی تلاشی لینا شروع کی اور بولے "چو دم برداشتم مادہ برآمد" یہ بچہ ظاہری شکل و صورت میں تو ایرانی ٹٹو ہی کا بچہ نظر آتا ہے۔ مگر دیکھیں آخر بڑھ کے یہ کیا نکلتا ہے۔
چوتھے دور کے ٹٹو کے بچے کا نام "اسرار خودی" ہے۔ یہ ٹھینٹھ فارسی نژاد ہے۔

ہم ایک جاہل آدمی ہیں صرف و نحو کی بھول بھلیوں میں تو نہ پڑنے سے رہے۔ ہاں اپنی موٹی سمجھ کے موافق جتنے جتنے سبق الف بے کے اوستاد سے سیکھے ہیں انکے بھروسے پر تو ہمیں اتنا ہی کہنا آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے "اسرار خودی" میں ہمیں سیکڑوں جگہ املاء کی غلطی نظر آتی ہے۔ املا میں ایک ہی قسم کی بے شمار غلطیاں ملنے سے ہمیں یہ تو مشکل سے یقین آسکیگا کہ کاتب کی غلطی ہے۔ ہم انہیں آپ کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔ آپکا بڑا ہی احسان ہو اگر آپ معزز ڈاکٹر صاحب سے پوچھ کے ہمیں بھی بتادیں کہ یہ واقعی غلطیاں ہی ہیں یا ہماری نالائقی کا قصور ہے اور غلطیاں ہیں تو کاتب ہی کی ہیں یا خدانخواستہ دور از حال نصیب دشمناں۔ خدا نہ کرے۔ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد۔ ڈاکٹر صاحب ہی کی ! ملاحظہ فرمائیے۔
ہم آپکی مثنوی شریف کے پہلے ہی شعر سے اپنا سبق شروع کرتے ہیں۔

اے امام۔ اے سید والا نسب   دودمانت فخر اشراف عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی   عقل کل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنی بیگانۂ　　　جلوۂ شمع مرا پروانۂ

ہیں تو بیگانئی - پروانئی ہی صحیح املا معلوم ہوتا ہے - آگے چلئے۔

بود نقشِ ہستیم انگارۂ　　　ناقبولِ ناکسے ناکارۂ

کیا صحیح املاء ناقبولے - انگارئے - ناکارئے ہی ہے نا؟

مقصدے از آسماں بالاترے　　　دلربائے دلستانے دلبرے

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ　　　ماسوی را آتشِ سوزندۂ

ہم تو تابندئے - سوزندئے - صحیح سمجھتے ہیں۔

گوسفندے زیر کے فہمیدۂ　　　کہنہ سالے گرگ باراں دیدۂ

صحیح املاء فہمیدئے - دیدئے - ہے یا نہیں؟

آں قتیلِ ہمت مردانۂ　　　آں ز رمز زندگی بیگانۂ

صحیح املاء؟ مردانئے - بیگانئے۔

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز　　　زندۂ؟ از صحبتِ حافظ گریز

صحیح املاء زندئے - شائد بادہ زدن کوئی محاورہ نہیں ہے۔ البتہ "جام زدن" ضرور ہمنے سنا تھا۔

قصد آزارم کنی دیوانۂ　　　از حیاتِ خود نما بیگانۂ

صحیح املاء؟ دیوانئے - بیگانئے

کوکب رم خوے گردوں زادۂ　　　یکدم از ذوقِ نمود استادۂ

صد فریب از غنچہ و گل خوردۂ　　　بہرۂ از زندگی ما بردۂ

مثلِ اشکِ عاشقِ دلدادۂ　　　زیب مژگانِ چکید آمادۂ

ایکہ می خواہی زدشمن جانبری　　　　از تو پرسم قطرۂ یا گوہری

صحیح املاء؟ زادئے۔ استادئی۔ خوردئی۔ بردئی: دلدادئی۔ آمادئی قطرئی۔ بہرئی۔ اور یہ بھی سن لیجئے کہ "کوکب والے شعر نے تو ہمیں صرف ونحو کا سارا سبق بھلا دیا۔ اسی طرح اس کے بعد والے شعر کے پہلے مصرعہ کے معنی کو دوسرے مصرعہ کے مطلب سے کوئی واسطہ نہیں معلوم ہوتا۔ اسکے بعد پھر "مثل اشک" والا بھی ہمیں تو صرف ونحو سے دور بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرا مصرعہ اسکا غور سے پڑھتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔

توکہ ہم در کافری کافر نۂ　　　　درخورِ طوفِ حریم دل نۂ

صحیح املا۔ نئی ہے؟

اے زبطنِ چرخ گرداں زادۂ　　　　از تو بہتر ساحل افتادۂ

صحیح املاء۔ زادئے۔ افتادئے؟ اس شعر کے مطلب سمجھنے میں ہماری فہم ناقص صاف جواب دے رہی ہے۔ ہمیں ایسا ہی ایک شعر حضرت وحشی کا یاد ہے۔ سُن لیجئے۔

لیالئے سعادت کو ہمائی نشئہ ملے　　　　خطیبِ خطبۂ ابرام دردرندمستاں ہے

بطن چرخ گرداں نئی بندش معلوم ہوتی ہے اور اسی طرح۔ ساحل افتادہ بھی۔

اے کہ مثلِ گل زگل نالیدۂ　　　　تو ہم از بطن خودی زائیدۂ

صحیح املاء۔ زائیدئے۔ بالیدئے ہے نا؟ دوسرے مصرعہ کے مضمون پر ہمارا چوب قلم سے صاد ہے۔

غافل از خود شو اگر فرزانۂ　　　　گر زخود غافل نۂ دیوانۂ

صحیح املا: تینوں جگہ بجائے "نہ" کے "نی" ہی ہیں تو صحیح معلوم ہوتا ہے۔

توکہ از نورِ خودی تابندۂ گر خودی محکم کنی پایندۂ

ہستی و از نیستی نرسیدۂ اے سرت گردم غلط فہمیدۂ

صحیح املا: تابندئی، نرسیدئی، فہمیدئی ہے۔ تابندۂ کا قافیہ پایندۂ تو بہت ہی اچھا ہے مگر پایندہ کوئی لفظ فارسی لغت میں ملتا ہی نہیں۔ اگر اسی کے ساتھ مخترع اکبر صاحب فارسی زبان کی کوئی نئی لغت بھی تصنیف فرما دیں تو بڑا ہی احسان ہو۔ موجودہ لغات سے تو ذرا بھی مدد نہیں ملتی ایسے رہ گئی ہیں۔

گرم رو در جستجوئے سرِ ئہ واقف از چشمِ سیاہِ خودنہ

صحیح املا: سرمئی، خودنئی ہے یا نہیں؟

دل ز نقشِ لا اللہ بیگانۂ از صنم ہائے ہوس تبخانۂ

صحیح املا: بیگانئے، تبخانئے؟

وقت را مثلِ مکاں گستردۂ امتیازِ دوش و فردا کردۂ

صحیح املا: گستردئی کردئی ہے۔ یہ بیسویں صدی کی ترقی ہے کہ بستر کی طرح مکان بھی بچھا اور لپیٹ کے بغل میں دبا لیا جا سکتا ہے۔ اگر یہاں بجائے مکان کے بستر یا بوریا یا ٹاٹ کا نمدا باندھا گیا ہوتا تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ ہم تو اب املا سے اکتا گئے اب کچھ اور سکھائیے۔

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام

ہمارے استاد صاحب قبلہ مدظلہ فرماتے تھے کہ اول تو حرکت بفتح اول و ثانی و ثالث ہی صحیح اور فصیح مانا گیا ہے۔ ہاں بیشک مولانا فوقی ایک جگہ کہہ گئے ہیں کہ

ع زبس خوش حرکتِ شیریں ادا بود

مگر ایک دنیا کا اتفاق رائے اسکے خلاف ہے۔ دوم "حرکت اعصاب گردون" اور "در رگِ مہ دورۂ خوں" دونوں نئی بندش ہیں اور دونوں بے سند ہیں۔ سوم نہ اعصاب کو حرکت ہوا کرتی ہے۔ نہ ماہتاب کی کوئی رگ ہے اور نہ اُس رگ میں خون کا دورہ ہونا ممکن ہے۔ چہارم "دورۂ" فارسی لفظ نہیں ہے۔ دور اور دوراں بیشک فارسی ہیں مگر دورہ اردو لفظ ہے۔ اسکا فارسی مثنوی میں گذر کہاں!

کیا یہ کفر تو نہو گا اگر نعوذ باللہ کوئی کہے کہ معزز ڈاکٹر صاحب کے دو مصرعہ اور ہوا میں معلق نظر آرہے ہیں۔ نہ آسماں میں ہیں نہ زمین میں!

"عشق سوہاں زد مرا آدم شدم" اور "خرمن از صد روئی و عطار کرد"

پھر آپ فرماتے ہیں۔ "ذرہ از بالیدگی دریا شود"

مگر ہمارے اُستاد تو کہتے تھے کہ بالیدگی کا لفظ زبان فارسی میں نباتات کے لئے بالعموم مستعمل ہوا ہے جو اپنی قدرتی نمو یا قوت نامیہ کے بل بر فطرتاً آپ سے آپ بڑھیں۔ نہ کہ ذرہ کے لئے، وہ تو یہاں بالیدگی کا لفظ بالکل ہی بے محاورہ بتا رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

خیز در جامم شرابِ ناب ریز در شبِ اندیشہ ام مہتاب ریز

ایک صاحب فرما رہے تھے کہ یہ آپ نے لف و نشر مرتب فرمایا ہے۔ جام ہے شب اور شراب ہے مہتاب اور کچھ ایسا کفر بھی بکتے تھے کہ اول تو شب کو جام سے تشبیہ دینا ایسا ہی ہے جیسے مثلاً ہاتھی یا اونٹ کو جام سے تشبیہ دینا۔ اسوجہ سے کہ شب کو جام کے ساتھ کیا صوری یا معنوی مناسبت ہو سکتی ہے!

پھر اسکے بعد اگر آپ " درجامِ شرابِ ناب ریز" فرماتے ہیں تو بالکل ہی صحیح ہو۔ مگر آگے چلیئے۔ اسکے بعد جب آپ " درشب اندیشہ رم مہتاب ریز" فرماتے ہیں تو ویسا ہی بے جوڑ ہے۔ جیسے شب کی مثال جام کے ساتھ تھی خدا جانے کیا بات ہے!

ہمیں اعتراف ہے کہ ہمارے پاس اتنا بیکار وقت نہیں تھا جو اس نظم کے پڑھنے میں صرف کرنے کے لئے نکالا جا سکتا۔ البتہ جگہ جگہ سے الٹ پلٹ کے دو دو چار چار شعر سرسری طور پر دیکھ لینے کے گنہگار ہم ضرور ہیں۔

رخشِ او در ظلمتِ معقول گم　　　درکہستانِ وجود افگندہ سم

کل ہم سے کوئی صاحب فرماتے تھے کہ نہ یہ فارسی اہلِ زبان کا طرزِ ادا ہے اور نہ انکا محاورہ یہ تو خاص ڈاکٹر اقبال کے " ایجاد بندہ " خیالات ہیں جنہیں فارسی کا جامہ زبردستی پہنا دیا گیا ہے اور ایسا ہی بدزیب نظر آتا ہے جیسے ڈاکٹر اقبال کے سر پہ ہیٹ۔ اور ظلمت معقول میں افلاطون کے گھوڑے کا کھو جانا اور پھر کوہستان وجود میں اسکے سم کا گر جانا سب ڈاکٹر صاحب کی ایجاد بندہ بتا رہے تھے ہمیں ڈاکٹر صاحب سے یہ بھی پوچھنا تھا کہ گھوڑے کے پاؤں سے نعل گر جاتے تو اکثر دیکھا اور سنا گیا ہے۔ مگر آجتک کبھی نہیں سنا گیا تھا کہ کوہستان کے پتھروں سے ٹھکرا کر کسی گھوڑے کا سم بھی نعل کی طرح اسکے پاؤں سے کٹ کر بیس گز کے فاصلہ پر پہونچا ہو۔ البتہ ایک ہندوستانی مثل ضرور سنی تھی کہ " منہ پر ناک نہیں دیکھتے اور کوے کے پیچھے دوڑے جاتے ہیں" شاید اس خیال کو نظم کا جامہ پہنانے کا ارادہ کیا گیا ہو تو کچھ بعید نہیں۔ اور ضرورت بھی اس کی

بیشک تھی۔ اسکے تو ہم بھی قائل ہیں۔

آپ فرماتے ہیں "طوف ساغر کرد مثلِ رنگ مے" اگر یہ کہا جاتا کہ شراب کی رنگت کی طرح جام پر کوئی چیز چھا گئی یا پھیل گئی۔ تو اور بات تھی۔ مگر یہاں تو ارشاد ہوا ہے کہ "طوف ساغر کرد" تو رنگ مے ساغر کا طواف نہیں کیا کرتا اور یہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔

پھر ارشاد ہوتا ہے "سازاو اقوام را اغوا کند" یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اول تو حافظ کو ساز سے کیا علاقہ ہے اور پھر ساز کو اغوا کرنے سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے۔ یہ اشعار حافظ سے متعلق تھے۔ اب اس کے ساتھ ہی "صنعت مہملہ" کی مثال میں ایک شعر اور ملاحظہ کے قابل ہے۔

"از بزِ یونان زمیں زیرک تر است ۔۔۔ پردۂ عود شِ حجاب اکبر ست"

ہمیں ڈر ہے کہیں آپ یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ بھلا اس شعر کی کونسی رگ سیدھی ہے؟ کہاں بزِ یونان۔ کہاں زمین۔ کہاں پردۂ عود۔ اور کہاں حجاب اکبر! ایک کا گھر چین میں ہے تو دوسرے کا بدخشاں میں ایک نیو پارک میں رہتا ہے تو دوسرا پریٹوریا جنوبی افریقہ میں۔ ایک ادھیو میں ہے تو دوسرا ڈی ٹی کاکا میں ایک کا پتہ نہ کوہ قاف میں کہیں چلتا ہے۔ اور نہ دادا بیٹا اور کنچن جنگا میں حضرت وحشی بھی خوب ہی فرماتے ہیں۔ اگر ایسے اشعار کی کچھ تطبیق ممکن ہے تو آپ ہی کے پاکیزہ کلام سے سن لیجئے۔

"قرابادینِ اعظم لاابالی ہر زمستعمل ۔۔۔ خرِ دجال امین ماوراء النہر دوالا ہے"

اچھا ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے اور یہی نچوڑ کا شعر بھی ہے۔ اسکے مخاطب

مخاطب حافظ شیرازی ہیں۔ اور اسی شعر کے ذریعہ سے انپر انتہاے بے تمیزی کا تبرا اڑایا گیا ہے۔ اسے بھی سُن لیجئے۔

گوسفند است و لوا آموخت است   عشوۂ ناز و ادا آموخت است

پڑھے لکھے لوگوں کو تو اکثر یہی کہتے سنا ہے کہ جس طرح یہ شعر انتہاے بے تمیزی کے تبرا میں طاق ہے اسی طرح اقبال کی شاعری کی ٹانگ توڑنے کے لئے اس سے اچھا پتھر بھی شائد مشکل سے مل سکیگا۔ نقل کفر کفر نباشد سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے حافظ کو گوسفند لکھا تو آخر کیا سمجھ کر۔ اسمیں کون سی شاعری ہے؟ اگر آپ آدمی کو گوسفند بنائینگے تو کوئی صوری یا معنوی مناسبت بھی آپ کو پیدا کرنا پڑے گی یا نہیں؟ اب آپہی تبلائیے کہ حافظ کو گوسفند سے کیا مناسبت ہے اور کس اعتبار سے؟ مثال کے طور پر لیجئے اگر میں کسی کی مثال الّو سے دوں تو مجھے ثابت کرنا پڑے گا کہ اسمیں اور الّو میں مشابہت کی کون کون سی علامتیں موجود ہیں۔ مثلاً میں یہ ثابت کرنا چاہونگا کہ اُسے دن دوپہر کچھ نہیں سوجھتا۔ اسکی عقل بھدی ہے۔ وہ حماقت میں شہرہ آفاق اور ضرب المثل ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو آپ نے حافظ اور گوسفند میں کیا کیا مناسبتیں پائیں؟

ناظرین کرام دیکھینگے کہ گوسفند کو حافظ سے کوئی صوری یا معنوی نسبت نہیں ہوسکتی ہے۔ لہذا یہ مثال بالکل ہی بے تکی ہانک ٹھہری۔ اب آگے چلئے۔ دوسرا مصرعہ پڑھئے۔ "عشوۂ و ناز و ادا آموخت است" ۔ اس مصرعہ کا مخاطب کون ہے؟ حافظ یا گوسفند۔ یا دونوں؟ اچھا ملاحظہ فرمائیے

اگر گوسفند مخاطب ہے تو گوسفند کے لئے "عشوہ و ناز و ادا" کے الفاظ جیسے کچھ مناسب اور معنی خیز ہو سکتے ہیں صاف ظاہر ہے۔ اونٹ کے شتر غمزے البتہ شہرہ آفاق ہیں۔ مگر بکری کے "عشوہ و ناز و ادا" یہ تو ڈاکٹر اقبال ہی کے سے بلند پایہ شاعر ہونگے جو باندھ سکیں۔ ورنہ ہماری سی موٹی سمجھ والوں کے نزدیک تو نہ یہ شاعری ہے نہ یہاں کہیں شاعری کی ہوا بھی چھو گئی ہے ہمارے صوبہ کا تو ایک ابجد خواں بھی ایسا نہ کرے گا۔ کہ بکری کے لئے "عشوہ و ناز و ادا کے الفاظ لکھے۔ اگر ان الفاظ کے مخاطب بڑے "حافظ" ہیں۔ اور وہ "عشوہ و ناز و ادا" کرتے ہیں۔ تو یہ بھی شاعری کے نام کی مٹی پلید کرنا ہے۔ کہاں گوسفند۔ کہاں حافظ۔ کہاں عشوہ و ناز و ادا۔ سوا اس کے کہ آپکو نوا کے قافیہ کی تلاش ہوئی۔ آپنے اسکا قافیہ ادا پسند فرمایا۔ اور اس قافیہ کی کھپت کے لئے آپنے ایک سے تا پا پھوڑ ڈھونڈا۔ بھدا گنوار مصرع تصنیف فرما کے کھینچ مارا۔

خیر میاں افلاطون کے گھوڑے کا سُم ٹوٹ گیا تھا۔ اور حافظ کالا سانپ تھا۔ شرابی تھا۔ کافر تھا۔ یہ تو معلوم ہوا۔ اب بیچارے عرفی سے کیا قصور سرزد ہوا تھا۔ ذرا وہ بھی سن لیجئے۔

روز محشر جسم اگر گوید بگیر	عرفیا! فردوس و حوراء و حریر
غیرت او خندہ بر حوراں زند	پشت پا بر جنت الماوی زند

لوگ شائد سچ کہتے تھے کہ یہ "اسرار خودی" ایرانی ٹڈا کا بچہ بتایا جاتا ہے۔ اب یہاں آپ اس عیبی جانور کی پشتکیں دولتیاں اصاف ملاحظہ فرمایئے

بنسل ہے اپنی اصلیت پر جاتا ہے۔" پشت پا بر جنت الماوی زند" دیکھئے دولتیاں بھی اُڑاتا ہے تو نئے فیشن کی۔ اور گھوڑے ٹٹو اگر کسی دیوار پر پشتکیں اڑاتے ہیں تو سُم کے سیدھے جانب سے، یعنی اس طرح کہ انکی نعل جا کے دیوار پر پڑتی ہے۔ مگر اس ٹٹو کے بچے کی دولتیوں میں بھی بلا کی جدت ہے کہ یہ" پشت پا" سے جنت کی دیواریں پیٹ رہا ہے، شاید ہمارے ڈاکٹر صاحب کو" پشت پا" کے معنی" تلوے" کے بتا دئے گئے ہیں۔ وہی یاد ہیں۔ پنجابی استاد بھی بلا کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ ضرور غور کرتے کہ" پشت پا زدن" کے کیا معنی ہونگے۔ اجی اول تو تم کسی عمارت یا دیوار کو پشت پا سے مار ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ تمھارے پاؤں اللہ میاں نے اُلٹے نہ بنائے ہوں۔ یعنی تلوے اوپر ہوں اور پشت پا نیچے۔ یا اگر کسی ترکیب سے گھما پھرا کے تم کسی دیوار پر اپنی پشت پا پٹخوگے تو دیوار کا تو کچھ نہ بگڑے گا مگر تم دو ہی منٹ کے اندر لنگڑے ہو جاؤگے۔

شامت اعمال سے کسی دشمن نے یہ عرفی والے دونوں شعر جا کے کہیں حضرت وحشی علیہ الرحمت کو سنا دئے ہیں ذرا بھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ کن صاحب کی عنایت تھی حضرت وحشی نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ہم وہ بھی سنائے دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

" اب وہاں تک تو سرکار نے" علم حاضر" سے کام لیا تھا یہاں" علم غائب" سے کام لیا گیا ہے۔ اور شاعری کے محاسن اور کمالات صوری دکھا دینے کے بعد اب حضور کچھ اظہار کمالات معنوی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ جل جلالہ!

الہی خیر! یہاں علم مکاشفہ کا کمال ظاہر فرمایا گیا ہے۔ فلاطون اور حافظ اسوجہ سے بوٹ کے نیچے روندے گئے تھے کہ اُنکی تصانیف کے ذریعہ سے جیسے کچھ خیالات ظاہر کئے گئے تھے وہ دماغ شریف کے اندر راہ نہ پاسکے مگر عرفی کا کیا قصور ثابت کیا گیا؟ عرفی کا قصور انہیں دو شعروں کے ذریعہ سے ہمیں بتایا گیا ہے جسکا خلاصہ در خلاصہ یہ ہے کہ "حشر کے دن اگر پروردگار عالم رحم کھا کے عرفی کو مخاطب فرمائیگا کہ اے عرفی تم فردوس اور حور اور حلۂ بہشتی لو تو عرفی کی غیرت کبھی اسے گوارا نہ کرے گی کہ وہ ان نعمتوں کو قبول کرے۔ وہ صاف انکار کردے گا" اِس بیان کے متعلق اتنی باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے اس کمال اور مکاشفہ کی داد نہ دینا کفر ہے۔ حشر کے دن عرفی اور اللہ میاں سے جو جو باتیں ہونے والی ہیں وہ ابھی سے ہمارے ڈاکٹر صاحب کو ازبر ہیں۔ واقعی اسکا دعویٰ تو حافظ کے فرشتوں نے بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ اب تو ڈاکٹر اقبال کو پیغمبر کہدینا بھی کچھ بیجا نہیں معلوم ہوتا میری رائے میں لگے ہاتھوں قادیانی کی خلافت کے لئے ایک درخواست لکھ کے آج ہی کی ڈاک سے بھجوا دیجئے۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اگر قابلیت کی کوئی دستاویز سنداً روانہ کرنا پڑے تو فقیر کا نام گواہان حاشیہ میں شوق سے دھر دیجئے۔

عرفی کا جرم آپکی تعزیرات ہند کا بدترین جرم تھا۔ آپ عرفی کی چھاتی پہ سوار ہیں اور اگر ہم آپ دوڑ کے فوراً ہی آیات قرآنی دم کرکے اس بیچارے کی گلو خلاصی نہ کرائیں تو آپ اسکا گلا گھونٹ چکے تھے۔ خیر عرفی کی "غیرت"

تو واقعی ایسی ہی ہو گی جیسی کچھ آپ کا مکاشفہ بتا رہا ہے۔ ہم اس علم ہیئت
سے بے بہرہ ہیں اور اسکی بابت کوئی رائے دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے
مگر ہاں عقلی گدے البتہ لگانا جانتے ہیں۔ اور اس اعتبار پر خوب ہی بے پر
کی اڑا دیا کرتے ہیں۔ ہم سے اس طرح اگر کوئی سوال کرے کہ عرفی کی "غیرت"
تو ایسی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی "غیرت" بھلا کیسی ہو گی؟ تو ہم یہ بے تکی
ہانک بے سوچے سمجھے ضرور لگا سکتے ہیں کہ اجی ڈاکٹر اقبال کی نہ پوچھیے۔ وہاں
تو مرجانے کے بعد کا حال تھا۔ حور اور جنت کے تذکرے تھے۔ اتنی دور تک تو
ہماری رسائی نہیں۔ مگر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں اور شرط باندھ کر کہہ سکتے ہیں کہ اگر
کوئی عیسائی پادری ہمارے معزز ڈاکٹر صاحب کو آج ہی کوئی اچھی سی نوکیلی
پری چھم چھم کرتا دکھا دے اور کل ہی وہ معہ بیٹے کے مشن کمپاؤنڈ کے اندر نظر
آجائیں تو ہمارا ذمہ۔ جسکا جی چاہے آزما دیکھے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔
بہشت دوزخ مرنا جینا حور وغیرہ تو یہاں خواب میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بھلا ہم
جاہل آدمی یہ باتیں کیا جانیں!"

آپ نے دیکھ لیا کہ ابتدائے "عشق" میں ہمارے شاعر صاحب کا دماغ
نشہ سے بالکل ہی خالی تھا۔ سب سے پہلے جب آپنے کتاب "علم الاقتصاد"
تالیف فرمائی ہے۔ اسوقت کیا حال تھا۔ پھر اسکے بعد جب آپ آدمیوں کی
بولی بولتے تھے اسوقت تک آپ کیسے رہے۔ بہت اچھے۔ بہت خاصے۔
رفتہ رفتہ دماغ پر گرمی چڑھتی گئی۔ یہہ گرمی ان بیجا تعریفوں کی تھی جنکی بھرمار
پنجاب سے شروع ہوئی یہاں تک کہ آج آپ اہل پنجاب کے بت بنے ہوئے ہیں

اور ہمارے صوبہ کے انگریزی خواں طبقہ میں بہت کچھ آؤ بھگت ہونے لگی ہے۔ آخر کار انجام کیا ہوا کہ آپنے عرفی۔ افلاطون اور حافظ کے سر پر پاؤں رکھدیا اور انہیں پاؤں سے روند کے مار ڈالنے پر تل گئے۔ مگر دنیا کب اس خون ناحق اس قتل عمد کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھ کے چپ بیٹھ سکتی ہے۔ اب اسکا فرض ہے کہ اپنے قابل احترام اُستادوں کو ان وحشیانہ حملوں سے پناہ دے۔ اور مجرم کو اُسکے کیفر کردار پر پہونچا کر دم لے۔

اقتباسات خطوط

"دو کاپیاں "پیام امید" کی پہونچیں۔ اسمیں شک نہیں کہ آپنے بہت بڑا کام اپنے سر لیا ہے۔ خدا کرے آپ اسمیں کامیاب ہوں۔ قوم کو آپکا مشکور ہونا چاہئے۔" جناب شیخ کرم حسین صاحب۔ رئیس ہرد وئی "خدا آپ کی ہمت میں برکت دے اور کوششیں بار آور ہوں۔ آمیں۔ میں کوشش کرونگی کہ جلدی اسکے لئے کچھ خریدار بہم پہونچاؤں۔" جنابہ مس عزیز الدین صاحب بنت عالیجناب خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب۔ مدار المہام ریاست دھولپور

عالیجناب حضرت مولانا کیفی صاحب قبلہ مد ظلہ۔ دکن کے مستند ادیب اور اہل قلم فرماتے ہیں۔ "رسالہ پیام امید نمبر ۱ موصول ہوا۔ امیدوں کا پیش خیمہ۔ اردو نثر کا پراز جواہر زندہ اہر سرچشمہ نظر افروز ہوا۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ۔ ترتیب مضامین۔ ہر اعتبار سے لائق ستائش و قابل نمائش ہے۔ میرے لائق جو خدمت بھی مجھ سے ہو سکتے ہیں . . . ."

"واقعی ایسے ہر دلعزیز پرچہ کی اردو لٹریچر کی ترقی کے لئے سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی آپنے اس صوبہ کے اردو لٹریچر پر بیحد احسان کیا ہے خداوندکریم آپ کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔"

مختار احمد صاحب صدیقی نائب تحصیلدار آگرہ

"مینے "پیام امید" کو دیکھا۔ دراصل ویسا ہی پایا جیسی کہ اسکی تعریف سنی تھی۔ امید ہے کہ اسکو ایسا ہی سرسبز اور شاداب ہمیشہ دیکھوں۔ جیسا کہ اب ہے۔" جنابہ بنت جناب احمد علی خانصاحب ڈپٹی مجسٹریٹ نہر بیتوا۔ جالون۔

"پیام امید" کے نمونہ کا پرچہ پہونچا۔ جس اہتمام سے آپنے اس رسالہ کو نکلنا شروع کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ خداوند تعالی آپ کی امداد فرمائے اور آپ کے مقصد میں کامیابی عطا کرے۔ آمین۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اس رسالہ کی اشاعت بڑھاکر آپ کی ہمت افزائی کرے" جنابہ ا۔ س۔ بیگم صاحبہ ذریعہ جناب مولوی سعید الدین صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد۔ لکھنؤ۔

اچانک آپکا گھر بار "پیام امید" موصول ہوا۔ جسے باوجود عدیم الفرصتی کے مینے شوق اور دلچسپی سے پڑھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دیکھکر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ کا میگزین عورت اور مرد دونوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ تاکہ آپ بغیر کسی بخل کے اپنی "پھولوں کی ٹوکری" دونوں کے نذر کرتی ہیں امید ہے کہ سب بہنیں اور بھائی ان پھولوں کی قدر کرینگے اور رسالہ کو خرید کر نہ صرف آپکی حوصلہ افزائی کرینگے بلکہ فرض سے سبکدوش ہونگے۔ ایسے

رسالجات بکثرت ملینگے جو مردوں اور عورتوں کے واسطے علحدہ علحدہ نکلتے ہوں۔ لیکن آپ کا امید۔ وں سے بھرا "پیام امید" اپنے قسم کا پہلا رسالہ ہے۔۔ ...... اور دونوں متفقہ طور پر اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔" جناب شیخ محمد بختیار صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وکیل ہائی کورٹ ہوشیارپور پنجاب۔

"پیام امید" ماہ اکتوبر ملا پڑھکر دل کو کمال درجہ خوشی حاصل ہوئی۔ ایسے پرچہ کی اسوقت ضرورت تھی خداوند تعالیٰ آپ کے کام میں برکت دے" شیخ ہی بخش منیجر وحصہ دار برف خانہ ملتان "آپ کے دو پرچے پہونچے۔ رسالہ بہت عمدہ اور مفید ہے۔ خدا اسکو مقبول خاص وعام کرے اور اشاعت بڑھائے"۔ بیگم صاحبہ جناب حافظ محمد اسحاق صاحب۔ سرپرست جنگی۔ بہاولپور "آپ کا پیام امید جب سے پڑھنا شروع کیا ہے دل بہت خوش رہا کرتا ہے۔ واقعی یہ پرچہ بہت عمدہ ہے"۔ بیگم صاحبہ جناب مولوی احمد حسین صاحب۔ نائب تحصیلدار۔ چوک۔ لکھنؤ۔

"رسالہ نہایت مفید چھپائی خوبصورت۔ مضامین پاکیزہ۔ زبان اعلیٰ درجہ کی اردو۔ خدا آپ کی کوششوں کو کامیاب کرے اور رسالہ کو مقبول عام"۔ بیگم صاحبہ جناب مولوی محمد امداد اللہ صاحب منصرم کچہری۔ مرادآباد۔

آپکا رسالہ "پیام امید" پہونچا۔ واقعی بہت اچھا ہے"۔ جناب سید تمیز علی صاحب۔ سب رجسٹرار امروہہ۔ "ستمبر اور اکتوبر کا "پیام امید" میری نظر سے گذرا آپ کی جانفشانی۔ اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کی داد دیتا ہوں۔ خدا آپکے رسالہ کو کامیاب کرے۔ اور اسکی عمر میں برکت دے۔ جناب محمد یسین صاحب انسپکٹر آبکاری۔ الہ آباد۔

ضوابط رسالہ

اس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہونگے۔ "پیامِ امید" تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا آلہ بننا چاہتا ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ اسکے مخاطب تمام روشن خیال مرد اور مستورات ہیں۔ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اصلی کام آج ہی سے شروع نہیں کرایا جا سکتا۔ ہمیں سب سے پہلے اتحاد پیدا کرنا ہے جبتک ہندو مسلمان اور شیعہ سنی آپسمیں لڑتے رہینگے۔ قوم اور ملک کی ترقی اصلی اور حقیقی معنوں میں بالکل ہی غیر ممکن ہے ہماری کوشش کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم (۱) مسلمان خریداران رسالہ سے تین روپیہ سال قیمت لینگے اور اردو خواں ہندو خواتین کو رسالہ مفت نذر کرینگے جہاں تک اور جس حد تک کہ ہماری اشاعت اس بار کی برداشت کرنے کی قوت ہمیں دے سکیگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم ہندو خواتین سے متفق الرائے ہو جائیں تو مردوں کے خیالات اتنے جلد پلٹا کھاجائینگے کہ دنیا کو حیرت ہوگی (۲) قومی اور ملکی ترقی کی پہلی منزل زبان کی ترقی ہے۔ ہم اردو علم ادب کی ترقی اور توسیع میں سعی بلیغ کرینگے اور وقتاً فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہیں گے تاکہ لایق مضمون نگاروں کو اچھے اور مفید مضامین لکھتے رہنے کی ترغیب اور تحریص ہو۔ رسالہ کی اشاعت بڑھنے پر ہم کوشش کرینگے کہ مفید علمی کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے ہماری زبان میں کئے جائیں اور مناسب قیمت پر فروخت ہوں (۳) ایسے بچے جو کافی طور پر علمی ترقی کر چکے ہیں اور ہر اہم مسئلہ پر ایک خاص رائے قائم کرنے کے متلاشی ہیں انہیں ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں خارجی مدد پہنچانے کی سخت ضرورت پیش آ[illegible] ت نازک زمانہ ہے۔ اگر وہ کسی اہم مسئلہ پر کوئی غلط رائے قائم کر[illegible] ن کے دماغوں میں نشو و نما پاکر وہ غلط رائے جم جائیگی توان کی سار[illegible] سے بھی زیادہ ہوگی ہم انہیں ایسی خارجی مدد عین وقت پر پہنچائینگے تاکہ ہر[illegible] ین حصہ لینے کی صلاحیت رکھیں۔

7/8/
15/
30/

رسالہ

اشتہارات

توسیع اشاعت رسالہ کے ساتھ اجرت اشتہارات میں تخفیف ہوئی ہے۔ موجودہ نرخ حسب ذیل ہے مگر اسمیں کمی ممکن نہیں ہے۔ اور نہ مزید تخفیف کے لئے مراسلت ہونے پر کوئی جواب دیا جائیگا۔

اندازِ صفحہ	ایکبار	سہ ماہی	ششماہی	[illegible]
چوتھائی صفحہ	1/	2/8/	4/8/	
نصف صفحہ	2/	5/	9/	
پورا صفحہ	4/	10/	18/	

رقوم مندرجہ بالا پیشگی واجب الادا ہیں اور پیشگی وصول ہونا چاہئے۔ مینیجر

شیکسپیر اُردو نظم میں



محمود۔ شیریں میری پیاری رشک گلزار — ہے ہے تمھیں کیا ہوا ہے آزار
کیوں خشک یہ لب ہیں نکھڑی سے — کمھلائے ہیں کیوں یہ گل سے رخسار
شیریں۔ پانی کی کمی کے ہیں یہ آثار — کمھلانا نہیں کچھ اِن کا دشوار
ہے چشمۂ چشم دیر سے بند — اشکوں کی نہیں ہوئی ہے بھرمار

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف نہ آئے تو ہمارا ذمہ۔ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جسے اظہر علی صاحب آزاد ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) نے اصل کتاب "مڈسمر نائیٹس ڈریم" سے لکھنؤ کی شستہ زبان اور گلزار نسیم کی بحر میں کیا ہے۔ یہ وہی ترجمہ ہے جس نے ہندوستان سے لندن تک شہرت پائی ہے۔ جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ اب جدید اشاعت خاص اہتمام سے نفیس کاغذ پر معہ مؤلف کی ہاف ٹون تصویر کے زیر طبع ہے۔ جو صاحب اشاعت سے پہلے اپنا نام درج رجسٹر کرا لینگے انہیں رعایتی قیمت پر کتاب مل سکیگی۔

حجم تخمیناً ۲۰۰ صفحہ — قیمت اصلی ع۸ر — رعایتی عہ ر
ایضاً معمولی سفید کاغذ پر بلا تصویر — اصلی قیمت عہ ر — رعایتی ۱۲ار
رسالہ ر

انسپکٹر آ؟ کا پتہ۔ دفتر رسالہ "پیام اُمید" ایٹہ۔ یو۔ پی

اُمید کا پیام ــــ" اُٹھو ــــ اُٹھو ــــ اور آگے بڑھو!"

اُمید پیام

نمبر ۹	ایٹہ - مئی ۱۹۱۶ء	جلد ۲

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح" پیام اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں ہے

عرض حال

معزز بہن حسن آرا بیگم ہمارے ناظرین کرام کو بتا چکی ہیں کہ کن مجبوریوں کی وجہ سے اکثر مضمون نگار صاحبوں کے مضامین شائع کرنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ آج ہمیں یہہ بتانا ہے کہ کتابوں رسالوں اور اخباروں پر ریویو کرنے میں ہمیں کیا کیا دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ ہمیں خوف ہے کہ ہمارا طرز عمل غلط فہمیوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ اس امر کے متعلق اپنے خیالات اور اپنی پالیسی کا اعلان کر دیں۔

ہم سچے دل سے اپنے تمام ہمعصروں کے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں اور سوا

بہی خواہی کے وہ ہم سے کبھی کسی حال میں بدخواہی کی اُمید نہ رکھیں۔اسی طرح مصنّفوں اور مولّفوں کے بدخواہ ہونے کی بھی ہمیں کوئی وجہ نہیں ہے۔

اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر عموماً اپنی کریم النفسی سے ہر تالیف اور تصنیف پر "ایک اچھا ساریویو" دینے کے لئے ہر وقت طیار رہتے ہیں۔اِسمیں شک نہیں کہ دنیا میں ہر شخص کے ساتھ بھلائی کرنا اور کسی کی بُرائی نہ چاہنا بہت بڑی نیکی اور بڑی بزرگی ہے۔مگر اسی کے ساتھ ہی ہمیں یہہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پبلک کے ساتھ ہمارے کیا فرائض ہیں۔اور ہمارے علم ادب کے ساتھ ہمارے کیا کیا فرائض ہیں۔ہر اخبار اور رسالہ کا اڈیٹر پبلک کا نمایندہ ہے۔ملک کا سچّا بہی خواہ سچّا خادم اور سچّا فرزند ہے۔علم ادب کا حامی اور ترقی خواہ ہے۔اور ہر ہر مسئلہ پر غور کرتے وقت سب سے پہلا سوال جو اُسکے پیش نظر رہنا چاہئے یہہ ہے کہ "آیا یہہ بات ملک کے لئے مفید ہوسکتی ہے یا مضر؟" اگر ہم اس نقطۂ خیال سے نظر ڈالینگے تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے اخباروں اور رسالوں کے معزز اڈیٹروں کی کریم النفسی کی قیمت کتنی سخت ہے۔

پبلک کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر کتاب خریدنے سے پہلے اُسے اوّل سے آخر تک پڑھ لے تب اُسے خرید کرے۔یہہ بات کسی طرح ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔بفرض محال اگر ممکن بھی ہو تو ہر شخص مذاق صحیح نہیں رکھتا کہ پڑھنے پر بھی وہ صحیح اندازہ کرسکے کہ کس کتاب کا کتنا حصّہ کس حد تک قابل پسند ہے۔اور کتنا حصّہ اعلےٰ معیار سے گرا ہوا ہے۔آپ ملک کے نمایندے ہیں۔یہہ

کام آپکا ہے۔ ملک نے آپ کے اخبار یا رسالہ کی توسیع اشاعت میں مدد دیکر آپکو اپنے دفتر محاسبہ کا نگراں بنا دیا ہے۔ آپکا یہی کام آپکا یہی فرض ہے۔ آپ ہر کتاب کو جو آپ کی راہ میں آجائے اول سے آخر تک مطالعہ فرمائیے اور ملک کو بتائیے کہ یہہ کتاب کس پایہ کی ہے۔

کاش اب سے دس بیس برس پہلے سے ہمارے معزز ایڈیٹر ایسا کر رہے ہوتے تو آج ملک میں یہہ ہر بونگ یہہ طوفان بے تمیزی برپا نہوا ہوتا۔ ہمارے ماد شما میں سے ہر شخص جسکا جی چاہتا ہے بےخوف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سادہ کاغذ کے کچھ اوراق سیاہ کر کے چھپوا لیتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں ریویو کے لئے بھیجدیتا ہے اور "ایک اچھا سا ریویو" حاصل کر لیتا ہے۔ اور آخر کار یہہ انجام ہوتا ہے کہ نہ صرف بے مقصد لغو اور مہمل بکواس ہی "کتاب" کے لفظ کی توہین کر کے دنیا کے سامنے پیش ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات گندہ اور مخرب اخلاق قصے کہانیاں "ناول" کے نام سے شائع ہو جاتی ہیں اور ہماری بازاروں سڑکوں شاہراہوں اور گلی کوچوں میں چکر کھاتی نظر آتی ہیں۔

کاش ہمارے ایڈیٹروں نے کتاب کے شائع ہوتے ہی اُسکے متعلق ایک مختصر سا نوٹ شائع کر کے پبلک کو بتا دیا ہوتا کہ اس نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے وہ تمہارے کام کی نہیں ہے تو وہ کتاب کبھی اتنی کامیاب نہوئی ہوتی جتنی دوسری حالت میں وہ ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ بہت سی کتابیں صرف نام ہی پر بکتی ہیں۔ کسی چلتے ہوئے مصنف نے ایک کتاب کا اچھا نام رکھ دیا وہ دلکش نام ہی اِس کتاب کے ہاتھوں ہاتھ نکل جانیکا باعث

ہوجاتا ہے۔ کتب فروش کی دوکان یا ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سیکڑوں
کتابوں کے انبار میں سے دوچار نئی کتابوں کا منتخب کرلینا آسان نہیں ہے
دوچار منٹ کے اندر کون شخص دیکھ سکتا ہے کہ اِس کتاب کے اندر کیا کیا بھرا
ہے! فطرت انسانی ہمیشہ جدّت کی متلاشی رہتی ہے۔ جدید لذیذ کا ترنم خیز نغمہ
ہر کان کو سُریلا اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ انجام کیا ہوتا ہے؟ ننانوے فیصد
کتابوں کا انتخاب اُنکے دلچسپ اور دلپسند نام ہی کی بدولت ہوجاتا ہے۔

جس طرح اچھی اچھی کتابوں کا رواج ملک کی ترقی کے لئے میدان صاف
کرتا ہے اسی طرح بُری اور مہمل اور مخرب اخلاق کتابیں ملکی ترقی کی سد راہ ہوتی
ہیں۔ یہہ کیونکر؟ بات بہت صاف ہے اچھی کتابوں کے پڑھنے سے ہزاروں
فائدے ہیں۔ انہیں سے سب سے بڑا فائدہ یہہ ہے کہ پڑھنے والوں کو مختلف
ضروری مضامین پر باقاعدہ غور کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ اور وہ مادہ ایک
نئی بات پیدا کرنے کا جو ایجاد و اختراع کا تخم ہے پڑھنے والے کے دل
میں بویا جاتا ہے۔ برعکس اسکے مہمل بکواس کے پڑھنے سے وقت کا ضائع ہونا
تو در کنار پڑھنے والے کی عادت بگڑتی ہے۔ دوچار دس بیس ایسی کتابیں پڑھ
لینے کے بعد وہ اس قابل باقی نہیں رہتا کہ ایسی تالیف یا تصنیف پڑھ سکے
جسمیں دماغ صرف کیا گیا ہو یا جسکے مطالعہ میں خود پڑھنے والے کو دماغ صرف
کرنے کی ضرورت پڑتی ہو۔

بیشک کسی کا بدخواہ ہونا ایک بہائمی صفت ہے۔ بغض اور کینہ شرافت
سے بعید ہے بلکہ سچ پوچھو تو کفر اسی کا نام ہے۔ اور اسلام نے بھی ایسی

تعلیم دی ہے۔ مگر ہمیں بغض و کینہ و عداوت سے کیا سروکار ہے! یہاں سوال تو صرف یہہ ہے کہ دو فریق آپکے سامنے آتے ہیں: (۱) مولف یا مصنف (۲) پبلک۔ دونوں کے مقاصد ایکدوسرے کے برعکس ہیں۔ ایک ناقص خراب اور مہمل کتاب کے مولف یا مصنف کا فائدہ اسمیں ہے کہ اسکی کتاب خوب بکے۔ پبلک کا فائدہ اسمیں ہے کہ ایسی کتاب اُس سے دور ہی دور رہے۔ پھر بتائیے آپ کیا کرینگے؟ آیا آپ پبلک کا ساتھ دینا پسند کرینگے جسنے آپکو اپنا نمایندہ بنا کے بٹھا دیا ہے۔ یا اس مولف یا مصنف کا؟ بعض کتابیں تو ایسی ایسی نظر آئی ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو اُنکے مصنفوں اور چھاپنے اور شائع کرنیوالوں میں سے ہر ایک کو یکقلم پھانسی دیدوں۔ مثال کے طور پر آج ایک ہی نام بتاتی ہوں۔ "بنگالی مینا"، یہہ کتاب ریل کے اسٹیشنوں اور کتب فروشوں کی دوکان پہ ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ کیوں؟ محض اسوجہ سے کہ نام بہت ہی پیارا پایا ہے۔ اور یہہ نام ہی اِس زور و شور کی بکری کا باعث ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر کتابوں کے ایک بڑے انبار میں سے اسے چھانٹ لینے کی گنہگار میں بھی ہوں مگر دو چار ورق پڑھ کر چاک کر رہی تھی کہ آزاد صاحب نے میرے ہاتھ سے چھین کر اسکی جان بچائی۔ اور آج میری مخرب اخلاق کتابوں کی فہرست میں یہہ کتاب اول نمبر پر ہے۔ جاہل مصنف نے جس طرح "ناول" کے لفظ کی مٹی پلید کی ہے اُس سے خدا ہی سمجھے۔ اور اس لچر تصنیف کے ذریعہ سے اُسنے کیا تعلیم دی ہے؟ اِس پایہ کا آدمی سوا اسکے اور کیا تعلیم دے سکتا ہے! اِس کتاب کے پڑھنے والے کو صرف تین ہی سبق مِل سکتے ہیں

کہ اپریل نمبر کے بعد مارچ نمبر کی اشاعت ہو رہی ہے۔ آخر ہمنے ریلوے کمپنی کو نوٹس دے دیا کہ مارچ نمبر کے گم کر دینے کی علت میں ہم کمپنی پر دو ہزار روپیہ ہرجہ نقصان کا دعویٰ عدالت دیوانی میں کرینگے۔ اور عدالت سے معہ خرچہ ڈگری لینگے۔ ہمارے پہلے معروضات پر کمپنی نے توجہ نہیں فرمائی تھی۔ مگر اس نوٹس دینے کے بعد اب ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے مارچ نمبر کا پارسل کاسگنج اسٹیشن پر آگیا ہے۔ منگوا لیا جائے۔ چنانچہ ہم اُسے ناظرین کرام کی خدمت میں بلا تاخیر روانہ کرا رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ معزز ناظرین ہمیں بے قصور سمجھ کر معاف فرمائینگے۔

لاہور
۲۰ مئی ۱۹۱۶ء

آزاد بیگم
ایڈیٹر

دنیا کی سب سے بڑی علمی تالیف

یہہ کتاب جیسی علم ادب کی انسائیکلوپیڈیا تھی۔ یعنی ایسی لغت جسمیں مختلف علوم و فنوں کے ہر ہر شعبہ مثلاً انجینری۔ جہازرانی۔ علم نباتات۔ علم حیوانات۔ علم معدنیات۔ علم طب۔ فلسفہ وغیرہ وغیرہ کے تمام الفاظ کی پوری پوری ماہیت ظاہر کی گئی تھی۔ بلکہ ساتھ ہی اسکے تمام مشہور مقامات کے تاریخی حالات۔ تمام مشہور علماء و فضلاے ایام ماضی و حال کی پُر مغز سوانح عمریاں۔ ہر علم و فن کے متعلق ہر ہر لفظ کی مکمل تاریخ اور تحقیقات درج تھی یہہ تالیف

گیارہ ہزار ایکسو جلدوں پر منقسم تھی مگر شامت اعمال سے سنہ ۱۹۰۰ء میں باکسر فرقہ کی بغاوت کے زمانہ میں یہہ بیش بہا تالیف ضائع ہوگئی۔ باغیوں نے ہان لن کالج کی عمارت میں آگ لگادی اور اسوجہ سے اس تالیف کا بہت بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ دو جلدیں اِس ذخیم تالیف کی حال میں دستیاب ہوئی ہیں اور لندن کے کتبخانہ میں محفوظ ہیں۔ ان دو جلدوں کے متعلق ضروری حالات رسالہ "لائبریری مسلینی" لندن نے شائع کئے ہیں چند جلدیں اِس ضخیم تالیف کی منہدم شدہ عمارت سے برآمد ہوئیں اور ملک چین میں موجود ہیں اِن جلدوں سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہہ کتاب کس پایہ کی تھی مگر اس عظیم نقصان کی تلافی غیر ممکن ہے۔ رسالہ "لائبریری مسلینی" نے اِس تالیف کے تواریخی حالات یوں لکھے ہیں۔

سنہ ۱۴۰۳ء میں خاندان منگ کے تیسرے شاہنشاہ ینگ لو نے ارادہ کیا کہ وہ ایک ایسی کتاب تالیف کرائے جسمیں ساری دنیا کے معلومہ علوم اور فنون کے متعلق مکمل معلومات موجود ہوں۔ اس ارادہ کی تکمیل کی غرض سے اُسنے اپنے زمانہ کے بہترین ادیب اور فاضل ہسیہ چن کو طلب کرکے یہہ اہم ذمہ داری اُسکے سپرد کی۔ ہسیہ چن نے جب اِس کام کو شروع کیا تو اُس کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہوکر اس مشقت میں کاندھا دینے والے ایکسو چھیالیس ۱۴۶ زبردست چینی علماء تھے۔ اور اِن لوگوں نے ایکسال اور چار مہینہ کی مدت میں یہہ کام ختم کردیا۔ اس تالیف کا نام "دِن ہسین تاچنگ" رکھا گیا جسکا لفظی ترجمہ "علمی معلومات

کا مکمل ذخیرہ" ہے۔ مگر جب کتاب شاہنشاہ کے حضور میں باریاب ہوئی تو معلوم ہوا کہ جس پایہ کی مکمل اور ہر ہر شعبہ کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالنے والی تالیف کا مہیا کیا جانا مدنظر تھا وہ بات ابھی حاصل نہیں ہوئی جب اس مختصر ذخیرہ معلومات سے شاہی تشنگی رفع نہ ہوسکی تو ایک جدید شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جسمیں مشہور ادیب ہسن جین بھی منجملہ اُن کمشنروں کے تھا جنکے سپرد یہ اہم خدمت کی گئی تھی۔ اور حکم دیا گیا کہ اِس مرتبہ ایک نہایت ہی مکمل کتاب تالیف کیجائے جسمیں تاریخ امروزہ تک کی تمام علمی تحقیقاتوں اور معلومات پر روشنی پڑسکے۔ اِن تین کمشنروں کے ساتھ کام کرنے کے لئے پانچ ڈائرکٹر مقرر کئے گئے۔ اور بیس نائب ڈائرکٹر جنکی ماتحتی میں کام کرنے کے لئے ۱۴۱۲ مشہور اور مستند علماء، ادیب اور اہل قلم تھے مجموعی تعداد اُن تمام اشخاص کی جو اِس دماغی مشقت میں مصروف تھے ۲۱۱۶۴ تھی۔ یہ علماء کی شاندار فوج چار سال برابر اِس محنت شاقہ میں دن رات مصروف رہی۔ اور اِس مدت کے ختم ہونے پر انھوں نے اپنے افکار اور مشقت کا ثمر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ جو خلعت قبولیت سے مشرف ہوا۔ یہ کتاب ۱۱۱۰۰ جلدوں اور ۲۲۸۷۷ مدات پر منقسم تھی۔ انکے علاوہ فہرست مضامین کی ۶۲ مدات تھیں۔ ان جلدوں میں سے ہر جلد نصف انچ موٹی تھی اور تمام جلدیں نیچے اوپر رکھے جانے پر سطح زمین سے ۴۵۰ فٹ یعنی ۱۵۰ گز اونچی ہوتی تھیں۔ یا دوسرے الفاظ میں اُنکی اونچائی لندن کے مشہور گرجا گھر سینٹ پال کینڈرل سے بھی زیادہ بلند ہوتی تھی۔ مگر ہمارے معزز ناظرین میں سے بہت کم حضرات کو سینٹ پال

کے مشہور گرجا گھر کے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا اور اِسوجہ سے وہ عموماً اس کتاب کے
حجم کا اندازہ لگا سکینگے اس خیال سے ہم ایسی بات لکھتے ہیں جسے چھوٹے
بڑے سب آسانی سے سمجھ لیں۔ چونکہ ان جلدوں میں سے ہر ایک ایک فٹ
آٹھ انچ لمبی اور ایک فٹ چوڑی تھی لہذا اگر اس کتاب کی سب جلدیں ایکدوسرے
سے ملا کر اِسطور سے سڑک پر بچھا دیجائیں کہ سڑک پر چلتے وقت ہر کتاب کی لمبائی
تو ہمارے داہنے بائیں ہوجاتی اور ہمارے پاؤں تلے چوڑائی ہی چوڑائی آتی
تو یہہ سب جلدیں دو میل پون فرلانگ تک برابر بچھ جائیں) ان کتابوں کی
جلد بندی موٹے کاغذ کی دفتی سے کی گئی تھی جسپر زرد ریشمی کپڑا چڑھایا گیا تھا
جو شاہی رنگ تھا۔ ہر جلد پر دو پرچے چسپاں کئے گئے تھے پہلے پرچہ پر عنوان
اور نمبر شعبہ جات مندرجہ ذیل درج تھے۔ دوسرے پرچہ پر ہنگ دو چنگ ین
کی تقلید میں ایک نظم تھی۔ یہہ ایک منظوم فرہنگ تھی جو خاندان منگ کے
دور حکومت میں رائج ہوئی تھی جسکے ذریعہ سے فہرست مضامین طیار کیجاتی تھی۔
یہہ عجیب طریقہ فہرست مضامین طیار کرنے کا اسوجہہ سے اختیار کرنا پڑتا تھا کہ
چینی زبان میں الف بے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی زبان کی انسائیکلو پیڈیا
اور لغات وغیرہ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ کیونکہ جب اُس
زبان میں حروف تہجی ہی نہیں تو اُنکے اعتبار پر ترتیب کیونکر ہو؟ (بقول سعدی
جامہ ندارم دامن از کجا آرم) ہمارے ناظرین دیکھینگے کہ اس خصوصیت میں چینی
زبان انگریزی۔ اردو ہندی اور دنیا کی اور زبانوں سے کسدرجہ مختلف ہے! اِس
کمی کی وجہہ سے چینی علماء ترتیب مضامین کے لئے مختلف طریقے ایجاد کرنے پر

کا مکمل ذخیرہ'' ہے۔ مگر جب کتاب شاہنشاہ کے حضور میں باریاب ہوئی تو معلوم ہوا کہ جس پایہ کی مکمل اور ہر ہر شعبہ کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالنے والی تالیف کا مہیا کیا جانا مدنظر تھا وہ بات ابھی حاصل نہیں ہوئی جب اس مختصر ذخیرہ معلومات سے شاہی تشنگی رفع نہ ہو سکی تو ایک جدید شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جسمیں مشہور ادیب ہسن جن بھی منجملہ اُن کمشنروں کے تھا جنکے سپرد یہ اہم خدمت کی گئی تھی۔ اور حکم دیا گیا کہ اس مرتبہ ایک نہایت ہی مکمل کتاب تالیف کیجائے جسمیں تاریخ امروزہ تک کی تمام علمی تحقیقاتوں اور معلومات پر روشنی پڑ سکے۔ اِن تین کمشنروں کے ساتھ کام کرنے کے لئے پانچ ڈائرکٹر مقرر کئے گئے۔ اور بیس نائب ڈائرکٹر جنکی ماتحتی میں کام کرنے کے لئے ۲۱۴۱ مشہور اور مستند علماء ادیب اور اہل قلم تھے مجموعی تعداد اُن تمام اشخاص کی جو اِس دماغی مشقت میں مصروف تھے ۲۱۶۹ تھی۔ یہ علماء کی شاندار فوج چار سال برابر اس محنت شاقہ میں دن رات مصروف رہی۔ اور اس مدت کے ختم ہونے پر انھوں نے اپنے افکار اور مشقت کا ثمر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ جو خلعت قبولیت سے مشرف ہوا۔ یہ کتاب ۱۱۱۰۰ جلدوں اور ۲۲۸۷۷ مدات پر منقسم تھی۔ انکے علاوہ فہرست مضامین کی ۶۰ مدات تھیں۔ ان جلدوں میں سے ہر جلد نصف انچ موٹی تھی اور تمام جلدیں تلے اوپر رکھے جانے پر سطح زمین سے ۴۵۰ فٹ یعنی ۱۵۰ گز اونچی ہوتی تھیں۔ یا دوسرے الفاظ میں انکی اونچائی لندن کے مشہور گرجا گھر سینٹ پال کتھیڈرل سے بھی زیادہ بلند ہوتی تھی (مگر ہمارے معزز ناظرین میں سے بہت کم حضرات کو سینٹ پال

کے مشہور گرجا گھر کے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا اور اِسوجہ سے وہ عموماً اس کتاب کے حجم کا اندازہ نفرما سکینگے اس خیال سے ہم ایسی بات لکھتے ہیں جسے چھوٹے بڑے سب آسانی سے سمجھ لیں۔ چونکہ اِن جلدوں میں سے ہر ایک ایک فٹ آٹھ انچ لمبی اور ایک فٹ چوڑی تھی لہذا اگر اس کتاب کی سب جلدیں ایکدوسرے سے ملاکر اسطورسے سڑک پر بچھا دیجائیں کہ سڑک پر چلتے وقت ہر کتاب کی لمبائی تو ہمارے داہنے بائیں ہوجاتی اور ہمارے پاؤں تلے چوڑائی ہی چوڑائی آتی تو یہہ سب جلدیں دومیل پون فرلانگ تک برابر بچھ جاتیں) اِن کتابوں کی جلدبندی موٹے کاغذ کی دفتی سے کی گئی تھی جسپر زرد ریشمی کپڑا چڑھایا گیا تھا جو شاہی رنگ تھا۔ ہر جلد پر دو پرچے چسپاں کئے گئے تھے پہلے پرچہ پر عنوان اور نمبر شعبہ جات مندرجہ ذیل درج تھے۔ دوسرے پرچہ پر ہنگ دوچنگ ین کی اقلید میں ایک نظم تھی۔ یہہ ایک منظوم فرہنگ تھی جو خاندان منگ کے دورحکومت میں رائج ہوئی تھی جسکے ذریعہ سے فہرست مضامین طیار کیجاتی تھی۔ یہہ عجیب طریقہ فہرست مضامین طیار کرنے کا اسوجہ سے اختیار کرنا پڑتا تھا کہ چینی زبان میں الف بے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی زبان کی انسائیکلوپیڈیا اور لغات وغیرہ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ کیونکہ جب اُس زبان میں حروف تہجی ہی نہیں تو اُنکے اعتبار پر ترتیب کیونکر ہو (بقول سعدی جامہ ندارم دامن از کجا آرم) ہمارے ناظرین دیکھینگے کہ اس خصوصیت میں چینی زبان انگریزی۔ اردو ہندی اور دنیا کی اور زبانوں سے کسدرجہ مختلف ہے! اِس کمی کی وجہہ سے چینی علماء ترتیب مضامین کے لئے مختلف طریقے ایجاد کرنے پر

مجبور ہوگئے جن کے ذریعہ سے ترتیب مضامین اس عنوان سے کیجائے کہ مضامین مطلوبہ کا تلاش کرلینا آسانی سے ممکن ہوسکے۔ اور ان مختلف طریقوں میں سے ایک وہی طریقہ ہے جو بنگ لو کی انسائیکلوپیڈیا میں اختیار کیا گیا ہے منجملہ ان مختلف طریقوں کے ایک اور طریق یہ بھی ہے کہ تمام ایسے الفاظ جنکے پہلے حصے آواز میں یکساں ہیں یکجا کر دئے جائیں۔ مثلاً ایسے الفاظ جیسے ساکن۔ ثابت صائب۔ صابون۔ صابر۔ سارا۔ سادہ۔ ساحر۔ ان الفاظ میں پہلا حصہ چاہے املاء میں جتنا مختلف ہو مگر آواز کے اعتبار سے یکساں ہے۔ مثلاً۔ سا۔ ثا۔ صا۔ آواز میں یکساں ہیں۔ چینیوں نے اپنی لغات اسی ترتیب سے لکھی ہیں۔ چینی تالیف کی آتشزدگی سے برباد ہونے کے وقت انگلستان کی مشہور ترین تالیف انسائیکلوپیڈیا برطانیکا کی جو اشاعت رائج الوقت تھی اسکی تعداد صفحات بائیس ہزار تھی۔ اسکے مقابلہ میں چینی تالیف کی تعداد صفحات ۹۱۷۴۸۰ ہے چینی تالیف کا ہر صفحہ ۱۶ کالم پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر کالم میں الفاظ کا اوسط ۲۵ تھا جسکے حساب سے کل تالیف کی الفاظ کی میزان ۳۶۶۹۹۲۰۰۰ ہوتی ہے چینی زبان کا طرز تحریر اسقدر عجیب ہے کہ ہر حرف بجائے خود ایک لفظ کا قایم مقام سمجھا جاتا ہے۔ اور پورے لفظ کی آواز پیدا کرتا ہے۔ ایک مستند عالم تخمینہ کرتا ہے کہ چینی زبان کے ۱۰۰ ایسے حروف انگریزی زبان کے ۱۳۰ الفاظ کے قایم مقام یا متقابل سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے اوپر جو تخمینہ میں تالیف کے الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے اسے دراصل چالیس کرور الفاظ سمجھنا چاہئے۔ اسکے مقابلہ میں مسٹر گانس نے انگلستان کی تالیف یعنی انسائیکلوپیڈیا یا برطانیکا کی جس اشاعت سے کیا

ہے اسکے الفاظ کی میزان صرف تین کرور آٹھ لاکھ ہی ہے اگر محض اسی مقابلہ سے
ہمارے ناظرین کو اس عجیب وغریب تالیف کی وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۴۱۰ء میں راے قرار پائی کہ یہہ تالیف چھپوا دیجائے اور شاہی حکم بھی
جاری ہوگیا۔ مگر آخر میں معلوم ہوا کہ چھپائی کا خرچ حد سے زیادہ ہوگا۔ اسوجہ سے
اس کام کے ہاتھ میں لینے کا ارادہ نہیں کیا گیا۔ ۱۴۲۱ء میں جب شاہنشاہ چین
نے اپنی دار الخلافت نین کنگ سے پیکنگ میں منتقل کی تو انسائیکلوپیڈیا بھی پیکنگ
میں لائی گئی۔ اور شاہی محل میں رکھی گئی۔ ۱۵۶۲ء میں ایک سو علما کی جماعت اس
کام پر مامور کی گئی کہ اس تالیف کی دو نقلیں اور طیار کرائیں۔ یہہ نقلیں ۱۵۶۷ء
میں طیار ہوئیں۔ اسکے بعد اصل تالیف نین کنگ میں واپس بھیجدی گئی۔ اور
وہ نقلوں میں سے ایک پیکنگ کے شاہی محل میں رکھی گئی جو "دفتر علم تواریخ"
کے نام سے ملقب تھا۔ ۱۶۴۴ء میں جب خاندان منگ کی سلطنت کا آفتاب
غروب ہوا اسوقت اصلی تالیف موجودہ نین کنگ اور نقل موجودہ دفتر علم تواریخ
دونوں آتشزدگی کے نذر ہوگئیں اور صرف وہی نقل باقی رہگئی جو پیکنگ کے شاہی
محل میں موجود تھی۔ یہہ نقل شاہی محل سے ہین لن کالج میں بھیجدی گئی اور وہیں رہی
حتی کہ فرقہ باکسر کی بغاوت کے وقت یہہ بھی آگ میں جل گئی۔ آتشزدگی کے بعد
تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس تالیف کے ۲۴۲۲ مجلدات یا قریب ایکہزار جلدوں
کے تلف ہوگئی ہیں۔

تمام تفصیل اس تالیف کی بابت شاہی فہرست کتب میں درج تھی۔ مگر اعداد
اسقدر حیرت انگیز تھے کہ یورپین دماغ انکی صحت تسلیم کر لینے کے لئے مشکل ہے

آمادہ ہو سکتا تھا۔ اور بہت سے یورپین لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہینگ لو کی انسائیکلوپیڈیا ایک عنقا ہے جیکے بہت سے افسانے مشہور ہیں مگر عالم وجود میں جسکا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ گورنمنٹ چین نے کبھی کوشش نہیں کی کہ یورپین حضرات کے ان شبہات اور خیالات کی تردید کرے۔ ان یورپین لوگوں میں سے بہتوں نے بارہا کوشش کی کہ ہنیہ ہین لن کالج میں جاکر اس عجیب و غریب تالیف کے بچشم خود دیکھ لینے کا موقع دیا جاوے۔ مگر گورنمنٹ چین نے "غیر ملکی شیاطین" کو اس کالج میں قدم رکھنے کا کبھی موقع نہیں دیا۔

ہمیں امیر مینائی اور داغ دہلوی کی ناتمام اور نامکمل لغات پر بڑا ناز ہے مگر ہمنے کبھی غور نہیں کیا کہ دنیا کی بہترین علمی لغات کے مقابلہ میں ان نامکمل اور ناتمام تالیفات کا کیا پایہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی ایک تنفس چاہے وہ کیسا ہی بلند پایہ کیوں نہو ہمیں ایک مکمل ذخیرہ معلومات فراہم کر دینے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا۔ گردوپیش کی دنیا ترقی کر رہی ہے اور ہمیں بھی اسی کے ساتھ ساتھ ترقی کر کے ترقی کرنے والی اقوام سے دوش بدوش ہو کر کھڑے ہونا ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم زندہ رہیں اور فنا نہو جائیں۔ ہمنے مانا کہ داغ اور امیر ہمارے بہترین ادیب تھے اور اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر اسکے آگے چلئے۔ آپ ایک ادیب سے کیا اُمید رکھ سکتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ اسیقدر کہ وہ آپکو ادب کے متعلق ایک مکمل ذخیرہ معلومات کا بہم پہنچا دیگا مگر صرف اتنا ہی ہمارے معلومات کی تشنگی کے رفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ مثلاً انجینیری۔ جہاندانی۔ طب۔ جراحی۔ علم نباتات۔ علم معدنیات۔ علم کیمیا۔

علم فزیکل سائنس - علم ہئیت و نجوم وغیرہ وغیرہ کے متعلق جن اہم اور ناقابل فروگذاشت معلومات بہم پہونچانے کی ضرورت ہے وہ کہاں سے آئینگی! یہہ کام ایک آدمی کا نہیں ہے۔ سارے ملک کے بہترین دماغوں کی یکجائی سے ایسے کام ہوے ہیں جہاں کہیں ہوے ہیں۔ انگلستان میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا اسی طرح بنی۔ چین میں چینی انسائیکلوپیڈیا اسی طرح بنائی گئی۔ مگر ہمیں یہہ بھی نہیں معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں ہر ہر فن اور شعبہ علم میں معلومات کا مکمل ذخیرہ بہم پہونچانے والے مل بھی سکینگے یا نہیں۔ پہلا سوال تو یہی ہے۔

ایڈیٹر

ہماری بے عذر خادمہ برق

گذشتہ اشاعت سے آگے

دوسرا اصول جس پر بجلی کی دیگر مختلف النوع خدمات کا انحصار ہے وہ یہہ ہے کہ جب برقی رو کسی باریک دھات کی راہ سے گذرتی ہے تو اسکی روانی میں ایک قسم کی رکاوٹ پیش آتی ہے اور وہ تار انگارہ کی طرح گرم ہوجاتا ہے۔ بجلی کے لیمپوں میں یہی اصول کام کرتا ہے۔ شیشے کے چھوٹے سے گلوب کے اندر کی ہوا خارج کردیجاتی ہے اور اسمیں باریک تار لگایا جاتا ہے جس کے سرے بند گلوب سے باہر لائے جاتے ہیں۔ اب اگر اس تار میں سے ہوکر برقی رو رواں ہوتی ہے تو یہہ تار گرم ہوکر خوب روشنی دیتا ہے اور چونکہ

اِسکے گرد ہوا بہت کم ہوتی ہے اِسلئے اسکے جلنے سے اسکے اوپر زنگ لگنے کا بہت کم امکان ہوتا ہے۔ اِسی کو برقی لمپ Incandescent Glow lamp کہتے ہیں۔ برقی لمپوں کی روشنی کی ایک مقررہ میعاد ہوتی ہے جسے لمپ کی عمر کہتے ہیں کیونکہ ایک عرصہ کے بعد گرمی اور اِس تھوڑی ہوا کے اثر سے جو گلوب کے اندر رہجاتی ہے تار ناکارہ ہوجاتا ہے۔ برقی لمپوں کی ایکدوسری قسم کو آرک لمپ (Arc lamps) کہتے ہیں۔ اور یہہ بہت بڑے کمروں کی روشنی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر (جہاں گیس کے جالی دار لمپ استعمال نہیں ہوتے۔ اسی قسم کے برقی لمپ ہوتے ہیں۔ اِن میں برقی رَو کاربن یعنی خالص کوئلہ کے دو سلاخوں کے درمیان گذاری جاتی ہے اور اسکے گذرنے سے کاربن کے بخارات گرم ہوکر بہت تیز روشنی دیتے ہیں۔

بجلی کی مدد اور تاروں کے ذریعہ سے گرمی پیدا کرنے کا جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی بے شمار اور عملی مثالیں ہیں جو گھر کے کاموں کے لئے بہت مفید ہوتی ہیں۔ مثلاً بجلی کے مدد سے کھانا پکانے کا یہی اصول ہے کہ ایک برتن کے اندر تاروں کا جال پھیلا دیا جاتا ہے اِس طرح پر کہ برقی رَو کے گذرنے سے وہ تار گرم ہوجاتے ہیں۔ اب اگر اِس برتن کی سطح پر جس کے اندر برقی رو سے تار گرم ہو رہے ہیں کوئی اور کھانا پکانے کا برتن رکھدیا جائے تو اسپر وہی اثر ہوگا جو کہ چولھے کے اوپر رکھنے سے ہوتا ہے۔ بغیر کسی قسم کی ظاہری آگ کے کھانا بخوبی تمام پک جائیگا۔ پانی اُبل آئیگا۔ انڈے چائے وغیرہ طیار ہوجائینگے۔

اور لطف یہہ کہ کھانا پکانے والی کو کسی قسم کی نگہداشت یا فکر کی ضرورت نہیں پڑے گی صرف دیوار میں برقی چابی (پلگ Plug) لگانے کی ضرورت ہے اور بس۔ اسکے بعد کھانا خود بخود پکتا رہیگا۔ حرارت کی کمی بیشی کا آسان طریقہ ہے ایک چابی کے ذریعہ سے جو ایک دائرہ کے ادھے گھومتی ہے (سوچ Switch) برقی رو کی طاقت کم و بیش کیجا سکتی ہے۔

بجلی کے ذریعہ سے کھانا پکانے کی بڑی خوبی یہہ ہے کہ کسی قسم کی گندگی یا کثافت کی آلودگی نہیں ہوتی۔ اور پھر لطف یہہ ہے کہ ایک ہی اسٹیشن سارے شہر کے لئے کافی ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں بجاے اسکے کہ گھر گھر آگ جلائی جائے صرف ایک ہی مرکزی مقام پر آگ جلائی جاتی ہے اور ڈائینمو (Dynamo) کے ذریعہ سے برقی رو پیدا کرکے ہر ایک محلہ اور گھر مین بجلی تقسیم کردیجاتی ہے۔ اسکے بعد آپکو اختیار ہے کہ چاہیں آپ اس سے اپنے پنکھے چلائیں۔ کمرے کو ٹھنڈا یا گرم کریں (گرم پانی کی نلیوں یا گرم ہوا کے ذریعہ سے) کھانا پکائیں۔ لمپ جلائیں۔ برقی استری سے کپڑے صاف کریں یا سینے کی مشین چلائیں۔ جب یہہ صورت ہے تو برق کو اگر ہم اپنی بے عذر خادمہ کہیں تو کیا بیجا ہے؟

بجلی کے خرچ کرنے میں ایک بات مزے کی یہہ بھی ہے کہ اگر زیادہ مقدار مین بجلی صرف کیجائے تو لاگت بہت کم رہجاتی ہے لیکن کم مقدار میں اسکا استعمال ہونے کی حالت میں زیادہ قیمت خرچ کرنا پڑتی ہے۔ اسلئے اسکے مرکزی اسٹیشن ہوتے ہیں جہاں وسیع پیمانہ پر بجلی پیدا کرکے گرد و نواح کے مقامات میں یہہ خرچ

کیجاتی ہے۔ اسطور پر نہ صرف بجلی کے استعمال سے صفائی اور سہولت حاصل ہوتی ہے بلکہ کفایت شعاری اور اعلےٰ متمدن زندگی بھی مترتب ہوتی ہے۔

شاید بجلی کے متعلق اِس مضمون میں یہہ بتلانا خالی از دلچسپی نہوگا کہ کیوں بعض اوقات یہہ وفادار خادمہ مہلک بھی ثابت ہوتی ہے جس طرح آسمانی بجلی گھروں درختوں انسان اور حیوانوں کو جلا دیتی ہے اِسی طرح برقی رَو بھی بعض اوقات برقی انجینروں کی موت کا باعث ہوتی ہے۔ برقی رَو کا مہلک اثر اِس کے زیادہ دباؤ کی وجہہ سے ہوتا ہے۔ ذیل کی مثال سے اِسکی وجہہ سمجھہ میں آسکیگی۔

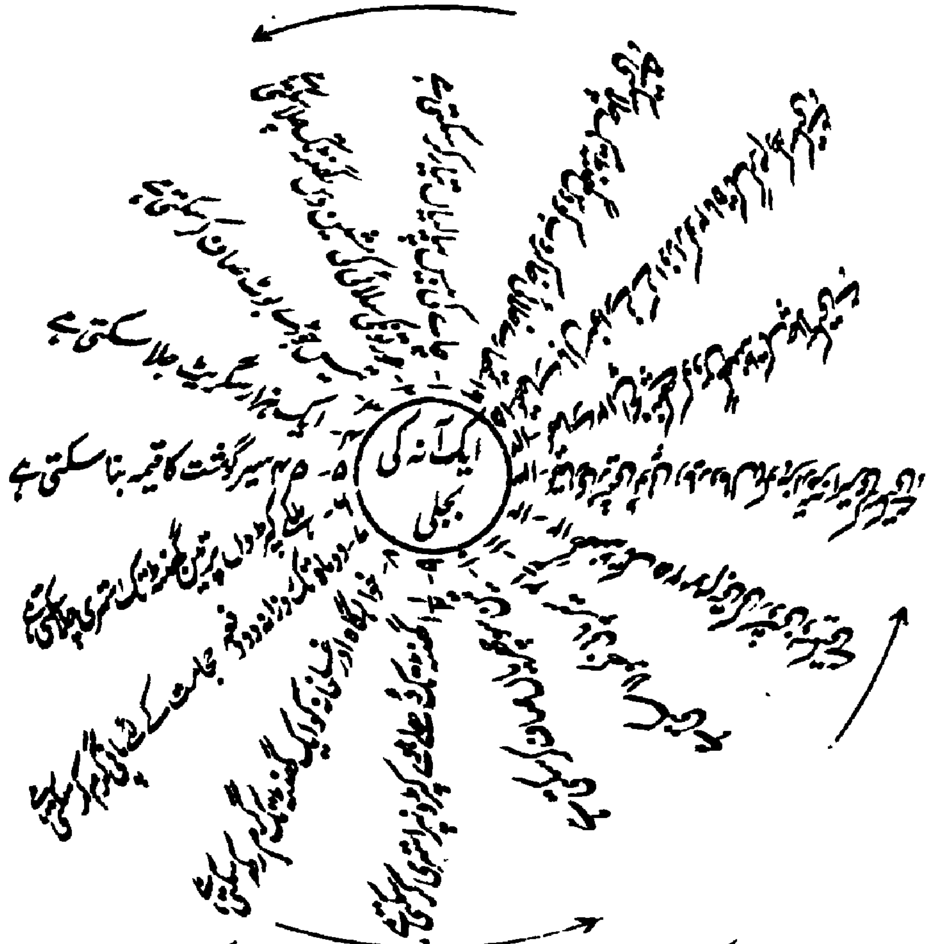
آپ ایک وسیع پایاب جھیل میں نہا سکتے ہیں اور اپنا سر بآسانی اسکی سطح کے کے نیچے رکھہ سکتے ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ اِس جھیل کا تمام پانی ایک حوض میں جو سطح زمین سے پانچسو گز اونچا ہو جمع کر دیا جاتا ہے۔ اور حوض کے نیچے ایک سوراخ چھہ ۶ انچ قطــر کا کر دیا جاتا ہے۔ اِس سوراخ میں سے پانی کی ایک زبردست دھار نکلیگی جس کے نیچے سطح زمین کے اوپر آپ اپنا سر ہرگز نہیں رکھہ سکینگے اسوجہہ سے کہ پانچ سو گز کے فاصلے سے گرتا ہوا پانی آپ کے سر پر نہایت زور سے پڑتا ہے اور یہہ صدمہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اِسی طرح برقی رو کی حالت ہے۔ اگر اِس تار کے دونوں سروں پر جس میں سے برقی رَو گذرتا ہے برقی دباؤ کا فرق بہت زیادہ ہے تو اس تار کے چھونے سے جو صدمہ جسم کے اندر سے برقی رو گذرنے پر انسان کو پہنچتا ہے وہ بعض حالات میں مہلک ثابت ہوتا ہے۔

ایک انگریز خاتون ماڈ لنکاسٹر نے بجلی کی مدد سے کھانا پکانے وغیرہ

کے متعلق ایک نہایت ہی دلچسپ مفصل کتاب ۱۹۱۴ء میں لکھی ہے اِسکا موضوع بجلی کو باورچیخانہ میں بالخصوص اور گھر میں بالعموم مفید بنانا ہے۔ چونکہ یہہ کتاب عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے اِسلئے مصنفہ نے محنت کے ساتھ تمام تشریحات کو سادہ اور صاف بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم اِس کتاب میں سے مفصلہ ذیل اقتباسات ضروری تصرفات کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

ماڈ لنکاسٹر نے ایک نقشہ کی شکل میں دکھایا ہے کہ ایک آنہ کی بجلی کیا کیا کام کرسکتی ہے۔ نقشہ کے وسط میں برق کی پری اپنا آتشیں لباس زیب بر کئے ہوئے جلوہ افروز ہے۔ اور اسکے چاروں طرف شعاعیں نکل رہی ہیں ہر شعاع ایک خاص مصرف میں لائی جارہی ہے بجلی کی قیمت کا اندازہ انگلستان کے متعلق ۱۹۱۰ء کا ہے مختلف مقامات پر کوئلے کی گرانی اور برقی اسٹیشن کی اہمیت سے بجلی کی قلیل ترین حصہ کا نرخ مختلف ہوتا ہے لیکن جس شرح کے مطابق نقشہ تیار کیا گیا ہے وہ اوسط شرح ہے اور اِس شرح کے مطابق بجلی کا استعمال لکڑی کوئلے یا گیس کے مقابلہ میں بہت کم خرچ ہے۔

ایک آنہ کی بجلی کیا کیا کرسکتی ہے؟



بجلی کے مصرف کے موٹے اصول بیان کرنے کے بعد ماڈ لنکاسٹر نے اختصار کے ساتھ بتایا ہے کہ گھر کے اندر بجلی کیا کیا کام کرسکتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہہ فہرست ہمارے سابقہ حصہ مضمون کا اعادہ ہے اِسلئے ہم اس کو بغیر مزید تمہید کے یہاں نقل کرتے ہیں۔

خانہ داری کے کام اور برق

ہوا کو گندگی سے پاک رکھ کر گھر میں روشنی پھیلا سکتی ہے۔ کیونکہ اُسکے روشن رکھنے میں آکسیجن کا خرچ نہیں ہے۔ برقی روشنی کے ساتھ نہ کسی قسم کا دھواں ہوتا ہے نہ کسی اور قسم کی غلاظت پیدا ہوتی ہے۔

بہت سی آرائیشی چیزوں کو منور کر کے دکھا سکتی ہے۔ مثلاً قیمتی تصویریں فوارے وغیرہ۔ جہاں معمولی لیپ کی روشنی سے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے وہاں برقی روشنی بغیر کسی قسم کے خطرہ کے استعمال کیجا سکتی ہے۔

چرٹ اور سگریٹ جلا سکتی ہے۔

جاڑے کے موسم میں کمرہ میں داخل ہونے والی ہوا کو گرم کر سکتی ہے اور ہوا کے آمد و رفت کو باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھ سکتی ہے۔

گرمیوں میں پنکھوں کے ذریعہ سے ہوا ٹھنڈی اور صاف رکھتی ہے۔

اوزون (Ozone) پیدا کر سکتی ہے (اوزون آکسیجن کی ایکدوسری قسم کا نام سمجھئے جو اپنی صحت بخش تاثیرات کے لحاظ سے بہ نسبت آکسیجن کے زیادہ موثر اور مفید ہوتی ہے) بھیگے کپڑوں کو خشک کرتی ہے۔

بالوں کو خشک کرتی ہے۔ ہر چیز کو گرم کر سکتی ہے۔

استری کو مختلف کاموں کے لئے گرم رکھ سکتی ہے

پانی گرم کرتی ہے اور پانی کی جراثیم کو مارتی ہے۔

پینے کے لئے پانی اونٹا سکتی ہے۔

ہر قسم کا کھانا عمدہ طور سے پکا سکتی ہے۔ اور جتنی دیر چاہئے اسے گرم رکھ سکتی ہے۔

بالائی کی برف بنا سکتی ہے۔

گوشت کا قیمہ بناتی ہے۔ یا اس کے ٹکڑے کاٹ کر چاپ وغیرہ بنا سکتی ہے۔

آلو۔ سیب وغیرہ پر سے چھلکا اتارتی ہے اور تمام کمرے صاف رکھتی ہے۔

تمام قالینوں فرشوں دریوں بستروں دیواروں وغیرہ سے خلائی خاک کش ول کے ذریعہ سے خاک کے ذرات جذب کرتی ہے اور لطف یہہ ہے کہ خاک اور گرد بالکل نہیں اڑنے پاتی اور صفائی کرنے والے کے ناک منہ حلق اور پھیپھڑوں میں نہیں جاتی جیسا کہ معمولی طریقہ صفائی سے ہوتا ہے۔

چاقو۔ چھریاں۔ چمچے ایک چھوٹے سے موٹر کے ذریعہ سے صاف کرتی ہے۔

بوٹ اور جوتے صاف کر کے پالش کرتی ہے۔

ہر قسم کی سلائی کے لیے سینے کی مشین چلاتی ہے۔

خراد کی مشین آرہ کی مشین یا ہر قسم کی کل چلاتی ہے۔

باجا بجا سکتی ہے۔

گھر کی تمام گھڑیاں چلا سکتی ہے اور نوکروں کے جگانے کیلئے الارم بجاتی ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں فاصلہ سے کھول سکتی ہے۔

فوارہ چلاتی ہے

پانی کنوئیں میں سے نکالتی ہے اور اور بہت سے مفید کام کر سکتی ہے جنکی بدولت گھر کا آرام بڑھ جاتا ہے جس گھر میں بجلی ہوتی ہے وہاں پودے اور

پھول نہایت اچھی حالت میں رہتے ہیں۔ اور ننھے بچوں کی صحت پر بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔

یورپ میں بہت سے ہوٹل ایسے ہیں جہاں سب کام ادنیٰ سے اعلیٰ تک بجلی کرتی ہے اور امراء کے گھروں میں بھی بجلی بطور خادمہ کے استعمال کیجاتی ہے بجلی کے معمولی استعمالات یعنی روشنی کرنا پنکھے یا ٹریمیے چلانا وغیرہ تو اب عام ہوگیا ہے۔

(مراد منزل علیگڈھ ۱۲۔ مارچ ۱۹۱۶ء) فیروز الدین مراد

ہماری خامیاں۔ زندہ قوموں کے نقطۂ خیال سے

انسان فطرتاً ایک ترقی کرنے والا پتلا بنایا گیا ہے۔ یوں تو دنیا میں جتنے جاندار اجسام ہیں سب ہی اپنی فطرت کے موافق بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں ہر بچہ ماں کے پیٹ ہی سے بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور ایک حد معینہ تک بڑھ کر پیدا ہوتا ہے۔ پھر دنیا میں آکر برابر بڑھتا اور نشو و نما پاتا رہتا ہے حتیٰ کہ سن بلوغ پر پہونچتا ہے اور پھر ایک معینہ حد تک برابر بڑھتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ بہائم کے بچے بھی انسان کے بچے کی طرح قوائے جسمانی کے اعتبار سے ایک حد معینہ تک بڑھتے اور ترقی کرتے ہیں۔ مگر انسانی فطرت کی خصوصیات بہائمی فطرت کی خصوصیات کے مقابلہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ آدمی کے بچے کے قوائے جسمانی کے ساتھ ہی ساتھ اسکے قوائے دماغی بھی نشو و نما پاتے جاتے ہیں۔ اور

جیسے جیسے اُسکے قواے جسمانی ترقی کرتے جاتے ہیں اُنہیں کے ساتھ ہی ساتھ اُسکے دماغی قواءبھی ترقی کرتے ہیں۔ جانوروں کو فطرت نے قوائے دماغی سے محروم رکھا ہے۔ بہائم کے بچے بھی ہمارے بچوں کی طرح قواے جسمانی میں ترقی کرتے ہیں۔ مگر ایک حد معینہ پر پہونچکر اُنکی ترقی کا دور ختم ہوجاتا ہے اور اس اخیر نقطۂ ترقی پر پہونچنے کے بعد زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ جسمانی قواء کے اعتبار سے جسم انسانی بھی اسی سخت قانون کا پابند ہے۔ اور اِس آخری نقطۂ انتہاے ترقی پر پہونچنے کے بعد قوائے جسمانی کا زوال ہمارے لئے بھی ہے۔ مگر فرق ہے تو اسی قدر کہ ہمارے قوائے دماغی کی ترقی قواے جسمانی کی ترقی کی ہر حال میں تابع نہیں رکھی گئی ہے۔ ہمارے قواے جسمانی زوال کرتے ہیں تو کریں مگر ہمارے قواے دماغی کا دور اگر باقاعدہ طور پر ایکبار شروع ہوچکا ہے تو مرتے دم تک ترقی ہی ترقی کرتا جائیگا اور جس نقطہ پر پہونچکر بہائم کے لئے زوال شروع ہوتا ہے وہاں پہونچکر ہماری ترقی کی رفتار کی سُرعت اور بڑھ جاتی ہے۔

ایک انسان اور حیوان کے درمیان میں کیا فرق باقی رہ گیا؟ اسیقدر اور محض اسیقدر کہ انسان کے قواے دماغی ترقی کرتے کرتے اپنے انتہائی نقطہ عروج کمال تک پہنچ سکتے ہیں اور پہونچتے ہیں۔ مگر برعکس اِسکے بہائم اِس دماغی ترقی کی نعمت سے محروم ہیں۔ مہذب دنیا یا دوسرے الفاظ میں یا دوسرے الفاظ میں ترقی کرنے والی دنیا کا یہی معیار ہے۔ جو قومیں اِس معیار پر پوری اُترتی ہیں انکا شمار انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ جو قومیں اِس معیار سے نسبتاً جس حد تک گری ہوئی پائی جاتی ہیں وہ اُسی نسبت کے ساتھ بہائم

تربیت یافتہ۔ نیم وحشی۔ یا وحشی کہلاتی ہیں۔

دماغی ترقی کے مختلف پہلو مختلف اصناف اور مختلف شعبے رکھے گئے ہیں اور ہر ہر شعبہ کا ہر ہر پہلو امتحان کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ ہر زندہ قوم ایک زندہ جسم ہے جس طرح کوئی انسانی جسم جسم نہیں کہا جا سکتا جب تک اُسکے اندر دل و دماغ نہوں۔ کوئی جسم جاندار نہیں کہلا سکتا جب تک یہ دل و دماغ کام نہ کر رہے ہوں اور کوئی جاندار جسم تندرست نہیں کہا جا سکتا جب تک اُسکے دل و دماغ اپنا صحیح فعل نہ کر رہے ہوں اور ہر طرح یہ نظام ٹھیک چل رہا ہو۔ بعینہٖ یہی حال قوم کا ہے۔ ایک زندہ جسم کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اِس جسم کے کسی حصہ میں کہیں ایک ذراسی پھانس لگ جائے تو سارا جسم بے چین ہو جائے۔ اور جب تک وہ پھانس نکل نہ لے اُسی کسی طرح چین ہی نہ آئے۔ زندہ اقوام بھی وہی ہیں جنکے افراد اسی طرح ایک سے ایک ملکر ایک واحد جسم بن گئے ہوں کہ جس کی اگر ایک اُنگلی دکھے تو سارا جسم بے چین ہو جائے۔ اور اسی طرح بے چین رہے جبتک اُس ایک انگلی کے اندر سے پھانس نکل نہ جائے۔ مذہبی اختلافات کی وجہ سے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں شخصی عداوتیں جڑ پکڑ گئی ہیں تو قائم رہیں۔ ڈاکہ زنی قتل اور فساد کا ہنگامہ برپا ہے تو برپا رہے۔ یہ اور بات ہے۔ مگر جہاں قومی اور ملکی مسئلہ سامنے آیا نہیں کہ سارے دشمن جہاں تک کہ اُس خاص معاملہ سے تعلق ہے دوست بنجائینگے اور سب کے سب یک دل یک دماغ اور یک زبان ہوکر وہی ایک واحد صدا بلند کرینگے جو ایک جسم واحد کی شان کے

شایاں ہے۔ اسکا نام Unification of the race ہے۔ یہہ ہماری قومی ہستی کے وجود کا سب سے پہلا امتحان ہے۔ جب تک یہہ بات حاصل نہو کوئی فرقہ قوم قوم کی رٹ لگاکر قوم نہیں بن سکتا اگر یہہ بات حاصل ہے تو اسکے بعد قومی دماغ کی بیداری کا امتحان لیا جائیگا۔

قومی دماغ کا پہلا امتحان کیا ہوگا؟ پہلا امتحان اسبات کا ہوگا کہ آیا یہہ دماغ تندرست ہے یا نہیں۔ یہہ کیونکر معلوم ہو؟ یہہ اسطرح معلوم ہوگا کہ آیا یہہ دماغ اپنا صحیح فعل کر رہا ہے یا نہیں۔ قومی دماغ کے اپنے صحیح فعل انجام دینے کا سب سے پہلا امتحان یہہ ہے کہ آیا اُس دماغ کی پرورش کس غذا پر ہو رہی ہے اور آیا وہ غذا صاف اور صحت بخش ہے یا نہیں۔ وہ غذا کیا ہے؟ قومی لٹریچر، قومی زبان اور اُس زبان کا ذخیرۂ معلومات۔ اِس زبان اور اِس ذخیرۂ معلومات کی جانچ پڑتال ہوگی کہ وہ معیار کے موافق ہے یا معیار سے گرا ہوا۔ مگر وہ معیار کون قائم کرے گا؟ جواب صاف ہے۔ معیار قایم کرنا ممتحن کا کام ہے۔ امتحان دینے والا اُس معیار کے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لہذا دنیا کی زندہ اقوام کے مقرر کئے ہوے معیار ہی وہ معیار ہیں جنکے موافق آپ کا امتحان لیا جائیگا۔ یاد رکھئے کہ آپ کے اپنے قائم کئے ہوے معیار کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اور نہ دنیا کو اُنسے کوئی بحث ہے۔ ایک طالب العلم بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے جا رہا ہے۔ بی۔ اے۔ کے امتحان کے لئے ایک نصاب تعلیم مقرر ہے اور اِسی نصاب تعلیم کے مقررہ مضامین میں ایک مقررہ معیار کے مطابق اُسے امتحان دینا ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ اُسے بی۔ اے کی سند ملجائے تو اسکے لئے لازم ہے کہ اسی

نصاب کے مقررہ معیار پر پورے اُترنے کے لئے اپنے کو طیار کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تو بی۔ اے کی سند حاصل کرنے کے خیال سے دست بردار ہو جائے۔ اسی طرح اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپکو بھی دنیا کی ترقی کرنے والی قوموں کی صف میں جگہ ملے تو آپ اُنکے مقرر کردہ معیار کے موافق امتحان میں پورے اُترنے کے لئے اپنے کو طیار کیجئے۔ اگر آپ یہہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نخوت اور خود پسندی کی دیوار آہن توڑ کر باہر نکل آنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو آپ وہیں قید رہیئے۔ کچھ دنوں زمین پکڑے پڑے رہیئے مگر دنیا کی وسیع میدان کی صاف اور فرح بخش ہوا سے محروم رہکر آپ کب تک ملک الموت سے کشتی لڑ سکتے ہیں۔ آخر کار فنا ہونا ہے۔ فنا ہو جائیگا۔

اب ہمیں یہہ دیکھنا ہے کہ دنیا کی زندہ اقوام نے زبان اور زبان کے ذخیرہ معلومات کے متعلق انسانی دماغ کی بیداری (Intellectual Efficiency) کے لئے کیا کیا معیار مقرر کئے ہیں اور یہہ کہ آیا ہم اس معیار پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ ساتھ ہی اسکے ہمیں یہہ بھی دیکھنا ہے کہ اگر ہم اِس معیار پر پورے نہیں اُترتے ہیں تو آخر وہ کون سے معیار ہیں جنپر ہم پورے اُتر رہے ہیں اور آیا یہہ ہمارے اپنے مقرر کردہ معیار کس پایہ کے ہیں اور آیا یہہ معیار دنیا کی زندہ اقوام کے معیار سے کہاں تک مشابہ یا کس حد تک مختلف ہیں اور مختلف ہیں تو اُس معیار سے موازنہ کرنے پر کسی حال میں اسکے مقابل میں مساوات کا درجہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں رکھ سکتے ہیں تو اِس معیار سے ہمارے معیار کہاں تک گرے ہوے ہیں اور دونوں معیاروں کے ایکدوسرے کے

مقابل میں آنے پر ایک کی دوسرے کے ساتھ کیا نسبت قائم ہو سکتی ہے۔

(باقی آیندہ)

عبدالستار

حافظ شیرازی اور ڈاکٹر اقبال

"اسرار خودی" کے معزز مصنف صاحب ایکطرف تو دنیا کو خودی یعنی خودداری کا سبق سکھانے کے لئے اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں۔ زمانہ کے سامنے اپنی سحر کار لالٹین پیش کرتے ہیں جس کی روشنی میں نظر دوڑانے سے حافظ عرفی اور فلاطون تک طفلِ مکتب نظر آتے ہیں۔ مگر سحر انداز ساحر اپنی عجیب وغریب لالٹین ایسے مقام پر رکھ دیتا ہے جہاں سے اِس کے سامنے کے کاغذی تصویر نما پردہ پر صرف اوروں ہی کی تصویریں نظر آسکتی ہیں جنہیں ساحر اپنے تماشائیوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ ساحر کی اپنی تصویر کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی ہستی کو پسِ پشت رکھتا ہے تاکہ اُسکے تماشائی اوروں کے عیوب خامیاں اور کمزوریاں تو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ مگر خود ساحر کے عیوب نقائص اور کمزوریاں تاریکی میں پڑی رہیں۔

"پیام اُمید" نے کوشش کی ہے کہ اِس ساحر اور ساحر کے ساتھ ہی اُسکی سحر کار لالٹین کا پردہ چاک کرکے دنیا کو صاف صاف دکھادے کہ اِن دونوں کی اصلی ماہیت کیا ہے جو شخص دنیا کے مستند ادیب اور فلسفیوں پر

حرف رکھنے چلے اُسے سب سے پہلے یہہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اُسکا مبلغ کتنا ہے اور یہہ کہ جن پہلوانوں کے مقابلہ میں وہ زور آزمائی کرنے جارہا ہے اُنکے مقابلہ میں اُس کی طاقت کا کیا پایہ ہے۔ حافظ کو وہی شخص پاؤں سے روند سکتا ہے جو حافظ سے زیادہ شہ زور ہو گو دنیا ساتھ ہی اِس کے یہہ بھی ضرور کہیگی کہ جو شخص حافظ سے زیادہ شہ زور ہوگا وہ بھی حافظ کے سر پر قدم رکھنے بجائے اُسے سر آنکھوں ہی پر بٹھائیگا۔ اگر روحانی کوائف کے اعتبار سے وہ ارواح طیبات سے کوئی سلسلہ تقرب رکھتا ہوگا۔ ہاں اگر وہ دیویت ہے تو البتہ اُسے سوا اِسکے کچھ آتا ہی نہیں ہے کہ جو کوئی اُس کی راہ میں پڑ جائے اسے اپنے سینگوں پر اُٹھا کے پٹک دے۔

ناظرین "پیام اُمید" دیکھ چکے ہیں کہ حافظ کے مقابلہ میں میدان میں آنے کے لئے اسرار خودی کے مصنف صاحب کس حد تک طیار خیال کئے جا سکتے ہیں اور اُن کی قوت حافظ سے زور آزمائی کرنیکے لئے کس پایہ کی ہے۔

اب ہمیں یہہ دکھانا ہے کہ جو آلہا اسرار خودی نے گایا ہے۔ آیا وہ راگ محض اسلئے طبع زاد فرمایا گیا ہے کہ دنیا کو سنا کر واہ واہ حاصل کیجائے یا اُس راگ کے مُصنّف نے بھی اُس سبق پر عمل کیا ہے جسے وہ دنیا کو سکھلانے نکلے ہیں۔

مثنوی اسرار خودی کے پہلے صفحہ پر سب سے پہلا لفظ جو جوب قلم سے لکھا گیا ہے لفظ "پیشکش" ہے۔ اور اسی لفظ کے ساتھ سلسلہ عبارت میں نیچے یہہ الفاظ بھی جلی قلم سے عنوان کے طور پر لکھے گئے ہیں "بحضور سر سید علی امام مدظلہ العالی" اِس عنوان کے بعد کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"اے امام اے سیدِ والا نسب ۔۔۔ دودمانت فخرِ اشرافِ عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی ۔۔۔ عقلِ کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنی بیگانۂ ۔۔۔ جلوۂ شمع مرا پروانۂ"

"پیامِ اُمید" بتا چکا ہے کہ آخری شعر کے دونوں مصرعوں کے آخری الفاظ کا صحیح املأ یوں ہونا چاہئے "بیگانئی" اور "پروانئی"۔ اِس سے ہمیں یہاں زیادہ بحث نہیں ہے مگر جس بات سے ہمیں بحث ہے وہ یہ ہے کہ چلے تو ہیں آپ دنیا کو خودداری کا سبق سکھانے مگر مثنوی کے سب سے پہلے ہی اشعار کے ذریعہ سے اپنی ہی خودداری پر ایسی وحشیانہ ضرب رسید کرتے ہیں کہ دیکھنے والے بلبلا اُٹھتے ہیں کہاں تو دنیا کو خودداری کا سبق سکھانا۔ کہاں حافظ کو خودداری کا دشمن بتانا اور کہاں خود ہی پشتو میں بھیک مانگنے سے مثنوی شروع کرنا!

آپ حافظ کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ

مسلم و ایمان او زنار دار ۔۔۔ رخنہ اندر دینش از مژگانِ یار

آپکی خاطر سے ہم ایک منٹ کے لئے مانے لیتے ہیں کہ خیر یہی سہی۔ اچھا فرمائیے آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ ایک بلند پایہ شاعر بننا چاہتے ہیں اور ایسے شاعر جنکے آگے حافظ اور عرفی بھی جھک مارتے ہیں۔ مگر آپکی شاعری کا آغاز ہی ملاحظہ فرمائیے کیونکر ہوتا ہے۔

آپ کی مثنوی کا سب سے پہلا لفظ "امام" یا "اے امام" ہے۔ ہمنے مانا کہ حضرت علی امام کا نام بھی علی امام ہے۔ مگر کیا محض اسی وجہ سے کوئی ادنیٰ طبقہ کا آدمی بھی انہیں "اے امام" کہہ کے مخاطب کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے؟

کسی شخص کا نام اللہ بخش۔ خدا بخش۔ نبی بخش یا رسول بخش ہو تو کیا آپ اُسے اسی شعر کی نظیر دے کر اے۔ اللہ۔ اے خدا۔ اے نبی یا اے رسول کہہ کے مخاطب کرنے کے مجاز ہو سکتے ہیں؟ سوال تو یہہ ہے آپ کے پاس اسکا کونسا شافی جواب ہے؟ اگر ہو تو براہ کرم عنایت فرمائیے۔ دنیا منتظر ہے۔ سر علی امام کو "اے امام" کہہ کے مخاطب کرنے میں کونسی لطافت آپکے پست مضمون میں پیدا ہو گئی پہلے یہی فرما دیجئے۔ آپکا یہہ شعر بالکل ویسے ہی ادنےٰ اور ارزل ترین پایہ کی تعریف کا شعر ہے۔ جیسے عموماً جاہل نائی۔ بھاٹ۔ میراثی اپنے ججمانوں کی کیا کرتے ہیں "حضور تو بڑے عالی نسب ہیں۔ شریف ہیں۔ عالی خاندان ہیں۔ رئیس زادے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ ہاں اگر کچھ کسر باقی رہتی ہے تو اتنی ہی کہ "حق تعالیٰ سلامت رکھے۔ بھائیوں کی جوڑی بنی رہے" اور یہہ کوئی بہت بڑی کسر نہیں ہے۔ آیندہ کسی نظم کے ذریعہ سے آسانی سے پوری کیجا سکتی ہے۔ بھلا اسمیں کونسی شاعری ہے؟ کونسا بلند پایہ مضمون پیدا ہوا ہے۔ کیا لطافت پیدا کی گئی ہے؟ اسے آپ ہی سمجھیں "عقل کل را حکمت آموز آمدی" والا مصرعہ یاد دلاتا ہے کہ آپکو وہی شعر سنا دیا جاے جو ہمارے صوبہ کے بچے کی لوک زبان ہو رہا ہے۔

چہ حاجت کہ نہ کرسئی آسماں   نہی زیر پاے قزل ارسلاں

ادنےٰ درجہ کی بکواس سے کاغذ سیاہ کرنے والے شاعر جب اُس اوج پہ رسائی سے معذور رہتے ہیں جہاں پہونچکر ایک بلند پایہ شاعر کمالات شاعری کے حلۂ بہشتی سے مزین کر کے عروسِ سخن کو تماشا گاہِ عالم میں جلوہ گر کرتا

ہے تو وہ یہی کرتے ہیں جو آپ کر رہے ہیں ۔ بے تکے مبالغوں اور جھوٹی تعریف کے پل باندھ کر زمین آسمان کے قلابے ملانے پر تل جاتے ہیں مگر اس خاک اڑانے سے انہیں نہ آج سے پہلے کبھی کچھ ہاتھ آیا ہے اور نہ آج ہی ہاتھ آسکتا ہے رہا یہ کہ اس "پیشکش" کے کاسۂ گدائی کا پیش کرنے والا ہاتھ کیا سوال لے کر نکلا ہے۔ اسکا صحیح جواب دینا تو بیشک دشوار ہے ۔ مگر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ گرما گرم تازہ بتازہ افواہ جو فی گھنٹہ ساٹھ میل کی رفتار سے اڑی پھر رہی ہے ۔ وہ تو یہی خبر سنا رہی ہے کہ اس کاسۂ گداغ کا سوال کاونسل کی ممبری ہے ۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی اصلیت کیا ہے یا کس حد تک صحیح ہے یا بالکل ہی غلط ہے ۔ اور نہ ہمیں اس سے بحث ہے کہ یہ خبر صحیح یا غلط ہو بحث ہے تو صرف اتنی ہی ہے کہ کہاں تو دنیا کو خودداری کا سبق سکھانا ۔ کہاں حافظ کو خودداری کا دشمن بتانا اور کہاں یوں خود ہی پنڈت رتن ناتھ صاحب کے فوجی کی طرح "اپنے زعم میں آپہی" "منھ کے بل چت ہو جانا" ! ہمیں ڈر ضرور ہے کہ اسکے جواب میں "اوگید ی نہوئی قزولی" کہہ کر کہیں آپ میدان ہی نہ آجائیں حافظ خودی ۔ خود نمائی ۔ خودداری ۔ خودستائی ۔ خود فروشی کے دشمن کیوں نہوں وہ کوچہ ہی اور ہے ۔ اسکی ماہیت وہی جان سکتا ہے جسکی اس اوج تک رسائی ہو ۔ وہ تو خود ہی کہہ گئے ہیں کہ

"خود فروشاں را بکوے مے فروشاں راہ نیست"

جب آپ کی خود فروشی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ خودداری کی بوریائے قناعت کو چھوڑ کر آپ بڑے نام والوں کے پیچھے پیچھے ننگے سر ننگے پاؤں دوڑتے پھرتے

ہیں اور بلند پایہ شاعری سے دست بردار ہو کر بھانٹ میراثیوں کی طرح
اُن کی خوشامد میں رطب اللسان ہو رہے ہیں تو ایسے خود فروش حافظ کے
پایہ کے شعرا کی کیا خاک قدر جان سکتے ہیں! آپ کی سرسری نظر مادی
دنیا کے موجودات کے اندر لپٹ کر رہ گئی۔ حقایق اور رموز حقیقت سمجھنے کے
لئے جو باریک بین نظر درکار ہے آپ اُسکے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔
اُلٹی سیدھی فارسی میں کچھ ٹوٹے پھوٹے شعر موزوں کر لینے سے نہ کوئی
ایک بلند پایہ شاعر بن سکتا ہے اور نہ کسی کی نظر باریک بین یا دوربین بن
سکتی ہے آپ نے حافظ کی شراب کے معنی ٹھرا اور رم کی سمجھا تو یہ آپہی کی
قابلیت ہے۔ آپنے حافظ کو میخوار سمجھا تو یہ آپ ہی کی ذہانت ہے۔ آپنے
حافظ کے ساقی کو بھٹی خانہ کا کلوار سمجھا تو یہ آپہی کی ذکاوت ہے۔ حافظ
کا اسمیں کونسا قصور ہے! بات صرف اتنی ہے کہ اگر آپ کی طرح کوئی بالکل
پھوہڑ طور پر بیجا بیجا زبردستی شراب کا لفظ ایسے موقع سے رکھدیا کرے کہ جسے
ہر موٹی سمجھ کا آدمی سمجھ سکے تو البتہ آپ اس شراب کے معنی خوب سمجھ لینگے۔
مثلاً "مئے درد "مئے فریاد"۔ جس کے معنی حقیقت میں صرف درد اور فریاد ہی
کے ہیں اور مے کا لفظ محض برائے بیت ہے۔ مگر حافظ کا سا بلند پایہ شاعر
تو آپ کی طرح مے دال۔ مے روٹی۔ مے ٹوپی۔ مے لنگوٹی باندھنے سے رہا۔
یہاں اُسکا شاعرانہ دماغ اس حد سے آگے بڑھا نہیں کہ آپ فوراً چیخ اُٹھے
"نیست غیر از بادہ در بازار او" مگر فرمائیے بندہ پرور آخر اسمیں حافظ کا
کا کیا قصور ہے۔ جو آپ اُسے زبردستی کوس رہے ہیں! آپ فرماتے ہیں کہ

حافظ نے خودداری کی جڑ کاٹی۔ حافظ کہتا ہے کہ یہ شعر بیاموز۔ بات یہ ہے کہ وہاں تو حافظ بارگاہ جناب سرور کائنات صلعم کے مقرب ہیں۔ فنافی اللہ کے جام سرشار کے متوالے ہیں۔ اُنکا ساقی ساقیِ کوثر ہے اور انکا محبوب محبوب و معبود حقیقی ہے۔ پھر اُس دربار کے درباری خودداری کرکے کہاں جائیں۔ اُس دربار میں ازل سے اسوقت تک صرف ایک ہی نظیر خودداری کی ملتی ہے مگر اُس خودداری کا کیا انجام ہوا۔ یہ بھی سبکو معلوم ہے۔ اور وہ نظیر کون سی ہے؟ وہ نظیر اسرار خودی کے سرچشمہ حضرت عزازیل با لقابہ کی ہے۔ اجی وہاں اُس کوچہ میں تم کس کے مقابلہ میں خودداری کروگے؟ وہاں تمھارے دو ہی مخاطب ہیں۔ جناب سرور کائنات کے مقابلہ میں؟ جی مزاج پوچھ لیا جائیگا! اللہ میاں کے مقابلہ میں؟ تو انجام بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا ہے!

وہاں خودی کہاں؟ خودنمائی خودفروشی اُنہیں مے نوشوں کو مبارک رہے جسکے لئے "اسرار خودی" کا ٹھرا بنایا گیا ہے۔ وہی اسکے اہل ہوسکتے ہیں۔ اُس کوچہ کا تو پہلا سبق یہی ہے

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں　　خاک او گشتم چندیں درجاتم دادند

وہاں تو جب تک "خودی" کو پائمال نہ کرو۔ خود فراموش نہ بنو۔ خودی کی دوئی سے باہر آکر فنافی الوحدت نہو جاؤ۔ خودی کو بلار کے پھونک کے خاک نہ کرڈالو اُسوقت تک تمھیں وہاں کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ تم کون ہو۔ وہاں تو بیٹھے تمھیں "پیر مغاں" (جناب رسالت مآب صلعم) کے دربار کی خاک بننا پڑیگا اگر تم وہ خاک بن سکو تو ضرور اکسیر ہو۔ اور نہیں بن سکتے تو جاؤ مانگ کھاؤ۔

وہاں تمھیں کوئی نہ پوچھیگا۔ ہاں البتہ "اسرارِ خودی" کا چکارا ہی بجانا ہے تو عمر بھر بجاتے رہو۔ تمھیں کوئی منع بھی نہیں کرتا۔ آیا سمجھ کے بیچ میں!

صوفی عبد اللہ

مکتوباتِ حسن آرا

ذیل کے مضمون کا ایک حصّہ ہمارے مشترکہ جنوری وفروری نمبر میں شائع ہوچکا ہے، مگر چونکہ اِس نمبر کی اشاعت ہمارے نئے ناظرین کے وسیع حلقہ میں بالکل نہیں ہوئی ہے اور ہمیں اُنکا پاسِ خاطر حد سے زیادہ منظور ہے لہٰذا ہم اِس مضمون کا پہلا حصّہ اُنکی خاطر سے دوبارہ شائع کرتے ہیں تاکہ پورا مضمون اُنکے ملاحظہ سے گذر سکے۔ یہ مضمون زیرِ تعلیم لڑکے لڑکیوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اِس سے پورا فائدہ اُٹھائینگے۔ ایڈیٹر

لکھنؤ ۲۰۔ دسمبر ۱۹۱۵ء

پیاری آزاد بیگم

آخری خط میں تمنے مجھ سے کہا تھا کہ تمھارے "آزادی" کے مضمون کے متعلق کچھ میں بھی لکھوں۔ میرے پریشان خیالات سُن لو تم سچ کہہ رہی ہو کہ ہمارے ملک میں آزادی کی وبا۔ آزادی کا طاعون پھیلا ہوا ہے بقول تمھارے وہ آزادی جو ایک قوم اور ملک کی حالت سدھارنے کے لئے ایک نہایت ہی لازمی عنصر ہے بالکل ہی شئے دیگر ہے۔ ہمارے بچے آزادی

آزادی کی پکار ہر وقت مچایا کرتے ہیں مگر خاک نہیں سمجھتے کہ آزادی کسے کہتے ہیں۔ انھیں کیسی آزادی کی ضرورت ہے اور وہ کیسی آزادی ہے جس کی تلاش میں وہ دنرات دیوانے رہا کرتے ہیں مگر کبھی نہیں پاتے۔

ہمارے تعلیم یافتہ اور صائب الرائے مردوں میں سے بعضوں کی یہ رائے ہے کہ ہمارے ملک کے ناسمجھ ناتجربہ کار ناعاقبت اندیش اور نیم تعلیم یافتہ فرقہ میں سے جنکی عقل سلیم ابھی تک پختہ کاری کی حد کو نہیں پہونچسکی تھی مگر شامت اعمال سے جنکے ہاتھوں تک ہربرٹ اسپنسر اور مزینی کی بعض تصانیف یا ایسی ہی اور کتابیں پہونچ گیئں وہ انھیں پڑھتے ہی باولے ہوگئے اور سوا فتنہ و فساد برپا کرنے کے انھیں دنیا میں کوئی شغل ہی پسند نہ آسکا۔ مجھے اس معاملہ میں کوئی ذاتی تجربہ حاصل نہیں ہے اور نہ مجھے کوئی حق حاصل ہے کہ ایسے اہم معاملات پر کوئی اسے ظاہر کروں۔ مگر آزادی کی جو چیخ پکار جونئی پود نے مچا رکھی ہے ابتدا سے متعلق میں اپنی رائے جیسی کچھ بُری بھلی رکھتی ہوں ضرور لکھوں گی۔ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس نگوڑی دیوانی باولی آزادی کا شور واویلا کیوں مچا ہوا ہے ؟ میرے خیالات سنو۔

جہانتک میری محدود عقل کام کرتی ہے وجہ یہی پاتی ہوں کہ ہماری مروجہ تعلیم ان بچوں کے آگے ایک سرسبز اور شاداب سماں برٹش آزادی کا کھولکر علیٰحدہ ہوجاتی ہے۔ اگر آپ تلاش فرمائیں تو انگریزی کتابوں انگریزی اخباروں انگریزی میگزینوں کے اوراق کے تہوں میں اس راز کی کنجی ملیگی۔ آپکی ہر ہر کتاب کے سطروں کے سویدا میں آپ کے ہر ہر لفظ کے جگر میں آزادہ رود دریائے تیز

کے لہروں کی روانی۔ انگلش چینل کے پہاڑی ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجوں کی تموّج کلب بے قرار نغمہ۔ ونڈسر فارسٹ کی آزاد بارکھیوں کے بنائے ہوئے شہد کی حلاوت آزار لندن کے آزاد پریس کے تیز رو انجن کا دھواں آزاد لندن کے آزاد انفاس سے دوش بدوش آزاد لندن کے ضرب المثل کُہرے کے ابخرات۔ آزاد کیر ہارڈی کے قلم کی کھڑ کھڑاہٹ۔ چپک کر۔ لپٹ کر۔ سمٹ کر چمٹ کر۔ پس پس کر۔ گھُل مِل کر مِل جُل کر چلی ہی آتی ہے۔ اِس چاشنی اِس لذت اِس حلاوت کا ہمارے بچے مزے لے لے کر رات کو سوتے ہیں تو خواب میں انھیں دنیا ایک سبز باغ دکھائی دیتی ہے جس کی جان اور جس کی روح و رواں آزادی ہی آزادی ہے اور کچھ نہیں۔ وہ صبح کو آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھتے ہیں۔ اون کی آنکھوں کی چکاچوندا بھی مٹنے بھی نہ پائی تھی کہ نسیم سحر کی اٹھکھیلیوں بھری ہوئی چال نے ایک ٹھوکر دے کر اُن کی میز پر رکھی ہوئی کتاب کا ورق الٹ دیا۔ اِس گراموفون کے پتے (ریکارڈ) کے اندر مزے مزے کے سُر بھرے ہوئے تھے صبا نے شوخی کر کے اِس کے گہرے نقشوں پر ایک مستانہ مضراب لگادی۔ ذرا آپ بھی ٹھہر کے سُن لیجئے۔ کیسا پیارا۔ کیسا سُریلا نغمہ سُنائی دے رہا ہے کہ انسان تو انسان فرشتہ بھی ہو تو کلیجہ تھام کے وہیں بیٹھ جائے۔

”انگلستان کی ہوا غلاموں کے انفاس کے مصرف میں آنے کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ یہ ہوا انکے دماغوں میں سمائی اور غلامی کافور ہوئی۔ غلامی کا جادو انگلستان پر چل نہیں سکتا۔ پابجولاں غلاموں کو مژدہ سنادو کہ وہ

دوڑکر خاک پاک انگلستان کو ایک بار چھو کے دیکھیں تو سہی۔ پھر اگر وہیں اُنکے پاؤں کی بیڑیاں کٹ کے گر نجائیں تو ہمارا ذمہ !"

میں کسنے پوچھتا ہوں دنیا میں کون بچہ ہوگا جس کے دماغ میں ایسی ہوائیں بھر دیجائیں اور پھر وہ اپنے آپے میں رہ سکے جب تک اُسی کے ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی نہ سمجھایا جائے کہ دنیا کی ہر ادرشے کی طرح آزادی بھی کسی معینہ حدود کسی مقررہ قیود اور کسی خاص مستثنیات کی پابند ہے۔ مگر ہمیں آجتک یہی نہ معلوم ہوا کہ یہ حدود یہ قیود اور یہ مستثنیات انھیں کب اور کیونکر سکھائے جاتے ہیں اور کون سکھاتا ہے!

ہمارے صوبہ کا محکمۂ تعلیم آئے دن طریق تعلیم کی سند حاصل کرنے پر ہمارے مدرسوں کے اُستادوں کو مجبور کیا کرتا ہے۔ بیشک ایک حدتک یہ تعلیم مفید ثابت ہو رہی ہے۔ مگر جو بات کہ ان طریق تعلیم کے مدرسوں اور جماعتوں میں سب سے پہلے سکھائے جانے کے قابل تھی اُسکا آجتک کسی نے نام بھی نہیں لیا۔ ان استادوں کو سب سے پہلے بتانا تھا کہ تمھارا اولین فرض اور اہم ترین فرض یہ ہے کہ تمھاری ہی غفلت اور تمھاری ہی سہل انکاری سے ہمارے بچوں کی موجودہ تعلیم و تربیت میں جو جو نقائص اور جو جو خامیاں باقی رہ گئی ہیں تم سب سے پہلے اُنھیں کا علاج اُنھیں کی اصلاح کرو اسکے بعد انھیں سکھایا جائے کہ کن کن تدابیر سے ان خامیوں کا علاج اور اُنکی اصلاح ہونا ممکن ہے۔

ہمنے اپنے "آزادی" والے مضمون میں پہلے مرتبہ بتانے کی کوشش کی

ہے کہ کس طریق پر یہ امر بچوں کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آزادی کا صحیح مفہوم معلوم کریں۔ اسکے بعد سیکھیں کہ یہ آزادی کن کن قیود اور مستثنیات کی پابند ہے۔ مثلاً ایسے بچے جو بے سوچے سمجھے آزادی آزادی کی پکار مچائے رہتے ہیں انھیں سائنس کا سبق سکھاتے وقت جب اُستاد اُس موقعہ پر پہونچے جہاں چاند سورج سیّارے اور زمین کی گردش کا ذکر ہے۔ تو وہ تمھارے آزادی والے مضمون سے ایک روشن سبق لیکر بچوں کو بتائے کہ دیکھو قدرت نے تمام سیّاروں کو پوری پوری آزادی عطا کی ہے۔ کسی چھوٹے سیّارے کے گلے میں کسی بڑے سیّارہ کی غلامی کا طوق نہیں ڈالا گیا ہے نہ اسکے پاؤں میں بیڑیاں ہیں یہ وہ رسّی یا تار سے کسی دوسرے سیّارہ سے باندھ کر اسکا غلام بنا دیا گیا ہے۔ وہ آزادی کی ہوا میں آزادی کے چکر لگا رہا ہے اور اڑا پھرتا ہے۔ لیکن پھر بھی تمام چھوٹے چھوٹے سیّارے ایک بڑے سیّارہ کے اس حد تک پابند کر دئے گئے ہیں کہ اسکے گرد طواف کر کرکے خراج اطاعت ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح تم سارے طالب علم سیّارے ہو جو اپنے اُستاد کے گرد چکر پھر کے اُس سے ادب اور اخلاق کا سبق لے رہے ہو۔ اگر آسمان پر ایک بڑے سیّارے کے گرد بہت سے چھوٹے سیارے گھومتے ہیں۔ مگر وہ بڑا سیّارہ اپنے سے بھی بڑے سیّارے کا تابع ہے اور اسکے گرد گھوم کر اسکی اطاعت کا اعتراف کرتا ہے تو اسی طرح تمھارا سیّارہ یعنی تمھارا اُستاد اپنے ہیڈ ماسٹر کا تابع ہے گھر پہونچتے ہو تو تم سب بچے ملکر سیارے ہو اور تمھارا افسر خاندان تمھارا بڑا سیّارہ ہے۔ وہ بڑا سیارہ

بھی اور دوسرے بڑے سیارے کا تابع ہے اور وہ بڑا بھی اس سے بڑے ستیارہ کا یعنی تمھارا افسر خاندان حکام وقت کا تابع فرمان ہے اور حکام درجہ بدرجہ بادشاہِ وقت کے تابع ہیں۔ دیکھو جس طرح چھوٹے چھوٹے ستیارے ایکدوسرے کے تابع نہیں ہیں مگر پھر بھی ایکدوسرے کا حفظ مراتب رکھنے میں حد سے زیادہ سخت ہیں۔ ہر سیارہ کی گردش کے لئے ایک دائرہ کی حد معین کردی گئی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنی حد معینہ سے سرِ مُو تجاوز کر جائے اسی طرح تم اپنے ہم عصروں کا حفظ مراتب کرنا سیکھو۔ اگر تم انکا لحاظ رکھو گے تو وہ تمھارا رکھیں گے اور دنیا ایک فساد اور ہنگامہ کا بازار بن جائیگی ستیارے بھی اگر ایکدوسرے کا حفظ مراتب نہ رکھیں تو ایک ستیارہ دوسرے سے لڑ جائے اور ایسا قیامت خیز سانحہ ظہور میں آئے جس کی نظیر دنیا کی تواریخ میں کہیں نہ ملیگی۔ (باقی آیندہ)

حسن آرا

مثنوی طلسم ہستی

۱۹۰۲ء میں جس وقت کہ آزاد صاحب تحصیل ہاٹا ضلع گورکھپور میں نائب تحصیلدار تھے آپ نے یہ فارسی مثنوی تصنیف فرمائی تھی۔ مثنوی شریف کی بحر فارسی میں ایک مقبول عام بحر ہے۔ اور اسی بحر میں آپ نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آزاد کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسکی ابتدا عذور وشور کے ساتھ نہیں ہوتی جس طرح ایک عظیم الشان دریا جب اپنے منبع سے نکلتا ہے تو آغاز

محض ایک تپلی سی دھارے ہوتا ہے۔ مگر اس منبع سے نکلکر جتنے وسیع میدان
اُسے ملتے جاتے ہیں۔ اُسکی وسعت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور آخرکار ایک
دریائے قمار بنکر سمندر میں ملجاتا ہے۔ یہی حال آپ کے کلام کا بھی ہے۔
آزاد نے نہ کبھی ہمہ دانی یا اُستادی کا دعویٰ کیا نہ اب کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ
اپنے کو ایک گدائے گوشہ نشین کہا کئے ہیں۔ اور اب بھی کہتے ہیں۔ نام و نمود
کا انھیں نہ کبھی شوق پیدا ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے کو شاعر بھی
نہیں کہتے۔ بلکہ برعکس اسکے ہمیشہ یہی قول رہا کہ "میں ایک جاہل آدمی ہوں"
دنیا جہاں بہت سے ذی علم اور باکمال حضرات کا کلام سن چکی ہے۔ آج ایک
"جاہل آدمی" کا کلام بھی سن لے۔ (ایڈیٹر)

بادشاہا خالقِ ارض و سما — بالیقیں لا ابتدا لا انتہا
خالق و رزّاق مطلق ہم توئی — صانع و خلاق مطلق ہم توئی
آفریدی بحر و برگ و شجر — بارور کردی شجر را از ثمر
گوہرِ نایاب دادی بحر را — زیب انسان دادی دہر را
نورِ مہر و ماہ از درگاہ تست — ایں ہمہ عالم تجلی گاہِ تست
ذرہ ذرہ شاہد نورِ تو ہست — قطرہ قطرہ آید از جودِ تو مست
بینوا را تاج شاہی میدہی — مایۂ جمشید جاہی میدہی
شیرِ مادر دادئی ہر بچہ را — شیرۂ آبست شیرِ ہر گیا
صولتت را کوہ و بحر آمد پدید — ابر باراں دادہ از نخافت نوید
رعد از قہر تو لرزاند مرا — برق از بیم تو ترساند مرا

اجتماعِ ابر و باراں رعد و برق — شاہد است از مہر و قہرت غرب و شرق

ہر کجا من چشمِ دل وا میکنم — ذاتِ پاکِ تو تماشا میکنم

از فرازِ عرشِ اعظم برق وار — در سحابِ تیرہ آئی تابدار

مضطر و تابندہ ز آلایش بری — وہ کہ از اوہامِ ما چابک تری

میدوی و می تپی و بعد ازاں — اندرونِ ابر می آئی نہاں

باز شکلِ قطرہ می آئی پدید — تا نہاں باشی تہِ خاکِ پلید

زاں نشیمن در رگِ ہر خشک شاخ — میدوی خوش میدوی و ہم فراخ

برگ و بار آری شگفتہ میکنی — راز خود تا کے نہفتہ میکنی

اندرونِ غنچہ پنہانی عبث — بوے تو گل میدہد فردوس را

دیدہ ام گلہاے عالم بیشمار — شکلِ گوناگون رنگ صد ہزار

من بہر رنگت نمایاں یافتم — گہہ پدید و گاہ پنہاں یافتم

در رگِ سنبل تو پیچاں آمدی — اندرونِ زلفِ خوباں آمدی

لعلِ لبہاے ہمہ سیمیں تناں — اندرونِ خویش دارندت نہاں

سرخیِ رخسارِ گلرویاں توئی — اندرونِ مردمک پنہاں توئی

دا چشم از وجودت نور دار — تا تماشایت کنم لیل و نہار

پرتوت در جسم و جانم بنگرم — در رگِ روح و روانم بنگرم

سینہ ام را سازِ عرشِ پاکِ خود — پاک دار ایں مشتِ خاکِ پاکِ خود

حرص و کینہ از خاطرِ من دور دار — وز ریاکاری مرا معذور دار

نخوت و ہم غصہ ما را بکش — سرکشیِ نفسِ امارہ بکش

همت مردانہ من برفزائے — قدرت خود کن بمن جلوہ نمائے

للہ الحمد اے خدائے ذو المنن — خوش دلی یارب عطا کردی بمن

ہست مستغنی دلم از جاہ و مال — پس عبث دانم شدن افسردہ حال

چیست غم - راحت کرا یابند خلق — در توہم روز و شب باشند خلق

رنج و راحت زادۂ اوہام ماست — خوش کسے کو زیں توہم ہا جداست

فکر و اندیشہ بود آزار دل — نیست عاقل کو در افتد پا بگل

اندریں دور سپہر چنبری — ہفت صد ہفتاد زاد آدمی

مشکل ما در کارگاہ ایں جہاں — مبتلا ماندند بند ایں و آں

آنچہ می بینیم کار ایں جہاں است — ایں چنیں کیں ہست بودہ آنچناں است

آنچہ بودن باید آں خواہد شدن — گو کرا یاراست بہر دم زدن

اضطرارت در حصول مدعا — گو برائے چیست اے مرد خدا

دولت و ثروت زمیں فرزند و زن — نیست زیں یک کو دہد آرام تن

مدعائے دل چہ داری مدعی — عیش و آسایش کرا نامیدئی

عیش و آرامے کہ ہر شب میدہی — ہست در امکان تو گر بشنوی

رنج را رنجے مپندار اے عزیز — خوش بسر کن درمیان رنج نیز

گرچہ شادی شاد باید زیستن — گر نئی غافل ز حد خویشتن

چوں نباشد شادی و غم را وجود — آنچہ باشد ہست و آں بود و نبود

گرچہ خواہی حاصلت راحت بود — رنج و راحت در خیالت یک شود

عقل و فہم دانش و بینش ترا — چوں عطا کردست رب کبریا

چوں ترا در نسل انساں زادہ اند — گوش و چشم و دست پایت دادہ اند

یا فتستی چوں درون خلق بود — ہم درونِ خلق میداری وجود

پس برائے چیست از خلقت گریز — میکنی با عقل صالح رستخیز

خلق محتاجت تو ای محتاجِ آں — پس جدا از خلق ماندن کے تواں

خلق بہرت ہم تو اے ز بہر خلق — ساز با نیرنگیِ ایں دہر۔ خلق

بسکہ دشت و کوہ ہامونِ جہاں — ہست بزمِ جلوۂ قدرت عیاں

چشمہ باشد چشمۂ فیضِ اللہ — شاہدِ توحید ہر تازہ گیاہ

از برائے حمد خلاقِ جہاں — برگ سبز ہر شجر باشد زباں

نیست مشکل ذکرِ حق کردن بدشت — اندرونِ خلق ایں دشوار ہست

نیست مردی کیں زن و فرزند خویش — وا رہانی با دلِ محزون و ریش

مرد آں دانم کہ او مردانہ وار — ہر نفس با صد بلا گردد دوچار

حرص و نخوت احتیاج و مفلسی — رنج و راحت دوستی و دشمنی

سرکشی نفس امارہ براں — جملہ با سازند ہر دم ہر زماں

نادر و رنگے دگر چیزے برد — لغزشے نارند پائے راست رد

نفرت از خلقِ خدا از بندہ نیست — ہر کہ از خلقت گریزد بندہ نیست

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

(مشتے نمونہ از خروارے)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہٗ کے نواسہ اور جانشین صوفیاے کرام کے سر پر خلافت روحانی کے زیب تاج و نگین۔ درویشانِ مقبول کے مایۂ ناز۔ اور حلقہ نظام المشائخ کی صدارت پر ممتاز یعنی قدوۃ العارفین حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب قدس سرہٗ و مدظلہٗ "پیام امید" کی ان الفاظ میں عزت افزائی فرماتے ہیں۔

"جنوری و فروری ۱۹۱۶ء کے "پیام امید" کو میں نے بہت شاندار پایا۔ اللہ کے بندے نے جو مضمون "حافظ اور ڈاکٹر اقبال" پر لکھا ہے۔ وہ بہت مفید۔ مدلل۔ موثر اور سرشار ہے..... میری لڑکی..... اور بیوی..... نے رسالہ "پیام امید" کو بہت دل لگا کر پڑھا۔ اور تمھاری لیاقت پر بہت عش عش کی۔ تم کو جو مصائب پیش آئے انکا حال رسالہ میں پڑھ کر ہم سب کڑھے۔ اور تمھارے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ یہہ دنیا کی مقررہ پریشانیاں ہیں۔ انسان کے فرائض میں انھیں سے کسی چیز کو خستہ انداز ہونے کی طاقت نہیں ہے۔ تم انکی کچھ پروانہ کرو۔ میں نے اخبار "خطیب" کو لکھا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ یہہ مضمون "اسرار خودی" والا اپنے اخبار میں نقل کرینگے۔ میں تمھارا کامی وقت زیادہ طول نویسی سے خراب نہیں کرونگا

یہہ جو کچھ لکھا ایک نیچرل داد تھی جسکی تم حقدار ہو"

ان سطور کے نیچے محترمہ خواجہ بانو صاحبہ مدظلہا یوں تحریر فرماتی ہیں۔

"میرا اسلام لیجیئے۔ کبھی دہلی آنا ہو تو ہم خاکساروں سے بھی ملئے۔۔۔ خواجہ بانو

اس نام کے اس لقب کے صدقے۔ اس پیار کے اس طلب کے صدقے۔

عاجزہ ایڈیٹر اس عزت افزائی کا کہاں تک شکریہ ادا کرسکتی ہے سوا اسکے

کہ ادب و انکسار سے دعا کرے کہ اس ذرہ نوازی کی جزاے خیر اللہ

انھیں دے۔ ناچیز ایڈیٹر

ایک ایسا ہی خط درگاہ مارہرہ شریف سے بھی موصول ہوا ہے جسکا کچھ

حصہ ہدیہ ناظرین ہے۔

" آپنے ایک ایسا کام کیا ہے جسکا احسان نہ صرف فنِ ادب پر ہے بلکہ

اہل اسلام اور صوفیاے کرام پر ہے۔ جزاک اللہ خیرالجزاء"

جناب مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی

رسالہ "پیام امید" بابت ماہ دسمبر میرے پاس پہونچا۔ اور میں نے

اُسے پڑھا میرے نزدیک آپ بڑی محنت اُٹھا رہی ہیں۔ خداوند عالم آپکو

کامیاب فرمائے۔ عورتوں اور مردوں دونوں کے پڑھنے کے لئے یہہ

رسالہ بہت موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے"

سید محمد ہاشم صاحب رئیس پرتاب گڈھ

" پیام امید میرے دیکھنے میں آیا۔ مضامین بہت عمدہ اور اعلےٰ درجہ

کے ہیں۔ خدا کرے اِسکی اشاعت میں نمایاں ترقی ہو"

سری نواس مانڈر ونگ صاحب وکیل۔ فورٹ رائچور۔ دکن

"میں نے رسالہ پیام اُمید ملاحظہ کیا۔ واقعی اسم بامسمیٰ رسالہ ہے۔ خداکرے اِس سے جیسی اُمید کیجاتی ہے۔ ویسا ہی مفید ثابت ہو۔ اللہ آپکو اِسی طرح ذی ہمت اور کمربستہ رکھے"۔

مسز کرامت علی صاحب گیلانی سب انسپکٹر ریاست بھاولپور

آپنے توسیع اشاعت میں بھی اعانت فرمائی ہے۔ جسکے لئے ہم آپکے بیحد مشکور ہیں۔ ایڈیٹر

"دو پرچے پیام اُمید کے میں نے دیکھے۔ پرچوں کی تعریف کرتی ہوں۔ دوسرے پرچوں سے بہتر ہیں"۔

والدہ مصطفےٰ اشرف صاحب۔ کوٹھی لطافت۔ جیم یارخاں سجے پور

"رسالہ پیام اُمید کل میری نظر سے گذرا۔ میری حیرت کی کوئی حد نہیں رہی جب میں نے رسالہ کے ضوابط میں یہہ پڑھا کہ ہندو خواتین کو آپ رسالہ مفت عنایت فرماتی ہیں۔ واقعی جب آپکے حوصلے اسقدر بڑھے ہوئے ہیں تو کامل اُمید ہے کہ خدا آپ کو کامیاب کرے گا۔ خدا آپ کو اور رسالہ کو نظر بد سے محفوظ رکھے"۔

آپکی نوکِ قلم کی زخمی مسز سید اسد۔ سکندرآباد دکن

"پیام امید" بابت ماہ ستمبر ۱۹۱۸ء اتفاق سے میری نظر سے گذرا۔ رسالہ واقعی قابل قدر ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم "پیام اُمید کو ترقی دے"

میرزا عمادالدین صاحب۔ باغ۔ شہر بنارس

"دو پرچے "پیام اُمید" کے پڑھے۔ میں بلا کسی معاوضہ کے توسیع اشاعت میں مدد دینے کو بدل طیار ہوں"

سید ابن رضا صاحب ہاشمی۔ ریاست بھرتپور

"پیام اُمید" کے ۷ نمبر مجھے ملگئے۔ اور میں نے نہایت شوق اور دلچسپی سے انھیں مطالعہ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ رسالہ کی قیمت کم ہے۔ بلا قیمت اشاعت کے اغراض پیش نظر ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ شروع ہی سے مضامین کا جو التزام اور معیار رکھا گیا ہے۔ اُسمیں بحمد اللہ ایک نمبر دوسرے پر فایق ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ انشاء اللہ میری خریداری میری زندگی تک قایم رہیگی۔۔۔۔ میں آپ کی ایثار اور علو حوصلہ پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کی خواہش کے مطابق آپکو کامیاب کرے"

حبیب الحسن صاحب۔ گوہر گنج۔ ریاست بھوپال

ضوابطِ رسالہ

اس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہونگے۔ "پیامِ اُمید" تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا
آلہ بننا چاہتا ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ اِسکے مخاطب تمام روشن خیال مرد او مستورات ہیں۔
ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اصلی کام
آج ہی سے شروع نہیں کرایا جاسکتا۔ ہمیں سب سے پہلے اتحاد پیدا کرنا ہے جبتک ہندو مسلمان
اور شیعہ سنی آپسمیں لڑتے رہینگے۔ قوم اور ملک کی ترقی اصلی اور حقیقی معنوں میں بالکل ہی غیر ممکن ہے
ہماری کوشش کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم (۱) مسلمان خریداران رسالہ سے تین روپیہ سال قیمت لینگے
اور اردو خواں ہندو خواتین کو رسالہ مفت نذر کرینگے جہاں تک اور جس حد تک کہ ہماری اشاعت اِس
بار کی برداشت کرنے کی قوت ہمیں دے سکیگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم ہندو خواتین سے متفق الرائے
ہوجائیں تو مردوں کے خیالات اتنے جلد پلٹا کھاجائینگے کہ دنیا کو حیرت ہوگی (۲) قومی اور ملکی ترقی کی
پہلی منزل زبان کی ترقی ہے۔ ہم اُردو علم ادب کی ترقی اور توسیع میں سعی بلیغ کرینگے اور وقتاً
فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہیں گے۔ تاکہ لایق مضمون نگاروں کو اچھے اور مفید مضامین
لکھتے رہنے کی ترغیب اور تحریص ہو۔ رسالہ کی اشاعت بڑھنے پر ہم کوشش کرینگے کہ مفید علمی
کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے ہماری زبان میں کئے جائیں اور مناسب قیمت پر فروخت ہوں۔
(۳) ایسے بچے جو کافی طور پر علمی ترقی کرچکے ہیں اور ہر اہم مسئلہ پر ایک خاص رائے قائم کرنے کے
مستلاشی ہیں انہیں ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں خارجی مدد پہنچانے کی سخت
ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ زمانہ انکے لئے نہایت نازک زمانہ ہے۔ اگر وہ کسی اہم مسئلہ پر کوئی غلط
رائے قائم کرلینگے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کے دماغوں میں نشو و نما پاکر وہ غلط رائے جم جائیگی
تو ان کی ساری عمر برباد کردینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہوگی ہم انہیں ایسی خارجی مدد عین وقت پر
پہنچائینگے تاکہ آگے چلکر وہ بھی ترقی کی رفتار میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھیں۔

اُجرت اشتہارات

توسیع اشاعت رسالہ کے ساتھ اُجرت اشتہارات میں تخفیف ہوئی ہے۔ موجودہ نرخ حسب ذیل ہے
مگر اسمیں کمی ممکن نہیں ہے۔ اور نہ مزید تخفیف کے لئے مراسلت ہونے پر کوئی جواب دیا جائیگا۔

اندازِ صفحہ	ایکبار	سہ ماہی	ششماہی	سالانہ
چوتھائی صفحہ	1/-	2/8/-	4/8/-	7/8/-
نصف صفحہ	2/-	5/-	9/-	15/-
پورا صفحہ	4/-	10/-	18/-	30/-

رقوم مندرجہ بالا پیشگی واجب الادا ہیں اور یکمشت وصول ہونا چاہئے۔ منیجر رسالہ

شیکسپیر اُردو نظم میں

محمود۔ شیریں میری پیاری رشکِ گلزار ہے ہے تمھیں کیا ہوا ہے آزار
کیوں خشک یہ لب ہیں کیوں بگڑی ہے کمھلائے ہیں کیوں یہ گل سے رخسار
شیریں پانی کی کمی کے ہیں یہ آثار کھلانا نہیں کچھ ان کا دشوار
ہے چشمۂ چشم دیر سے بند اشکوں کی نہیں ہوئی ہے بھرمار

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف نہ آئے تو ہمارا ذمہ۔ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جسے اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) نے اصل کتاب "مڈسمر نائیٹس ڈریم" سے لکھنؤ کی شستہ زبان اور گلزار نسیم کی بحر میں کیا ہے۔ یہ وہی ترجمہ ہے جس نے ہندوستان سے لندن تک شہرت پائی ہے۔ جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ اب جدید اشاعت خاص اہتمام سے نفیس کاغذ پر معہ مؤلف کی ہاف ٹون تصویر کے زیر طبع ہے۔ جو صاحب اشاعت سے پہلے اپنا نام درج رجسٹر کرائینگے انھیں رعایتی قیمت پر کتاب مل سکیگی۔

حجم تخمیناً ۲۰۰ صفحہ قیمت اصلی عہ رعایتی عہ
ایضاً معمولی سفید کاغذ پر بلا تصویر اصلی قیمت عہ رعایتی ۱۲ا

ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ "پیام اُمید" ایٹہ۔ یو پی

امید کا پیام "اُٹھو اُٹھو اور آگے بڑھو"

امید

نمبر ۱	ایڈ - اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء	جلد ۱

ایک ماہنامہ علمی و ادبی صحیفہ۔ پیام امید کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ ایمن جعفری ایڈیٹر

"کچھ بھی نہیں"

"سویرا ہے۔ نور کا تڑکا ہے۔ اُٹھو چلو۔ میدان کی سیر کریں۔ یہ تاروں کی چھاؤں
نسیم سحر کی اٹکھیلیاں۔ یہ فرح بخش تازہ پھولوں کی خوشبو جس سے ہوا معطر
ہو رہی ہے پھر نصیب نہ ہوگی"۔ وہ اُٹھتا ہے۔ چلتا ہے۔ کفِ دست میدان
میں پہونچکر اوچاٹ نظریں دوڑاتا ہے کہ قدرت کی دلچسپیوں کا نظارہ کرے
اب کچھ کچھ روشنی نمودار ہو چلی ہے۔ صبح اُمید کا سفیدا اپنی دلفریب جھلک
دکھا رہا ہے۔

"دور۔ بڑی دور۔ وہ سامنے دیکھو پہاڑ کی اونچی چوٹیوں پر سفید برف جھلک رہی ہے۔ اوہو ہو! کیا دلکش منظر ہے۔ پہاڑ بھی جیسے کچھ ایسا بہت دور نہیں ہے۔ وہ دیکھو پہاڑی راستے ایک ایک صاف الگ الگ دکھائی دے رہے ہیں۔ نیچے والے حصہ کے درخت اتنے صاف ہیں کہ ہم چاہیں تو ایک ایک کر کے گن لیں اوپر کے درخت البتہ گنجان ہیں بالکل گچھا ہو رہے ہیں۔ داہنے بائیں جانب کے درختوں کی بھی یہی حالت ہے۔ بہتے ہوئے چشمے ہمیں صاف نظر آرہے ہیں۔ گو ہم اُنکے بہنے کی آواز نہیں سن سکتے ہیں مگر دیکھ سب کچھ رہے ہیں۔ آؤ آگے بڑھیں اور اس پُرلطف منظر کا تماشا کریں" نا تجربہ کار لڑکا چل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی دُھن میں سیدھا تیز رو تیر کی طرح اڑا جا رہا ہے اور نہیں معلوم کتنی دور چلا آیا ہے۔ وہ پہاڑ کو جتنا قریب سمجھتا تھا اتنا ہی دور نکلا۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا اور پے در پے کوششوں کے بعد آخر وہ وہاں تک پہونچ ہی تو گیا۔ اور پہونچا تو کیا پایا؟" کچھ بھی نہیں!" ایک ناہموار کاواک کچکول پتھروں کا ڈھیر۔ ویرانی۔ اور کچھ نہیں۔ اب وہ آگے بڑھتا ہے۔" اہاہا۔ کیسے شاداب درخت ہیں۔ درختوں کے بیچ میں اُنکے ٹھنڈے سایہ میں صاف شفاف پانی کے قدرتی چشمے ہیں۔ اور وہ فضا ہے کہ سبحان اللہ اور صل علےٰ" ایک طرف تخیل اس دل آویز منظر کی کیسی ہی دلربا تصویریں کھینچ رہا ہے" یہاں گنجان درختوں کا سایہ ہے۔ یہاں سبزہ ہے یہاں قدرتی چشمے ہیں۔ یہاں قدرت کی ہر نعمت موجود ہے۔" دوسری جانب آفتاب عالمتاب کی طلائی کرنوں کے نیزہ بردار تعاقب میں مصروف ہیں اور کہتے ہیں "بھاگو۔ یہاں سے بھاگو۔ اسی میں خیر ہے!" تشنگی کا غلبہ ہے۔ ماں باپ

کے لاڈلے۔ نازوں کے پالے۔ ناتجربہ کار بچے میں جفاکشی کہاں۔ تن آسانی کی عادت آرام ڈھونڈھتی ہے۔ وہ ماں باپ کی نازبرداری کا ان سنگدل پہاڑ کے پتھروں سے طالب ہے۔ مگر یہاں سوا خاک پتھر کے اور کیا دھرا ہوا ہے! آخر کار وہ اٹھکر افتاں وخیزاں ہانپتا کانپتا دوڑتا دھوپتا کسی نہ کسی طرح آخران گنجاں درختوں کے تلے چشموں کے کنارے پہونچتا ہے اور بیدم ہوکر سبزے پر لوٹ جاتا ہے مگر یہاں پہونچکر اُسنے کیا پایا؟ "کچھ بھی نہیں!"

وہ مقناطیسی کشش جو دور ہی سے اس منظر کی جانب اسکا دل کھینچ رہی تھی اب کافور ہوگئی ہے۔ ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ لامعلوم شے جو ایک دل کو اپنے ہی جانب کھینچ رہی تھی۔ جسے دیکھے بغیر اُسے چین ہی نہیں آتا تھا وہ یہاں کہیں نام ونشان کو بھی نظر نہیں آتی۔ ہاں درختوں کا سایہ ہے۔ چشمے ہیں۔ سبزہ ہے۔ اور بس۔ اور کیا ہے؟ "کچھ بھی نہیں"

مگر آخر وہ کیا شے تھی جس نے اتنا اشتیاق پیدا کر دیا تھا؟ وہ کیا تھا جس میں اتنی کشش تھی؟ آخر وہ تھی کیا شے؟ "امید" امید کی ساری امنگیں امید ہی کے سارے جذبات اور امید ہی کی ساری کشش تھی اور کچھ نہ تھا۔ امید ہی نے اس معمولی سیدھے سادے منظر کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا اور وہ اسے کیا سے کیا سمجھنے لگا تھا۔ ہمارا نوعمر سیاح سمجھ رہا تھا کہ یہاں شاید ہماری دنیا کی بہشت ہوگی۔ اُسے خیال تھا کہ یہاں پہونچکر شاید وہ لامعلوم اور بے پایاں خوشی۔ وہ دلی مسرت وہ خیالی راحت جسے سچی خوشی اور سچی فرحت تصور کرکے انسان رات دن اسی کی تلاش میں پریشان حیران اور سرگرداں رہتا ہے۔ جسکی دھن میں

وہ ہمیشہ ہر وقت غلطاں و پیچاں رہا کرتا ہے اُسے حاصل ہو جائیگی۔ مگر یہاں نہ گل ہے نہ بلبل۔ نہ یہاں باغ ہے نہ چمن۔ نہ یہاں وہ فضا وہ جنت کی فضا ہے جس کی آپ کو تلاش ہے۔ ہمارا ہٹیلا بچہ نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے" نہ ہو نہ سہی۔ سایہ تو ہے۔ سبزہ تو ہے۔ خوشگوار ہوا تو ہے۔ گوشہ عافیت تو ہے۔ ہم تو اب دنیا میں واپس نہیں جاتے۔ بس ہم تو اب یہیں کے ہوئے۔" وہ بیفکری سے سبزے پہ دراز ہو جاتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگتا ہے . . . .

اے لو۔ وہ اب اٹھتا ہے سنو کیا کہہ رہا ہے

"نہیں۔ اتنا سوئے۔ یہ تو شام ہو گئی! ہمارے احباب کہاں ہیں؟ کدھر گئے؟ یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آتا!" وہ کلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہا ہے۔ پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں سے ٹکرا کے صدائے بازگشت اُس کا منہ چڑا دیتی ہے۔ جواب دینے والا تو ایک بھی نظر نہیں آتا! اُسے اور طیش آتا ہے" ہمارے احباب کہاں گئے؟" پہاڑ اپنی بے پایاں کرخت آواز میں یوں منہ چڑاتا ہے" ہمارے احباب خوباں گئے؟" "اللہ! سب کو سانپ سونگھ گیا" پہاڑ جواب دیتا ہے" اللہ! سب کو سانپ سونگھ گیا!" "ارمان! ارے میاں، کوئی تو بولو!" "ارماں کوئی تو بولو!" اس بار بار بات بات پر منہ چڑا دینے پر وہ جھلا اٹھتا ہے اور اپنے یاران طریقت کے نام لے لیکر پکارنا شروع کر دیتا ہے۔

"میاں تمنا خاں! بھائی امید علی! میاں حسرت حسین! ارے کمبختو کدھر غائب ہو گئے!" ایک سناٹے کا عالم ہے۔ سارا پہاڑ سائیں سائیں کر رہا ہے۔ نوعمر بچہ دوڑ دھوپ سے تھکا ماندہ تھا۔ اب بھوک اُسے بری طرح ستا رہی ہے۔ یہاں کیا دھرا ہے! وہ اٹھتا ہے۔ چشمے کے کنارے [illegible] ہاتھ دھوتا ہے۔ اور اٹھکر کھانے کی فکر میں

ادھر اُدھر ڈانواں ڈول پھرتا ہے۔ یہاں کیا ہے؟ - اللہ کا نام ہے۔ درختوں کی پتیاں ہیں۔ چاہو تو چبالو۔ یا تازہ ہرا ہرا سبزہ زار ہے۔ چرو اور پیٹ بھرلو - کوئی نہ پوچھے گا۔ یہاں کوئی مویشی خانہ بھی نہیں ہے۔ خوب بے ڈر ہو کے چرلو۔ پیٹ بھرلو اور اس چشمہ کا پانی پی کے اس گھانس پر سو رہو۔ یہاں کا دلکش منظر بس اتنا ہی مہماں نواز ہے۔ اب تو صاحبزادے کی سیٹی پٹاق بھولی ۔ واللہ بری ستائی۔ الہی توبہ! ارے ہم تو بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور یہاں آپکو تبہل کی سوجھی ہے۔ "یا اللہ کوئی کچھ کھانے کو دے" پہاڑ کی صدائے بازگشت کا گرامو فون اسے بچہ سے چڑھا دیتا ہے۔ "یا اللہ کوئی کھانے کو دے" اور وہ آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ مگر اس بگڑنے سے کیا بنتا ہے۔ کیا ہاتھ آتا ہے؟ کھانے کے لئے کیا مل جاتا ہے؟ "کچھ بھی نہیں!"

اس بچے کو یہیں چھوڑو۔ اسے بھوک پیاس کی قیمت اور اکے تجربہ کا مفید سبق مول لیا ہے۔ اب تجربہ خود ہی اسکی رہبری کردے گا۔ ہاں دولت کے طالبوں کو دیکھو۔ ہاے روپیہ ہاے روپیہ چلا رہے ہیں۔ سر پھوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اسی پر مر رہے ہیں کہ روپیہ ہاتھ آئے۔ اور کسی کی محنت رائگاں نہیں کیا۔ مقدر کے موافق تھوڑا بہت ہر شخص پا ہی جاتا ہے۔ مگر اس شخص سے پوچھو جس کے پاس تمہارے خیال میں سب سے زیادہ دولت ہوگی۔ دنیاوی دولت سے اسے کیا ہاتھ آیا؟ - "کچھ بھی نہیں" کیا دولت کسیکو اصلی راحت سچی خوشی دے سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بعض موقع ایسے بھی ہوئے ہیں جہاں ساری دنیا کی دولت بیکار ثابت ہوئی ہے۔ ابھی مدت کی بات نہیں ہے کہ ایک امریکن لکھ پتی کا لڑکا۔ اپنے لکھ پتی

باپ کا اکلوتا بیٹا باپ کا زمین دوز خزانہ دیکھنے گیا اور دیر تک ایک ایک جواہر کو نظر غور سے دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔ پہرے والوں نے دیر کے بعد سیکڑوں آوازیں دیں جواب نہ ملا۔ بہت تلاش کی مگر نہ پایا۔ لڑکا کہیں کسی گوشہ میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ آخر کار خزانہ کا پھاٹک بند کر لیا گیا۔ بہت دیر بعد لڑکا اپنی جگہ سے اوٹھا۔ اور پھاٹک بند پاکر سیکڑوں آوازیں دیتا رہا مگر اسکی آواز باہر نہ آئی اسی طرح وہ اس قفس کے اندر کئی روز بے آب ودانہ بند رہا۔ آخر بھوک اور پیاس نے اپنا اپنا حملہ شروع کر دیا اور لڑکا جاں بلب ہوگیا۔ مرنے سے کچھ پہلے وہ ایک کاغذ کے پرچے پر پنسل سے یہ عبارت لکھ کر مر گیا۔ "کاش ان جواہرات کے بدلے یہاں کچھ کھانے پینے کا سامان ہوتا تو میں کچھ دیر اور زندہ رہتا۔ کاش اس ساری دولت کے بدلے اسوقت مجھے کوئی مٹھی بھر چنے اور ایک گلاس پانی دیدیتا"! جائے عبرت سرائے فانی ہے"!

تم لوگے لاکھوں کروروں میں کہیں ایک واقعہ ایسا ہوگیا لہذا مستثنیات میں ہے اور اسکی بنا پر اصول میں تغیر نہیں ہوسکتا۔ اسے بھی جانے دو۔ تم ہر شہر میں جہاں چاہو ڈھونڈ لو۔ ایسے بہت سے ملینگے جنہیں اللہ نے خوب دل کھول کے دولت دی ہے مگر یہ دولت انہیں سچی خوشی نہیں دیسکتی ہے۔ وہ رنجور اور دلگیر ہیں۔ صحت درست نہیں ہے۔ فرض کرو کہ وہ ایک امیر کبیر ہے مگر کوڑھی ہے۔ میں پوچھتی ہوں پھر آخر یہ ساری دولت وثروت اسکے کس کام کی ہے؟ یہ دولت اسے کیا عیش کیا آرام دیسکتی ہے؟ "کچھ بھی نہیں!" اگر کوئی شخص اسکی ساری دولت سے ایک صاف ستھرا کوڑہ سے پاک جسم بدل سکے تو وہ آج بدلنے پر طیار ہے کسی کے اولاد نہیں ہے اور یہ کانٹا اسے ہر وقت بے چین رکھتا ہے۔ کسیکا نہایت؟

محبوب عزیز مر گیا ہے اور وہ دن رات اُسکی یاد میں تڑپا کرتا ہے سچی خوشی وہ شے نہیں ہے کہ روپیہ سے خریدی جا سکے۔ وہ ایک لازوال دولت ہے ایک نعمت ہے جو اللہ پاک کی دی ہوئی ہے اور اللہ جل شانہ یہ نعمت اُسکو دیتا ہے جس پر اسکی خاص رحمت نازل ہوتی ہے۔

بعض اللہ کے بندے اچھی صورت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ زمانے کے بازیگر کا ایک تماشا ہے۔ ایک شعبدہ ہے۔ اچھی سے اچھی صورت کے اندر کیا دھرا ہوا ہے؟ چشم باطن سے دیکھو تو "کچھ بھی نہیں!"۔ جو صورت آج نظر فریب اور دلکش نظر آتی ہے کل دس برس بعد سیدھی سادی دکھائی دیگی۔ پرسوں اور دس برس بعد پیری وصد عیب کا شکار بنکر کھلواں اور کاواک ہو جائیگی۔ ترسوں اور دس برس بعد سر سے غائب ہو جائیگی! تمنے بازیگر کا تماشا اکثر دیکھا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک مختصر سی مٹی کے ڈھیر میں سے چشم زدن میں ہرے بھرے پیارے پیارے چھوٹے موٹے آم کے پودے پتے اور گدراموں سے لدے ہوئے پیدا کر کے دکھا دیتا ہے۔ آم توڑ کے تمھارے پاس لاتا ہے اور تمہیں چکھا دیتا ہے۔ تم اُسکے کرتب کی داد دیتے ہو اور تعریف میں محو ہو جاتے ہو۔ مگر دوسرے منٹ کے اندر نہ وہ ہرا بھرا پودا باقی رہ جاتا ہے اور نہ آم کا تماشہ۔ کچھ دن اس شعبدہ باز بازیگر کے کرشموں کا ہر کوچہ و برزن میں چرچا رہتا ہے۔ اسکے بعد "کچھ بھی نہیں!" اس دنیا میں ہماری ہستی بس اُس آم کے پودے کی مثل ہے۔ زمانہ کا بازیگر آن واحد میں ہمیں خاک کی تہ سے کھینچکر اوپر لا کے بٹھا دیتا ہے۔ دیکھنے والے واہ واہ سے تحسین کر دیتے ہیں مگر پھر دوسری ساعت میں ہم جہاں کے تہاں پہونچ جاتے ہیں

اور مٹی میں ملکر مٹی ہوجاتے ہیں۔ ہم کیا ہیں؟ "کچھ بھی نہیں!"۔ وہ حسین جس کی دل لبھا لینے والی پیاری پیاری صورت ہمارے دلکو اپنی ہی جانب کھینچے لیتی ہے۔ اسمیں کیا دھرا ہوا ہے؟ "کچھ بھی نہیں!" ایک مشت خاک ہے اور کچھ نہیں۔ صناعان لکھنؤ کے بنائے ہوئے مٹی کے کھلونے دیکھنے کا مجھے بار ہا اتفاق ہوا ہے۔ کیسی پیاری پیاری صورت کے کھلونے بناتے ہیں کہ جو دیکھتا ہے محو حیرت ہو کے رہ جاتا ہے حقیقت کی طرف جاؤ تو بد ھرتی دیتے ہیں کھلونے ہیں مٹی سے بنائے گئے ہیں اور بہت جلد پھر مٹی ہی میں تبدیل ہوجائینگے۔ مگر فرق ہے تو اتنا ہی کہ وہ مٹی کے کھلونے معصوم ہیں۔ اُنکے سر کوئی جوابدہی نہیں ہے۔ اُنہیں بچے کھیلتے ہیں اور توڑ کے پھینک دیتے ہیں۔ وہ پھر خاک میں ملکے خاک ہوجاتے ہیں۔ مگر برعکس اسکے ہمارا ایک ایک فعل قلمبند کیا جارہا ہے اور ایک دن ہمیں ہر ہر کام کا حساب دینا ہوگا۔ ہماری تصویر آج ٹوٹے یا کل اس سے بحث نہیں مگر ہم ایک جوابدہ تصویر ایک ذمہ وار کھلونا ہیں۔

تم کہوگے کہ دنیا کی ترقی کرنے والی قومیں اپنے بچوں کے آگے یہ سٹریاں سرائی نہیں کرتیں وہ انہیں کبھی نہیں سکھاتی ہیں کہ تم مر جاؤگے سڑ جاؤگے۔ فنا ہو جاؤگے مٹی میں ملکر مٹی بنجاؤگے تم کہوگے کہ ہماری ایشیائی تعلیم کی یہ بڑی خامی ہے اور اس خامی نے اپنا زہریلا اثر پھیلا کر ہماری ساری قوم کو کاہل بیکار اور بے مصرف بنا کے دھر دیا ہے۔ بیچ تمھارا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ مگر میرا مقصد تمہیں کاہل بنانا نہیں ہے۔ میں تمہیں مرنے سڑنے کی بھیانک اور ہولناک تصویریں دکھانے نہیں آئی ہوں۔ بلکہ برعکس اسکے میری دلی تمنا اور میری دلی آرزو یہی ہے

کہ تم زندۂ جاوید بن جاؤ۔ تم کبھی نہ مرو کبھی نہ فنا ہو۔ میں تمہیں آبحیات پلا دینا چاہتی ہوں۔ دنیا کا آب حیات کہاں ہے؟۔ ظلمات کے سات پردوں کے تہوں میں لپٹا ہوا کہاں کس کونے میں پڑا ہوا ہے کہ دنیا اسکی ازل سے متلاشی ہے مگر ابد تک نہ پائیگی! کیا تم حیات ابدی کے تلاش میں ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ زندۂ جاوید بن جاؤ؟ کیا تم چاہتے ہو کہ موت کا آہنی پنجہ تمہیں زیر نہ کر سکے اور تم ابد الآباد تک زندہ رہو؟ یہاں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ نپولین کہ گیا ہے کہ "ناممکن" کا لفظ ہماری لغات سے نکال دو۔ یہ لفظ بے معنی ہے۔ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں۔ ہاں اگر تم ناممکن کو ممکن کر دکھانا چاہتے ہو تو آرام طلبی۔ سستی۔ کاہلی سے فوراً دست بردار ہو جاؤ۔ ہمت شجاعت صبر۔ استقلال کے ہتھیاروں سے مسلح ہو۔ کمر ہمت باندھو۔ اور مرد میدان بنکر کام کی تلاش میں اٹھو۔

"اٹھو۔ اٹھو۔ اور آگے بڑھو!"

دیکھو دنیا کے وسیع میدان میں کام کرنے والوں کی صفیں کام کرنیوالوں کی متلاشی ہیں۔ دنیا تمہاری ہی منتظر ہے۔ اُٹھو اور کام کرو۔ یہی کام کرنے والوں کی صفیں آب حیات کی محافظ ہیں۔ محافظ ہی نہیں بلکہ مالک ہیں۔ اس چشمہ کی راہ انہیں معلوم ہے۔ اس خزانہ کی کنجی انہیں کے جیب میں رہتی ہے۔

مجھے بھی خواجہ خضر نے ایک بار اس آب حیات کا پتا خواب میں بتایا تھا۔ تم کہو گے کہ خواب خیال کی باتوں پر تمہیں عقیدہ نہیں مگر مجھے تو ہے۔ اچھا میں تمہیں سے اس خواب کی تعبیر پوچھتی ہوں۔ دیکھوں تم کیا کہتی ہو؟۔ پیارے بچو خواجہ خضر کہتے تھے کہ

"یہہ آب حیات تمہارے دماغوں کے پردۂ ظلمات میں ہے"
اِن پردۂ ظلمات کی تاریک تہوں میں نور علم کی برقی روشنی پھونچاؤ۔ تو تمھاری آنکھیں کھل جائینگی اور تم بیقرار ہوکر چیخ اُٹھو گے کہ۔

"یار در خانہ و من گرد جہاں میگردم"

مگر یاد رکھو جس علم کی روشنی میں تمہیں چودہ طبق صاف صاف نظر آنے لگیں وہی علم تمہارے کام کا ہے۔ یہ دیوانی ہانڈی کا گڑبڑ گھوٹالا جس سے آجکل تمہارے دماغوں کی ضیافت کیجارہی ہے۔ اسکا م کا نہیں ہے۔ تم بی۔اے پاس کرکے یہ نہ سمجھو کہ تم عالم ہوگئے۔ کتاب طاق پر رکھدو اور اُسے دیمک چاٹ جاے۔ تم پڑہو اور پڑھو اور پڑھو۔ اور پڑھتے جاؤ جب تک پڑھ سکو۔ اگر ہمارا میلان طبع ادب کیجانب ہے تو ادب ہی پڑھو۔ تم ریاضی داں ہو تو ریاضی ہی کو اپنے لئے منتخب کرلو۔ فلسفہ سے خاص دلچسپی رکھتے ہو تو اسیکو پڑھو۔ کسی ایک چیز میں کمال پیدا کرو۔ مگر وہ کمال نہیں جسے حاصل کرکے ہندوستان کے اندھوں کی صف میں کانے راجہ کہلاؤ۔ یاد رکھو تم دنیا کے وسیع میدان میں کھڑے ہو۔ اور تمہیں یورپ اور امریکہ والوں کی صفوں میں شامل ہونا ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری قوم زندہ رہے۔ فنا نہ ہوجاے۔ تم ہمیں سب سے پہلے ایک ہی آدمی دو جسکا نام "انسائیکلو پیڈیا برٹینکا" کی آئندہ اشاعت میں شامل ہوسکے۔ دیکھیں تم میں سے کون پچھلی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑہتا ہے۔ کون ہے وہ سپوت۔ وہ ہمارے آنکھوں کا تارا۔ ہماری زندگی کا سہارا ہے۔ اُسے ہمارے سامنے جلد لاؤ ہم اُسے اپنے سر آنکھوں پر بٹھانا چاہتے ہیں۔

بولو پیارے بچو کیا دیر ہے۔ کس گھڑی کس دن کس وقت کے منتظر ہو؟

آخر کون شے مانع ہے؟ "کچھ بھی نہیں!"

آزاد بیگم

حافظ شیرازی اور ڈاکٹر اقبال

"پیام امید" کے جولائی اگست و ستمبر نمبر میں حضور کا پر زور مضمون میری نظر سے گذرا۔ مضمون کے شروع میں تو آپ تحریر فرماتے ہیں کہ میرا مضمون افراط اور تفریط سے دور ہوگا۔ اور صوفی صاحب کو آنکھیں بند کرکے بد تہذیبی کی زبان کھولنے کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ مگر آگے چلکر خود قریب قریب وہی زبان اور وہی طرز ادا اختیار فرماتے ہیں اب دنیا حیرت میں ہے کہ اس "بد تہذیبی" کے مجرموں کی فہرست میں اول نمبر پہ صوفی صاحب کا نام قائم کرے یا حضور کے دشمنوں کا۔ رہی افراط و تفریط۔ تو اگر صوفی صاحب ڈاکٹر اقبال کو پچھاڑنے پر تلے ہوئے ہیں تو ان سے کچھ کم نہیں بلکہ اگر سچ پوچھئے تو زیادہ ہی خود بدولت صوفی صاحب کو پچھاڑ کر انصاف سے گلے پر کند خنجر پھیر دینے پر آمادہ ہیں۔

جون نمبر میں صوفی عبداللہ صاحب نے سچ لکھا ہے کہ "مذاق صحیح" نہ کسی پنساری کی دوکان پر بکتا ہے کہ "پڑیا میں باندھکر" کسی صاحب کے پاس بھیجدیا جائے یا شربت بزوری کی طرح چاٹ لینے کو تیار دیا جائے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ عدالت تقادی کے بلند پایہ اجلاس کا اختیار سماعت غیر محدود ہے۔ اس اجلاس کا صدر نشین جو کسی خاص موقع پر کسی خاص مقدمہ کی سماعت کر رہا ہو ایک حاکم وقت ہے۔ اور

مولف یا مصنف جسکے کلام کا "مقدمہ" اسکی پیشی میں ہو ملزم کی حیثیت سے اس حاکم کے سامنے آتا ہے۔ اس ذی اختیار حاکم وقت سے یہ امید رکھنا کہ وہ ملزم کو اپنی کرسی سے بھی اوپر جگہ دیگا اور ملزم کو مخاطب کرتے وقت ہاتھ جوڑکر گڑگڑا کر منت وسماجت کے ساتھ اسکی خدمت میں عرض حال کریگا صاف اور صریحی ثبوت ایسی امید رکھنے والے کے مذاق صحیح سے بالکل ہی اجنب اور بے بھرہ ہونے کا ہے۔ صوفی صاحب کافی سے بھی زیادہ مثالیں دے چکے ہیں کہ کس طرح۔ کس لہجے اور کس انداز سے ہندوستان اور یورپ میں نقادان سخن نے تنقید کرتے وقت مولفین اور مصنفین کو مخاطب کیا ہے۔ یہ کہ نقادی ہی ایک ایسا عدالت ہے جس کے بازوؤں میں قوت پہونچانے سے زبان ترقی کر سکتی ہے ہماری زبان کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ ترقی کرکے قوم کی ترقی کرنے والی مشین کا ایک چلتا پرزا بن جائے یہ بات ممکن نہیں ہے اگر ہمارے گردوپیش کے حالات بجنسہ اسی حالت میں چھوڑ دئے جائیں جس حال میں کہ وہ اب ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ مگر اصلاح کا آخر کون سا طریقہ ہے؟ یہی اور صرف یہی کہ بلند پایہ نقادان سخن اپنا اجلاس گرم کریں۔ اور نثر و نظم کا جو کلام اصلی شاہراہ سے ہٹا ہوا ہو اسے اصلی شاہراہ پر لائیں۔ جتنا حصہ بیکار اور بے مصرف ہے اُسے خارج کرکے دریابرد کردیں۔ جو حصہ قائم رکھنے کے قابل ہو اسے قائم رکھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

رہا یہ اعتراض کہ اس تنقید میں ظرافت کیوں شامل کی گئی۔ بندہ پرور پھر یہاں وہی شکایت مذاق صحیح کے قحط کے سامنے آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ روکھی پھیکی چوب خشک تنقید اگر لکھی جائے تو اسکے پڑھنے والے کہاں سے بلائے جائیں؟

ٹی ٹی کا کا اور اوہو سے؟ آپ ہی بتائیے کہ ہندوستان کی اُردو خواں پبلک کے طبقہ میں سے کیا آپکو فی صدی چار آدمی بھی ایسے مل سکینگے جو اس دماغی مسہل کی دارو سے تلخ کے قدح کے قدح چپکے سے آنکھیں بند کر کے پی جائیں؟ مجھے تو اسمیں بھی شک ہے۔ اگر آپ اس نظر سے دیکھتے تو نقاد کا یہی "عیب" آپکو ہنر نظر آتا۔

انگلستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں نقادان سخن کے قلم کی آزادی کی وسعت لامحدود مانی گئی ہے۔ اور صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں پس افتادہ مسائل پر بھی جنھیں اور ملکوں کا بچہ بچہ مان اور تسلیم کر چکا ہے لمبے چوڑے مباحثے ہوتے ہیں اور اخباروں اور رسالوں کے کالم سیاہ کئے جاتے ہیں۔ اسکی وجہ صرف ایک ہی ہے معلومات کی کمی اور مذاق صحیح کا قحط۔ نقادان سخن بالکل مجاز ہیں کہ مولفین اور مصنفین کے کلام کی دھجیاں اُڑائیں اور جی بھر کے ہنسیں اور ہنسائیں ہاں اگر انکے اختیارات ساقط ہوتے ہیں تو صرف ایک ہی موقع پر۔ وہ کون سا موقع ہے؟ ذاتیات سے بحث رکھنا۔ کوئی کمینہ اور بزدلانہ حملہ کرنا۔ ذاتی عناد یا نفسانیت سے کام لینا تو یہاں کہیں اسکا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اگر صدیقی صاحب کو کہیں نظر آتا ہو تو خود انہیں کے اپنے خیالات کا عکس ہوگا۔

کوئی نقاد اگر کسی مولف یا مصنف کے ساتھ سخت گیری کرتا ہے تو کیا اس سے آپ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ وہ اسکا دشمن ہے؟ استغفراللہ! بھلا دشمنی کا یہاں کیا ذکر یورپ اور امریکہ کے نقادان سخن تنقید کے وقت مصنفوں کی بری طرح خبر لیا کرتے ہیں۔ مگر وہی مصنف اور وہی نقاد ایک ہی کلب میں جمع ہو کر ایک ساتھ ہنستے کھیلتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ کسکی دشمنی اور کہاں کی عداوت ایک وقت

ایسا تھا کہ اہل لکھنؤ نے پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولانا حالی۔ مولوی عبد الحلیم شرر اور داغ دہلوی کا ناکوں دم کر دیا تھا۔ بیچاروں کو بات کرنا دشوار تھا چھینکتے ناک کٹتی تھی۔ اودھ پنچ کے کالم کے کالم سیاہ کر دئے جاتے تھے۔ مگر کیا وہی دشمن" آج بھی اُنکے دشمن ہیں! توبہ کیجئے۔ آج اُوہی اہل لکھنؤ ہیں جنھوں نے حضرت سرشا اور شرر کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور داغ اور حالی کو اُستاد مان رہے ہیں۔ چاہے ساتھ ہی اسکے وہ تھوڑے بہت مستثنیات بھی لگاتے جائیں۔ ڈاکٹر اقبال سے صوفی صاحب کے دست و گریباں ہونے سے کیا آپ نے یہی معنی سمجھے کہ وہ ڈاکٹر اقبال کے دشمن ہیں اور چھرا تیز کئے ہوئے اُنکے دشمنوں کے خون کے پیاسے بنکر گلی کوچوں کے چکر کاٹ رہے ہیں اگر آپکی یہی سوجھ بوجھ ہے تو

"اللہ کرے زور سمجھ اور زیادہ"

"زور سمجھ کی ترکیب کی بھی ضرور داد دیجئے گا"

حضور نے ڈاکٹر صاحب کی تصنیف اسرار خودی کے پہلے شعر کا پہلا لفظ "اے امام" سامنے رکھکر صوفی صاحب کے اعتراض کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ مگر اس ذہانت کے صدقے کہ پورا فقرہ پڑھا بھی نہیں اور جواب تحریر فرما دیا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ "جب کوئی کسی سے بے تکلف ہو جاتا ہے تو اسکا آدھا نام لیکر خطاب کرتا ہے۔ اتنا کہہ دینے سے نہ آپ اس بارے سبکدوش ہوتے ہیں اور یہ جو صوفی صاحب کا اعتراض اٹھتا ہے۔ یہ تو معمولی ناموں کے متعلق عام قاعدہ زبان میں ہے۔ مگر اس قسم کے خاص ناموں کے متعلق کیا قاعدہ ہے۔ جیسا نام کہ "علی امام" علی سے ہے۔ یا جیسے ناموں کی

نظیر صوفی صاحب نے دی ہے۔ یعنی خاصکر ایسے نام کہ اللہ رسول یا بندگان دین کے ناموں کے اجزا ہوں۔ اور جنکو علیحدہ کرکے پڑھنے لکھنے یا بولنے میں سوء ادبی سمجھی جاسکتی ہو۔ مثلاً کسی کا نام اللہ بخش رسول بخش۔ خدا بخش۔ نبی بخش یا پیغمبر بخش ہے تو کیا اسے آپ اے اللہ۔ اے رسول اے خدا۔ اے نبی۔ اے پیغمبر کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ سوال تو یہ ہے۔ اگر آپ یہہ فرماتے ہیں کہ یہ جایز ہے تو صاف الفاظ میں اسے جایز قرار دیجئے۔ اگر آپ جرأت رکھتے ہوں۔ ورنہ آنکا اعتراض نہ آپسے اٹھا ہے نہ اٹھ سکیگا

آپ صوفی صاحب کا ڈاکٹر صاحب کو تم کہکے مخاطب کرنا بے تمیزی بتلاتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے سرعلی امام کا آدھا نام امام لینے کو داخل محبت قرار دیتے ہیں۔ مگر آپ سے کون کہتا تھا کہ صوفی صاحب نے بھی اسی طرح ڈاکٹر صاحب کو فرط محبت سے تم کہہ کر نہیں یاد کیا ہے ہم تو اسمیں بھی اظہار خلوص محبت کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے اہل پنجاب تم کی جگہہ تو ہی بولتے ہیں اور وہ داخل محبت سمجھا جاتا ہے۔

ہم آپ کے اس ارشاد کا کیا جواب دیں کہ "کشور ہند میں کلیۂ ناکام کابت . . . ." مہمل نہیں ہے۔ اگر یہہ مہمل نہیں ہے۔ تو حضرت وحشی علیہ الرحمت کی ساری تصانیف میں سے ایک شعر بھی مہمل نہیں ہے اس سے زیادہ آپکی سمع خراشی کرنا بیکار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ظہور لن ترانی گوے اوج طور" بھی اعتراض سے خالی ہے۔ تو ہم کہینگے کہ آپ تو مصنف سے بھی بڑھ گئے !۔

ان جوابات میں سب سے زیادہ مزہ ہمیں تو ہمیں آیا ہے کہ حضور زعم میں آکر اس شعر میں بھی کوئی نقص نہیں پاتے۔

شوق تحریر مضامیں کھلی جاتی ہے اٹھکر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے۔

قبلہ حاجات اعتراض یہہ ہے کہ آجتک کسی شاعر نے اردو زبان میں "شوق" کو مؤنث نہیں باندھا ہے۔ مگر شاید آپ یہ بھی فرمادیں تو کچھ بعید نہیں کہ یہاں "شوق نہیں کھلی جاتی ہے" "تحریر کھلی جاتی ہے"۔ مگر حضرت یہاں تو ڈاکٹر صاحب نے "شوق" ہی کو زنانیت کا برقع پہنایا ہے۔ "تحریر" تو وہاں سے کوسوں دور ہے۔ بفرض محال اگر انھوں نے ذہانت کے زور میں آکر تحریر ہی کو "کھلی جاتا" بتایا ہے۔ تو جناب والا نہ شوق ہی کوئی افیم کی پوٹلی ہے کہ وہ کھلی جاتی ہو اور نہ تحریر ہی اور نہ اسکا کھولنے والا آجتک کوئی پیدا ہوا ہے۔ اسکے بعد ذرا اسپر بھی تو غور فرمائیے کہ پہلے مصرعہ میں "شوق" ..... "کھلی جاتی ہے" اور دوسرے مصرعہ میں "پردہ میں بیٹھکر بے پردہ ہوئی جاتے" سے کیا نسبت ہے۔ کیا کوئی چیز کھل جاے تو وہ بے پردہ بھی ہو جاتی ہے؟ آخر اس کا بھی کوئی تک سمجھ میں آتا ہے!

آخاہ! مولانا اب سمجھے۔ لے اب معافی کے ساتھ اپنا اعتراض واپس لیتے ہیں۔ بیشک بیشک شاعر کا مطلب یہہ تھا کہ "شوق تحریر مضامین" افیم کی پوٹلی ہے جو کھلی جاتی ہے۔ "پردہ میں بیٹھکر" سے مطلب ہے افیم کا پوٹلی کے اندر بند ہونا۔ مگر جب وہ کھلتی ہے تو پوٹلی سے باہر آکے

کٹورے کے اندر پہونچ جاتی ہے۔ جب تک وہ پوٹلی کے اندر تھی گویا پردے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب کھلی اور گھل کر پوٹلی کے پردے سے باہر نکلی یعنی کٹورے کے اندر داخل ہو گئی تو صاف بے پردہ ہو گئیں اور اسکے مشتاقان جمال کے منہ میں اُسے دیکھتے ہی پانی بھر آیا۔ اے سبحان اللہ۔ اعجاز ہے اعجاز! واقعی آپنے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ صوفی صاحب کو " قدرت کے فیاض ہاتھوں نے ملکہ شاعری سے محروم رکھا ہے اور فطرت نے انہیں تیرہ صدی کے جذبہ تصوف کے علاوہ اور کوئی لطیف مذاق عطا نہیں فرمایا ہے۔" واقعی ایسے ادق مضامین سمجھنے کے لئے دماغ درکار ہے۔ یہاں ایسے ویسوں کا کام نہیں۔

مولانا اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم اتنا ضرور عرض کر سکتے ہیں کہ گستاخی معاف جہاں کوئی لغت یا کتاب حضور کے ہاتھ لگ گئی ہے وہاں تو اپنے نقل را چہ عقل کا صیغہ بڑے دھوم دھام سے گردانا ہے۔ مگر جہاں یک من علم را دہ من عقل می باید کا موقع دشمنوں کو پیش آگیا ہے وہاں سہ کاربڑی صفائی سے ہماروں شانے چت نظر آتے ہیں۔ ہماری صلاح ہے کہ آپ ہر وقت سوتے جاگتے ایک بغل میں برہان قاطع اور غیاث اللغات اور دوسرے بغل میں حضرت مجدد السنۃ مشرقیہ مدظلہ العالی کا حل بی۔ اے۔ کورس دابے رہا کیجئے تو بعض ماننیئے ایسی افتاد کبھی پیش نہ آئیگی۔

رہا آپکا یہ فرمانا کہ مولینا غالب آپکے گواہ ہیں تو اسپر سوا اسکے کہ ہنسی آئے اور کیا جواب ہو سکتا ہے! آپنے اتنا غور نہیں فرمایا کہ جو نسخہ دیوان غالب کا آپ سند کے لئے پیش فرمارہے ہیں وہ نسخہ اگر خاص غالب ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوتا تو بیشک آپ کی سند بجا و درست تھی اور آپکا جواب دنداں شکن سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ مگر واقعہ تو

یہہ ہے کہ جس نسخہ سے آپ سند دے رہے ہیں وہ ایسے زبردست کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو قابلیت اور ہمہ دانی میں آپسے بھی بڑھا ہوا تھا یہ کاتبوں کی عام غلطی ہے مگر ایسی غلطی کی بنا پر بہت سے آپ ہی کے سے خوش عقیدہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ دیوان غالب میں جب یہہ املا دیکھا گیا تو پھر نعوذ باللہ قرآن و حدیث کی سند سے اسکا پایہ کیا کم ہو سکتا ہے! بھائی جان یہہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ اور مجھے آپکی سمجھ سے لڑنا منظور نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "لذت رشکِ شعاعِ آفتابِ صبحدم" کی ترکیب "ممکن ہے غلط ہو" "یہہ ممکن ہے" کی ایک ہی ہوئی۔ جناب والا او یہ باتیں تو بالائے طاق رکھئے۔ پہلے یہہ تو ذرا فرما دیجئے کہ آخر اس مصرعہ کے کیا معنی ہوے؟ اول تو "شعاع کے لئے لذت" کا لفظ بالکل ہی بے جوڑ ہے۔ تاوقتیکہ کوئی خاص استعارہ کی صورت نہ پیدا کیجاے۔ ورنہ سیدھی سادی زبان میں "لذت شعاع" نہ کوئی بولا ہے اور نہ بول سکتا ہے۔ پھر "لذت رشکِ شعاع" چہ معنی دارد! شعاع کے رشک کی لذت؟ بھلا شعاع کا رشک کیسا ہوتا ہے۔ کالا یا گورا! یا اگر آپ یہہ فرمائیں کہ وہ لذت جو شعاع کے لئے باعث رشک ہے اول تو الفاظ کی ترکیب ان معنوں کے منافی ہے اور اگر بفرض محال یہہ معنی بھی زبردستی پہنا ہی دئے جائیں تو بھی کیا نتیجہ نکلتا ہے! پھر بھی مہمل ہی رہتا ہے۔ خیر یہاں تک تو بات سمجھ میں آگئی کہ "لذتِ رشک شعاع" ضرور صحیح ہے۔ مگر مولینا اِس شعر کے دوسرے مصرعہ پر حضور کا کیا فتویٰ ہے "صداے مرغ سحر کی زیر و بم" کی نسبت اپنے کچھ ارشاد نہ فرمایا کہ صحیح ہے یا غلط۔ واقعی مرغ سحر کی صدا تو بالکل ہی طبلہ کی تھاپ سے مشابہ ہوتی ہے

یہہ توکمال شاعری ہے یا نہیں؟ صرف کمال ہی نہیں بلکہ شاعری کی معراج
یہاں تو ہم بھی قائل ہیں۔

سرکار نے دیوانۂ۔ پروانۂ بیگانۂ کو صحیح فرماکر خیر سے سندیں بھی
پیش کردی ہیں۔ اور یہہ سندیں کسکی ہیں۔ غالب کی! پھر یہہ "دنداں شکن"
جواب دیکر حضور اپنا کس بل دیکھ رہے ہیں کہ صوفی کو کیسی "چنھیاں"
دی ہیں کہ وہ "مسخرا" بھی یاد کریگا۔ مگر حضور غریب پرور فارسی زبان میں
یہہ عام قاعدہ ہے کہ ایسے موقعہ پر پائے ہوز۔ ہمزہ لگا نا صرف اضافت کے
معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً "دیوانۂ عشق" "افسانۂ غم" "خمخانۂ محبت" وغیرہ وغیرہ
مگر "ہمزہ" اور "ی" وہیں لگانتے ہیں جہاں "ہے" "تو" کے معنی ادا کرنا مقصود ہوتا
ہے ایسا نہ کیا جائے تو دونوں حالتوں کی مختلف کتابتوں کا فرق دور
ہوجائے۔ اور یہہ امتیاز قائم رکھنے کی ضرورت ہے اگر آپکی تاویل صحیح
مانی جائے تو کیا انجام ہوگا؟ "دیوانۂ محبت" لکھنا ہو تو بھی "دیوانہ محبت"
لکھیں اور اگر یہہ مفہوم ظاہر کرنا ہو کہ "تم دیوانے ہو" تو بھی "دیوانہ"
لکھیں۔ پھر دونوں صورتوں کی رسم خط میں کیا فرق باقی رہگیا۔
امتیاز کی کوئی بھی صورت باقی رہگئی!

کشور ہند میں کلیۂ ناکام کا بت
عربستاں میں سفاخانۂ اسلام کا بت
اور لندن میں عبادت کدۂ عام کا بت
لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

تو بقول حضور کے اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہے۔ کیوں نہو۔ ماشاء اللہ! کلیہ ناکام کی ترکیب بالکل درست ہے مہلیت کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے''۔ عربستان میں شغا غانہ اسلام کا بت'' بھی موجود ہے۔ آپ اسکے شاہد ہیں۔ اور اسیطرح ''لندن میں عبارت کدۂ عام کے بت کے آگے سارے دنیائے اسلام سجدہ کر رہی ہے مراقبہ کرنا تو بقول آپکے صوفیوں کے حصہ میں پڑا تھا مگر یہہ کیا کفر ہے کہ اب تو حضور بھی مراقبہ اور مکاشفہ کی غیر محسوس قوتوں سے کام لینے لگے۔ یہہ قیامت ہے! میرا یہہ خیال صحیح ہو یا غلط اسکی تو کوئی بحث نہیں ہے۔ مگر اتنا تو میں بھی ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ اس نکتہ رسی نے آپکے جوہر آفتاب کیطرح چمکا دئے۔

اسکے بعد آپ اُس بحث کا باب کھولتے ہیں جو اس مصرعہ سے متعلق ہے '' فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا'' اور پورا بند نقل کر دینے کے بعد آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ یا تو صوفی صاحب نے پورا بند سنا نہیں۔ سنا تو رعایت نہیں سمجھے۔ اور رعایت سمجھنے پر بھی ہٹ دھرمی کی تو'' عوام کو دھوکہ دیکر اپنا الو سیدھا کیا''۔ یہی آپکے مہذب ملفوظات ہیں جن کی بنا پر دعوے کیا جاتا ہے کہ صوفی صاحب نے '' آنکھیں بند کر کے بد تہذیبی کی زبان کھولی'' ہے۔ اور یہہ کہ حضور کی تحریر افراط اور تفریط سے دور ہوگی کیسی کچھ دور ہے۔ سبحان اللہ وصل علیٰ۔ آپنے اعتراض فرماتے وقت یہہ نہیں دیکھا کہ آپ تو لکھ رہے ہیں کہ صوفی صاحب نے پورا بند سنا نہیں مگر یہہ نہیں دیکھتے کہ صوفی صاحب تو اس بند کے پہلے مصرعہ کو ہی اُس فہرست میں شامل کر چکے ہیں جس کے ذریعہ سے ڈاکٹر صاحب کے کمالات شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ آپ بھول گئے ہوں تو اب دیکھ لیجئے۔

مئے درد کے معنی درد اور مئے فریاد کے معنی فریاد ،، کی داد دیگئی ہے یا نہیں۔
آپکو واقعی ایسی بندشیں کیوں نہ پسند آئیں۔" مئے درد،، اللہ اللہ کیا پیارا
استعارہ ہے اور یہی وجہ تو ہے کہ حضور کو حافظ کے کلام میں تصوف کی جھلک
نظر نہیں آتی۔ کیوں آنے لگی۔ اگر بقول صوفی صاحب کے وہ بھی اسیطرح مئے
دال مئے روٹی مئے ٹوپی مئے لنگوٹی باندھتے تو بیشک آپکو مزا آجاتا کہ کیسا
زوروں کا مضمون باندھا ہے کہ او ہو ہو۔ سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ آپکے
" جان پہچان میں ایک صاحب ہیں،، جنہوں نے" خنجر دکھا دکھا کے ظالم نے
دہمکیاں دیں" والے شعر کا جھول نکالا تھا۔ آپ ڈر کے مارے انہیں اپنے" جان
پہچان والوں میں بتاتے ہیں اور صاف صاف " دوست " نہیں تسلیم کرتے
واقعی ایسی ہی نادر الوجود صحبتوں سے آپکی قابلیت اور ہمہ دانی میں اور بھی چار
چاند لگ گئے ہیں۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے چڑھا نیم پر" آپ اپنے دوست سے
کہئے ذرا لگے ہاتھوں اس شعر کا بھی جھول نکال دیں۔

" گئی ہے جویاں سے مدینے تلک + وہ شرک "

اللہ اللہ رے ہمہ دانی۔ اور یہ حضور کی لن ترانی! حضور کو" سہم جانا"
بالکل ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ آپکے نزدیک سہم بروزن فہم بالکل ہی جائز ہے
واللہ آپنے تو قابلیت کے جھنڈے گاڑ دئے۔ کیوں نہ کیا کہنا۔ مگر تعجب ہے
کہ جس طرح " دکھے " باتشدید کے عوض میں آپنے دکھا کو بروزن" لکھا "
قرار دیکر " لکھا " باتشدید کی سند دی ہے اسیطرح سہم بروزن فہم کی بھی کوئی
سند پیش نہیں فرمائی۔ قبلۂ عالم سہم بروزن فہم تو نہ لکھنؤ کی زبان ہے نہ دہلی کی۔

ہاں اگر ریاست حیدرآباد کی زبان ہو جہاں حضور رونق افروز ہیں تو کچھ بعید نہیں۔ رہا یہ کہ جو آپنے دُکھاؔ کا ٹک لکھا سے ملا کر لکھاؔ کا لکھا چھوڑا ہے یہہ بالکل آپ ہی کی ذہانت ہے جسکی داد ضرور دینا چاہئے آپنے اقلیدس میں ضرور پڑھا ہوگا کہ "جو چیزیں ایک دوسرے کے برابر ہوں وہ آپسمیں برابر ہوتی ہیں"۔ لیکن اقلیدس کے اصول اقلیدس کے ساتھ ہیں زبان میں اُنکی سند مانی نہیں جاتی۔ دُکھا کا ٹک لکھا سے ملتا ہو تو شوق سے ملا دیجئے کیونکہ آپ ٹھہرے شاعر آدمی آپکو کون منع کر سکتا ہے کہ نہ ملائے مگر قبلہ ٹک ملا دینا اور بات ہے اور زبان دانی شئے دیگر۔ بھلا کسی بھلے آدمی سے پوچھ دیکھئے کہ زبان کے معاملہ میں سند پیش کرتے وقت بھی آپکی شاعری کی ٹک بندی جائز ہے یہہ آپنے واقعی بڑے زوروں کی دلیل پیش کی کہ جس حال میں دُکھاؔ کا ٹک لکھاؔ سے ملتا ہے۔ اور لکھاؔ جایز ہے۔ تو دُکھاؔ بھی ضرور جایز ہے آپ اگر اقلیدس کی کوئی شکل ثابت کر رہی ہوتی تو یہہ دلیل حجیت قاطع تھی مگر میاں یہہ اقلیدس کی شکلیں ثابت کرنے کا مدرسہ نہیں ہے۔

یہاں زباندانی کی بحث ہے۔ یہہ آپ سے کس نے کہا تھا کہ لکھاؔ کا با تشدید ہونا صوفی صاحب کو تسلیم نہیں ہے۔ اسکی یہاں کیا بحث تھی! اور پھر اس سے بھی زیادہ مزے کی بات یہہ ہے کہ حضور نے لکھاؔ کو جایز قرار دیکر سند میں دو شعر بھی پیش کر دیئے ہیں جنمیں سے دوسرا شعر خاصکر قابل ذکر ہے۔ واہ کیا شعر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا ‪:.‬ پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا"
اس شعر کے لکھدینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی سوا اسکے کہ شاید
یہہ خود بدولت ہی کا شعر ہے۔ اور آپ اسے سُنا کے ہم سے داد لینا
چاہتے ہیں۔ اسوجہ سے کہ بحث تو ہے "لکھا" کے بالتشدید صحیح ہونے کی
اور سند میں جو شعر پیش فرمایا جارہا ہے اُسمیں "لکھا" پر تشدید سرے ہی نہیں!
مولنا سچ فرمائیگا کیا جسوقت آپنے یہہ مضمون تحریر فرمایا ہے اُسوقت
گرمی تو بہت شدّت کی نہیں پڑ رہی تھی؟ آپ آخر میں یہہ دلیل پیش فرماتے
ہیں کہ حافظ کے بعض اشعار ایسے ہیں جنسے اُنکے کلام کو تصوف کی طرف
منسوب کرنے کے خیال کی تردید ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ آپ یہہ بھی فرماتے
ہیں کہ وہ شرابی تھے۔ اس بات کا شافی جواب دینا کہ حافظ یا اُنکا کوئی
ہمعصر یا اب سے کئی صدی پہلے کا کوئی شخص شرابی تھا یا نہیں واقعی
دشوار ہے۔ ایسا دعوی کر بیٹھنا تو ہر شخص کے لئے بہت آسان ہے
آپ کہدیجئے کہ نظامی گنجوی بھی شرابی تھے۔ مولانا جامی بھی شرابی
تھے۔ اسلئے کہ دونوں نے ایک بار نہیں ہزار بار جب مانگی ہے شراب ہی
شراب مانگی ہے۔ اور اس دلیل کی تردید میں صاف اور بین ثبوت
پیش کرنا واقعی آسان نہیں ہے۔ اسے میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔
اگر آپ اسمیں خوش ہیں تو ایک ساتھ اِن سبکو شرابی کا معزز لقب عطا
فرما دیجئے۔ مگر آپ جب یہہ ارشاد فرمائینگے کہ حافظ کے کلام میں ایسے شعر
بھی داخل ہیں جنسے تصوف والے خیال کی تردید ہوتی ہے تو اس اعتراض کا

جواب دینا آساں ہے۔ چاہے آپکی اس جواب سے تشفی ہو یا نہو
یہہ اور بات ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں سب سے پہلے بات
جو قابل گذارش ہے وہ یہہ ہے کہ صوفی صاحب نے کبھی یہہ دعوی
نہیں کیا ہے اور نہ کوئی سمجھ دار آدمی کر سکتا ہے کہ دیوان حافظ کا
ہر ہر شعر تصوف کے رنگ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسمیں شک نہیں
کہ اس ضخیم دیوان میں جہاں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جو تصوف
کے مضامین سے شرابور ہیں وہاں بہت سے ایسے اشعار بھی ہیں
جو صاف سلیس سیدہی سادی ایشیائی شاعری کا نمونہ ہیں۔ اور
یہی اشعار ہیں جسمیں سے ذیل کا نمونہ آج آپنے پیش کیا ہے۔

"چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں آ"

جس سے محض یہی مقصد ہے کہ حافظ تونے ساری عمر شراب و
کباب کے ذکر میں صرف کر ڈالی اب بڈھا ہو گیا اب تجھے ایسی باتیں
زیب نہیں دیتیں معشوق عشق۔ وصال۔ جام۔ چنگ و رباب
کے تذکرے جوانوں ہی کو زیب دیتے ہیں۔ بڈھوں کے منھ سے اچھے
نہیں معلوم ہوتے۔ لہذا اب ان تذکروں کو چھوڑ"

دوسرے شعر کا مطلب بھی عرض کرونگا۔ اپنی سمجھ کے موافق
کیونکہ میں تو پہلے ہی سے دوہائی دے رہا ہوں کہ میں شاعر نہیں
ہوں۔ اگر آپ مجھپر بھی اعتراض جما دیں کہ تم شاعر نہیں ہو تو کیا
ہوگا؟ میں پہلے ہی سے اقبالی ملزم بنا جاتا ہوں۔ تاکہ آپکو اعتراض

فرمانے کی زحمت گوارہ نکرنا پڑے۔ ساتھ ہی اسکے یہہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ میں کوئی صوفی ہوں نہ عالم۔ اب شوق سے آپکا جو جی چاہے مجھے کہہ لیں۔

"گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد آہ گر در پئے امروز بود فردائے"

اگر حافظ کے سے عقائد رکھنے اور طرز عمل اختیار کرنے کا نام مسلمانی یا اسلام ہے تو کیا اچھا ہو اگر امروز کے بعد فردا بھی آئے معنی ان افعال اور اعمال میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جائے۔ شعر تو مزے کا ہے خواجہ فرماتے ہیں کہ ہمارا اسلام یہی ہے کہ رندی اور بت پرستی کو ایمان سمجھتے ہیں۔ ہماری رندی اور بت پرستی کے معنی اور ہیں اور اہل دنیا اسکے کچھ اور ہی معنی سمجھ رہے ہیں اگر انہیں عقائد کا نام اسلام رکھ دیا جائے (گر مسلمانی ہمیں است) جسکے معنی یہہ ہونگے کہ لوگ بے سمجھے ہمارے مفروضہ عقائد کی پیروی کرنے کے نام سے میخواری اور سیہ کاری پر کمر باندھ لیں تو اس سے اچھا یہی ہے کہ ایسے "امروز کے بعد فردا" بھی آئے یعنی ہم اپنا ہی طرز عمل بدل دیں تاکہ اہل دنیا کو ہمارا مفہوم سمجھنے میں غلط فہمی نہو۔ مگر شاعری کی چیز اس تو مینے باندھی نہیں ہے۔ میرا بتایا ہوا مطلب کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔!

بہتر ہو اگر آپ ہی بیان فرمائیں۔

" شوق تحریر مضامین کھجلی جاتی ہے" کی پوٹلی کھولنا شروع کر دیں۔ حضور نے صوفیائے کرام کے خلاف بھی زبان کھولی ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب پر تو آپ نے کھلم کھلا اعتراض جما یا ہی تھا خیر اسی پر بس کرتے۔ مگر کلیجہ ٹھنڈا نہوا۔ اور آخر مجبور ہو کر آپ نے یوں جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ "جتنے مولانا اور صوفی صافی ہیں کام کرنے والوں کو ہمیشہ کافر۔ فاسق فاجر دور از صراط مستقیم وغیرہ کہہ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑا کرتے ہیں۔ لیکن خود کچھ نہیں کرتے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں"

اللہ۔ اللہ یہہ زور۔ یہہ دم دعوی! بہت اچھا سب سے پہلے اپنے "کام کرنیوالے طبقہ" کے کارنامے سن لیجئے۔ اسکے بعد آپ سے عرض کیا جائیگا کہ صوفیائے کرام "اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والوں نے دنیا میں کوئی مفید کام کیا ہے یا نہیں۔

آپ کے "کام کرنے والے طبقہ" نے کیا کر رکھے دھر دیا ہے پہلے ہمیں یہی دیکھنا ہے جب سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کا دور دورہ ہوا ہے فیاض برٹش گورنمنٹ آپ حضرات کی تعلیم و تربیت پر بے دریغ سالہا سال سے کروروں روپیہ پھونکتی چلی آئی ہے یہانتک کہ اس عالمگیر جنگ کے پر آشوب زمانہ میں بھی جبکہ ایماں سے پوچھئے تو گورنمنٹ کے لئے ہر پیسہ روپیہ کا قائم مقام اور ہر روپیہ اشرفی کی برابر وقعت رکھتا ہے ایسے نازک وقت پر بھی اسکا فیاض ہاتھ نہیں رکا اور برابر بے دریغ آپکی تعلیم اور تربیت کے

کروروں روپیہ پھونکتی چلی جاتی ہے۔ اسکول آپ کے لئے بنائے گئے
کالج آپکے لئے تعمیر ہوئے۔ لائق سے لائق اُستاد اور پروفیسر آپکے
لئے بلائے گئے۔ سو ڈیڑھ سو برس سے اسی طرح برٹش گورنمنٹ
آپکے ہونہار طبقہ کے پیچھے برابر سر مار رہی ہے۔ مگر آپ ہی انصاف
کی عینک لگا کے ملاحظہ فرمائیے کہ اس تنو ڈیڑھ سو سال کے اندر
آپکے "کام کرنیوالے طبقہ" نے کیا کرکے دھر دیا ہے؟ آپ صوفیوں کو
تو گولر کا بُھنگا بتا رہے ہیں۔ مگر بندہ پرور آپ اس ننھے سے
تنگ نظری کے گولر سے باہر نکل کر دنیا کے وسیع میدان میں
تشریف لا کے دیکھیے کہ آپ دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں
کہیں کسی شعبہ میں بھی نظر آتے ہیں؟ کیا آپنے کوئی ایک انجینئر۔
ایک فلسفی۔ ایک مورخ ایک ماہر سائنس۔ ایک ماہر علم سیاسات
یا خلاصہ یہ کہ دنیا کے سارے معلومہ علوم وفنون کے مختلف
شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ میں ایک بھی ایسا ماہر پیدا کیا ہے
جو دنیا کی زندہ اقوام کے ماہرین کی صفوں میں شریک ہو کر
اُنکے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہو سکتا ہو؟ اگر آپنے پیدا کیا
ہے تو اُسکا نام بتائیے ہم اِن سائکلو پیڈیا برٹینیکا میں اُس نام کی
تلاش میں مصروف ہوں۔ کیا ساری دنیا کی سیکڑوں برس سے
چلتی ہوئی لاکھوں مشینوں کے کروروں پرزوں میں سے آپنے
آج تک کوئی ایک سڑی سی مشین میں کوئی ایک ادنیٰ سا پُرزہ بھی

اضافہ فرمایا ہے ؟ اگر فرمایا ہے ۔ تو مہربانی کرکے بتا دیجئے ہم آپکے بڑے احسانمند ہونگے اور تھوڑی سی نہیں اتنی میٹھائی کھلا دینگے کہ آپ کھاتے کھاتے گھبرا اٹھیں اور میٹھائی کے نام سے دوہائی دینے لگیں ۔ اب تو ہم میٹھائی بھی کھلانے پر آمادہ ہیں ۔ پھر آپ چُپ چُپ کیوں ہیں ۔ ؟ صوفی صاحب نہ کھلائیں ۔ نہ سہی ہم تو حاضر ہیں ۔ حضور غریب پرور جب آپکے کام کرنیوالے طبقہ کا یہہ حال ہے تو پھر یہہ لن ترانیاں اور یہہ دم دعوی آخرکس بل پر! آپ کے کام کرنے والے طبقہ نے کیا کارنمایاں کیا ہے ؟ ہمسے سُن لیجئے ۔ بی اے ۔ ایم۔اے ۔ پاس کرلیا ۔ اور بس ۔ یہی آپکا کام کرنا ہے ۔ اسکے آگے آیت ۔ مگر یاد رکھئے دنیا کو محض خطابی بیکار اور بے مصرف ڈگری پانے والوں کی مطلق ضرورت نہیں ہے ۔ دنیا کام کرنے والوں کی تلاش میں ہے اور آپکے ہونہار روشن خیال طبقہ میں کام کرنے والوں کی خیر سلاّ ہے ۔ کالر لگالیجے ٹائی درست فرمالیجئے ۔ مانگ نکال لیجئے ۔ ہیٹ زیب سر فرمالیجئے ۔ اور بس یہیں آپکی روشن خیالی کا ماہتاب طلوع اور یہیں غروب ہوتا ہے ۔

ہاں اگر کام کرنے سے آپکا یہہ مطلب ہے کہ آپ نے سرکاری دفتروں کو ہزاروں کلرک دیدئے یا سیکڑوں تحصیلدار منصف اور سب جج پیدا کردئے تو پھر وہی گورکے بھنگے کی مثل آپ پر

چسپاں ہوتی ہے۔ دنیا کے وسیع میدان میں نکلیئے۔ کام کرنیوالوں کی
صفیں دیکھیئے۔ اور شرمایئے۔ ایک طرف بیسویں صدی کی دنیا ہے
جو روزبت نئی کلیں نئی مشینیں ایجاد کر رہی ہے اور نئی نئی علمی تحقیقاتیں
کر رہی ہے۔ ایک طرف بیسوین صدی کی کام کرنے والی دنیا ہے
جس نے خشکی پر ریل اور موٹر کار اور تری پر دخانی جہاز چلا کر
وقت کے آہنی پنجہ سے زور آزمائی کی اور اُسے زیر کر لیا۔ جس نے
ٹیلی گراف ٹیلی فون اور بے تار کے تار کے جال ساری دنیا میں
پھیلا کر بحر و بر کو ایک کر ڈالا خشکی اور تری پر اپنی فتحمندی کا
پھریرا اڑا دیا۔ اب فضائے آسمانی پر اسکا حملہ جاری ہے۔ ہوائی جہاز
نے ہوا پر اپنا علم بلند کیا ہے اور ایک دن ہم آپ دیکھ لینگے کہ یہہ
نئی ایجاد اور کیا کیا نئے گُل کھلاتی ہے۔ ایک طرف یہہ کام کرنیوالی
دنیا ہے اور ایک طرف آپ کی بیکار ہستی اور آپکا بے معرف
وجود ہے۔ جسے ایک سوئی ایک الپین ایک بٹن بنانا نہیں آتا
جو اپنی روزمرہ کی زندگی کی ہر ہر چھوٹی بڑی چیز کے لیئے دنیا کی
ہنرمند قوموں کے ذخیرۂ مشقت کی ذکوٰۃ کی محتاج ہے۔ کہ
جب تک ہاتھ اُٹھا کر اپنی محنت مشقت کی خیرات وہ آپکو نہ دیں
آپ اتنے بھی نہیں ہیں کہ آپ اپنی برہنگی کی اپنے ہاتھوں ستر پوشی
کر سکیں لندن میں رائل اشٹاٹنگ سوسائٹی کلکتہ میں اشیاٹک
سوسائٹی آف بنگال سالہا سال سے علمی تحقیقات میں مصروف ہیں

آپکے ہیٹ باز طبقے نے کبھی چار سطریں بھی لکھکر اس دماغی کام کرنیوالے طبقے کے سامنے پیش کی ہیں؟ پیش کی ہوں تو بتایئے۔ رونا ہے تو اِنہیں باتوں کا۔ بھائی جان ہیٹ کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ کپڑا انگریزی وضع کا ہو یا دیسی وضع کا کوئی بُری چیز ہے۔ آپ شوق سے ایک کی جگہ چھ چھ سوٹ تلے اوپر پہن کر اپنا شوق پورا کرلیجئے ہم بُرا نہیں مانتے۔ ایک ہیٹ کے بدلے تلے اوپر نصف درجن ٹوپیاں ایک ساتھ سر پہ دھر لیجئے۔ اگر اس انگریزی کپڑے اور اس ہیٹ سے آپ دنیا کے لئے کوئی کارآمد شخص بن سکیں۔ کپڑے سے غرض محض ستر پوشی ہے۔ اور کوئی دوسری غرض نہیں۔ ہمیں صرف اتنی ہی بات بُری معلوم ہوتی ہے کہ اس بیکار محض بات پر تو آپ اتنے اَڑے ہوئے ہیں کہ اسکو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ بھائی جان کام کرنے والوں کی صورت بنانے سے آپکا شمار کام کرنے والوں میں ہوا ہے نہ کبھی ہوگا۔ دنیا کام مانگتی ہے۔ کچھ کیجئے کچھ کرکے دکھائے۔ تب دنیا آپکی عزت کریگی۔ اچھا سلا ہوا سوٹ ہر شخص پہن سکتا ہے۔ جس کے پاس روپیہ ہے۔ مگر کام کرنیوالی دنیا کے سامنے کام کرکے وہی پیش کرسکتا ہے۔ جو اسکا اہل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی کام کرنے والوں کی صف میں کھڑے ہوسکیں۔ اُسوقت اگر آپ سوتے وقت بھی ہیٹ نہ اُتاریں تو بھی ہم آپکو سر آنکھوں پر بٹھائینگے۔ اور جہاں آپکا پسینہ گرے وہاں ہم خون گرائینگے۔

مگر جب تک آپ صرف لفافہ بن کر ہمارے سامنے آئینگے اور ہمسے کہینگے کہ کام کرنے والوں کا بہروپ بھر لینے کی وجہ سے ہم آپ کو بھی اُنہیں کی صف میں شامل سمجھکر آپکی وہی عزت کریں تو یاد رکھئے یہہ بات نہوئی ہے اور نہ کبھی حشر تک ہوگی۔ ہماری آپکی اگر لڑائی ہے تو بس اتنی ہی۔ اور کچھ نہیں۔ اگلے زمانہ کی بیویاں اُس شخص سے عمر بھر صاف نہیں ہوتی تھیں جو اُنکی چوڑی تھچی پر چپت رہے۔ آپ بھی اُس شخص سے عمر بھر صاف نہیں ہوتے جو آپکی ہیٹ کو برا کہے۔ وجہ کیا ہے؟ ذاتی جوہر حاصل کرنے کی طرف آپ نہ کبھی مائل ہوئے اور نہ ہوتے ہیں ذاتی جوہر تلاش کرنیکا ذرا سا خیال بھی آپکے دماغ میں جس گھڑی پیدا ہوگا اُسیوقت اس پتلون ٹائی اور ہیٹ کا کہیں پتہ بھی نہ چلیگا۔ آپ ہماری بات یاد رکھیئے۔ ہندو بچوں کی مثال آپکی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح اس بہروپ بھرنے پر اپنی زندگی کے سارے مقاصد کا خاتمہ سمجھہ رہے تھے مگر جس گھڑی سے یہہ بات اُنکی سمجھہ میں آگئی ہے کہ یہہ کینچل بدلنا کیا شئے ہے۔ اسمیں کیا دھرا ہوا ہے۔ اُسوقت سے دیکھئے ہوا کا رُخ بدل گیا ہے۔

آج بھی اگر وہ کام کرنے والوں کی صفوں میں تو جاکے نہیں مل گئے ہیں۔ مگر پھر بھی دیکھئے۔ آپ کہاں ہیں اور وہ کہاں اونکی صفیں

آپکی لغا فنہ بازصعوں سے اتنی آگے بڑھ گئیں ہیں کہ اگر آپ آج ہی
سے محنت کرنا شروع کر دیں تو آپکو سالہا سال کی محنت درکار ہوگی
قبل اسکے کہ آپ اُنکی صفوں تک پہونچ سکیں ۔ بھائی جان ! ایک
موٹی بات اور بھی تو ہے جو آپکو ابھی تک نہیں سُوجھی اور ہندو
بچوں پر مُدّت ہوئی آفتاب کی طرح روشن ہو چکی ہے وہ بات
یہہ ہے ۔ کہ غیر قوم کی نقل اُتارنے کے صرف ایک ہی معنی اہل بصیرت
کی نظروں میں ہو سکتے ہیں ۔ اور وہ معنی یہہ ہیں کہ آپکے آبا واجداد
آپکے لئے کوئی قابل تقلید نمونہ نہیں چھوڑ گئے ۔ آپ دوسری
قوموں کی تقلید کرکے گویا دوسرے الفاظ میں اس بات کا اعتراف
کرتے ہیں کہ آپ اور آپکے مورث اعلیٰ سب ناکارہ اور بے
مصرف ہیں اور جب تک آپ اور غیر قوموں کی روش پر نہ چلیں
آپ کا ترقی کرنا بالکل غیر ممکن ہے ۔

بڑا مزا تو یہی ہے کہ تعلیم و تربیت میں تو آپ ہندؤں سے
مقابلہ کرکے قابل نہ آجتک ہوئے ہیں اور نہ اب سے ایک صدی
کے اندر ہو سکتے ہیں ۔ مگر یہہ کیا ستم ہے کہ وہ جتنے ہی تعلیم
و تربیت میں آپ سے آگے ہیں اتنی ہی آپکی اس "روشن خیالی" میں
آپ سے پیچھے ہیں وہ خدا پرست ہیں اور آپ ہیٹ پرست آپ ہیٹ پرست
ہیں اور وہ ہیٹ شکن ۔ اور جتنی ہی زیادہ تعلیم و تربیت پاتے جاتے
ہیں اور اپنے مقدس مذہب کا احترام اُنکے دلوں میں اور مضبوط جڑ پکڑتا

جاتا ہے۔ آپ پڑھتے لکھتے خاک بہتر بھی نہیں۔ چار حرف پڑھکر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا لکھنا پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ مگر اتنے ہی پر آپکو ایسے کیسے گھمنڈ کی چڑھ جاتی ہے کہ بے پئے ہی مست رہا کرتے ہیں یہہ ہیں آپکے کام کرنے والے طبقہ کے کارنامے۔

اب سنئے صوفیائے کرام اہل اللہ اور ہاتھ پر ہاتھ دھرکے بیٹھنے والے" طبقہ نے کیا کیا ہے۔ جب تک دنیا کی باگ اس طبقہ کے ہاتھ میں رہی دنیا دنیا تھی۔ یہی طبقہ ہے۔ جسکے معزز سرگروہ بانی اسلام صلعم ہیں۔ اس معزز طبقہ نے سارے دنیا سے اسلام کو ایک مستحکم رشتہ محبت میں پرو دیا۔ دشمنوں کو دوست غیروں کو اپنا بنایا۔ گورے افغان اور کالے حبشی کو بھائی بھائی بنا دیا۔ غریبی امیری دولت اور افلاس کے درمیان میں حائل ہونے والی دیوار آہن توڑ کر چھوٹے بڑے غریب امیر سب کو ایک ہی صف میں لاکر ایک ہی میدان میں کھڑا کر دیا۔ انکا اللہ ایک تھا۔ انکا رسول ایک تھا۔ پھر وہ دوئی کیا جانتے۔ یہی سبق آج بھی صوفیائے کرام پڑھاتے ہیں۔ مگر پڑھنے والے نہیں ملتے۔ اور یہہ آپکے ترقی کرنے والے طبقہ کے احسانات ہیں جو پہلے خود ڈہل مل یقین ہوتے ہیں۔ اسکے بعد وہی زہریلی ہوا دنیا میں پھیلاتے ہیں سو ڈیڑھ سو برس کے مسلسل شکوک رکاوٹ اور خود پسندی کا خرمن آج آپکے آنکھوں کے سامنے ڈھیر ہے اگر آپ اہل بصیرت ہیں تو آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ آج یہہ ہو رہا ہے کہ آپ مثلاً

عرب کے مسلمانوں کو کٹھ ملا کہہ کر اُنسے کنارہ کشی اختیار فرماتے ہیں تو وہ آپکو برائے نام مسلمان سمجھکر آپ سے دور بھاگتے ہیں وہ رشتہ اخوت جسکی ریشمی لڑی میں آپ گوندھے گئے تھے۔ آپنے ایک تلا ہوا ہاتھ مار کر اُسے توڑکے پھینک دیا۔ اب کون ہے جو ان بکھرے ہوے موتیونکو جمع کرکے اپنے پھر ویسی ہی ایک لڑی طیار کرے! وہ کام اہل اللہ اور صوفیاے کرام کا تھا۔ یہہ کام (یعنی اس لڑی کو توڑکے پھینک دینا) آپکا کام ہے۔ اب آپکا جی چاہے تو اپنے اکارتامے پر ناز کیجئے اور چاہیئے تو رویئے۔ مگر یاد رکہیئے کہ آپ بی اے پاس کرکے ڈیڑھ سو کی نوکری پاجانے کو ترقی سمجھہ رہے ہیں۔ مگر یہی ترقی آپکا تنزل ہے۔ آپ صوفیاے کرام پر آوازے کستے ہیں کہ وہ ایک ہی نظر سے سبکو کیوں دیکھتے ہیں۔ آپ اپنی اسرار خودی کا آلہا گاتے پھرتے ہیں۔ تو شوق سے گایئے۔ مگر یاد رکہیئے کہ اگر آپ کبھی ترقی کرینگے (اگر شاید کبھی کریں) تو انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرکے بیٹھنے والوں کی بدولت اور وہ بھی کب؟ جب ہی اور صرف جب ہی۔ کہ اس اسرار خودی کے چکر سے باہر نکال کر آپکو پھر اُس پُرانے رشتۂ محبت اور اخویت میں گوندھ دینگے۔

بھائی جان اسکا نام روشن خیالی نہیں ہے۔ اسکا نام شامت ہے۔ ہنسنے کا وقت نہیں ہے۔ یہہ وقت رونے کا ہے۔ اگر آپ آج آنسوؤں کی جھڑی سے اپنی کاہلی کا نامۂ اعمال دھوڈالینگے تو کل آپکا شمار بھی دنیا کی زندہ قوموں میں ہوگا۔ اگر آج رونے کا وقت آپ ہنستے اور مذاق

اُڑانے میں صرف کئے دیتے ہیں ۔ تو یاد رکھئے آپکو اور آپکی اولاد کو اور پھر اُس اولاد کی اولاد کو تمام عمر رونا پڑیگا ۔ آپکو اختیار ہے چاہے ۔آج آپ ہنس لیں اگر اسی میں آپ خوش ہوتے ہیں ۔

بھائی صاحب آپ کہینگے کہاں تنقید اور کہاں یہہ دُکھڑا رونا! یہہ دُکھڑا رونا تو آپ ہی نے یاد دلادیا ۔ درد سے بھرے ہوئے دل کیلئے ایک ٹہیس ہی بس ہے ۔ اللہ آپکا بھلا کرے ۔

الغامی مضمون

محی الدین احمدؔ

نہایت ضروری متفرق حالات

چند ایسے حادثات بچہ کی پیدائش کے بعد پیش آتے ہیں جنکا سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے ۔

۱۔ بعض اوقات بچے بالکل ساکت پیدا ہوتے ہیں ۔ اور وہ ناواقفیت کی وجہ سے مردہ سمجھکر دفن کر دیئے جاتے ہیں ۔ اگر ایسا بچہ پیدا ہو تو فوراً ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے ۔ اکثر ایسے بچہ کئی گھنٹوں تک بے حس اور بظاہر مردہ پڑے رہے ۔ مگر مصنوعی تنفس دلانے ۔ اور مناسب موقعہ علاج کرنے سے زندہ ہوگئے ۔

۲۔ بچہ کا جسم اور سینہ پیدا ہونیکے بعد سوجا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کا کچھہ خیال نہ کیا جائے ۔ یہہ بچہ کو بے احتیاطی اور سختی سے پکڑنے کی وجہ سے ہوجاتا ہے شیر گرم پانی سے نہلایا جائے ۔ اور گرم کپڑے پہنائے جائیں ۔ خود بخود ہی تکلیف دور ہو جائیگی ۔

۳۔ بعض بچوں کو پیدا ہوتے ہی چھینک آجاتی ہے۔ اس کی وجہ کمرہ کی سردی ہے۔ بچہ کو فوراً گرم کپڑے میں لپیٹ دینا چاہئے اور گرم پانی سے نہلانا چاہئے۔ سردی سے حفاظت کی جائے ورنہ نقصان کا احتمال ہے۔

۴۔ بعض بچوں کے تالو میں چھید یا سوراخ ہوتا ہے۔ بچہ کو جب دودھ پلایا جائے تو ناک کے راستے باہر آجاتا ہے۔ اگر ایسی حالت ہو تو بہت احتیاط کی جانے۔ ڈاکٹری مشورہ اور فوری علاج کیا جانے اور دودھ چمچہ سے حلق میں اُتار کر پلا جائے۔ اسکا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔

۵۔ بچے کی پیدائش کے بعد سلا دینا چاہیئے۔ جب جاگے آنکھوں میں سوا گھنٹے پر اگر آنکھوں میں کیچڑ آجائے اور آنکھیں چپک جائیں تو سمجھا جاتا ہے کہ آنکھیں دُکھنے آگئیں۔ مگر عموماً یہہ وجہ ہوتی ہے کہ نہلاتے وقت صابون آنکھوں میں پڑ گیا ہو۔ یا سخت روشنی کے سامنے اسکی آنکھیں دُکھ گئی ہوں یا ماں کے پاس سونے سے اسکا دودھ یا پسینہ آنکھوں میں پڑ گیا ہو ان تمام باتوں کی اگر احتیاط کیجائے تو غالباً یہ شکایت ہی پیش نہ آئیگی۔ آنکھیں صاف پانی سے دھو ڈالی جائیں۔ کوئی مناسب دوا آنکھوں میں ڈالی جائے۔ اور سوتے وقت آنکھوں کے پردوں میں ویسلین لگا دیجاوے

۶۔ بعض بچوں کی زبان نیچے کے جبڑے سے جُڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اسکو فوراً بے نوک کی قینچی سے کاٹ دینا چاہیئے۔ اور کاٹے ہوئے سروں میں گھی لگا دینا چاہیئے تاکہ جُڑ نہ جائیں۔

۷۔ اگر ۲۴ گھنٹہ تک پیشاب یا پاخانہ کی حاجت نہ ہو تو فوراً ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ قبض کے لئے عام طور پر ماں کا پچھلا دودھ ہی کافی ہوگا۔ نہلانے سے پیشاب آجاتا ہے۔

۸۔ اگر کوئی خطرناک حادثات پیش آئیں تو ڈاکٹری مشورہ لیا جائے اور علاج میں تساہل نکیا جائے۔

وہ نہایت ہی خوش قسمت ماں ہوگی جو ان ہدایات کے مطابق اپنے بچہ کی پرورش کریگی۔ اور وہ نہایت ہی خوش قسمت بچہ ہوگا جو ان ہدایات کے زیر عمل پرورش پائے۔

مسز فدا حسین

جامِ اُلفت

(جام الفت کا اشتہار رسالہ کے لوح کے پشت سے آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو)

محمود۔ لیلی۔ او میری دلربا پیاری — بانکی ہے دہج تیری ادا پیاری
(بیدار ہوکر) تیکھے تیور عذار کی وہ پھبن — سو قیامت پھر اُسپہ بھولا پن
شوخی چتون میں چال میں چہل بل — انکھڑیاں مست مضطرب چنچل
نرم نازک وہ ترے رخسارے — صاف ستھرے ہرے بھرے پیارے
بانکپن میں ادا لگاوٹ کی — نازنین دہج ہے کچھ بناوٹ کی
بکھرے کیوں ہیں یہ گیسوئے خمدار — مستو شاید یہی ہے وقت بہار
رنگ پر ہے بہار کا عالم — حسن پر ہے نکھار کا عالم

تیرہ و تار ابر چھایا ہے
سر سے بڑھ کر کمر تک آیا ہے

کالی گھنگھور ہے گھٹا چھائی
آج مستوں کی خوب بن آئی

گھیر کر کہیں برس پڑتی ہے
چھائی جاتی ہے اُمنڈی پڑتی ہے

بتو مطلق نہیں ہے ضبط فغان
ہے جنون خیز موسم دوران

کہیں کوئل جو کوک اٹھتی ہے
یاں کلیجے میں ہوک اٹھتی ہے

پی کہاں پی کہاں کی مست آواز
رکھتی ہے اک نرالا ہی انداز

مور جنگل میں ہیں پکار رہے
ولولے دل کے ہیں اُبھار رہے

بھونرے پھولوں سے پٹتے جاتے ہیں
گنگناتے ہیں راگ گاتے ہیں

سارے عالم میں چھا گئی ہے بہار
پیاری لیلی ہے رونقِ گلزار

سرو قد ہیں تو گل ہیں رخسارے
نرم نازک ہرے بھرے پیارے

انکھڑیوں میں ادا ہے نرگس کی
مستی غفلت حیا ہے نرگس کی

زلفِ پُر خم ہیں جلوۂ سنبل
پیچ در پیچ مشکبو کاکل

شاہد گلعذار ہے لیلی
جلوۂ نو بہار ہے لیلی

آزاد

معزز خریداران رسالہ کو مالک رسالہ کے مفصلہ ذیل اختیارات دیئے جاتے ہیں

ناظرین کرام پیام اُمید کے ایثار کی جھلک کچھ نہ کچھ دیکھ ہی چکے ہیں۔

جسکا اشاعت مفت ایک شمہ ہے۔ اگست نمبر ۱۹۲۶ء کے ساتھ "پیام امید" نے اپنی عمر کا ایک سال ختم کر لیا۔ اب دوسرے سال کا چوتھا مہینہ چل رہا ہے اس عرصہ میں بیشمار مشکلات کا قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا جنکی تفصیل کیلئے ایک دفتر چاہیے۔ ان مشکلات میں عاجزہ کی شدید علالت تبدیل مقامات دو خاص مشکلات تھیں "پیام امید" پر ان مشکلات کا اتنا اثر تو ضرور پڑا کہ اسکی اشاعت برابر وقت معینہ پر غیر ممکن ہو گئی۔ مگر اس سے زیادہ کوئی اثر نہیں پڑ سکا۔

کاغذ کا قحط جیسا پڑا ہوا ہے اسکا حال ظاہر ہے۔ بہت سے اخبار اور رسالوں کو مجبور ہو کر ادنیٰ قسم کا کاغذ استعمال کرنا پڑا۔ بعضوں نے اپنے صفحات کی مقررہ تعداد میں کمی کر دی۔ "پیام امید" آج بھی رسالہ کیلئے کاغذ کی قیمت میں پہلے کے مقابلہ میں سہ چند اور چہار چند صرف کر کرکے مناسب قسم کا کاغذ صرف کر رہا ہے۔ محض اسوجہ سے کہ وہ ہمیں مالی منفعت پہونچانے کے لئے دنیا میں نہیں آیا ہے۔ بلکہ اسکا کام خدمت کرنا ہے۔ ہر ہر پرچہ جو اپنے مقررہ وقت کے خلاف شایع ہوا ہے۔ اُسکی خلاف وقت اشاعت میرے لئے ایک صدمۂ جانکاہ تھی۔ اسباب ایسے ایسے جمع تھے کہ میں بے بس تھی۔ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر مینے اتنا ضرور کیا کہ جسطرح خریداران رسالہ کو وقت پر پرچہ نہ ملنے سے انتظار کی تکلیف اُٹھانا پڑی اسیطرح مینے بھی میعاد مقررہ ختم ہو جاتے ہی وی پی روانہ نہیں ہونے دیا۔ اور ہر ہر خریدار کے ساتھ اسکی پوری رعایت کی۔

آج بھی یہہ صورت پیش ہے کہ رسالہ کی سالانہ قیمت والے خریدارونکی میعاد اگست نمبر ۱۹۶۱ء کے ساتھ ختم ہو چکی ہے مگر ہمنے ابتک انکی خدمت مین وی پی نہیں بھیجا ہے۔ اب چونکہ وقت پر اشاعت کا معقول انتظام ہو گیا ہے۔ لہذا اب جاکے دسمبر نمبر سال بھر کی قیمت کا قیمت طلب پیکٹ کرا کے بھجوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ خریدار صاحبونکی خدمت میں گذارش ہے کہ اس قیمت کا جو اس پیکٹ کے ذریعہ سے وصول ہوگی ستمبر نمبر سے حساب شروع ہوگا۔ یہہ سالانہ قیمت اگست نمبر ۱۹۶۲ء کے ساتھ ختم ہو جائیگی۔ "پیام اُمید" اپنے ایثار کا ضرورت سے زیادہ امتحان دیچکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس ایثار کا انعام مانگا جائے۔ "پیام امید" کا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ اُسکی صدا ہر کان میں پہونچانے کی راہ تلاش کیجائے۔ یہہ کام میرا نہیں ہے۔ یہہ کام آپکے معزز جوہر شناسوں اور قدردانوں کا ہے جنکی فضل الٰہی سے کمی نہیں ہے بلکہ برعکس اسکے جنکی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر رسالہ کے ہر ہر خریدار صاحب مستقل ارادہ کر لین کہ کم سے کم چار خریدار رسالہ کے پیدا کر دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھینگے تو ایک مہینے کے اندر رسالہ کی اشاعت میں چوگنی ترقی ممکن ہے اس ترقی اشاعت کا فایدہ گھوم پھر کر قوم اور ملک ہی کا فائدہ ٹھہرتا ہے۔ اسوجہ سے کہ رسالہ کی جتنی اشاعت بڑھیگی اتنا ہی اضافہ بلا قیمت اشاعت کی تعداد میں ہوتا جائیگا۔ ہمارے دفتر میں متعدد درخواستیں بلا قیمت اشاعت کی فائل میں موجود ہیں۔

مگر ہم مجبور ہیں کہ انکے لئے کچھ نہیں کر سکتے اسوجہ سے کہ بلا قیمت اشاعت کی جتنی گنجایش
ممکن ہے اوس سے بھی زیادہ اس اشاعت سے پہلے ہی سے ہو رہی ہے
اس تعداد میں مزید اضافہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ ان درخواستوں میں سے
بہت سی درخواستیں اُردو خواں ہندو بیگمات کی ہیں بہت سی نادار مسلمان
طلباء کی ہیں۔

اب ہمیں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بلا قیمت اشاعت کا اختیار
خریداران رسالہ کے ہاتھ میں دیدیں۔ اور اس تحریر کے ذریعہ سے ہم
اعلان عام کرتے ہیں کہ معزز خریداران رسالہ میں سے جو حضرات چھ
نئے خریداروں کے اسماء گرامی بھیجیں انہیں اختیار ہوگا کہ ساتویں خریدار کا
پتہ اپنی تجویز سے بلا قیمت اشاعت رجسٹر میں درج ہونے کے لیے بھیجدیں
ہم سفارش کرتے ہیں کہ یہ انتخاب ذیل کے طبقہ میں سے کیا جائے۔

(۱) تعلیم یافتہ اُردو خوان ہند و خواتین (۲) غریب نادار طلباء جسمین
لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں
یا مسلمان۔ البتہ اُردو خوان ہوں اور اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں۔
جب تک کاغذ کا قحط قایم ہے ہم ہر چھ خریداروں پر ساتویں خریدار بلا قیمت
اضافہ کرتے رہینگے۔ جب کاغذ پہلے کی طرح پر آسانی سے دستیاب ہونے لگیگا
جیسی صورت ہوگی۔ اسکے مطابق ہر چار خریداروں پر پانچواں یا پانچ خریداروں پر
چھٹا خریدار اشاعت مفت میں قایم کرینگے۔

ایک اور رواج ہمارے دفتر میں شروع ہی سے رایج ہے گو درج

ضوابط نہیں ہے۔ مگر اب اسے بھی درج ضوابط کئے لیتے ہیں۔ غریب طالبعلموں کے
لئے جو رسالہ کی پوری قیمت دینے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں بشرطیکہ
اُردو خوان ہوں اور اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں انکے ہیڈ ماسٹر کے
سرٹیفکٹ آنے پر رسالہ اُنکے نام نصف قیمت پر جاری کر دیا جائیگا۔
طالبعلموں کے کلب کے ساتھ بھی یہی رعایت کیجائیگی بشرطیکہ ہیڈ ماسٹر
صاحب کا سرٹیفکٹ داخل کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں یہہ مراعات
ہندو اور مسلمان طلبار کے ساتھ یکساں جاری رکھی جائیگی اور کوئی تفریق
مذہب جائز نہیں رکھی جائیگی۔ اور نہ تفریق جنسی ہوگی۔

معزز خریداران رسالہ مجاز ہیں کہ ایسے پتہ بھی ہمارے دفتر میں اپنی
سفارش پر بھیجتے رہیں۔ جب تک کاغذ کا قحط قائم ہے ہم فی صدی دس
طالبعلموں یا اُنکے کلبوں کے ساتھ ایسی رعایت کرسکتے ہیں۔ یعنی ہر سو ا
مستقل خریداروں پر علاوہ بلاقیمت اشاعت کے دس فی صدی نصف
قیمت کے خریدار قایم کرسکینگے۔ کاغذ کا نرخ پھر ارزان ہوجانے کے بعد
ہم فیصدی پندرہ یا بیس تک اس تعداد میں اضافہ کرینگے۔ جس حد تک کہ
کاغذ کی قیمت اس رعایت کی اجازت دیسکیگی۔ فی الحال ایک نام اضافہ
کرنے کی بھی گنجایش باقی نہیں ہے۔ معزز خریداروں کے ہاتھ میں سارا معاملہ
ہے۔ جتنے نئے خریدار وہ پیدا کرسکینگے اُسی اعتبار سے بلاقیمت اشاعت کی
طرح نصف قیمت کی اشاعت میں بھی وسعت پیدا ہوتی جائیگی۔ خریدار صاحبان
سفارش کرنے سے پہلے براہ کرم دفتر سے دریافت فرمالیں کہ کتنے نام کے

اضافہ کرنے کی گنجایش نکلتی ہے۔ رجسٹرڈ دیکھکر بلا تاخیر جواب دیا جائیگا۔
معزز خریداران رسالہ کی سفارش کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کے سرٹفکیٹ
کی محتاجی باقی نہیں رہیگی۔ انہیں کا سرٹفکیٹ کافی سے بھی زیادہ ہوگا۔
ہماری قومی خدمت کا مدار ہماری وسعت پر ہے۔ یہہ آپ ہی کا کام ہے
کہ ہمارے بازؤں میں قوت پہونچایئے۔ اور جتنی قوت ہم میں بڑہتی جائے
اتنی خدمت ہم سے لیتے جایئے۔ "پیام اُمید" صحیح معنوں میں ایک قومی آلہ
(Organ) بنا چاہتا ہے۔ یہہ کیسکی ذاتی ملک نہیں ہے۔ قوم اسکی
مالک اور مختار ہے۔ اسکے مالک آپ ہیں۔ اور ہم آپ کے خادم ہیں۔
لہذا مالک کے اختیارات مالک ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔

آزاد بیگم

۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء

(بابا)

ساری ۲ — شیپی گون ۱ — بلاؤز ۲ — شلوکہ ۱ — دراز ۲ —

تولیہ بڑی ۱ — دلائی ۱ — رومال ۲ — لنگی ۱ — رومال سرکا ۱

(بیگم صاحب)

ساری ۲ — نائیٹ گون ۱ — بلاؤز ۲ — بنیاین ۲ — پائجامہ ۲ — کرتی ۱

قمیض ۱ — رومال ریشمی ۲ — ″ سوتی ۱ —

ضوابط رسالہ

اس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہونگے۔ "پیام امید" تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا آرگن بنا چاہتا ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ اسکے مخاطب تمام روشن خیال مرد اور مستورات ہیں۔ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اصلی کام آج ہی سے شروع نہیں کرایا جا سکتا۔ ہمیں سب سے پہلے اتحاد پیدا کرنا ہے جبتک ہندو مسلمان اور شیعہ سنی آپسمیں لڑتے رہینگے۔ قوم اور ملک کی ترقی اصلی اور حقیقی معنوں میں بالکل ہی غیر ممکن ہے ہماری کوشش کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم (۱) مسلمان خریداران رسالہ سے تین روپیہ سالانہ قیمت لینگے اور اردو خواں ہندو خواتین کو رسالہ مفت نذر کرینگے جہاں تک اور جس حد تک کہ ہماری اشاعت اس بار کی برداشت کرنے کی قوت ہمیں دے سکیگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم ہندو خواتین سے متفق الرائے ہوجائیں تو مردوں کے خیالات اتنے جلد پلٹا کھاجائینگے کہ دنیا کو حیرت ہوگی (۲) قومی اور ملکی ترقی کی پہلی منزل زبان کی ترقی ہے۔ ہم اردو علم ادب کی ترقی اور توسیع میں سعی بلیغ کرینگے اور وقتاً فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہیں گے تاکہ لایق مضمون نگاروں کو اچھے اور مفید مضامین لکھتے رہنے کی ترغیب اور تحریص ہو۔ رسالہ کی اشاعت بڑھنے پر ہم کوشش کرینگے کہ مفید علمی کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے ہماری زبان میں کئے جائیں اور مناسب قیمت پر فروخت ہوں۔ (۳) ایسے بچے جو کافی طور پر علمی ترقی کر چکے ہیں اور ہر اہم مسئلہ پر ایک خاص رائے قائم کرنے کے متلاشی ہیں انہیں ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں خارجی مدد پہنچانے کی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ زمانہ انکے لئے نہایت نازک زمانہ ہے۔ اگر وہ کسی اہم مسئلہ پر کوئی غلط رائے قائم کرینگے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کے دماغوں میں نشو و نما پاکر وہ غلط رائے جم جائیگی تو ان کی ساری عمر برباد کر دینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہوگی ہم انہیں ایسی خارجی مدد عین وقت پر پہنچائینگے تاکہ آگے چلکر وہ بھی ترقی کی رفتار میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھیں۔

اجرت اشتہارات

توسیع اشاعت رسالہ کے ساتھ اجرت اشتہارات میں تخفیف ہوئی ہے۔ موجودہ نرخ حسب ذیل ہے مگر اسمیں کمی ممکن نہیں ہے۔ اور نہ مزید تخفیف کے لئے مراسلت ہونے پر کوئی جواب دیا جائیگا۔

اندازصفحہ	ایکبار	سہ ماہی	ششماہی	سالانہ
صفحہ	1/-	2/8/-	4/8/-	7/8/-
نصف صفحہ	2/-	5/-	9/-	15/-
پورا صفحہ	4/-	10/-	18/-	30/-

رقوم مندرجہ بالا پیشگی واجب الادا ہیں اور یکمشت وصول ہونا چاہئے۔

منیجر رسالہ

فہرست مضامین پیام امید ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۷ء

اُمید کا پیام — "اُٹھو — اُٹھو — اور آگے بڑھو!"

پیامِ اُمید

نمبر ۱۷	آگرہ - جنوری ۱۹۱۷ء	جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہی - اسمیں جنس کی قید نہیں جس حال میں ہم مستورات مرد ایڈیٹروں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے سیکڑوں اخبار اور رسالے برابر بے تکلف پڑھ رہی ہیں ہمیں روشن خیال مردوں کے طبقہ سے اس حد تک مایوسی نہیں ہے کہ انہیں ہمارے طبقہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ پڑھ لینا بھی گراں گذرے گا - تعلیم یافتہ اور روشن خیال مردوں کا طبقہ ہماری سوسائٹی کا بہترین طبقہ ہے اور ہمیں اس معزز طبقہ کے خلاف ایسی یکطرفہ رائے قایم کرلینے کا کوئی حق نہیں ہے -

---

خانہ آبادی

خانہ آبادی کسے کہتے ہیں؟ یہ ایک حل طلب سوال ہے - جس کا شافی جواب ہمیں درکار ہے - دُنیا میں کون بشر ایسا ہے - چاہے وہ مرد ہو یا عورت -

جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اُس کا گھر بنے؟ جو یہ تمنا نہ رکھتا ہو کہ اُس کا گھر بہترین نمونہ ہو ایک ایک ایسے ہرصورت سے مکمل گھر کا جسے دُنیا ایک قابل تقلید مثال ایک قابل رشک زندگی کا نمونہ قرار دے سکے؟ سچ پوچھئے تو ہم میں سے ہرشخص۔ ہرمرد و عورت۔ ہر چھوٹا بڑا یہی تمنا رکھتا ہے۔ مگر اس حل طلب سوال کا شافی جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہرشخص اپنے نقطۂ خیال کے موافق اپنے گھر کی طرف رُخ کرتا ہے۔ اور نگاہ تجسس دوڑا کر دیکھتا ہے کہ اس گھر کی زندگی میں کیا کیا خامیاں نظر آتی ہیں اور اُسے ضرور بہت سی خامیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ جب کسی قوم کے ادبار کے دن آتے ہیں تو اُس کے افراد خود غرض خود پسند اور آرام طلب ہو جاتے ہیں یہی حال اس وقت ہمارا بھی ہے۔ خود غرضی اور خود پسندی ہمیں اپنا عیب اپنی خامی نہیں دیکھنے دیتی ہے۔ بلکہ ہمارے آرام آسایش اور اطمینان میں اگر کسی طرح کوئی خلل کوئی فتور واقع ہوتا ہے تو ہم اُس کا الزام دوسروں کے سر تھوپ دینے پر تُل جاتے ہیں۔ ہمارے مرد جب اس نظر سے اپنے گھر کی طرف رُخ کرتے ہیں تو ساری خامیوں ساری ابتریں ساری بدنظمیوں ساری خود غرضیوں کا الزام عورتوں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ اب عورتوں کی باری آتی ہے۔ وہ سارا الزام مردون کے کاندھون پر لاد کر خود سبکدوش بنجاتی ہیں۔ ابھی تازہ واقعہ ہے حال ہی کی بات ہے کہ رسالہ پردہ نشین نے ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "میاں بی بی کے ساتھ نباہ کرنے کا طریقہ" مضمون نگار ایک مرد تھا جس نے شامت اعمال سے یہ صلاح دی تھی کہ عورتوں کو اپنے شوہروں کی اطاعت کرنا چاہیئے۔ اگر مردون کو رات کہے تو تمھیں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دینا

چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ مضمون نگار نے اگلے زمانے والوں کے نقطۂ خیال سے لکھا تھا۔ کیونکہ اس زمانہ کا کوئی تربیت یافتہ مرد بیوی کو اس طرح لونڈی بنا کر رکھنے کا خیال خام اپنے دماغ میں نہیں آنے دیتا۔ مگر اس مضمون نے بارود کے میگزین میں دیا سلائی لگا دی اور غیض و غضب کی آگ کے شعلے چاروں طرف سے بھڑکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ آگ کیا کیا فتنہ برپا کردے گی اور اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ اس وقت اخبار "شریف بی بی" کی اشاعت مورخہ ۲ نومبر ۱۹۱۶ء میرے سامنے موجود ہے اس پرچے کی صرف اسی ایک اشاعت میں اس تحریک کے خلاف تین خط اچھے خاصے لمبے چوڑے چھپے ہوئے موجود ہیں۔ ہر خط کا ہر ہر لفظ بول رہا ہے کہ خط لکھنے والی بہن کس قدر پیچ و تاب اور کیسے اشتعال کی حالت میں خط لکھنے بیٹھی ہیں۔ اور یہاں بھی وہی نتیجہ نکل رہا ہے جیسا میں اوپر عرض کر چکی ہوں۔ مرد عورتوں کو ملزم ٹھہراتے ہیں اور عورتیں مردوں کو ان کا دشوں۔ ان کشیدگیوں ان شکر رنجیوں۔ ان شکایتوں اس آپا دھاپی اور رسا ہمی کا اونٹ آخر کس کل بیٹھے گا۔ اس کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ واقعی ملزم کون ٹھہرتا ہے؟ مرد یا عورت؟ مرد کہتے ہیں کہ سارا قصور عورتوں کا ہے۔ مستورات کا طبقہ جواب دیتا ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ سارا قصور تمہارا اپنا ہی ہے۔ ہم سر اسر معصوم اور بالکل بے قصور ہیں۔ مگر ایمان کی بات اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو سارا قصور ہماری شامت اعمال کا ہماری نکبت اور ہمارے ادبار کا ہے۔

اگر ہمارے گھروں میں وہ سچی خوشی وہ سچا اطمینان آسایش اور فارغ البالی

وہ اللہ تعالےٰ کی سب سے بڑی اور گراں قدر نعمت خلوص محبت اور پیار کا نور تجلی نظر نہیں آتا تو اُس کے اسباب کچھ اور ہی ہیں۔ نہ اس میں قصور مردوں کا ہے نہ عورتوں کا۔ اِسی نور تجلی کی برقی روشنی سے ہمارے گھر خالی ہیں۔ اسی کی ساری تاریکی۔ اسی کی ساری وحشت اور ساری پراگندگی ہے۔ جس گھر میں یہ نور نہ ہو اُس گھر کا شیرازہ کیوں نہ پراگندہ ہو۔ کیوں نہ ابتری پھیلے۔ کیوں نہ شکوے شکایات کے دفتر کھُلیں اور کیوں نہ خانہ جنگیوں کی بنا پڑے!

ہمارے تعلیم یافتہ اور روشن خیال بچے انگریزی پڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ گھر کو ایک یورپین گھر کا نمونہ بنا کر کھڑا کر دیں۔ ہماری لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں اور قصے افسانے مضامین لکھتی ہیں اور ایک مہذب گھر کی تصویر کھینچتی ہیں تو انھیں کیا نظر آتا ہے۔ ڈائننگ روم۔ ڈرائنگ روم۔ باتھ روم۔ میز کرسی۔ کانٹا چھُری۔ ہمارے لڑکے اگر ٹامی بابا بننے پر مرے مٹے ہوئے ہیں تو ہماری لڑکیاں کیوں نہ مس بابا بنیں۔ مگر ان سے کوئی اللہ کا بندہ پوچھے کہ فراک اور پیٹی کوٹ کالر اور ٹائی۔ کانٹا اور چھُری کیا اُس نور تجلی کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے جس کا نام اخلاص۔ محبت اور پیار ہے؟ اگر آپ کسی مردہ جسم کو کوٹ پتلون پہنا کر زندہ بنا دینے کی طاقت رکھتے ہیں تو شوق سے ہمیں بھی اپنا اعجاز مسیحائی دکھا دیجئے۔ ہم ایک مدت سے آپ کی کرامات دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ ہمارے گھروں کی مُردہ دلی اگر زندہ دلی سے تبدیل کی جا سکے تو ہم اِسے مردے کو زندہ بنا دینا ہی سمجھیں گے۔ اگر آپ یہ معجزہ دکھا دینے کی طاقت رکھتے ہیں تو دیر نہ کیجئے آج ہی دکھا دیجئے۔ مگر یاد رکھیئے کہ کوئی مردہ جسم کوٹ پتلون پہنا دینے یا کالر ٹائی

لگا دینے سے نہ کبھی زندہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ محبت انسانی زندگی کی جان اور ہماری قومی ہستی کی روح و رواں ہے۔ جب تک آپ اس برق تجلی پر حکومت کرنے کے قابل نہ ہو لیں گے آپ کا مردہ حشر تک مردہ ہی رہے گا۔ کبھی زندہ نہ ہو سکیگا۔ آپ اس برق کے خواص۔ اس کی ماہیت اس کا نظام سمجھئے اور اسکو اپنے مطالعہ کا خاص مضمون قرار دیجئے۔ اگر آپ بیسویں صدی کے ایڈیسن بننا چاہتے ہیں۔ اور جس دن آپ ایڈیسن کی طرح اس وحشی غزال کو رام کرکے اسپر حکومت کرنے کے قابل بنجائیں گے اُسی دن آپ کی نصرت آپکے اقبال کے شادیانے سارے ملک میں بجنے لگیں گے۔ مگر جب تک یہ بات حاصل نہیں ہوتی آپ کی ساری کوششیں بیکار ہیں۔

نومبر نمبر میں ہمشیرہ محترمہ عطا بیگم صاحبہ نے "ظالم مرد مظلوم عورتوں" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرایا ہے۔ اس کے نکات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے۔ اور انصاف کیجئے۔ ہماری ماں۔ ہماری خالہ۔ ہماری پھوپی۔ ہماری چچی۔ ہماری نانی اور پرنانی۔ دادی اور پردادی بھی آخر انسان تھیں۔ نہ وہ کوئی ادنیٰ طبقہ کی مستورات تھیں جنھیں خود داری کا کبھی خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ وہ کوئی بہائم میں داخل تھیں کہ نیک و بد اچھے بُرے۔ بُرائی بھلائی۔ محبت نفرت۔ خندہ پیشانی اور اخلاص سے ملنے اور کدورت رکھنے میں کوئی فرق ہی نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ اُن کے وقتوں میں کیا بات تھی کہ کسی کو کوئی شکایت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی اور آج کیا ہو گیا ہے کہ آئے دن ہمارے اخبارات۔ رسالے اور میگزین شکایتوں کے دفتر بنے ہوئے ہیں۔ اور اس

بوجھ سے ایسے لدے ہوئے ہیں کہ چلنے ہی نہیں پاتے! کیا ہمارے مرد بدل گئے ہیں یا ہم خود بدل گئے ہیں؟ آخر یہ کیا سحر ہے کونسا جادو ہے۔ کیسا طلسم ہے کہ ایک آن واحد میں پل مارتے ہی کیا سے کیا ہوگیا! کیا اُن کے وقتوں میں بھی کبھی یہ شکایت سُنی گئی تھی کہ لڑکیاں ماں کا کہنا نہیں مانتیں۔ لڑکے باپ کا ادب نہیں کرتے۔ بھائی کو بہن سے محبت نہیں ہے۔ اور نہ بہن کو بھائی سے۔ بیویوں کو شوہروں سے شکایت ہے اور شوہروں کو بیویوں سے! اُس وقت کیا تھا کہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب کیا ہوگیا ہے کہ ہَوا ہی بدل گئی ہے! آخر اس کی کوئی وجہ تو ضرور ہی ہوگی؟ پھر کون سی وجہ ہے؟

"خم خانۂ محبت تو ہی تبا خدا را
کیا زہر مل گیا ہے اِس بادۂ کہن میں؟"

مگر ہم ان سوالات کا کوئی جواب دینا نہیں چاہتے۔ اگر آپ کو جواب کی تلاش ہے تو ہمشیرہ محترمہ عطا بیگم صاحبہ کا مضمون مذکور ملاحظہ فرمائیے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مالی منفعت اُٹھانے کے لئے ہوا کے رُخ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں مالی طور پر وُہی کامیاب رہ سکتا ہے جو ابن الوقت ہو اور جس کا یہ مقولہ ہو کہ

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

"پیام اُمید" ابن الوقت بننے کے لئے دُنیا میں نہیں آیا ہے۔ اُس کی جولانگاہ کوئی اور ہی سرزمین ہے۔ وہ ایسی خدمت کا بیڑا اُٹھا کے آیا ہے جس کے لئے مشکل سے کوئی اور کھڑا ہو سکیگا۔ وہ ہوا کے رُخ پر نہیں چلنا چاہتا جس سے اُسکی

رفتار میں آپ سے آپ سہارا ملتا جائے۔ اُسے ایسے خاص موقعوں پر جہاں ہوا کے خلاف چلنے کی اور کوئی جرأت نہیں کرے گا حد سے زیادہ جرأت ہے۔ اور اطمینان اور استقلال کے ساتھ اپنا کام کرتا چلا جائیگا۔ سہارے کے لئے اُس کا تکیہ کسی دُنیاوی طریق کی دستگیری پر نہیں ہے۔ اس کا سہارا صرف اُس ایک ذات پاک پر ہے جو اُسے عدم سے وجود میں لائی ہے۔ اس کا غیبی تائید کے بھروسہ پر وہ یکہ وتنہا اس میدان میں کھڑا ہے۔ اُس کی خدمت نہایت ہی اہم اور نہایت ہی مشکل ہے۔ مگر اس کا مشکل کشا ہر مشکل کا آسان کرنے والا ہے۔

مثال کے طور پر لیجئے

مثلاً "پیام اُمید" دیکھ رہا ہے کہ بے نتیجہ شاعری ہماری بہت ہی بڑی کمزوری ہے۔ اور جب تک کم سے کم ہم اس پایہ کے شعراء نہ پیدا کر سکیں جس پایہ کے سر بندر ناتھ ٹگور ہیں۔ جب تک مہذب دُنیا ہماری شاعری کا لوہا نہ مان لے ہم اپنے مُنہ میاں مٹھو بن کر اگر خوش ہو لیتے ہیں تو ہو لیں۔ مگر ہم یہ چاہتے ہوں کہ دقیانوسی غزلیات لکھ لکھ کر ہم اپنی شاعری کا سکہ مہذب دُنیا پر بٹھا دیں یہ بات نہوئی ہے نہ کبھی ہوگی "پیام اُمید" دیکھتا ہے کہ قومی ترقی کا سب سے پہلا زینہ زبان کی ترقی ہے اور زبان کی ترقی کی راہ میں ہماری شاعری روڑے اٹکا رہی ہے تو سوا "پیام اُمید" کے کون ہے جو ہوا کے رُخ کے خلاف چلنے کی جُرأت کرے گا "پیام اُمید" دیکھتا ہے کہ سر سید مرحوم اور اُن کی پارٹی نے کن کن مصیبتوں کن کن محنتوں سے اردو نثر اور ایک حد تک اردو نظم کو بھی فارسی عربی کے بوجھل اور لایعنی الفاظ کی غلامی سے آزاد کیا تھا۔ میر حسن

انیس۔ شوق۔ پنڈت دیا شنکر نسیم اور جوالا پرشاد برق نے اُردو نظم کو صاف سلیس سادہ بنایا تھا۔ ایک دلکش سادگی ہی اُس کا حُسن خداداد تھا۔ مگر آج ان بزرگوں کی سالہا سال کی محنت برباد کردینے پر نثر میں تو مولانا ابوالکلام آزاد اور نظم میں ڈاکٹر اقبال ایسے تلے ہوئے ہیں کہ اس نوخیز شیریں حرکات معصومہ کے خون سے اپنا دامن تر کریں گے۔ مرے پر سو دُرے والی مثل مشہور تھی ہی۔ ہمارے محترم حضرت اکبر الہ آبادی نے جب دیکھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے آپ بھی خیر سے کانٹا چھری لیکر اُس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اپنا ٹمن چاپ انگریزی دانی کی انگیٹھی پر بھون بھون کر کھانے پر آمادہ ہوگئے۔ یہاں بھی ہوا کے رُخ کے خلاف چلنے کی کس نے جرأت کی تھی یا کون کرے گا اسے بھی آپ دیکھ لیں گے

القصہ ہمیں ہوا کے رُخ پر چلنا منظور نہیں ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر قوم اسی رُخ پر چلی گئی تو اُس کی تباہی یقینی ہے "پیام اُمید" سیلاب کے ساتھ بہہ جانے کے لئے دُنیا میں نہیں آیا ہے۔ وہ سیلاب کا مقابلہ کریگا۔ اگر تائید غیبی اُس کے شامل حال رہی تو وقت آنے پر وہ سیلاب کا رُخ بدل دینے میں ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوگا۔ اگر یہ نہیں ممکن ہے تو وہ اس سیلاب کا شہید بننا پسند کرے گا بجائے اِس کے کہ خود ہی اس کے ساتھ بہنے لگے۔

بہنو آج کے دن میری اصلی مخاطب آپ ہی ہیں۔ میری آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ محترمہ بہن عطا بیگم صاحبہ والا مضمون اور اس مضمون کو غور سے پڑھنے کے بعد آج کے عنوان کے سلسلہ میں جتنے مضامین شائع ہوں

انہیں آپ غور کے ساتھ پڑھتی جائیں۔ یہی میری ساری دماغ سوزیوں کاوشوں محنتوں اور شب بیداریوں کا اصلی انعام ہے۔

آج سے جو سلسلہ مضامین اوپر کے عنوان سے شروع کیا جارہا ہے وہ میرا اپنا مضمون نہیں ہے۔ انگلستان کی ایک مقبول عام تصنیف کا ترجمہ ہے جس کے مصنف ریورنڈ ڈاکٹر جے۔ آر۔ ملر ڈی۔ ڈی۔ ہیں۔ اس سلسلۂ مضامین سے میں یہ امر آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتی ہوں کہ ہمارے گھروں کا شیرازہ کیوں پراگندہ ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ ہم میں کیا کیا خامیاں ہیں اور اُن خامیوں کا کیا علاج ہے۔

ہندوستان میں زمانۂ حال میں جو تعلیم مروّج ہے اس کے حاصل کر لینے پر ہمارے بچّوں میں بہت سی خامیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ جن کا مفصّل حال کبھی کسی اور موقعہ پر عرض کروں گی۔ ہمارے بچّے یورپین طرز معاشرت کی بے سمجھے بوجھے نقل اُتار رہے ہیں۔ ہم میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اسکول بھیجنے سے پہلے بچوں کے خیالات کی اصلاح کر دیا کریں یا جس زمانہ میں کہ وہ زیر تعلیم رہیں اُن کی خامیاں محسوس کر کے اصلاحات کرتے جایا کریں۔ ایک سُلجھے ہوئے خیالات کی تربیت یافتہ ماں کی تربیت سے محروم رہنا ہی سب سے بڑی کمی ہے۔ ہمارے بچے مدرسہ کی کتابیں یاد کر لیتے ہیں اور انسانی زندگی اور طرز معاشرت کے مختلف مسائل پر اُلٹی سیدھی جیسی کچھ رائے ابتداء میں ان کے دماغ میں سما جاتی ہے سن شعور پر پُہنچنے پر وہی پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ ہمارا یہ سلسلۂ مضامین بتائیگا کہ خاندان کے مختلف افراد کے کیا کیا مختلف فرائض ہیں۔ ہمیں ابتک اپنی اہم ذمّہ داریوں کا بھی پُورا احساس نہیں ہوا ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ اگر آپ اس سلسلۂ مضامین کو کامل

غور کے ساتھ مطالعہ فرمائینگی تو کم سے کم احساس تو ضرور ہی پیدا ہو جائیگا۔ دُنیاوی زندگی میں زمانہ کا یہ اصول ہے کہ اِس ہاتھ دو۔ اُس ہاتھ لو۔ جب ہم اپنے مطالبات دُنیا کے سامنے پیش کرنے جاتے ہیں تو پہلے ہمیں یہ بھی تو بتانا چاہئے کہ آخران مطالبات کے عیوض میں ہم کیا دینے پر تیار ہیں۔ یہ مضمون بتائیگا کہ ہمیں اپنے ہر ہر عزیز مثلاً باپ۔ ماں۔ بھائی۔ بہن۔ شوہر سے کیا کیا ملنا چاہئے۔ اور ہمیں اُنھیں کیا کیا دینا چاہئے۔ جو خاکہ اس کتاب میں مصنف نے کھینچکر پیش کیا ہے وہ ایک مستند خاکہ ایک یورپین تربیت یافتہ مہذب گھر کا ہے۔ مگر یہ ایسا گھر آپ کے سامنے نہیں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں میز کرسی کانٹا چھری کالرٹائی کا لفافہ ہی لفافہ نظر آئے اور لفافہ بالکل ہی خالی ہو۔ برعکس اس کے یہاں نہ میز ہے نہ کرسی نہ باتھ روم ہے نہ ڈرائنگ روم۔ مگر ہے وہی جسے ہمیں آپ کو اور سب کو جاننا چاہئے مگر ہم خاک بھی نہیں جانتے۔

عقد مناکحت میاں بیوی کے باہمی نباہ کا ایک سمجھوتہ ہے۔ دونوں فریقوں کے درمیان دوامی صلح قائم رکھنے کا ایک مستقل صلح نامہ ہے۔ اس عہد نامہ کی تکمیل کسی دُنیاوی حاکم کی حکومت کے زیر اثر نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ احکم الحاکمین کے دربار شاہی کے احکام کی تعمیل کیجاتی ہے۔ یہ عہد نامہ دلوں کی لوح پر لکھا جاتا ہے۔ ملائکہ مقربین اس کے گواہان حاشیہ ہوتے ہیں اور سُنت نبوی کے نور کی مُہر سے مزین ہو کر اس کی مصدقہ نقل بارگاہِ احدیت کے محافظ خانہ یعنے لوح پاک میں محفوظ رکھی جاتی ہے۔ اے کاش اس مقدس عہد نامہ کی اہم ذمہ داریوں کا احساس فریقین کے دلوں میں اسی وقت سے پیدا ہو جایا کرتا

جس وقت کہ اس عہدنامہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

مجھے کسی فریق کی بیجا تائید کرنا نہیں ہے۔ اور نہ دوسرے فریق سے زبردستی کی مخالفت کرنا ہے۔ میں جب کہوں گی ایمان اور انصاف کی بات کہوں گی۔ بات کی پچ اور ہٹ دھرمی میرا شیوہ نہیں۔ میں اوپر عرض کرچکی ہوں کہ ہمارے بچے تربیت یافتہ ماں کی ابتدائی تربیت سے محروم رہ کر ہر اہم معاملہ میں اُلٹی سیدھی ایک رائے قایم کرلیتے ہیں۔ اور سنِ شعور پر پہنچکر وہی رائے اُن کے دماغوں میں پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ کاش ہماری مائیں ہمیں ایام تربیت ہی میں یہ سکھادیا کرتیں کہ دُنیا میں زندگی خوش بسر کرنے کا کیا اصول ہے۔ کاش وہ اپنے لڑکے لڑکیوں کو سمجھادیا کرتیں کہ زمانہ سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ جو خیالات آجکل کے اعلیٰ تربیت یافتہ دماغوں میں جاگزیں ہیں وہ اُن خیالوں سے بالکل ہی مختلف ہیں جواب سے دس بیس برس پہلے ہوا کرتے تھے۔ لڑکے پُرانی روش کی فارسی خواں اُستادوں اور پُرانی روش کے بزرگوں کے زیر اثر بھی کچھہ نہ کچھہ ضرور رہتے ہیں۔ اُن کی مثال اُن کا نمونہ نادانستہ طور پر اُن کی اثر پذیر طبیعتوں پر کچھہ نہ کچھہ اپنا رنگ ضرور جاجاتا ہے۔ ہمارے بچے کالجوں اور مدرسوں میں جاجاکر انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ وہ کتابیں تو ضرور ازبر کرجاتے ہیں۔ مگر دُنیا میں زندگی بسر کرنیکے عملی اصول انہیں کوئی نہیں سکھاتا۔ ہائی اسکولوں کے اُستاد عموماً ایسے لوگ ہیں تو خود انہیں بچوں کی طرح ایک تربیت یافتہ ماں کی ابتدائی تربیت سے محروم رہ کر کتابیں ازبر کرگئے ہیں۔ وہ خود کسی اہم معاملہ میں کوئی صائب رائے نہیں رکھتے۔ بلکہ انہیں بچوں کی طرح کتابیں

پڑھ پڑھ کر جو رائے از خود بلا کسی قابل وقعت خارجی مدد کے اُنھوں نے قائم کی تھی وہ اُن کے دماغوں میں جم گئی ہے اور وہ اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان معاملات میں ہمارے بچّوں کی مدد کر سکیں۔ اس کے علاوہ آجکل کیا ہو رہا ہے۔ سررشتہ تعلیم ہی ایک سرکاری محکمہ سمجھ لیا گیا ہے۔ جہاں زیر تعلیم بچوں کے ساتھ وہی سلوک اُستاد کر رہے ہیں جو ایک غیر ہمدرد محکمہ کو کرنا چاہئیے۔ استادوں کو مطلق اس بات کا احساس نہیں ہے کہ بچّوں کی تعلیم اور تربیت کے معاملہ میں وہ ماں باپ کے قایم مقام ہیں۔ اُنھیں بالکل اس بات کا سلیقہ نہیں ہے کہ اپنے اور اپنے زیر تعلیم بچوں کے درمیان ایک ایسا دیرپا رشتۂ محبت قایم کرلیں جو ساری عمر نہ ٹوٹے۔ وہ بات جو اگلے زمانے کے اُستادوں اور شاگردوں میں ہوتی تھی آج کہیں خواب وخیال میں بھی نظر نہیں آتی۔ اُستاد اپنے شاگردوں کو اولاد سے بڑھکر سمجھتے تھے۔ بچّوں سے سچّا خلوص اور سچّی محبت رکھتے تھے۔ اُن کی ذراسی علالت کی خبر پاکر بےچین ہو جایا کرتے تھے اور جب تک اُن کا شاگرد پھر تندرست ہو کر اُن کے مکتب میں نہیں پہونچ لیتا تھا اُنھیں کسی پہلو چین ہی نہیں آتا تھا۔ جب اُستاد بچّوں کو اپنی اولاد بلکہ اولاد سے بڑھ کر سمجھتے تھے تو بچے جو محبت کے پتلے ہوتے ہیں ان پر اس بے ریا خلوص اور سچّی محبّت کا اتنا گہرا اثر ہوتا تھا کہ "جور اُستاد بہ زمہر پدر" کے زبان سے نہیں بلکہ دل سے قائل ہو جایا کرتے تھے۔ اگرچہ اُن اُستادوں کی بعض کمزوریوں کا گہرا نقش بھی اپنے دلوں پر لاتے تھے مگر ساتھ ہی اس کے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ماں باپ سے زیادہ نہیں تو کم سے کم اُنہیں کی برابر ہی برابر

وہ استاد کی حرمت اُستاد کی عزت استاد کی توقیر کرتے تھے۔ آجکل مدرسوں کے اُستاد بید اور چھڑی کے زور پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے اُستاد محبت کے بل پر اپنی سچی حکومت کی بنا ڈالتے تھے۔ چھڑی کی چوٹ صرف بدن پر لگ سکتی ہے دل تک اُس کی مار نہیں پہنچ سکتی۔ کوئی تعجب نہیں اگر شاگردوں کے دل اُستادوں کی حکومت سے باہر ہیں۔ اس میں ایمان کی بات یہ ہے کہ سارا قصور اُستادوں کا ہے۔ وہ اپنے کو ایک محکمہ کا افسر اور بچّوں کو اپنا ماتحت سمجھکر اُن سے برتاؤ کرتے ہیں۔ کوئی دُنیاوی محکمہ دلوں پر حکومت کرنے کے لئے نہیں بنایا گیا ہے نہ کبھی بنایا جا سکتا ہے۔ جیسا بیج بوتے ہو۔ ویسا ہی پھل پاؤ گے۔ پھر آئے دن رونا کس بات کا ہے کہ لڑکے ہمارا ادب نہیں کرتے اور پُرانے زمانے کے اُستادوں کی طرح ہماری پرستش نہیں کرتے! اسکولوں سے بڑھ کر کالجوں کے احاطہ میں قدم رکھئے۔ یہاں کیا ہے؟ یہاں کی دُنیا کیسی ہے؟ یہ بھی ہمارے لئے کوئی نئی دُنیا نہیں ہے۔ یہاں بھی دُنیاوی تصنع بناوٹ اور ظاہرداری کی ہمدردی بچّوں سے جتائی جاتی ہے۔ جس سکہ میں تم قرضہ تقسیم کرتے ہو اسی سکہ میں تمہارا قرض تمہیں واپس دیدیا جاتا ہے۔ نہ تم ہمارے بچّوں کے دُکھ سُکھ رنج و راحت کے شریک بننا چاہتے ہو نہ اُن کے دلوں کو تمہارے ساتھ کوئی لگاؤ ہے جیسی بناوٹ کی ہمدردی تم کرتے ہو ویسا ہی جواب پا جاتے ہو۔

قصہ مختصر گھر کی چاردیواری کے اندر ابتدائی تربیت سے ہمارے بچے صاف یوں کورے رہ گئے۔ مدرسے بھیجے گئے وہاں کا جو حال تھا آپ نے دیکھ لیا۔ پھر آخر انجام کیا ہونا تھا؟ جو ہونا تھا وُہی ہو رہا ہے۔

ہمارے لڑکے پُرانی روش کے بزرگوں سے نادانستہ یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ مرد حاکم ہے اور عورت محکوم۔ بیوی کی نازبرداری اور رضاجوئی حاصل کرنے کا جو شخص خیال پیدا کرے وہ زن مرید ہے۔ شوہر اگر دن کو رات کہے تو بیوی کا فرض ہو کہ وہ بھی ہے کہ وہ بھی رات کہے۔ یہ سبق تو گھر سے سیکھ کر لڑکے مدرسے بھیجے گئے۔ وہاں جاکر انگریزی کتابوں انگریزی اخباروں رسالوں میگزینوں کو پڑھ کر کیا سبق سیکھا؟ وہ "آزادی"! اُستاد اگر بچوں کے نگراں رہتے۔ اگر وہ اُن کے نیک و بد میں شریک رہنا اپنا فرض جانتے اگر وہ یہ سمجھتے کہ ان کا کام یہیں ختم نہیں ہوجاتا ہے کہ نصاب تعلیم کی مشروطہ کتابیں از بر کرا کے انہیں امتحان پاس کرا دیں تو وہ اُس کی بھی کچھ فکر اپنے ذمہ لیتے کہ اِن بچّوں کی کیا کیا مشکلات ہیں۔ اُن کے زیرِ مطالعہ کتابوں کے اندر کہاں کہاں عمیق غار شاداب سبزے سے ڈھکے ہوئے پڑے ہیں کہ اگر وہ نادانستہ ان پر پاؤں رکھ دیں گے تو ایسی بُری طرح تحت الثریٰ کی خبر لیں گے کہ حشر تک وہاں سے باہر ہی نہ آسکیں گے۔ اُنہیں مہینہ پُورا ہونے پر اپنی تنخواہ سیدھی کر لینے سے مطلب ہے۔ چاہے مُردہ بہشت میں جائے یا دوزخ میں۔ انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ ہمارے بچے "آزادی" کا نام سُنتے ہی باولے ہوجاتے ہیں۔ بہن حُسن آرا بیگم نے "مکتوباتِ حُسن آرا" میں اس موقعہ کی پوری تصویر بڑی صفائی سے دکھائی ہے۔ اُسے ملاحظہ فرمایئے۔ القصہ آزادی کے قیود آزادی کے مستثنیات تو انہیں کوئی نہیں بتاتا وہ آزادی کا نام سُن کر ایسے دیوانے بنجاتے ہیں کہ آزادی کے دیو۔ آزادی کے خبیث۔ آزادی

کے بہایم بنجاتے ہیں۔ ماں باپ کی عزت کریں تو آزادی کا خون ہوجائے۔ اُستاد کی توقیر کریں تو آزادی کا ملیامیٹ ہوجائے۔ بیوی کی بات مانیں تو آزادی کی چڑیل اُن کا گلا گھونٹنے لگے۔

یہ تو لڑکوں کا حال ہوا۔ لڑکیوں پر بھی تعلیم پاکر وُہی گذر رہی ہے جو لڑکوں پر گذرتی ہے۔ یہ بھی "تعلیم" پاکر آزادی کی ہیبت ناک دیوی کی پرستار بنجاتی ہیں مگر آزادی کی قیود۔ اس کی مشتثنیات خاک بھی نہیں سمجھتیں۔ ماں باپ کا کہنا مانیں تو آزادی کی دیوی روٹھ جائے۔ میاں کی بات مانیں تو آزادی کا خون خرابا ہوجائے۔

مگر ہائے شامت! اسی تعلیم کے لئے تعلیم تعلیم کی رٹ لگائی جا رہی ہے اسی تعلیم کے لئے آسمان سر پر اُٹھایا جا رہا ہے۔ اسی تعلیم کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں! ہم نے طوطے کی طرح بے سوچے سمجھے ایک لفظ "تعلیم" کا رٹ لیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخا کرتا ہے کہ "تعلیم دو" "تعلیم دو" مگر یہ کوئی نہیں سوچتا کہ کیا تعلیم دو اور کیونکر تعلیم دو۔ کیونکہ یہاں تو دماغ خرچ کرنے کی ضرورت ہے جس کا شامت اعمال سے ہم میں قحط ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آجکل "تعلیم تعلیم" کی رٹ ہر گلی کوچہ میں لگائی جا رہی ہے۔ ہر شخص دیکھتا ہے کہ جو کوئی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس چیخ پکار میں شریک ہوجاتا ہے وہ ملک میں عزت بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور بڑا عالی دماغ اور روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔ پھر روشن خیالوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لینا بھی کتنا سستا سودا ہے۔ اور اس قیمت پر کون نہ خریدیگا!

میاں بیویوں کی باہمی کشیدگی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہی ہے جو میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ اب اور آگے چلئے۔ نئے طرز تعلیم نے اگر "آزادی" کا ایک لفظ کان میں ڈال دیا اور رہا ہوگئی تو اس کی یاد تازہ رکھنے کے اور کیا کیا سامان ملک میں موجود ہیں۔ اخبار اور رسالے۔ جو انگلستان کی سفریجیٹ عورتوں کے کارنامے فخریہ نقل کرتے اور سُناتے پھرتے ہیں۔ اور اس آزادی کے نقش کو دلوں پر روز بروز اور گہرا بناتے جاتے ہیں۔ —

ہاں تو میں عرض کر رہی تھی کہ عقد نکاح میاں بیوی کے درمیان میں دوامی صلح اور امن قایم رکھنے کا ایک مستقل صلح نامہ ہے۔ مگر ہماری عدالتوں میں متخاصمین مقدمہ میں کیونکر مصالحت طے پاتی ہے۔ لڑنے کے وقت کیا ہوتا ہے؟ ہر فریق صرف اپنے ذاتی حقوق پورے پورے حاصل کر لینے پر اڑا رہتا ہے۔ دوسرے فریق کے حقوق کا خس برابر بھی خیال دل میں نہیں لاتا۔ اگر دوسرے فریق کے حقوق کا بھی اُسے پورا احساس ہوتا تو مقدمہ ہرگز عدالت تک نہ پہنچتا۔ باہمی گفت و شنید سے گھر ہی پر وہیں کا وہیں فیصل ہو جاتا۔ مگر اب جبکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ گھر کے شکوے شکایات گھر کی چار دیواری سے باہر نکلکر پبلک کے پلیٹ فارم تک پہنچ گئے اور اخبار اور رسالوں کے ذریعہ سے پبلک کی پنچایتی عدالت میں مقدمہ کی صورت میں دائر ہوگئے تو ان قضیوں کے فیصل کرنے کا کیا طریق باقی رہ گیا؟ یہی اور صرف یہی کہ فریقین مقدمہ باہمی مصالحت سے معاملہ طے کر لیں۔ اور عدالت میں پیروی کرنے سے دست بردار ہو جائیں۔ جیسا مشورہ کہ محترمہ بہن عطا بیگم صاحبہ نے

دیا ہے۔ اور جو غور سے مطالعہ کا محتاج ہے۔

جب تک اس مقدمہ کے فریقین میں سے ہر فریق محض اپنے ہی ذاتی حقوق کے پورے پورے مطالبہ پر جارہیگا کوئی مفید اور کارآمد نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اخبار اور رسالوں کی کالموں کو خانہ جنگیوں کا اکھاڑا بنانے سے یہ گتھیاں نہ آجتک سُلجھی ہیں اور نہ حشر تک کبھی سُلجھیں گی بلکہ برعکس اس کے اس سے بہت ہی بدنما اور بُرے نتائج پیدا ہوں گے۔ شکر رنجیاں اور کشیدگیاں روز بروز بڑہتی ہی جائیں گی اور آخر کار ایک دن مردوں اور عورتوں کے درمیان میں انگلستان کی طرح یہاں بھی ایک ناقابل عبور خلیج واقع ہو جائیگا انگریزوں کی قوم ایک مدبر دانشمند مہذب اور تربیت یافتہ قوم ہے۔ وہ اپنی بگڑی ہوئی بات کسی نہ کسی طرح بنا ہی لیں گے۔ مگر ہم میں ایسی صورتیں کہاں نظر آتی ہیں جو ایسا معجزہ دکھا دینے کی قدرت رکھتی ہوں۔ بہنو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ بگڑی بات کا بنجانا ابھی آسان ہے۔ خدا نہ کرے ایسا وقت آپہنچے کہ اس کا انسداد ہمارے قابو سے باہر ہو جائے۔ ہمیں اپنے دل میں انصاف کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ آخر اس طرز عمل کا کیا حشر ہونا ہے۔ ہمیں جسطرح اپنے مطالبات پیش کرنے میں یہ بات ملحوظ ہے کہ ہمارے حقوق ہمیں پورے پورے مل جائیں اسی طرح ہم دوسروں کے حقوق کا بھی خیال اور احساس پیدا کریں اور ہمارے حقوق کا تب ہی تصفیہ ممکن ہے۔ جب ہم ایک بار اپنی خامیوں پر انصاف کی نظر ڈالیں گے تو یہ بات روز روشن کی روشنی میں ہمیں صاف صاف نظر آنے لگیگی کہ ہم کہانتک حق بجانب ہیں اور کہانتک ہم زیادتی

کررہے ہیں۔ گھر کے معاملات گھر ہی کی چار دیواری کے اندر رکھنا اپنی عزت اپنی حرمت قایم رکھنا ہے۔ ان معاملات کو طشت از بام کرنے میں ہماری ہی سبکی اور رسوائی ہے۔ اگر کہیئے کہ اس تدبیر سے ہماری مقصد برآری ہوجائیگی تو یہ بالکل ہماری خام خیالی ہے۔ بلکہ برعکس اس کے سُبکی اور رسوائی کے علاوہ نقیض روز بروز بڑھتی ہی جائے گی اور آخر کار یہ مُہلک مرض بالکل ہی لا علاج ہو جائیگا۔ ابھی تک تو اچھی طرح علاج پذیر ہے۔ اگر ہم آپ ابھی سے بیدار ہو جائیں۔ اور نیم حکیم خطرۂ جان والے طبقہ کی مشورات سے کنارہ کشی اختیار کرلیں۔ جیسا کہ محترمہ بہن عطا بیگم صاحبہ مشورہ دیتی ہیں۔

ابتک جو کچھ ہوا بلا سے ہوا۔ اُس کا غم فضول ہے۔ گذشتہ را صلوٰۃ۔ مگر اسی کے ساتھ آیندہ را احتیاط کا پہلو بھی ہمیں بڑی مضبوطی سے پکڑ لینا چاہیئے۔ آج ہی کی تاریخ سے ہماری لڑکیوں کو یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے "کہ آزادی" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنی ساری انسانی ذمہ داریوں سے بری الذمہ بن جائے اور ہر بات کا یہی جواب دیدیا کرے کہ ہم آزاد ہیں۔ ہم ماں باپ کا ادب نہ کریں گے کیونکہ ہم آزاد ہیں۔ تعلیم و تربیت جس کا نام ہے۔ وہ ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ بڑوں کا ادب کریں۔ چھوٹوں سے محبت رکھیں۔ اور اپنی ساری اہم ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کریں۔ شوہرو اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیویاں تمہارے تابعدار ہو جائیں تمہاری آنکھوں کے اشاروں پر چلیں تمہاری لونڈیاں بن جائیں۔ بیویو اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے شوہر بالکل ہی تمہارے ہو کے رہیں یہی نہیں بلکہ مطیع اور فرمانبردار بنجائیں تو تم دونوں کو میں ایک ایسا نسخہ بتاتی ہوں جو کبھی خطا نہیں کرسکتا۔ یہ نسخہ

شیخ الرئیس بو علی سینا کے بھی استاد کی بیاض سے چرایا گیا ہے۔ اور تم اسے تیر بہدف سمجھو۔

اگر تم چاہتے ہو کہ دوسرا فریق تمہارا سچا غمخوار تمہارا سچا رفیق تمہارا سچا خدمت گذار ہی نہیں بلکہ تابعدار یا اس سے بھی بڑھ کر۔ جان نثار بنجائے تو پہلے تم اسکے سچے غمخوار سچے رفیق سچے وفادار بن لو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ زمانہ کے موافق اعتدال کے ساتھ ہمدرد ملے۔ تو تم پہلے خود اس کے ویسے ہی ہمدرد بن جاؤ۔ اگر تم اسے اپنا عاشق زار بنانا چاہتے ہو تو پہلے تم اس کے عاشق زار بن لو۔ پھر دیکھو دوسرا فریق بھی آپ سے آپ ویسا بن جاتا ہے یا نہیں۔ اگر تم اس میں بھی تصنع اور بناوٹ خرچ کروگے تو یاد رکھنا دوسری جانب سے بھی ویسی ہی بناوٹ پاؤگے۔ اگر تم جو کچھ کر رہے ہو دل سے کر رہے ہو تو دوسری طرف سے بھی ہر بات دل ہی سے کیجائیگی القصہ ہیو یو جیسا تم چاہتی ہو کہ تمہارے شوہر بن جائیں۔ پہلے ویسی ہی تم آپ بن لو اس کے بعد اگر تمہارے شوہر بھی آپ سے آپ ویسے ہی تمہارے سچے مخلص سچے دردمند نہ ہو جائیں تو تم جس طرح چاہو مجھ سے اس کا محاسبہ کر سکتی ہو۔ مگر تم یہ چاہو کہ ہم کچھ نہ کریں۔ بے محنت مشقت کے ہمیں دنیا کا سب سے شیریں ثمر آپ سے آپ مل جائے تو یہ بات کبھی نہ ہوگی۔ حب کا عمل۔ تسخیر۔ جادو جو کچھ بھی ہے۔ اسی کا نام چلتا جادو ہے۔ اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو۔ جب چاہو آزما دیکھو۔ لیکن تم چاہو کہ اخباروں، رسالوں، میگزینوں میں مضامین شائع کر کرکے اس امن عافیت اس ہمیشہ کے چین کو حاصل کر لو۔ تو یہ بات کبھی نہ ہوگی۔ اس طرز عمل سے سوا برائی کے کبھی بھلائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ حریت نسواں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم ایک

فوج بن جاؤ اور اپنے باپ بھائی، چچا ماموں، خالو، شوہر پر رائفل کی گولیاں اور گولے برسانا شروع کردو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ تمھیں اس بری راہ چلانا چاہتے ہیں وہ ہرگز تمہاری بھی خواہ تمہارے دوست نہیں ہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں۔ جس طرح ہمارے لڑکے "آزادی" کا نام سُنکر دیوانے ہوگئے ہیں اسی طرح تم "حریت نسواں" کا نام سنکر باولی مت بنجاؤ۔ اور اپنے ناخنوں سے اپنے گوشت کی بوٹیاں نوچ نوچ کر پھینکنے پر نہ تل جاؤ۔ سوچو کہ یہ کام عقل کا نہیں ہے۔ یہ دیوانگی ہے۔ کون کہتا ہے کہ تمہیں آزادی نہیں ہے۔ ہر ممکن طریق پر تمہیں ہر طرح کی جائز آزادی حاصل ہے بشرطیکہ تم اپنی روش اپنے طرزِ عمل سے اپنے کو اُس آزادی کا اہل ثابت کردکھاؤ۔ مگر تم یہ چاہو کہ ایک طرف تو باپ، چچا، بھائی شوہر کو نشانۂ ملامت بناؤ اور دوسری جانب انہیں سے آزادی مانگنے جاؤ تو آخر وہ کس اطمینان پر تمہیں آزادی دے سکتے ہیں۔ ایمان کی بات کہنا ہٹ دھرمی کا سند نہیں ہے۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ اپنے کو فخریہ تعلیم یافتہ کہتی ہو۔ تمہاری تعلیم سے دُنیا کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں دُنیا انتظار میں ہے کہ تمہاری تعلیم کے شیریں ثمرات سے فیض یاب ہو۔ وہ شیریں ثمرات کیا ہیں اور کیا ہونا چاہیئے؟ بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ۔ عزیزوں سے محبت شوہروں سے اخلاص۔ بچّوں کی بہترین ابتدائی تربیت۔ خانہ داری کا سلیقہ شعاری سے انتظام۔ اگر تم یہ سب اہم ذمہ داریاں خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہو تو دُنیا میں کون ایسا کمبخت مرد ہے جو تمہیں سر آنکھوں پر نہ بٹھائے گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان اہم ذمہ داریوں کے بہترین طریق پر ادا کرنے کی قابلیت "حریت نسواں" کی رٹ لگانے سے تمہارے اور تمہارے مردوں

دونوں کے لئے ہزار ہزار گونہ زیادہ مفید ہے۔ اگر تم اس راہ چلوگی تو تمہارے عزیزو اقارب میں جتنے مرد ہیں سب کے سب اگر تمہاری راہ میں آنکھیں نہ بچھائیں تو تم مجھے انسان نہ سمجھنا۔ اس طرز عمل کے بعد یقین مانو تمہیں حریت نسواں کی صدا بلند کرکے اپنا حق مانگنے کی حاجت ہی باقی نہ رہیگی۔ اور تمہارے حق سے بھی زیادہ تمہیں بے مانگے اگر نہ ملنے لگے تو میرا ذمہ۔

آج کا تمہیدی مضمون خلاف توقع زیادہ طول پکڑ گیا۔ اس عنوان کی تحت میں جو سلسلۂ مضامین لکھا گیا ہے اب اس کی اشاعت آیندہ نمبر سے شروع کیجائے گی۔

عاجزہ (آزاد بیگم)

بیوی کا اثر شوہر کے اطوار اور اخلاق پر

(اقتباس و ترجمہ از اسمائیلس کیریکٹر)

کوئی عقلمند شخص محض حسن صورت ہی پر بیوی کے انتخاب کا مدار قرار دے نہ سکے گا۔ حسن صورت ابتداء میں انسانی طبیعت پر بڑا اثر ڈالتا ہے مگر امتداد زمانہ اس اثر کو رفتہ رفتہ زائل کرتا جاتا ہے۔ اس سے میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ حسن صورت کی قدر نہ کیجائے۔ کیونکہ اگر اور حالات بھی مساوی ہوں تو حسن صورت صحت کی دلیل ہے۔ مگر اچھی عورت کس کام کی اگر اسی کے ساتھ ہی حسن سیرت بھی موجود نہ ہو۔ ایک دل کش دلربا صورت جو نیکی پاکیزگی اور محبت سے خالی ہو ہمارے کس کام کی؟ جس طرح کہ ایک اچھے سے اچھا

دل کش۔ قدرتی منظر۔ کوئی دلفریب سبزہ زار، کوئی دلفریب آبشار، کوئی رنگارنگ معطر اور معنبر پھولوں سے لدا ہوا خطہ کوہسار، روزمرہ سیر کرتے کرتے اس منظر کی یکسانی ہماری آنکھوں کو اپنا عادی بنا دیتی ہے اور تھوڑے دنوں میں وہی پُرفضا منظر ہمارے لئے دلچسپی سے خالی نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح حسین سے حسین صورت بھی روزمرہ نظر کے سامنے رہتے رہتے آنکھوں کو اپنے نظارہ کا عادی بنا دیتی ہے اور کچھ مدت گذر جانے پر ہمیں خیال بھی نہیں باقی رہتا کہ یہ صورت جو ہر وقت ہمارے پیش نظر رہتی ہے حسین بھی ہے۔ ہاں البتہ اگر اس حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی شامل ہے تو سیرت کی دلکشی حسن صورت کی یاد بھی تازہ رکھتی ہے۔

جس صورت کے ساتھ حُسن سیرت بھی شامل ہو تو چاہے وہ صورت کوئی واقعی حسین اور دلکش صورت نہ ہو مگر اُس کا حُسن سیرت اسے ہمیشہ حسین بنائے رکھتا ہے اور انسان کا دل اس لازوال حُسن کا ہمیشہ پرستار بنا رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حُسن صورت زمانہ کے انقلاب پذیر اثرات کا شکار بن کر متغیر ہو کر معرض زوال میں پڑتا جاتا ہے۔ مگر برعکس اس کے حُسن سیرت زمانہ کے نشیب و فراز سے تجربہ حاصل کر کے جتنا زیادہ زمانہ گذرتا جاتا ہے اتنا زیادہ پختہ کار ہوتا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں اگر امتداد زمانہ سے حسن صورت گھٹتا جاتا ہے تو حسن سیرت بڑھتا جاتا ہے۔ عقد کے پہلے سال کے بعد میاں بیوی کی نظر ایک دوسرے کے حسن صورت پر کبھی شاذ ہی پڑتی ہے۔ چاہے انہیں سے کوئی انتہا درجہ کا حسین بھی ہو تب بھی یہی حال ہوتا ہے۔ مگر مزاج کی خوبی یا خرابی ایسی شے ہے

ہے جس پر دونوں کی ہر وقت نظر پڑا کرتی ہے۔ مشہور فلسفی ایڈیسن کا قول ہے کہ "جب میں کسی ترشرو۔ تندخو۔ آتشی مزاج شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُس کی بیوی کے حال پر ترس آتا ہے۔ برعکس اس کے جب مجھے کوئی فراخ دل خندہ پیشانی ذہین اور ذکی آدمی ملتا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ اس کے دوستوں۔ اہل خاندان اور اعزا کا وقت کیسی خوشی اور اطمینان سے گذرتا ہوگا"

مشہور اسکاچ شاعر برنس کے خیالات ہمارے ناظرین دیکھ چکے ہیں۔ لارڈ برئے نے جو نصیحت اپنے بیٹے کو لکھی تھی آج وہی ناظرین کے سامنے پیش کی جاتی ہے "جب اللہ جل شانہ وہ وقت لائے کہ تم سن شعور کو پہنچو تو اس وقت بیوی کے انتخاب میں بہت ہی سوچ بچار سے کام لینا۔ کیونکہ محض اسی ایک بات پر تمہاری ساری زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا مدار منحصر ہے۔ یاد رکھو کہ تمہاری زندگی بھر کے لئے یہ ایک ہی موقع ہے۔ جس طرح جنگ کے زمانہ میں کسی فوج کا کمانڈنگ افسر (جنرل) صرف ایک ہی بار غلطی کر سکتا ہے اور اُس ایک اکیلی غلطی کا انجام ساری فوج کی تباہی اور شکست فاش ہوسکتی ہے۔ اسی طرح بیوی کے انتخاب میں بھی تم سے صرف ایک ہی بار غلطی ہوسکتی ہے مگر وہ غلطی تمہاری ساری عمر کو برباد کر دینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس وجہ سے کہ بیوی کے انتخاب کی ساعت ہی سے تمہاری ذات سے جو بھلائی یا برائی ہونا ہے اُس کا آغاز ہوتا ہے۔ بیوی کے انتخاب کے وقت تمہیں نہایت ہوشیاری سے معلومات ذیل فراہم کرنا چاہئے۔ تمہیں دریافت کرنا چاہئے کہ اُس کا مزاج کیسا ہے۔ لڑکی کے باپ ماں نے اپنا عالم شباب کیونکر اور کس حالت

میں بسر کیا ہے ۔ تمہاری بیوی کو غریب اور مفلوک الحال نہ ہونا چاہیئے ۔ چاہیے
وہ کیسی صحیح النسب اور فیاض ہو اور سیر چشم بتائی جائے ۔ اور نہ محض دولت
ہی کی طمع میں گرفتار ہو کر کسی تنگ ظرف کمینہ خیال عورت سے شادی کر لینے
پر آمادہ ہو جاؤ ۔ ایسی شادی کا یہ انجام ہوگا کہ خود تم سے اپنا وقار قایم نہ رہ
سکیگا ۔ اور غیر لوگ تمہیں حقارت کی نظر سے دیکھیں گے ۔ اسی طرح کسی پستہ
قد بونی یا احمق عورت کو نہ بیاہ لانا ۔ بونی بیاہو گے تو تمہارے بچے پنجرے
میں پالنے کے قابل ہوں گے ۔ بیوی احمق ہوئی ۔ تو تمہاری بے وقری ہر
اور اس کی باتیں سُن سُن کر تمہیں دن رات رنج پہنچتا رہے گا ۔ اور آخرکار
تم اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ مادہ الّو کی طرح مادہ احمق سے بڑھ کر کوئی شے
دُنیا میں قابل نفرت نہیں ہے ۔"

بیوی کا بہت ہی گہرا اثر انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو پر پڑتا ہے ۔
تنگ ظرف اور پست خیال عورت کی صحبت اُسے پستی کی جانب مائل کرتی ہے
اور بلند نظر وسیع الخیال عورت کی صحبت اُسے اوجِ رفعت پر پہنچاتی ہے
اوّل الذکر صورت میں مفید نیک اور اعلیٰ پایہ کی باتوں کیطرف سے اُس کا
رجحان کم ہوتے ہوتے ایک دن بالکل ہی زائل ہو جائیگا ۔ اس کی مستعدی
اس کی سرگرمی اس کی سرگرم کوششیں جن کا رُخ اعلیٰ درجہ کے مفید کاموں
کی جانب ہوتا اب کسی دوسرے ہی جانب پھیر دیا گیا ہے اور اخلاقی نقطۂ
خیال سے گویا اُس کی زندگی بیکار بے مصرف اور رائگاں ہو گئی ہے ۔
آخر الذکر صورت میں جب سچی محبت کا جواب سچی محبت اور سچے خلوص سے

ملے گا تو اس کا اخلاقی پہلو مضبوط ہو جائیگا۔ اُسے آرام اطمینان اور فارغ البالی نصیب ہو گی اور اس آرام اور اطمینان کے امن میں اس کی ذہانت ذکاوت اور دماغی جوہروں کو نشوونما پاکر ابھرنے کا موقع ملے گا۔ محض اتنے ہی پر خاتمہ نہیں ہے بلکہ تربیت یافتہ وسیع الخیال اور زندگی کے اعلیٰ اصولوں کی عملی پیروی کرنیوالی عورت کی صحبت ایک غیر محسوس طریق پر مرد کی زندگی کے مقاصد کو اعلیٰ اور ارفع بناتی جائے گی۔ برعکس اس کے تنگ ظرف پست خیال عورت کی صحبت ایک نامعلوم اور غیر محسوس طریق پر مرد کی اخلاقی سطح کو رفتہ رفتہ پستی کی جانب مائل کرتی جائے گی۔ مشہور زمانہ ڈی ٹاک وِل اوپر کے سادہ فقرات کی صداقت کا حق الیقین رکھتا تھا۔ اُس کی مستقل رائے تھی کہ انسانی زندگی میں نیک مزاج رفیع الخیال اور اعلیٰ اخلاقی اصول کی پابند بیوی سے بڑھ کر کوئی اور قوت دُنیا میں میسر نہیں ہے جس کے سہارے پر انسان بھروسہ کر سکے وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے تجربہ میں بعض ایسی مثالیں بھی دیکھی ہیں جہاں کہ بہت سی کمزور اور محدود دائرۂ نظر کے لوگوں سے بڑے بڑے اہم کارنامے وقوع میں آئے ہیں محض اس وجہ سے کہ اُن کی شریک زندگی ایک رفیع الخیال بلند نظر عورت تھی۔ جو اُن کی زندگی کے اشغال میں اُن کو ہمت دلا کر نیک اور مفید کاموں کی جانب مائل کرتی تھی اور اعلیٰ فرایض انسانی کی اہمیت اُنکے دلوں پر نقش کر کے اُن کی شریک حال ہمدرد اور حوصلہ فزا رہتی تھی۔ برعکس اس کے وہ کہتا ہے کہ میں نے اس سے بھی زیادہ بہت سی ایسی مثالیں دیکھی ہیں جہاں مرد رفیع الخیال بلند نظر تھا مگر اس کی شریک زندگی ایک ایسی عورت

تھی جس کا دائرۂ نظر تنگ و تاریک تھا اور جس کی نظروں میں خوش زندگی بسر کرنیکے صرف یہی معنی تھے کہ مکان اعلیٰ درجہ کا سجا سجایا ہوا ہو۔ بیش قیمت سامان اور آرائیش سے مزین ہو۔ اچھی اچھی نفیس پوشاکیں لذیذ کھانے ہوں۔ عیش و عشرت میں زندگی بسر ہو۔ انسانی فرایض۔ انسانی زندگی کے اہم فرائض۔ اہم ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہ تھا۔ انجام یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ رفیع الخیال مرد بھی کاہلی اور عیش پسندی کا عادی بنگیا۔ اور اُس کی ذات سے دُنیا کا کوئی مفید کام جسکی انجام دہی کا وہ اہل تھا کبھی انجام نہ پا سکا۔ "پیام امید"

(نوٹ) اوپر کا مضمون خاص طور پر غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔" اعلیٰ تربیت یافتہ اور وسیع الخیال" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زمانہ حال کی مروجہ سطحی تعلیم پاکر کوئی شخص اپنی کو رفیع الخیال اور اعلیٰ تربیت یافتہ سمجھنے لگے۔ فیشن ایبل ہوجانا۔ آرام و آسایش کے اچھے سے اچھے سامان بہم پہنچا کر زندگی بسر کرنا بھی اعلیٰ تربیت کا ثبوت نہیں بن سکتا۔ جب تک انسان اپنی اہم انسانی ذمہ داریوں کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کرلے۔ جب تک کم سے کم وہ یہ نہ سمجھنے لگے کہ ساری قوم ملکر ایک واحد متنفس ہے۔ اور اُس متنفس کا ایک ادنیٰ عضو میں ہوں۔ اس حیثیت سے میرا کیا فرض ہے اور مجھے کیا تدبیر کرنا چاہئے کہ ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت ہوسکوں۔ مجھہ میں کیا کیا خامیاں ہیں۔ اُن خامیوں کا کیا علاج ہے۔ وہ خامیاں کیونکر رفع ہوسکتی ہیں۔ کیا کیا عملی تدابیر اختیار کرنا چاہیئے۔ جب تک ان باتوں کا احساس پیدا نہ ہو کسی ترقی کی اُمید فضول ہے۔

قوم افراد کے ایک خاص طبقہ کا نام ہے۔ قوم کے افراد قوم کے جسم کے اعضا ہیں۔ ہم میں سے ہر ہر شخص سب سے پہلے اگر اپنے گھر کا نظام ٹھیک کر لی جائے تو رفتہ رفتہ قوم کی حالت بھی سنبھل جائے گی۔ جس وقت ہم اپنے کو اس حالت پر پہنچا دیں کہ ہمارے گھروں کی مردہ دلی زندہ دلی سے تبدیل ہو جائے۔ چھوٹے اپنے بڑوں کا ادب کرنے لگیں۔ عزیزوں سے محبت اور اخلاص کا مضبوط رشتہ قایم ہو۔ میاں بیویوں میں خلوص اور محبت بڑھے۔ ہمارے بچے اس زندہ دلی کی روشن شعاعوں کے نور میں بڑھیں اور پرورش پائیں۔ جب اس حد تک ہم پہنچ لیں تو آگے ترقی کا راستہ صاف کھلا ہوا ہے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسمائیلس کے مضامین میں عورت کے جو جو اوصاف دکھائے گئے ہیں ہمیں غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ اس معیار کے مقابلہ میں ہم میں کیا کیا خامیاں ہیں۔ اگر رفتہ رفتہ ہم ان خامیوں کو پورا کر سکیں تو ہماری فتح یقینی ہے۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ "اسمائیلس کیرکٹر" سے جتنے ترجمے اور اقتباسات شائع ہوئے ہیں انہیں بہنیں غور سے مطالعہ فرمائیں گی۔ ہماری کاوشوں اور دماغ سوزیوں کا سب سے بڑا یہی انعام ہے۔

آزاد بیگم



قانونِ تعلیل یا سببیت

پر

ایک تنقیدی نظر

اس دنیا کی۔ اس عالم اسباب کی ہر شے اپنے وقوع کے لئے کسی نہ کسی دوسری
شے کی محتاج اور دست نگر ہے۔ پانی اپنے برسنے کے لئے۔ آگ اپنے جلنے کے لئے
ہوا اپنے چلنے کے لئے۔ کیا دوسروں کی زیر بار احسان نہیں؟ کیا ان میں بھی لم
یلد ولم یولد کی شانِ جلالی اور آنِ جمالی پائی جاتی ہے؟ نعوذ باللہ۔ خام کار
رائیں۔ جاہل دماغ۔ ان تمام تغیرات اور وقوعات کو جو فطرت میں آئے دن ہوتے
رہتے ہیں چند جاندار عوامل کے باعث خیال کرتے ہیں۔ اگنی۔ اندر۔ پَوَن وغیرہ
کے تصورات کی بنیادیں اسی خیال پر اُٹھائی گئی ہیں۔ حضریات کے دیوتا۔ بڑھیا
کی کہانیوں کی چڑیلیں۔ جن۔ پری۔ بھوت۔ پریت۔ سب کا راز اسی میں مضمر ہے
لیکن نکتہ رس دماغوں کی تسکین اس سے نہیں ہوتی۔ وقوعاتِ فطرت کو دیوتاؤں
سے منسوب کر دینا ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کافی نہیں۔ یہ دعوے کہ اندر پانی
برساتا ہے۔ اگنی آگ جلاتی ہے۔ دراصل وہ دعوی ہیں جن کے اثبات کے لئے
ہمارے پاس کوئی دلیل۔ کوئی برہان نہیں۔ ارواح اور مظاہر فطرت کی سی
مختلف النوع اشیاء کا ایک ہی رشتے میں منظوم ہو جانا ناممکن ہے حقیقی اور
اصلی تشریح کے لئے درکار ہے کہ عامل و معمول کے درمیان کوئی مماثلت کوئی مشابہت

موجود ہو۔ سب سے پہلا شخص جس نے اس راز کے چہرے کو بے نقاب کرنا اور وقوعات دُنیاوی کو فطری علل سے وابستہ کرکے علم کا ایک باقاعدہ اور منتظم نظام قایم کرنا چاہا ہے وہ سرزمین یونان کا مشہور فلسفی طالیس تھا۔

سائنس کا کام ہے کہ وہ ان واقعات کے جو ہمارے تجربہ کے مایۂ ضمیر ہیں باہمی تعلقات کو ہم پر ظاہر کردے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شے ا دوسری شے ب کے وقوع کے بعد ہی فوراً وقوع میں آیا کرتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ب۔ ا کے وقوع کا باعث ہے یا بہ الفاظ دیگر دونوں علت و معلول کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ مثلاً آگ کے چھونے کے ساتھ ہی ہمیں گرمی اور برف کے چھونے کے ساتھ ہی ہمیں سردی محسوس ہوا کرتی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آگ گرمی پیدا کرتی ہے اور برف سردی۔ یعنی جو چیز پہلے واقع ہوتی ہے وہ اس شے کی علت ہوتی ہے جو بعد کو واقع ہوتی ہے اور یہ بعد کو واقع ہونے والی شے پہلے کی معلول اور یہی استقرا کا اصل اصول ہے۔

سطور مرقومہ بالا کو کچھ اور نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ محض تصور تعلیل کے ڈھانچے کی تیلیاں ہیں۔ لیکن "گوش زدہ اثرے دارد" ان کے ذہن نشین کرلینے سے ہمیں آیندہ صفحات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

جب ہم کوئی نتیجہ مستنبط کرتے ہیں تو کسی نہ کسی اصول کی بنا پر۔ اچھا تو استنباط استقرائی کی بنا کس اصول پر قائم ہے؟ مختلف علمائے منطق نے اسے مختلف عنوان سے ظاہر کیا ہے۔ بعض اسے یک رنگیٔ فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض یکسانیٔ فطرت سے۔ اکثر اسے قانون تعلیل یا سببیت سے نامزد کرتے ہیں اور اکثر

اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں "جو کچھ ہوا ہے پھر ہوگا" "فطرت اپنے کو دہراتی ہے" "مستقبل ماضی سے مشابہت رکھتا ہے" وقس علیٰ ہذا۔ بعض نے اسے اس طریقہ پر ظاہر کیا ہے "جو کچھ ایک بار صحیح ثابت ہوا وہ یکساں واقعات و علل کے ماتحت ہمیشہ صحیح ثابت ہوگا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کی ہر شے کا وقوع ایک دوسرے پر منحصر ہے اور جب تک شرائط یکساں رہتی ہیں نتائج بھی یکساں رہتے ہیں۔ بعض نے مماثلت پر زور دیا ہے۔ بعض نے یکسانیت پہ۔ تجربئین نے اوّل الذکر کو اپنا منتہی یا مدِ نظر قرار دیا ہے اور عقلئین نے آخر الذکر کو لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے آخر الذکر ہی صحیح ترین اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایما یہ ہے کہ دُنیا عالمِ اسباب ہے اور ایسے اجزا پر مشتمل ہے جو باہم مسلسل و مربوط ہیں۔ یہ تعلقات مستقل بھی رہتے ہیں۔ اس طرح کہ اگر سبب کا اعادہ ہوا تو پھر وہی مسبب پیدا ہوتا ہے۔ جو اس سبب سے ایک بار پہلے پیدا ہو چکا ہے۔ موجوداتِ عالم میں ایک شے بھی ایسی نہیں جو دوسری اشیاء سے وابستہ نہ ہو۔ اسلئے تمام عالم دراصل وحدت کا ایک گلدستہ ہے۔ کثرت کی رنگا رنگی سے اسے کوئی تعلق نہیں یہاں تک ہم نے مختلف دماغوں کے زورِ تخیل دیکھے۔ لیکن ان تمام عقل آرائیوں کا نتیجہ دراصل واحد ہے۔ یعنی نظامِ فطرت کی یک رنگی۔ نوامیس فطرت کی یکتائی اور قانونِ تعلیل یا سببیت کے اظہارات گو لفظاً ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں لیکن معناً بالکل ایک ہیں۔ یہ اس میں شامل ہے وہ اس میں۔ یہ اس سے جُدا نہیں وہ اس سے اور جب یہ صورت ہے تو استقرار کے اصول موضوعہ کو خواہ یکرنگیٔ فطرت کہو یا یکتائی فطرت۔ یا قانونِ تعلیل ہی کے نام سے پکارو بس

ایک ہے۔ لیکن بعض نگاہوں کو قانونِ تعلیل اور یکرنگیٔ فطرت میں اختلاف کی جھلک نظر آئی ہے۔ وہ اوّل الذکر کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ "ہر معلول کے لئے کوئی نہ کوئی علت ہے" اور موخرالذکر کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ "ہر ایک علت کا ہمیشہ ایک ہی معلول ہوا کرتا ہے" گویا ان کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ دُنیا کی اشیاء میں اپنے وجود کو بذاتہ قایم رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اور جب یہ نہیں تو دونوں کے درمیان فرق بھی نہیں۔ اگر ہر علت کے لئے ایک معلول ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا اور بداہتہً کہ ہر علت سے ہمیشہ وہی معلول ظاہر ہوگا جو ایک بار اس سے ظاہر ہو چکا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اس کو علت کہنا ہی غلط ہوگا۔ ان کا تعلق تو محض اتفاقی ہی ہوگا۔ علت و معلول کی وابستگی سے وہ دونوں آزاد ہونگے اسی طرح یکتائی فطرت بھی قانونِ تعلیل میں شامل ہے۔ اگر ہر علت کا ایک معلول ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہی اور صرف یہی ہے کہ دُنیا کا کوئی جزو دوسرے سے غیر متعلق نہیں۔ یا بہ الفاظ دیگر تمام اجزا وحدت کے رشتہ میں گندھے ہوئے ہیں۔

نظامِ فطرت کی یکسانیت کا اصول مسلم ہو چکا۔ لیکن عملاً ہم کو فطرت میں بے انتہا گوناگونی اور اختلاف نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان دونو ظاہری تناقضات میں مطابقت کیونکر پیدا کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ اگر ہم تجربیین کی تعریف یکسانیت فطرت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو پیچیدگیوں سے مفر نہیں ہو سکتا۔ ان کا ادعا یہ ہے کہ مستقبل ماضی کا مشابہ و مماثل ہے۔ لیکن ہمارے روزمرہ کے حقیقی تجربے اس دعوی کی تردید پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ مستقبل ماضی کا ٹھیک ٹھیک مماثل نہ تو ہوتا ہے نہ ہو ہی سکتا ہے۔ اچھا تو اس دقت سے نکلنے کا کوئی راستہ؟ ہاں ہے۔ عقلیین

کی دی ہوئی تعریف تسلیم کر لی جائے اور یہ گتھیاں خود ہی سلجھ جاتی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک معلول کی ایک نہ ایک علت ہوتی ہے اور جب اور جس وقت اس علت کا اعادہ ہوگا یہ معلول ظاہر ہوگا۔ یہ تصریح معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہے۔ یعنی اگر فطرت میں اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علل سابقہ موجود نہیں یکسانیت فطرت تو صرف یہی کہتی ہے کہ جب اور جس وقت علت معلومہ کا اعادہ ہوگا معلول معلومہ کا بھی اعادہ ہوگا وہ اس کا دعویٰ نہیں کرتی کہ علت معلومہ کا اعادہ لامحالہ ہو ہی جائے گا۔

اوپر کے بیان سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یک رنگی فطرت استنباط استقرائی کی اصل اصول یا بنیاد ہے۔ لہٰذا جب تک یہ نہ تسلیم کر لیا جائے کہ نظامِ فطرت میں یک رنگی موجود ہے۔ عمومیت استقرائی کا حصول ممکن ہی نہیں۔ فطرت وہی ہے جو اس استدلال کی نوعیت ہے جسے وہ تسلیم کرتی ہے۔

مذہب تجربیہ کا سب سے بڑا نمائندہ مل ہے۔ اصول یکرنگی فطرت کی نسبت اس کا خیال یہ ہے کہ وہ خود ہی ایک استدلال استقرائی ہے۔ جس کا حصول کلیتہً تجربہ پر منحصر ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ خود ہی تمام استدلالات استقرائی کا سنگ بنیاد ہے تو اس کا خود استقرا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اس حالت میں تو وہ خود اپنا ثبوت آپ ہو جاتی ہے اور یہ بالکل بعید از قیاس اور مغالطہ آمیز ہے۔ لیکن ہمیں مل اس مغالطہ کی تشریح کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے ہم خاص خاص یکسانیت کا تعین کرتے ہیں اور پھر جس امر کو ہم چند خاص اشکال میں صحیح پاتے ہیں اس کو عمومیت کے درجہ پر پہنچا کر یکسانیت فطرت کو ایک اصول

کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ مِل کے استدلال کا ماحصل یہ ہے۔ یکسانیت کا اصول
ا۔ ب۔ س۔ د وغیرہ واقعات میں صحیح ثابت ہوتا ہے اس لئے وہ تمام واقعات
میں ٹھیک اُتریگا۔ مگر یہ استدلال مغالطہ مصادرہ علی المطلوب سے خالی نہیں۔ دلیل
یہ ہے کہ یکسانیت فطرت کُل واقعات میں صحیح اترتی ہے کیونکہ وہ اکثر واقعات میں صحیح
اُتر چکی ہے۔ یہ یہی بات ہوئی کہ جو امر اکثر واقعات میں ٹھیک اُترتا ہے وہ سب واقعات
میں ٹھیک اُترتا ہے۔ یہ الٹ پھر کر یکسانیت فطرت ہی کا اصول ہوا۔ گویا جو شے ہمیں
ثابت کرنا تھی اسی کو ہم نے ثبوت کے طور پیش کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ اصول یکسانیت
فطرت کی عمومیت کو تجربہ استقرائی کے ذریعے سے ثابت کرنا بغیر ارتکاب مصادرہ
علی المطلوب کے ممکن ہی نہیں۔

لیکن عقلئین نے اس کے ثبوت کا دوسرا پہلو اختیار کیا ہے اور بادی النظر میں
یہ پہلو بہتر بھی معلوم ہوتا ہے۔ تجربئین نظامِ فطرت کی یکسانیت کو استنباط استقرائی
کی طرح ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ عقلئین اس کے برعکس اسے ایک اصول موضوعہ
کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کا ادعا یہ ہے کہ اگر اصول یکرنگی صحیح نہ فرض کر لیا
جائے تو فطرت کی نسبت کسی خیال کا قایم کرنا ہی دشوار ہو جائے گا۔ اور ایسا
ہر علم میں ہوتا ہے کہ چند اصول اولیہ کو صحیح مان لیتے ہیں۔ ان کے ثبوت و عدم ثبوت
سے بحث نہیں ہوتی۔ مثلاً اقلیدس۔ اگر اس کے اصولات موضوعہ کے صحیح و غلط
ہونے کی بحثوں میں انسان اوّل ہی سے پڑ جائے تو اصل مقصد ندارد ہو جائے
ہاں پہلے ان کو صحیح فرض کر لیتے ہیں پھر اُن کے موافق مثالیں لیتے اور ان کو
ثابت کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح منطق میں بھی پہلے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ

نظام فطرت یکساں رہتا ہے پھر اس کے لئے براہین لاتے ہیں کہ فلاں فلاں نوع امیں فطرت کا اتحاد و اتصال ہمارے تسلیم کردہ اصول یکسانیت کا آئینہ بردار ہے۔ اسی طرح امثلہ کو وسعت دیتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ہمارا تجربہ خود ہی بتلا دیتا ہے کہ جس اصول کو اوّلاً ہم نے صرف فرض کر لیا تھا وہ کوئی فرضی ہی شے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم نے فرض کیا ہے۔ اچھا تو اگر ہم نے اس اصول کو شروع ہی سے فرض کر کے اصول تفتیش کے طور پر استعمال نہ کیا ہوتا بلکہ اس کے منتظر رہتے کہ وہ استنباط استقرائی کے بیروں عمومیت کے درجہ پر پہنچ جائے تو کیا نتیجہ نکلا ہوتا؟ وہی جو بالکل بدیہی ہے۔ یعنی یا تو ہم اس کے حصول میں ناکامیاب ہی رہے ہوتے یا تجربیین کی طرح اسے ثابت کرنے مصادرہ علی المطلوب کے مرتکب ہوئے ہوتے۔

اب ہم براہ راست قانون تعلیل سے بحث کرتے ہیں۔ قانون تعلیل کوئی جداگانہ شے نہیں ہے غور سے دیکھا جائے تو یہ اصول یک رنگئ فطرت ہی میں ایک نتیجہ کے طور پر شامل نظر آتا ہے۔ یک رنگئ فطرت کا دعوی ہے کہ جن علل کے جو معلول گذشتہ زمانہ میں پیدا ہو چکے ہیں اُن سے ہمیشہ وہی پیدا ہوتے رہیں گے بشرطیکہ شرائط میں کوئی تغیر نہ واقع ہو۔ اس کا مطلب فی الحقیقت یہ ہے کہ ہر ایک معلول کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے۔ یہی قانون تعلیل ہے۔ مثلاً اصول یک رنگئ فطرت کہتا ہے کہ آگ کی خاصیت ہمیشہ جلا دینا ہے اس کا منتہی یہ ہے کہ جل جانے کا سبب آگ ہے۔ گویا قانون تعلیل اور اصول یک رنگئ فطرت ایک واقعہ کے بیان کرنے کے دو مختلف نہج ہیں۔

قانون تعلیل کی تحدید سب سے پہلے ڈیوڈ ہیوم نے کی ہے۔ اس سے پیشتر تقریباً ہر مذہب کے فلاسفر اس پر متفق ہو چکے تھے کہ تصور تعلیل میں قوت لازماً شامل ہے۔ یعنی علت میں معلول کے پیدا کرنے کی قوت موجود ہوتی ہے اس خیال کی عمومیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ لاک نے بھی جن کے قلم نے فلسفۂ جدید میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس خیال کو بلا کسی تنقید کے یونہی چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال ہیوم کی تحدید کے بعد سے مسئلہ تعلیل فلاسفہ کی ردوکد کا جولانگاہ بن گیا۔ ہیوم نے سبب کو ایک ناممکن التغیر مقدم سے تعبیر کیا۔ یہ دراصل ایک تجربی فلاسفر تھا اور اس نے جیسا کہ اُسے کرنا چاہئے اپنے تصور تعلیل کے لئے کلیتہً تجربہ پر بھروسہ کیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق تجربہ ہی وہ تنہا ذریعہ ہے جس کی وساطت سے ہم اس تعلق کو دریافت کر سکتے ہیں جو علت و معلول کے غیر متغیر تسلسل کا باعث ہے۔ اگر ا ہمیشہ ب کے بعد ہی وقوع میں آیا کرتا ہے تو ب۔ ا کا سبب ہے۔ اگر ا۔ ب کا سبب ہے تو اُسے ہمیشہ ب سے پہلے واقع ہونا چاہئے۔ ا۔ ب دونوں کا وقوع بار بار تسلسل کے ساتھ ہوتا رہتا ہے یا نہیں صرف تجربہ کے ذریعہ سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "اگر کوئی شخص اپنے تجربہ کے دوران میں دیکھتا ہے کہ دو ہستیاں ا اور ب ایک دوسرے کے بعد پیہم اور پے درپے واقع ہو رہی ہیں تو وہ فطرتاً یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ دونوں رشتۂ تعلیل کی زنجیر میں جکڑی ہیں۔" ہیوم کے اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ تعلیل ایک ذاتی یا غیر خارجی واقعہ ہے اور اس تعلق کے قائم کرنے کے واسطے اعادہ اور عادت دونوں لابدی ہیں چنانچہ آگے چل کر وہ خود کہتا ہے

کہ "تعلیل توقع کے اس احساس کا نام ہے جو اعادہ اور عادت پر مبنی ہوتا ہے"
اس کے نزدیک ا کے ب کی علت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب ا کا وقوع ہوتا
ہے تو ہمیں فوراً اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ب اس کے بعد ہی قطعاً وقوع
میں آئے گا اور یہ احساس اس بنا پر ہوتا ہے کہ کئی پیش رو موقعوں پر ہم دیکھ چکے
ہیں کہ اول الذکر کے وقوع کے بعد آخر الذکر بھی ضرور ہی واقع ہوا ہے۔ اگر ہم ہیوم
کے تصور تعلیل کی تحلیل کریں تو نتیجہ ان الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) تعلیل دو اثرات حسیہ کے تواتر کا نام ہے۔

(۲) ان میں کا ایک سبب دوسرا مسبب ہے۔

(۳) دونوں کا وقوع کسی قدر وقفہ سے ہوتا ہے۔

(۴) تعلیل ایک غیر خارجی یا ذاتی واقعہ ہے۔

(۵) یہ محض ایک تعود ذہنی ہے یعنی اس کی بنیاد اعادہ اور عادت پر قائم ہے

(باقی آیندہ)

"صدیقی"



مکتوبات حسن آرا

حسن آرا کا خط م۔ ب لکھنوی کے نام۔

بمبئی
۱۵ر نومبر ۱۹ء

پیاری بہن
چہ خوش ماشاءاللہ کیوں نہ ہو۔ اس ذہانت اس ذکاوت کے صدقے۔ اب حضور کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ حسن آرا کون ہے۔ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ نہ صرف حضور ہی حسن آرا سے اجنبی ہیں بلکہ ہماری سرکار خاقان منزل والی نواب بیگم صاحبہ بھی پوچھتی ہیں کہ حسن آرا کون ہے؟ کیا آپ مجھ سے یہ فرمائیں گی کہ یہ سب باتیں سراسر غلط جھوٹ اور بہتان ہیں؟ اگر یہ خبر آپ کے پرانے دشمن زادی ضعیف کے ذریعہ سے پہنچی ہوتی تو میں بھی بے دلیل مان لیتی کہ ضرور جھوٹی ہے اس وجہ سے کہ مجھے آپ کی اور اس کی پرانی پشتینی عداوتوں کی تاریخ ازبر ہے مگر میرا ذریعہ معلومات کچھ ایسا ویسا نہیں ہے۔ آپ گھبرا نجائیں تو میں یہانتک پتہ دے سکتی ہوں کہ جو خط آپ نے ایڈیٹر "پیام اُمید" کو نام بھیجا تھا وہ میری نظر سے بھی گذر چکا ہے اللہ اللہ۔ اب خیر سے آپ کو حسن آرا کے وجود سے بھی انکار ہونے لگا مگر یہ تو ابھی پہلی بسم اللہ ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا! ہاں بہن آپ لوگ پڑھی لکھی ماشاءاللہ تعلیم یافتہ روشن خیال ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی کے لئے ایسے شکوک بالکل قدرتی ہیں دیکھیے یورپ کے روشن دماغ علما جس علمی مسئلہ کی تحقیقات

کرتے ہیں ہمیشہ اس کا نتیجہ کچھ ایسا ہی نکلتا ہے جیسا آپ نکال رہی ہیں۔ آدم اور حوّا سے بنی نوعِ انسان کی ابتدا ہی سرے سے اسقاط کر دی گئی ہے۔ انسان نے زبان سیکھی تو کیونکر؟ ایک بتاتا ہے سب سے پہلے انسان کتے کی طرح بھونکا کرتا تھا۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں یہ غلط ہے۔ وہ بادل کی طرح گرجا کرتا تھا۔ تیسرے صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ گرجا گھر کے گھنٹے کی طرح ٹن ٹنا ٹنا۔ اور ٹھن ٹھنا ٹنا کہکر اپنا مافی الضمیر ادا کیا کرتا تھا۔ آگے چلئے۔ اب حضرت عیسیٰ کے وقت تک پہنچئے۔ مبصرین کو صاف انکار ہے کہ عیسیٰ نامی کوئی شخص دُنیا میں کبھی تھا ہی نہیں یا انجیل توریت اور زبور میں جو اقوال و افعال کسی بزرگ کے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ مختلف اوقات میں مختلف شخصوں نے لکھے تھے۔ سب سے آخری دور میں جس شخص نے یہ سب کارنامے یک جا جمع کئے اُس نے ان سب واقعات کو ایک فرضی نام کے ساتھ وابستہ کر دیا اور اس فرضی وجود کا نام عیسیٰ رکھدیا گیا اسی طرح یونان کے مشہور شاعر ہومر کے متعلق بھی تحقیقات ہوئی تھی اور ایسا ہی نتیجہ اس علمی تحقیقات کا نکلا۔ یعنی پُرانے زمانے کی بہترین نظمیں درج کرنے کے قابل نظر آئیں وہ مختلف وقتوں میں مختلف مسودات کی صورت میں مختلف آدمیوں کے پاس جمع رہیں اخیر وقت میں کسی عالم نے یہ ساری نظمیں ایک شخص کے نام سے موسوم کر دیں۔ اور اس فرضی شاعر کا نام ہومر قرار دے دیا۔ چونکہ ہو مراس جس سے لفظ ہومر نکلا ہے اُس کے معنی یونانی زبان میں نابینا کے تھے لہٰذا مشہور کر دیا گیا کہ ہومر شاعر جسکا یہ کلام ہے وہ نابینا تھا۔ کچھ بعید نہیں ہے اگر دو چار آٹھ دس ہزار برس کے بعد جب ملٹن کی سوانح عمریاں دستبرد زمانہ سے تلف ہو جائیں اور اُس کے کلام

کے متفرق اجزا فراہم کر کے اُس وقت کے علما ریں سے کوئی تحقیقات کرنے بیٹھے
تو وہ بھی اس نتیجہ پر پُہنچے کہ ملٹن ایک فرضی نام تھا۔ مختلف مسودات کسی نے یک جا
کر کے جمع کر دئیے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ یہ اندھے ملٹن کی تصنیف ہیں!۔
مگر بہن یہ تو اصل مصنف کے مر جانے سڑ جانے کے بعد ہزاروں برس گذر جانے پہ
ایسے شکوک اور اشتباہات ظاہر کئے گئے تھے۔ لیکن تم نے تو غضب ہی کر دیا کہ آج
جیتے جی اپنی حسن آرا کو مارے ڈالتی ہو! مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہاری شوخی اور شرارت
ہے۔ اور جو کچھ تم لکھتی ہو وہ اوپر کے دل سے میرے چھیڑنے کے لئے لکھتی ہو۔ تم سے
کچھ بعید نہیں ہے اگر تم نے ایڈیٹر "پیام اُمید" کو یہ بھی لکھ بھیجا ہو کہ وہ تمہارا خط بجنسہ
میرے پاس بھیج دیں۔ کیونکہ اگر خود تمہیں نے ایسا نہ لکھا ہوتا تو شائد وہ خود ایسا
کبھی نہ کرتیں۔

تمہاری گم شدہ خیالی بہن
"حسن آرا"

م۔ ب۔ لکھنوی کا جواب

لکھنؤ
۱۸ر نومبر سنہ ۱۶ء

پیاری بہن۔ اے ہے! میری "خیالی بہن" اور میری "گم شدہ بہن" اللہ
ہی تم سے سمجھے! کیوں جی میں شوخ ہوں۔ میں شریر ہوں! اور کسی بھلے آدمی کو ناحق
بلا وجہ شوخ اور شریر لکھ مارنا نہ کوئی شوخی ہے نہ شرارت! "خیالی" اور "گم شدہ"
کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ گم شدہ تو ہو ہی۔ کچھ اس میں بھی کسی کا ڈر پڑا ہے! غضب ہو
خدا کا مہینوں سے تم لاپتہ ہو رہی ہو۔ کسی کو خبر نہیں ہے کہ چین میں ہو یا ٹی ٹی کا کا میں

نہ تمہارا کوئی خط ہی آتا ہے نہ اپنا پتہ ہی کسی کو بتاتی ہو کہ کوئی تمہیں لکھ سکے۔ پھر گم شدہ نہیں تو اور کون ہو! "خیالی" بہن کہدوں تو میرا کیا کر لوگی! تمہارا راوی ضعیف تو ہمیشہ تمہیں خیالی ہی بتایا کرتا ہے۔ تم کہتی ہو کہ اُس سے اور مجھ سے پشتینی عداوت ہے۔ مگر تم سے تو عداوت نہیں ہے؟ پھر آخروہ مواخدائی خوار تمہیں آئے دن کیوں خیالی اور فرضی بتایا کرتا ہے۔ اور جب تمہارا اپنا رپورٹر ہی نگوڑا ایسا بدلگام ہے تو تمہیں اوروں سے شکایت کرنے کا کیا حق ہے! میں ہزار میں لاکھ میں کُھلے خزانے کہونگی اور پھر کہوں گی بلکہ پانیر میں اشتہار دیدوں گی کہ بی حسن آرا بیگم حقیقت میں کوئی ہیں ویں نہیں۔ یہ سارا فقصور بالکل ہی لغو سراسر غلط اور سرسے پاتک جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ فرمائیے آپ کیا کرلیں گی؟ دیکھوں میرے اشتہار کے جواب میں آپ کا کیا اشتہار ہوتا ہے۔ واللہ بڑا ہی مزا آئیگا۔

لکھنؤ میں اردو کانفرنس کی بڑی دھوم دھام ہے۔ میں نہ مانوں گی اِس زمانہ میں تو تمہیں ضرور ہی یہاں آنا پڑے گا۔ میں آج ہی بہن عطیہ بیگم فیضی اور نواب بیگم جنجیرہ کو لکھتی ہوں۔ اے واہ۔ کیا حُسن آرا اُن کی قیدی ہوگئی ہے کہ کہیں جانے ہی نہ پائیگی۔

اپنی خیالی حسن آرا کی خیالی بہن

اچھی ملیں!

م۔ب

حُسن آرا کا جواب

پیاری بہن۔ م۔ب

بہن تم ہو بڑے مزے کی آدمی۔ خیالی پلاؤ تو ہم نے سیروں کھا ڈالا تھا مگر خیالی بہن نہ دیکھی تھی نہ سُنی۔ مگر اللہ کی دین ہے کہ ہمیں خیالی بہن بھی مل گئیں۔

ہیں اگر تم ضرور پوچھوگی کہ "خیالی پلاؤ سیروں کھا ڈالا" سے میرا کیا مطلب ہے۔ بہن میرا
مطلب اُس خیالی پلاؤ سے ہے جو تمہارے "خوانِ دعوت" میں رکھ کے ان دنوں سارے
ہندوستان میں تقسیم ہو رہا ہے۔ متقدمین نے تو صرف خیالی پلاؤ ہی پکایا تھا۔ مگر بہن
م-ب کا اللہ بھلا کرے کہ خیالی متنجن، خیالی زعفرہ۔ خیالی سموسے۔ خیالی کباب۔ خیالی
رس گلے اور قصہ مختصر ساری دُنیا کی نعمتیں پکا کے دھر دیں اور سارے ہندوستان
میں ڈنکے کی چوٹ بانٹتی پھر رہی ہیں۔ اس سیر چشمی اس فیاضی اس بلند ہمتی کے صدقے
کھانے ایک سے ایک لذیذ کہ اور کھانوں کو تو دیکھ کے مُنہ میں پانی بھر آتا تھا مگر یہاں
اس خوانِ دعوت کے کھانوں کا نام سُن کر رال ٹپک پڑتی ہے۔ اللہ اللہ۔ اے
سبحان اللہ کیا کہنا۔ نورًا علیٰ نور۔

گرمہ شود براو ستارہ شود بری — باخوانِ دعوت تو کند کے برابری

نواب بیگم جنجیرہ کہتی ہیں کہ حُسن آرا لکھنؤ جا کے کیا کرے گی۔ تمہاری باتوں کی حلاوت
سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اور یہاں تو تمہارے خوانِ دعوت نے وہ رنگ جمایا ہے
کہ تم لکھنؤ میں اُس خوان کا خوان پوش اتارتی ہو تو یہاں بمبئی میں تمہاری لذیذ کھانوں
کی معطر خوشبو سے چھینکوں پر چھینکیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ
چھینکوں والا قصہ میرا اپنا چشم دید نہیں ہے یہ روایت بھی ادی ضعیف کی ایک معتبر روایتوں
میں سے تھی۔ اب چاہے تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔

میرا لکھنؤ آنا تو ابھی بہت دُور ہے۔ اردو کانفرنس کے زمانے میں تو میں آ نہیں
سکتی مگر پھر تم ہی کیوں نہ بمبئی چلی آؤ۔ کہو آتی ہو؟ تم "ہاں" کہدو پھر میں دیکھ لونگی
تم کہوگی کیونکر؟ میں ابھی اور کچھ تو نہیں کہہ سکتی مگر اتنا بتا سکتی ہوں کہ اگر تم آنے

پر آمادہ ہو جاؤ تو تم تنہا نہ آؤ گی۔ ایسی مزے مزے کی صحبت ہو گی کہ پھڑک جاؤ گی۔
کہو تو دو ایک نام بتا دوں؟ اچھا لو سنو۔ بہن نذر سجاد۔ بہن ثروت آرا نذر الباقر۔
ایڈیٹر پیام اُمید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہو کیا کہتی ہو؟

تمہاری خالی خولی خیالی بہن

حسنہ

اُردو کانفرنس کی دعوت

"اُٹھو ——— اُٹھو ——— اور آگے بڑھو!"

کام کرنے کا وقت آ گیا۔ کام۔ کام کرنے والوں کی تلاش میں ہے اگر آپ اس کام کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں تو باتوں میں وقت خراب نہ کیجئے اور اسباب باندھ کر لکھنؤ کا ٹکٹ لیجئے۔ ۲۹ر اور ۳۰ر دسمبر کو آپ ہی کا کام ہے۔ آپ ہی کا انتظار رہے گا۔ اور آپ کے بغیر ہم سے کچھ نہ بن پڑے گا۔ آئیے۔ چلئے۔ دیر نہ کیجئے۔

وقت سر پر آ پہنچا!

دیکھئے اُردو کانفرنس کیا کہہ رہی ہے۔ کان لگا کے سُنئے۔

مُلک کے تمام اہل الرائے اصحاب اس بارے میں متفق الخیال ہیں کہ اہل ملک کی تعلیم عامہ کا بہترین ذریعہ ملکی زبانیں ہیں۔ لیکن ملکی زبانوں کی بے مائگی ہے۔ جو در اصل لوگوں کو عملاً اس اصول کی تائید نہیں کرنے دیتی۔ اور جب تک پوری مستعدی، یکدلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ مسلسل کوشش نہ کی جائے۔ ملکی

زبانیں کبھی اُس درجے پر نہ پہونچیں گی جس کے بغیر ناممکن ہے کہ باشندگان ملک کی وہ تمام تعلیمی، تمدنی و اقتصادی ضروریات پوری ہو سکیں جو کسی زبان یا اُسکے ادب سے وابستہ ہوتی ہیں۔

زبانِ اردو کے متعلق اس قسم کی سب سے بڑی کوشش کا مرکز انجمن ترقی اردو ہے۔ لیکن اب تک اُس کا کام اور دائرۂ اثر جس قدر محدود رہا ہے وہ ہرگز ایک ایسے وسیع ملک کے شایانِ شان نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ ہمارا ہندوستان ہے۔ اور اس کانفرنس کی اصلی غایت و غرض یہی ہے کہ مختلف حصص ملک کے کثیر التعداد تعلیم یافتہ، محب وطن اور قومی درد رکھنے والے اصحاب کے سامنے ملک کی یہ نہایت ضروری تحریک پیش کی جائے۔ اور سب کے مشورہ و رائے سے ترقیٔ اردو کے کام کو بڑے پیمانہ پر کرنے کی بنیاد رکھی جائے۔

عام ملکی و قومی معاملات سے آپ کو جو گہری دلچسپی ہے اُس کی بنا پر غالباً یہ نتیجہ نکالنا نامناسب نہیں کہ زبان اردو کے متعلق ہر قسم کی کوششوں سے نہ صرف آپ دلی ہمدردی رکھتے ہیں بلکہ جس طرح دوسری ملکی و قومی تحریکات میں آپ کافی حصہ لیتے ہیں اسی طرح اس نہایت ہی اہم شعبہ پر بھی آپ پوری توجہ مبذول فرمائیں گے۔ جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ آپ اس موقع کو جو بخت و اتفاق سے اس دفعہ حاصل ہوا ہے غنیمت جانیں اور اردو کانفرنس کو اپنی شرکت سے سرفراز فرمائیں۔

زبان اردو کی خدمت کرنے اور اُسے ایک وسیع علمی زبان بنانے کا خیال کچھ نیا نہیں ہے بلکہ زمانۂ حال کی بہت سی ملکی و قومی مجالس اُس وقت

وجود میں بھی نہیں آئی تھیں۔ جب اس اہم ضرورت کا احساس شروع شروع پیدا ہوا ہے اور اُس وقت جس ہمت و سرگرمی سے یہ کام شروع کیا گیا تھا اگر اتفاقات سے قبل از وقت رُک نہ جاتا تو یقیناً آج ہماری منزل بہت آسان ہوتی۔ تاہم اُن پیش روان محترم کی سپاس گزاری ہمارے ذمّہ واجب ہے۔

پھر اب تک دوسرے بہت سے کاموں کی طرح یہ تحریک بھی محض شخصی کوشش و توجہ کی رہین منت رہی ہے جس کی وجہ سے دائرۂ عمل کبھی اُس حد تک وسیع نہ ہو سکا جس کے لئے آج یہ جد و جہد ہو رہی ہے اور حقیقتاً یہی سبب ہے کہ اُس کے بعد کی بہت سی تحریکات میدان عمل ہیں اب اُس کے لئے نشان منزل اور سنگ راہ کا کام دینے کے قابل نظر آتی ہیں۔ بہر حال اب جبکہ اس بات کا قوی احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ترقی اُردو کی رفتار کو تیز اور اُس کے حیطۂ اثر کو وسیع کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج کی یہ کوششیں کل کے بہترین ثمرات کا سبب نہ بنجائیں لیکن چونکہ اِس مقصد میں کامیابی کا تمام تر انحصار اسی پر ہے کہ ہوا خواہان اُردو کی ایک جماعت کثیر اطرافِ ملک سے جمع ہو کر اس کانفرنس کے مشوروں اور عملی تجویزوں میں شریک ہو اس لئے میں ایک دفعہ آپ کی خدمت میں پھر استدعا کرتا ہوں کہ آپ ہم اہل لکھنؤ کی دعوت قبول فرمائیں اور مجوزہ کانفرنس کو اپنی شرکت کا افتخار بخشیں

جو اصحاب اس کانفرنس میں کوئی تحریک پیش کرنا چاہیں یا اس بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنا پسند کریں کہ پیش نظر مقاصد کے حصول کے واسطے کس قسم کی عملی تدابیر اختیار کی جائیں یا پھر اس بحث کے متعلق اظہار خیال مناسب تصور فرمائیں کہ کم سے کم وقت، محنت اور سرمایہ کے صرف سے مدعائے خدمت اُردو

حاصل کرنے کے لئے کون کون سے ذرائع عمل میں لائے جائیں تو وہ براہ کرم ۱۰ر دسمبر سے پہلے اپنی تجاویز اور رائیں مجلس استقبالی اردو کانفرنس کے دفتر میں بھیج دیں تاکہ انعقادِ کانفرنس سے قبل جو جلسہ شوریٰ کانفرنس کے نظام عمل کی ترتیب کے لئے منعقد ہو اس میں یہ سب تحریریں پیش کر دی جائیں۔

چونکہ اس سال لکھنؤ میں مختلف سیاسی و تمدنی مجالس کے اجلاس دسمبر کے آخری ہفتہ میں ہوں گے۔ اور اس سبب سے ہوٹلوں اور کرایہ کے مکانوں میں قیام کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے ہی سے انتظام کیا جائے۔ اس بنا پر جو اصحاب اردو کانفرنس کی شرکت کی غرض سے تشریف لانے کا ارادہ فرمائیں اور چاہتے ہوں کہ ان کا قیام مجلس استقبالی کی طرف سے عمل میں آئے وہ براہ کرم ۱۵ر دسمبر سے پہلے اپنی تشریف آوری کی تاریخ سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ مجلس استقبالی تا امکان راحت رسانی کا انتظام کر سکے۔

خاکسار

ظفر الملک علوی

معتمد کارکن مجلس استقبالی اردو کانفرنس"

آپ ہی کے آجانے پر ظفر الملک کی فتح ہے۔ آیئے اور انہیں مظفر الملک بنائیے۔ "پیام امید"

نوٹ۔ اوپر کا مضمون ہماری دفتر میں دسمبر نمبر کی اشاعت کے بعد پہنچا اس وجہ سے پہلے اس کی اشاعت غیر ممکن تھی۔ مگر چونکہ ہمارا جنوری نمبر دسمبر ہی میں شائع ہو رہا ہے لہٰذا چنداں مضایقہ بھی نہیں ہے۔

آزاد بیگم

فغان آزاد

ذیل کی نظم ایک دلخراش نالہ ایک جگر فگار شیون ہے۔ آزاد کو نہ شاعری کا دعویٰ ہے نہ فارسی دانی کا زعم ہے۔ فرصت کے وقت کا یہ بھی ایک مشغلہ ہے۔ اور اہل کمال سے نظر اصلاح ملاحظہ فرمائیں۔ مثل مشہور ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

آزاد بیگم

ز گدائے کوئے حرماں بِرسا صبا پیامے کہ مرا چو خاک کردی بفگن بکوئے عامے

گلہ ز جورِ اختر چہ کنم اگر نہ سازم کہ نمیرسد غبارم برہ در سلامے

منِ بینوا و فکرم۔ کہ دریں زماں چہ کردم نہ دمے قیامِ جائے نہ گہے مرا مقامے

ہمہ نقطۂ خیالم۔ کہ مقام شد محالم چہ ز جورِ بخت نالم۔ کہ عجیب شد نظامے

بقیودِ بندگیہا ہمہ بند بند بستم بگدا لقب گرفتم۔ ز گدا شدم غلامے

رہ و رسمِ رندستاں تو ز ما میا چہ پرسی خود اگرچہ کو چشمی زہی بہ ہیچ کامے

تو ز لعل و سنگ پارہ نہ اگر تمیز کردی چہ گناہ شد یمن را کہ خجل شود بہ نامے

گہہ تغافلت رہا ایں پردہ دار لیکن نہ گناہِ بے گناہاں بفگند بہ ہیچ دامے

تو ز خونِ عبث بشوی ہمہ جیب و آستیں را ز جبینِ حیاں بشوئی کہ نیست خونِ خامے

منِ بینوا و یاراں بسرودِ خویش رقصاں منِ بینوا و جامم نرسد اگر بکامے

چہ سزد خدائے عالم کہ مرا چو جامِ دادی چو رسد نہ قطرۂ زاں بگلوئے تشنہ کامے

توئی خود سپردئی زانکہ مرا بکار افتاد توئی کو بدست دادی جامم کہ گشت جامے

چہ سزا اگر بہ بیناں داری امیدوارم ۔۔۔ چکند کسے کہ ماند جاوید تلخ کامے
چو کسے گرفتہ یک درکے کوچہ گرو گردد ۔۔۔ زیں آستانِ رو دکو؟ بردر گہہ کدامے!
ز آزاد بندگی ہا جستن روا نباشد ۔۔۔ کیں بندۂ درِ تو نزو دبکوئے عامے

در بحرِ دیگر

ہاں باز خیز و بنشیں بر آستاں مدامے ۔۔۔ زاں آستاں کہ یابی زیرِ فلک دوامے
ہاں اے صبا غبارم از رہگذر بپراں ۔۔۔ ہاں اے غبار بنشیں بر آستاں مدامے
خاکم اگرچہ داری خاکِ درِ خودم کن ۔۔۔ ایں خاکِ رہ گذر را شاید ہمیں انعامے
مگذار کیں غبارم پئے ناکساں بگیرد ۔۔۔ از دامنے کہ گیرد بیروں فتد زبامے
خاکم ولے عفونت با من چہ کار دارد ۔۔۔ ایں عنصرم ندارد میلے بدیں تمامے
چوں خاکِ پاکِ پاکاں خاکِ مرا نگہدار ۔۔۔ خاکِ شہیدِ نازم از عشوۂ مدامے
چوں تار تار کردی ایں تار پودِ ہستی ۔۔۔ حرمت سزد ترا ہم کیں حرمتیست نامے
خاکم ولے بخاکی سجدہ روا نہ دارم ۔۔۔ جز خاکِ آستانت دارم نہ احترامے
رزقم اگر بظاہر مشروطِ بندگی شد ۔۔۔ من یکے وہم بنانے ایں دولت دوامے
با خاکِ خاکساراں بدعت روا نہ باشد ۔۔۔ ایں خاک را میفگن با خاکِ پائے عامے
تا یکے امیدوارم ۔ درگردش آر جامم ۔۔۔ اے سرورِ دو عالم بر تو زمن سلامے
اکنوں خجل مسازم اے سرورِ دو عالم ۔۔۔ درگردش آر جامم ۔ درگردش آر جامے
آزاد کن خدارا از جورِ رہ گذر ہا ۔۔۔ آزاد دار آزا کآزاد گشت نامے

آزاد

شیکسپیر اردو نظم میں

محمود۔ شیریں میری پیاری رشک گلزار — ہے ہے تمہیں کیا ہوا ہے آزار

کیوں خشک یہ لب ہیں پنکھڑی سے — کمھلائے ہیں کیوں یہ گل سے رخسار

شیریں۔ پانی کی کمی کے ہیں یہ آثار — کمھلانا نہیں کچھ ان کا دشوار

ہے چشمۂ چشم دیر سے بند — اشکوں کی نہیں ہوئی ہے بھرمار

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف نہ آئے تو ہمارا ذمہ۔ یہ ہی مقبول عام ترجمہ ہے جسے اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) نے اصل کتاب "مڈسمر نائٹس ڈریم" سے لکھنؤ کی شستہ زبان اور گلزار نسیم کی بحر میں کیا ہے۔ یہ وہی ترجمہ ہے جس نے ہندوستان سے لندن تک شہرت پائی ہے۔ جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ اب جدید اشاعت خاص اہتمام سے نفیس کاغذ پر معہ مؤلف کی ہاف ٹون تصویر کے زیر طبع ہے جو صاحب اشاعت سے پہلے اپنا نام درج رجسٹر کرا لیں گے۔ انہیں رعایتی قیمت پر مل سکیگی۔

حجم تخمیناً ۲۰۰ صفحہ — قیمت اصلی عہہ — رعایتی عمر

ایضاً معمولی سفید کاغذ پر بلا تصویر — اصلی قیمت عمر — رعایتی ۱۲ر

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ یو۔ پی

فہرست مضامین "پیامِ اُمید" ماہ فروری سنہ ۱۹۱۷ء

امید کا پیام ـــ "اٹھو ـــ اٹھو ـــ اور آگے بڑھو"!

پیام امید

نمبر ۲	اگرہ - فروری ۱۹۱۷ء	جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں جس حال میں ہم مستورات مرد ایڈیٹروں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے سیکڑوں اخبار اور رسالے برابر بے تکلف پڑھ رہی ہیں روشن خیال مردوں کے طبقہ سے اس حد تک مایوسی نہیں، ہے کہ انہیں ہمارے طبقہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ پڑھ لینا ہی گراں گذرے گا۔ تعلیمیافتہ اور روشن خیال مردوں کا طبقہ ہماری سوسائٹی کا بہترین طبقہ ہے اور ہمیں اس معزز طبقہ کے خلاف ایسی یک طرفہ رائے قائم کر لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

خانہ آبادی

(ترجمہ و اقتباس)

گھروں پر جو برکتیں نازل ہوتی ہیں اُن کی مثال اس باران رحمت سے

ہے جس کی گھنگھور گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر کسی پہاڑی پر برسا کرتی ہوں۔ اِس پانی سے ہزاروں چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور ہزاروں ننھے منے پیاری پیاری ندی نالوں کے کنارے کے ہرے بھرے سبزے کی سبزی اور شادابی میں ایک نئی روح ایک نئی شادابی اور تازگی جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔ پھولوں کے پودے اِس فرح بخش پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور اُن کی رنگا رنگ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے ساری ہوا معطر ہو جاتی ہے۔

آباد گھروں کی مثال اِن پہاڑی چشموں سی ہے جن کی چھوٹی موٹی دھاریں ایک دوسرے سے مِل جُل کر ایک عظیم الشان دریا کی شکل اختیار کر لیں۔ اِن عظیم الشان دریاؤں کا دوسرا نام سوسائٹی۔ برادری اور قوم ہے۔ اگر چشموں میں پانی کم باقی رہجائیگا تو دریا خشک ہو جائیگا۔ اگر اِن میں خوب شدت کے ساتھ پانی بہیگا تو دریا کی شان بھی بڑھے گی۔ اگر چشمے صاف ہیں تو دریا کا پانی بلوّر کی طرح چمکیگا۔

اگر چشمے گندہ ہیں تو دریا میں بھی سوا گندگی کے غلاظت کے کچھ نظر نہ آئے گا۔ جب گھروں پر نکبت اور ادبار آتا ہے تو اِس شامت کا اثر دُور تک پھیلتا ہے۔ برعکس اس کے جب اُن پر رحمت نازل ہوتی ہے تو اُس کا جلوہ بھی دُور دُور تک اپنی نورانی شعاعیں پھیلا کر سرسبزی شگفتگی اور شادابی کے رنگ میں نزدیک و دُور کی ہر شئے کو رنگ دیتا ہے۔

ہمارے گھر پروردگار عالم کے بنائی ہوئی ہستیوں کے سرچشمے ہیں۔ یہ کوئی امر اتفاقی نہیں ہے کہ بنی آدم ایک دوسرے سے ایک ساتھ مِل جل کر

گھروں کو آباد کرتے ہیں اور رہتے سہتے ہیں۔ تنہا رہنا پسند نہیں کرتے لیکن انسانی کا آغاز اِسی طرح ایک گھر میں مِل جُل کر زندگی بسر کرنے سے ہوا تھا اس گھر کا نام باغ عدن تھا۔ پروردگار عالم کی رحمت کاملہ اُنہیں قوموں پر نازل ہوتی ہے جو اِس اوّلین طرز معاشرت کا تتبع کرتے ہیں۔ اور جو عقد مناکحت کے پاک رشتہ کا احترام کرکے تمام رزیل آلائشات سے اُسے مُبرا اور پاک رکھتے ہیں برعکس اس کے نکبت اور خدا کی لعنت برستی ہے ایسوں پر جو اللہ جل شانہٗ کے مقرر کردہ طریق سے تجاوز اختیار کرتے ہیں۔ جو عقد کے پاک رشتہ کی بے حرمتی کرتے ہیں اور گھر کا شیرازہ پراگندہ کرکے اُس کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔

ایک لبے بنائے گھر کی پرشت اس کی مستحکم دیواروں کا پشتی بان عقد ہوتا ہے شادی کا دن اپنی نورانی شعاعیں دور و دراز مستقبل تک پہونچاتا ہے۔ اِن مبارک شعاعوں کی تاثیر فرح بخش اور روح پرور ہونا چاہیے قرون وسطیٰ کی انگریزی طرز معاشرت میں یہ رسم داخل تھی کہ جب دولہن رسم نکاح ادا کرنے کی غرض سے مقدس گرجا گھر کو روانہ ہوتی تھی تو دوستوں عزیزوں اہل برادری کی جماعت اس کے پیچھے پیچھے چلتی تھی اور دولہن کی راہ میں گلاب کے پھول بچھا دئیے جاتے تھے۔ انگریزی طرز تحریر میں" راہ میں گلاب کے پھول بچھا دینا" اسی رسم کی یادگار ہے۔ گلاب کا پھول شگفتگی نیکی۔ پیار۔ اخلاص۔ کامیابی اور فارغ البالی کی فال نیک سمجھا جاتا تھا۔ اور گویا مقصد یہ رکھا گیا تھا کہ دولہن کے خویش اقربا اُس کی آئندہ زندگی کو

ان اوصاف سے موصوف ہونے کے خواستگار ہیں۔ گویا یہ رسم زبانِ حال سے کہتی تھی کہ پیاری نازپروردہ دولہن جاؤ شاد و آباد رہو۔ بڑھو اور پھلو پھولو۔
تبدیل رسم ورواج کے ساتھ ہر قوم اور ملک میں نکاح کی رسم کا خیر مقدم کیا زمانہ ماضیہ میں اور کیا حال میں ایسی ہی تمناؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے بعض ملکوں میں دولہن کے سر پر پھولوں کے ہار لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ بعضوں میں پھولوں کے طرّے اس کے سر پر لگا دیئے جاتے ہیں، اور بعض جگہ پھولوں کے ہار اس کے گلے میں پہنا دیئے جاتے ہیں۔ بعض ملکوں میں پھولوں کا ایک مختصر سا گلدستہ ساتھ جاتا ہے اور دولہن کے سر میں لگا دیا جاتا ہے۔ بعض جگہ اسکے سینہ پر اٹکا دیا جاتا ہے۔ مگر ہر جگہ اور ہمیشہ مقصد ایک ہی ہوتا ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ بعض ملکوں میں دولہن کے ساتھ ساتھ باجہ بجتا چلتا ہے۔ بعض ملکوں میں ایک مخصوص طریق پر گھنٹہ بجایا جاتا ہے۔ مگر ہر حال میں اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ اُسے خوشی اور برکت نصیب کرے۔ ہر ملک میں شادی کا موقعہ ایک نہایت ہی اہم اور نہایت ہی ضروری وقت خیال کیا جاتا ہے۔ اور انسانی زندگی کی سارے مقاصد اور اُمیدوں کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ باپ ماں دوست اور عزیز اسی دن کے لئے گھڑیاں گنتے رہتے ہیں اور جب یہ نیک ساعت آتی ہے تو سب کے سب ایک دوسرے کو تہہ دل سے مبارکباد دیتے اور خوش ہوتے ہیں۔
مگر افسوس! ہر حال میں یہ تمنائیں یہ اُمیدیں بارور نہیں ہوتیں بعض صورتیں ایسی بھی پیش آتی ہیں کہ شادی کے دن کی خوشیوں کی یاد دل کے کسی گوشہ

میں دبی پڑی رہتی ہے ۔ مگر اس کی جھلک بیاہی ہوئی زندگی کی ہستی میں کہیں بھی نظر نہیں آتی ۔ یہ صورت کہاں پیش آتی ہے ؟ وہاں جہاں ہاتھ تو مِل گئے ہیں مگر دِل نہیں ملے ہیں ۔ یا دوسرے الفاظ میں جہاں بیاہی زندگی محبت کی حکومت سے محروم ہے ۔ یہاں بیاہ کے پھول کمہلائے سوکھے اور مٹی میں مِل کر مٹی بنگئے ہیں ۔ مگر برعکس اس کے جہاں محبت کے فرح بخش آب وہوا موجود ہے وہاں یہ پھول کبھی نہیں کمہلائیے اور اُن کی لپٹوں سے عمر بھر دولہن دولہا کے دماغ معطر رہتے ہیں ۔ حتیٰ کہ آخر کار وقت آپہنچتا ہے اور اِن دونوں میں سی ایک رفیق زندگی کا پیمانہ حیات مستعار لبریز ہوجاتا ہے ۔ اُس وقت پس ماندہ کا فریق وہی ہرا بھرا تازہ پھول اپنے ہاتھ سے اُٹھا کے محبت اور خلوص کے آنسوؤں میں تر کرکے رخصت ہونے والے مہمان کے جنازہ پر دھر دیتا ہے ۔

شادی کا مقصد خوشی ہے ۔ بیاہی زندگی ایک مکمل خوشی ۔ ایک تکمیل یافتہ پاکیزگی اور انسانی زندگی کی بہترین حلاوتوں کا عطر مجموعہ ہونا چاہیے بیاہی زندگی ایک طور پر تکمیل یافتہ زندگی کے مقاصد کا نمونہ ہے ۔ یہ مقاصد ہمارے اپنے وضع کئے ہوئے نہیں ہیں ۔ ان کا واضع خود اللہ جل شانہٗ ہے اللہ پاک نے جب دیکھا کہ مرد کا تنہا زندگی بسر کرنا اچھا نہیں ہے تب اُس نے عورت کو پیدا کیا ۔ محض تنہا مرد کا وجود ایک تکمیل شدہ وجود ثابت نہیں ہوا ۔ خامیاں محسوس ہوئیں ۔ اور اُن خامیوں کا علاج مقصود ہوا ہماری غیر محسوس کمی ۔ ہماری خامیوں کا یہ پیارا پیارسے بھرا ہوا علاج تھا جو اللہ پاک نے ایک معصوم عورت کی صورت میں جلوہ گر کرکے ہمیں عطا

فرمایا۔ شکر ہے اُس کے احسان کا۔ پروردگار عالم کا اس بیش قیمت عطیہ کے عطا فرمانے سے یہ مقصد تھا کہ دونوں ملکر انسانی زندگی کی تکمیل شدہ صورت پیدا کریں۔ پس عورت بغیر مرد کے غیر مکمل اور مرد بغیر عورت کے غیر مکمل ہے۔

اس اتحاد اور اس پاک اتصال سے دونوں میں سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے کے لئے کوئی کمی پیدا کردینے کا باعث نہیں بنتا بلکہ برعکس اس کے دونوں کی کمی دونوں کی خامیاں پوری ہوتی ہیں اور دونوں مل کر ایک تکمیل شدہ زندگی کا وجود قائم کرتے ہیں۔ اگر کسی صورت میں اس تکمیل پر پہنچنے کے بعد دونوں کو وہ امن وہ عافیت وہ دلی راحت وہ سچی خوشی نصیب نہ ہوسکے جو ہمارے آفریدگار کا اصلی مقصد تھا تو اس کا الزام اس پاک رسم اس مقدس رشتہ کے برپا ہونے پر نہیں آسکتا بلکہ صرف انہیں افراد پر جنہوں نے اس مقصد کو نہیں سمجھا اور جو محض زبان ہی سے خطبۂ نکاح پڑھ گئے اور جن کا قلب تصدیق کے وقت زبان کا شریک حال نہ تھا۔

(باقی آیندہ)

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

جاہلیت کے زمانہ کا حجاز۔ اور اہل حجاز

ہر چند کہ عرب کے شمالی اور جنوبی حصہ کے رہنے والوں نے اپنی متمدن زندگی کے اوایل میں بیداری یا نیم بیداری کے آثار دکھانا شروع کردیئے

تھے مگر ملک کا وسطی حصہ ابتک اسی وحشیانہ حالت میں تھا۔ وجہ یہ تھی یہ حصّہ ملک بالکل خشک اور ویران تھا۔ نہ یہاں پانی میسر آسکتا تھا اور نہ زمین پر کہیں گھاس کا نام ونشان نظر آتا تھا۔ دُنیا کی بڑی بڑی متمدن سلطنتیں اِس حصّۂ ملک سے دُور تھیں اور کہیں سے آمد و رفت کا سلسلہ نہ تھا اور چونکہ اور علاقہ ایک چٹیل میدان تھا اور صحرائے عرب کے بیچوں بیچ میں پڑتا تھا اس وجہ سے کسی فاتح کا خیال بھی ادھر رجوع نہیں ہوتا تھا۔ اوّل اِس وجہ سے کہ اس حصّہ ملک پر حکومت حاصل کرنے سے کوئی مالی فائدہ پہنچنے کی اُمید فضول تھی۔ دوسرے بے آب و گیاہ اور ویران مقام تک کسی بڑی فوج کا پہنچنا بیشمار مصائب اور ناقابل برداشت دقتوں کا سامنا کرنا تھا۔ مگر جس ملک کے فتح کرنے میں ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑے اور فتح کر لینے پر کوئی فائدہ پہونچنے کی اُمید نہ ہو وہاں کا رُخ کون کرسکتا تھا۔

چودھویں صدی قبل از مسیح میں رعمسیس ثانی اور چوتھی صدی قبل از مسیح میں اسکندر اعظم اور پہلی صدی عیسوی میں قیصر آگسٹس کے زمانہ کا ادلیوس غالوس جو اپنے اپنے زمانہ کے جرار صف شکن بنرد آزما مرد میدان تھے۔ مگر ان کی ملک گیری کی ہوس نے بھی اس حصّۂ ملک کی جانب رُخ کرنے پر اُنہیں مائل نہیں کیا اسی طرح سلطنت ایران جس کا ستارہ اگلے زمانہ میں عروج کمال پر پہنچا ہوا تھا اس نے بھی کبھی اس ملک کے فتح کرنے کا خیال دل میں نہیں پیدا کیا۔ اس امن اور عافیت کی زندگی نے اہل حجاز کو مطمئن اور قانع بنا رکھا تھا۔ اور وہ جس حال میں تھے اپنے حال میں ہر طرح خوش بسر

کر رہے تھے۔ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جب تک انسان خطرہ میں نہ ڈالا جائے وہ کسی ترقی کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ خطرہ میں پڑکر اُسکا دماغ اصلاحات کی جانب رجوع ہوتا ہے اور افکار اصلاح انسانی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ انسان کے خمیر میں نفسانیت اور عزت کی چاٹ بھی ملی ہوئی ہے جس کا تقاضہ اس صورت میں جلوہ گر ہوا کہ ان حجازیوں باہم خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ آئے دن کے جھگڑے رفتہ رفتہ اُنہیں لڑنے بھڑنے کا عادی بناگئے اور کچھ مدت بعد اُن کا ذریعہ معاش لوٹ مار بن گیا۔ اِس شغل میں پڑ کر وہ کچھ ایسے محو ہوگئے کہ سوا اس کے دوسری جانب مائل ہونا ہی نہیں جانتے تھے۔ مگر جہاں یہ عیب تھا وہاں اُنمیں خوبیاں بھی تھیں۔ وہ کیا تھیں؟ وہ خوددار تھے۔ وعدہ کے پکّے۔ بات کے دھنی۔ صاحب ہمت وشجاعت اور بلند حوصلہ تھے۔ اور یہ صفات اِس امر پر دلالت کرتی تھیں کہ کسی آیندہ زمانہ میں وہ ضرور ایک بار چمکیں گے اور خوب چمکیں گے۔

جاہلیت کے زمانہ کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے اور نہ کسی دوسری قوم یا دوسرے ملک کی تاریخ اس زمانہ پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ اور ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ اِس زمانہ جاہلیت کی اصلی اور صحیح مدت کیا تھی۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی مدت کئی صدیاں تھیں۔ ہماری رائے میں یہ مدت کم وبیش ایک ہزار سال کہی جاسکتی ہے۔

اب رفتہ رفتہ ہم تواریخی زمانہ سے قریب تر آتے جاتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب تو کچھ صورتیں غیر ملکوں کی بھی یہاں نظر آنے لگی ہیں۔ اِن

صورتوں میں نمایاں حصّہ یہودیوں کا ہے۔ یہ یہودی کون ہیں؟ کہاں سے آئے اور کیوں آئے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے اہلِ یہود اپنا وطن مالوفہ چھوڑ چھوڑ کر عرب میں بسنا شروع ہو گئے تھے۔ مگر قرون اخیر زمانہ قبل از مسیح میں اور ابتدائی عیسوی صدیوں میں سلطنت روما نے ان غریبوں پر بہت ظلم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس ظلم و تعدی سے جان بچا کر یہ لوگ ترک وطن کر کے اس ملک میں آئے تھے۔ اس کے بعد بیت المقدس کی تباہی کا زمانہ آیا۔ اس زمانہ میں خاص کر ان کی بہت بڑی تعداد آ کر عرب میں بس گئی۔ انہیں یہودیوں کے ساتھ ساتھ کچھ نبطی لوگ بھی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہ تارکان وطن خاص کر طائف اور مکہ اور مدینہ میں آباد ہوئے مدینہ ان کی آبادی کا بہت ہی بڑا مرکز تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں ان سے بھی پہلے اوس اور خزرج نامی قبائل ان کے ہم مذہب پہلے ہی سے آباد تھے۔

اہل حجاز پر ان نو آباد تارک وطنوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ اور انہوں نے بہت سی ایسی باتیں رائج کر لیں جن کے نام سے بھی وہ پہلے واقف نہ تھے مثلاً حج، قربانی۔ نکاح، طلاق، کہانت۔ تہواروں کے دن جلسے کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہودیوں سے انہوں نے توریت کے قصے سُنے۔ تلمود کے چندباب یاد کئے اور یہودیوں کی عادات و رسوم بھی ان میں پھیل چلیں۔

اب سیل ارم کے واقعہ کا زمانہ آ گیا۔ اور اس زمانہ میں بہت سے اہل یمن یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ بیرونی آبادی کا ملکی آبادی سے میل جول

بڑھا۔ اور انجام یہ ہوا کہ اہل حجاز نے دو فرقے بنا لئے۔ ایک صحرائی عرب فرقہ کہلایا۔ یہ فرقہ بادیہ گرد صحرا نورد خانہ بدوش تھا۔ اور اپنی سادہ طرز معاشرت میں خوش اور مطمئن تھا۔ دوسرا فرقہ شہریوں کا قرار پایا۔ اور یہ شہری مکہ۔ مدینہ اور طائف میں آباد تھے۔ یہ لوگ حضر یعنی شہری کہلاتے تھے۔

اب مکہ میں حج ہونے لگا تھا۔ اور دور دراز ملکوں کے لوگ یہاں آنے لگے تھے اسلئے وہ حجاز کے شہروں میں سب سے ممتاز ہوا۔ رفتہ رفتہ کئی صدیاں گذر جانے پر مکہ ایک تجارتی منڈی سمجھا جانے لگا۔ اس وجہ سے کہ ایک وقت معینہ پر ہر سال وہاں کثرت سے لوگ دور و دراز ملکوں کے آتے اور ٹھہرتے تھے۔ اور خرید و فروخت خوب ہوتی تھی۔ اب وہ وقت آ پہنچا کہ عرب کی آبادی قبائل پر تقسیم ہوئی۔ ہر ہر فرقہ یا قبیلہ کا ایک ایک سردار قرار پایا۔ اور چونکہ مکہ تجارت کی منڈی بن چکا تھا اور جس قبیلہ کی حکومت مکہ پر ہوتی وہ یقینی ایک مالدار قبیلہ بن جاتا لہٰذا ہر قبیلہ کی سرداری کی نظر ادھر ہی تھی۔ دور اولیں میں مکہ بنو اسمٰعیل کی قبضہ میں رہا۔ اور وہی لوگ مکہ کے خادم اور حاجب تھے۔ مگر جب سیل ارم کے واقعہ کے بعد ملک یمن سے ہجرت کر کے بنو خزاعہ مکہ میں آئے تو انھوں نے مکہ پر بھی اپنا قبضہ جما لیا اور اہل حجاز کو اپنا محکوم بنا لیا۔ چونکہ یہ فرقہ ملک یمن میں برسر حکومت رہ چکا تھا حکومت کی بو اس کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں اسمٰعیلی یا جسکا دوسرا نام عدنانی ہے بہت ہی کمزور ہو رہے تھے۔ اور اہل یمن سے مقابلہ نہ کر سکے۔ بنو خزاعہ کی حکومت کئی صدیوں تک رہی۔ اس کے بعد بنو خزاعہ بھی کمزور

ہو گئے۔ اور عدنانی جو اس فرقہ کی حکومت میں محکوم بن چکے تھے اور حاکم بننے کی اُمنگ ان کے دلوں میں پیدا ہو کر اُنہیں اُبھار رہی تھی آخر کار اُنہوں نے زور باندھا۔ عدنانیوں کی قوم میں سے ایک حصہ کنانہ کے نام سے موسوم تھا۔ اِس حصہ نے امتیاز میں نمایاں صورت پیدا کی۔ اِس حصہ میں سے ایک قبیلہ اہلِ قریش کا تھا اور رفتہ رفتہ یہ قبیلہ سارے فرقہ میں نمایاں نظر آنے لگا۔

(باقی آئندہ)

زبردستی کی اُردو کانفرنس

معزز اُردو اخبارات اور رسالے براہ کرم مضمون ذیل کی نقل شائع کر دیں یہ ایک اہم قومی خدمت ہے

جنوری نمبر [illegible] میں ہم اُردو کانفرنس کی دعوت کا اعلان کر چکے ہیں۔ ۲۹ر اور ۳۰ر دسمبر کی تاریخ کانفرنس کے اجلاس کے لئے مقرر تھی۔ کانفرنس نے ہمیں بھی مدعو کیا تھا۔ مگر ہم نے اظہر علی صاحب آزاد کو "پیامِ اُمید" کا نمایندہ بنا کر بھیجا تھا جس کی باضابطہ اطلاع سکرٹری صاحب کانفرنس کو دے دی تھی۔ سکرٹری صاحب کانفرنس (ظفر الملک صاحب ...ی ایڈیٹر رسالہ الناظر) سے ہم سے مراسلت ہوئی تھی۔ یہاں ایک جملہ ...معترضہ یہ ہے کہ بعض حضرات نے خط کے ذریعہ سے ہم سے دریافت کیا ہے کہ آیا "ظفر الملک" کوئی حیدر آبادی خطاب ہے۔ کیونکہ بصورت

ظاہر یہ نظام الملک اور محسن الملک اور وقار الملک سے ہم وزن اور ہم ردیف نظر آتا ہے۔ مگر ایک ایک صاحب کو علیحدہ علیحدہ جواب بھیجنے کے بجائے ہم یہاں مختصراً اتنا ہی عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ خیال بالکل ہی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ کا اسم گرامی اسحاق علی علوی ہے۔ ظفر الملک کا خطاب آپ نے خود تصنیف فرما کے اپنے نام کے ساتھ نتھی کر لیا ہے۔

القصہ ہمارے نام جو گرامی نامہ آپ کا صادر ہوا تھا اس کے ذریعہ سے آپ نے یہ بھی درخواست کی تھی کہ کچھ نام معتدر بزرگانِ قوم کے معہ پورے پتہ کے ان کی خدمت میں بھیجدیے جائیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں ہم نے ایک فہرست پورے ایک سو ناموں کی آپ کی خدمت شریف میں روانہ کر دی تھی۔ آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ اگر ہمیں کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے کوئی رزولیوشن بھیجنا منظور ہو تو ۱۰ر دسمبر سے قبل ایسے تمام رزولیوشن آپ کی خدمت میں ضرور پہنچ جانے چاہئیں کیونکہ اس تاریخ کے بعد جو رزولیوشن موصول ہوں گے وہ یقینی نظر انداز کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ہم نے حسب ذیل سات رزولیوشن ۷ر دسمبر کی ڈاک سے بصیغۂ رجسٹری روانہ کر دیئے تھے ایک کاپی ان کی اسی دن احتیاطاً عالیجناب آنریبل سید آل نبی صاحب بی۔ اے ایل ایل بی چیرمین میونسپل بورڈ آگرہ کی خدمت میں بھی بھیجدی تھی اور ایک نقل اپنے دفتر میں رکھ لی تھی۔ یہ تینوں کاپیاں میرے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ یا اس سے پہلے اور جتنے خط بھیجے گئے

تھے وہ سب کے سب میرے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ ان رزولیوشنوں کے ساتھ جو عریضہ بھیجا گیا تھا اُس کا مضمون یہ تھا کہ میں ایک منکسر مزاج آدمی ہوں۔ مجھے نام و نمود سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان رزولیوشنوں میں سے ہر ہر رزولیوشن کے متعلق آپ کو پورا اختیار دیتی ہوں کہ جو صاحب چاہیں بے تکلف اپنے نام سے پیش کر دیں جو صاحب چاہیں تحریک و تائید کریں۔ اگر ان کے متعلق میرا کوئی ذکر بھی نہ کیا جائے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ مجھے کام ہو جانے سے غرض ہے۔ نام سے مطلب نہیں ہے۔

عالیجناب ظفر الملک صاحب کے ایک یا دو خط اس واقعہ کے بعد آئے مگر کسی خط میں ان رزولیوشنوں کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ میں نے گھبرا کر خط لکھا کہ رجسٹری شدہ لفافہ تھا وہ تو غالباً گم نہ ہوا ہوگا براہِ کرم اس کی رسید تو بھیجد یجئے کہ اطمینان ہو جائے۔ مگر میری مودبانہ درخواست قابلِ التفات نہیں قرار پائی اور کوئی جواب نہیں عنایت فرمایا گیا۔ میں نے پہلے خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اظہر علی صاحب آزاد وہاں پہنچکر آپ سے ملیں گے آپ اُن سے بتا دیجئے گا کہ ان رزولیوشنوں کے متعلق آپ نے کیا کارروائی کی ہے۔

اظہر علی صاحب آزاد ۲۷ دسمبر کی صبح کو لکھنؤ پہنچے۔ ایڈیٹر صاحب الناظر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ سیدھے دفتر ہمدم میں گئے اور رسید جالب صاحب دہلوی سے۔ اُن سے جو مکالمہ ہوا درج ذیل ہے۔

آزاد۔ (رزولیوشنوں کا تذکرہ کر کے اور پتہ بتا کر) میں منگوا دوں گا اگر

آپ براہ کرم بتا سکیں گے کہ ان رزولیوشنوں کے متعلق کیا کارروائی ہوئی ہے

جالب صاحب۔ اب رزولیوشن پیش کرنے کا وقت نہیں رہا۔ سب سے آخری دن ۱۵ر دسمبر تھا۔

آزاد۔ مگر یہ رزولیوشن بصیغہ رجسٹری ۶ر دسمبر کو آگرہ سے روانہ ہوئے تھے۔ اب اس کا بار ثبوت آپ پر ہے کہ وہ ۱۵ر دسمبر کے بعد موصول ہوئے۔

جالب صاحب۔ میں اس کی بابت کچھ نہیں جانتا۔

آزاد۔ کیا آپ مہربانی کرکے اتنا بتا سکیں گے کہ آیا اُن میں سے کوئی رزولیوشن بھی لیا گیا ہے یا نہیں۔

جالب صاحب۔ اگر اُن میں سے کوئی ضروری ہوگا تو ضرور لیا گیا ہوگا۔

آزاد۔ میرے سوال کا یہ جواب نہیں ہے۔ مہربانی کرکے صرف ایک ہی لفظ میں جواب دیجئے۔ ہاں فرمائیے یا نہیں۔

جالب صاحب۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا یہی جواب ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ضروری ہوگا تو ضرور لیا گیا ہوگا۔

آزاد۔ مثال کے طور پر دو رزولیوشنوں کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) کانفرنس کا ایک مستقل صدر مقام قرار دیا جائے۔ ایک تنخواہ دار سکرٹری مقرر کیا جائے۔ سکرٹری کے زیر نگرانی دفتر کے لئے کافی عملہ دیا جائے۔ ایک پریس بھی اس کے متعلق کر دیا جائے جہاں کانفرنس

کے سرکاری کاغذات چھپا کریں۔ اور ایک مستقل ماہوار رسالہ نکالا جائے جس میں کانفرنس کی کارروائیاں ماہ بماہ شائع ہوتی رہیں۔

(۲) کانفرنس کے آیندہ اجلاس کے صدر ہمارے صوبہ کے مشہور ادیب اور مستند فاضل آر پی ڈیوہرسٹ صاحب بالقابہ قرار پائیں۔ اردو کانفرنس باقاعدہ طور پر اس کے متعلق آپ کی خدمت میں تحریک کرے۔

جالب صاحب۔ ڈیوہرسٹ صاحب بہادر کی صدارت کی لئے میں خود تحریک کرنے والا ہوں۔ ابھی تک صرف تین رزولیوشن لئے گئے ہیں چوتھا معرض بحث میں ہے۔ مگر میں خود اس کی تحریک کرونگا

آزاد۔ چونکہ آپ نے آزاد بیگم کے بھیجے ہوئے رزولیوشنوں کے ساتھ بالکل بے انصافانہ اور بے ضابطہ کارروائی کی ہے جس کے آپ بالکل مجاز نہ تھے لہٰذا میں بحیثیت "پیام امید" کے نمایندہ کے آزاد بیگم کا دیا ہوا وہ اختیار واپس لیتا ہوں جس کی رو سے آپکو بطور خود رزولیوشن پیش کردینے کا اختیار دیدیا گیا تھا۔ اب اگر آپ پیش کرسکتے ہیں تو صرف اسی ایک صورت میں کہ اُن کا رزولیوشن قرار دے کر اُن کی جانب سے آپ پیش کردیں۔

جالب صاحب۔ اس صورت میں پیش کرنے سے مجھے صاف انکار ہے۔ اور اُن کا کوئی رزولیوشن پیش نہیں ہوسکتا۔

آزاد۔ ما بخیر و شما بسلامت۔ سلام علیک۔

اب آزاد صاحب پھر ظفر الملک صاحب کی تلاش میں مصروف

ہوئے۔ دفترِ الناظر کا مشکل سے پتہ چلا وہاں معلوم ہوا کہ گولا گنج میں ندوۃ العلماء کی پُرانی عمارت میں ملیں گے۔ وہاں کانفرنس کے مہمان مقیم ہیں۔ آزاد صاحب وہاں گئے۔ دہلی کے دو بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

(۱) جناب ابو المعانی منشی محمد دین صاحب خلیقی۔ چاندنی چوک دہلی۔

(۲) جناب مولوی ظفر احسن صاحب۔ کارکن دایرۃ الادب۔ دہلی۔

مگر ظفر الملک صاحب کی نسبت سُنا گیا کہ راجہ صاحب محمود آباد کے دربار میں جلوہ افروز ہیں۔ ایک والنٹیر تلاش کیا گیا۔ آزاد صاحب کا کارڈ لیکر وہاں بھیجا گیا۔ انتظار کا وقت بزرگان دہلی سے ملاقات میں صرف کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ جو وقت اسٹیشن ریل پر آزاد صاحب کو پیش آئی تھی اُس کا تلخ تجربہ ان حضرات کو بھی اُٹھانا پڑا۔ والنٹیر کا وہاں کہیں نام ونشان بھی نہ تھا سواری کا کوئی کسی قسم کا انتظام نہ تھا۔ آزاد صاحب نے پولیس کے سارجنٹ سے کہہ کر ایک تانگہ حاصل کر لیا تھا۔ جس کا صرف ایک ہی روپیہ کرایہ دینا پڑا تھا۔ مگر ان بزرگوں کو ۸ آنہ تو قلی کے نذر کرنا پڑا۔ اور چار روپیہ گاڑیبان صاحب کی خدمت میں پیش کش حاضر کرنا پڑا۔ آزاد صاحب کے بھائی وہاں لکھنؤ میں موجود ہیں۔ وہ وہاں ٹھہر گئے۔ مگر ان بکیس مسافروں کو کھانا بھی نہ ملتا اگر گھر سے باورچی ساتھ نہ لائے ہوتے۔ اس پر طرّہ یہ تھا کہ آخر وقت تک بھی حضور ظفر الملک بہادر کی خدمت میں باریابی کا موقع ان غریبوں کو نہ مل سکا۔ قصّہ مختصر ظفر الملک صاحب کو یہاں تک قدم رنجہ فرمانے کی زحمت گوارہ فرمانے کی نوبت نہ آسکی اور آزاد میاں سے

ناکام واپس گئے۔ دہلی کے بزرگ دہلی کی انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک مقتدر نیابت لانے کا انتظام کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے ارادہ سے اراکین لکھنؤ یا ظفر الملک صاحب اور جالب دہلوی صاحب کو مطلع فرمایا مگر یہاں سے یہ جواب ملا کہ یہ کانفرنس انجمن ترقی اردو سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی ہے لہٰذا دہلی سے نیابت کا لانا بالکل فضول ہے۔ چنانچہ ان بزرگوں کی ہفتوں کی کاوش اور دوا دوش پر پانی پھر گیا اور نیابت کی جگہ پر چند اصحاب محض انفرادی حیثیت سے تشریف لا سکے۔

القصہ ۲۷ر اور ۲۸ر دسمبر کا سارا وقت ظفر الملک صاحب کی خدمت میں باریابی حاصل کرنے کے شوق میں گذر گیا۔ مگر سوا مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اب ۲۹ر دسمبر کو اجلاس کانفرنس کے لئے ساڑھے آٹھ بجے صبح کا وقت دیا گیا تھا آزاد ٹھیک آٹھ بجے پہنچ گئے۔ مگر وہاں بارہ دری قیصر باغ مقفل تھی اور کوئی موجود نہ تھا۔ وہ سید وزیر حسن صاحب کے کیمپ میں چلے گئے کہ وقت کاٹیں۔ ساڑھے آٹھ بجے باہر آئے تو دیکھا کہ بارہ دری کے اندر صفائی ہو رہی ہے اور کرسیاں بچھائی جا رہی ہیں۔ جھاڑو سے اتنی گرد اڑائی جا رہی ہے کہ ادھر رخ کرنا محال ہے۔ جو حضرات شوق شرکت کانفرنس میں تشریف لائے تھے باہر ٹہل رہے ہیں۔ مگر ظفر الملک صاحب اب بھی نہیں نظر آتے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ راجہ صاحب محمود آباد کے دولت کدہ کی جانب تشریف لیگئے ہیں۔ پونے نو بجے ظفر الملک صاحب نظر آئے۔ آزاد ان کی زیارت سے بہرہ اندوز سعادت

ہوئے۔ رزولیوشنوں کے متعلق سوال کرنے پر جواب ملا کہ (ایک کتاب کی جلد کھول کر لفافہ دکھا کر) یہ دیکھو میرے پاس موجود ہیں۔ میں نے انہیں سبجیکٹ کمیٹی میں پیش کیا۔ مگر میرا اس میں کیا قصور ہے اگر سبجیکٹ کمیٹی نے انہیں سے ایک بھی نہ لیا۔

اب اسوقت رفتہ رفتہ سنو آدمیوں کے قریب اس راز سے ماہر ہو چکے تھے کہ اس طرح یہ رزولیوشن بھیجے گئے تھے اور اُن کا یہ حشر ہوا۔ اور حاضرین میں اس بے ضابطہ کارروائی کے خلاف ناراضگی کا جوش پھیل گیا تھا۔ آزاد نے آنریبل شاہد حسین صاحب سے بھی اس کی شکایت کی۔ اُنہوں نے ظفر الملک صاحب سے کہا۔ ظفر الملک صاحب نے انہیں بھی یہی جواب دیا کہ میں نے سبجیکٹ کمیٹی میں پیش کر دیا۔ اب اگر سبجیکٹ کمیٹی انہیں نظر انداز کر چکی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس جواب سے وہ بھی ساکت رہ گئے۔ اب مسٹر سجاد حیدر آئے اور بڑے تپاک سے آزاد سے ملے۔ آزاد نے اُن سے بھی بڑی شکایت کی کہ آپ سبجیکٹ کمیٹی کے ممبر تھے اور تعجب ہے آپ کے ہوتے ہوئے ایسے اہم بے ضابطگی ہو گئی اور آپ نے کچھ بھی نہ کیا۔ ایسے اہم رزولیوشن نظر انداز کر دینے کا سبجیکٹ کمیٹی کو کیا حق تھا جبکہ سبجیکٹ کمیٹی کو کانفرنس نے نہیں قائم کیا تھا بلکہ ابھی تک اس کی حیثیت صرف ایک خود رو کمیٹی کی تھی۔

اس پر سجاد حیدر صاحب نے جواب دیا کہ اللہ جانتا ہے اگر مجھے ذرا بھی علم ہو کہ آزاد بیگم کا کوئی رزولیوشن آیا ہے۔ نہ تم نے نہ آزاد بیگم نے

مجھے اس کی کوئی اطلاع دی تھی (اور یہ بالکل سچ تھا) اور نہ سبجیکٹ کمیٹی کے سامنے آزاد بیگم کا کوئی رزولیوشن پیش کیا گیا تھا!

اس آخری فقرے پر آزاد چونک پڑے اور وہی فقرہ پھر دوہرایا "کیا! سبجیکٹ کمیٹی کے سامنے آزاد بیگم کا کوئی رزولیوشن پیش نہیں کیا گیا تھا؟" ہائیں! کیا واقعی یہ سچ ہے! مسٹر سجاد حیدر نے جواب دیا کہ "سچ اور بالکل سچ ہے"۔

اب آزاد بڑھے کہ ظفر الملک صاحب سے پوچھیں۔ مگر ادھر وہ سجاد حیدر صاحب سے باتیں کرنے کے لئے مخاطب ہوئے تھے کہ ادھر سکرٹری صاحب ڈائیس پر پہنچکر اپنی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ ہال میں پورا مجمع ہوچکا تھا۔ اور اب کوئی موقع اس گفت وشنید کا باقی نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس گفت وشنید سے کیا حاصل ہوسکتا تھا جب واقعہ کی اصلیت کا پردہ اچھی طرح فاش ہوچکا تھا۔ ہاں آزاد نے عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو سے بھی اس بے ضابطہ کارروائی کی شکایت کی تھی۔ مگر بجائے اس کے کہ ان سے کوئی ہمدردانہ جواب ملے وہ ترش رو نظر آئے اور آخر میں یہی ارشاد فرمایا کہ سبجیکٹ کمیٹی نے جو کچھ کیا بالکل جائز کارروائی تھی۔ اور آپ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق کوئی منصب نہیں ہے

اب اس موقعہ پر پہنچکر بہت سے حضرات کو ان کارروائیوں کا حال معلوم ہوچکا تھا۔ اور برہمی اور برافروختگی کا ایک سیلاب پیدا ہوچکا تھا جس کا روکنا دشوار تھا۔ ہر شخص آزاد کو ابھارتا تھا کہ تم ضرور

صاحب بھی مدعو تھے۔ یہاں پہونچنے پر دہلی کے دونوں بزرگ بھی ملے اور بہت سے احباب تھے۔ حضرات دہلی نے آزاد صاحب سے کہا کہ ظفرالملک صاحب اب فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کانفرنس کا جلسہ نہیں ہے۔ یہ انجمن ترقی اُردو کی شاخ ہے جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھی۔ چونکہ کام زیادہ ہے اور ایجوکیشنل کانفرنس کے پاس اس شعبہ کے لئے کافی وقت نہیں ہے لہٰذا یہ شاخ وہاں سے علیحدہ کر لیگئی ہے۔ حضرات دہلی نے فرمایا کہ ظفرالملک صاحب نے نہ صرف اُن سے بلکہ کئی ایک اور اصحاب سے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ آزاد اُن سے ملے اور استفسار حال کیا۔ اُنھیں بھی لفظاً بہ لفظ وہی جواب ملا جیسا کہ بیان کیا گیا تھا۔ اس پر آزاد صاحب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو مجھے چنداں اعتراض نہیں اس وجہ سے کہ آپ کے کاموں کی نگراں ایک باضابطہ انجمن پہلے ہی سے موجود ہے۔

اب شام کا وقت آیا۔ ایک کارکن کمیٹی منتخب کی گئی جس میں بہت سے موقر نام سُنائے گئے اور کہا گیا کہ کمیٹی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اس فہرست کو مزید وسعت دے۔ کشن پرشاد صاحب کول ایڈیٹر اودھ اخبار اس کمیٹی کے سکرٹری تجویز کئے گئے۔ صاحب ممدوح نے عدیم الفرصتی کا عذر پیش کیا۔ اصرار پر اصرار بڑھتا گیا۔ آخر مجبور ہو کر آپ نے فرمایا کہ جس حال میں یہ اُردو کانفرنس کا اجلاس نہیں ہے۔ بلکہ انجمن ترقی اُردو کی ایک شاخ اور آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ ہے جو بدون حصول اجازت ضابطہ اس سے علیحدہ کر لیا گیا ہے تو میں اپنے کو ایسے بے ضابطہ انجمن کا سکرٹری

نہ ہونے دونگا جب تک کہ اس کی اجازت علیحدگی حاصل نہ کیجائے ۔ اس پر زور دیا گیا کہ اجازت ضرور حاصل کرلیجائے گی ۔ مگر آپ حصول اجازت کے ساتھ مشروط کرکے علیحدہ سکرٹری قبول فرمالیں چنانچہ بڑے اصرار پر آپ نے اُسے منظور کرلیا۔

اس کے بعد یہ مسئلہ پیش ہوا کہ اردو کانفرنس کا آیندہ اجلاس کہاں ہوگا ۔ چنانچہ کلکتہ کے ایک نواب صاحب نے اُٹھکر کانفرنس کو کلکتہ میں مدعو کیا اور دعوت منظور کرلی گئی ۔ گویا اب پھر اردو کانفرنس کی صورت نکالی گئی

اب "اردو کانفرنس" کے مختلف پہلوؤں پر کافی روشنی پڑ چکی ہے ۔ صرف ایک اور پہلو ابھی اور باقی ہے ۔ اُسے بھی ملاحظہ فرما لیجیے ۔ عام خیال غالباً یہ ہوگا کہ بانیان "کانفرنس" نے اپنی جیب سے روپیہ خرچ کیا ہوگا ۔ اپنے وقت کا قیمتی حصہ اس کام کے نذر کیا ہوگا ۔ وقت صرف کرنے کا پردہ تو اُن کے حسن انتظام نے فاش کردیا ہے اور اس کے متعلق کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہیں ہے ۔ رہا روپیہ صرف کرنا تو اس کی اصلیت یہ ہے کہ حضرت ظفرالملک صاحب نے سر برآوردہ عمائد اور معززین لکھنؤ کی ایک فہرست مرتب فرمائی اور چند احباب کو ساتھ لیکر شہر میں گشت کرنا شروع کردیا ۔ جو چندہ اس طرح سے فراہم ہوا اس میں سے خرچ کیا گیا ۔ خرچ کا بصورت ظاہر منتظمین کے سر کوئی بار نظر نہیں آتا تھا جو مہمان باہر سے مدعو کئے گئے تھے اگر اُن کی آرام و آسایش کی پوری توجہ کے ساتھ نگرانی بھی کی گئی ہوتی اور کم سے کم اُن کے حال زار پر توجہ کرنے کے لئے اپنے بیش قیمت اوقات میں سے نکالکر آٹھ

دس منٹ بھی اُن غریبوں کو دیدیے گئے ہوتے تو اُن کی اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر رونا تو اسی کا ہے کہ اتنا بھی نہ ہو سکا۔ خود فرصت نہ تھی اس سے کہیں زیادہ اہم ملکی اور مالی خدمات پیش نظر تھیں تو باقاعدہ طور پر کام تقسیم کیا گیا ہوتا اور اِن غریبوں کی دیکھ بھال کے لئے بھی کوئی اللہ کا بندہ ذمہ دار بنا دیا گیا ہوتا تو اُنھیں وہ تکلیفیں نہ برداشت کرنا پڑتیں جو اُنھیں مدتوں یاد رہیں گی۔

ان واقعات کی روشنی میں بہت سے سوالات نظر آتے ہیں اور ہمیں اب ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا ہے۔

(۱) یہ "اردو کانفرنس" آخر ہے کیا بلا؟ اتنے سوال وجواب سب ہو گئے مگر اب تک یہ بات صاف نہ ہوئی کہ آیا یہ ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہے یا اس سے بالکل مختلف ایک شے دیگر ہے۔

(۲) اگر یہ ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہے اور بقول بانیان ایجوکیشنل کانفرنس کے پاس اس کام کے لئے کافی وقت نہ تھا لہٰذا یہ بارگراں اسکے کاندھے سے اتار لیا گیا تو پھر اس میں کیا قباحت تھی کہ ایجوکیشنل کانفرنس کی اجازت حاصل کر کے ایسا کیا گیا ہوتا؟ کوئی شاخ شاخ نہیں کہی جا سکتی جب تک وہ باضابطہ طور پر شاخ نہ بنائی گئی ہو۔

(۳) اگر واقعی یہ شاخ ہی تھی تو اس کا نام "اردو کانفرنس" کیوں رکھا گیا۔ اور کس کی اجازت سے رکھا گیا۔ اور ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

(۴) دہلی کی نیابت کیوں روک دیگئی؟ اسکے آنیمیں کیا نقصان تھا؟ کوئی قومی نقصان تھا یا کسی کا ذاتی نقصان تھا؟

(۵) اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک وقت اس کا نام کانفرنس رکھا گیا۔ اور دوسرے وقت ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ تبلائی گئی؟ اسمیں کیا مصلحت تھی؟ اصلیت پر پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی تھی؟

(۶) باقاعدہ طور پر کام کرنے سے کیوں گریز کیا گیا؟ یعنی سب سے پہلے ایجوکیشنل کانفرنس سے کیوں نہ اجازت حاصل کرلیگئی اس کے بعد جب چندہ مانگنے کا پورا سامان تیار ہوچکا تھا اور عین وقت پر اعتراض کیا گیا کہ کسی مستند اور معتبر بنک میں روپیہ جمع ہو۔ قابل وقعت اور قابل اعتبار اکاؤنٹنٹ حساب کی جانچ کے لئے مامور ہوں اور ہمیشہ باقاعدہ اور ٹھیک ٹھیک حساب رکھا جائے تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ سکرٹری صاحب اسی وقت اٹھہ کھڑے ہوتے اور فرمادیتے کہ ہم بنک بنگال سے مراسلت کرتے ہیں۔ آپ لوگ براہ راست بنک میں اپنا چندہ بھیجدیں۔ اور ہم باقاعدہ حساب رکھنے کا بھی انتظام کئے لیتے ہیں۔ فلاں فلاں حضرات سے ہم مراسلت کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اکاؤنٹنٹ ہوجائیں۔ قصہ وہیں ختم تھا۔ اور اسی وقت چندہ وصول ہونا شروع ہوجاتا۔ بانیاں میں سے تینوں حضرات وہاں موجود تھے۔ حضرت ظفر الملک بہادر۔ مولینا جالب دہلوی اور مولینا عبدالحق صاحب۔ مگر آخر ان حضرات میں سے ایک نے بھی کیوں اتنی اخلاقی جرات سے کام لینا گوارہ نہ فرمایا؟ اور چندہ کا مضمون وہیں سے کیوں غت ربود کردیا گیا جس کے لئے پانچ چھہ دھواں دہار اسپیچیں ہوچکی تھیں اور صاف الفاظ میں مانگنا شروع کیا جاچکا تھا؟

میں اس کا نام بھی لینا نہیں چاہتی ہوں کہ میرے بھیجے ہوئے رزولیوشن
کیوں نہ پیش کئے گئے۔ اگر یہ کوئی قومی انجمن ہوتی تو بیشک جائے شکایت
تھی مگر جب محض ان تین حضرات کی مجلس تھی تو ان کی خودسری اور خودرائی
کی شکایت ہی کیا! ہاں بیشک یہ کبھی ہونے نہ دونگی کہ ذاتی انجمن قومی انجمن
کہی جائے اور قوم اور ملک کو صاف صاف دہوکہ دیا جائے۔

مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے طرزعمل سے ان تین حضرات کو بڑا رنج
پہنچیگا۔ مگر قوم اور ملک کی بہبود کے معاملہ میں چند افراد کو رنج پہنچانے کا خیال
مانع نہیں آسکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ انہیں رنج پہنچانا میرے لئے ناگزیر ہے مگر مجھے امید ہے
کہ وہ مجھے معذور سمجھکر معاف فرمائیں گے۔

تینوں حضرات مجھے معاف کریں، اگر میں انہیں سے پوچھتی ہوں کہ کیا
وہ بنک بنگال یا کسی دوسری اسی پایہ کے بنک سے اپنی ذاتی ذمہ داری
پر تین سو روپیہ قرض لا سکتے ہیں؟ اگر نہیں لا سکتے ہیں تو انہیں کیا حق ہے
کہ قوم سے ایسی امید رکھیں کہ وہ تین لاکھ روپیہ کے معاملہ میں ان پر اعتماد
کرکے اپنا روپیہ ان کے ہاتھ میں بلا کسی جانچ یا پرتال کے چھوڑ دے!۔
بنک کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ تمہاری ماہوار مستقل آمدنی کیا ہے۔ دوسرا سوال
یہ ہوگا کہ تمہارے پاس کتنی جائداد ہے؟ یہی سوالات کیا قوم بھی نہیں پوچھ
سکتی ہے؟ آخر کس اعتبار کس ضمانت پر تمہارے ہاتھ میں اتنا بڑا سرمایہ
بے روک ٹوک دیدیا جائے! قوم دیوانی نہیں ہے!

قوم متواتر تلخ تجربات اُٹھا چکی ہے۔ اب وہ کاروبار کو کاروبار کی طرح کرنا چاہتی ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی ایثار اپنی حب الوطنی کا کوئی عملی ثبوت دے سکتے ہیں تو صفیں چیر کر ہمارے سامنے آجایئے اور بلا معاوضہ کام کرنا گوارہ فرمایئے۔ یاد رکھئے ہم ایک پیسہ نہ دیں گے جب تک نہایت سختی سے اس کا حساب نہ لے لیں گے۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں، تو تشریف لایئے۔ ہمیں آپ ہی کی ضرورت ہے۔ اگر آپ سادہ چیک کی تلاش میں ہیں تو وہ کہیں اور تلاش کیجئے یہاں سے نہیں مل سکتی ہے۔

قوم کا فرض ہے کہ اس مصنوعی کانفرنس کی کڑی کا جالا آج ہی توڑ پھوڑ کے پھینک دے، اور ایک نئی علیحدہ کانفرنس کی بنا ڈالے۔ جو انجمن ترقی اردو سے کوئی واسطہ نہ رکھتی ہو۔ ہماری رائے میں لکھنؤ کے مرکز میں ایک نئی کانفرنس کا قایم ہونا موجودہ صورت میں بالکل مناسب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک دہلی کی سرزمین کی فرح بخش آب وہوا اسے راس آئے گی۔ ہماری رائے میں ہمیں آزمودہ را آزمودن جہل است پر عمل کرنا چاہئے۔ اور ایک پائدار اور مستحکم بنیاد قائم کرکے کانفرنس کا صدر دفتر دہلی میں کھول دیا جائے۔ دہلی کے خود فراموش افراد جو دہلی سے نیابت لیجانے میں ساعی تھے اور جنھوں نے ہفتوں دن کو رات اور رات کو دن کرکے ایک دشوار کام کیا تھا اُنہیں کو پورا حق حاصل ہے کہ اسی سرگرمی کے ساتھ اس کام کے لئے بھی اُٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ اُن کی مدد کرے گا۔ ایک مستقل تنخواہ دار سکرٹری اور عملہ۔ ایک مستقل ماہوار رسالہ ایک مستقل پریس یہ چیزیں از حد ضروری ہیں۔ چندہ کا روپیہ براہ

راست بنک بنگال میں جمع کرایا جائے۔ دفتر میں باقاعدہ حساب رکھا جائے اور حساب کی جانچ موقر اکاؤنٹینٹ کریں۔ ہماری رائے میں حضرات دہلی کو ایسٹر کی تعطیل میں یہ کام کرلینا چاہئے۔ اُن کی سرگرمی اور سچے قومی جوش اور حب الوطنی پر ہمیں پورا بھروسہ ہے اور ہم اس کار خیر میں اُنہیں کے سر اس کا سہرا دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ آنریبل راجہ صاحب محمود آباد۔ حضور بیگم صاحبہ بھوپال اور ایسے دیگر حضرات کی خدمت میں جو چندہ دینے پر آمادہ ہیں یہ امر ادب کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ اگر آپ کوئی رقم حضرت جالب دہلوی۔ حضرت ظفر الملک صاحب یا مولٰنا عبدالحق صاحب کی ذات کے لئے دینا چاہتے ہوں تو ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ہے آپ اپنے مال کے مالک ہیں اُسے جس طرح چاہیں صرف کریں۔ لیکن اگر آپ کی نیت قومی کام کے لئے چندہ دینے کی ہے تو نہ صرف انہیں تین حضرات کے ہاتھ میں بلکہ کسی متنفس کے ہاتھ میں ہرگز کسی حال میں ایک کوڑی بھی نہ دیں۔ اور جب تک باقاعدہ کام نہ شروع کیا جائے۔ باقاعدہ حساب نہ رکھا جائے۔ اور اس حساب کی جانچ معتبر اور موقر اکاؤنٹینٹ نہ کرتے ہوں۔ جب تک بجائے کسی شخص واحد کے ہاتھ میں روپیہ دینے کے آپ کو بنک میں روپیہ بھیجنا نہ پڑے آپ ہرگز کسی حال میں کسی کو نہ دیں۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہمیں فلاں صاحب پر اعتبار ہے اور فلاں صاحب پر نہیں ہے۔ یہاں اعتبار کا سوال نہیں ہے، باقاعدہ کام کرنے کا سوال ہے۔ اور اگر زبردستی اعتبار ہی پر بحث آپڑے تو ہم صاف

صاف یہ بھی کہہ دینے کے لئے تیار ہیں کہ کسی ایسے شخص کو جس کے پاس کوئی جائداد نہیں ہے۔ جس کی آمدنی سو پچاس سے زیادہ نہیں ہے کیا حق حاصل ہے کہ وہ لاکھوں روپئے کے معاملے میں قوم کو اس کے ہاتھ میں سادہ چک دیدینے پر مجبور کرے۔ کوئی بنک ایسا نہیں کرتی۔ کوئی سرکاری محکمہ ایسا نہیں کرتا۔ کوئی موقر باقاعدہ کام کرنے والی کمپنی یا کارخانہ ایسا نہیں کرتا۔ پھر قوم آخر ایسا کیوں کرے! یہ بالکل بے اصول اور بے قاعدہ طرز عمل ہے اور ہرگز ایسا نہ ہونے دیا جائیگا۔

۲ر جنوری ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں اخبار "ہمدم" لکھنؤ نے "اردو کانفرنس" کی روئداد شائع کی ہے۔ مگر میاں دیکھتی ہوں تو پھر "اردو کانفرنس" ہی بھری ہوئی ہے۔ نہ "انجمن ترقی اردو" کا نام ہے اور نہ اُن اعتراضات کا کوئی تذکرہ ہے جو اس بحث سے متعلق جلسۂ عام میں عائد کئے گئے تھے۔ اسی طرح سید سجاد حیدر صاحب کے اردو ٹائپ کی حمایت والے رزولیوشن کے متعلق لکھا ہے کہ سید صاحب نے اپنا رزولیوشن واپس لیا۔ یہ خبریں بالکل ہی غلط اور سرتاپا غلط ہیں البتہ اُنھوں نے اپنا اعتراض کسی آیندہ موقعہ پر پیش کرنے کے لئے فی الحال ملتوی کردیا تھا کیونکہ اُنہیں اس پر بحث کرنے کا کوئی موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔

اسی طرح اس زبردستی کی کانفرنس نے سارے کام بے قاعدہ اور بے ضابطہ طور پر کئے ہیں۔ ہر ہر رزولیوشن کے لئے ضروری تھا کہ حاضرین سے ووٹ (رائے) لیجاتی اور کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا۔ مگر کسی رزولیوشن پر حاضرین سے کوئی ووٹ نہیں لیا گیا۔ صرف تحریک تائید اور مزید تائیدات

ہوئیں اس کے بعد دوسرا رزولیوشن پیش کر دیا گیا۔ اِس طور پر جتنے رزولیوشن پیش کئے گئے تھے اُن میں سے ایک بھی پاس نہیں ہوا ہے اور ساری کارروائی مسترد کالعدم ناجائز اور باطل ہے۔

ہمیں کسی کا ڈر نہیں پڑا ہے۔ ہم بآوازِ بلند صاف صاف پکار کے کہتے ہیں کہ اب قوم رزاعت کی حالت سے نکل کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ بھیڑ بکریوں کے گلے کا برتاؤ کرنے کے جو لوگ عادی ہو رہے ہیں اُنہیں فوراً اپنا طرزِ عمل بدلنا چاہیئے۔

سیّد جالب ہوں یا حضرت جبرئیل مگر جب وہ اس جماعت کے سامنے آئیں تو اپنی حد پہچان کر آئیں۔ قوم اندھی بن کر اُن کے پیچھے پیچھے چلنے کے لئے کسی حال میں نہ تیار ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ہمارا کام باقاعدہ طور پر بحیثیت ایک ادنیٰ فرزند اور خادم قوم کے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو شوق سے کریں اُن کی جگہ ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ مگر برعکس اس کے اگر وہ قوم کے مخدوم بن کر اسٹیج پر تشریف لانا چاہتے ہیں اور قوم کا نام لے کر صرف اپنی ذاتی رائے اور اپنے خیال کے غلامی میں قوم کو مقید کرنا چاہتے ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ فوراً سر جھکا کر پیچھے ہٹ جائیں اور جگہ خالی کر دیں۔ قوم کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی غلامی کے لئے تیار نہیں ہے۔

بزم اردو امرتسر اور اسی طرح کی اور انجمنوں کو چاہیے کہ اپنے کو اس مفروضہ "اردو کانفرنس" کے جال میں پھنسنے نہ دیں اور پہلے معاملات کی اصلیت دریافت کر لیں تب آگے بڑھیں۔

عاجزہ نے جو رزولیوشن کانفرنس میں پیش کرنے کی غرض سے بھیجے تھے اُنکی لفظ بہ لفظ نقل یہ ہے۔

رزولیوشن نمبر ۱۔ اس کانفرنس کی رائے میں اُردو علم ادب کی ترقی اور توسیع کے لئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ انگریزی اور دیگر زبانوں سے مختلف علوم اور فنون کی مستند کتابوں کے ترجمے اُردو زبان میں کرائے جائیں۔ یہ کام حسب دلخواہ اور بلا تضیع اوقات اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ترجمہ کرنیوالوں کا مناسب انتخاب کیا جائے اور اُنہیں اُن کی دماغ سوزیوں کا پورا اور معقول صلہ دیا جائے۔ لہٰذا اس کام کے انجام دینے کے لئے ایک منتخب کمیٹی کانفرنس کی قائم کی جائے جو مناسب کتابوں کا انتخاب کرے اور ہر کتاب کے ترجمہ کے لئے ایک خاص مؤلف کو ذمہ دار قرار دے۔ معقول رقم اجرت اور مناسب میعاد مقرر کردے۔ مؤلفین کا انتخاب اُن کی پہلی تالیفات پر نظر ڈال کر کیا جائے اور فارم ذیل کی رسید بہیاں چھپوائی جائیں جن کا نصف حصّہ دفتر میں محفوظ رہے اور نصف حصّہ حوالہ مولفین کیا جائے۔ تاکہ اِس کام کی نگرانی کا معقول انتظام رہے۔

نمبر سلسلہ۔ نام کتاب۔ تعداد صفحات۔ نام مؤلف۔ میعاد معینہ۔ اجرت معینہ

رزولیوشن نمبر ۲۔ اِس کانفرنس کی رائے میں اردو علم ادب کی ترقی اور توسیع کے لئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ موجودہ اخبارات و رسالوں میں سے جو جو پرچے اُردو علم ادب کی خاص طور پر خدمت کر رہے ہیں اُنکی ایک فہرست بنائی جائے اور کانفرنس اس فہرست کو اخباروں اور رسالوں

کے ذریعہ سے قوم کے سامنے پیش کرکے ان کی توسیع اشاعت میں مدد دیکر
ان کی مالی حالت مستحکم بنا دینے کی درخواست کرے۔ ان رسالوں اور اخبارات
کا انتخاب ایک منتخب کمیٹی کانفرنس کے سپرد کیا جائے۔

نوٹ فائدہ یہ ہوگا کہ اخبار اور رسالہ اپنی حالت درست کرنا شروع کردیں گے اور
رفتہ رفتہ سب اعلیٰ مدارج پر پہنچ جائیں گے زبان کی خدمت کا شوق سب کو
پیدا ہو جائے گا۔ اگر اس میں کچھ تھوڑی بہت رقابت پیدا ہو جائے گی تو ترقی کے
لئے ایسی گھوڑ دوڑ کی ضرورت ہے۔ جو آگے رہیگا۔ بازی اسُی کے ہاتھ
رہے گی۔

رزولیوشن نمبر ۳۔ ملک میں بہت حضرات ایسے موجود ہیں کہ اچھے اچھے ترجمے
کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر کافی سرمایہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے اشاعت
کا بار برداشت نہیں کرسکتے اور اس وجہ سے اس جانب مائل نہیں ہوتے ہیں۔
بہت سی کتابیں ایسی موجود ہیں جو چھپ چکی ہیں مگر مؤلفین کی لاپروائی یا
سرمایہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُن کی اتنی اشاعت نہیں ہونے پاتی ہے
جتنی کہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ان دقتوں کو رفع کرنے کی ضرورت سے
کانفرنس کرتی ہے کہ اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے اعلان عام کیا
جائے کہ جو جو حضرات اچھی اچھی کتابوں کے ترجمے کریں گے انکا حق تالیف
معقول معاوضہ دیکر کانفرنس خرید لے گی۔ اور اپنے اہتمام سے اُن کی اشاعت
کا معقول انتظام کرے گی۔ اس طرح جن کتابوں کی کافی اشاعت بوجہ عدم
موجودگی کافی سرمایہ کے ابتک نہیں ہوسکی ہے ان کا حق تالیف بھی معقول

قیمت دے کر کانفرنس خرید کر لینے پر آمادہ ہے۔

رزولیوشن نمبر ۴ - اس کانفرنس کی رائے میں کانفرنس کا صدر دفتر مستقل طور پر لکھنؤ میں قائم کیا جائے۔ اور ایک مستقل تنخواہ دار سکرٹری مقرر کیا جائے۔ جس کی زیر نگرانی دفتر کانفرنس کا سارا کام رکھا جائے۔ اور ایک مستقل ماہوار رسالہ جس میں کانفرنس کی کارروائیوں کی اشاعت ماہ باہ بلاناغہ ہوتی رہے۔ کانفرنس کی جانب سے شائع کیا جائے۔ کانفرنس کا سکرٹری اس رسالہ کا ایڈیٹر قرار دیا جائے۔ اور بر دست ایک مختصر سا مطبع بھی رسالہ کی اشاعت اور کانفرنس کے سرکاری کاغذات کے چھاپنے کے لئے زیر نگرانی سکرٹری رکھا جائے۔ سکرٹری کی تنخواہ معقول مقرر کی جائے تاکہ کانفرنس کا اقتدار قایم ہو۔ اور سکرٹری کے دفتر کے لئے مناسب اسٹاف دیا جائے۔

رزولیوشن نمبر ۵ - کانفرنس کی رائے ہے کہ ہر سال دسمبر کے ہفتہ اخیر میں ایک طلائی تمغہ اس اخبار یا رسالہ کو عطا کیا کرے جس نے زبان کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے اور ترقی دینے میں سب سے اچھی اور بیش قیمت خدمات انجام دی ہوں۔ پہلے سال کا تمغہ محض سال ہی بھر کی خدمات پر محدود نہ ہو گا سالہائے مابعد کے تمغے صرف ایک سال کی خدمات کے اعتبار پر دیئے جائینگے کانفرنس کی منتخب کمیٹی اسکا تصفیہ کرے گی۔ اور اس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ اس انتخاب کے دائرہ عمل کی وسعت کے اندر سارے ہندوستان کے اردو اخبار اور رسالے داخل سمجھے جائیں گے۔

رزولیوشن نمبر ۶ - اس کانفرنس کی رائے ہے کہ اردو زبان کی

ترقی کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ اس تحریک کو ایک کامیاب اور بارآور تحریک بنائیں۔ ہماری پہلی منزل کا مدار ہماری مالی حالت کے قابل اطمینان ہونے پر ہے۔ زبانی ہمدردی سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ لہٰذا حامیان اور بہی خواہان اردو علم ادب اپنی ایک ایک مہینے کی آمدنی اس فنڈ میں داخل کریں۔

رزولیوشن نمبر ۲۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ کانفرنس کے آیندہ سالانہ اجلاس کے لئے ہمارے صوبہ کے مشہور ادیب عالی جناب آر۔ پی۔ ڈیوہرسٹ صاحب ڈسٹرکٹ جج ضلع گونڈہ بشرط ان کی منظوری کے میر مجلس منتخب کئے جائیں۔ اور کانفرنس صاحب ممدوح سے اس بارہ میں باقاعدہ تحریک کرے۔

آزاد بیگم

معاونین کا شکریہ۔ اب تک ہم سے یہ اہم فروگذاشت ہوتی رہی کہ معزز معاونین رسالہ جب رسالہ کے نئے خریدار پیدا کرتے تھے۔ تو سوائے کی تحریرات کے ہم نے رسالہ کے ذریعہ سے انکا شکریہ کبھی نہیں ادا کیا۔ حالانکہ ایسا ہونیکی ضرورت تھی۔ پرانی روشنی کو بدل کر ہم اپنی معزز بی بی نعیمہ خاتون صاحبہ بنت عالیجناب خان بہادر قاضی عزیزالدین احمد صاحب ناظم ریاست دھولپور اور محترمہ بلقیس بیگم صاحبہ حصار پنجاب کے تہ دل سے مشکور ہیں۔ کہ دونوں معزز بہنوں نے اسی مہینہ کے اندر دو دو نئے خریدار عنایت فرمائے ہیں۔ اور توسیع اشاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ پچیس خریدار اس مہینہ میں اور نئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان سب معاونیوں کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

عاجزہ (ایڈیٹر)

معزز اخبار اور رسالے مضمون ذیل کی نقل شائع فرما کر عاجزہ ایڈیٹر کو مرہون منت فرمائیں۔

شیعہ کانفرنس شیعہ کالج اور اسلام

(آزاد صاحب کی نظر ثانی کے بعد)

ہم نے آجتک شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج کے متعلق قطعی سکوت سے کام لیا ہے۔ علم سیاست مدن کا یہ ایک کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ کسی قوم کی متحدہ قوت اگر دو یا کئی جدا گانہ اور ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ حصّوں میں اس طرح پر تقسیم ہو جائے گی کہ ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہ رہے اور دونوں اپنے اپنے نقطۂ خیال کے موافق ایک دوسرے سے بالکل ہی بے واسطہ ہو کر کام کریں تو قومی اتحاد کا شیرازہ ضرور پراگندہ ہو جائیگا اور ابتری پھیلنا اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ انگریزی زبان میں اس طرح پر ابتری پھیلنے کا نام سیاسی اصطلاح میں (DISINTEGRATION.) ہے۔ ہاں البتہ یہ اور ہی بات ہے کہ قوم یک دل و یک زبان ہو کر اتفاق سے اپنا کام کئی مختلف شعبوں میں تقسیم کر دے مگر وہ سب مختلف شعبجات ایک مرکزی قوت کی تابع رہکر کام کریں اسکی عام فہم مثال یہ ہے کہ مرکزی قوت قوم کے دماغ کا کام دے باقی سب شعبے دل جگر گردہ۔ معدہ وغیرہ وغیرہ بنکر اپنے اپنے مختلف فرائض جُدا جُدا کریں مگر ایک دوسرے سے متفق ہو کر ایک دوسرے سے قریب ترین رشتہ یگانگت رکھکر ایک دوسرے سے صوری اور معنوی تقویت حاصل کرے۔ اگر ایسا رشتہ اتحاد اور صوری و معنوی تقویت پیدا نہیں ہے تو قومی ہستی کا وجود معرض خطر میں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایک جسم کے مختلف اعضا کاٹ کاٹ کر ایک دوسرے سے جُدا جُدا کر دیں اور پھر بھی یہ تمام اعضا اسی طرح اپنے کام انجام دیتے رہیں جس طرح متحدہ حالت میں وہ انجام دیا کرتے تھے! کیا یہ بات ممکن ہے کہ گھڑی کے مختلف پرزے علیحدہ علیحدہ نکال کے رکھدیئے جائیں اور پھر بھی وہ گھڑی چلتی اور برابر وقت بتاتی رہے! یہ نکات ہیں جنپر غور کرنیکی ضرورت تھی مگر افسوس کہ غور نہیں کیا گیا۔

اگر شیعہ کانفرنس کا ظہور اس طرح پر ہوا ہوتا کہ شیعہ و سُنی فرقہ جات جو تعلیمی کانفرنس میں شریک ہیں سب نے اتفاق رائے کر کے شیعہ کانفرنس کا ایک شعبہ علیحدہ کر دیا ہوتا اور وہ شعبہ بھی اُسی مرکزی قوت کا جزو لاینفک رہتا جسمیں شیعہ اور سُنی عنصر کا عطر مجموعہ موجود ہوتا تو نہ صرف یہی کہ کوئی نقصان نہ تھا بلکہ برعکس اس کے پہلے سے وہ چند زیادہ اور پہلے سے دہ چند اچھا کام ہونا شروع ہو جاتا۔ اور یہ شعبہ بجائے اسکے کہ ہمارے ضعف کی دلیل ثابت ہوتا ہماری قوت کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتا۔

جو رشتہ شیعہ کانفرنس کو اسلامی کانفرنس سے ہے وہی رشتہ شیعہ کالج کو اسلامی کالج سے ہے۔ اور جو باتیں شیعہ کانفرنس کے متعلق عرض کیگئی ہیں وہی خفیف تبدیل الفاظ کے ساتھ شیعہ کالج کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہیں۔

ہم نے دلی رنج اور حد سے زیادہ صدمے اور افسوس کیساتھ بھن نذر سجاد حیدر صاحبہ اور قبلہ مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب کے خطوط جو ہمدم میں شائع ہوئے ہیں پڑھے اگر اس وقت تک شیعہ کانفرنس قایم نہ ہو چکی ہوتی اور شیعہ کالج کے قایم کر لینے کا مستقل ارادہ نہ کر لیا گیا ہوتا تو ہم ضرور رائے دیتے کہ بھائیو ایسا نہ کرو۔ یہ کیا ستم ہے کہ ایک طرف تو ہم ہندو اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لئے جان لڑا رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے گھر ہی میں پھوٹ پڑ جائے اور شیعہ اور سُنی ایک دوسرے سے جدا ہوتے نظر آئیں! اللہ نکرے اگر ایسا ہوا تو نہ صرف یہ ہمارا قومی ادبار ہوگا بلکہ ہماری قومی پستی کی قبر اُسیوقت کھد کر تیار ہو جائیگی۔

ہماری رائے ناقص میں یہ وقت ایسے مضامین شائع کرانے کا نہیں ہے جیسے کہ شائع ہوئے ہیں۔ ایسے مضامین اُسوقت شائع ہو سکتے تھے جسوقت کہ شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج قائم نہیں ہوئے تھے۔ اب ایسے مضامین شائع کرنیکا وقت نہیں ہے اسوجہ سے کہ اگر اُسوقت شائع ہوتے تو ممکن تھا کہ ہمارے شیعہ بھائی ان نکات پر غور کر کے اپنی رائے میں کوئی ترمیم کر لیتے۔ اور ان مضامین سے فائدہ پہنچنے کی اُمید تھی۔ مگر برعکس اس کے اب فائدہ پہنچنا تو درکنار سوا نقصان اور سخت نقصان کے

اور کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا۔

ہماری رائے ناقص میں شیعہ کالج کے علوی کالج کے نام سے پکاری جانیسے بھی کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ شیعہ کالج شیعہ کالج ہی رہیگا چاہے آپ اُسے علوی کالج کہیں یا شیعہ کالج۔ جس بات کی کمی اوپر ظاہر کی جا چکی ہے وہ محض تبدیل نام ہی سے پوری نہیں ہو سکتی۔ پھر نام کی بحث چھیڑنے سے کیا فائدہ ہے؟ ایک فعل عبث ہے دیکھئے ہمارے ہندو برادرانِ وطن پہلے کس شد و مد سے کوشش کر رہے تھے کہ ہم مسلمان جُداگانہ انتخاب کی بحث چھیڑنے سے باز رہیں۔ اُنہیں اس بات کا یقین کامل تھا کہ اگر مسلمان جُداگانہ انتخاب کی کوششوں میں کامیاب ہو جاویں گے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض اور مقاصد جُداگانہ ہو جانے کے سبب سے دونو قوموں میں سخت مخالفت پیدا ہو جائیگی۔ اور یہ نفاق پھر کسی کے مٹائے نہ مٹے گا۔ یہ بالکل دوسرا ہی سوال ہے کہ آیا اُنکا یہ یقین صحیح تھا یا غلط۔ مگر جب ہندو بھائیوں نے دیکھا کہ مسلمان اس پر اڑے ہوئے ہیں تو اُنہوں نے چُپکے سے ان کی بات مان لی۔ اسوجہ سے کہ وہ جانتے تھے کہ اب مخالفت کئے جانا ہی مضرت رساں ثابت ہوگا اور یہی مخالفت دوامی نفاق کا باعث ہوگی۔

ہمیں بالکل انہیں واقعات کی روشنی میں شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج کو دیکھنا چاہیے اگر ہم نیک نیتی سے باور کرتے تھے کہ شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج۔ مسلمانوں کے دونوں فرقوں کو دو مختلف اغراض اور مقاصد میں تقسیم کر کے نفاق کا باعث ہوں گے تو اب اس بحث کو طول دینے کا وقت باقی نہیں رہا۔ شیعہ کانفرنس عالم خیال کے برزخ سے نکلکر عالم وجود میں ایک جیتی جاگتی شکل میں جلوہ گر ہو چکی۔ شیعہ کالج کی بنیاد بھی اتنی گہری پڑ چکی ہے کہ اب اُسکا متزلزل ہونا امکان سے خارج نظر آتا ہے۔

ہم نے مانا کہ اگر بجائے دو کانفرنسوں کے ایک ہی کل نفرنس ہوئی یا دو کانفرنسیں ایک ہی مرکزی قوت کی تابع ہو کر کام کر رہی ہوتیں۔ اگر بجائے شیعہ اور اسلامی کالج کے دونوں اسلامی ہی کالج ہوتے تو اس سے بڑھ کر کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ دو کانفرنسیں ہوتیں تو ایک دوسرے سے بالکل ہی بے واسطہ اور بے تعلق ہوتیں۔ دو ہی نہیں ذاتی بنیاد

اور کالج ہوتے مگر اُن سب کا نظام ایک مرکزی قوت کے زور پر چل رہا ہوتا اور یہ مرکزی قوت شیعہ اور سُنیوں کی متحدہ قوت ہوتی تو ہماری قومی ترقی کی رفتار کی سرعت فوراً بڑھ جاتی۔ مگر یہ دُنیا ہر یہاں "ہوتا" اور "ہوتی" کے معنی کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ بے معنی اور لایعنی الفاظ ہیں۔ انہیں کام کرنیوالی قومیں نہیں جانتیں اور نہ ہمیں اسکا ذرا بھی خیال کرنا چاہئیے۔ آجکل کے زمانہ میں "اگر یہ صورت واقع ہوئی ہوتی تو اُس سے ایسا نتیجہ ظہور میں آیا ہوتا" پھر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ خیالی پلاؤ پکانا اگلے زمانہ میں میاں شیخ چلی ہی کا مشغلہ تھا۔ مگر بیسویں صدی کی کام کرنیوالی دُنیا نے انکے نام معزولی کا پروانہ جاری کر دیا ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کیا کس کس شکل و صورت میں واقعات ہماری پیش نظر ہیں اور ہمیں کیونکر اُن کا سامنا کرنا چاہئیے۔ دُنیا میں ہر کام ہماری بہترین توقعات کے موافق نہیں ہوا کرتا۔ بہت کم کام ان توقعات کے موافق ہوتے ہیں۔ بلکہ عموماً یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے کام تو خلاف توقع ہی ہو جاتے ہیں ہماری نزدیک اُنکا کیا انجام ہونیکی ضرورت تھی یا ہونا چاہئیے تھا یا ہونیکی اُمید تھی مگر اسکے بالکل ہی برعکس نتیجہ ظہور میں آگیا۔

اب شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج دونوں کا وجود (ACCOMPLISHED FACT.) ایک واقعہ ثبتہ کی شکل میں ہماری سامنے ہے اور ہمیں ان دونوں کو ایک واقعہ ثبتہ ہی قرار دیکر کام کرنا چاہئیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئیے کہ ان دونوں سے اختلاف کرنا صائب الرائی کی دلیل نہیں ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس کے برعکس ہو۔

کیا اس بات سے کوئی سمجھدار مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ شیعہ اور سنیوں میں اتفاق اور صوری و معنوی اتحاد قائم اور برقرار رکھنی ہی پر نہ صرف ہمارے قومی عروج قومی ترقی کا بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے قومی وجود ہماری قومی ہستی ہماری قومی حیات کا دارومدار ہے ہمارے لئے ہر حال اور ہر صورت میں قومی اتحاد ملکی اتحاد پر مقدم ہے۔ پہلے گھر میں چراغ جلالو تب مسجد میں جلانا چاہئیے۔ شیعہ بھائیوں کو کھو کر اگر ہمنے ہندو بھائیوں کو اپنا بنا بھی لیا تو یہ اتحاد ہمارے کس کام کا ہو سکتا ہے! کیا ہمارے جسم میں سے اگر ایک ہاتھ ایک پاؤں ایک کان کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے اور ہماری ایک آنکھ پھوڑ دیجائے تو ہم کسی کام کے باقی رہ سکتے ہیں! شیعہ و سُنیوں کی علیحدگی ہمارے قومی

وجود ہماری قومی ہستی کیلئے ایک ایسی ہی مثال ہو سکتی ہے۔

ہمنے مانا کہ ہمارے شیعہ بھائی سراسر غلطی پر ہیں۔ ہم نے فرض کر لیا کہ اس مسئلہ کے اصلی نکات وہ نہیں سمجھے ہیں۔ تو کیا یہی بات ہماری اُن سے مخالفت کی ایک معقول وجہ بن سکتی ہے؟ ہرگز نہیں حشر تک نہیں! ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ ہمارا معصوم ننھا منا چھوٹا موٹا پیارا پیارا بھائی مچل گیا ہے کہ ہم تو یہی لال کھلونا لینگے۔ ہم ہزار ہزار لاکھ لاکھ سمجھاتے ہیں مگر وہ ہماری ایک نہیں سنتا۔ وہ اپنا لال کھلونا ہی لیگا اور نہ دو گے تو روٹھ جائیگا۔ تو کیا ہم اپنے معصوم پیارے بھائی کو روٹھ جانے دینگے! ہم سے تو یہ نہ دیکھا جائیگا۔ پتھر کا کلیجہ کہاں سے لائیں!

ہمارے بڑے بھائی ہندؤں نے یہی سمجھ لیا ہمیں جداگانہ انتخاب کا لال کھلونا لے دیا وہ ہم پر ہنستے ہیں کہ ہم بات کی تہ کو نہیں پہنچے۔ ہم اُنپر ہنستے ہیں کہ وہ ہمیں ناسمجھ بتا رہے ہیں اب ہمارے چھوٹے بھائی (چھوٹے بھائی اسوجہ سے کہ جسطرح ہندو بھائی تعداد میں ہمسے زیادہ تھے اسیطرح ہم شیعہ بھائیوں سے تعداد میں زیادہ ہیں) اب ہمارے چھوٹے بھائی ہمسے شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج کا لال کھلونا مانگ رہے ہیں اور جو سلوک ہمارے بڑے بھائی نے ہمارے ساتھ کیا ہے وہی سلوک ہمیں بھی اپنے چھوٹے بھائی سے کرنا چاہیے۔ اگر ہم عقلمند ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نفاق کی بنا نہ پڑنے پائے اور بگڑی ہوئی بات فوراً بنجائے تو جس طرح ہنسی خوشی اُس جھگڑے کا تصفیہ ہو گیا تھا اسی طرح ہنسی خوشی یہ جھگڑا بھی طے کر دینا مناسب ہے۔

شیعہ کالج اور شیعہ کانفرنس سے مایوس ہونے کی ہمیں کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم آج ہی سے مخالفت سے دست بردار ہو جائیں اور محض اتنے ہی پر بس نکریں بلکہ شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج کے کام میں ہاتھ بٹا کر دونوں کو ایک چلتی ہوئی مشین کے چلتے پُرزے بنا دیں۔ وقت اور موقع ہمیشہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور جسطرح مسلم لیگ اور کانفرنس آخر ایک ہو گئی ہیں انشاللہ وہ دن بھی جلد آئیگا کہ شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج قومی کانفرنس اور قومی کالج کے ساتھ متحد ہو کر ایک ہو جائیں گے۔ ہماری کوششیں مخلصانہ۔ دوستانہ۔ ہمدردانہ مشفقانہ اور برادرانہ ہونا چاہیں۔ نہ کہ مخالفانہ۔ ایسی طرز عمل سے کامیابی ممکن ہے یہی طرز عمل اختیار کرنیکی ضرورت ہے۔ اور اسی پر ہمیں دل وجان سے آمادہ ہو جانا چاہئے۔

اب ہم اپنے معروضات ختم کرچکے "پیام اُمید" اپنا پیام سُناچکا۔ سوچو مت پس وپیش کرنیکی ضرورت نہیں ہو۔ شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ وقت ضائع نکرو۔ یہ کام کرنیکا وقت ہو۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ خیال سو نظر بحالات موجودہ شیعہ کالج اور شیعہ کانفرنس کیخدمت اسلام کی عین خدمت ہو۔ شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج کو چمکاؤ۔ شیعہ اور سُنی یک دل اور یک زبان ہوکر کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ چندہ کی فہرست کھلی ہوئی ہو۔ دامے درمے سخنے قدمے مدد کرو۔ قومی اتحاد قومی عروج اور قومی ترقی کی یہی شاہراہ ہو۔ اُٹھو۔ اُٹھو۔ اور آگے بڑھو۔ (عاجزہ آزاد بیگم)

نوٹ ۔ چندہ بھیجنے والے بہن بھائی براہ راست محترمہ نواب قمر جہاں بیگم صاحبہ سکرٹری کیخدمتمیں خاقان منزل۔ وزیر گنج لکھنوکے پتہ سو روپیہ بھیجیں "پیام اُمید" کوئی فہرست چندہ کھولنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ البتہ اگرچندہ بھیجنے والے حضرات چاہیں گے کہ ہم انکے اسماء گرامی اور تعداد رقوم عطیہ شائع کردیا کریں تو ہم اس خدمت کیلئے حاضر ہیں۔ **ایڈیٹر**

تنقیدات

عائشہ صدیقہ رض۔ یعنی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کی سوانحعمری مؤلفہ جناب مولنا نیاز محمد خاں صاحب۔ نیاز فتحپوری "پیام اُمید" کی تقطیع میں ۱۲۷ صفحہ کی کتاب۔ کاغذ سفید لکھائی چھپائی صاف زبان اور طرز ادا صاف اور عام فہم۔ ملنے کا پتہ:۔
ایڈیٹر صاحب رسالہ صوفی۔ پنڈی بہاء الدین۔ گجرات۔ پنجاب۔ قیمت فی جلد ۱۲ار۔

یہ کتاب سُنی اور حنفی نقطۂ خیال سے لکھی گئی ہے۔ مؤلف ایک ذیعلم بزرگ معلوم ہوتے ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے خلاف جہاں جہاں سوء ظن کا موقع پیدا ہوا ہے آپ نے تلاش اور فکر کی ہے کہ جہانتک تواریخ سے مدد مل سکے تواریخی واقعات کی روشنی میں صفائی سو دکھادیا جائے کہ اس موقعہ پر حضرت صدیقہ رض کے خلاف رائے قائم کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ بادی النظر میں مؤلف صاحب ان کوششوں میں ایک بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کام علمائے کرام کا ہے کہ اس کے متعلق حکم بن کر کوئی ناطق اور قطعی فیصلہ صادر فرمائیں۔ یہ کام ہمارا نہیں ہے

نہ ہمیں اتنا علم ہے اور نہ ایسی وسیع معلومات رکھتے ہیں نہ ہمارا فیصلہ ایسے امور میں قطعی ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں فیصلہ کرنے کا کوئی حق ہے۔ زبان کے اعتبار سے ایک آدھ جگہ کہیں کہیں کوئی لغزش اگر نظر آئی ہے تو ہم نے اسی کتابت کی غلطی سمجھکر نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ہم نیک نیتی سے یہی باور کرتے ہیں کتاب ہر حال میں قابل قدر ہے۔ اور قابل مؤلف کی عرق ریزی ہر طرح حوصلہ افزائی کے قابل ہے۔

ہمارے نزدیک خواتین اسلام میں سے مشاہیر کی سوانح عمری لکھنا ایک نہایت ہی نتیجہ خیز اور مفید مشغلہ ہے اور ہمارے ملک کے اہل قلم کو اس طرف ضرور متوجہ ہونا چاہئے۔ ہم ایسے حالات زندگی چاہتے ہیں جس میں فکر تلاش اور عالمانہ تجسس سے کام لیا گیا ہو اور اس پایہ کی سوانحعمریاں چاہتے ہیں جیسی یورپین وقائع نگار لکھتے ہیں۔ ہمارے مطالعہ کی راہ میں جو مشکلات ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر ہم عیسائی مولفین کی لکھی ہوئی کتابوں میں مشاہیر اور اکابر اسلام کے حالات دیکھنا چاہتے ہیں تو وہاں یہ عالم نظر آتا ہے کہ اسلام عیسائیت کی عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ عیسائیت کے تمام وہ اصول جو اسلام اور عیسائیت کے درمیان معرض بحث میں ہیں وہاں پہلے ہی بطور اصول مسلمہ مان لئے جاتے ہیں اسکے بعد آگے قدم اُٹھایا جاتا ہے۔ مثلاً مسئلہ تثلیث۔ حضرت عیسیٰ کا ساری دُنیا کا نجات دہندہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد آگے چل کر جہاں جہاں اسلامی عقائد سامنے آتے ہیں یا تو اُن کی توہین کیجاتی ہے یا سکوت اور خاموشی کے ساتھ اُن کو محض غلط اور ناقابل التفات سمجھ کر مولف صاحب آگے بڑھجاتے

ہیں۔ پس جس مؤلف کے دماغ میں یوں عیسائیت بسی ہوئی ہو۔ اس سے یہ اُمید رکھنا کہ اسلامی اصول اور اسلامی عقاید اور اسلامی روایات پر وہ ایک غیر جانب دار منصف ہو کر نظر ڈالے گا کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ خود ہی فرما سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیجئے انگریزی زبان میں معلومات عامہ کی کتابوں میں سے کوئی کتاب اُٹھا کے لفظ "محمدؐ" یا محمڈن (مسلمان) تلاش کیجئے اور دیکھئے مؤلف صاحب کیا لکھتے ہیں۔ لفظ "محمدؐ" کے مقابل میں فی صدی ننانوے کتابوں میں آپ کو یہ عبارت ملیگی "جزیرہ نمائے عرب کا نبی کاذب (نعوذ باللہ) جس نے پیغمبر ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ"

جن حضرات کے ملاحظہ سے عیسائی مؤلفین کا لکھا ہوا ترجمہ کلام اللہ گذر چکا ہے انہیں معلوم ہے کہ یہاں کتنی بے ادبی اور بے تمیزی سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً نزول آیات ربانی کا ذکر کرکے مولف صاحب فرماتے ہیں (نقل کفر کفر نباشد) کہ حضرت محمدؐ کا جو جی چاہا کرتا تھا کر گذرتے تھے۔ اور اپنے طرز عمل کو جاہل اہل عرب کی نظروں میں جائز اور حق بجانب قرار دینے کے لئے وحی تصنیف کر کرکے انہیں سُنا دیا کرتے تھے تاکہ وہ اعتراض نہ کر سکیں اور ساکت رہجائیں۔

یورپین مصنفین اور مولفین کی کتابیں پڑھ پڑھ کے ہم عادی ہو گئے ہیں کہ جو بات کسی کتاب میں ہمارے سامنے آئے اس پر مؤلف یا مصنف نے اسی عالمانہ مذاق سے ہر ہر پہلو پر اپنی ہمہ گیر نظر دوڑائی ہوا ور ہر ہر پہلو پر نظر کرتے وقت اس کی مشاق نظر سے کہیں کوئی بات ایسی نہ رہ گئی ہو جو

درحقیقت قابل تذکرہ تھی مگر اس پر مؤلف یا مصنف کی نظر نہیں پڑی۔ اور نظر پڑی بھی تو اوچھی اور سطحی نظر تھی۔ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی اور پرہی سے لوٹ آئی۔ یہ باتیں ہمیں اہل وطن کی کتابوں میں کبھی نہیں ملیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں پڑھ کر ہمیں کبھی سیری نہیں ہوتی۔ دل ویسا ہی پیاسی کا پیاسا رہجاتا ہے۔

پُرانے طرز کے بزرگوں کو ہم اگر ایک حد تک قابل معافی بھی قرار دے لیں تو ہمارے نئے طرز کے تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس معاملہ میں اُن سے اچھے نہیں ثابت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ شیخ عبدالقادر صاحب سابق اڈیٹر مخزن لاہور کا سفرنامہ روم لیجئے جس میں اُنہوں نے بڑے اہتمام سے بعض تصاویر ہاف ٹون بھی شامل کر دی تھیں اور جس کا اشتہار ایک مدت دراز تک "مخزن" میں شائع ہوتا رہا۔

مگر آخر وہ سفرنامہ کیا تھا؟ ایسا سفرنامہ تھا جسے سفرنامہ کہتے بھی شرم آتی ہے۔ یا شبلی صاحب مرحوم کا سفرنامہ ہی لیجئے۔ ایک بلند پایہ مؤلف سے ہم کیا اُمید رکھتے ہیں؟ اگر اُس کی نظر کوچہ گرد عوام الناس سے زیادہ باریک اور غائر نہیں ہے۔ اگر وہ ہر بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو اسکا تالیف اور تصنیف کے کوچہ میں قدم رکھنا ہی فضول ہے۔ اِن دونوں سفرناموں کے پڑھنے والے کی معلومات میں کوئی کار آمد اضافہ ہوتا ہے؟ خاک بھی نہیں!

مثال کے طور پر لیجئے۔ فرض کیجئے کہ ایک یورپین سیاح مثلاً بغداد پہنچا

اور وہاں کے حالات قلمبند کرنے بیٹھتا تو کیا کرتا؟ سب سے پہلے وہ نقشہ اپنے سامنے پھیلا کر آپ کو بتاتا کہ بغداد کہاں ہے۔ سطح سمندر سے کتنی بلندی پر ہے گرمی اور سردی میں یہاں تھرما میٹر کس کس ڈگری پر پہنچتا ہے۔ مردم شماری کیا ہے۔ کون کون قومیں کتنی کتنی آباد ہیں۔ اور ان کے باہمی تعلقات کیا کیا ہیں۔ یہاں کتنے مدرسے ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے کیونکر اور کس حد تک تعلیم پاتے ہیں۔ کس مضامین میں تعلیم ہوتی ہے۔ استاد کس قوم کس مذہب کس فرقے کے ہیں۔ طلبا کے ساتھ ان کا کیا سلوک ہے۔ اور تعلیم کا ملک پر کیسا اثر پڑ رہا ہے۔ یہاں کی تعلیم اور طرز تعلیم میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا نقایص ہیں۔ نقایص کی کیا اصلاح ہوسکتی ہے اور کیونکر۔ اسی طرح یہاں کے رسم و رواج۔ یہاں کا قانون اور اس قانون کا رعایا پر اثر آیا وہ اس سے خوش ہے یا نہیں۔ حکام کا رعایا کے ساتھ برتاؤ۔ رعایا اور حکام کے ساتھ کیسے مراسم ہیں۔ اسی طرح شہر کی صفائی۔ سڑکیں اور شاہ راہیں۔ تجارتی راہیں جو باہر سے ہیں۔ ریلوے لائن اور کہاں کہاں تک اس حصہ ملک پر اس کا اثر ہے۔ کون کون سی مخصوص اشیا تجارتی ہیں۔ کن کن قوموں سے تجارت جاری ہے مال کی آمد اور نکاس کی کیا صورت ہے۔ سالانہ درآمد برآمد کیا ہے۔ غیر ملکوں کی سفارت کا حال۔ جنگی کس ٹمس اور ٹیکسوں کا مفصل حال اور ان کا ملک کی تجارت پر اثر۔ ڈاک خانہ کا انتظام تار کا انتظام۔ فوج کا انتظام۔ مدارس حربیہ میں بحری اور بری تعلیم۔ فوج کے اقسام مدت، اور طریق تعلیم۔ مختلف وردیاں اور نشانات جنگ مصنوعی بری و بحری۔ تجارت کے صیغہ میں یہ دیکھنا تھا کہ کون

کون سی اشیاء ہاتھ سے بنتی ہیں کون کون کلوں انجنوں اور مشنریوں کے ذریعہ سے بنتی ہیں۔ انجن برقی قوت سے چلتے ہیں۔ یا بھاپ یا تیل سے۔ موٹر کے پرزے ہیں یا دخانی انجن کے سے۔ انجن کہاں کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی مرمت کہاں ہوتی ہے۔ اس کے چلانے والے انجنیئر ملکی ہیں یا غیر ملکی۔ ان کی تعلیم کہاں ہوتی ہے۔ اور کس طریق پر کیا معیار قابلیت ہے۔ اسی طرح تعلیم انجنیری اور فن انجنیری پر بحث کی جاتی۔ ڈائکٹری کا صیغہ اسی غائر نظر سے دیکھا جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر بجائے اس کے کیا کیا گیا ہے؟

فلاں تاریخ فلاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن کے ساتھ چاء پی۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آپ بڑے قابل آدمی ہیں۔ آپ جیسے قابل ہیں دُنیا خود دیکھ رہی ہے۔ دُنیا اندھی نہیں ہے۔

القصہ یہ ہیں ہماری مشکلات۔ اِن مشکلات کا حل یہی ہے کہ ملک میں اہل بصارت اور اہل نظر پیدا ہوں۔ ہماری پبلک کا مذاق بدلے۔ اور ہمارا ملک صحیح اور اصلی معنوں میں ترقی کرے۔ اللہ وہ دِن جلد لائے۔ دنیا بے صبری سے اُس دن کا انتظار کر رہی ہے۔

نظر بحالات موجودہ کتاب اچھی ہے۔ قدر کرنا چاہئے۔

دودِ دل

ایکہ رُخت بمن کشادایں درِ جنت و پری ۔۔۔ دیکہ زتو بمن رسید جامِ شراب کوثری

از کرم کریمیت حور بہ پہلوام نشست ۔۔۔ کز رُخ او بمن کشاد جلوۂ پیکرِ پری

دولتِ حسنِ روی او مایهٔ عیشِ ظاهرست — گنجِ کمال باطنش نازِ جمالِ دلبری

شعلهٔ عکسِ روی تو چون به پیاله ام فتاد — رنگِ رخت پیاله رخت باده پرید چون پری

ما به نقابِ چهره ات دور ز تو نمی شویم، — جلوه نما بعشوه‌ای تا به نقاب اندری !

روی خوشت حجاب گیر - دیدهٔ شوق پرده در — رخ بکدام سو نهی - رو بکدام کو بری

من ز بهشتم خجل کو بصنم کده رسید — آمدم از حرم تهی - تو به مغانه ام بری

چون در میکده زدم پیرِ مغان بمن رسید — عکسِ رخش بشیشه رفت - باده پرید چون پری

پا بگلم هوس چو کرد رختِ هوا ز سر فتاد — پای مرا چه لنگ ساخت دستِ تهی و بی زری

منکه سبک سرم کنون - دست بگیر و ره نما — خضرِ رهِ منم شود - رو بفگن به بهتری

منکه سبک پری من رو بنهد بساقِ عرش — لنگ بپا شود مگر گردشِ چرخِ چنبری

جامِ جهان نمای من هست بگردش آمده — بارِ خودی ز سر فگن بارِ هوای خودسری

جرعه‌ای کش ز جامِ جم - ز آبِ حیات جام زن — آبِ بقا تراست این جامِ شرابِ کوثری

جامِ خودی لنگ زن تا تو بمیکده رسی — حافظِ جامِ جم رسد - با تو ز مهر گستری

تو بجلادتِ خودی صیدِ هوس شدی اگر — دامِ مگس نهاده بود - پا بگلی چسان پری

جامِ خودی چشی اگر رو به فگن باهرمن، — هان که بدان نزدِ ترا میلِ هوای همسری

لافِ خودی زدن کجا شیوهٔ خاکیان بود — خاکِ درِ مغان شدن هست هوای بی سری

هر که ز خاکِ پای او سرمه کشید خاک شد — خاک بکیمیا رسید از رهِ لطفِ سروری

حیف که زعمِ باطلت یافت نه گوهرِ مراد — کشتیِ نای و نوش شد غرقِ گناهِ خودسری

خاکِ مرا چو کردئی ناز مراست سرورا — خاکِ درم تو کردئی باره و رسمِ سروری

اظهر بینوا شده خاکِ درت دلی چه غم، — خاکِ درت شدن بود تاجِ سرِ سخنوری

نعت آزاد

خوان دعوت

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ بغیر استاد کی مدد کے کھانا پکانے کے حق میں کمال کا درجہ حاصل کرلیں تو یہ کتاب ملاحظہ فرمائیے۔ اسے کتاب نہ سمجھئے لکھنؤ کے صاحب فن اہل کمال کے خاندانی نسخوں اور ساری عمر کے تجربات کا خزانہ سمجھیے۔ یہ فن لکھنؤ کے باہر کہیں خواب میں بھی نظر نہیں آتا۔ مگر اب م۔ب لکھنوی نے اسے عام کردیا۔ کھانا پکانا مستورات کا خاص فن ہے۔ زیر تعلیم لڑکیوں کے لیئے اس سے زیادہ مفید اور کارآمد دوسرا کوئی فن نہیں ہرگھر میں ایک کاپی ضرور ہونا چاہیئے۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ "پیام امید" لوہا منڈی۔ نولبستہ آگرہ

گودڑ کا لال

یہ کتاب مسلسل طور پر مدت سے اخبار شریف بی بی میں شایع ہوتی رہی ہے اور عام شائقین کی نظروں سے گذر چکی ہے۔ اس ناول کی مصنفہ ایک معزز خاتون ہیں اور اُن کی ہمت افزائی ہمیں ہر طرح منظور ہے۔ کتاب کا حجم دونوں حصے ملا کر ۹۰۰ صفحات سے زائد ہے قیمت تین روپیہ (للعہ) ہے۔

ملنے کا پتہ۔ مسس فضل علی صاحب مرحوم۔ ذریعہ جناب تحصیلدار صاحب فتح آباد ضلع

نظّارہ

یعنی ادب اردو کا ایک ماہوار رسالہ

یہی وہ نظارہ ہے جس کی تاب حضرت موسیٰ نہ لا سکے! یہی وہ نظارہ ہے جس کے پردے میں قدرت کی تجلیاں مخفی ہیں۔ دنیائے علم کے تماشائی کہاں ہیں آنکھیں کھولیں اور اس جام جہاں نما کی سیر کریں۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ ادبی۔ معاشرتی مناظر کا نظارہ نظارے ہی کے صفحات سے ہوتا ہے جو ہر مہینے آفتاب عالمتاب کیطرح میرٹھ سے نکلتا ہے اور دنیا میں ایک نئی روشنی پھیلاتا ہے۔

اہل نظر نظارے کو آئینہ کی طرح سامنے رکھیں اور علم کی جیتی جاگتی تصویروں کا (جن کو ملک کے مشہور اہل قلم مختلف رنگوں میں نظارے کے اوراق پر کھینچتے ہیں) تماشا دیکھیں قیمت کچھ بھی نہیں صرف تین روپیہ بھیجکر نظارے کی سیر ایک سال تک گھر بیٹھے ہوسکتی ہے نمونہ ۵ر کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔ منیجر رسالہ نظارہ شہر میرٹھ

شیکسپیر اردو نظم میں

محمود۔ شیریں میری پیاری رشک گلزار | ہے ہے تمہیں کیا ہوا ہے آزار
کیوں خشک یہ لب ہیں پنکھڑی سے | کمھلائے ہیں کیوں یہ گل سے رخسار
شیریں۔ پانی کی کمی کے ہیں یہ آثار | کمھلانا نہیں کچھ ان کا دشوار
ہے چشمہ چشم دیر سے بند | اشکوں کی نہیں ہوئی ہے بھرمار

فرمایئے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف نہ آئے تو ہمارا ذمہ۔ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جسے اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) نے اصل کتاب "مڈسمر نائیٹس ڈریم" سے لکھنؤ کی شستہ زبان اور گلزار نسیم کی بحر میں کیا ہے۔ یہ وہی ترجمہ ہے جس نے ہندوستان سے لندن تک شہرت پائی ہے۔ جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ اب جدید اشاعت خاص اہتمام سے نفیس کاغذ پر معہ مؤلف کی ہاف ٹون تصویر کے زیر طبع ہے جو صاحب اشاعت سے پہلے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے۔ انہیں رعائتی قیمت پر مل سکیگی۔

حجم تخمیناً ۲۰۰ صفحہ قیمت اصلی عہ رعائتی عہ ر
ایضاً معمولی سفید کاغذ پر بلا تصویر اصلی قیمت عہ ر رعائتی ۱۲ ار

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ یو۔ پی

فہرست مضامین رسالہ پیام امید ماہ مارچ ۱۹۱۷ء

امید کا پیام ـــــ "اٹھو ـــــ اٹھو ـــــ اور آگے بڑھو"!

پیامِ امید

نمبر ۱۹	اگرہ ۔ مارچ ۱۹۱۷ء	جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں جس حال میں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردوں کی اڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گذرے گا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

خانہ آبادی

(سلسلہ کیلئے گذشتہ نمبر ملاحظہ ہو)

نکاح کے ارکان ختم ہونے کے ساتھ ہی میاں اور بیوی کی دو ہستیاں دو جداگانہ

وجود ایک واحد متنفس کی شکل میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اور اسی مبارک ساعت سے
دوامی۔ خوشی۔ وسعت اور ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور دونوں کو اپنی
شرافت۔ ایثار اور خود فراموشی۔ نیکی اور نیک نہادی غرضکہ اپنے اپنے
بہترین ذاتی جوہروں اور خوبیوں کے چمکانے کا اصلی موقعہ شروع ہوتا ہے۔ نکاح
کے کمروں میں رحمت کے فرشتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور ارکان نکاح ادا ہوتے
ہی یہ فرشتے زن وشو کو اپنے پیروں کے سایہ میں لے لیتے ہیں تاکہ نیک نہادی
پاکبازی شرافت اور نیکی کی راہ میں ان کے محافظ رہیں۔ زن وشو کا پاک رشتہ
بہترین اخلاقی اوصاف انسانی کا سرچشمہ ہے اور اس کا رخ اللہ اور رسول
کی جانب ہے جن کے مقدس احکام کے اتباع سے یہ مبارک ارکان ادا
ہوتے ہیں۔ زن وشو ان میں سے ایک یا دونوں تقصیر وار ہیں اگر یہ نکاح رحمت
نہ ثابت ہو یا ان میں سے ایک یا دونوں کے لئے بجائے رحمت کے زحمت
ثابت ہو۔

مگر اسی کے ساتھ ہمیں یہ نہ فرض کرلینا چاہئے کہ نکاح ہوتے ہی ہم پر آپ سے
آپ بغیر ہمارے ہاتھ پاؤں ہلائے جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اسمیں
شک نہیں کہ نکاح کے ذریعے دوامی امن اور راحت حاصل کرلینا بہت ممکن
ہے مگر ہمیں یہ بھی نہ بھول جانا چاہئے کہ کامیابی کے بہترین توقعات کے ساتھ
ہی ساتھ ناکامی کے امکانات بھی موجود ہیں۔ ذکاوت۔ صداقت اور دانشمندی
ہی ہمارے بہترین رہبر ہیں۔ اگر ان رہبروں کا ساتھ چھوٹ گیا تو کامیابی کی
اصلی شاہ راہ سے متجاوز ہو کر ہمارا منزل مقصود سے دور نکل جانا ہر وقت

ممکن ہے۔

سب سے پہلا سبق جو اس منزل پر پہنچکر ہمیں اپنے لوح دل پر نقش کر لینا چاہیئے اس کا عنوان ہے "صبر۔استقلال۔ خلوص اور محبت" یا "خلوص اور محبت آمیز صبر و استقلال" دو جدا گانہ ہستیوں کا ایک واحد متنفس کی شکل میں تبدیل ہو جانا کسی بازیگر کا تماشہ نہیں ہے کہ چھو منتر کہتے ہی تبدیل ہیئت کر لے۔ اس کے لئے وقت اور وقفہ درکار ہے۔ اور اس وقفہ کا زمانہ "خلوص اور محبت آمیز صبر و استقلال" میں صرف ہونا چاہیئے اگر عقل سلیم کے مشورہ سے کام کرنا ہے۔ عقد سے پہلے میاں بیوی دونوں کو چاہے کیسی ہی اچھی طرح ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ چاہے کیسی ہی بے تکلفی اور خلوص دونوں میں رہا ہو مگر یقین مانو یہ بات بالکل ہی غیر ممکن ہے کہ شادی ہونے سے پہلے وہ ایک دوسرے کے عادات و اطوار۔ مذاق اور خواہشات۔ افکار اور خیالات سے پورے طور پر ماہر ہو سکیں۔ نکاح ہی ایک سحر حلال ہے جو دو افراد کے درمیان سے دوئی کا پردہ اُٹھا کے دو جدا گانہ ہستیوں کو ایک واحد وجود کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اور جب تک یہ دوئی کا پردہ درمیان میں حائل رہتا ہے یہ حد فاصل جُدا نہیں ہوتی یہ بات بالکل ہی غیر ممکن ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے اصلی وجود۔ اصلی شخصیت دیکھ لیں یا دوسرے الفاظ میں ایک دوسرے کے ذاتی خصوصیات۔ عادات اطوار خصائل مذاق۔ افکار خیالات اصلی رجحان حقیقی میلان طبع اور فطرت اصلی سے واقف ہو سکیں۔

ملک چین میں یہ رواج ہے کہ نکاح کے وقت سے پہلے شوہر اپنی

آیندہ بیوی کی صورت نہیں دیکھنے پاتا۔ نکاح کے وقت دولہن کو بہت سے کپڑوں کی تھون میں لپیٹ کر ایک کرسی نما الماری میں بند کرکے لاتے ہیں۔ جب یہ الماری دولہا کے گھر پہنچتی ہے تو اس کی کنجی دولہا کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔ وہ قفل کھولتا ہے۔ برقعہ کے تہیں ہٹاتا ہے اور پہلے مرتبہ دولہن کا منہ دیکھتا ہے چین کی طرح انگلستان میں دولہا اور دولہن ایک دوسرے کی شکل و صورت سے بالکل اجنب نہیں ہوتے انہیں بارہا ایک دوسرے کی صورت دیکھ لینے اور باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر دل کے اندرونی احساسات اور اصلی خیالات اصلی اور فطرتی میلان طبع اور مذاق تو اسی وقت صحیح طور پر معلوم ہو سکتا ہے جب دوئی کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے و وجدا گانہ وجود ملکر ایک بنجائیں۔ یہ بات بغیر عقد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی اپنے اصلی خیالات اور احساسات عمداً و قصداً دوسرے سے چھپائے رکھنا چاہتا ہو۔ یہ امر لازمی نہیں ہے کوئی اپنے اصلی مذاق اور خیالات کو بالقصد پس پردہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہر صورت میں تفرید صوری و معنی یعنی دو دلوں کا ملکر ایک ہو جانا اسی وقت ممکن ہے جب دونوں نکاح کے مقدس رشتہ سے وابستہ کر دیئے جائیں۔ بہت سی اندرونی ذاتی خوبیاں ہیں جو برسوں ملنے جلنے پر بھی معلوم نہیں ہو سکتیں اور نکاح ہو جانے پر پہلی مرتبہ علم میں آتی ہیں۔ بہت سی خامیاں۔ عادات اطوار و خصائل کی خصوصیات مذاق کی نیرنگیاں۔ مزاج کی باریکیاں ہیں جن کا پہلے کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور اب نکاح کے بعد پہلی مرتبہ نظر آنے لگتی ہیں۔

بیاہی زندگی کا یہی سب سے بڑا خطرناک موقع ہے اور بعض طبیعتیں اِن معلومات کا علم ہوتے ہی افسردہ ہو جاتی ہیں اور عجلت اور بے صبری کے ساتھ فوراً اِس نتیجہ پر پُہنچنا چاہتی ہیں کہ ہم سے اِس شادی کے معاملہ میں بڑی غلطی ہو گئی اور اسکا انجام ضروری اور لازمی ناکامی ہے۔ اُن کا دوامی خوشی اطمینان اور آسایش کا خواب نوشین فرار ہو جاتا ہے اور اُنہیں اب اصلاح کی کوششیں بالکل بے سود نظر آتی ہیں۔ حالانکہ یہی موقعہ ہے جس کے لئے اوپر بتایا گیا تھا کہ "خلوص اور محبت آمیز صبر اور استقلال" سے کام لو۔ عقل سلیم کو اپنا رہبر بناؤ۔ اور تمہاری فتح ہے۔ اگر تم اِس ناہمواری کی رائی کو پہاڑ بنا کر ہمت ہار بیٹھو گے تو یہ تمہارا اپنا قصور ہو گا۔ سچ پوچھتے ہو تو نہ یہ موقع دل افسردگی کا ہے اور نہ مایوسی کا۔ بلکہ برعکس اس کے اب بھی بہت ممکن ہے کہ تم اِن مشکلات پر فتح حاصل کر کے اپنی زندگی کو ایک بہترین مثالی زندگی کا نمونہ بنا سکو۔ دو مختلف دریا جو کوسوں منزلوں علیحدہ علیحدہ بہتے آئے ہیں آج وہ ایک خاص نقطۂ اتصال پر پُہنچکر ایک دوسرے سے مِل گئے ہیں۔ اس نقطۂ اتصال پر پُہنچتے ہی ایک زور و شور سے بہتی ہوئی تیز دہار کا دوسری سے ملنا۔ صورت ظاہر میں طلاطم۔ تموّج۔ برہمی اور شور و شغب پیدا کرتا ہوا نظر آئیگا۔ اور بادی النظر میں یہی معلوم ہوگا کہ یہ دو دہاریں کبھی ایک ہو کر نہیں بہ سکینگی۔ مگر ذرا تھم جاؤ۔ کچھ اور آگے بڑھ کر تماشہ دیکھو کہ کس پیار کس محبت اور کس خلوص سے دونوں آپس میں ملکر یوں ایک ہو گئی ہیں کہ اگر تم چاہو کہ انہیں پھر علیحدہ کر دو تو نہیں کر سکتے۔ اور نہ تم یہی تمیز کر سکتے ہو کہ کہاں سے کہاں تک پہلا

دریا ہے اور کہاں دوسرا۔ دیکھو دونوں کیسے ایک ہوگئے ہیں!

بعینہٖ یہی حال میاں اور بیوی کا ہے۔ دو افراد کی جُداگانہ ہستیاں تھیں ان میں سے ہر ایک کے عادات۔ مذاق۔ خیالات۔ احساسات جُدا جُدا تھے۔ دونوں ایک نقطۂ اتصال پر پہنچکر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اگر اِس نقطہ پر پہنچکر ایک دوسرے سے اتصال ہونے کے زمانہ میں بادی النظر میں کچھ ظاہری آثار کشیدگی۔ برہمی یا افراط و تفریط کے دکھائی دیں تو تم یہ نہ سمجھو کہ یہ نظارہ کوئی خلاف معمول دلشکن نظارہ ہے۔ نہیں بلکہ برعکس اس کے بالکل ہی فطرتی ہے۔ اور اس کا انجام آخر کار وہی ہوگا جیسا تم نے ابھی ابھی دو دریاؤں کے اتصال کے موقعہ پر دیکھا ہے۔ انگریزی ضرب المثل یاد رکھو کہ روما کی عظیم الشان سلطنت ایک دن میں نہیں بنی تھی۔ بشیک کافی مدت درکار ہے۔ اور تمہیں صبر اور استقلال سے کام لینا چاہیئے۔

میل جول اور محبت مارے باندھے کا سودا نہیں ہے۔ پیار اور اخلاص زبردستی پیدا کرنے سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ نرمی اور ملائمیت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں عجلت کا کام نہیں ہے۔ صبر اور استقلال کی ضرورت ہے۔ محبت کی راہ میں پہلی منزل یہ ہے کہ انسان "خودی" کو بھول کر خود فراموش بنجائے۔ "میں" اور "میرا" کا نام نہ آنے دے۔ خودغرضی۔ خود مطلبی۔ اپنا ذاتی فائدہ۔ تن آسانی سے دُور رہے۔ اپنے آرام اپنی آسایش پر دوسرے کے آرام دوسرے کی آسایش کو فوق دے۔ اگر کہیں کوئی چول ڈھیلی رہجائے۔ کوئی بات بگڑجائے۔ کوئی کام خراب ہوجائے۔ کوئی بدنمائی کی صورت نظر آئے تو دوسرے پر الزام رکھنے

کی عیوض اپنے ہی سر الزام لے لو۔ القصہ اعلیٰ درجہ کی شرافت۔ نرمی صلح جوئی۔ آشتی پسندی کا کام ہے۔ دو افرادی حیثیت کی روحوں کا دو قالبوں میں رہکر ایک ہو جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تعجیل اور بے صبری کا یہاں گذر نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ ایک سخت لفظ روڑا بن کر مہینوں تمہاری روحی ترقی کی راہ میں اڑا رہے گا۔ میاں اور بیوی دونوں کو مصمم عزم کر لینا چاہیے کہ ہم اس شادی کو ایک کامیاب شادی بنائیں گے۔ اور ہماری راہ میں جو جو رکاوٹیں حائل ہوتی جائیں گی ہم کبھی انہیں اپنی ترقی رفتار میں مانع نہ ہونے دیں گے۔ اگر دونوں فریق ایسا ارادہ کر لیں گے تو دونوں کی شخصی خصوصیات میں جو جو اختلافات ہوں گے وہی اختلافات ہی دونوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کا باعث ٹھہریں گے۔ اور جب یہ زمانہ دو روحوں کے ایک ہونے کا اخیر پر پہنچے گا۔ اور اتصال تکمیل پر پہنچ لے گا۔ چاہے یہ مدت کیسی ہی الم ناک یا پُر از خطرات رہی ہو مگر آخر انجام یہ ہوگا کہ سکون۔ اطمینان قلب۔ دوامی خوشی اور پائدار محبت حاصل ہوگی۔ (باقی آئندہ)

ترجمہ و اقتباس



تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

(سلسلہ کے لئے گذشتہ نمبر ملاحظہ ہو)

قصیؔ بن کلاب بن مرہ نامی ایک بزرگ جو فہیم۔ زیرک۔ دانشمند۔ صائب الرائے۔ بلند ہمت۔ عالی حوصلہ تھے جو سنہ عیسوی کی پانچویں صدی میں گذرے ہیں۔ یہ قبیلہ خزاعہ میں سے تھے اور ان کی شادی خانہ کعبہ کے متولی کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس شادی کا اصلی مقصد خانۂ کعبہ کا منصب "حاجب" حاصل کرنا تھا جس کا نام "سدانت کعبہ" تھا۔ قصی نے تجارت شروع کی اور اس میں فروغ حاصل کر کے دولتمند، اور صاحب عزت و ثروت ہوئے۔ ان کی اولاد میں کئی لڑکے نکلے جن کے اوصاف حمیدہ کی خوبیوں سے اس خاندان کا نام خوب چمکا اور عزت و رعب داب قائم ہوا۔ اب قصیؔ کے خسر کی وفات کا زمانہ آگیا۔ انہوں نے مرتے وقت وصیت کی کہ اُن کی لڑکی یعنی قصیؔ کی بیوی کو خانہ کعبہ کی خدمت سپرد کی جائے۔ قصیؔ کی بیوی نے یہ اعتراض پیش کیا کہ اس خدمت میں کعبہ کا دروازہ کھولنا اور بند کرنا شامل ہے۔ میں عورت ہوں۔ یہ کام میری طاقت سے باہر ہے۔ اس معقول عذر کی سماعت کر کے انہوں نے یہ خدمت اپنے بیٹے محترش کے سپرد کر دی۔ محترش نحیف الجثہ اور منحنی تھا۔ اس خدمت کی انجام دہی کے لئے طاقت کی ضرورت تھی۔ قصی کو موقع مل گیا۔ اور انہوں نے ایک

مسکن و شراب دیگر یہ خدمت خرید لی۔ اس واقعہ کی خبر قبیلہ خزاعہ کو ملی اور یہ حال سُنکر رشک حسد اور غیض و غضب کی آگ اُن کے سینوں میں بھڑک اُٹھی۔ انجام یہ ہوا کہ قبائل قریش اور خزاعہ میں اعلان جنگ ہو گیا۔ عرصہ تک جنگ جاری رہی اور بہت خونریزی ہوئی۔ آخرکار فریقین پنچائتی فیصلہ کے ذریعہ سے صلح کے طالب ہوئے۔ اہل قریش میں سے ایک موقر بزرگ ثالث مقرر ہوئے ان کا فیصلہ قصی کے حق میں ہوا۔ باہمی قرارداد کے موافق اس فیصلہ پر نزاع کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ خدمت ظہور اسلام کے بعد فتح مکہ کے زمانہ تک اہل قریش ہی کے خاندان میں رہی۔

کعبہ کی خدمت کی فضیلت اور اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خادم کعبہ حقیقت میں قوم کا مخدوم اور کعبہ کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ قصی کی دانشمندی اور حسن تدبیر نے اپنے اقتدار کی بنا مستحکم کرنے کی یہ صورت پیدا کی کہ قریش کے قبیلے کے اپنے تمام اعزا و خویش و اقربا کو خاص شہر مکہ اور حوالئے مکہ کے قریہ و دیار میں بسا لیا اور اس طرح زور پیدا کر کے رفتہ رفتہ اپنی قوت مستحکم کر لی حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ اہل قریش نے اپنے سارے معاملات میں قصی کو اپنا حکم اور سردار تسلیم کر لیا۔ قصے نے اپنے اعزا و خویش و اقربا کی املاک چار حصوں میں تقسیم کر دی۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے مقبوضات میں مکانات بنائے اور مستقل طور پر وہیں رہنے سہنے لگے۔ اس طرح مکہ کی حکومت مستقل اور مستحکم طور پر اہل قریش کے ہاتھ میں آگئی۔ قصی کے بعد اُن کے بیٹے عبد مناف اپنے باپ کے جانشین ہوئے۔ عبد مناف کے کئی لڑکے تھے۔ ان میں سے

ہاشم اور عبد شمس نے اپنی قابلیت اور دانشمندی کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ عبد مناف نے مرتے وقت وصیت کے ذریعہ سے خانہ کعبہ کی خدمت ہاشم کے سپرد کی۔ عبد شمس کے لڑکوں میں سے ایک کا نام اُمیہ تھا۔ یہ وہی لڑکا ہے جو آگے چل کر بنو امیہ کا مورث اعلیٰ بنا۔ اُمیہ کو خدمت کعبہ اپنے چچا ہاشم کے سپرد ہونے پر بڑا رشک آیا۔ اس رشک نے حسد کی صورت اختیار کر لی۔ اور حسد سے زیادہ نا اتفاقی پیدا ہوئی فساد کی بنا پڑی اور دونوں میں جُدائی کی نوبت آئی۔ ہاشم کو اپنے بھتیجے اُمیہ سے جُدائی گوارا نہ تھی۔ مگر اس باہمی نا اتفاقی اور اختلاف کی حالت دیکھ کر اہل قریش نے ہاشم کو مجبور کیا کہ اُسے جُدا کریں۔ ہاشم نے اس شرط پر جُدائی منظور کر لی کہ اُمیہ ہاشم سے پچاس اونٹنیاں لے اور بیس برس تک حدود مکہ کے اندر قدم نہ رکھے۔ اُمیہ نے یہ شرائط منظور نہیں کیئے۔ آخر کار عسفار کا رہنے والا کاہن خزاعی نامی حکم قرار پایا اور فریقین نے اُس کے فیصلہ ثالثی پر رضامند ہو جانے کا عہد کر لیا۔ خزاعی نے ہاشم کے موافق فیصلہ کیا۔ ہاشم نے اونٹوں کی قربانی کی اور دعوت عام دی۔ اُمیہ بیس برس کے لئے ملک شام کو چلا گیا۔ اور اس طرح پر بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے درمیان میں عداوت کی یہ تاریخی بنا قائم ہوئی۔ ہاشم کے بعد اُن کے بیٹے عبد المطلب خانہ کعبہ کے متولی مقرر ہوئے یہ وہی عبد المطلب ہیں جو ہمارے رسول مقبول صلعم کے جد امجد تھے۔

اوپر کے واقعات سے آپ دیکھ چکے ہیں کہ اہل قریش کو کس حد تک اقتدار حاصل تھا۔ اور کیونکر حاصل ہوا تھا۔ اب اس قبیلہ کی حکومت کا پورے طور پر

تسلط ہو چکا تھا۔ اہل قریش جس خاندان میں چاہتے تھے شوق سے شادی کر لیتے تھے۔ اور اُن پر کوئی شرائط کسی قسم کے عائد نہیں کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ غیر قبائل میں اپنی لڑکیاں نہیں بیاہتے تھے۔ اگر بیاہتے تھے تو اُس خاندان پر دیندار رہنے کے سخت شرائط لگاتے تھے۔ اہل قریش ہی نے حج کے فرائض اور ارکان مقرر کئے تھے اور حج کا فرض ہر شخص پر لازم قرار دیا تھا۔ یہ لوگ سارے اہل عرب میں موقر اور ممتاز تھے۔ اور ہر معاملہ میں انہیں خاص حقوق اور اختیارات سردار قوم کے حاصل تھے۔

(باقی آیندہ)

فقیر آزاد کی کھلی چھٹی جناب ایڈیٹر صاحب اخبار "وکیل" کے نام

جناب من۔

معزز "اخبار وکیل" میں جو مضمون نصاب تعلیم نسواں کے متعلق شائع ہوا ہے میری نظر سے گذرا۔ اس کے متعلق اپنے پریشان خیالات اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔

یورپ اور امریکہ کے نقطۂ خیال سے گھر کے اندر جو تعلیم دیجاتی ہے اس کا نام تعلیم نہیں ہے۔ چاہے وہ کیسی ہی اعلیٰ پیمانہ کی ہو اور چاہے کیسی

ی احتیاط کے ساتھ دی جائے۔ اُس تعلیم کا پایہ حرف شناسی سے کسی
حال میں بلند نہیں سمجھا جاتا۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے جس کی ہر شخص تردید
کرسکتا ہو۔ یہ ایک مسلمہ مسئلہ تعلیم کا سمجھا گیا ہے۔

مگر اس لکھنے سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ لڑکیوں کو گھر پر اچھی سے
اچھی ممکنہ تعلیم دیئے جانے کی تجاویز سے مخالفت کروں۔ یورپ اور ایشیائی
نقطہ خیال ہمیشہ سے جدا جدا ہیں اور ہمیشہ جدا جدا رہیں گے۔ پردہ کی رسم
ہمارے ملک میں ہے۔ یورپ میں نہیں ہے۔ اسلامی عقائد اسلامی روایات
اسلامی رسم ورواج یورپ سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ یہ سب باتیں قابل
لحاظ ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی ضرب المثل ہے کہ اگر ہمیں پوری روٹی
میسر نہیں آسکتی تو ہمارے لئے آدھی ہی روٹی ہزار غنیمت ہے۔ ان نکات
کو پیش نظر رکھ کر مجوزہ نصاب تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔

یورپین معیار کے مطابق یونیورسٹی میں قیام کرکے نامور پروفیسروں
کے خیالات سے مستفیض ہونا۔ وہاں کے وسیع اور ہمہ گیر کتب خانوں کے
خرمنوں کے خوشہ چینی کرلینا ہی تکمیل تعلیم کے لئے کافی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ
مختلف مہذب ملکوں کی سیر وسیاحت وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار
سے ذاتی واقفیت وہاں کے ملکی اور مالی حالات سے معلومات میں مفید اضافہ
ہونا۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بہترین عملی اصول سے ماہر ہونا کتابوں
کے ذریعہ سے جو معلومات بہم پہنچتی ہیں مشاہدات اور تجربات سے اُن کی تطبیق
کرنا وغیرہ وغیرہ تکمیل تعلیم کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔

مگر یہ یورپین مسئلہ تعلیم کا اصولی پہلو ہے جہاں تک اس کا تعلق طبقہ مستورات سے ہے عملی پہلو اس اصولی اور خیالی پہلو سے بہت مختلف ہے۔ باوجود اس اعلیٰ معیار تعلیم کے مثلاً انگلستان ہی کو لیجئے تو عورتوں کی تعلیم مردوں کی تعلیم سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی نسبت ہی نہیں پیدا کرتی۔ میری کارپلی یا مسز بسنٹ کے سے نمونے یورپ میں اتنے کمیاب ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ تربیت یافتہ عورات جو یورپ کے معیار کے موافق اعلیٰ تربیت یافتہ کہی جا سکیں اُن کی تعداد انگلستان میں شاید فی دس ہزار مردم شماری پر ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ حرف شناس عورات کا شمار البتہ بہت زیادہ ہے۔ اور یہی عورات سفرجیٹ طبقہ کی روح و رواں ہیں۔ عموماً انگلستان میں پڑھی لکھی عورات کم علم ہیں۔ معمولی طور پر لکھ پڑھ سکنے کی قابلیت بہتوں کو حاصل ہے۔ اور اُن کا مطالعہ قانون طلاق اور ناولوں تک عموماً محدود ہے۔

ہمارا مجوزہ نصاب تعلیم ہماری مستورات کی تعلیم میں ترقی کا سنگ بنیاد ہونا چاہیئے اور اسی نظر سے میں اُسے دیکھتا ہوں۔ نہ ایسی "ترقی" جس کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ایسی ترقی جو ہمارے مذہبی عقائد اور اسلامی خصوصیات کا قلع و قمع کر دے بلکہ ایسی ترقی جو اسلام کی ترقی کہی جا سکے۔ یہ نصاب ہماری مستورات کی تعلیم کی انتہائی حد نہیں مقرر کرتا ہے۔ بلکہ گھروں کی چار دیواری کے اندر رہکر بہترین ممکنہ تعلیم حاصل کر لینے کی راہ نکالتا ہے۔ اور ہمیں اسی نقطۂ خیال سے اس کے حسن و قبح پر اچھی طرح غور کر لینے کی ضرورت ہے۔

اتنا عرض کر دینے کے بعد اب میں مجوزہ نصاب تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔

نظم اردو میں آپ رباعیات اکبر داخل نصاب فرما رہے ہیں۔ مگر کیا آپ کے ملاحظہ سے وہ رباعی نہیں گذری ہے جسمیں یورپین خواتین گھڑی بنائی گئی ہیں کیا آپ نے نہیں خیال فرمایا ہے کہ مصنف کا اس سے کیا مطلب ہے! اگر آپ اس سم قاتل سے ہماری لڑکیوں کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ایسا ہی کیجئے آپ مختار ہیں۔ اس کے علاوہ سوا ایک خاص طبقہ کے جو حضرت اکبر کا کلام پڑھتا اور داد دیتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ اہل نظر اور اہل بصیرت سمجھے جاتے ہیں اُن کی رائے حضرت اکبر کے کلام کے متعلق کیا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض جو حضرت اکبر پر بجا طور سے عائد ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ گو آپ زبان پر قادر ہیں اور شاعر بھی ہیں مگر با ایں ہمہ نادانستہ طور پر اُردو زبان کے ساتھ آپ جیسی عداوت صرف کر رہے ہیں اُس کی نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکتی ہے اِس اجمال کی تفصیل سُنیئے۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ حضرت غالب مرحوم نے ایک مشاعرہ میں اپنا تصنیف کردہ سہرا سُنایا تھا۔ شامت اعمال سے اِس سہرے میں کہیں "ہمنبر" کا لفظ آگیا تھا۔ اِس اختراع سے مشاعرہ میں تہلکہ مچ گیا۔ نامی مشاعرہ تھا۔ دہلی کے تمام مستند استاد شریک مشاعرہ تھے غالب کے سے اُستاد کا کلام تھا۔ مگر اردو زبان میں "ہمنبر" کے سے معمولی مگر غیر مانوس لفظ کے آجانے پر قیامت برپا ہو گئی۔ پھر آگے بڑھے اور بڑھتے ۱۹۰۵ء تک پہونچئے۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر

نے دلگداز کے ایک مضمون میں "ایڈٹ کرنا" ترتیب دینے کے معنی میں
لکھا تھا۔ اس پر "اودھ پنچ" نے کالم کے کالم سیاہ کرکے دھر دیئے۔ ایک وہ دن
تھا اور ایک آج کا دن ہے ہم نے حضرت اکبر کو لیسنس دیدیا ہے کہ جب اور
جس طرح چاہیں جا اور بیجا برمحل اور بے محل اردو الفاظ کو کوٹ پتلون پہنا کرلاکے
اسٹیج پر کھڑا کر دیں۔ کیا آپ اسے زبان کی ترقی کہیں گے یا تنزل؟ بیشک
حضرت اکبر زبان اردو سے عمداً اور قصداً عداوت صرف نہیں کر رہے ہیں۔
مگر وہ عداوت صرف کر رہی ہو یا نہ کر رہی ہو دونوں صورتوں میں نتیجہ ہمیشہ یکساں ہی رہیگا
آپ دوست بن کر کسی کو زہر پلائیں تو بھی وہ مرجائے گا دشمن بن کر پلائیں
تو بھی مرجائے گا۔ زہر تو زہر ہی ٹھرا۔ اپنا کام ضرور کرے گا۔ آپ کی نیت
اچھی یا بری ہونے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ انجام کیا ہورہا ہے؟ ہم حضرت اکبر کی
بذلہ سنجی، شوخی، ظرافت اور چلبلے پن میں محو ہو رہے ہیں۔ اور حضرت اکبر کی
شاعری اردو زبان کے گلے پر کند خنجر پھیر رہی ہے۔ وہ زبان جو حضرت اکبر
کے اسٹیج پر قدم رکھنے سے پہلے دیسی عیسائیوں کی زبان کہلاتی تھی اب
رفتہ رفتہ ٹکسالی زبان کا جامہ پہننے پر مائل ہورہی ہے۔ اور اگر یہی لیل ونہار
قایم رہ گئے تو کیا عجب ہے کہ اب سے سو پچاس برس بعد ٹکسالی اردو کو بدخل
کرکے یہی گڈامی اردو ٹکسالی زبان بنجائے۔ اللہ وہ دن نہ لائے!

ان نکات کو پیش نظر رکھکر میں بلا خوف تردید صاف صاف کہوں گا
کہ حضرت اکبر کی زبان کا زہر اگر مردوں میں پھیل رہا ہے تو پھیلے۔ مگر للہ ہماری
معصوم مستورات کو اس زہر سے محفوظ رکھیئے۔ عورتوں کی زبان اسی وجہ

سے مستند مانی گئی ہے کہ مردوں کو باہر کے لوگوں سے ملنے جُلنے اور باتیں کرنے
کے موقع پیش آتے رہتے ہیں۔ مستند اور غیر مستند فصیح اور کریہہ مانوس اور
غیر مانوس الفاظ اُن کے کان میں پڑتے رہتے ہیں۔ کچھ عجب نہیں اگر اُن کی زبان
سے بعض وقت وہی الفاظ نکل جائیں جنھیں دن رات سُنتے رہنے کا اُنہیں
اتفاق ہوا کرتا ہے۔ مستورات اِس خدشہ سے پاک ہیں۔ مگر جس حال میں کہ آپ
ایسی کاواک اور گنجول اُردو اُن کے نصاب تعلیم میں داخل کریں گے تو نہ صرف
اُنہیں کی زبان کا بلکہ اُن کے بچوں کی بھی زبان کا اللہ ہی حافظ ہے!

اسی طرح نظم کے حصّہ میں ڈاکٹر اقبال کا ترانہ یا قومی گیت بحد ضروری اور قابل
پسند ہے مگر "شمع اور شاعر" کو ٹکسالی زبان میں داخل کرنا اُردو زبان کے ساتھ
سخت عداوت کرنا ہے۔ "ترانہ" کی زبان صاف سلیس دلکش اور سادہ ہے
"شمع اور شاعر" کی زبان ایسی اُردو ہے جو نہ فارسی ہے نہ اُردو۔ جس طرح
بے ضرورت انگریزی الفاظ اُردو زبان میں کھینچ لانا داخل عیب ہے اُسی طرح
حد معینہ سے زیادہ فارسی ترکیب اور فارسی طرز ادا کو اردو میں دخیل ہونے
دینا مذاق صحیح سے بعید ہے۔ اللہ کے فضل سے ٹکسالی اُردو کی نظمیں زبان میں
کثرت سے موجود ہیں۔ پنڈت جوالا شنکر مرحوم برقؔ کی "مثنوی بہار"۔ مولوی احمد علی
صاحب شوقؔ قدوائی کی بے نظیر نظم "عالم خیال" اور ایسی ہی درجنوں کتابیں
موجود ہیں۔ آپ خود انتخاب فرما سکتے ہیں۔ زمانۂ حال کی ٹکسالی اُردو صاف
سادہ اور سلیس ہے۔ ایک دلکش سادگی ہی اُس کا حسنِ خداداد ہے نہ یہاں
انگریزی کی بھرمار ہے نہ فارسیت کی بوچھار۔ آپ "عالم خیال" ہی کو دیکھئے۔

ساری مثنوی بے اضافت ہے۔ فارسی کا ایک لفظ بھی آنے نہیں پایا ہے ایک بار اسے پڑھیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر اقبال کی نظم "شمع اور شاعر" پڑھیے۔ جس میں اضافتیں ہی اضافتیں ہیں۔ نہ فارسی ہی۔۔۔ ہے نہ اردو ہی۔ بہر حال آپ جو کتاب داخل نصاب فرمائیں اس کی زبان تو کم سے کم ٹکسالی زبان ضرور ہونا چاہیے۔

نظم کے نصاب میں ڈاکٹر اقبال کا ترانہ بیشک ہر اعتبار سے ٹکسالی زبان میں داخل کر لینے کے قابل ہے۔ قومی ہمدردی کا ولولہ جوش میں لانے کا بھی یہ نظم ایک نہایت ہی مؤثر آلہ ثابت ہوگی۔ اسی کے ساتھ حضرت صفی لکھنوی کی قومی نظم بھی ضرور داخل نصاب فرمائیے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر اقبال کا ترانہ اور یہ نظم دونوں ہمارے بچوں کو ازبر کرا دینا چاہیے۔

آپ دونوں نظمیں ایک ساتھ پڑھیے۔ اس کے بعد کہیں کسی مقام سے چند اشعار ایک نظم کے سن کر ایک کاغذ پر لکھ لیجیے۔ اس کے بعد اس کے نیچے دوسری نظم کے چند اشعار لکھیے۔ اور دونوں کو بالمقابلہ پڑھ کے دیکھ لیجیے مثلاً

شمع اور شاعر

خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانند کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم

صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر،
تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
ہاں اسی شاخِ کہن کو پھر بنالے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر
کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

عالمِ خیال

میری خوشی تمہیں سے تھی نہ تم نہ اب خوشی مری
فراق چھین لے گیا رُلا کے سب خوشی مری
وہ دن خیال ہوگئے وہ راتیں خواب ہوگئیں
وہ دو دلوں کی راحتیں سب اضطراب ہوگئیں
نہ ان لبوں پہ وہ ہنسی نہ رُخ پہ اب وہ رنگ ہے
نہ روح میں وہ تازگی نہ دل میں اب اُمنگ ہے
شباب، رنگ، حسن، ان کی صورتیں بگڑ گئیں

گھروں میں لوٹ پڑ گئی تو بستیاں اُجڑ گئیں

تمہارے آنسوؤں کے داغ خط میں جس جگہ پڑے
وہ خط میں میرے دل میں آکے داغ بنکے رہ گئے

اب مثنوی بہار کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

ہر شے سے عیاں ہے نور اُسکا ہر رنگ میں ہے ظہور اُس کا،
جھیلیں، دریا، پہاڑ، چشمے اُس کی قدرت کے ہیں کرشمے
مرغانِ چمن سروں میں گاؤ، توحید کے زمزمے سناؤ
لہرو ہر پھر کے ہو عبادت جھرنو گر گر کے ہو عبادت
بس سجدے کو خم کرو شجر تو، جھک جاؤ شاخ بارور تو
مرغانِ چمن چہک اُٹھو تم، گلہائے چمن مہک اُٹھو تم،
گونج اُٹھو ثنا میں کوہسارو
گر پڑ کے دعا ہو کوہسارو

القصہ یہ ہے رنگ زمانۂ حال کی ٹکسالی زبان کا۔ غالب یا مرزا رجب علی بیگ سرور کے زمانہ کے رنگ میں اردو زبان کو رنگ کر آجکل کی دنیا کے سامنے پیش کرنا گھڑی کی سوئی کو اُلٹی پھیر کر چلانے کی کوشش سے کم نہیں ہے۔ کیا آپ اسے زبان کی ترقی کہہ سکیں گے۔ یا زبان کا تنزل ہر حال میں ترقی ہو یا تنزل۔ مگر اب سے سو پچاس برس پیچھے کی زبان کا اسٹیج

پر لاکر چاہنا کہ ٹکسالی زبان کا سارا نظام درہم وبرہم کردے کیونکر گوارہ کیا جاسکتا ہے ! ایسی زبان میں جو کلام شائع کیا جائے گا وہ زمانہ حال کے کلام کے ساتھ مخلوط کرکے داخل زبان نہیں کر لیا جاسکتا - وہ ہمیشہ اس سے علیحدہ رکھا جائیگا

اس کے بعد آپ کے نصاب تعلیم میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ جو بات سب سے پہلے ہماری مستورات کو سکھائی جانا چاہیے تاکہ وہ ہمارے بچوں کے ابتداء ہی سے ذہن نشین کرسکیں اس کا کوئی صاحب نام بھی نہیں لے رہے ہیں - وہ بات کیا ہے ؟

کیا وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بچہ بچہ حب وطن اور قومی جوش کے نشہ میں سرشار ہے - قوم اور ملک کے لئے جان دیدینا کوئی بات ہی نہیں سمجھتا - برعکس اس کے ہماری یہ حالت ہورہی ہے کہ قوم فروشی ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہورہا ہے - ہر بات میں اور ہر بات کے ہر پہلو میں ہم اپنا ہی ذاتی نفع ڈھونڈھتے ہیں - اور جس کام میں اسکی کوئی صورت نہ نکلے یا تو ہم اسمیں ہاتھ ہی نہیں لگاتے ہیں - اور اگر ہاتھ بھی لگاتے ہیں تو اپنی جیب گرم کرنے کی فکر کبھی ہمارے دل سے دور نہیں ہوتی - ہمارے ہندو بھائیوں نے مسٹر گوکھلے (یادش بخیر) کی بدولت "خدام ہند" کے سیکڑوں خود فراموش افراد پیدا کردیئے - کیا آجتک ہم نے ایک بھی پیدا کیا ہے ! ہم میں سے اگر اب تک ایک بھی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے تو آخر اس کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ بھی ضرور ہوگی - وہ وجہ کیا ہے ؟

وجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم وتربیت ایسے برے طریق پر ہوتی ہے کہ یہ سبق

ہمیں کبھی پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ ماں کا سب سے پہلا کام یہی سبق سکھانا ہے۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ اس تعلیم کے بہی شدید ضرورت ہے۔ آپ کہیں گے کہ ایسی تعلیم کے لئے آخر کیا پڑھائیں۔ اسکا مصالح کہاں سے آئیگا؟ اس کا جواب اخبار کے ذریعہ سے نہیں مل سکتا۔ صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ یہ ایسی شئے نہیں ہے جسے آپ کبھی نہ پا سکیں۔ بہت آسانی سے اس کا مل جانا ممکن ہے اگر آپ چاہیں۔ لیکن اگر آپ اسے کوئی اہمیت نہیں دے سکتے ہیں تو آپ مختار ہیں۔

ایک اور اہم بات اس نصاب کے متعلق غور طلب ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ شامتِ اعمال سے بعض اخباروں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ آئے دن ہماری عورتوں اور زیر تعلیم لڑکیوں کے کان میں یہ پھونکتے رہتے ہیں کہ مرد تمہارے حقوق کے غاصب ہیں۔ وہ ظالم ہیں اور تم مظلوم ہو۔ ہم ان اخباروں اور رسالوں کو بے دیکھے بھالے بیویوں اور لڑکیوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور یہ وبا ہمارے ملک میں بُری طرح پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ناتجربہ کار لڑکیاں نہیں سوچتیں کہ آخر اس کے کیا معنی ہوئے! کن مردوں کا اُن سے سابقہ رہتا ہے؟ بھائی۔ باپ۔ چچا۔ ماموں۔ خالو اور ایسے ہی عزیزوں سے۔ انجام کیا ہوتا ہے؟ بہن کو بھائی سے شکایت پیدا ہوتی تو بھائی کو بہن سے کیوں نہ پیدا ہو۔ بیٹی کو باپ سے شکایت ہوتی ہے تو باپ کو بیٹی سے کیوں نہ ہو! وغیرہ وغیرہ۔

القصہ ناخنوں سے گوشت جدا کیا جا رہا ہے۔ آپکا نصاب تعلیم اس

مرض کا کیا علاج تجویز کرتا ہے؟ کیا مریض کو بے دوا علاج چھوڑ کے مرض کو لاعلاج ہو جانے دینا آپ گوارہ فرمائیں گے۔ کیا آپ یہ دل خوش کن نظارہ دیکھنا پسند کریں گے کہ اب سے دس بیس برس بعد ہمارے ملک میں بھی انگلستان کی سفرجیٹ عورتوں کا مثنیٰ آ کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو آپ کا نصاب تعلیم آخر اس کا کیا علاج تجویز کرتا ہے۔ اس کا علاج بھی ہے۔ اور اگر آپ چاہیں تو آسانی سے آپ پا سکتے ہیں۔ آپ نہ چاہیں تو یہ بات ہی اور ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم میں ایک اور بڑا نقص یہ ہے کہ جب کبھی وہ ایک مہذب گھر کا خاکہ کھینچنے بیٹھتے ہیں تو وہاں کیا نظر آتا ہے؟ کانٹا چھری۔ کالر ٹائی۔ میز کرسی ڈائننگ روم۔ ڈرائنگ روم۔ باتھ روم۔ ہم نہیں کہتے کہ تم انگریزی طرز معاشرت سے عداوت رکھو۔ مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی نہیں مشورہ دے سکتے کہ تم ہمارے گھروں کو دیسی عیسائیوں کا گھر بنا دو۔ اچھی بات جہاں -- پاؤ بے تکلف لیلو۔ مگر سب سے پہلے اچھے اور برے میں امتیاز کرنا سیکھو۔ اسلامی تعلیم اسلامی عقائد اسلامی روایات اسلامی طرز معاشرت ہی کے ساتھ ہو تو اسلامی تعلیم ہے۔ غیر قوموں کی تقلیدی غلامی ہمارے لئے کسی طرح قابل فخر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ برعکس اس کے اہل نظر کے نزدیک اس کے ہمیشہ ایک ہی معنی ہوں گے۔ کیا ہمارے اسلاف بالکل ہی ناکارہ تھے؟ کیا وہ ہمارے لئے کوئی قابل تقلید نمونہ نہیں چھوڑ گئے؟ اگر چھوڑ گئے ہیں تو غیر قوموں کی تقلید کر کے ہم کیوں اپنے ہی طرز عمل سے اس بات کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں کہ ہمارے اسلاف ہمارے لئے کوئی قابل تقلید نمونہ نہیں چھوڑ گئے ہیں۔ اور مجبور ہو کر ہمیں غیر قوموں کی تقلید کرنا پڑتی ہے۔

ہمارے ہندو برادران وطن تعلیم و تربیت میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ مگر اس بر دستی کی "روشن خیالی" میں وہ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے! اس کا علاج بھی نایاب نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ توجہ کریں۔

پنجاب میں گھر گھر عام شکایت ہے کہ مدرسوں میں تعلیم پاکر لڑکیوں کے مذہبی خیالات ڈانواں ڈول ہونے لگے ہیں۔ ابھی تک ہمارے صوبہ میں یہ شکایت لڑکوں ہی تک محدود ہے۔ اس وجہ سے کہ ہمارا صوبہ تعلیم نسواں میں پنجاب سے بہت پیچھے ہے۔ محض چند مذہبی معلومات کی کتابیں پڑھا دینا اس خدشہ کی مدافعت کے لئے کافی نہیں ہے۔ ایک زبردست خارجی مدد کی بھی ضرورت ہے جو وقتاً فوقتاً پہنچتی رہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ خارجی مدد کہاں سے آئیگی؟ اسکا سامان بھی ملک میں موجود ہے۔ اگر آپ ادہر توجہ کرنا مناسب سمجھیں۔

تاریخ کے مضمون کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ چاہے آپ اور کوئی تاریخ رکھیں یا نہ رکھیں مگر مصر کے فاضل علامہ جرجی زیدان کی تاریخ "تمدن اسلام" ہرگز نہ چھوڑیئے۔ اس تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے روز بازار پریس امرتسر نے شائع کیا ہے۔ اور مولوی محمد حلیم صاحب انصاری رودلوی اسکے مترجم ہیں۔

دفتر رسالہ "پیام اُمید"
آگرہ - ۲۵ جنوری ۱۷ء

فقیر
اظہر علی آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس
(لنڈن)

"اردو کانفرنس" کا آسیب

فروری نمبر میں ہم "اردو کانفرنس" کے چہرہ سے نقاب الٹ چکے ہیں اور ناظرین کرام اس نقاب پوش چہرہ کی اصلی شکل وصورت سے آشنا ہو چکے ہیں۔ اس اشاعت میں ہم حضرت "یاس" کی چٹھی کی نقل شائع کرتے ہیں جو "ہمدم" کی اشاعت مورخہ ۱۹ جنوری ۲۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس چٹھی میں فقرات ذیل بالخصوص قابل توجہ ہیں۔

(۱) مجھے اس کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع تو مصلحتاً نہ دیا گیا۔

(۲) استقبالی کمیٹی کے "معتمد کارکن" منشی اسحاق علی علوی المعروف بہ ظفر الملک صاحب کے دستخط سے اخباروں میں اشتہار دیا گیا تھا کہ تمام بہی خواہان اردو اس جلسہ میں شریک ہو کر ترقی کی تجویز پیش کریں۔۔۔ انہیں بزرگوار ظفر الملک بہادر کے دستخط سے بعض مخصوص حضرات کے پاس دعوت کے خطوط بھی پہونچے تھے مگر لکھنؤ کے عمائد شائد اس قابل نہ سمجھے گئے کہ خاص طور پر بلائے جاتے۔ چنانچہ حضرات اوج۔ شیدا۔ جاوید۔ انجم۔ افضل۔ فصاحت احسن۔ آرزو۔ بیخود موہانی۔ صفدر مرزاپوری وغیرہ وغیرہ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام وہ اصحاب لکھنؤ جن سے لکھنؤ مراد ہے شریک نہ کئے گئے۔ ہاں صرف مولانا شرر اور پروفیسر رسوا وغیرہ ضرور شریک تھے۔ اور یہ حضرات کیوں نہ شریک ہوتے۔ کیونکہ استقبالی کمیٹی کے ممبر تھے۔ خیر اہل لکھنؤ کانفرنس میں نہ شریک کئے گئے تو کچھ ایسی بڑی بات نہ ہوئی۔ مگر افسوس تو اس کا ہے کہ دہلی

اور میرٹھ سے جو حضرات خط بھیجکر بلائے گئے تھے اُن کے ساتھ جو بے اعتنائی کی گئی وہ لکھنؤ کے لئے نہایت شرم کی بات ہے۔

نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی کو ظفر الملک بہادر نے خط بھیجکر بلایا اہل دہلی نے باقاعدہ کمیٹی کی۔ حضرت سائل کو اپنا پریسیڈنٹ بناکر لکھنؤ بھیجا۔ نواب سائل صاحب نے پہلے سے بذریعہ خط اپنے آنے کی اطلاع ظفر الملک صاحب کو دیدی تھی اور جب لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچے تو اردو کانفرنس کے والنٹیروں کی معرفت پھر اطلاع دی کہ سائل حاضر ہے۔ معدن الادویہ نخاس میں ٹھرا ہے اگر کوئی خدمت لینا ہو تو اطلاع دی جائے۔ کوئی خاص مشورہ کیا جائے تو مجھے بلالیا جائے ۔ ۔ ۔ مگر اللہ رے بے نیازی! جناب ظفر الملک بہادر کو خبر تک نہوئی کہ کون آیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ بے بلائے چلا آیا ہے یا بطور مہمان بلایا ہوا آیا ہے۔ مولٰنا قدرت اور جناب حمید میرٹھی ایڈیٹر "نظارہ" کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ یہ لوگ ہمایوں ہوٹل میں جا ٹھرے۔ مگر ان کا بھی کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ حضرت سائل وغیرہ کانفرنس میں شریک تک نہ ہوئے۔ کانفرنس ختم بھی ہوگئی۔ مگر اس پر بھی ظفر الملک صاحب کو ان پردیسیوں کی طرف نگاہِ التفات کا خیال نہ آیا۔ آخر کار دہلی کے اس محترم بزرگ کو بیرنگ واپس ہونا پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظفر الملک صاحب کے اس فعل سے یقینا دہلی کی ضرور دل شکنی ہوئی۔ اور اس کا آیندہ دیکھئے کیا اثر پڑے۔ یہ ناگوار سلوک ہرگز قابل معافی نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی عذر قابل سماعت ہوسکتا ہے۔" بالکل بجا اور درست ہے۔ یہ قوم کی توہین کی گئی ہے اور قوم کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس خط کے جواب میں سید جالب صاحب

بہادر دہلوی اپنے اہل وطن اہل دہلی کی نیابت اور محترم نواب سائل کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اسی اشاعت ۱۹ر جنوری میں اس چٹھی پر آپ ایک کالم کا نوٹ اضافہ فرماتے ہیں جسکا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) میرزا واجد حسین صاحب یاسؔ عظیم آبادی ہیں۔ لکھنوی نہیں ہیں۔

یا دوسرے الفاظ میں یہی وجہ معقول ہے کہ سیّد جالب صاحب دہلوی آپکی توہین کریں۔

(۲) آپ کی شکایات "بے دلیل شکوہ سنجی" میں داخل ہے۔

اگر ایسی مدلل شکایات کا نام "بے دلیل" ہے تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایک روزانہ اخبار کے اڈیٹر کے دماغ میں راہ پانے کے لئے اور کیسے دلائل ہونا چاہئیں جنھیں وہ سمجھ سکے۔

(۳) "ان دلائل اور شکوہ جات سے "کسی قسم کی مفید معلومات ناظرین کو حاصل نہیں ہوسکتیں"۔

بندہ پرور آجکل کے ناظرین وہ ناظرین نہیں رہے جو اڈیٹر کے آنکھ سے دُنیا دیکھتے تھے۔ اب اللہ نے اُنھیں آنکھیں دیدی ہیں۔ اور نیک و بد میں تمیز کرنے کے لئے آپ کی عقل عاریتاً لینے کی اُنھیں ضرورت نہیں ہے۔

(۴) "جناب یاس اساتذہ سابق وحال پر اپنی خوردہ گیری و نکتہ چینی سے شمالی ہند کے پُرانی شاعری کے حلقوں میں ایک خاص قسم کی شہرت حاصل کرچکے ہیں اور اگرچہ شاعری میں انھیں حضرت شاد مدظلہم عظیم آبادی سے تلمذ سنا جاتا ہے لیکن اس فن خاص میں اُنھوں نے جناب "مجدد السنۂ مشرقیہ" کی جانشینی کا حق اپنے

لئے محفوظ کر لیا ہے۔"

اوپر کے فقرات جتنے اہانت آمیز ہیں ناظرین خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

(۵) پھر حضور ارشاد فرماتے ہیں کہ "آپ نے ان شکایات میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔"

اس کے بعد ذیل کے فقرات حضرت یاس ہی کی توہین نہیں کرتے ہیں بلکہ لکھنؤ کے سارے مستند اہل کمال کی جن کا خاص طور پر مدعو کیا جانا لازمی تھا مگر نہیں مدعو کئے گئے۔ اُن کی نہ صرف سخت توہین کی گئی ہے بلکہ اُن کے ساتھ ایسی سخت بے تمیزی کیگئی ہے جو کسیطرح قابل معافی نہیں قرار پاسکتی۔

سیّد جالب کی بے تمیزی حد سے تجاوز کر جاتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ "ہمیں جہاں تک علم ہے اُردو کانفرنس کے دونوں اجلاس کھلے دروازوں کے ساتھ قیصر باغ کی بارہ دری میں منعقد ہوئے اور کسی والنٹیر کو جناب یاس کا فوٹو اس غرض سے حوالہ نہیں کیا گیا تھا کہ جب وہ شرکت اجلاس کی غرض سے تشریف لائیں تو باہر ہی روک دیئے جائیں۔ ......"

اس ڈھٹائی کو ملاحظہ فرمائیے۔ خاص لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں "اُردو کانفرنس" کا اجلاس ہو۔ جو حضرات اہل لکھنؤ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ جن سے اہل لکھنؤ مراد ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اس جلسہ کے اہل تھے وُہی نہ بلائے جائیں۔ اور .. ..جب اس کی شکایت کی جائے تو بجائے معذرت کرنے معافی چاہنے اپنے قصور کا اعتراف کرنیکے اس بے تمیزی سے جواب دیا جائے؟

(۶) فخر قوم عالیجناب نواب سراج الدین احمد صاحب سائل کے معاملہ کے متعلق سید جالب صاحب بہادر کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے

"ہمارے مخدوم ومکرم جناب نواب سراج الدین احمد صاحب سائل دہلوی صدر نیابت دہلی اور بعض دوسرے بیرونی مہمانوں کا معاملہ اس کے متعلق ہم اپنے سابق لیڈر میں افسوس ظاہر کر چکے ہیں کہ یقیناً کچھ فروگذاشت ہوئی۔ لیکن مسٹر ظفر الملک کی تنہا ذات پر کام بحید بار تھا۔ اور اول اجلاس کے بعد وہ علیل بھی ہو گئے تھے۔"

آپ ایک بار ایک بھلے آدمی کو مدعو کریں۔ پھر اس کی کوئی خبر نہ لیں۔ آپ نیابت دہلی کے صدر کو اس قابل نہ سمجھیں کہ آپ کے مشورات میں شریک ہو سکے۔ آپ لکھنؤ میں "اردو کانفرنس" کریں اور اہل لکھنؤ کو شریک نہ کریں۔ آپ چند انے گنے آدمیوں کو اپنی مٹھی میں لے کر جس طرح آپ کا جی چاہے کام کریں۔ اور اس کا نام "قومی کام" رکھیں۔ اس کے بعد اپنے اخبار میں ایک معذرت کا نوٹ لکھ کر اپنے سارے گناہوں کی تلافی کر لیں اور معصوم بنجائیں۔ یہ بات نہیں ہونے پائیگی۔ آپ اسے اچھی طرح ذہن نشین فرمالیجئے۔

آپ کے مسٹر ظفر الملک بہادر کب علیل تھے؟ "کانفرنس" کے پہلے اجلاس کے بعد؟ اگر وہ بزرگوار علیل تھے اور بستر علالت پر پڑے ہوئے بیچینی کی کروٹیں بدل رہے تھے تو نواب ذوالقدر جنگ کے "ایٹ ہوم" میں کون شریک ہوا تھا؟ کیا وہ نواب ظفر الملک بہادر کے ہمزاد تھے! وہاں تو علالت

کا کہیں نام نشان بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اور یہی پارٹی تھی جہاں اُنھوں نے
آزاد صاحب حضرت خلیقی دہلوی اور مولانا ظفر احسن صاحب کارکن دائرۃ
الادب دہلی سے معذرت کی تھی کہ غلطی سے اس جلسہ کا نام "اُردو کانفرنس"
رکھدیا گیا اور مجھے بڑا افسوس ہے کہ ہماری ہی غلطی سے خاص وعام میں یہ غلط فہمی
پھیل گئی کہ یہ جلسہ "اُردو کانفرنس" کا اجلاس ہے۔ ورنہ دراصل یہ تو "انجمن
ترقی اُردو" کا معمولی جلسہ ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو آپ ابتک اسے "اُردو کانفرنس"
ہی کیوں پکارے جاتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے اور "انجمن ترقی اُردو"
ہی کا جلسہ تھا تو قومی "ایجوکیشنل کانفرنس" سے کیوں نہیں درخواست کیجاتی
کہ اپنے اس شعبہ کو ایجوکیشنل کانفرنس سے جُدا کرکے باقاعدہ طور پر اس کا
اہتمام آپکے ہاتھ میں دیدے!

آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ آپ یہ کھیل نہیں کھیلنے پائیں گے۔ آپ کی ساری
کارروائیوں کا پردہ قوم پر اچھی طرح فاش ہو چکا۔ اب گھونگٹ کی آڑ بالکل
فضول ہے۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ باقاعدہ طور پر کام کیجئے اگر آپ کام کرنا
چاہتے ہیں۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ بنک بنگال سے مراسلت کرکے وہاں
چندہ جمع کرائیے۔ باقاعدہ حساب وکتاب رکھنے کا ذمہ لیجئے۔ مستند اور قابل
وقعت آڈیٹروں سے حساب جانچ کراتے رہئے۔ باقاعدہ پیسے پیسے کا حساب
رکھئے۔ آپ اس پہلو پر آتے ہی نہیں ہیں۔ اپنی ذاتی ذمہ داری پر قوم سے
تین لاکھ روپیہ کا سادہ چک صرف آپ مسٹر عبدالحق اور نواب ظفر الملک بہادر
دام دولتہٗ وحشمتہٗ مانگتے ہیں۔ قوم دیکھ رہی ہے کہ آپ میں سے کسی کی آمدنی

سو پچاس ماہوار سے زیادہ نہیں ہے کسی کے پاس کوئی جائداد نہیں ہے۔ جس کی ضمانت پر آپ کا اعتبار کر لیا جائے۔

آپ کسی بنک یا کسی تجارتی کاروبار رکھنے والے کارخانے کسی سرکاری دفتر سے سو پچاس بھی اپنی ذاتی ذمہ داری پر نہیں لا سکتے ہیں۔ اگر لا سکتے ہیں تو لاکے ہمیں دکھا دیجئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قوم آپ کے ہاتھ میں بے حساب و کتاب پورے ۳۰ لاکھ کا سرمایہ دیدے اور کوئی محاسبہ کسی قسم کا نہ کرے!

بیشک اُردو کانفرنس کی بنیاد ڈالی جائیگی۔ نیشنل اکاڈمی قائم کیجائیگی۔ مگر نہ اس طرح پر کہ کسی واحد متنفس یا چند غیر مستطیع افراد کے ہاتھ میں لاکھوں روپیہ کا سرمایہ بے حساب و کتاب دھر دیا جائے۔ آپ نے اس وقت تک جو کچھ اور جس طریق پر کیا ہے اس سے آپ کی قابلیت اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے اور جس کام کو آپ کرنا چاہتے ہیں آپ اپنے کو اس کا اہل ثابت نہیں کر سکے۔

اب آپ صاحبوں کا فرض ہے کہ سکوت اور خاموشی سے اپنی جگہ پر خاموش ہو کر بیٹھ جائیے۔ اور قوم کو موقع دیجئے کہ وہ باقاعدہ طور پر کام شروع کرے۔ جب تک آپ یہ طوفان بے تمیزی بپا رکھیں گے کوئی مفید کام نہیں ہو سکتا آپ اپنے افکار اپنے اخبار کی ایڈیٹری تک محدود رکھئے۔ اس کام میں قوم آپ کی مدد کو تیار ہے۔

"اردو کانفرنس" کا آسیب نقاب پوش ہو کر قوم پر مسلط ہونے آیا تھا۔ گھونگٹ کا طلسم ایک لوح طلسمی کی طلسم کشائی سے ٹوٹ گیا۔ قوم نے اُسکی خبیث شکل دیکھ لی۔ کیا اب بھی ہم یہ کہہ سکیں گے کہ ہمیں اصلی حالات

معلوم نہ تھے!

قوم کی نگاہیں بے صبری سے دہلی کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ حضرت سائل اور اُن کے خود فراموش رفقا اس طوفان کے نوح بن سکتے ہیں۔

جو لوگ یہ بار عظیم اُٹھانے کے اہل ہیں وہی اُٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں باقاعدہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اور باقاعدہ کام شروع ہونا چاہیئے۔

اب ہم حضرت یاس کی تحریر بجلسہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

اردو کانفرنس

بخدمت ایڈیٹر صاحب ہمدم

جنابمن۔ مجھے اس کانفرنس میں شریک ہونیکا موقع تو مصلحتاً نہ دیا گیا۔ مگر مکرمی شاہ دلگیر صاحب اکبرآبادی کی زبانی اس کانفرنس کے حالات معلوم ہوئے مجھے اس وقت فقط دو ریزولیوشنوں کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

ایک تو اردو کے لئے ایک مرکزی کتب خانے کی تجویز ہے اور یہ نہایت ضروری اور مفید تجویز ہے اور اس کا سرانجام بھی بہت مشکل نہیں ہے۔

دوسری تجویز اردو انسائکلوپیڈیا کی ہے یہ کام جتنا مفید ہے اسی قدر دشوار ہے مگر قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اردو انسائکلوپیڈیا کی غرض وغایت

غالباً یہی ہو گی کہ اردو لٹریچر مختلف علوم و فنون کی معلومات سے پُر ہو جائے۔ اس کام سے اردو کی ترقی تو ضرور متصور ہے۔ مگر ترقی کے قبل ہم کو اس زبان کی حفاظت زیادہ ضروری ہے یعنی زبان اردو کے مبسوط لغت اور صرف و نحو کی کمی کے باعث زبانِ اردو مٹتی جاتی ہے یا خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس ضروری مسئلہ پر کانفرنس میں غالباً کوئی ریزولیوشن پیش نہیں کیا گیا اور انجمن ترقی اردو نے ابتک کوئی معقول انتظام نہ کیا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی تو ہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ ملک کے مستند اہل زبان و زباندانوں کی مجموعی قوت سے ایک جامع تصنیف شائع ہو تاکہ صحیح اور ٹکسالی اردو کا رواج ہو سکے۔

اردو کی صرف و نحو کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس کا مصنف انگریزی کا بی اے یا ایم اے ہو بلکہ زبان اردو کا ماسٹر ہونا چاہئے۔

اردو کی صرف و نحو سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ اس زبان کا ایک مبسوط اور مستند لغت تیار کیا جائے مگر یہ کام دو ایک شخص کا نہیں ہے بلکہ ایک اچھی خاصی جماعت کا کام ہے جس میں مختلف شہروں کے اہل زبان و زبان داں شریک ہو کر عملی طور پر مدد دیں۔ ابھی ہم کو یہی معلوم نہیں کہ اردو میں جو ذخیرہ موجود ہے اس کی حد اور وسعت کیا ہے اردو زبان کی وسعت معلوم ہو جائے تو پھر اس امر کا اندازہ بھی آسان ہو جائیگا کہ اس زبان میں ادائے مطلب کی صلاحیت کہاں تک ہے اور کتنی ہے۔ پہلے زبانِ اردو کے موجودہ الفاظ اور مختلف طرز استعمال کو یکجا قلمبند کر و تاکہ موجودہ سرمایہ تلف نہ ہو جائے اس کے بعد تراش خراش اور

نئی نئی گڑبڑ کی طرف توجہ کرو۔ ترقی سے پہلے حفاظت زبان کا مسئلہ قابل غور ہے۔ جب اس کام سے فراغت ہو چکے تو دوسری زبانوں کے علوم و فنون سے اپنے لٹریچر کو قوت پہنچاؤ۔ مگر واضح ہو کہ زبان اردو کے لغت کی تدوین میز۔ کرسی پر بیٹھ کر نہیں ہو سکتی یہ اُن لوگوں کا کام ہے جو شہروں شہروں گلیوں گلیوں خاک چھاننے اور ادنیٰ و اعلیٰ ہر کس و ناکس سے ملنے کو عیب نہ سمجھتے ہوں۔ کوٹ پتلون والے زبان اردو کی مصطلحات مختلفہ کو حاصل کرنا چاہیں تو پہلے اپنے فیشن کو تہ کر رکھیں اور ہر طبقے کے لوگوں سے ملکر معلومات حاصل کریں جب کہیں خادم قوم کا لقب پا سکتے ہیں ورنہ زبان اردو کی تہ کو پہنچنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ زبان اردو کی خدمت اُن ہی لوگوں سے ہو سکتی ہے جو شب و روز سوتے جاگتے اردو ہی کی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔ غیر مانو نہ مانو آگے تم جانو۔

یہ بھی عرض کرنا ہے کہ استقبالی کمیٹی کے کارکن معتمد منشی اسحاق علی صاحب المعروف بہ ظفر الملک صاحب کے دستخط سے اخباروں میں اشتہار دیا گیا تھا کہ تمام بہی خواہانِ اردو اس جلسہ میں شریک ہو کر ترقی کی تجویزیں پیش کریں اور مناسب تدبیریں عمل میں لائیں وغیرہ وغیرہ انہیں بزرگوار (ظفر الملک بہادر) کے دستخط سے بعض مخصوص حضرات کے پاس دعوت کے خطوط بھی پہنچے مگر لکھنؤ کے عمائد شاید اس قابل نہ سمجھے گئے کہ خاص طور پر بلائے جاتے چنانچہ حضرت آوج و شیدا و جاوید و انجم و افضل و فصاحت و احسن و آرزو و بیخود موہانی و صفدر مرزاپوری وغیرہ۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام وہ اصحاب لکھنؤ جن سے لکھنؤ مراد ہے شریک نہ کئے گئے۔ ہاں صرف مولنا شرر اور پروفیسر رسوا وغیرہ ضرور شریک تھے اور یہ حضرات کیوں

نہ شریک ہوتے کیونکہ استقبالی کمیٹی کے ممبر تھے۔ خیر اہل لکھنؤ کانفرنس میں نہ شریک کئے گئے تو کچھ ایسی بُری بات نہ تھی۔ مگر افسوس تو اس کا ہے کہ دہلی اور میرٹھ سے جو حضرات خط بھیجکر بلائے گئے ان کے ساتھ جو بے اعتنائی کی گئی وہ لکھنؤ کے لئے نہایت شرم کی بات ہے۔

نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی کو ظفر الملک بہادر نے خط بھیجکر بلایا۔ اہل دہلی نے باقاعدہ کمیٹی کی۔ حضرت سائل کو اپنا پریسیڈنٹ بنایا اور اپنا نمایندہ بنا کر لکھنؤ بھیجا۔ نواب سائل صاحب نے پہلے سے بذریعہ خط اپنے آنے کی اطلاع ظفر الملک صاحب کو دیدی تھی اور جب لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچے تو اردو کانفرنس کے والنٹیروں کی معرفت پھر اطلاع دی کہ "سائل حاضر ہے۔ معدن الادویہ نخاس میں ٹھہرا ہے اگر کوئی خدمت لینا ہو تو اطلاع دیجائے کوئی خاص مشورہ کیا جائے تو مجھے بلا لیا جائے وغیرہ وغیرہ"

مگر اللہ رے بے نیازی جناب ظفر الملک بہادر کو خبر تک نہ ہوئی کہ کون آیا ہے کیوں آیا ہے بے بلائے چلا آیا ہے یا بطور مہمان بلایا ہوا آیا ہے۔ مولٰنا قدرت اور جناب حمید میرٹھی ایڈیٹر نظارہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا یہ لوگ ہمایوں ہوٹل میں جا ٹھہرے مگر ان کا بھی کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ حضرت سائل وغیرہ کانفرنس میں شریک تک نہ ہوئے۔ کانفرنس ختم بھی ہوگئی۔ مگر اسپر بھی ظفر الملک صاحب کو ان پردیسیوں کی طرف نگاہِ التفات کا خیال نہ آیا۔ آخر کار دہلی کے اس محترم بزرگ کو بےرنگ واپس ہونا پڑا۔ دہلی اور لکھنؤ میں پرانی مخالفت چلی آتی ہے۔ مگر اس مخالفت کی بدولت تہذیب و اخلاق سے چشم پوشی کرنا کون سے مذہب

میں رہا ہے۔ ظفر الملک صاحب کے اس فعل سے نیابت دہلی کی ضرور دل شکنی ہوئی اور اسکا دیکھیے آیندہ کیا اثر پڑے۔ یہ ناگوار سلوک ہرگز قابلِ معافی نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی عذر قابل سماعت ہوسکتا ہے۔

راقم مرزا یاس از لکھنو شاہ گنج

اہل امریکہ کی ترکیب سے بریک فٹ بسکٹ بنانا

نسخہ۔ میدہ ولائتی (فلاور) آدھ سیر۔ بکنگ پوڈر چائے کے دو چمچہ کی تعداد مکھن پاؤ بھر۔ دودھ اور نمک بقدار مناسب۔

ترکیب۔ پہلے بکینگ پوڈر۔ پھر مکھن اچھی طرح میدہ میں ملا دیجئے۔ پھر دودھ ملا کر پھینٹ لیجئے۔ اس کے بعد ہموار سطح میں نصف انچ موٹی تہہ اِس پھینٹے ہوئے میدے کی۔۔ سینی یا ایسے ہی دوسری ظرف میں رکھہ کر بنا لیجئے۔ پھر ٹین کے سانچے سے گول گول بسکٹ کاٹ لیجئے۔ اور بسکٹ پکانے کے چولہے پر ایک ٹین کی تھہر پر رکھہ کر کوئلہ کی تیز آنچ پر پکا لیجئے۔ جب سُرخ ہو جائیں گرما گرم اُتار کر اوپر سے اور مکھن تھوڑا تھوڑا کرکے لگاتے جائیے تاکہ جذب ہوتا جائے اب بسکٹ تیار ہیں نوش فرمائیے۔ بکینگ پاؤڈر ہر بڑے شہر میں بکتا ہے قیمت کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔

بادامی کیک

مغز بادام شیریں پاؤ بھر۔ اوپر کا چھلکا اوتار کر (مقشر کرکے) باریک پیس لئے جائیں اسمیں ولایتی میدہ (فلاور) بمقدار چائے کے نصف چمچہ کے ملا دیا جائے۔ اور اسی طرح شکر چائے کا ایک چمچہ بھر ایک انڈا معہ زردی سفیدی اور کاغذی نیبو کاٹ کر آدھے نیبو کا عرق۔ انڈے کی زردی اور سفیدی پھینٹ کر ایک کرلی جائے۔ اس کے بعد سب اجزا ایک میں خوب اچھی طرح ملا دیئے جائیں۔ اگر ضرورت باقی ہو تو ایک اور انڈا توڑ کر اس کی زردی اور سفیدی ایک میں پھینٹ کر بقدر ضرورت اُسے بھی ملا دیں۔ محض اتنی ہی نمی کی ضرورت ہے جتنی ان اجزاء کو کیک کی صورت میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ اگر انڈا زیادہ ہو جائے گا تو کیک ٹوٹ جائیگی۔

اب کیک کے سانچے کے اندر مکھن کی ایک تہہ جما کر اوپر سے کیک رکھ دیجئے اور پھر کیک کے اوپر بھی مکھن کی ایک تہہ پھیلا دیجئے۔ کوئلہ کی نہایت ہی دھیمی دھیمی آنچ پر پکائیے اور جب بھورا بھورا سا رنگ آجائے تو اُتار لیجئے اگر اوپر کا حصّہ بہت سُرخ ہو جائیگا تو نیچے کا حصّہ جل جائیگا۔ اسکا لحاظ رہنا چاہئے

نوٹ۔ پہلے نسخہ میں جو ولایتی میدہ یا فلاور لکھا گیا ہے وہ "کارن فلاور" کے نام سے ٹین میں بند ہو کر ولایت سے آتا ہے۔ اور بازار میں آسانی سے ہر بڑے شہر میں مل جاتا ہے۔

پان کیک بنانیکا فرانسیسی نسخہ

اجزا۔ آدھی چھٹانک دودھ۔ ایک انڈا۔ کارن فلاور (ولایتی میدہ) دو بڑے چمچہ کی تعداد میں۔ نصف چار کے چمچہ کی مقدار میں شکر۔

ترکیب۔ انڈے کی زردی اور سفیدی میں شکر ملا کر خوب پھینٹئے تاکہ ملکر ایک ہوجائیں۔ اس کے بعد ولائتی میدہ اور دودھ ملادیجئے۔ اور جب اچھی طرح ملکر ایک ہوجائیں تو دو پلیٹوں میں مکھن اچھی طرح برابر برابر پھیلا کر اوپر کے اجزاء میں سے نصف حصّہ ایک پلیٹ میں اور باقی نصف دوسری پلیٹ میں رکھکر کوئلوں کی اوسط درجہ کی تیز آنچ میں پکائیے۔ جب پک جائیں تو ایک پلیٹ والی تہہ پر گوزبری یا راس بری جام یا اور جس قسم کا جام (انگریزی ترکیب کا بنا ہوا مربہ) جو پسند ہو رکھہ کر دوسرے پلیٹ والی تہہ اسی طرح گرما گرم اُٹھا کر اوپر سے بچھا دیجئے دونوں تہیں آپس میں چپک کر پان کیک بن جائینگی۔

نوٹ۔ کارن فلاور (ولایتی میدہ) ٹین میں بند ہو کر ولایت سے آتا ہے اسی طرح جام (ولایتی مربہ) بھی آتا ہے۔ ہر بڑے شہر میں دونوں چیزیں آسانی سے بازار میں مل سکتی ہیں۔

گاجر کا حلوہ

گاجر اس طرح چھیلئے کہ اس کے مغز میں چھلکے کا رنگ نہ رہنے پائے۔ کیونکہ اسی میں بکھٹاپن ہوتا ہے۔ خوشرنگ حلوہ بنانا ہے تو زرد رنگ

کی ولائتی گاجروں کا بنائیے - چھیلنے کے بعد اس کے اندر سے بڑے اس صفائی کیسو نکالئے کہ اس کا کوئی حصہ معذ میں باقی نہ رہجائے - کیونکہ یہ بدمزہ چیز ہے - ان ٹکڑوں کو کدوکش کے ذریعے سے باریک کر لیجئے - بعض لوگ انہیں خشک کر کے پکاتے ہیں - بعض تازہ ہی کا حلوہ بنانا پسند کرتے ہیں - اس طرح بنی ہوئی گاجر کا وزن اگر سیر بھر ہے تو بھینس کا خالص دودھ دو سیر ہونا چاہیئے - اب گاجروں کو دودھ میں دم دے کر حل کر لیجئے - پھر گھی میں بھون کر پستہ بادام اور پسند کے موافق میوہ جات تراش کر حل کردہ زعفران اور میوہ ملا کر اُتار لیجئے - اور گرما گرم دیگچی میں آدہ سیر صاف شکر (چینی) ملادیجئے اب حلوہ تیار ہے - ملاحظہ فرمایئے -



گردشِ زمانہ

(سلسلہ کیلئے ماہ دسمبر ۱۶ء کا رسالہ ملاحظہ فرمائیے)

بابوجی - سُنو تو سہی تمہیں اسقدر جلدی کیوں ہے ؟ جو کچھ تم کہتے ہو مجھے منظور ہے - لیکن سب کام ٹھیک طور پر کرنا ورنہ بڑی مشکل کا سامنا ہوگا - یہ لو دو سو روپئے پیشگی دیتا ہوں -

یہ کہکر دو سو روپیہ کے نوٹ بابوجی نے اُن کے ہاتھ پر رکھدیئے - جب وہ کچھ دُور چلے گئے تو پھر بابوجی نے پکار کر کہا -

بابوجی - میں مکان کے پیچھے تمہارا منتظر رہوں گا - جب موقعہ ہو مجھے تلاش کرلینا

دونوں آدمی بہت اچھا کہکر چلتے ہوئے - میں اپنی جگہ پر جا بیٹھا - خوف کے مارے دِل دھڑکتا اور کلیجہ بانسو اچھلتا تھا - سمجھا کہ شاید خواب دیکھ رہا ہوں پیارے باپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کیسا جال پھیلایا جا رہا ہے! کس کے لئے یہ سامان ہو رہے ہیں! حیرت اور خوف کی انتہا نہ رہی بدحواس ہو گیا - چاروں طرف اندھیرا معلوم ہونے لگا - دِل کے اضطراب نے بیٹھنے نہ دیا - آخر کار لیٹ گیا پھر کچھ خبر نہ رہی شاید سو گیا - یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک اس حالت میں رہا - آہستہ آہستہ افاقہ ہوا یعنی میں سو کر اٹھا پورے طور پر آنکھیں کھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ آواز کان میں آئی -

آواز - بیچارہ لڑکا ہے اس نے کبھی تکلیف نہیں اُٹھائی تھکا ہوا تھا سو گیا بابوجی جگا دیجئے - بہت دیر ہو گئی - کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے -

بابوجی نے میرے پاس آکر نہایت پیار سے کہا :-

بابوجی - برجبیندر برجبیندر - اُٹھو بیٹا! اتنا کیوں سوتے ہو طبیعت کیسی ہے؟ دیکھو تمہارے خسر دیر سے تمہارے منتظر کھڑے ہیں - کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے

میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا - دل کی جو حالت تھی وہ بیان نہیں کر سکتا نہ مجھے بھوک تھی نہ پیاس - مارے خوف کے کانپ رہا تھا - نیچی نظروں سے بابوجی کی طرف دیکھا نہ معلوم کیوں اُن کی صورت سے بھی خوف معلوم ہونے لگا اور خیال ہوا کہ میرے باپ ضرور کوئی اندیشہ ناک کام کرنے والے ہیں - آخر کار رائے جی نے مجھ سے کہا :-

رائے جی۔ آؤ اندر چلو سب تمہارے منتظر ہیں۔ ہاتھ منہ دھو ڈالو اور کچھ کھا پی لو۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا اور چپکے سے اُٹھکر اُن کے ساتھ ہولیا۔ رائے جی مجکو اپنے ساتھ زنانہ مکان میں لے گئے۔ یہ بھی مثل باہر کے مکان کے میلا کچیلا پڑا ہوا تھا۔ رائے جی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لالٹین تھی جس کی وجہ سے راستے وغیرہ میں کچھ دقت پیش نہیں آئی۔ صحن میں ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک دالان میں پہونچے جس کے بغل میں ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ کمرے کے اندر طاق پر ایک چراغ جل رہا تھا۔ کمرے کی حالت بالکل ردی تھی جابجا اینٹیں نکل رہی تھیں۔ سیل کی وجہ سے بد بو پیدا ہوگئی تھی۔ ایک کمرے سے گذر کر ہم ایک اور کمرے میں پہونچے جہاں تین عورتیں ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک جوان تھی اور دو بوڑھی۔ کمرے کے ایک جانب بہت سی پھول کی تھالیاں لوٹے اور گلاس بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک تپائی پر ٹین کا چھوٹا سا شمعدان روشن تھا۔ جس کے پاس ہی الگنی پر بہت جھوٹے کام کی ساڑیاں ٹنگی ہوئی تھیں۔ کمرے کی دیواریں دیوتاؤں کی تصویریں لگی تھیں۔ چھت میں ایک پرانے چھینکے پر رنگی ہوئی مٹی کی ہانڈی لٹک رہی تھی۔ تمام کمرے میں دری کا فرش تھا۔ درمیان میں بہت ہی اچھا ادنی قالین بچھا ہوا تھا۔ اور وہیں ایک مسہری آراستہ تھی۔ مسہری کے پاس تپائی پر تھوڑی سی مٹھائی رکھی تھی۔ رائے جی نے مجھے لیجا کر قالین پر کھڑا کر دیا۔ چار روپیہ دئیے اور کہا:۔

رائے جی۔ (اُنگلی سے بتا کر) دیکھو میری ماں کے پاس جو بیٹھی ہیں وہ

تمہاری ساس ہیں یہ روپئے انہیں دو اور ان کے قدم لو۔ میں دیوانہ وار جو رائے جی کہتے گئے کرتا گیا۔ ساس کے پیروں کے پاس روپئے ڈال دیئے۔ اور ان کے پیر چھوئے۔ پھر ان دونوں بڑھیوں کے بھی جو میری ساس کے پاس بیٹھی تھیں قدم لینے پڑے۔ سب نے دعائیں دیں۔ رائے جی نے بڑھیا سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہو داماد کیسا ہے؟

بڑھیا۔ پرمیشور کی دیا سے بڑا سُندر اور ہونہار ہے۔ اس پر سب ہنس پڑے رائے جی نے بڑھیا سے کہا۔ (باقی آیندہ)

عبید الحق

تنقیدات

"جذبات روحی" مؤلفہ جناب شیخ احمد اللہ صاحب عثمانی۔ برقی عزیزی پریس آگرہ۔ کاغذ سفید۔ لکھائی چھپائی صاف "پیام امید" کی تقطیع میں ۸۰ صفحہ۔ قیمت فی جلد ۴ر۔ جو قومی خدمت کے لئے وقف ہے۔

شیخ احمد اللہ صاحب ان تنہائی پسند بزرگوں میں سے ہیں جن کو خالصًا للہ محض کام ہی کرنے سے غرض ہے۔ نام و نمود کی آلائش سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ پاک رہیگا۔ آپ کام کرتے ہیں مگر اس کا صلہ اس کا اجر نہیں تلاش کرتے ہیں۔ خدمت کرتے ہیں مگر نام اور شہرت

کی خواہش قریب نہیں آنے دیتے۔ یہ نایاب زمانہ کتاب آپ نے ہمیں "نذر" کی ہے ریویو کے لئے نہیں محض ہمارے مطالعہ کے لئے۔ مگر اس کتاب کے اندر کیا کیا بھرا ہے کیسے کیسے ذخار دریا اس کوزہ کے اندر موج زن ہیں۔ اس کا کچھ مختصر حال آپ بھی سُن لیں۔

ہمارے عوام الناس خیال کرتے ہیں کہ تصوف اسلام سے اور بالخصوص شریعت سے مُنافی ہے۔ اس وہم باطل کی تردید قابل مولوی صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ سے کی ہے۔ اور تصوف کو شریعت کے ساتھ منطبق کرکے جس دلفریب اور دلنشین پیرایہ میں آپ نے پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ ہماری رائے میں یہ نہ صرف تصوف کی خدمت ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اسلام کی خدمت ہے۔ اور قوم کو عموماً اور حضرات صوفیانہ کرام کو خصوصاً اس خدمت کی پوری پوری قدر کرنا چاہئے۔

قابل مولوی صاحب نے نہایت باقاعدہ طور پر یہ بحث شروع کی ہے۔ سب سے پہلے انسان کی تعریف فرماتے ہیں۔ اس کے بعد انسانی مدرکات کو "ادراک حسی" اور "غیر حسی" پر تقسیم کرکے دونوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد "ادراک کشفی" کا ذکر کرتے ہیں پھر کشف و کرامات پر آتے ہیں۔ اس بحث کو ختم کرکے "اقسام اہل ریاضت" کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ اسے ختم کرکے عنوانات ذیل پر یکے بعد دیگرے بحث فرماتے ہیں۔

"حرمت شرعی کی اباحت" "اصلی تصوف اور اہل تصوف۔ طریقہ و سلوک۔ وجہ اختلاف اکتساب طریق۔ نماز ذریعہ تقرب ہے۔ فنا فی الصفات۔

اس کے بعد اکابر صوفیہ کرام میں اکثر بزرگوں کی یاد کے عنوان سے لکھتے ہیں جسمیں سید اشرف جہانگیر فرزندان معین الاولیا قطب عالم ۔ شیخ موسیٰ وغیرہ شامل ہیں پھر تجلی عام سے بحث کرکے تجلی کشفی پر پہنچتے ہیں اور اس کی دو قسمیں "نوری" اور "صوری" دکھا کر تجلی ذاتی ۔ تجلی صفاتی اور تجلی معلی کی عقدہ کشائی فرماتے ہیں ۔ اس کے بعد آگے چل کر قوت باصرہ کا ذکر فرماتے ہیں اور اس کے بعد "مشاہدہ ظاہری و باطنی" کے حالات بیان فرماتے ہیں ۔ اور سب سے آخر مناصب سالکین کی تصریح فرماتے ہیں" جس میں تجلیات سے شروع کرکے "فنافی اللہ" کے درجہ تک ترقی کرتے ہیں ۔ القصہ تصوف کے حقایق اور اُن کی معنوی خوبیاں اگر دیکھنا ہیں تو اس کتاب کو اوّل سے آخر تک غور سے پڑھیے اور قابل مؤلف کے حق میں دُعائے خیر کیجیے ۔

ہماری رائے میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ موتیوں سے تولی جائے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہمارے معزز ایڈیٹر صاحبان رسالہ صوفی و طریقت و اسوۂ حسنہ و اشاعتِ اسلام اور محترم مکرم عالیجناب خواجہ حسن نظامی صاحب اسکی پوری قدر کریں گے ۔

اذان اور نماز ۔ از مؤلف "جذبات روحی" عزیزی پریس آگرہ ۔ قبل الذکر کتاب کی طرح یہ بھی ہمارے مطالعہ کیلئے آئی ہے مگر اس کتاب کو بھی ہم کسیطرح نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ اذان اور نماز کے حقایق زیر تعلیم بچوں کے ذہن نشین کرانے کیلئے بسید سوزوں ہے ۔ قیمت کچھ نہیں لکھی ہے ۔ چھوٹی تقطیع پر ۳۰ صفحہ کی کتاب ہے، قیمت غالباً ۲ر ہوگی ۔ کاغذ سفید ۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے ۔

شکریہ

معزز بہن بلقیس بیگم صاحبہ کا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپنے پھر ایک نیا خریدار رسالہ کے لئے عطا فرمایا ہے اور تحریر فرماتی ہیں کہ توسیع اشاعت میں انشاء اللہ اپنی طرف سے حد بھر کوشش اٹھا نہ رکھوں گی“ اسیطرح معزز بہن بیگم شمس الدین صاحب تحصیلدار بدھونہ اٹاوہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپنے بھی ایک نئے خریدار سے رسالہ کے معزز ناظرین کے طبقہ میں اضافہ فرمایا ہے۔

اس مختصر عرصہ چند ماہ کے اندر رسالہ کے جوہر شناسوں اور قدردانوں کے معزز طبقہ میں بعض بزرگوں کی قبل از وقت موت سے جو کمی واقع ہوئی ہے۔ اسکا ہمیں بیحد افسوس ہی۔ معزز بزرگ جناب مولوی حبیب الدین صاحب اکاونٹینٹ جنرل حیدرآباد دکن کے انتقال پر ملال کا غم تازہ ہی تہا کہ معزز بیگم سرور علی صاحب کی جانکاہ موت کی خبر پہنچی۔ تین سال کی ایک خوردسال لڑکی آپکی یادگار ہے اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ اسیطرح مولوی انوار الحسن صاحب ڈپٹی کلکٹر مظفرنگر کے انتقال کی خبر ملی جسے سنکر بیحد قلق ہوا۔ جناب مولوی سید احمد صاحب رئیس تحصیل پہولپور الہ آباد کے حادثہ وفات کی خبر بہی پہنچی اور سب سے آخر میں جناب منشی بابو لال صاحب مولتس تحصیلدار کرچنا الہ آباد کی۔ مولوی سید انوار الحسن صاحب اور منشی بابو لال صاحب مولتس آزاد صاحب کے پرانے کرم فرما تہے۔ اسوجہ سے ان دونوں صاحبوں کے انتقال کا اور بہی ملال ہے اللہ پاک ان سب حضرات کی روحوں کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ایڈیٹر

پہلے درویش کے جنگی کارنامے

(یعنی ان بڑی لڑائیوں کا بیان جنمیں حضور سرور کائنات خود شریک ہوئے) عنوان بالا کے تحت میں نہایت موثر و دلکش تاریخی مضامین کا ایک قابل دید سلسلہ حضرت مولنا خواجہ حسن نظامی صاحب نے میرٹھ کے ماہوار مذہبی وادبی رسالہ (راز و نیاز) کے لئے لکھنا شروع کیا ہے اس دلگیر سلسلہ کا پہلا حصہ رازونیاز کے نوروز نمبر معروف بہ درویش جنتری ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ جو صاحب اس اثر انداز تاریخی مضمون کے مطالعہ سے لطف اُٹھانا چاہیں وہ صرف ۳۔ کے ٹکٹ بھیجکر ہم سے درویش جنتری ۱۹۱۷ء منگالیں جس میں سال بھر کیلئے پنجگانہ نماز اور سحر و افطار کے نہایت معتبر اوقات۔ ایکہزار سے زاید بزرگان دین کے عرسوں کی تاریخیں۔ حضرت جرجیس علیہ السلام کا عبرت آموز قصہ اولیا اللہ کی دلسوز حکایات فقہی مسائل۔ شرعی آداب، اعمال و وظایف مجرب علاج، اسلامی اخبارات و رسائل کی فہرست اور بہت سی کارآمد اور دلچسپ باتیں درج کیگئی ہیں اور جس کی ایک ایک سطر پڑھنے کے قابل ہے رسالہ رازونیاز کے (جس کی سالانہ قیمت عہ ششماہی ۱۲ اور سہ ماہی ۷ ہے) کل مستقل خریداروں کو درویش جنتری مفت دیجاتی ہے محض ۷ خرچ کرکے آپ درویش جنتری اور رازونیاز کے دو پرچے خرید سکتے ہیں۔

ضرورت ہے ۔ درویش جنتری ۱۹۱۷ء کو کمیشن پر فروخت کرنے کے لئے ایجنٹوں کی بہت جلد ضرورت ہے ۲۵ جنتریوں کی قیمت ایجنٹوں سے بجائے للعہ کے صرف ۲ روپے ۱۲ لیجائیگی

مینجر "رازونیاز" درویش جنتری کیمپ میرٹھ

جنگ! جنگ! خونریز جنگ!!! اور فتح!!!

حسن و شباب کے دو لاکھ حجاب شرم و حیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمناؤں کے پیدل۔ ارمانوں کے
شعلہ آشام سوار۔ حسرتوں کے شرر بار رسالے دل کے سنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور تبسم کی
شعلہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادھر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا
پرجوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اضطراب کے توپخانے
سے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش سے
جنگ جاری ہو جاتی ہے کج ادائیوں کا غنیم جنرل "دغا" کی ڈویژن پر ایک سخت خونریز
اور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "دغا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہے
مگر نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ پھر دفعتہ
پاک "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آتے ہیں۔ اس
نئی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے اسے دیکھتے ہی
غنیم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات۔ یہی حسن و عشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے
جذبات کی تصویر۔ عفت اور حیا کا دلنشین مرقع خلوص صدق و صفا کے صاف شفاف
آئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادھر آئیے ہم دکھاتے ہیں۔ سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت
استاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت خلیل
شاعر دربار ریاست بلرام پور کی زبان سے مرصع اردو نظم میں بڑے آب و تاب بڑی خوبی
و خوش اسلوبی سے چھپ کر تیار ہے حجم [illegible] قیمت مجلد ۱۰/
ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ "پیام امید" اکبر[illegible]

شیکسپیر اُردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار	چھائی ہوئی ظلمت شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت	اُلفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان	ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی	کانوں میں صدائے یار آئی

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پا چکا ہے اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔ اصلی قیمت ؏ تھی۔ اب رعایتی قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

دفتر رسالہ "پیام اُمید" آگرہ

فہرست مضامین رسالہ پیام امید ماہ اپریل ۱۹۱۷ء

اُمید کا پیام ــــ ”اُٹھو ــــ اُٹھو ــــ اور آگے بڑھو!“

اُمیــــد

نمبر ۲۰	آگرہ - اپریل ۱۹۱۷ء	جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح ”پیام اُمید“ کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ جس حال میں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گذریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی راے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

ایڈیٹوریل نوٹس

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ میگزینوں یا ماہوار رسالوں کا محض اتنا ہی کام ہے کہ وہ علمی ادبی تواریخی مضامین شائع کرتے رہیں۔ اور اِس تنگ دائرہ کی معینہ حدود سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اُن کی راے

میں یہ کام روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں کا ہے کہ اِن معینہ حدود سے باہر نکل کر عملی اور کارآمد تجاویز ملک اور قوم کے سامنے پیش کریں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اُردو خواں پبلک اِن معاملات میں بیسویں صدی کی دنیا سے کتنی پیچھے ہے۔ اور اگر ہم محض اپنی ہی ذاتی رائے کے بھروسے پر کچھ لکھیں گے تو ایک بیکار بحث چھڑیگی جس میں پڑنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم اِس اعتراض کے جواب میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے صرف ایک ہی مہینے یعنی مئی ۱۹۱۶ء کے اندر انگلستان کے میگزینوں میں ادبیات کے علاوہ جو جو مضامین شائع ہوئے ہیں اُن میں سے بعض کا مختصر ذکر ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ ہمارے لایق معترضین کے رفع شک کے لئے غالباً اِتنا ہی کافی ہوگا۔

نائن ٹین تھ سنچری۔ "بغاوت آئرلینڈ کا علاج"

فارٹ نائٹلی ریویو۔ "جرمنی پر پوری فتح حاصل کرنے کے لئے کیا کیا عملی تدابیر اختیار کی جائیں"

انگلش ریویو۔ "بغاوت آئرلینڈ کا علاج"

ایڈنبرا ریویو۔ "ہالینڈ کے خطرات" یعنی موجودہ جنگ میں ہالینڈ کو جرمنی سے کیا کیا خطرات پیش آسکتے ہیں

کنٹمپریری ریویو۔ "مشرقی افریقہ کی جرمن نوآبادی اور اُس حصہ ملک میں جنگ کی مشکلات"

یونائیٹڈ سروس میگزین۔ ”جرمن بحری قوت روبترقی ہے“
کنٹمپریری ریویو۔ ”جرمن سازشوں کا مستقل پروگرام“
ایڈنبرا ریویو۔ ”جنگ کے بعد کون کون سا حصہ ملک کسے ملنا چاہئے“
کوارٹرلی ریویو۔ ”جنگ کے بعد کون کون سے اہم مسائل ہمارے
پیش نظر ہونگے“
انگلش ریویو۔ ”مسٹر مک کنا کی عظیم الشان جنگی بجٹ پر مفصل بحث“
فارٹ نائٹلی ریویو۔ بشرح صدر
کوارٹرلی ریویو۔ ”تجارتی جہازوں کی کمی اور محصول کی زیادتی“
انگلش ریویو۔ ”قانون تیاری سامان جنگ کا اثر مزدوروں پر“
ایشیاٹک ریویو۔ ”روس میں گرانی اشیاء ضرورت“
کنٹمپریری ریویو۔ ”یوآنشیکائی کا دعوائے سلطنت چین۔ اور چین کے
سیاسی حلقے“
ہبرٹ جرنل۔ ”سلطنت کی ذمہ داریاں اور تعلیم“
ڈبلن ریویو۔ ”مردم شماری اور شیرخوار بچوں کی اموات“
رائل میگزین۔ ”کیا مذہب عیسائی زندہ رہیگا؟“

جس حال میں کہ انگلستان کے مستند میگزین ایسے ایسے اہم مسائل کی موشگافیاں کرنا اپنی حدود جائز سے باہر نہیں سمجھ رہے ہیں۔ کیا آپ ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑ کر اور ہمارے منہ میں لگام دیکر ہمیں مجبور کرینگے کہ ہم ادبیات کے تنگ دائرے کے اندر اپنی جولانگاہ محدود رکھیں؟

ہاں بیشک وہ بے تکلف سیاسات پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں۔ مگر ہمارا رسالہ غیر سیاسی ہے۔ اور اس معاملہ میں اپنی حدود جائز کے باہر ہم کبھی قدم نہیں رکھتے اور نہ رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسے ایسے اہم غیر سیاسی مسائل پر ایسے نازک وقت میں سکوت قائم رکھنا کہ جب سکوت بمنزلہ ایک عظیم قومی گناہ کے ہے ہم سے کیونکر ممکن ہوسکتا ہے ؟۔ ہم قوم کے نمائندے ہیں۔ اور جب کہ اہم ترین قومی مقاصد معرضِ خطر میں ہوں تو کیا ایسے موقع پر ہمیں گونگا بہرا بنکر رہنا زیب دیتا ہے !

ایڈیٹر

خانہ آبادی

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

بیاہی زندگی کے کامیاب بنانے کا ایک رازیہ بھی ہے کہ نرمی تہذیب اور آشتی کا برتاؤ رکھا جاے۔ خدا جانے یہ کیا بات ہے کہ بیاہ ہوجانے کے بعد روزمرہ کے باہمی برتاؤ میں میاں بیوی ایک دوسرے کو مخاطب کرتے وقت آپس میں برتاؤ کرنے میں وہ پیارے چھوٹے چھوٹے فقرے جو زمانۂ حال کی مہذب اور تربیت یافتہ سوسائٹی میں ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی غرض سے وضع کئے گئے ہیں۔ ان سے کام لینا ترک کردیتے ہیں۔ کیا مہذب اور شائستہ سوسائٹی کے

وضع کئے ہوئے ایسے فقرات کی اب ضرورت باقی نہیں رہی ؟ کیا دونوں
کو ایک دوسرے کی محبت پر اس حد تک بھروسہ ہو گیا ہے کہ اظہار
محبت کی ضرورت اب نہیں ہے ؟ کیا بیاہی زندگی کی محبت کے نرم
اور نازک پودے نے اب اتنی گہری اور مضبوط جڑ پکڑلی ہے۔ اور
اس درجہ پائدار اور مستحکم ہو گیا ہے کہ دھوپ پانی یا شبنم سے
ہمیشہ کے لئے مستغنی ہو گیا ہے ؟ کیا نرمی اخلاق اور شریفانہ مہذب
برتاؤ صرف غیروں کے ساتھ برتنے کے لئے وضع کیا گیا ہے اور ان
باتوں کی اُنہیں کے ساتھ برتاؤ کے وقت ضرورت نہیں ہے جو ہمیں
سب سے زیادہ عزیز ہیں ؟ کیا میاں بیوی کے دل اللہ پاک نے
اتنے سخت بنائے ہیں کہ اُنہیں ایسی باتوں سے کوئی رنج نہ پہنچیگا
جو دوست احباب کی سوسائٹی میں اس درجہ معیوب خیال کی گئی ہیں
کہ اگر وہ ہم سے وقوع میں آجائیں تو ہمارا قصور کسی طرح قابل معافی
نہ سمجھا جا سکے ؟ کیا اخلاقاً ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اپنے عزیز ترین
متوسلین کے ساتھ ادب آمیز شریفانہ برتاؤ قائم رکھیں دراں حالیکہ
تربیت یافتہ سوسائٹی کے آداب کی رو سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسا
برتاؤ ایک بے تمیز دیہاتی گنوار یا بالکل ہی اجنب شخص کے ساتھ
بھی ضرور ہی قائم رکھیں ! برعکس اس کے دنیا میں کوئی مقام ایسا
نہیں ہے جہاں ہمیں اتنی تہذیب اور شائستگی صرف کرنے کی ضرورت
ہے جتنی ہمیں اپنے گھر میں صرف کرنا چاہیئے۔ دنیا میں کوئی دل اظہار

محبت کے فقرات کا اتنا بھوکا نہیں ہو سکتا جتنا ایک بیوی کا دل ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی محبت غذائے محبت کی اتنی بھوکی نہیں ہوتی جتنی میاں بیوی کی محبت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں درشتی تندمزاجی یا بے تمیزی اس حد تک ناقابل معافی ہو جتنی بیوی کے ساتھ برتاؤ کرنے میں ہو سکتی ہے۔ محبت جتنی ہی زیادہ گہری ہوگی اُتنی ہی زیادہ ضرورت اُس محبت کو سیکڑوں ہزاروں روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی موٹی باتوں میں توجہات۔ مہربانیوں مدارات۔ تواضع اور پاس خاطر کی ہوگی۔ جن کے ادا کر دینے سے دل کو سکون۔ آسائش اور اطمینان نصیب ہوگا۔ بڑے دن یا سالگرہ کے موقع پر بیش قیمت سوغات پیش کرنا چنداں ضروری نہیں ہے۔ اگر بارہ مہینے کی مدت پیار اور محبت سے خالی گزر چکی ہے تو آج ایسی سوغات پیش کرنا اُس حقیقی محبت کا خاکہ اُڑانا ہے جس کی کمی سال بھر برابر محسوس ہوا کی ہے۔ زیورات۔ ریشمی کپڑے یا ایسی ہی اور سوغات اُس خلوص اور محبت کی تلافی نہیں کر سکتے ہیں جس کی کمی برابر محسوس ہوا کی ہے۔ "بیاہی زندگی کی خوشیوں کا وجود بہت سے اقل قلیل بھول جانے والی نیکیوں سے ترکیب دیا گیا ہے۔ ایک محبت میں ڈوبا ہوا لفظ۔ ایک ہمدردی سے سرشار نگاہ۔ ایک پیار سے بھرا ہوا تبسم۔ ایک دل سے نکلی ہوئی محبت آمیز داد۔ ایک خوش آیند خیال۔ ایک ولولۂ جوش اس کے ہزاروں بلکہ بے شمار

اجزاء میں سے چند اجزاء کے نام ہیں"۔ بادی النظر میں یہ باتیں حقیر اور ناقابل توجہ معلوم ہونگی اور اِن کی عدم موجودگی عموماً کوئی محسوس نہ کریگا۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہی اجزاء محبت کی اصلی غذا ہیں۔ اور اگر یہی نہ ملینگے تو ایک محبت کرنے اور محبت چاہنے والا دل انکے بغیر گرسنہ ہی رہیگا۔ دنیا کے کاروبار میں منہمک شوہر یا خانہ داری کے افکار سے تھکی ہوئی بیوی اپنی لاپروائی سے اوائل میں اِن باتوں کی جانب بے توجہی صرف کرسکتے ہیں + اور اُس وقت یہ باتیں بہت ہی خفیف اور ناقابل توجہ معلوم ہونگی۔ مگر کچھ عجب نہیں اگر یہی کمی اِن دو ہستیوں کو ایک واحد وجود کی شکل میں تبدیل ہونے کی راہ میں حائل ہوجائے۔ اور وہی دو دل جو اِن چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ کرنے سے ایک ہو جاتے آخر کار جدا ہی رہ جاتے ہیں۔ محبت قائم رکھنے کے لئے محبت کی پرورش ہونے کی بھی ضرورت ہے۔

میاں بیوی میں محبت ہونے کے لئے وحدت اشغال بھی ازحد ضروری ہے۔ چونکہ عموماً میاں بیوی کے اشغال ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتے ہیں لہذا بڑا خوف اِس امر کا ہے کہ یہ اشغال کا اختلاف رفتہ رفتہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنے کی وجہ نہ بن جائے۔ شوہر فکر معاش کے مختلف اشغال میں سے کسی ایک خاص شغل میں منہمک رہا کرتا ہے۔ اور اُس شغل کے متعلق روز اُسے محنت شاقہ برداشت کرنا پڑتی ہے۔ بیوی کے تعلق خانہ داری کا انتظام ہوتا ہے

اور لڑکوں کی پرورش اور پرداخت۔ ایسی صورت میں میاں بیوی
کے مختلف اشغال میں کوئی حصّہ ایسا نہیں نکلتا جہاں پہنچکر
دونوں کے اشغال ایک دوسرے سے کسی نقطۂ اتصال پر مل سکیں
یہ کمی اِس طرح پوری کی جاسکتی ہے کہ ایک کو دوسرے کے شغل
اور فرائض کے ساتھ ایک محبت آمیز دلچسپی پیدا کر لینا چاہئے۔
مثلاً دن بھر کے کام دھندوں سے فراغت پاکر جب شوہر گھر آئے
تو اپنی بیوی سے دن بھر کے واقعات کی داستان مزے لے لے کر
دلچسپی کے ساتھ سُنے۔ پُرلطف واقعات کے مزے میں شریک بنے۔
پیچیدہ اور تشویش ناک واقعات کے افکار میں حصّہ لے۔ بچوں کی باتیں
اُن کی شرارتیں۔ اُن کی مزے مزے کی حکایتیں۔ ان کے پُرلطف
کھیل تماشوں کے واقعات کی لذتوں میں بیوی کا شریک حال بنے۔
کیا کیا نئی نئی باتیں ہوئیں۔ کیا کیا خبریں سننے میں آئیں۔ پاس
پڑوس محلہ ہمسایہ کی چھوٹی چھوٹی داستانیں شوق اور لطف اور
ہمدردی کے ساتھ سُنے۔ شوہر کیسا ہی بیدار مغز۔ عالی دماغ۔ بلند نظر
وسیع الخیال۔ نامور یا بلند پایہ ہو مگر ان چھوٹی چھوٹی مزے مزے
کی باتیں سُنکر اُن میں گہری دلچسپی لینا اپنی شان کے خلاف نہ سمجھے
دنیا کے بڑے لوگوں کی سوانح عمریوں میں بہت ہی کم واقعات ملتے
ہیں جو ان دلفریب چٹکلوں کی پُرحلاوت چاشنی کا مقابلہ کرسکیں۔
جہاں اُن کی خانہ داری کے واقعات اور بیوی بچوں کے متعلق

لطائف سے بحث کی جاتی ہے - ہمیں کتنا لطف آتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مشہور اور یکتائے روزگار افراد گھر کی چار دیواری کے اندر پہنچتے ہی اپنے ننھے ننھے پیارے بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اُن کی بھولی بھولی پیاری پیاری باتیں مزے لے لیکر سُنتے اور خوش ہوتے ہیں - اور بیوی سے ملتے ہیں تو دن بھر کے واقعات کی داستان اور خانہ داری کی دن بھر کی تاریخ دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ سُنتے ہیں -

علیٰ ہذا ہر زیرک صاحب سلیقہ اور عقیل بیوی کو چاہیئے کہ شوہر سے اُس کے دن بھر کے اشغال کے تمام چھوٹے بڑے واقعات گہری دلچسپی کے ساتھ سُنے اور یوں عملی طور پر سچی ہمدردی کے ساتھ اس کی شریک حال بنے - ہر ہر ذمّہ داری - ہر ہر فکر - ہر ہر تجویز اور تدبیر - ہر ہر خواہش اور ارادہ سُنکر سچی ہمدرد اور سچّی شریک حال بنے - اسے سُننا چاہیئے کہ کون کون سی کوشش کس کس معاملہ میں کامیاب ہوئی اور کہاں کہاں ناکامی یا مایوسی کا سامنا کرنا پڑا - اور اِسی طرح وہ اُس کی روزانہ کاروباری زندگی کی ذاتی افکار میں اس کی ہمدرد اور ہمخیال بنے - ترجمہ و اقتباس

(باقی آیندہ)

—— ۰۰ ✻ ۰۰ ——

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

اہل عرب کا طرز حکومت زمانۂ جاہلیت میں

یہاں اہل عرب سے ہمارا مقصد اہلِ قریش ہے۔ چونکہ قبیلۂ قریش ہی سے ظہور اسلام ہوا تھا لہٰذا ہمیں اسی قبیلہ سے بحث ہے

جاہلیت کے زمانہ میں صحرائی عربوں کا طرز حکومت ہمیشہ ایک ہی تھا۔ بادشاہِ وقت کی ذات واحد کے ساتھ مختلف فرائض وابستہ تھے۔ وہ والئ ملک یا بادشاہِ وقت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ وہ عہدۂ قضا کے سارے فرائض خود ہی ادا کرتا تھا۔ وہ وزیر خزانہ کے تمام فرائض کی انجام دہی کا ذمہ دار تھا۔ وہ کمانڈر انچیف عساکر شاہی کی خدمات بھی خود ہی انجام دیتا تھا۔ قصّہ مختصر چھوٹے بڑے تمام اہم فرائض اور ذمہ داریاں سب اسی کے سر تھیں۔ نہ وہاں کوئی سازشیں چلتی یا چلنے پاتی تھیں۔ نہ وہاں بادشاہِ وقت کے انتخاب کے موقع پر لڑائی جھگڑا تکرار فساد خونریزی ہوتی تھی۔ قوم کی کثرت رائے سے جو شخص سب سے زیادہ اِن خدمات کا اہل امین اور معتمد سمجھا جاتا تھا وہی بادشاہ بنا دیا جاتا تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں اہلِ قریش کا شاہی انتخاب دنیا کی تواریخ میں زمانۂ حال کی سلطنت جمہوری کا اوّلین نمونہ تھا۔

اگر کبھی ایسی صورت پیش آجایا کرتی تھی کہ ایک سے زیادہ

اشخاص مساوی قابلیت اور اعتبار کے ٹھیرتے تھے تو اُن سب میں
جو باعتبار سن وسال سب سے بڑا اور سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار
ہوتا تھا اُسی کا انتخاب ہو جاتا تھا۔ علیٰ ہذا جنگ کی حالت میں اگر
کئی مختلف قبائل ایک ساتھ شریک ہو کر جنگ کرتے تھے اور اس امر کا
تصفیہ کرنا منظور ہوتا تھا کہ اِن قبیلوں کے سرداروں میں کس قبیلہ کا
سردار کمانڈر انچیف افواج متحدہ بنایا جاوے تو سب سرداروں کے نام
یکجا کر کے قرعہ اندازی کرتے تھے۔ جس کا نام نکلتا تھا وہی کمانڈر انچیف
مان لیا جاتا تھا۔ قرعہ اندازی اگر ہوتی تھی تو قرعہ کا فیصلہ قطعی ہوتا
تھا۔ اور اس فیصلہ کے بعد خوردی اور بزرگی کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا

یہ حالت صحرائی اہلِ عرب کی تھی۔ مگر شہری عرب اہلِ مکہ تھے
اِن میں یہ دستور تھا کہ خانۂ کعبہ کا خادم سردارِ قوم ہوتا تھا۔ اب
جبکہ خانۂ کعبہ کی خدمت اہلِ قریش میں آگئی تو وہی سردار قوم مان
لئے گئے۔ یہاں کسی دلیل اور کسی حجت کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ایک
قاعدہ مقررہ تھا۔

(باقی آیندہ)

شیعہ کالج کا علی گڈھ کالج سے الحاق

(قومی شیرازہ پراگندگی سے بچانے کی صرف ایک ہی راہ)

ہم ہندی مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے "اسلام" کے کیا معنی ہیں اور اِس لفظ سے ہمارا کیا مفہوم ہے ؟ شیعہ اور سنیوں کی متحدہ قوت کا نام اسلام ہے۔ نہ تنہا سنیوں کی قوت "اسلام" کا مفہوم ادا کرسکتی ہے اور نہ محض شیعوں کی۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک قوت علٰحدہ ہوکر اگر کوئی کام کرے گی تو وہ کام اُس خاص قوت کے نام سے موسوم ہوسکیگا نہ کہ اسلام کے نام سے۔ جب تک دونوں قوتوں کا مرکز واحد ہے اور دونوں اُسی مرکزی حرکت کے عمل واحد کے تابع رہکر کوئی کام کرینگی وہ کام اسلامی کام ہوگا۔ جس وقت ان میں سے کوئی بھی اِس مرکز سے جُدا ہوکر کوئی نیا مرکز قائم کریگی اُسی وقت اِس کے اُس معینہ مرکز سے تجاوز کرتے ہی قومی شیرازہ کے وہیں سے صاف دو ٹکڑے ہوجائیں گے اور اِس کا لازمی نتیجہ ابتری ہوگا۔

کوئی دیانت دار اہلِ نظر اِس سے انکار نہیں کرسکتا کہ قومی کانفرنس سے جدا کرکے جس وقت شیعہ کانفرنس کا ایک جداگانہ مرکز قرار دیا گیا ہمارے قومی شیرازہ کا جوڑ جوڑ اُسی وقت ڈھیلا ہوگیا۔ یہ ایک بدیہی واقعہ ہے چاہے ہم اِسے پسند کریں یا نہ کریں۔ یہ بات ہی اَور ہے۔ ہمارے باتیں بنا دینے سے واقعات اپنی صورت نہیں بدل سکتے۔

مگر ان فقرات سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم اپنے قوت بازو پیارے شیعہ بھائیوں کو مورد الزام ٹھیرائیں - ہمیں معلوم ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ کیا اشد ضرورت سے مجبور ہوکر کیا اور بالکل ہی نیک نیتی کے ساتھ کیا - ہمیں اُن پر الزام رکھنے کا کیا حق ہے جب ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ اُنہیں نے اسلام کو اعلیٰ درجہ کا ایک اَور نیا کالج دیا - حقیقت میں ہم اُن کے ممنون احسان ہیں - اور ہمیں اُن کا شکر گزار ہونا چاہیئے نہ کہ ان کا حرف گیر اور عیب جو ہونا !

بادی النظر میں ہمارے اوپر کے فقرات اجتماع ضدین کی صورت پیدا کرتے ہوے دکھائی دینگے مگر آگے چلکر ہمارا مطلب صاف واضح ہو جائیگا -

ہم اپنے "شیعہ کالج نیوز" والے مضمون میں دکھا چُکے ہیں کہ ہماری قومی ضروریات کے لیئے ایک اکیلا علی گڈھ کالج بالکل ناکافی ہے بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہمیں علی گڈھ کالج کے ہوتے ہوئے کسی اَور قومی کالج کی کوئی مدد نہ کرنا چاہیئے - یہ خیال بالکل غلط اور سراسر غلط ہے - مضمون مذکور میں ہم نے دکھایا ہے کہ ہر صورت میں کم سے کم ایک کرور زیر تعلیم اور قابلِ تعلیم بچے ہمارے سامنے موجود ہیں جو ہندوستان کے قریب و بعید نزدیک و دور حصوں کے دیہات قصبوں اور شہروں میں بسے ہوے ہیں علی گڈھ کالج تک ہمارا ہر ہر بچہ نہیں پہنچ سکتا اور بفرض محال اگر پہنچ بھی سکے تو علی گڈھ کالج

میں زیادہ سے زیادہ صرف سات سو بچّوں کی گنجائش نکل سکتی ہے۔
اب آپ ہی فرمائیے کہ ان ایک کرور بچّوں میں سے سات سو کو تو
آپ علی گڈھ بھیجیں گے۔ باقی سات سو کم ایک کرور کو آپ کہاں
لیجانا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں!
ہمارے عوام الناس کا یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علی گڈھ کالج کے
ہوتے ہوئے کوئی دوسرا کالج اگر بنیگا تو علی گڈھ کالج کے ضعف کا
باعث ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ ایک نہیں
ہزاروں کالج بھی اگر ہم قائم کرلیں تو ہمارا کوئی نقصان سوا فائدہ کے
نہیں ہوسکتا۔ البتہ شرط صرف اِتنی ہی ہے کہ سب کے سب ایک ہی
مرکزی قوت کے تابع رہکر کام کریں اور وہ مرکزی قوت شیعہ اور سنیوں
کی متحدہ قوت ہو۔ جب تک یہ مرکزی قوت اپنی جگہ پر قائم ہے اور اُسکی
برقی رَو تمام شعبہ جات پر یکساں حاوی ہے قومی شیرازہ کبھی پراگندہ
نہیں ہوسکتا۔ مگر اس مرکزی قوت کے نظام میں ذرا سا بھی فتور
واقع ہوگا تو اس کا اثر نزدیک و دور برابر پہنچیگا اور ابتری پھیلائیگا
ہم اِس مسئلہ کو آسان مثالیں دیکر سمجھائینگے۔ فرض کیجیے دہلی کے
سارے شہر کا ہر ہر محلہ برقی روشنی سے روشن کیا جاتا ہے۔ ہر ہر محلہ کے
ہر ہر مکان میں برقی روشنی ایک تار کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے
برقی قوت کا ذخیرہ ایک معینہ مرکز پر رہتا ہے۔ جب تک دہلی کے
ہر ہر گھر میں روشنی پہنچانے والا ہر ہر تار۔ اِس مرکزی ذخیرہ سے ملا ہوا

ہر ہر گھر میں برابر روشنی پہنچتی رہیگی۔ جس جس گھر میں پہنچنے والا تار اس مرکزی ذخیرہ سے علیحدہ ہوتا جائیگا وہیں روشنی کبھی نہ پہنچیگی۔ ہاں اگر ان گھروں کے لئے برقی قوت کے ذخیرہ کا کوئی علیحدہ مرکز بنا دیا جاے تو بیشک یہاں بھی روشنی پہنچ سکیگی۔ مگر آپ چاہیں کہ علیحدہ علیحدہ مرکز ایک ہی مرکز سمجھے جائیں تو یہ بات حاصل نہ ہوگی جب تک ایک برقی تار کے ذریعہ سے یہ دونوں مرکزی ذخیرے ایک نہ کر دئے جائیں اور یہی ہمارا مقصود ہے۔ ایک اَور مثال لیجئے۔ سارے صوبہ کے حسابات کی جانچ پرتال کے لئے اکاونٹنٹ جنرل کا دفتر صوبہ کے صدر مقام الہ آباد میں قائم کیا گیا ہے۔ کیا آپ یہ دلیل پیش کرسکتے ہیں کہ اس مرکزی دفتر کے ہوتے ہوئے ہمیں سارے صوبہ میں کسی اور دفتر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی دفتر سارے صوبہ کے حسابات کے لئے کافی ہے! مقامی خزانہ جات جو ہر ہر ضلع اور ہر ہر تحصیل میں کھلے ہیں کیا وہاں کے دفتر حسابات آپ توڑ دینگے! آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں! اگر الہ آباد کے صدر دفتر کے ہوتے ہوے اَور بہت سے مقامی دفتروں کی بھی ضرورت ہے تو علی گڈھ کالج کے ہوتے ہوئے اَور مقامی کالجوں کی بھی ضرورت ہے۔ مگر جس طرح ہر ہر دفتر ایک ہی محکمہ سے متعلق ہو اور سب کا نظام ایک ہی مرکزی قوت کے تابع ہے یہی صورت یہاں بھی پیدا ہونا چاہیئے یعنی یہ مرکزی قوت شیعہ اور سنیوں کی متحدہ قوت صحیح اَور اصلی معنوں میں ہونا چاہیئے۔

"شیعہ کالج نیوز" والے مضمون میں ہم دکھا چکے ہیں کہ ہماری تعداد ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے وقت سات کرور تھی۔ ۱۹۱۱ء کو اب پانچ برس ہو چکے۔ اِس عرصہ میں ہماری تعداد میں ہر سات آدمیوں کی تعداد پر صرف ایک ہی کا اضافہ مان لیا جائے تو ہماری تعداد آٹھ کرور ٹھیرتی ہی۔ ہم اِس مردم شماری کا صرف آٹھواں حصّہ زیر تعلیم اور قابلِ تعلیم بچّوں کا فرض کئے لیتے ہیں۔ جو کسی طرح مبالغہ آمیز نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ آٹھواں حصّہ ایک کرور ہوا۔ علی گڈھ میں زیادہ سے زیادہ سات سو بچّوں کی تعلیم کی گنجائش ہے۔ سات سو بچّے علی گڈھ کالج میں بھیج دینے کے بعد باقی بچّوں کے لئے کتنے اَور کالجوں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ذرا آپ ہی حساب لگا کے دیکھ لیجئے۔ سادہ تقسیم کا سوال ہے۔ اگر ہر سات سو بچّوں کی تعداد پر ہم ایک کالج دینے کے لئے تیّار ہوں تو کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آج ہی کتنے اَور کالجوں کے بنانے کی ضرورت پڑتی ہے؟ اِن کالجوں کی تعداد چودہ ہزار دو سو پچّاسی ہوگی! کیا اب بھی آپ فرمائینگے کہ صرف علی گڈھ کالج ہی ہماری ساری تعلیمی ضروریات کے لئے کافی ہے!

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ شیعہ کانفرنس کا ایک جُداگانہ مرکز قرار پا جانے سے قومی شیرازہ کا جوڑ جوڑ ہل گیا ہے۔ مگر کیا یہ مرض لا علاج ہے؟ کیا اس کا کوئی علاج باقی نہیں رہا؟ کیا اب ہمیں

بالکل ہی مایوس ہو جانا چاہئے اور قومی تباہی کے لئے گھڑی ساعت کے منتظر ہو کر بیٹھنا چاہئے ؟ کیا اب ہم کچھ نہیں کر سکتے ؟ کیا ہر تدبیر ہر کوشش بیکار ثابت ہو گی ؟ کیا کوشش کرنا ہی بے سود ہے ؟ نہیں اور ہرگز نہیں - بگڑی ہوئی بات اب بھی بن سکتی ہے اور ایسی بن سکتی ہے کہ باید و شاید - ہاں البتہ ہمیں اپنی متحدہ قوت صرف کرنا پڑیگی اور ہم میں سے بعض لایق قابلِ فخر فرزندان قوم کو اپنے ایثار حب الوطنی اور سچی قومی ہمدردی کا عملی ثبوت دینا پڑے گا - اگر یہ باتیں ممکن ہیں تو سب کچھ ممکن ہے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ یہ سب باتیں اچھی طرح ممکن ہیں -

ہماری کامیابی کی صرف ایک ہی راہ ہے - اِس کے سوا دوسری راہ نہیں ہے - اگر کوئی دوسری راہ ہے تو آپ ہی فرمائیں کہ وہ کون سی راہ ہے ؟ ہمیں جو راہ نظر آتی ہے وہ یہی اور صرف یہی ہے کہ شیعہ کالج کی مرکزی قوت اسلامی کالج کی مرکزی قوت سے متحد کر دی جاے - اس کی عملی صورت صاف الفاظ میں یہ ہے

ہم آج ہی یہ بات اپنے مستقل پروگرام میں درج کر لیں کہ علی گڈھ کالج کا عہدۂ آنریری سکرٹری جب اور جس وقت خالی ہو ہم سب یکدل و یک زبان ہو کر بلا کسی ایک مخالف آواز کے فخر قوم نواب حاجی فتح علی خاں صاحب قزلباش سی - آئی - ای سکرٹری شیعہ کالج کو علی گڈھ کالج کا سکرٹری منتخب کر دیں - اگر خود نواب صاحب

ممدوح بھی کوئی عذر پیش کریں تو کبھی کسی حال میں سماعت نکریں اور اُن سے مودبانہ عرض کردیں کہ قوم کی متفقہ آواز کے خلاف فیصلہ کرنا اُن کی شان سرداری سے بعید ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کی ذات پر دو دو کالجوں کے انتظام کی ذمہ داریوں کا حد سے زیادہ بار پڑجائیگا مگر اللہ پاک نے اُنہیں صحت قوت عزت دولت و ثروت غرضکہ اپنی تمام بہترین نعمتوں سے مالامال کر رکھا ہے اور یہ اُن کی شان کے شایاں نہیں ہے کہ قوم کی آس توڑیں۔

صرف یہی ایک اکیلی صورت ہے جس کے عملی جامہ پہنتے ہی ایک چشم زدن میں کایا پلٹ ہوجائیگی اور جو بات اس وقت ہمارے ضعف کی دلیل نظر آرہی ہے وہی ہماری زبردست قوت کا جیتا جاگتا ثبوت بن جائیگی۔ یہ گویا ایک چھومنتر کا عمل ہوگا جس کے پڑھتے ہی شیعہ اور اسلامی کالج۔ شیعہ کانفرنس اور اسلامی کانفرنس یک جان و دو قالب بن جائیں گے۔ اُمید کی خشک جڑیں ایک آنِ واحد میں شاداب ہوجائینگی اور قوم کا پژمردہ چمن فوراً ہرا بھرا پھولا پھلا بن جائیگا۔

کچھ اِس کی ضرورت نہیں ہے کہ نواب صاحب بالقابہ کی ذات واحد پر کام کا اتنا بار ڈال دیا جائے کہ وہ اُکتا جائیں اور مہینے ہی بھر میں کہنے لگیں کہ مجھ سے اتنا کام ہونا ممکن نہیں ہے

علی گڈھ کالج کے اندرونی انتظامات کے روبراہ رکھنے کے لئے ہمارے پاس کافی سے زیادہ اسٹاف موجود ہے۔ آنریری سکرٹری کا کام قلم گھسنا نہیں ہے۔ اُس کا سارا کام دماغی اور انتظامی ہے۔ کالج کی پالیسی برقرار رکھنا۔ اُس کا نظام درست رکھنا اور تمام اہم معاملات کو مسلمہ بہترین اصول کے مطابق چلانا سکرٹری کا اصلی منصب ہے۔ جزئیات کی دیکھ بھال اور عملی طور پر سارے معمولی کام چلانے اور روبراہ رکھنے کے لئے ہمارے قابلِ فخر فرزند قوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب موجود ہیں۔ اور اُن کی موجودگی میں نواب صاحب کو ہر ہر چھوٹے معاملہ میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اسی طرح ایک قابل معاملہ فہم اور روشن خیال جوائنٹ سکرٹری شیعہ کالج کے لئے بھی تجویز کر لئے جائیں۔ پورے دو سال اس طرح کام چلانے کے بعد شیعہ کالج کے جوائنٹ سکرٹری کا تبادلہ علی گڈھ کالج کے جوائنٹ سکرٹری سے کر لیا جائے۔ اسکے بعد سال ختم ہونے پر دونوں جوائنٹ سکرٹریوں کے کام کی جانچ کی جائے اور ان دونوں میں سے جس نے اچھا کام کیا ہو اُسے سونے کا تمغہ اور سونے کا ہار پہنا کر اس کی عزت افزائی کی جائے اگر دونوں کا کام مساوی ٹھیرے تو دونوں کا مساوی اعزاز کیا جائے اس کے بعد تین تین سال کام کرنے کے بعد جوائنٹ سکرٹریوں میں اس طرح باہم ردوبدل ہوا کرے تاکہ دونوں کالج ایک ہی

مشین کے پُرزے بنے رہیں۔

ہم اِس مضمون کو ختم نہیں کر سکتے جب تک ایک اَور اہم بات ضبط تحریر میں نہ لائیں جس کے بغیر ہمارا مضمون ادھورا رہا جاتا ہے صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب سالہاسال سے بلا معاوضہ علی گڈھ کالج کا کام کر رہے ہیں اور اپنے بیش قیمت اوقات کا بہت بڑا حصّہ اِس کام میں صرف کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کر کے سخت رنج ہوا کہ بعض اہلِ اخبار نے بے سوچے سمجھے بلا تحقیق اُنکے خلاف مضامین شائع کر کے اُن کا دل دُکھایا۔ ہم نہیں کہتے کہ صاحبزادہ صاحب موصوف کوئی فرشتہ ہیں اور اُن سے غلطیاں ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔ مگر ہمارا سب سے پہلا فرض ہے کہ ہم پہلے تحقیق کریں کہ جو جو شکایات سنی جاتی ہیں وہ کہاں تک اصلیت پر مبنی ہیں۔ اگر بعض شکایات صیحح بھی ٹھیریں تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ غلطیاں کس قسم کی ہیں ایا محض انسانی سہو و خطا سے متعلق ہیں یا کیا۔ شامت اعمال سے ہم میں کام کرنے والے افراد بہت کم ہیں اور حرف گیری کرنیوالے بہت۔ اگر ہم ذرا ذراسی بات میں اِس طرح کام کرنے والوں کا دل توڑینگے تو ہمیں کام کرنے والے کہاں سے میسر آسکیں گے۔ جناب صاحبزادہ صاحب کا بدترین دشمن بھی اِس بات کو تسلیم کر لیگا کہ اُنھوں نے کبھی قوم فروشی نہیں کی نہ ذاتی اغراض پر قومی فوائد کو قربان کیا۔ اس قحط الرجال کے زمانہ میں کیا یہی اعلیٰ اوصاف

اُنہیں سچی عزت کا مستحق نہیں بناتے ہیں! ہم سچے دل سے کہتے ہیں
کہ اگر اس وقت معاملات کی یہ خاص صورت پیدا نہ ہوگئی ہوتی تو
صاحب زادہ صاحب سے زیادہ کوئی عہدہ آنریری سکرٹری کا مستحق نہ ٹھیرتا
اور ہم سب سوا اُن کے کسی اَور کا نام وقت آنے پر کسی حال میں
زبان پر نہ لاتے۔ مگر نظر بحالات موجودہ قومی ضروریات کا احساس
بھی اُن سے زیادہ کسے ہو سکتا ہے۔ اور ہمیں اُن کی دانشمندی
حُب الوطنی۔ ایثار اور سچّے قومی جوش سے قوی اُمید ہے کہ محترم
نواب صاحب کے انتخاب کے معاملہ میں ذاتی اعزاز کو قومی فلاح
پر کبھی کسی حال میں فوق نہ دینگے۔ ہمیں اچھی طرح ذہن نشین
کر لینا چاہیئے کہ ہماری قومی ہستی معرض خطر میں ہے۔ ہمارا قومی
شیرازہ پراگندگی پر مائل ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم اس کا فوری انسداد
نہیں کرتے تو خوف ہے کہ یہ خوفناک مرض لاعلاج نہ ہو جائے۔
اس موقع پر ضبط۔ صبر۔ تحمل۔ ایثار کی انتہائی قوتیں صرف
کرنے کی ضرورت ہے۔ تدبّر اور دانشمندی کا کام ہے۔ ابھی تک
کچھ نہیں بگڑا ہے۔ ہماری مقصد برآری بالکل ہمارے اپنے ہی
ہاتھ میں ہے۔ اس موقع پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیئے
ہمیں کوئی لفظ زبان سے نہ نکالنا چاہیئے جب تک ہم اچھی طرح
نہ سمجھ لیں کہ اِس کا کیا اثر اور کیا نتیجہ ہوگا۔ ہم میں سے ہر ہر متنفس
کو اپنی اہم قومی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے

اور ہم جو بات زبان سے نکالیں اُس کے ہر ہر لفظ کی پوری پوری ذمہ داری
کا احساس کر لینے کے بعد نکالیں۔ یاد رکھئے کہ ایسے نازک موقع
پر جس طرح ایک محبت بھرا ہوا لفظ ایک قلب مضطر کے لئے ایک
شکستِ قلب مرہم بن سکتا ہے اسی طرح ایک سخت کرخت یا ناگوار
لفظ ایک محبت سے لبریز دل پر ایک ایسی وحشیانہ ٹھیس لگا سکتا
ہے جس کا بُرا اثر مدتوں زائل ہونا دشوار ہو جائے۔

آزاد بیگم



"انجمن تنزّل اُردو" کے معرکۃ الآرا کارنامے

قومی اور ملکی مسائل پر نظر ڈالتے وقت ایک دیانت دار
ایڈیٹر کا فرض ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنے دل سے سوال کرے
کہ مَیں کس کا نمایندہ ہوں ؟ قوم اور ملک کا یا کسی اَور کا ؟
اگر وہ قوم اور ملک کا نمایندہ ہے تو اُس کا حقیقی اور اصلی فرض
کیا ٹھیرا ؟ قوم اور ملک کی بہی خواہی۔ ہم بے دلیل تسلیم
کئے لیتے ہیں کہ کسی کے ساتھ برائی نہ کرنا ایک بہترین اخلاقی اور
انسانی صفت ہے۔ مگر کیا محض اِس نظر سے کہ لوگ ہماری
تعریف کریں۔ اور ہمیں نیک۔ بے نفس۔ فرشتہ صفت۔ اور
صلح کُل کے معزز لقب سے یاد کریں۔ ہمیں اپنے تمام قومی ملکی

اور اخلاقی فرائض بھلا دینا چاہیئے؟ کیا ہمیں محض اپنی ذاتی خوبیوں کی تعریف کرانے کے شوق پر اپنے تمام ملکی قومی اور اخلاقی فرائض قربان کر دینا چاہیئے؟ سوال تو یہ ہے۔

یہاں ایسا موقع در پیش ہے کہ اگر ہم ساکت رہیں اور کچھ نہ بولیں تو ممکن ہے کہ بہت سے لوگ واہ واہ کرنے والے آسانی سے مل سکیں گے۔ مگر ہم چپ رہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ نہ ہم کسی حال میں اُس بھروسہ کے اہل ہو سکتے ہیں جو قوم اور ملک کو ایک اعلیٰ پایہ کے ایڈیٹر پر ہونا چاہیئے اور نہ ہم میں قوم کے لئے کوئی مفید کام کرنے کی صلاحیت رکھنے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ جس حال میں کہ ہم صاف اور صریحی طور پر دیکھ رہے ہیں کہ ایک شدید غلطی ہو رہی ہے۔ وہ غلطی ہمیں اچھی طرح نظر آ رہی ہے مگر بہتوں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ رہی ہے تو کیا ایسے موقع پر ہمیں چپ رہنا چاہیئے؟

یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر "اُردو کانفرنس" کے خلاف ہمیں صدا بلند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم "انجمن ترقی اُردو" کے متعلق اپنے خیالات کا ظاہر کرنا اپنا ایک اہم ترین فرض خیال کرتے ہیں۔ البتہ جس طرح اُس موقع پر ہمیں بعض کڑوی باتیں کہنا پڑی تھیں یہاں بھی ضرورت ہمیں صاف گوئی ہی پر مجبور کر رہی ہے۔ اِس صاف گوئی سے اگر کسی صاحب کا دل دُکھے تو وہ ہمیں معاف کریں۔ اگر ایک واحد متنفس کا دل دُکھائے بغیر چارہ ہی نہیں ہے

توہم مجبور ہیں کیونکہ محض اسی خوف کی بنا پر ہم اپنا ایک فرض عظیم ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرسکتے۔

مسٹر عبدالحق بی۔ اے کی ایڈیٹری میں کتاب "دریائے لطافت" حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور لایق مسٹر عبدالحق صاحب کا "مقدمہ" قوم اور ملک کی عدالت مجاز کی پیشی میں ہے۔ اِس عدالت العالیہ کے جج منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت شوق کون ہیں اور کس پایہ کے بزرگ ہیں۔ اور اُن کا فیصلہ کیا حکم رکھتا ہے۔ ہمیں سارے ملک ہندوستان کے اندر ایک شخص بھی نظر نہیں آتا جو آپ کے فیصلہ میں چون وچرا کی مجال رکھتا ہو۔ آپ اُردو علم ادب کی سلطنت جمہوری کے ہائی کورٹ کے ذی اختیار جج ہیں۔ ہم آپ کی تجویز کی نقل قوم کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ہم اس فیصلہ میں سے اتنا ہی حصہ لیتے ہیں جتنا مسٹر عبدالحق کے "مقدمہ" اور مسٹر عبدالحق کی ادبی قابلیت پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت شوق خود ہی فرماتے ہیں کہ مسٹر عبدالحق کے "مقدمہ" میں زبان کی اغلاط پر آپ نے بالکل توجہ نہیں فرمائی ہے۔ البتہ اِس تنقید کے اندر عبدالحق صاحب کے جو فقرات آگئے ہیں صرف اُنہیں فقرات کی چول سیدھی کر دی ہے۔ اس حساب سے اگر پورے "مقدمہ" کی زبان پر اصلاح کا قلم اُٹھایا گیا ہوتا تو اس مقدمہ کے حجم سے دوگنا سہ گنا حجم اصلاح کا ضرور ہو جاتا۔

دریائے لطافت

اور

مسٹر عبدالحق بی۔ اے کا "مقدمہ"

(نوشتۂ جناب منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی از رامپور)

"دریائے لطافت" چھپ کے شائع ہو گئی۔ اس پر مسٹر عبدالحق بی اے (آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اُردو) کا مقدمہ بھی چھپا ہے۔

یہ کتاب کچھ انشاء اللہ خان کی اور کچھ مرزا قتیل کی ہے۔ اس اعتبار سے اچھی ہے کہ ۱۲۲۳ہجری میں اُردو پر لکھی گئی تھی جس کو آج تک ایک سو بارہ ۱۱۲ برسوں کا زمانہ گزرا ہے۔ زبان کے تغیرات جو ایک صدی میں ہو گئے، اُن کا ٹھیک پتہ اِس سے مل سکتا ہے، اور جو اُصول انشاء نے بیان کئے ہیں اُن سے آیندہ کی تصنیفات کو بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کتاب نواب سعادت علیخاں کے فرمانے سے لکھی گئی مگر یہ تعجب ہے کہ اِس میں لکھنؤ کی زبان پر بہت حملے کئے گئے ہیں، حالانکہ جو زبان دہلی کی اُس وقت دکھائی گئی ہے اگر یہی تھی۔ تو حیرت کے قابل ہے۔ شاہجہان آباد کی زبان کے موازنہ میں کثرت سے پورب کا لفظ لکھا گیا ہے، اور پورب کا حوالہ دے کے زبان وہ لکھی گئی ہے جو سو برس پیشتر بھی لکھنؤ کی زبان نہ تھی، اُس وقت کی تصنیفات آج موجود ہیں، جو اس بول چال کو لکھنؤ سے ٹکسال باہر کہتی ہیں، جیسے انشا نے پورب کا

نام لے کر لکھنؤ کے سر رکھا ہے۔

یہ قیاس کہ لکھنؤ کو بھی انشاء نے پورب میں داخل کیا ہے، اُنکے اِس جملے سے صرف قیاس نہیں رہتا، بلکہ یقین بنجاتا ہے، لکھتے ہیں:-

"و بعضے حروف و حرکات ہم دلالت کنند بر شاہجہان آبادی بیرونی مثلاً ہرگاہ اہل دہلی شاہجہاں پور را از زبان بر می آرند اظہار واو در پور (پُر) بروزنِ خور کہ بمعنی آفتاب است، می گویند و پوربیان پور بروزن نور ادا نمایند صفحہ ۳" ....

"دُردانۂ چہارم" میں انشا نے دہلی کی اصطلاحیں کثرت کے ساتھ لکھی ہیں - اِنہیں میں ضرب الامثال بھی ہیں - یہ حصہ اچھا بھی ہے اور بُرا بھی - اچھا اِس اعتبار سے ہے کہ مصطلحات کا ذخیرہ یکجا نظر آتا ہے اور بُرا اِس اعتبار سے ہے کہ مَردوں - عَورتوں - بازاریوں - شہدوں، لڑکوں، وغیرہ کی اصطلاحیں اور مثلیں بلا تمیز مہذب اور غیر مہذب کے - اور بغیر تشریح فصیح اور غیر فصیح کے - سب سلسلے کے ساتھ اکٹھا لکھ دی ہیں، اہل زبان یا زباندان فرق امتیازی قائم کرسکتا ہے مگر اُسکو اِن کے دیکھنے کی ضرورت کم، اور ناواقف اِنہیں دیکھ کے دھوکے کھائے گا، بے محل استعمال کریگا اور واقف کاروں میں ہنسا جائیگا۔

....

انشاء نے سعادت یارخان رنگین سے لے کے دہلی کی عورتوں کے محاورے بہت اچھے لکھے ہیں اور بعض جگہ یہ بھی دکھا دیا ہے کہ یہ محاورہ

مردوں اور عورتوں میں مشترک ہے۔

اُردو کی صرف و نحو کے حصّے بیشک نہایت عمدہ ہیں، انشا کی قابلیت اور اُن کے دماغ کی قوت قابل داد ہے کہ آج سے ایک سو بارہ[۱۱۲] برس پہلے اُنہوں نے وہ نکات بیان کئے ہیں جن تک آج بھی لوگوں کا دماغ شاید کم پہنچتا ہو، جو لوگ اُردو کو علمی مذاق کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہوں۔ اُن کو دریاے لطافت کے ان دونوں جزیروں کی سیر ضرور کرنا چاہیے۔ انشا نے ایک حصّہ تذکیر و تانیث کا بھی لکھا ہے، یہ بھی بہت ہی اچھا ہے۔ دیکھنے کے قابل یہ خوبی ہے کہ اُس زمانے کے اساتذہ جیسے میر یا سودا جس مونث لفظ کو مذکر کہہ گئے ہیں، انشا نے اُس کو مونث ہی ظاہر کیا ہے اگرچہ یہ لکھ دیا ہو کہ باوصف مونث ہونے کے بعض نے مذکر کہہ دیا ہے۔ مثلاً "جان" یہ لفظ انشا کی تحریر سے اُس وقت بھی مونث ہی تھا۔ مگر میر مذکر کہہ گئے ہیں۔

سیکڑوں عاشقوں کا جان گیا پر نہ تیرا یہ امتحان گیا (میر)

انشا نے کتاب کے آخری حصّے میں طبیعت کی عجیب جولانی دکھائی ہے، غلط اجتہاد کی کُند چھُری صحیح اُردو کی گردن پر ایسی بے رحمی سے پھیری ہے کہ الٰہی توبہ۔ تعجب پر تعجب یہ ہے کہ مسٹر عبدالحق بی اے (انجمن اُردو کے آنریری سکرٹری) نے بھی اُس غلط اجتہاد کی تائید کی اور جو مقدمہ اُنہوں نے "دریاے لطافت" پر لکھا ہے۔ اس میں متانت سے تجاوز کر کے لکھنؤ پر کھُلّم کھُلّا چوٹ کر دی۔

مسٹر عبدالحق کے الفاظ یہ ہیں :-

بعض اصحاب جنہیں صحتِ لغت کا اِسی قدر خیال رہتا ہے جیسے ایک مومن متقی کو ادائے ارکانِ صلوٰۃ کا، اور خصوصاً ثقات لکھنؤ بہت جزبز ہونگے (صفحہ ۴ - مقدمہ)

یہ خدا کی شان ہے کہ مسٹر عبدالحق "ثقات لکھنؤ" پر مُنہ آئیں! اُن کے مقدمے کا ایک جُملہ جسے میں نے یہاں نقل کرکے دکھایا ہے۔ اسی سے اُنکی زبان دانی ظاہر ہے۔

"اسی قدر خیال رہتا ہے جیسے ایک مومن متقی کو" الخ

ایسی با محاورہ اُردو جب ثقاتِ لکھنؤ لکھ نہ سکیں گے، تب آپ ہی جھیپ کے جزبز ہوں گے۔ حضرت سکرٹری صاحب معاف فرمائیے، اگر لکھنؤ کا کوئی ثقہ آپ سے یہ پوچھے کہ "اسی قدر" کے بعد "جس قدر" کی ضرورت تھی۔ نہ کہ "جیسے" کی۔ تو کیا جواب ہوگا؟ بجائے اظہار مقدار کے جملہ مثالیہ میں آپ "وضع فعل" متعلق بہ صفت لائے۔ جُملے کی یہ ترکیب کتنی صحیح رہی!

ثقات لکھنؤ بڑے نادان ہیں کہ صحیح اُردو پر مٹے ہوئے ہیں۔ آپ سے غلط اُردو نہیں سیکھ لیتے۔

میں نے مقدمہ کا صرف ایک ہی جملہ دکھا دیا۔ جو "ثقات لکھنؤ" پر طنز کا پہلو رکھنے سے میری بحث کا ایک جزو ہو گیا تھا۔ اگر پورا مقدمہ نکتہ چیں نگاہ سے دیکھا جائے تو بہت مقاموں پر حضرت کا قلم غلط بول چال کی خندقوں میں مُنہ کے بَل گرا ہے۔

اَب مَیں انشا کا وہ غلط اجتہاد دکھاتا ہوں جس کی غلط تائید مسٹر عبدالحق نے کی ہے۔ انشا کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد۔ عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سُریانی یا پنجابی۔ یا پوربی۔ از روے اصل غلط باشد یا صحیح۔ آں لفظ لفظِ اُردوست اگر موافقِ اصل مستعمل است۔ صحیح است۔ و اگر خلافِ اصل است۔ ہم صحیح است۔ صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پذیرفتن در اُردوست زیرا کہ ہر چہ خلافِ اُردو است۔ غلط است۔ گو در اصل صحیح باشد۔ و ہر چہ موافقِ اُردو است۔ صحیح باشد۔ گو در اصل صحت نہ داشتہ باشد (صفحہ ۲۴۱)

اِس لکھنے کے بعد انشا نے مثال کے طور پر ۳۷ الفاظ ایسے لکھے ہیں جنکی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ان کو اور مثل اِنکے اَور بہت سے الفاظ کو جن کا حصر اُن سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اُردو کے صحیح الفاظ سمجھنا چاہیئے اگرچہ اصلیت کے اعتبار سے غلط ہے۔ مسٹر عبدالحق مجھے معاف فرمائیں۔ اگر میں یہ سچی بات کہوں کہ وہ نہ اُردو کے اہل زبان ہیں۔ نہ زبان داں ہاں۔ اِس حیثیت سے کہ انجمن ترقی اُردو کے سیکرٹری ہیں۔ اُردو کے محسن ضرور ہیں۔ اُصولِ اُردو کی ناواقفیت نے اُن کے دماغ کو اُس فروگذاشت تک نہ پہنچنے دیا۔ جو انشا سے ہو گئی تھی۔ فروگذاشت یہ ہے کہ انشا نے "عوام" اور "عام" کی صراحت نہیں کی۔ اصولاً "عوام" کا اطلاق ادنیٰ طبقے والوں پر ہے۔ جن کی بول چال اُردو کی قلمرو میں

ٹکسال باہر قرار دی گئی ہے۔ اور "عام" میں فصحا بھی داخل ہیں۔ یعنی "غلط العام" وہ ہے۔ جو ادنیٰ طبقے سے اعلیٰ طبقے تک بے تکلف بول چال میں داخل ہو جائے۔

مسٹر عبدالحق کے مقدمہ کی عبارت کا ایک ٹکڑا یہ ہے :۔

"اِس اُصول کے قائم کرنے کے بعد وہ (یعنی اَنشا) بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔ صحیح بتاتے ہیں۔ مثلاً سید اَنشا کی رائے میں بُرقا (برقع) صحیح اُردو کا لفظ ہے۔ گو وہ خلافِ اصل ہے۔ یا وہ (یعنی انشا) غَدَر کو بہ فتح د (دال) اُردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ اصل میں بہ سکون دال ہے۔ صفحہ ۸"

اِسی عبارت کے بعد حضرت نے "ثقات لکھنؤ" پر چوٹ کی ہے۔ لکھنؤ سے کچھ چھیڑ ہی مدِ نظر تھی۔ ورنہ عام طور پر وہ اپنا منشا ظاہر کر سکتے تھے۔ لکھنؤ کا نام لکھنا نہ ضروری تھا نہ مقتضائے تہذیب۔

اب میں کہتا ہوں کہ بُرقا (بُرقع) الف کے ساتھ ہرگز صحیح اُردو نہیں ہے غلط اُردو ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بول چال میں الف ہی نکلتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ عین (ع) کا تلفظ عرب کی قرأت کے ساتھ (جس کا مخرج تجوید میں حلق ہے) اُردو اور فارسی الفاظ کے بولتے وقت کون ہندوستانی ادا کرتا ہے۔ بلکہ کون ایرانی بھی۔ ظہوری کا مصرع ہی ع

کہ سازم علاجِ عقلِ فرتوت را + الف کا دھوکا کھا کے عقل کے عین کو تقطیع سے گرا دیا۔ یوں ہی علی سرہندی وغیرہ نے بھی۔

کسی دلیل سے ”برقا“ الف کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا
اس دلیل کے کہ بولنے میں عین نہیں نکلتا۔ الف نکلتا ہے۔ لیا
دلیل سے جو کلیہ قائم ہوگا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ مَقطَع کو مقطا۔ ضلع
وَدَع کو ودا۔ وَجَع کو وجا۔ دَمَع کو دما۔ طَمَع کو طما۔ اور مَطلَع
قرار دینا ہوگا۔ یوں ہی اور بہت سے عربی الفاظ سے عین
آخر میں الف کا دُم گزا لگانا پڑے گا۔ اور اگر مسٹر عبدالحق کا
کرنے کو اُردو میں ”بہت کچھ وسعت۔ لطف اور شیرینی“ پیدا
ہو تو اُردو کے حروف تہجی سے حرف عین (ع) ”دال فے عین“
کردیا جائے۔ ثقات شہر اغلاط آباد کے اس قول کو اگر ثقاہ
تسلیم کرلیں تو ان کی اُردو ویسی ہی صحیح ہوجائے جیسی مسٹر
چاہتے ہیں۔

انشا کو میں کچھ نہیں کہتا۔ اُن کے زمانے کی اُردو اُس
مشابہ تھی۔ جس میں اچھے بُرے۔ ٹیڑھے سیدھے۔ کٹیلے اور پھو
خودرو پیڑ سب گڈمڈ ہوں۔ بیشک۔ انشا نے جس اصابت را
دریائے لطافت کے اکثر جزیروں میں کام لیا ہے۔ اُس کو وقت
کے دیکھتے قابلِ داد سمجھنا چاہیئے۔ اگر وہ بہت سے غلط الفاظ
دے گئے۔ تو اُس وقت کے فصحا کی زبان یہی ہوگی۔ میر۔ سو
انشا کا کلام موجود ہے۔ وہ ایسے ایسے الفاظ کہہ گئے۔ جنکی تلخی
کی شیریں زبانیں گوارا نہیں کرسکتیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ اس

اُس پوچ حصّے پر کرنا ہے۔ جو دریائے لطافت کو ویسی ہی زینت دے رہا ہے جیسی زینت کوڑیوں کا زیور کسی بدوی عورت کے سر کو دیتا ہے۔

مسٹر عبدالحق لکھتے ہیں:۔

"اور جس طرح وہ الفاظ زبان زد خاص و عام ہوگئے ہیں"

اِس کُلیئے سے اِنکار کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مگر عبدالحق تو آج کے استعمال میں ایک سو بارہ برس بیشتر کی سڑی گلی زبان کو لانا چاہتے ہیں۔ اِس خیال کو قبول کر کے فُصحا اپنی بول چال کو خراب نہیں کر سکتے۔

دیکھئے۔ اِس چھوٹے سے جُملے میں بھی مسٹر عبدالحق ایک اصطلاحی غلطی کر گئے۔ اصلاحِ اُردو۔ لفظِ "عام" میں خواص و عوام دونوں کو داخل کئے ہوئے ہے۔ اِسی بنا پر "غلط العام فصیح" کا مقولہ زبانوں پر ہے۔ جب لفظِ "عام" لکھا تھا تو اِس کے ساتھ لفظ "خاص" کے لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ خاص تو اصطلاحاً عام میں داخل ہی۔ ہاں عوام لکھا ہوتا۔ تو خواص کی ضرورت ہوتی۔ اِس لئے کہ اصطلاحِ اُردو میں خواص عوام سے جُدا ہیں۔

ثقاتِ لکھنؤ بھی عجیب بزرگ لوگ ہیں۔ اِس اُردو پر بھی جزبر ہونگے۔ حالانکہ حضرت سکرٹری صاحب نے یہ خیال کر کے کہ آج کل دنیا آزادی آزادی پُکار رہی ہے۔ اُردو کے لئے بھی علمی قواعد اور ضوابط سے آزاد کرنے کا منشا ظاہر کر دیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ایسی آزادی اُس باؤلی عورت کی آزادی سے مشابہ ہوگی۔ جو نہ چار دیکھے

نہ شریف - نہ حرام سمجھے نہ حلال - نہ نجس کا خیال کرے نہ پاک کا - ہر
عقلی قید سے آزاد سب کے گھروں کا جھوٹا جیسا پائے ویسا کھاتی پھرے
انشاء نے اپنے زمانے کے بہت سے الفاظ لکھے ہیں - جن کو وہ
کہتے ہیں کہ (اسوقت) فصحاے دہلی کی صحیح اُردو یہ ہے - پھر بھی اور بے شمار
الفاظ کا حصر وہ نہیں کر سکے - اُن کی عبارت حسب ذیل ہے -
"براے مثال لفظے چند نوشتہ می آید - ہمیں قدر کافی است و حصر جمیع
الفاظ از احاطۂ علم فقیر بیرون است -
مسٹر عبدالحق ان کو اور اسی قسم کے تمام الفاظ کو آج کی اُردو میں
داخل کرنے کی راے دیتے ہیں - لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ ثقاتِ لکھنؤ
درکنار - ثقات دہلی بلکہ ثقات ہند بھی اس زمانہ کی بولچال اور سخن سنجی
میں ان الفاظ یا اس قسم کے الفاظ کو قصداً داخل کرنا پسند نہ کریں گے
ہاں - آپ ہی آپ رواج پاتے پاتے جو الفاظ عوام کی زبانوں پر چڑھکر
خواص کی زبانوں تک پہنچ جائیں - وہ "غلط العام فصیح" ہیں اسی طرح
اپنی جگہ پیدا کرلیں گے جس طرح ذراب جاے ذرہ کے - سہی بہ جاے صحیح کے -
آبشورہ بہ جاے افشرہ کے - حلوان بہ جاے حلّان اور حلام کے - مدمغ
بہ جاے مدموغ کے - لاش بہ جاے نعش کے - شکر رنجی بہ جاے شکر آب
کے - چغل خور بہ جاے چغل کے - تلبتب بہ جاے لبالب کے - ہتمم بہ جاے
مہتم کے - ہزار داستاں بہ جاے ہزار دستان کے - یوں ہی اور بہت سے
الفاظ تغیر حروف کے ساتھ اُردو میں جگہ لئے ہوئے ہیں - ان کے علاوہ

ایسے الفاظ بھی بہت سے ملیں گے جن کی معنوی صورت بدل گئی ہے۔ مثلاً سرپرست بجائے خادم کے مربی کے معنی میں۔ تپاک بجائے اضطراب کے مدارات کے معنی میں۔ خدائی بجائے منسوب بخدا ہونے کے خلق اللہ کے معنی میں۔ روزگار بجائے زمانہ کے نوکری کے معنی میں۔ صف بجائے قطار کے فرش بوریہ کے معنی میں۔ عادی بجائے عود کرنے والے کے خوگر کے معنی میں۔ عرس بجائے طعام عروسی کے مجمع فاتحہ خوانی کے معنی میں۔ غل بجائے زنجیر کے شور و غوغا کے معنی میں۔ لجاجت بجائے خصومت کے خوشامد کے معنی میں۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔

اب میں اُن الفاظ میں سے چند کو لکھتا ہوں۔ جنھیں انشا نے اپنے زمانے کی فصیح اُردو میں شمار کیا ہے۔ اور مسٹر عبدالحق نے مقدمے میں انشا کی تائید کر کے زمانۂ حال کے لئے ایسی ہی اُردو کی رائے دی ہے۔

منقر یعنی منصر۔ ذرا اس لفظ کے متعلق انشا کی عبارت ملاحظہ فرمائی جائے۔ "منصر منحصر است دراصل و ایں از زبان بعضے زنان و مرداں مسموع است و در زبان اہل لیاقت و استعداد منحصرات است لیکن منقر ہم سامعہ خراش نیست صفحہ ۲۴۲" اس ستم کو دیکھئے کہ ثقات دہلی منحصر بولیں۔ پھر بھی انشا منقر کی رائے دیں اور مسٹر عبدالحق بغیر فرق امتیازی قائم کئے ہوئے ایسے غلط اصول کی تائید کر کے "ثقات لکھنؤ" پر آوازہ کسیں انشا کے اور الفاظ ملاحظہ ہوں اور اُنھیں کی لکھی ہوئی تشریح بھی۔

مچکّر بروزن مفعّل لفظے است ہندی بہ معنی گردش کنندہ۔ ایں تصرف

"اگرچہ بہ تقلید عربیاں غلط محض است لیکن صحیح است زیرا کہ در اُردو مروج است"

چیاڑ بہ صیغۂ مبالغہ بہ معنی چوپڑ باز

ماعنی بجاے معنی لفظ صحیح و مستعمل زبان دانانِ اُردو است و در اصل غلط است و معنی با یاءِ معروف و با الف در آخر (یعنی معنیٰ) در اصل صحیح لیکن خلاف اُردو واقع می شود۔ وانچہ مستعمل اُردو است ہماں لفظ است۔ یعنی ماعنی"

شیر بروزن خیر (یعنی بہ فتح شین) بہ جاے شعر در استعمال اُردو است فتحۂ اوّل بروزنِ جعد یعنی شعر (مطلب یہ کہ بروزن بعد و سعد) لہجۂ دہاتین است۔

برقا در اصل برقع بودہ است لیکن در اُردو ہماں غلط صحیح بود از سبب فصاحت و لفظ صحیح جز بر زبان دہاتین وقت تکلم در ہندی جاری نبود۔

شولا در اصل شلہ است و آں قسمے از طعام باشد۔

چنبل بجاے چنبر است۔

سیو بجاے سیب

یہ بہت ٹھیک ہے! سیو بیسن کی وہ نمکین سویّوں کی سی چیز ہے۔ جو گھی یا تیل میں تلی ہوتی ہے۔ حلوائیوں اور پکوان کے تمام دکانداروں کو مجبور کرنا پڑے گا کہ اُس کا نام کچھ اَور رکھو یا اُسے سیب کہنے لگو۔

غَدَر بہ حرکتِ دوم (یعنی بروزن خبر) بہ جاے غدر (یعنی بروزن درد)

عُذَر بہ حرکتِ دوم (بروزن شرر: وہ سرر جو قرآن پاک میں ہے یعنی

سرِّ مرفوعہ) بجائے عذر بہ سکون حرف دوم۔
قدر بہ حرکتِ حرفِ دوم (یعنی بروزن جگر) بہ معنی مرتبہ۔ بجائے قَدْر بہ سکون حرف دوم۔

اُردو میں قَدَر بہ فتح دال مقدار کا مفہوم ادا کرتا ہے جیسے کنوئیں میں پانی کس قدر ہے۔ یا۔ اِس قدر غصّہ تمھیں کیوں آیا۔ اب مرتبے کے معنی میں بول چال کے خلاف لئے جائیں تو کون سمجھے۔

اِن چند الفاظ کو ملاحظہ فرما کے ارباب فہم فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ انشا کے وقت کی پُرانی زبان کو جس میں یہ اور اِسی قسم کے اَور بہت سے الفاظ ہوں گے۔ کیا آج بول چال کے خلاف زبردستی بول چال میں لینا چاہیئے۔ اور کیا مسٹر عبدالحق کی رائے کے موافق بلا لحاظ خواص اور عوام کے غلط یا غیر مانوس الفاظ کو اُردو میں لیکے اُسے صحیح اُردو قرار دے دینا چاہیئے۔ اور اسی دار و گیر کو صحیح اُصول قرار دے دینا چاہیئے۔ ایسا تو شاید دنیا کی کسی زبان میں نہ ہوا ہو۔ البتہ جو الفاظ ضرورت سے لئے جائیں۔ اُن کے لینے سے تو کوئی منکر نہیں ہے۔ یا دوسری زبان کے الفاظ جو مصطلحات قرار دیکے اِس ضرورت سے کہ اُردو میں ان کے ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ اُردو میں ملائے جائیں۔ تو اِس اُصول پر بحث کی ضرورت ہی نہیں سب اِسے تسلیم کر چکے ہیں۔ علاوہ مصطلحات کے جن کے لئے اجتہاد۔ اختراع۔ ترجمہ۔ یا اصلی اصطلاحی نام کے لینے کی ضرورت طے شدہ ہے۔ اور جن کو داخل کر کے اُردو کی کمی کو پورا کرنے کی ضرورت مسلم قرار پا چکی ہے —

یوں بھی انگریزی کے ضروری الفاظ اُردو میں مل رہے ہیں۔ اور جب وہ مل جُل کے عام میں آجاتے ہیں تب اُردو کا جزو بن جاتے ہیں۔ مثلاً :۔

اصلی حالت کے ساتھ کالج ۔ ماسٹر۔ ٹائم ٹیبل ۔ آرٹکل ۔ لکچر ۔ ایڈرس۔ فیس ۔ پلیٹ ۔ چک ۔ بورڈنگ ہوس ۔ کلب ۔ سلیٹ وغیرہ ۔ صدہا الفاظ۔ تغیر حالت کے ساتھ ہاسپٹل سے اسپتال ۔ سگنل سے سکندرا۔ ٹنڈم سے ٹمٹم ۔ کوچ مین سے کوچوان یا کوچبان ۔ کمینڈر سے کمانیر ۔ رپورٹ سے رپٹ ۔ اسٹیمپ سے اسٹام ۔ کارٹرج سے کارتوس ۔ فلانل سے فلالین وغیرہ ۔ صدہا الفاظ ۔

اب مسٹر عبدالحق کے مقدمے کی یہ عبارت جسے میں ذیل میں لکھتا ہوں ملاحظہ ہو

"اُردو زبان مستقل زبان اُسی وقت ہوگی جب وہ ان زبانوں (یعنی عربی فارسی ۔ ترکی یا بعض یورپی السنہ کے الفاظ) کو لے کر انہیں اپنا کرلے" پھر لکھتے ہیں :۔

"مگر ہم میں بعض نازک دماغ ، دقیق نظر حضرات کو ان غیر ملکیوں (یعنی الفاظ) کی یہ بے تکلفی ہرگز نہیں بھاتی ۔ وہ انہیں اپنا بنانا نہیں چاہتے۔ بلکہ انہیں دھکیل دھکیل کر اپنے حدود سے باہر نکالنا چاہتے ہیں ۔ اگر سید انشا کے اصول پر عمل رہا ہوتا تو اب تک اُردو میں بہت کچھ وسعت ۔ لطف اور شیرینی ہوجاتی"

پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت کے اس دوسرے جملے میں بھی

محاورے کی غلطی ہے " رہا ہوتا " اور " اب تک " کے لئے " پیدا ہو گئی ہوتی " کی ضرورت تھی۔ نہ کہ محاورے کے خلاف " پیدا ہو جاتی " کی۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا مختلف زبانوں کے الفاظ اُردو نہیں لئے ہوئے ہے۔ اگر نہیں تو اُردو پیدا کہاں سے ہوئی۔ آسمان سے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ جیسے چند الفاظ انگریزی کے میں نے اوپر لکھ دئے ہیں۔ ایسے ہی بے شمار الفاظ اُردو زبان لے چکی۔ لے رہی ہے۔ اور برابر لیتی رہیگی۔ ضرورت جس قدر مجبور کرتی جائے گی۔ اُردو اُسی قدر مجبور ہوتی جائے گی۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ حضرت نے یہ طنزیہ جملہ اُردو زبان سے ناواقف بن کے لکھا ہے یا واقف بن کے ؟

اگر ناواقف بن کے لکھا۔ تو اس ناواقفیت پر افسوس ہے۔ اور اگر واقف بن کے لکھا تو افسوس پر افسوس !



مسٹر عبدالحق انجمن ترقی اُردو کے سکرٹری ہیں۔ آپکے کام کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ آپ کی قابلیت کے جوہر آفتاب کی طرح روشن ہو چکے۔ اِسی طرح آپ برابر یہ اہم قومی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ جو کام آپ کے ہاتھ میں ہے وہ ایک مستقل کام ہے۔ اُس کام کا اثر برس چھ مہینے کے بعد زائل نہیں ہو جائیگا۔ یہ کام نہ صرف ہمارا ہی ہے بلکہ ہمارے بیٹوں پوتوں پرپوتوں کا بھی اس میں حصہ ہے۔

جو کام آپ کر کے چھوڑ جائیں گے وہ آیندہ نسلوں کے کام آئیگا۔ ہم آپ جانتے ہیں کہ مسٹر عبدالحق کی راے اِن اہم معاملات میں کہانتک وقعت رکھ سکتی ہے۔ مگر اب سے سو پچاس برس بعد جب نہ ہم ہونگے اور نہ مسٹر عبدالحق ہی ہوں گے مگر مسٹر عبدالحق کا کام ہماری آیندہ نسلوں کے ہاتھ میں آئیگا۔ اِنھیں کیا معلوم ہوگا کہ مسٹر عبدالحق کس پایہ کے بزرگ تھے اور اُن کی راے کس حد تک قابلِ وقعت مانے جانے کے قابل ہے۔ وہ مسٹر عبدالحق کو ساری قوم کا منتخب کردہ سکرٹری مان کر آپ کی انھیں رایوں اِنھیں باتوں اِنھیں خیالات کو آیات و حدیث سمجھیں گے۔ مگر انجام کیا ہوگا ؟ آپ ہی سوچئے کیا ہوگا ؟ کیا آپ ہماری آیندہ نسلوں پر کوئی احسان کر رہے ہیں یا اُنھیں ایسی وحشیانہ زنجیروں میں جکڑ رہے ہیں جن سے نہ وہی نکل سکیں گے اور نہ اُن کے بیٹے پوتے پڑپوتے۔ اور زبان کہاں جائیگی ؟ اُس بیچاری مظلوم کا کیا حشر ہوگا ؟ اِسے آپ ہی سوچئے اور اِس کے بعد فرمائیے کہ ہماری آپ کی اِس وقت کی خاموشی اس وقت کے سکوت کی قیمت کتنی سخت ہے !

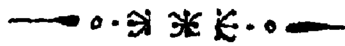
جو حضرات محض اُردو خواں ہیں عموماً وہ "بی۔ اے" کا لفظ سُنکر ضرور کان کھڑے کر لیتے ہیں اور اپنے دل میں اتنا ضرور فرض کر لیتے ہیں کہ جس شخص نے یہ امتحان پاس کر لیا ہے وہ ہو نہ ہو ضرور ہی انگریزی زبان کا ایک مستند عالم ہوگا۔ مگر انگریزی داں حضرات سے

جو واقعی انگریزی داں کہے جانے کے مستحق ہوسکتے ہیں اِس بی لے ڈگری کا کچا چٹھا کبھی فرصت میں سُنئے۔ دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں؟ اتنی ہی خیریت ہے کہ جس طرح بے خوف ہوکر مسٹر عبدالحق نے آج اِس کتاب کے مقدمہ پر قلم اُٹھایا ہے کاش اُنہوں نے اسی طرح انگریزی زبان میں کوئی اتنا ہی طویل مضمون لکھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا انجام ہوا ہوتا؟ اُردو تو پھر بھی ایک طرح پر آپ کی زبان مادری کہی جاسکتی ہے۔ خدانخواستہ کہیں انگریزی دانی کے اظہار کی ضرورت پیش آگئی ہوتی تو جیسی مدارات حضرت شوق نے کی ہیں اس سے کم سے کم دہ گونہ کی تو ضرور ہی نوبت پہنچ گئی ہوتی۔ مسٹر عبدالحق بی۔ اے ضرور ہیں اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر دنیا نے آج تک آپ کی کوئی دس سطر کی انگریزی تحریر بھی کسی موقر انگریزی اخبار یا رسالہ میں کبھی نہیں دیکھی ہے۔ اور واقعی خیریت بھی جب ہی تک نظر آتی ہے جب تک آپ ایسی جرأت نہیں کرتے۔ محض اُردو خواں حضرات واقف نہیں ہیں کہ انگریزی خوانوں کے طبقہ میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں کہ انگریزی دانوں کی صحبت میں تو اُردو کے مستند ادیب بنکر اپنا سکہ بٹھا جاتے ہیں۔ اور جب کبھی اُردو خوانوں کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہاں اپنی مسلم انگریزی قابلیت کے جھنڈے گاڑنے پر تُل جاتے ہیں۔ اور دونوں صحبتوں میں سہرا انہیں کے سر رہتا ہے۔ سوا اتفاق

سے شاید ہی کبھی ایسا بُرا سامنا ہو جاتا ہے جیسا کہ اِس موقع پر دشمنوں
کو پیش آگیا ہے - اللہ رحم کرے !

مگر یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ہماری سوسائٹی میں پڑھے لکھوں
کا ایسا قحط ہے کہ سارے ہندوستان میں ہمیں ایک بھی ایسا آدمی
نہیں مل سکتا جو انگریزی میں بھی پوری پوری استعداد رکھتا ہو
اور اسی کے ساتھ اگر اُردو کا مستند ادیب نہ ہو تو نہ سہی کم سے کم
نیک و بد میں تو تمیز کر سکتا ہو ؟ اپنی خامیوں کا احساس تو رکھتا ہو
اگر اُسے خود اِتنی استعداد نہیں ہے کہ چار سطر سیدھی سادی اُردو
لکھ پڑھ لے تو اوروں سے اصلاح ہی لیکر سہی مگر ہمارا کام تو چلا سکے ؟
یہ کیا ستم ہے - کیا قہر ہے - کیا قیامت ہے کہ ہم قوم کی باگ ایسے
ہاتھوں میں دیئے دیتے ہیں جو کسی طرح اِس کے اہل ہی نہیں ہیں !
کیا آپ کہیں گے کہ مسٹر عبدالحق نے اب تک کام کیا ہے ہم اُن کی
دل شکنی نہیں کر سکتے ؟ کیا آپ ایک واحد متنفس کی دل شکنی پر
ساری قوم کو قربان کر دینگے ؟ کیا یہ بھی قوم فروشی کی ایک قابل
نفرت صورت نہیں ہے ! اگر مسٹر عبدالحق نے اتنے عرصہ تک بلا معاوضہ
کام کیا ہے تو کیا قوم اِنہیں معقول معاوضہ اُن کی خدمات کا دیکر
اُنہیں آخری سلام نہیں کر سکتی ؟ اگر ہم ایسا ہی کر سکیں تو اسمیں
مسٹر عبدالحق کو شکایت کا کیا موقع مل سکتا ہے ؟ کیا ہم مسٹر عبدالحق
کی مروت میں آکر اپنے بیٹے پوتوں پر پوتوں کے ساتھ عداوت کرنے پر

طیار ہیں ؟ یہ چند غور طلب سوالات ہیں - اور قوم کو ان ضروری سوالات پر غور کرکے جلد قطعی فیصلہ کرنا چاہیئے - ابھی تک کچھ نہیں بگڑا ہے - ابھی تو مسٹر عبدالحق نے صرف ایک ہی مختصر سا مقدمہ لکھا ہے - ہم ان صفحات کو پھاڑ کے پھونک دینگے اور اسی آنچ میں چار پکا کے گرما گرم چاء سے اپنے دوست کی دعوت کر دینگے - اس کے بعد حضرت شوق قدوائی کی خوشامد کرکے انہیں سے " مقدمہ " لکھوا لینگے - مگر ابھی کیا ہے ع
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ؟ اگر یہی لیل و نہار قائم رہ گئے تو مسٹر عبدالحق کیسے کیسے اور زبردست مقدمے نہ لکھینگے اور زبان کے پیچھے کہاں کہاں لاٹھی لئے نہ پھریں گے - ہمیں تو صاف بات آتی ہے - جب تک مسٹر عبدالحق سکرٹری ہیں ہم تو اس انجمن کو " انجمن تنزل اُردو " ہی کہے جائیں گے اور آپ سے عرض کرینگے کہ آپ کے آیندہ کارناموں کے لئے ہمیشہ گوش بر آواز رہیں -
" پیام امید "



" اُردو کانفرنس "

" اُردو کانفرنس " کے اسرار بے نقاب ہو چکے - روز روشن کی روشنی میں قوم صاف صاف دیکھ چکی ہے کہ " اُردو کانفرنس " کی اصلی ماہیت کیا ہے - قومی نمایندہ ہونے کے اعتبار سے ہمارا جو فرض تھا ہم اُسے اپنے خیال میں اچھی طرح ادا کر چکے - مگر جس طرح ہمارا یہ فرض تھا کہ واقعات

کی اصلیت ظاہر کردیں جیسا کہ ہم کر چکے ہیں اسی طرح ہمارا یہ فرض بھی ہے کہ کسی شخص سے کوئی پرخاش نہ رکھیں۔ جہاں تک جس حد تک ضرورت تھی ہم راستی اور ایمانداری سے واقعات کی اصلیت دکھا چکے۔ قوم کو اختیار ہے جو چاہے فیصلہ کرے۔ اب ہمارا فرض جو کچھ باقی رہا ہے وہ ہماری اپنی ذات سے متعلق ہے۔ اگر ہمارے ایمان اور عقیدے کے موافق قوم کا فیصلہ ویسا ہی ہوگا جیسا ہونا چاہیئے تو البتہ ہم اسمیں کوئی عملی حصہ لینے کے لئے طیار ہوسکیں گے۔ اگر اس کا فیصلہ اسکے خلاف ہوگا تو ہم اسمیں کوئی عملی حصہ نہ لیں گے۔

آج کی اشاعت میں ہم نیابت دہلی کی مطبوعہ یادداشت کی نقل بجنسہ شائع کئے دیتے ہیں۔ یہ یادداشت نیابت دہلی نے باقاعدہ طور پر مرتب کرکے طبع کرائی تھی۔ اس پر عالیجناب نواب ابو المعظم سراج الدین احمد خاں صاحب سائل صدر انجمن۔ جناب محمد آصف علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا نائب صدر انجمن۔ جناب منشی امرناتھ صاحب ساحر ناظم انجمن ترقی اردو دہلی اور جناب ابوالمعالی محمد الدین صاحب خلیقی نائب ناظم انجمن ترقی اردو دہلی کے دستخط تھے۔ یہ یادداشت اپنے ہمراہ لیکر بزرگان نیابت دہلی لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ مگر عالی جناب نواب ظفر الملک بہادر کو انصرام امور ملکی و مالی میں مصروفیت کی وجہ سے ان بیچاروں سے ملنے کی فرصت کہاں مل سکتی تھی۔ جب یہ حضرات جناب سکرٹری صاحب بہادر کے دربار میں باریابی سے بھی محروم رہے تو

اِس یادداشت کوکون پوچھتا تھا۔ وہ اسی طرح دہلی واپس گئی۔ نواب سائل شریک کانفرنس بھی نہیں ہوسکے۔ اُنہیں اُمید تھی اور شاید ایسی اُمید کرنے کا وہ حق رکھ سکتے تھے کہ مشورات میں تو وہ ضرور شریک رکھے جائینگے۔ جب اُن بیچارے کی کسی نے بات تک نہ پوچھی تو کس مُنہ سے کانفرنس کا رُخ کرتے! کسی کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوئی کہ آخر یہ حضرات آئے ہیں تو کہاں ٹھیرے ہیں اور کس حال میں ہیں۔

ناظرین ملاحظہ فرمائینگے کہ جو رزولیوشن عاجزہ نے روانہ کیے تھے اُن میں سے کئی ایک کا مضمون اس یادداشت کے اندر ملتا ہے آئندہ اشاعت میں ہم اصلی یادداشت کی جو ہمارے دفتر میں بجنسہ موجود ہے لفظ بلفظ نقل کر کے قوم کے ملاحظہ کے لئے شائع کرینگے۔

ایک نیا ناول

ہمارے کرم فرما مسٹر رشید احمد (حیدر آباد دکن) ایک دلچسپ انگریزی ناول کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس ناول کا آج سے آغاز ہوتا ہے۔ ہم اسکی اشاعت اس طریق پر کرینگے کہ ایک پرچہ میں گردش زمانہ اور دوسرے میں یہ ناول شائع ہوا کریگا۔ ایڈیٹر

پہلا باب

قتل

اسد بسمل ہے کس انداز سے قاتل سے کہتا ہے کہ مشق ناز کر خون دو عالم تیری گردن پر

اکثر زندگیاں ایسی ہوتی ہیں جو بالکل سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ نہ انہیں

عظیم تغیرات سے دوش بدوش ہو کر چلنا پڑتا ہے نہ آفات و حوادث سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ دنیا میں اُن کا ظہور ہوا۔ ہنسی خوشی میں وقت گزر گیا پیمانۂ عمر لبریز ہوا اور چل بسیں۔ بچپن کھیل کود میں گزرا۔ جوانی آئی اور اپنے وقت پر وہ بھی رخصت ہو گئی۔ بڑھاپا آیا۔ مُنہ پر جھرّیاں پڑ گئیں اور عمر ختم ہو گئی۔ زندگی کے دن تو اچھّے کٹے۔ مگر چونکہ ساری عمر کسی اہم یا قابلِ ذکر واقعہ سے خالی گزری تھی دنیا کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون آیا تھا اور کون چل بسا۔ برعکس اِس کے بعض زندگیاں اہم واقعات عجیب و غریب اسرار۔ آفات و حوادثات کے عظیم کارناموں سے لبریز ہوتی ہیں۔ دنیا ایسے واقعات کے لئے ہمیشہ گوش بر آواز رہتی ہے۔ اور جب ایسے واقعات اِسکے علم میں آتے ہیں کمال اشتیاق اور گہری دلچسپی کے ساتھ انہیں سنتی ہے اور اس دلچسپ زندگی کے ہر ہر حصّہ کے چھوٹے بڑے واقعات معلوم کرنے کی حد سے زیادہ شایق بن جاتی ہے۔ انگلستان کے مشہور رسالہ "ہُمنٹ" کے مضمون نگار مسٹر اسٹورٹ ڈان نے ایک بار مجھے ایسا ہی دلچسپ اور اہم واقعات سے لبریز قصہ سُنایا تھا۔ میرے قلب پر ان واقعات کا اتنا اثر ہے کہ بیان کرتے وقت آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس عجیب و غریب جرم اور محبت کے پراسرار واقعات کے دلچسپ سلسلہ کو قصہ کی صورت میں لانے کی کوشش میں اگر میں نے کسی مقام پر شریفانہ اخلاق فراخ دلی اور فیاضی سے انحراف کیا ہے۔ یا

جہاں رحم کی ضرورت تھی وہاں ستم کیا ہے تو یہ قصور میری سنگدلی کا نہیں ہے۔ ناظرین اسے میری کمی معلومات پر محمول کرکے مجھے معذور سمجھیں اور حرف گیری سے معاف رکھیں۔ بیشک میں نے جیسا کیا تھا ویسا ہی بھر پایا اور جس خطا کا میں نے شرمساری کے ساتھ اعتراف کیا تھا وہ فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دی گئی۔

رشید احمدؐ از حیدر آباد دکن

پہلے درویش کے جنگی کارنامے

(یعنی اُن بڑی لڑائیوں کا بیان جن میں حضور سرور کائناتؐ خود شریک تھے) عنوان بالا کے تحت میں نہایت موثر و دلکش تاریخی مضامین کا ایک قابل دید سلسلہ حضرت مولنا خواجہ حسن نظامی صاحب نے میرٹھ کے ماہوار مذہبی و ادبی رسالہ رازونیاز کے لئے لکھنا شروع کیا ہے۔ اِس دلگیر سلسلہ کا پہلا حصہ رازونیاز کے نوروز نمبر معروف بہ درویش جنتری ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا ہے جو صاحب اِس اثرانداز تاریخی مضمون کے مطالعہ سے لطف اُٹھانا چاہیں وہ صرف ۳۰۰ر کے ٹکٹ بھیجکر ہم سے **درویش جنتری ۱۹۱۷ء** منگالیں جس میں سال بھر کے لئے پنجگانہ نماز اور سحر و افطار کے نہایت معتبر اوقات - ایک ہزار سے زائد بزرگان دین کے عرسوں کی تاریخیں - حضرت جرجیس علیہ السلام کا عبرت آموز قصہ اولیاء اللہ کی دلسوز حکایات فقہی مسائل - شرعی آداب، اعمال و وظائف - مجرب علاج، اسلامی اخبارات و رسائل کی فہرست اور بہت ہی کارآمد اور دلچسپ باتیں درج کی گئی ہیں اور جس کی ایک ایک سطر پڑھنے کے قابل ہے - رسالہ رازونیاز کے (جسکی سالانہ قیمت ۲؎ ششماہی ۱۳ر اور سہ ماہی ۷ر ہی) مستقل خریداروں کو درویش جنتری مفت دیجاتی ہے - محض ۲ر خرچ کرکے آپ درویش جنتری اور رازونیاز کے دو پرچے خرید سکتے ہیں -

ضرورت ہے - درویش جنتری ۱۹۱۷ء کو کمیشن پر فروخت کرنے کے لئے ایجنٹوں کی بہت جلد ضرورت ہے ۲۵ جنتریوں کی قیمت ایجنٹوں سے بجائے ۱۱؎ کے صرف ۱۳؎ لی جائے گی -

مینجر "رازونیاز" درویش جنتری کیمپ میرٹھ

جنگ! جنگ!! خونریز جنگ!!! اور فتح!!!!

حُسن وشباب کے دولے حجاب شرم وحیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمناؤں کے پیدل۔ ارمانوں کے شعلہ آشام سوار۔ حسرتوں کے شرربار رسالے دل کے سنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور غنیم کی شعلہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادھر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا پرجوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اضطراب کے توپخانے سے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش وخروش سے جنگ جاری ہے کہ اتنے میں کج اداؤں کا غنیم جنرل "وفا" کی ڈویژن پر ایک سخت خونریز اور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "وفا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہے مگر نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ پھر وقفہ پاکر "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آتے ہیں۔ اِس نئی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے اُسے دیکھتے ہی غنیم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات۔ یہی حُسن وعشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے جذبات کی تصویر۔ عفت اور حیا کا دلنشین مرقع خلوص صدق وصفا کے صاف شفاف آئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادھر آئیے ہم دکھاتے ہیں۔ سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت اُستاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت جلیل شاعر دربار راج بلرام پور کی زبان سے مُرصع اردو نظم میں بڑے آب وتاب بڑی خوبی وخوش اسلوبی سے چھپ کر تیار ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحہ۔ قیمت فی جلد ۱۰/ر۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "پیام اُمید" آگرہ

شیکسپیر اردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار ، چھائی ہوئی ظلمتِ شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت اُلفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی کانوں میں صدائے یار آئی

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پا چکا ہے اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔ اصلی قیمت ۱۲؍ تھی۔ اب رعایتی قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

فہرست مضامین پیامِ اُمید بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۱۷ء

"اُمید کا پیام ——"اُٹھو —— اُٹھو —— اور آگے بڑھو!"

پیامِ اُمید

جلد ۴	محمود آباد - ماہ مئی ۱۹۱۷ء	نمبر ۵

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے اسمیں جنس کی قید نہیں جس حالیں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردونکی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گذریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے۔ ایسی رائے قایم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

آپ خفا نہ ہوں

روزانہ ہندو اخبار" لیڈر" کے قابل رشک ایڈیٹر آنریبل مسٹر چنتامنی ہمارے صوبہ کے مجلس واضعان قانون میں اُردو اور ہندی کی بحث اس نازک موقعہ پر نہ چھیڑتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ اول تو ہمارے حکام کے دماغ جنگ کے متعلق طرح طرح کی

افکار میں منہمک ہیں۔ اور اُنکے دماغوں پر ایسے افکار کا بار اضافہ کرنا اس وقت تو بالکل ہی بے ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے ابھی کل ہی کی بات ہے کہ لکھنؤ کے مقام پر کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنی متفقہ کوشش سے ایسی صورت پیدا کی تھی کہ ہندو اور مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو اور نااتفاقی ہمیشہ کیلئے دور ہو۔ اس لحاظ سے بھی یہ موقع ایسے مباحثے پیش کرنیکے لئے موزوں نہ تھا تیسرے جس بنا پر یہ تحریک قائم کی گئی تھی وہ بنا اس درجہ کمزور تھی کہ بادی النظر میں کوئی واقعی بنا بھی نظر نہیں آتی۔ بحث یہ تھی کہ دیوانی عدالتوں میں ہندی دستاویزات اکثر معرض بحث میں آتی ہیں۔ لہذا منصفوں اور صدرالصدوروں کا ہندی استعداد رکھنا از حد ضروری ہے۔ اس وجہ سے وہ ہندی استعداد حاصل کرنیکے لیئے مجبور کئے جائیں۔ قابل مسٹر چنتامنی کو معلوم ہے کہ منصف ترقی کرکے صدر اعلی ہوتے ہیں اور منصفی کا عہدہ کسے دیا جاتا ہے؟ اسکے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ امیدوار نہ صرف امتحان وکالت پاس ہو بلکہ کم سے کم تین سال کی مدت تک وکالت کا کام بھی کرچکا ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وکیل لوگ کون ہوتے ہیں وکالت کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟ وکالت کی سند حاصل کرنیکے لئے ہر امیدوار کو ہندی کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ اور جبتک یہ امتحان پاس نہ کرلے اُسے وکالت کی سند نہیں دیجاتی۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر منصف اور صدر اعلی پہلے وکیل تھا۔ اور وکیل ہونے سے پہلے وہ ہندی کی پوری استعداد حاصل کرچکا تھا جب یہ صورت ہے تو جس مضمون میں ایکبار وہ امتحان پاس کرچکا ہے اسی مضمون میں دوبارہ امتحان لیکر اُسے بیفائدہ پریشان کرنے سے کیا حاصل ہے اگر یہی اصول درست ہے تو ہر منصف اور سب جج کا بی اے میں دوبارہ امتحان

کیوں نہیں لیا جاتا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو ہر منصف اور سب جج سے کہنا چاہئے کہ اگر تمہیں نوکری کرنا ہے تو پھر از سر نو جیومیٹری بمقابلہ۔ اقلیدس۔ علم مثلث۔ تواریخ اور ادب میں امتحان پاس کرنیکے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے ہو تو ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لو۔ اور نوکری کو خیرباد کہو۔

انگلستان کے اعلیٰ ترین تربیت یافتہ طبقہ میں بہت سی مثالیں ایسے کریم النفس افراد کی ملتی ہیں جنہوں نے اپنے حق الیقین کی صداقت اور ضمیر کی صاف شہادت پر اپنی جانیں قربان کر دیں مگر یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے مقررہ اصول سے سرِ مو تجاوز کریں۔ ایسی بہت سی مثالوں میں سے مشتے نمونہ از خروارے لارڈ میر رڈلے اور سر ٹامس مور کی مثالیں ہیں۔ آنریبل مسٹر چنتامنی کی تحریرات سے جو آپکے معزز اخبار میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنی اعلیٰ دماغی قابلیتوں کے اعتبار سے مسٹر چنتامنی بھی انگلستان کے اُن تمام آور اور یادگارِ زمانہ نمونوں میں سے ہیں۔ مگر ہماری پبلک کا یہ حسنِ ظن کس حد تک صحیح ثابت ہوتا ہے ہمیں یہی دیکھنا ہے۔ ابھی تک امتحان کا موقع نہیں آیا تھا۔ اب آگیا ہے۔

کونسل کی اسپیچ میں مسٹر چنتامنی فرما چکے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر اور حق الیقین کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے۔ آپ کی تقریر سے یہ امر بھی صاف ترشح ہے کہ جبتک کوئی شخص کوئی خاص معینہ امتحان پاس نہ کرے آپ اُسکی قابلیت نہیں تسلیم فرما سکتے۔ اب آپ ہی کے اصول کو پیشِ نظر رکھکر ہم آپ کو یاد دلاتے ہیں کہ حضور خود کوئی امتحان پاس نہیں ہیں۔

اور آپ ہی کے اصول کے مطابق آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ جب تک آپ کم سے کم ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ ڈی کی سند آنرس کے ساتھ حاصل نہ کریں آپ بلے سبب بلاوجہ بے استحقاق ہمارے صوبہ کے ایک معزز روزانہ اخبار کی ایڈیٹری کی کرسی اور ہمارے صوبہ کے کاونسل کی ایک کرسی روکے بیٹھے رہیں ؟ آپ فرما چکے ہیں کہ آپ کو اپنا اصول کتنا عزیز ہے۔

لائمبر۔ رڈلے اور سر ٹامس مور کی طرح یہاں آپ کا اصول آپ سے جان کی قربانی نہیں مانگتا۔ صرف ایڈیٹری کی کرسی اور ایک مختصر سا لفظ "آنرپبل" آپ سے مانگ رہا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ آپ دونوں سے فوراً استعفا دیکر اپنے اصول کی عزت رکھتے ہیں۔ یا ایک مختصر سے لفظ اور ایک کرسی پر اس عزت کو قربان فرما دیتے ہیں۔ آپ نے بڑے ہی جوش سے فرمایا تھا کہ یہ معاملہ اصول کا ہے۔ میں اپنا رزولیوشن ہرگز ہرگز واپس نہ لونگا۔ وہی مبارک اصول یہاں بھی خیر سے آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے اُس کا سوال پورا کیجیے۔

شامت اعمال سے لندن کے بعض اخباروں کے عیسائی ایڈیٹروں نے کسی موقعہ پر لارڈ ہیڈلے کے شراب پی لینے پر اسلام کا مضحکہ اڑایا۔ اس کا صاف جواب یہ تھا کہ اس موقعہ پر عیسائیت قابل مضحکہ ہے نہ کہ اسلام۔ عیسائیت شراب خواری کی بدعادت کے خلاف صدا بلند نہیں کرتی۔ اسلام کرتا ہے۔ اگر مشرف بہ اسلام ہو جانے پر کسی متنفس سے کسی وقت ایسی

کمزوری ظہور میں آجاتی ہے تو اُس کا الزام عیسائیت کی پُشتہا پُشت تک شراب خواری پر آتا ہے نہ کہ اسلام پر۔ اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ہر ہر نومسلم اسلام پر ایمان لاتے ہی چھومنتر کے زور سے پشتہا پشت کی بدعادات بُرے رسم ورواج سے معصوم بنا دیا جائیگا۔ ایسے موقعوں پر ترقی بتدریج ہوگی۔ ساری خامیوں کا علاج ایک منٹ میں نہیں ہوسکتا۔ کسی واحد متنفس سے اگر کوئی انسانی کمزوری۔ کوئی لغزش ظہور میں آجائے تو اُس کا مذہب قابل ملامت نہیں قرار پاسکتا۔ بلکہ اُس لغزش کا وہی ذمہ دار ہے جس سے ایسی لغزش ظہور میں آئی ہو۔ عیسائی مذہب کے عقیدے کے موافق اللہ پاک کے دس احکام ہیں جنکے ذریعہ سے جھوٹ بولنا۔ چوری کرنا وغیرہ وغیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ کیا اگر کوئی عیسائی جھوٹ بولے یا چوری کرے تو اللہ پاک کے یہ دس احکام یا عیسائیت قابل ملامت قرار دیجا سکے گی ؟ مگر ہمیں یہ معلوم کرکے حد سے زیادہ رنج ہوا کہ ہمارے بعض اردو اخبارات کے ایڈیٹروں نے بجائے اسکے کہ ایسا دنداں شکن جواب دیتے خود ہی اسلامی مشن کا خاکہ اُڑانا شروع کردیا اور اسلامی مشن ہی کی بیخ کنی پر تل گئے!

عیسائی اخبار نویس اسلامی مشن کا خاکہ اُڑائیں تو اس میں کوئی بات خلاف موقعہ نہیں ہے۔ مگر اسلامی اخبارات اسلامی مشن کا خاکہ اُڑاکر پھر بھی قومی اخبارات بنے رہ سکیں یہ بات صرف ہندوستان ہی میں ممکن ہے۔ ہمارے بعض اخبارات نے پہلے تو وہ شور مچانا شروع کیا کہ خواجہ کمال الدین انگلستان میں احمدی فرقہ کے نمائندے بنکر گئے ہیں۔ اور جس خدمت کو وہ تبلیغ اسلام کے

نام سے پکارتے ہیں حقیقت میں محض تبلیغ احمدیت ہے۔ خواجہ کمال الدین نے تین سال کے عرصہ میں پونے دو سو اعلیٰ طبقہ کے تعلیم یافتہ انگریزوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ مگر کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی احمدی عقائد رکھتا ہے! اسلام کے اندرونی شعبہ جات سے نہ دنیا کو کوئی بحث ہے اور ہمیں اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اور ہمارا بھائی ہے۔ اور ایسا بھائی جو ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تم کہتے ہو کہ زید شیعہ ہے اور بکر سُنّی۔ ہم کہتے ہیں کہ زید ہمارا دل ہے اور بکر ہمارا جگر۔ ہم صرف اتنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ ہندی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر عمرو ہندو ہے اور خالد مسلمان۔ تو خالد ہماری داہنی آنکھ ہے اور عمرو ہماری بائیں آنکھ۔ اسلام اس لئے دنیا میں آیا ہے کہ دشمنوں کو دوست غیروں کو اپنا بنائے نہ اس لئے کہ اپنوں کو غیر بنا کر بھائی سے بھائی کو جدا کر دے! ایک وہ زمانہ تھا کہ اسلام نے بزور شمشیر دنیا کو تسخیر کر لیا تھا۔ یہ اسلام کا پہلا دور تھا۔ وہ دور اب ختم ہو گیا۔ یہ دوسرا دور ہے۔ اس دور میں تلوار میان میں رکھ لی گئی ہے اور تلوار کی جگہ قلم اور زبان نے لی ہے۔ اگر دور اول میں ہم نے اعلان جنگ کر کے دنیا کو صلح اور امن کا پیام پہنچایا تھا۔ تو اب صلح کر کے۔ دوستی کر کے محبت کے مضبوط رشتہ میں باندھ کر ہم ساری دنیا کو اپنا بنائیں گے۔ لندن ساری دنیا کا پائے تخت ہے۔ ایسی دنیا کا پائے تخت ہے جہاں آفتاب ہی غروب نہیں ہوتا۔ لندن کو بزور شمشیر ساری دنیا فتح کر لینے دو۔ ہم اسی محبت

بناکر پائے تخت لندن پر اپنا پھریرا اڑائیں گے۔ ہمارے اس ہلالی پھریرے
کا علم بردار کون ہے ؟ ہمارا علم بردار خواجہ کمال الدین ہے۔ یہ ہلالی پھریرا
ووکنگ مشن کی مسجد کے بلند میناروں پر اڑ رہا ہے۔ پونے دو سو برگزیدہ
افراد اس پھریرے کے سایۂ امن میں آچکے ہیں۔ اللہ وہ دن بھی جلد لائیگا
کہ یہ پونے دو سو پونے دو لاکھ اور پونے دو کروڑ ہو جائیں گے۔ اللہ وہ دن
جلد لائے۔ ہم اُسی ساعت سعید کے منتظر ہیں۔ یہ بیسویں صدی کی اسلامی
فتوحات ہیں۔ اور یہ فتوحات ہمیں اُن فتوحات سے بھی زیادہ عزیز ہیں جو بزور
شمشیر عمل میں آئی تھیں۔ یاد رکھو کہ خواجہ کمال الدین یا اُنکے مشن کی توہین
اسلام کی توہین ہے۔ اور اسلام اس توہین کو کبھی معاف نہیں کریگا۔
خواجہ کمال الدین کے عقائد احمدی ہیں تو ہونے دو۔ ہمیں اس سے کوئی
بحث نہیں۔ اُنکے عقائد اُنکے ساتھ ہیں۔ ہمیں اُنکے عقائد سے لڑنا منظور
نہیں ہے۔ ہمیں تو دنیا کو یہ دکھانا ہے کہ ہر کلمہ گو ہمارا بھائی۔ حقیقی بھائی
ہے۔ اور اسلام کی اندرونی فرقہ بندی ہمیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں
کرسکتی۔ اگر ہمارا ایک احمدی بھائی۔ ایک شیعہ بھائی ایک سُنّی بھائی کوئی
قومی یا اسلامی خدمت کرتا ہے تو وہ ساری قوم کا مخدوم ہے۔ اُسکے عقاید اُسے
اس خدمت کے لئے ناقابل نہیں بنا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خواجہ کمال الدین
کو دل و جگر میں جگہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواب حاجی فتح علی خان قزلباش
کو ہم سر اور آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔
ہمارا ہر اخبار ہر رسالہ قومی آرگن بنتا ہے۔ مگر قومی آرگن کی کیا صفت ہے ؟

قومی آرگن کی یہ خصوصیت ہے کہ اُسکے مختلف سُروں پر ہ تھ رکھنے سے، چاہے جیسی موٹی مہین۔ ہلکی بھاری آوازیں نکلیں مگر یہ سب آوازیں ایک ہی سُر سے ہم آہنگ ہوکر ایک ہی واحد نغمہ پیدا کریں۔ اور وہ نغمہ قومی نغمہ قومی ترانہ ہو۔ جب تک ہمارا وجود ذاتیات کی کمزوریوں سے بالاتر نہ ہو۔ جب تک شخصی اختلاف شخصی مخالفت۔ ذاتی اغراض کی آلائشوں سے پاک ہوکر ہم اسے بلند مقام پر نہ بٹھلا سکیں جہاں پستی کی دماغ سوز غلاظتیں نہ پہنچ سکتی ہوں۔ جہاں بیٹھنے پر ہمیں اُس برقی آلہ تک رسائی نہ ہو سکے۔ جس کا تار قوم کے سارے افراد کے دلوں میں ایک ہی رشتہ محبت سے وابستہ کر رہا ہو تو ہمیں ایڈیٹری کا نام لینا ہی نہ چاہئے۔

خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

کوئی شادی کامیاب شادی نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ میاں بیوی کے دو جداگانہ وجود۔ دو جداگانہ ہستیاں ایک واحد وجود ایک واحد ہستی کی صورت میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کہ بیاہی ہوئی زندگی کے مختلف فرائض کے ہر ہر نقطہ اتصال پر دونوں زندگیاں برابر ملتی اور ایک دوسرے سے پیوستہ نہ ہوتی ہیں۔ اور یہ صورت اُس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں کے اغراض ہر ہر معاملہ میں مشترک ہو جائیں تاکہ خوشی کے موقعہ پر ایک ہی ولولہ شادمانی ایک ساتھ ایک ہی وقت دونوں

دلوں کو یکساں متحرک کرے اور غم کی حالت میں باد مخالف کا ایک ہی جھونکا دونوں دلوں کی غنچوں کو ایک ہی وقت ایک ساتھ یکساں پژمردہ کر سکے۔ یہی اصلی مفہوم شریک رنج و راحت کا ہے اور اسی طرح دو جداگانہ ہستیاں ایک معنوی جسم واحد اختیار کر سکتی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے وقت دونوں کو ایک ساتھ بیٹھکر لکھنا پڑھنا چاہیئے۔ درس اور مطالع کے وقت ایک ہی اعلیٰ خیال دونوں روحوں کو ایک ساتھ رفعتِ عرش کی طرف مائل کر رہا ہو۔ عبادت کے وقت دونوں ایک ساتھ عبادت کر رہے ہوں اور حضور قلب سے خداوند عالم کی مقدس بارگاہ میں اپنی زندگی کے بہترین مقاصد میں ترقی کے طلبگار بن کر حاضر ہوں۔ اپنے دلوں کے مشترک افکار میں بارگاہ خداوندی سے مدد کے طالب ہوں۔ اپنے بچوں کے لئے بہترین نعمتوں کے خواستگار ہوں۔ تخلیہ کے وقت اپنی اپنی جداگانہ مشکلات۔ اپنے مصائب۔ اپنی افکار۔ اپنی کمزوریاں۔ اپنی خامیاں ایک دوسرے سے بیان کریں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی ظاہر کر کے اُنکا دل قوی کریں۔ ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھائے۔ ہمت بلند کرے تاکہ دونوں صبر اور استقلال کے ساتھ دنیاوی زندگی کی مشکلات سے مقابلہ کرنیکے لئے طیار ہو سکیں۔ اور ایک دوسرے سے مدد پاکر ان مشکلات پر آسانی سے فتحیاب ہو سکیں اس طریق پر دونوں ملکر ایک معنوی واحد زندگی بسر کریں۔ اس زندگی کی ہر ہر تدبیر۔ ہر اُمید۔ اسکا ہر مقصد دونوں کے لئے ایک ہی ہو۔ دونوں۔ ہر ہر موقع پر جبکہ شوہر اپنی دنیاوی افکار کا کوئی حصہ بیوی کے احاطۂ افکار سے باہر لیجاتا ہے یا جبکہ بیوی اپنی افکار۔ اپنے منصوبے۔ اپنی اُمیدیں۔ اپنی خوشیاں۔

اپنے مشاہدات - اپنی ہمجولیوں سے محبت - شوہر کے احاطہ معلومات اور ہمدردی سے باہر ہوجاتی ہے اِن دونوں صورتوں میں خانہ آبادی معرض خطر میں پڑجاتی ہے - بیوی کا کوئی راز ایسا نہونا چاہئے جو شوہر کے احاطہ معلومات سے باہر ہو - علیٰ ہذا شوہر کا کوئی راز بیوی کے علم سے باہر نہونا چاہیئے دونوں کے لئے کوئی رفیق کوئی دوست کوئی ہمدرد - کوئی ہمجولی کوئی سہیلی ایسی نہونی چاہئے جو دونوں کے مشترک دردمند بہی خواہ اور خیر اندیش نہوں - یا جنکا میل جول - ملاقات - مراسم - خلوص اور محبت محض یکطرفہ ہو - یا جن سے ملاقات قایم رکھنے کیلئے کسی امر میں کسی قسم کی رازداری مشروط ہو جیسے بیوی کو شوہر سے یا شوہر کو بیوی سے مخفی رکھنا لازمی قرار پاتا ہو - میاں بیوی کی زندگیاں ایسی ہونی چاہئے کہ اُنکے اندر کوئی خوشی ایسی نہو جس میں دونوں شریک نہوں - بیاہی زندگی کے محفوظ خلوت خانہ میں کسی تیسرے کا گذر نہیں ہے - انگریزی لفظ " ہوم " جو بیاہی زندگی کا مفہوم ادا کرنیکے لئے ایک معنی خیز لفظ ہے لغوی حیثیت سے ایک رسا لفظ ہے جسکے ساتھ تخلیہ اور خلوت کا مفہوم وابستہ ہے - (اُردو میں اس لفظ کا سرسری اور سطحی مفہوم ادا کرنیکے لئے جو لفظ مل سکتا ہے وہ " گھر " ہے - مگر گھر کے لفظ کے ساتھ تخلیہ اور خلوت کا مفہوم وابستہ نہیں ہے - انگریزی لفظ " ہوم " بتاتا ہے کہ اس گھر کی چار دیواری کا دروازہ غیروں کے لئے ہمیشہ بند رہتا ہے اور اسکے اندر صرف وُہی رہ سکتے ہیں جو اس گھر کے صاحب خانہ ہیں -)
میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ ایک نوعمر بیوی نے اپنے گھر میں ایک

کہلان اور سبا کے خاندان عہدِ اسلام سے قبل ہی مشرق اور مغرب کے درمیان میں تجارتی تعلقات قایم کر چکے تھے۔ ہندوستان کا تجارتی مال بحر ہند کی راہ سے یمن اور حضر موت کو جاتا تھا اور یمن سے حبش، مصر فنیقیہ (Phoenicia) پہنچتا تھا بلکہ اس سے بھی اور آگے رومی۔ عمالقہ۔ اور مدینی اقوام تک راہ پاتا تھا اور اسی طرح مغربی ملکوں تک اس کا سلسلہ جاتا تھا۔ اسماعیلی عربوں کی تجارت کا سلسلہ خشکی کی راہ سے اُسوقت کی آباد دُنیا کے انتہائے سرے تک پہنچا ہوا تھا۔

مُلک عرب اُس زمانہ کے متمدن ملکوں کے وسط میں پڑتا تھا۔ کلدانی شوری۔ عبرانی۔ حبشی اور فنیقی زبانیں جو اُس زمانہ کے متمدن قوموں کی زبانیں تھیں ان سب زبانوں کا سلسلہ سامی تھا۔ عربی زبان بھی اُسی ذیل سے تھی۔ یہ سب زبانیں تلفظ اور معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مُشابہت رکھتی اور ملتی جلتی ہیں۔ اس وجہ سے عربی زبان کو ایک نایاب موقع اپنے زمانہ کی مشترکہ بین الاقوامی زبان بننے کا مِلگیا تھا۔ اور اہل عرب کو اس مشترکہ زبان کی وجہ سے تجارت میں ایک خاص سہولیت مل گئی تھی۔ حتیٰ کے اہل عرب بلا واسطہ کسی ترجمان کے ان مختلف اقوام سے باتیں کر کے اپنا مفہوم اُنھیں سمجھا سکتے اور اُن کا مفہوم خود سمجھ سکتے تھے۔ انھیں تجارتی تعلقات کا سلسلہ جسطرح روز بروز بڑھتا گیا عربی زبان کی ہمہ گیری بھی روز بروز ترقی کرتی گئی۔ اور آخر وہ ایک دن ایسی وسیع زبان بنگئی جیسی کہ آج آپ اُسے پاتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ بیان مبالغہ آمیز

نظر آئیگا۔ مگر ہم ایک ایسے ہی واقعہ کی مثال یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتاب توریت سے دیکھتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ ولادت حضرت مسیح علیہ السلام سے کم وبیش دو ہزار برس قبل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کلدان کے مُلک سے نکل کر سوریا فنیقیہ اور عرب میں سیر کرتے پھرے۔ وہاں کی مختلف اقوام سے ملے جُلے۔ اور بلا مدد کسی ترجمان کے بے تکلف ان مختلف زبانوں کے بولنے والوں سے باتیں کرتے رہے۔ ایک ایسی ہی اور مثال بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کی ہے۔ جو چالیس برس تک جزیرہ نمائے عرب کے بالائی حصہ میں گشت کرتے پھرے اور انہیں بھی وہاں کے لوگوں سے گفتگو کرتے ملنے جُلنے میں کسی ترجمان کی محتاجی نہیں ہوئی۔ (باقی آیندہ)

مورخ

آل انڈیا مُسلم لیڈیز کانفرنس

مُسلم لیڈیز کانفرنس کے مضمون پر ابتک کئی وجہوں سے ہمیں سکوت رکھنا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس سال کے سالانہ اجلاس کا نتیجہ دیکھنے پر البتہ ہمیں اپنے خیالات ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہم ابتک کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ اور نہ اسکی ضرورت ہمیں محسوس ہوئی ہمیں دیکھنا یہ تھا کہ اس ایجوکیشنل کانفرنس کا نصب العین کیا ہے۔ اسکی وضاحت ابتک نہیں ہوئی تھی۔ اسوجہ سے کہ اس انجمن کا نام تو رکھا گیا تھا "آل انڈیا مُسلم لیڈیز کانفرنس" اور مقصد ظاہر کیا گیا تھا علیگڈھ کے زنانہ مدرسہ

کی امداد۔ کہاں لفظ "آل انڈیا" کی عظمت اور کہاں مدرسۂ نسواں علیگڈھ!
یا دوسرے الفاظ میں مقصد اور ذریعہ حصول مقصد کے درمیان میں کوئی صحیح
منطقی رشتہ قائم کرنا انسانی دماغ کی وسعتِ فکر سے باہر تھا۔ امسال سے
اجلاس کی کوئی باقاعدہ روئداد کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ اخبار "شریف
بی بی لاہور" عموماً اس کانفرنس کی روئداد شائع کیا کرتا تھا۔ اس مرتبہ اُس نے
بھی سکوت ہی قائم رکھا۔ البتہ صرف خطبہ صدارت شائع کیا ہے جو اِس وقت
ہماری میز پر ہے۔ اسی کے ساتھ ایک گمنام مضمون "تہذیب نسواں" نے شائع
کیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔

اس گمنام مضمون سے پایا جاتا ہے کہ امسال کے جلسہ کی ساری
کارروائیاں بالکل فرضی ہوئیں۔ حتیٰ کہ دہلی کی اُن خاص خواتین نے بھی
شرکتِ جلسہ سے صاف انکار کیا جنہوں نے کانفرنس کو خاص طور پر دہلی
میں مدعو کیا تھا۔

محترمہ محمود بیگم صاحبہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں بعض مُفید اور قابلِ عمل
نکات پیش کئے ہیں۔ اور میری رائے ناقص میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس جلسہ
نے ایسے نکات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ہمیں ان نکات کے حسن و
قبح پر ایک غائر نظر ڈالنا ہے۔ اس خطبہ صدارت کا پہلا حل طلب سوال
یہ ہے۔

"ہماری قوم کے مُسلّمہ حکیموں نے مرض کا سب سے بڑا سبب جہل تشخیص کیا
ہے اور اُسکے علاج کے لئے تعلیم و تربیت کا نسخہ قرار دیا ہے۔ اور رفتہ رفتہ

زمانے نے اور بھی سمجھا دیا ہے کہ اس نسخہ کا اصلی جزو تعلیم اُناث ہے"
کوئی سمجھدار آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ ہماری قوم کی سرسبزی اور شادابی کا مدار تعلیم اُناث ہی پر ہے۔ جبتک ماں تربیت یافتہ نہو گی بچہ کا امتحان پاس کرکے سند حاصل کرلینا تو ممکن ہے مگر صحیح معنوں میں اس کا تربیت یافتہ ہونا غیر ممکن ہے۔ لیکن اسکے یہ معنی ہرگز نہوں گے کہ جسطرح ہمارے بچوں کی ادہوری اور ناقص تربیت ہو رہی ہے اُسی طرح ہماری لڑکیوں کی بھی ادہوری اور ناقص تعلیم ہو۔ بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے پاس کرلینا تربیت کی تکمیل نہیں ہو یہ بالکل ہی شئے دیگر ہے۔ یہ ہی شئے ہے جو زمانہ حال کے مدرسوں میں عنقا ہو رہی ہے۔ اسی کا پیدا کرنا سب سے بڑی کمی کا پورا کرنا ہے۔ جب تک یہ کمی پوری نہو گی ہماری تعلیم اپنے قدرتی مرکز ثقل پر نہیں پہنچ سکتی۔ دراصل اس تعلیم کا بہت بڑا اور اہم حصہ ماں سے متعلق ہے۔ مگر جبتک ہم تربیت یافتہ مائیں پیدا نہیں کرسکتے اس تربیت کا سارا بار اُستاد ہی کے سر رہتا ہے۔ مگر ہمارے کتنے اُستاد ہیں جو اس کمی کا احساس بھی رکھتے ہوں! انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم یوروپین یونیورسٹیوں کی تعلیم کا ایک نامکمل اور ادہورا خاکہ ہے۔ اس نامکمن اور ادہورے سانچے میں ہمارے بچے ڈہالے جاتے ہیں۔ پھر سوا اسکے اور کیا نتیجہ ہوسکتا ہے جیسا کہ ظہور میں آرہا ہے۔ جسے اہل نظر دیکھتے ہیں اور روتے ہیں جسے عوام الناس دیکھ نہیں سکتے۔ اور "تعلیم تعلیم" کی رٹ لگاکر ہمارے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلی کمی یوروپین یونیورسٹیوں کی ادہورے خاکہ کی تھی۔ اس پر اسلامی خصوصیات کی کمی سے اور بھی بہت سی خامیاں مستزاد

کریں۔ ہمارے بچوں کی تعلیم جب تک اسلامی روایات اسلامی عقاید۔ اسلامی نقطۂ خیال کی روشنی میں نہو ہمارے لئے کسی کام کی نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہمارے بچوں کی تعلیم کی یہ کمی پوری نہ کی جائے ہمارے بچے تربیت یافتہ نہیں کیے جا سکتے وہ ایم اے پاس کر لینے پر بھی حرف شناس ہی رہیں گے۔ ایک بچہ کا کسی امتحان کے لیے چند مشروط کتابوں کا ازبر کر لینا کوئی تربیت نہیں کہی جا سکتی۔ اگر اُسے کتابیں خوب یاد ہیں تو ضرور امتحان پاس کریگا۔ اور ممکن ہے کہ اعزاز کے ساتھ ہو۔ مگر ان کتابوں کو یاد کر کے پاس کر لینے پر کیا اس میں وہ اعلیٰ اور بہترین خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں جو ہمیں بی اے ڈگری سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ جو کسی انسانی فرقہ کے مذہب اور تربیت یافتہ بنانیکے لئے لازمی ہیں۔

مثال کے طور پر لیجیئے بی اے۔ یا ایم اے کی کس کتاب میں یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ ساری قوم ملکر ایک جسم واحد ہے۔ اور اس کا ہر فرد ہر ہر متنفس اس جسم کا ایک جیتا جاگتا عضو ہے۔ اگر اس عضو کے ایک حصہ کو تھوڑی سی بھی تکلیف پہنچے تو سارے جسم کو اسکے درد سے بیچین ہو جانا چاہیئے اگر اس جسم کی ایک اونگلی میں ایک ننھی سی پھانس لگ جائے تو سارے جسم کو بیچین ہو جانا چاہئے۔ اور اسی طرح بیچین رہنا چاہیئے جبتک کہ اُس اونگلی کے ناخن کے اندر سے وہ ننھی سی پھانس نکل نہ جائے! یورپین اقوام کو یہ سبق ازبر ہے۔ اسی وجہ سے وہ مہذب قوموں میں داخل ہیں۔ مثلاً فرانس کے ملک کا ایک باشندہ فرض کیجیئے ایک پادری چین میں قتل کر ڈالا جائے۔ سلطنت فرانس اور سلطنت چین کے والیان میں صرف اسی ایک متنفس کا قتل اعلان جنگ

کے لیے کافی سے زیادہ وجہ بن سکتا ہے۔ مگر ایک بیگناہ مسلمان اگر بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو ہم کیا کریں گے؟ ہم اسکے خلاف جھوٹی شہادت دیں گے۔ اگر اسکے دشمن کہیں گے کہ وہ بدمعاش ہے تو ہمارا جواب ہوگا کہ وہ بدمعاش ہے۔ اسکے باپ دادا سات پشت سب بدمعاش تھے حالانکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ بالکل بیگناہ تھا۔ اسی قومی اتحاد کا نام یورپین سیاسی اصطلاح میں "Unification of the race" ہے۔ جبتک ہماری قوم میں ایسا اتحاد پیدا نہو ہم کسی تربیت یافتہ قوم کی نظروں میں "قوم" نہیں بن سکتے۔ چاہے ہم دن رات "قوم قوم" رٹ لگا کر دنیا کا دماغ پریشان کرتے رہیں۔ قومی تربیت اور اسلامی نقطۂ خیال کی تربیت کی پہلی منزل یہی ہے مگر ایسی تعلیم کہاں ہوتی ہے؟ کون کون اوستاد ایسی تعلیم دیتے ہیں؟ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ اگر ہم اُن کی تصویر نہیں دیکھ سکتے تو کم سے کم اُن کا نام ہی سُن لیں۔ شامتِ اعمال سے ہمارے قومی وجود۔ ہماری قومی ہستی کی جڑ میں کیڑا لگا ہوا ہے۔ اس کیڑے سے نے ہماری جڑ بالکل کھوکھلی کر دی ہے۔ موجودہ مروجہ تعلیم ہماری اس قومی پودے کی کُملائی ہوئی شاخوں پر پانی کا فوارہ چھوڑ رہی ہے مگر جڑ سے کیڑا نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ ایسی آبیاری سے جیسا کچھ نتیجہ ظہور میں آنا ممکن ہے وہی ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ ہم سارا حال صاف صاف روز روشن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں مگر پھر بھی نہیں سمجھتے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ مرجھائی ہوئی کونپلوں پر گنگا جل نہیں آبِ کوثر بھی اگر آپ چھڑک دیجیے تو وہ ہری نہیں ہو سکیں۔ جبتک جڑ سے کیڑا نہ نکالا جائے۔ اور یہ جڑ کا کیڑا کیا ہے

ایسے بھی صاف صاف دیکھ لیجیے۔

بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لا الہ الا اللہ۔ محمد الرسول اللہ کے رشتۂ اخوت میں ساری دنیائے اسلام کے چمکدار موتیوں کو پروکر ایک ہار بنا یا تھا۔ ہر کلمہ گو ایک دوسرے کا عزیزترین بھائی تھا۔ گورا افغان اور کالا حبشی۔ غلام اور آقا چین۔ تاتار۔ افریقہ اور ہندوستان کا باشندہ ایک ہی صف میں کھڑا تھا کالے گورے ایک جان دو قالب تھے۔ مشرق کا سرا مغرب سے ملا ہوا تھا۔ اور یہ سارا معجزہ اسی ایک فقرہ کا تھا۔ لا الہ الا اللہ و محمد الرسول اللہ۔ یہی اسلام کا چلتا جادو۔ یہی سحر حلال اور یہی ایک پُرزور منتر تھا۔

اسلام کی یہ میراث ہمارے باپ دادا نے ہمارے ہاتھ میں چھوڑی۔ ہمنے تعلیم پائی۔ ہم روشن خیال بنے۔ اور اس روشن خیالی کا وحشیانہ لٹھہ کاندھے پر رکھکر میدان میں آگئے۔ اس لٹھہ کے پہلے ہی جھٹکے سے ہم نے وہ موتیوں کا ہار توڑ ڈالا۔ وہ رشتہ اخوت ٹوٹ گیا۔ روشن خیالی ہی ہاتھ رہگئی۔ اور آج ہم یہ روز بد دیکھ رہے ہیں کہ مثلاً عرب کے مسلمانوں کو ہم کٹھ مُلّا کہکر اُن سے دور بھاگتے ہیں تو وہ ہمیں برائے نام مسلمان کہکر ہماری طرف رُخ بھی نہیں کرتے۔ ہم اپنے زعم باطل میں روشن خیال ہیں۔ اور وہ "کٹھ مُلّا" اُنکے نقطۂ خیال سے ہم مُرتد ہیں۔ اور کسی طرح قابل خطاب نہیں سمجھے جاتے چلئے قصہ ختم ہوا۔

اگر ہم نے نئی تعلیم پائی تھی۔ نئی روشنی کی دُھن میں منہمک تھے تو کم سے کم ہمیں یہی کرنا تھا کہ یوروپین تہذیب کا قومی اتحاد جسے اہل یورپ و امریکہ

"Unification of the race" کے نام سے ملقب کرتے ہیں اُسی کو پُرانی روش کے اسلامی اتحاد کا قایم مقام بنا لیتے تو بھی ہمارا قومی وجود ہماری قومی ہستی معرض خطر میں نہ پڑتی۔ مگر افسوس "قوم" کے لفظ سے صرف ہمارے کان آشنا ہیں۔ دل اسکی لذت سے بالکل ہی اجنب ہے۔ آپ کفر بکنے کیلئے ہمیں معاف کیجیئے مگر قومی ہستی کے پودے کی جڑ میں جس کیڑے کی آپ کو تلاش تھی شامت اعمال سے وہ کیڑا ہماری روشن خیالی ہی ٹھہرتی ہے۔ یہ ایک بدیہی واقعہ ہے۔ چاہے آپ اسے پسند کریں یا نکریں یہ بات ہی اور ہے۔

مگر ہماری خامیوں کا یہ صرف ایک ہی پہلو تھا۔ اس پر خاتمہ نہیں ہے۔ "کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری" چھوٹی بڑی ایسی ہی سیکڑوں باتیں ہیں جو ایک انسان کو تربیت یافتہ بنانے اور ایک جیتی جاگتی قوم کا ایک جیتا جاگتا متنفس بنانیکے لیئے لازمی ہیں۔ مگر ہماری موجودہ تعلیم اُدھر رُخ بھی نہیں کرتی۔ لڑکیوں کی تعلیم میں ان خامیوں کا بھی کوئی علاج سوچا جائیگا یا نہیں ؟ سوال تو یہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ اسکا علاج نایاب نہیں ہے۔ اگر آپ توجہ فرمائیں۔ جوئیندہ یابندہ۔

محترمہ محمود بیگم صاحبہ ہماری لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق ابتدا میں جو کچھ فرماتی ہیں لفظ بلفظ صحیح ہے۔ یہ بھی تعلیم کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ بچہ کی تعلیم اُس کے عین پیدائش ہی سے شروع ہوتی ہے اور ماں کا چہرہ ہی اُسکے دفتر تعلیم کا پہلا صفحہ ہے مگر اس حد سے آگے بڑھکر جب وہ عملی تدابیر بتانے پر

آتی ہیں تو وہی پُرانی لکیر پر گھوم پھر کے پہنچ جاتی ہیں اور محض اتنے ہی پر بس کر دیتی ہیں کہ اسکول اور کالج کھولے جائیں۔ وظائف دیئے جائیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں سوال تو یہ ہے کہ آپ ہمیں ریل کا ٹکٹ تو لئے دیتی ہیں مگر یہ نہیں بتاتیں کہ آخر یہ فی گھنٹہ چالیس میل کی رفتار سے چلنے والی ٹرین ہمیں کہاں کدھر کس سمت کس رُخ لیجائے گی اور ہماری منزل مقصود کیا ہوگی؟ اگر ہماری لڑکیوں کی منزل مقصود بھی وہی ہے جو ابتک ہمارے لڑکوں کی رہی ہے تو معاف فرمائیے۔ ایسی تعلیم کو ہمارا دُور ہی سے سلام ہے۔ ہم ایسی تعلیم سے جاہل ہی بھلے۔ اگر ہماری تعلیم ہمیں اپنے عزیز و اقارب خویش و اقربا سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ اگر ہماری تعلیم ہم سے عزیزوں کی محبت چھڑا دیتی ہے۔ اگر ہماری تعلیم ہمارے مذہبی عقائد کی راہ میں کانٹے بوتی ہے۔ اگر ہماری تعلیم ہمیں محض لکیا خود غرض مطلب آشنا حرف شناس بنا کے رخصت ہو جاتی ہے اور سوا فیشن پر مرنے اور جھوٹی شیخی اور نقل کے ہمیں کوئی مفید شے نہیں دے سکتی تو نہیں ایسی تعلیم کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری تعلیم خدا اور بندوں کے درمیان میں ایک حدفاصل بنکر کھڑی ہو جانے پر تلی ہوئی ہے تو ہمارے لئے ایسی تعلیم برکت نہیں ہو سکتی بلکہ ہزار لعنتوں کی ایک لعنت ہے ابھی تک ہمارے بچے ہی ڈبل بل لقین ہوئے ہیں۔ لڑکیاں صاف بچی ہوئی ہیں۔ اگر ہماری لڑکیوں میں بھی یہی زہر پھیلا تو یاد رکھئے کہ اسلام کا خاتمہ ہے۔ اور اسکے ساتھ "قوم" کا بھی۔ چراغ گل اور پگڑی غائب ہے!

ہم تعلیم نسواں کے مخالف نہیں ہیں۔ تعلیم سے مخالفت عقل کی مخالفت

ہے۔ مگر ہمیں ایسی تعلیم چاہیئے جس کی ہمیں ضرورت ہے اور جسکا حال ہم کچھ اوپر عرض کر چکے ہیں۔ اور بہت کچھ "پیام اُمید" آج سے پہلے بتا چکا ہے۔ اگر آپ وہی تعلیم دینگی تو آپ قوم کی محسنہ ہیں۔ اور ہماری قومی تواریخ طلائی حروف سے آپکا نام اپنے صفحات میں چمکائے گی۔ مگر برعکس اسکے اگر آپ کی مجوزہ تعلیم اسکے برعکس ہوئی تو اسلام کو ایسی تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد محترمہ محمود بیگم صاحبہ مکاتب اور اسکولوں کا قایم کرنا۔ نصاب تعلیم تجویز کرنا۔ کتابیں تصنیف کرنا مردوں کے ہاتھ میں چھوڑتی ہیں۔ اور عورتوں کو اُن سے متفق الرائے ہوکر کام کرنے کی صلاح دیتی ہیں۔ اُنکا مشورہ بہت ہی مناسب اور قابل ستائش ہے۔ مگر یہاں ہمارے لئے یہ بات قابل افسوس ہے کہ ہر صورت سے قابل پسند نصاب تعلیم تک مُرتب نہو سکا۔ ہمیں ایسے نصاب تعلیم کی ضرورت ہے جو موجودہ طرز تعلیم کی ساری خامیوں اسارے نقائص کا شافی علاج ہو سکے۔ ایسا نصاب کہاں ہے؟ ہمیں تو کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اور یوں تو ادھر اُدھر سے آم گھانس منتخب کرکے کتاب کی صورت میں لے آنا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ ایک بچہ بھی کرسکتا ہے۔ رہا عورتوں کا مردوں سے متفق الرائے ہو کر کام کرنا یہ بات تو حد سے زیادہ اہم اور دشوار ہے۔ اس راہ میں جگہ جگہ کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ اور جب تک ہماری راہ کے یہ کانٹے دُور نہوں ایسے اتحاد کی صورت برقرار ہونا ہمیشہ خواب و خیال ہی رہے گا۔ یہ کانٹے کیا ہیں؟ اسکا جواب ہم بچ کی تحریر کے ذریعہ سے دیکھتے ہیں اگر آپ چاہیں۔

رسالے کے ذریعہ سے ممکن نہیں ہے۔

معزز محمود بیگم صاحبہ آگے چلکر فرماتی ہیں کہ ایک مختصر سا رسالہ مرتب کیا جائے جس میں پیدائش سے لیکر چھ سات برس کی عمر تک بچونکی پرورش و پرداخت و تربیت کے متعلق ضروری ہدایات ہوں۔ ایسا رسالہ لکھوانا چاہیے اور ہزارہا کاپیوں کی تعداد میں اسکو طبع کرا کے مسلمانوں میں مفت تقسیم کرانا چاہیئے۔ تجویز تو نہایت عمدہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا عملی پہلو نہایت ہی مضبوط ہے مگر مشکل اتنی ہی ہے کہ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔ اس اہم ترین کام کیلئے مکمل ہدایات کسی ایک مختصر رسالہ میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اس مضمون پر ایک وسیع کتب خانہ جمع کر سکتی ہیں۔ صرف ایک مختصر رسالہ کیا کر سکتا ہے۔ اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ ناممکن نہیں۔ البتہ آپ کی پوری توجہ کی ضرورت ہے۔

(۲) علمار کرام کی مدد بھی بہت کچھ کارآمد اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر نہ صرف ایک مختصر سے رسالہ میں سارا مضمون آسکتا ہے اور نہ صرف اُس ایک مختصر رسالہ کا مضمون علمار کرام اپنے حلقہ اثر میں شایع کر سکتے ہیں کہ اُتنا ہی کافی ہو۔

(۳) کانفرنس کے ممبروں سے بھی بہت کچھ عملی کام ہونا ممکن نہیں اگر وہ پوری توجہ سے کام کرنا شروع کر دیں۔ مگر شرط اتنی ہی ہے کہ اوروں کو ہدایت کرنے سے پہلے خود ہی اس مضمون پر اچھی طرح تیار ہو جائیں۔ یہ تیاری کسی ایک

مختصر رسالے کے چند اوراق دیکھ لینے سے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ انہیں بہت کچھ دیکھنا اور غور سے مطالعہ کرنا پڑیگا۔ دلسوزی کے ساتھ اچھی طرح محنت کرنے کی ضرورت پڑے گی اور بہت سا وقت صرف کرنا پڑیگا۔

(۴) جو اخبار طبقہ اناث کی اصلاح خیالات کے لئے جاری ہیں انکی اشاعت میں ترقی دینا حد سے زیادہ مفید کام ہے۔ مگر سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کون کون سے اخبارات یا رسالے آجتک اپنے کو صحیح اور واقعی اصلاح کا اہل ثابت کر چکے ہیں۔ ایسا نہو اصلاح کے نام سے غلط خیالات پھیلائے جائیں اور صحیح اصولوں سے متجاوز ہو کر ہماری لڑکیاں غلط راستوں پر بھٹکیں اور ٹھوکریں کھاتی پھریں۔ جیسا کہ بعض قابل افسوس حالتوں میں دیکھا جا رہا ہے یہاں بھی بڑے سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی کا اثر عالمگیر ہوگا۔ یہی زمانہ ہماری لڑکیوں کی تربیت قبول کرنیکا ہے جسے انگریزی میں "Formation of character" کہتے ہیں۔ اس وقت صحیح یا غلط جو رائے دماغ میں جم جائے گی وہ ساری عمر نکالے نہ نکلے گی۔ یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۵) کانفرنس کے موقع پر بیویوں کو بلا کر انسے سُنا کہ انہوں نے اپنے بچوں کی کس کامیاب طریق پر تربیت کی ہے حد سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے مگر اس ضمن میں مثال کے طور پر جو باتیں دکھائی گئی ہیں وہ کسی ذہین ذکی۔ دانشمند اور معراج ترقی پر پہنچی ہوئی قوم کے بچوں کی تربیت کا نمونہ پیش نہیں کرتیں جو باتیں یہاں بیان ہوئی ہیں یہ تربیت کے مکتب کی الف

بے ہیں - ہمارے بچوں کی تربیت کا انہیں باتوں سے آغاز اور انہی پر اختتام ہونا چاہیے - البتہ عملی کام شروع کرنیکے لیے یہ ابتدا کوئی بری ابتدا نہیں کہی جا سکتی - اگر آپ ان نکات کو مراتب ابتدائی سمجھکر آگے بڑھیں اور زینہ بزینہ منزل بمنزل ترقی جاری رکھیں تو ضرور یہ کوشش قابل داد ہوگی - اگر اسی حد پر تربیت کا خاتمہ ہے تو کچھ بھی نہیں ہے - ہاں نہونیسے کچھ ہونا ضرور بہتر سمجھا جائیگا - اور انگریزی زبان کی وہ مثل راست آئیگی - کہ اگر ہمیں پوری روٹی میسر نہیں آسکتی تو آدھی ہی ہزار غنیمت ہے -

(۶) اس طرح عقائد رسوم اور اسراف کے متعلق جو ابتدائی کوششیں شروع کیجا رہی ہیں ہر طرح قابل داد ہیں - بشرطیکہ انہی پر ہماری تربیت کی معراج نہ سمجھ لیجائے

(۷) یورپ کے طرز معاشرت کی تقلید اور اسراف کے خلاف بھی محمود بیگم صاحبہ نے صدا بلند کی ہے - وہ فرماتی ہیں کہ ہمارے لڑکوں میں یہ خامی نمایاں صورت میں نظر آنے لگی ہے اور انکی یہ شکایت بالکل صحیح اور حق بجانب ہے - اور سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ لڑکیاں اس خدشہ سے بچائی جائیں - صفائی سے سادگی اور کفایت شعاری سے قومیں بنتی ہیں - فضول خرچی اور اسراف سے تباہ ہو جاتی ہیں - یہ بات ہر حال میں ہماری لڑکیوں کے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے - سی طرح اس کی بھی کہ اگلے زمانہ کے مسلمانوں میں جیسی حیادار اور سلیقہ شعار بیویاں پیدا ہوتی تھیں ایسی پھر ہونے لگیں - محترمہ محمود بیگم صاحبہ اُستانیوں کی زندہ مثال پر بہت زور دیتی ہیں اور اس پر جتنا زیادہ زور دیا جائے کم ہے - ہزار سبق ایک طرف ہیں اور ایک قابل تقلید زندگی کا جیتا

جاگتا نمونہ ایک طرف مگر اسی کے ساتھ ہمیں مجبوراً یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ غیر مسلم استانیوں سے اسلامی طرز معاشرت اسلامی عقائد اسلامی زندگی کے قابل تقلید نمونے کی تلاش میں ہم کس حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ابھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہمیں نہیں معلوم ہے کہ ہم کہاں تک ایسوں سے یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی عظمت اپنے شاگردوں کے دل پر جما سکیں گی جن کے دل خود اس عظمت کے نقش سے خالی ہیں۔

یہ عملی تجویز بھی حد سے زیادہ قابل ستائش ہے کہ کانفرنس ایک لائق اور پاک نفس مسلمان خاتون کی خدمات حاصل کرے جس کا فرض ہو کہ زنانہ اسلامی مدارس کا دورہ کرکے ہر ہر مدرسہ میں چند روز قیام کرکے وہاں کے حالات پر ایک غائر نظر ڈالے اور مذہبی۔ اخلاقی اور تعلیمی مقاصد کے ہر ہر پہلو اور ہر ہر شعبہ پر نظر کرکے وہاں کے تفصیلی حالات کی رپورٹ کانفرنس کی خدمت میں بھیجا کرے۔

اسی طرح کھانا پکانا سینا پرونا اور خانہ داری کے انتظام کی بھی مدارس میں تعلیم ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد صدر انجمن صاحبہ کی توجہ مکاتب دیسی کی طرف ہوتی ہے۔ اور فرماتی ہیں کہ ایسے مکاتب جہاں جہاں ہیں اُنکی مدد کی جائے اور نئے مکاتب کھولے جائیں۔ تعلیم نسواں کے رواج دینے کیلئے مکاتب بیحد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ مگر ہمیں بھول نجانا چاہئے کہ اگلے زمانے کے اُستاد جوان مکاتب کی روح رواں تھے وہ بات اُنکے دم کے ساتھ گئی۔ جو بات تب تھی وہ تو اب پیدا ہونا کار دارد ہے۔ بیسویں

صدی کے نیم ٹرا وستادوں سے اسکی امید رکھنا ہی فضول ہے۔ البتہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جو نصاب تعلیم کانفرنس جانچ پڑتال کے بعد قایم کرے یہ اُستاد انہیں کتابوں کو پڑھا ہیں ۔ آگے چل کر اُستادوں کی تربیت کا بھی ایک کلاس کھول دیا جائے۔ اس کلاس کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے پر اُستاد کو معقول تنخواہ دیجائے اور اُس سے ہمارے مکاتب میں کام لیا جائے ہمیں لایق اُستانیوں کی حد سے زیادہ ضرورت ہے اور جو کام اُستانی کا ہے وہ اُستاد سے نہیں نکل سکتا۔ محلہ کے خانہ نشین اور پنشنر بزرگوں سے تربیت میں مدد دینے کی صلاح بہت اچھی ہے۔ مگر ہمیں بڑا خوف ہے کہ اس حد تک ایثار کرنے والے بزرگ ہماری قوم میں کمیاب ہیں۔ ہم اُس نیک ساعت کے منتظر ہیں جب مسٹر گوکھلے (یادش بخیر) کی انجمن خدام ہند کی طرح ہمارے طبقہ میں بھی ویسے ہی خود فراموش افراد پیدا ہونے لگیں گے۔ اللہ وہ دن جلد لائے۔ آمین۔

نتیجہ اخیر۔ ہم محترمہ محمود بیگم صاحبہ کو اُنکے عملی نکات سے لبریز خطبۂ صدارت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اوپر کی سطور میں نکتہ چینی کی ہے تو ہماری غرض اس سے محض اتنی ہے کہ قوم ان نکات کے حسن و قبح پر اچھی طرح غور کرے اور بحث مباحثہ کرکے ایک صاف اور سیدھی شاہراہ تجویز کرے۔ تاکہ ہماری نئی پود اور آیندہ صفوں کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ محترمہ محمود بیگم صاحبہ سچے معنوں میں محسنہ قوم ہیں۔ اور اُن کا قابل قدر خطبہ غور سے حرف بحرف پڑھنے اور غور

غور کرنیکے قابل ہے۔ کیا اچھا ہو اگر کانفرنس کی سب ممبر خواتین کانفرنس کی اُن مفید تحریکات میں اتنی ہی گہری دلچسپی لیں جتنی محمود بیگم صاحبہ اُن سے اُمید رکھتی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گی تو سال کے اخیر میں سب کا ایک جگہ جمع ہو کر چند رزولیوشن پاس کر کے گھر واپس چلا جانا کوئی کارآمد یا مفید نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ بلکہ برعکس اس کے اس سے بہت سے نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس تب ہی اصلی معنوں میں ایک قابل فخر کانفرنس ہو سکتی ہے جب وہ کچھ کر کے دکھائے۔ محمود بیگم صاحبہ کا خطبہ صدارت اس کانفرنس کا دائرہ عمل علیگڈھ کے مدرسہ نسواں کی محدود چار دیواری کی حدود کے اندر محدود نہیں کرتا۔ بلکہ سارے ہندوستان کے تعلیمی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ پہلا اصول کوتاہ اندیشی کا نمونہ تھا۔ حال کا روشن وسیع الخیالی اور دور بینی پر مبنی ہے۔ اسی خطبہ صدارت کی روشنی میں قواعد کی بھی ترمیم ہونا چاہئے۔ جو تنگ خیالی اور پست ہمتی سے اُسکی وسعت محض زنانہ اسکول کی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں۔ قواعد میں اور بہت سی باتیں ترمیم طلب ہیں جنپر ہم ابتدا ہی میں کانفرنس کو توجہ دلا چکے ہیں مگر وہ ہماری نیچ کی تدبیر تھی اور آج بھی اُسے عام کرنا گوارا نہیں کرتے۔ جبتک شدید ضرورت ہمیں مجبور نکر دے۔ آزاد بیگم

نوٹ۔ آج کی ڈاک سے "شریف بی بی" مورخہ ۲۶ مارچ موصول ہوا۔ اس سے پہلے کی اشاعت ہمیں نہیں ملی۔ امید کہ ایڈیٹر صاحبہ جلد عنایت فرمائیں گی

کانفرنیس کی روئداد پر اپنے پریشان خیالات ہم آیندہ اشاعت میں ظاہر کرینگے

گردش زمانہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

رائے جی۔ ماں تم اپنے داماد کو کھانا کھلاؤ۔ شام سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا ہے بھوک لگی ہوگی۔ میں بابوجی کے پاس جاتا ہوں وہ تنہا بیٹھے ہیں (پھر میری طرف مخاطب ہوکر کہا) برجبیندر تم کھانا کھاؤ میں باہر جاتا ہوں شرم کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ تو تمہارا گھر ہے۔ جوں ہی رائے جی باہر گئے میری ساس گھونگھٹ کھول کر بے تکلف پاس آئیں اور ہاتھ پکڑ کر بولیں کھاؤ لالہ کھاؤ۔ شرم کیوں کرتے ہو۔ ہم لوگ کیا غیر ہیں تم تو ہماری اولاد کیا تمھیں معلوم نہیں ہے۔ افسوس کہ آج برجبیندر تم کو بڑی تکلیف ہوئی بیشک یہ کھانے کا وقت نہیں ہے۔ بہت دور سفر کرنا پڑا۔ تھک گئے ہو گے۔ تھوڑا بہت کھا کر سو رہو۔ پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اچھا اب دیر نہ کرو کچھ کھالو جس قدر مجھ سے کھانا کھانے کو کہا جاتا تھا اُتنا ہی مجھپر خوف غالب ہوتا جاتا تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا چاروں طرف دیکھتا اور اُن لوگوں کی حرکتوں پر غور کرتا تھا۔

ساس۔ (بڑھیا سے) ماں کیا ابتک دودھ نہیں آیا؟ ان کو تم کھانا کھلاؤ میں جاکر دودھ منگاتی ہوں۔

یہ کہکر وہ چلی گئی۔ بڑھیا میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بڑی شفقت سے کہنے لگی

بڑھیا۔ بیٹا شرم نے ابتک تم کو نہیں چھوڑا او اب تو کچھ کھالو۔

جب کھانیکے واسطے بہت مجبور کیا تو میں نے بڑی عاجزی سے کہا مجھے بھوک نہیں ہے۔ لیکن یہ کون سنتا تھا۔ بڑھیا اور زیادہ مجبور کرنے لگی اصرار کی کوئی انتہا نہ رہی بار بار کہنا شروع کیا کہ اب تم کو تمہاری دُلہن خود آکر کھلا دیں گی۔ دولہن کا نام سُن کر ایک گونہ خوشی ہوئی کہ سات دن سے جسے میری آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں اسوقت اُسکا نظّارہ میسّر آئیگا۔

بڑھیا۔ (مجھے خاموش دیکھکر) ہیرا کی ماں اِنکی دُلہن کو بلا لا۔ ورنہ یہ کھانا نہیں کھائیں گے۔

اچھا کہتی ہوئی تیسری عورت چلی گئی۔ اس ہیرا کی ماں نے ابتک کوئی بات نہیں کی تھی جاتے وقت چراغ کی روشنی میں اُسکا چہرہ دیکھکر میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی عورت ہے جو میرے خُسر کیلئے حُقّہ لیکر گئی تھی۔

بڑھیا۔ (میرے سر پر ہاتھ پھیر کر) بیٹا سات ہی دن میں اسقدر محبت ہوگئی کہ بغیر بیوی کے کھانا نہیں کھا سکتے۔ چلو اچھا ہوا یہی چاہیے۔ جس قدر زیادہ تم دونوں میں محبت ہوگی اُتنی ہی زیادہ ہم سبکو خوشی ہوگی۔

باہر سے پازیب کی جھنکار کی آواز آئی۔ بڑھیا اُٹھکر فوراً چلی گئی باہر پہنچکر اُس نے بآواز بلند کہا:۔

بڑھیا۔ بیٹی جاؤ تمہارے بغیر وہ کھانا نہیں کھاتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے مُنہ میں نوالہ دینا۔ ۔ ۔ ۔

مجھے ان تمام باتوں پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا کہ یکایک ایک حُسن کی

دیوی نے دروازہ کھول کر اپنا جمال جہاں آرا دکھایا۔ بڑی شوخی سے گھونگھٹ کھول کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ میں اُسکی بیحجابی پر حیران رہگیا۔ دیوانہ وار مُنہ تکنے لگا۔ یہ عورت نہایت حسین تھی۔ ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کشادہ پیشانی۔ نازک نازک ہاتھ۔ بیباکی اور شوخی سب سے زیادہ قیامت ڈہا رہی تھی۔ آنے والی نازنیں نے مجکو اس قدر خودرفتہ دیکھکر کہا۔ مجھے کیا دیکھتے ہو؟ مزاج کیسا ہے؟

میں۔ (منت سے) آپ کون ہیں؟ میں نے پہچانا نہیں معاف کیجیے۔

نازنیں۔ تعجب ہے کہ آپ مجھے نہیں پہچانتے ایسے تغافل کا کیا ٹھکانا ہے دو ہی دن میں بھول گئے۔ گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا۔ میں تمہاری بیوی ہوں

میں۔ سچ بتادو تم کون ہو۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا تمہاری بڑی عنایت ہوگی اگر تم صحیح صحیح اپنا حال بیان کردو گی کہ میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں۔ یہ کون مقام اور کس کا مکان ہے۔ تم کون ہو؟ اور میں کس جال میں پھنسایا گیا ہوں۔ یہ بیداری ہے یا خواب؟

(باقی آیندہ)

عبید الحق

ادبی جواہرات

(۱) **جام الفت** - یعنی شیکسپیر کے مشہور زمانہ ڈراما "مڈسمر نائیٹس ڈریم" کا ترجمہ شستہ لکھنوی زبان اور گلزار نسیم کی بحر میں۔ قیمت فی جلد ۸؍

(۲) **شکنتلا** - یعنی ملک الشعرا کالیداس کا کلام۔ حضرت خلیل شاگرد حضرت امیر مینائی مرحوم شاعر دربار بلرام پور راج کی مرصع نظم میں۔ فی جلد ۱؍

(۳) **پیام امید کے پچھلے پرچے** - اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے سچے دیندار مسلمان رہ کر ویسے ہی نکلیں جیسے دنیا کی زندہ قوموں کے بچے ہوتے ہیں تو ان کی خامیوں کا علاج انہیں صفحات میں ملے گا۔ ستمبر ۱۵ء سے اس وقت تک کے پرچے موجود ہیں۔ فی پرچہ ۴؍

دفتر رسالہ "پیام امید" محمود آباد ضلع سیتاپور

(اودھ)

موسو

یہ دوا اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں۔ تمام دردوں مثلاً وجع المفاصل۔ نقرس۔ گٹھیا۔ عرق النسار۔ درد پشت۔ فالج۔ ادہرنگ۔ ذات الصدر۔ ذات الجنب۔ خارش جسم وغیرہ جیسی تمام شکایات کو رفع کرنا اس کا اصلی کام ہے۔ یہ مالش کرنے کی صورت میں اپنا اثر فوری دکھاتا ہے۔ اکثر بادی۔ بلغم اور ریح وغیرہ یا بے اعتدالیوں کی وجہ سے بڑھاپے میں جس کو ایسے دردوں کی تمام شکایت پائی جاتی ہے اُن اصحاب کیلئے موسو کا استعمال نہایت مفید ہے۔ بطور حفظ ماتقدم اسکی مالش سے آنیوالی شکایتیں رُک جاتی ہیں۔ ایک بکس جس کی قیمت صرف ۱۲؍ ہے مدت کیلئے کافی ہے۔

المشتہر۔ سلیمان۔ اینڈ۔ روز۔ ۱۱۵ بیگانڈیٹ سٹریٹ رنگون۔ ملک برہما۔

پردہ نشین لائبریری آگرہ کی مقبول عام کتابیں

معلمہ یا بہشتی جوہر ۱۲؍۔ عقیلہ بیگم ۱؎۔ جمیلہ خاتون ۳؍۔ لاڈلہ بیٹا ۳؍ صبر کی دیوی ۳؍۔ سولہ دلچسپ کہانیاں ۱۲؍۔ رسول عربی ۶؍۔ راہ جنت ۳؍ بنت الرسول ۵؍۔ صنعت خانہ ۴؍

ملنے کا پتہ۔ مسز احتشام مہتمم پردہ نشین آگرہ

نادر و نایاب علمی کتابیں

پیک ابر | کالیداس کی مشہور نظم "میگھ دوت" کا ترجمہ۔ مرصع نظم میں از جناب عاشق لکھنوی۔ نفیس کاغذ۔ عمدہ چھپائی اور دس کے قریب فوٹو کی تصاویر۔ قیمت صرف ۶ر

کفایت شعاری | ڈاکٹر سیموئیل سمائلیز کی کتاب "تھرفٹ" کا اُردو ترجمہ نفیس کاغذ عمدہ چھپائی قیمت صرف ۸ر

علم زندگی | "سائنس آف نیو لائف" کا اُردو ترجمہ ہر ایک شادی شدہ جوڑے کے پڑھنے لائق کتاب ہے قیمت عہ

انتخاب زوج | ایک دلچسپ تمدنی افسانہ از کے۔ ایف بیگم صاحبہ دہلوی قیمت ۵ر

کلام محروم | منشی تلوک چند محروم کی نایاب ادبی اخلاقی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ قیمت ۱۲ر

پریم پچیسی | ان نہایت دلچسپ کہانیوں میں منشی پریم چند صاحب نے اکثر قومی اور تمدنی مسائل سے بحث کی ہے۔ بچوں اور عورتوں کے پڑھنے لائق کہانیاں ہیں قیمت ۱۲ر

افسانہ بنگال | سر رابندر ناتھ ٹیگور۔ شریمتی سینہ لتا سین۔ بابو پربھا ست کمار مکرجی وغیرہ مشہور بنگالی افسانہ نگاروں کی بہترین کہانیوں کا اردو ترجمہ از منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ایڈیٹر رسالہ ترجمان لاہور۔ ان کہانیوں میں شاعرانہ تخیل اور مصورانہ رنگ آمیزی موجود ہے قیمت ۸ر

برکات سلطانی | ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کے باتصویر حالات زندگی قیمت ۶ر

المشتہر۔ لال برادرس۔ ۷ پارسنز روڈ نولکھا۔ لاہور

جس کا درد وُہی جانتا ہے
دوسرا کیونکر جان سکتا ہے

یونتو کوئی ایسا مرض نہیں جسکی تکالیف سے مریض نالاں اور پریشان ہنو مگر دمہ کے مریض
دمہ کی ناقابل برداشت تکلیف سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور راتدن سانس بھ
دم نکلے جاتے ہیں اور نیند حرام ہو جاتی ہے دیکھئے آج انکو کسقدر تکلیف ہے لیکن افسوس
اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیا دھتورہ بھنگ بلاڈونا پوٹاس
دیگرہ بنتی ہیں - اسلئے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے - ڈاکٹر برمن کی کم
سے بنی ہوئی دمہ کی دوا - ایک انمول جوہر ہے - آپ نے بہت خرچ کیا ہوگا ایک
مرتبہ اسے بھی آزمالیں قیمت عہ فی شیشی محصولڈاک ۵ ر

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسانکی زندگی خون ہے اسلئے خون صاف رکھنا ضروری ہے اور اُسکی تد
آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی اوڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں پوٹاس ای روڈائڈ وغیرہ
آزمودہ ادویات ملا کر بنتا ہے تمام سالسو سے زیادہ مُفید ہے - گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادوی
سے خون بگڑ گیا ہو تو اسکو استعمال کیجے - اگر آپ اپنے لڑکی اور لڑکیوں کو تندرست رکھ
ہوں تو لال شربت پلادیں کلیجہ کی کمزوری وکھانسی ولاغری کو دور کرنا چاہتے

لال شربت

پلادیں پیدائش کیوقت سے ہوشیار ہونے تک دوا یکساں فائدہ کرتی ہے پینے میں شیریں
سرخ ہونیکی وجہ سے لڑکے خواہش سے پیتے ہیں - قیمت ۱۲ ر فی شیشی - محصولڈاک ۴ ر
ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ - کلکتہ

جنگ! جنگ!! خونریز جنگ!!! اور فتح!!!!

حُسن و شباب کے ذولے حجاب شرم و حیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمناؤں کے پیدل۔ ارمانوں کے شعلہ آشام سوار۔ حسرتوں کے شرر بار رسالے دل کے رنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور غنیم کی شعلہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادہر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا پرجوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اضطراب کے توپخانے سے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش سے جنگ جاری ہو کہ استنے میں کج ادائیوں کا غنیم جنرل "وفا" کی ڈویزن پر ایک سخت خونریز اور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "وفا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہو مگر نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ پھر وقفہ پاکر "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آتے ہیں۔ اِس نئی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے اُسے دیکھتے ہی غنیم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات۔ یہی حُسن و عشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے جذبات کی تصویر۔ عفت اور حیا کا دلنشین مرقع خلوص صدق و صفا کے صاف شفاف آئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادہر آئیے ہم دکھاتے ہیں سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت اُستاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت خلیل شاعر دربار راج بلرام پور کی زبان سے مُرصع اردو نظم میں پڑھیے آب و تاب بڑی خوبی خوش اسلوبی سے چھپ کر تیار ہے حجم ۵۰ صفحہ قیمت فی جلد ۱۰/۔

ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

شیکسپیر اردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار
چھائی ہوئی ظلمت شب تار

ظلمت کو ہے نور سے عداوت
الفت کو نفور سے عداوت

یہ سب ہے مگر ہزار احسان
ہے سامعہ زیر بار احسان

کی جب نہ بصر نے رہنمائی
کانوں میں صدائے یار آئی

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟
یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پا چکا ہے
اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی
کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ
اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔
اصلی قیمت ۱۲ تھی۔ اب رعایتی قیمت ۸ رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

فہرست مضامین رسالہ پیام اُمید ماہ جون ۱۹۱۷ء

امید کا پیام ـــ "اُٹھو ـــ اُٹھو ـــ اور آگے بڑھو!"

پیامِ امید

جلد۳	محمود آباد سیتاپور - جون ۱۹۱۷ء	نمبر۲۶

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیامِ امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے - امید جنس کی قید نہیں جس حال میں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گذرے گا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے -

---

۲۱ اپریل ۱۹۱۷ء سے ہمارا دفتر آزاد صاحب کے تبادلہ کی وجہ سے یہاں منتقل ہو آیا ہے - اُن کے تبادلہ کی وجہ سے رسالہ کا دفتر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو آنا تبادلہ کا لازمی نتیجہ ہے - ہر چند ہم اسے پسند نہیں کرتے - مگر مجبور ہیں - ناظرین کرام مطمئن رہیں کہ اس تبدیل مقام کا کوئی اثر رسالہ کی وقت پر اشاعت پر نہیں پڑے گا - ہم نے اس کے متعلق خاطر خواہ انتظام کر لیا ہے - جون نمبر کی

کی اشاعت محمود آباد سے ہوئی ہے۔ پوسٹ ماسٹر جنرل صاحب کی اجازت ابھی تک حاصل نہیں ہوئی ہے مگر اُس اجازت کے حاصل ہونے کے انتظار میں اشاعت ملتوی رکھنا ہم نے گوارہ نہیں کیا اور ہر ہر پکیٹ پر بجائے ایک پیسہ کے آدہ آنہ کا ٹکٹ لگا کے وقت پر اشاعت کر دینا ہم نے بخوشی گوارہ کر لیا۔

مئی نمبر میں خلاف معمول کتابت کی بہت سی غلطیاں رہگئی ہیں۔ ناظرین کرام معاف فرمائیں۔ حتیٰ کہ نمبر اور جلد کا شمار بھی غلط ہو۔ مئی نمبر کا صیح نمبر ۲۵ اور جلد کا صیح نمبر ۳ ہے ناظرین کرام صحت فرمالیں۔

مئی نمبر میں تعداد صفحات خلاف معمول کم تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے دفتر سے اُردو کانفرنس والے مضمون کے متعلق نیابت دہلی کی چھپی ہوئی یادداشت پریس کو روانہ کر دی گئی تھی۔ وہ یادداشت گم ہے یقینی طور پر نہیں کہا سکتا کہ پریس کے دفتر سے گم ہوگئی یا کاتب نے کاپیوں کے ساتھ ہمارے دفتر میں بھیجی اور ہمارے کاغذات میں مخلوط ہو کر آگرہ ہی میں چھوٹ گئی۔ بہر حال اب اگر از سر نو نیا مضمون لکھوایا جاتا اور اُس کی کاپیاں لکھوائی جائیں تو کسی طرح وقت پر اشاعت ممکن نہیں تھی۔ ہم نے اسے گوارہ نہیں کیا۔ اور جتنے مسودات کی کاپیاں تیار تھیں اتنی ہی چھپوا کے رسالہ وقت پر شائع کرا دیا۔ مئی نمبر کے صفحات کی کمی اب جون نمبر میں ہم پوری کئے دیتے ہیں۔

ایڈیٹر



خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

بیاہی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ اصول بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہر ایسی خفیف سے خفیف بات بھی جس سے غلط فہمی یا بدمزگی کی ابتداء ہونا ممکن ہو اُس کا پہلے ہی سے لحاظ کر لیا جائے تاکہ ایسی صورت وقوع پذیر ہونے ہی نہ پائے۔ بہت سے گھروں کی تباہی ویرانی اور بربادی کے اصلی اسباب پر اگر غور کیا جائے تو اُن کی ابتداء اُس بیاہی ہوئی زندگی کے زمانہ میں ملیگی جبکہ میاں بیوی کے باہمی تعلقات نہایت ہی نازک حالت میں تھے۔ بہت سی صورتوں میں دوامی نفاق کی بنیاد محض خفیف اختلاف رائے تھی جس کا علاج صبر تحمل اور دانشمندی کے رنگ میں رنگا ہوا ایک لفظ یا ایک فقرہ ہو سکتا تھا۔ - - - - مگر ایسے لفظ یا فقرہ سے کام نہیں لیا گیا اور بجائے اُس کے عجلت اور بے صبری سے ایسا لفظ یا فقرہ استعمال کیا گیا۔ جس نے ایک فتنہ برپا کر دیا۔ اس کے بعد اس بدمزگی کی پرواہ نہ کی گئی حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک ترقی کر گئی کہ وہی دونوں دل جو کل تک ایک تھے آج یوں ایک دوسرے سے اجنبی ہیں کہ ع - گویا تھا ہی نہ اِن تلوں تیل! شاذ ہی ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی دن کے اندر دو دلوں میں دوامی نفاق پیدا ہو گیا ہو۔ یا نفاق کی وجہ محض ایک ہی واقعہ ثابت ہوا ہو۔ عموماً یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ابتداء میں کوئی ایک وجہ پیدا ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ فریقین

کی لاپروائی سے وجوہ اور اسباب پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ سب اسباب مل کر دوامی نفاق کی خبیث صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عقلمند اور ذی شعور انسان کا فرض ہے کہ ابتداء ہی سے فکر کرے تاکہ یہ اسباب جمع نہ ہونے پائیں۔ تمہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا تم نے عجلت اور ناعاقبت اندیشی سے کوئی ایسا لفظ یا فقرہ زبان سے نکالا ہے جو تمہیں نکالنا مناسب نہ تھا؟ اگر ایسا ہوا ہے تو فوراً اُسے واپس لو اور عذر خواہی کرو۔

تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ کسی معاملہ کے متعلق کوئی غلط فہمی واقع ہوئی ہے؟ اگر یہ صورت ہے تو ہرگز کسی حال میں اس پر غور نہ کرو کہ اس میں کس کا قصور تھا۔ تمہارا فرض ہے کہ اس غلط فہمی کو ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر جس طرح ممکن ہو سکے دُور کر دو۔ تم خیال کرکے دیکھو کہ تمہارے باہمی تعلقات میں محبت کی ویسی ہی گرمجوشی قائم ہے جیسی پہلے تھی۔ یا اب اُس میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ دریافت نہ کرو اور نہ یہ پوچھو کہ اس میں قصوروار کون ٹھہرتا ہے۔ ہاں جسطرح بن پڑے پہلے ہی کا سا خلوص پہلے ہی کی سی محبت اور پہلے ہی کی سی گرمجوشی پھر پیدا کر لو۔ لڑائی کے وقت اگر غصہ میں ایک سخت لفظ زبان سے نکل گیا ہے تو دیکھو تم سمجھدار اور ذی شعور ہو۔ اب دوسرا لفظ زبان سے نکلنے نہ پائے۔ اگر تم اپنی زبان پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے ہو تو تمہیں انصاف کرو کہ تم دوسرے کا دل کیونکر قابو میں رکھ سکو گے۔ اس کے لئے بڑا جگر درکار ہے۔ دوسرے کے دل پر اپنی حکومت کا سکہ بٹھا لینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ وُہی کر سکتا ہے جو سب سے پہلے اپنی زبان اور پھر اپنے غصہ پر قابو رکھنا سیکھے۔ اگر رنجش ملال

اور غصہ کے غلبے سے تم اس وقت بالکل بے قابو ہو گئے ہو اور تمہارا اتنا ظرف نہیں ہے کہ فوراً ان منحوس خیالات کو دل سے نکال کے پھینک دو تو کچھ صبر کرو۔ مگر یاد رکھو کہ شام ہونے سے پہلے ہی صفائی کر لو اور دل میں کدورت باقی نہ رکھو۔ بیاہی زندگی میں غرور۔ تکبر۔ خودداری یا انانیت کا گذر نہیں۔ یہاں رتبہ کا پاس یا سخن پروری دلیل حماقت ہے۔ اور نہ یہاں اسکا ذکر ہے کہ معافی مانگنا کسکا کام یا کس کا فرض ہے۔ اور نہ اس کا موقع ہے کہ کون اپنی ہٹ پر قایم رہتا ہے۔ اقلیم محبت کے قوانین رائج الوقت میں یہ مضامین ٹکسال سے باہر شمار کئے جاتے ہیں۔ اس مملکت میں اسی کے سر سہرا رہتا ہے جو ہٹ پر قائم رہنا کیا معنی ہٹ کا نام ہی نہ جانتا ہو اور جسے معاف کر دینے اور بھول جانے کا سبق ازبر ہو۔ میاں اور بیوی کے لئے اس سے اچھا کوئی سبق نہیں ہے کہ جب کبھی اُنہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ ہمارا کوئی قول یا فعل دوسرے کی دل آزاری یا رنج دہی کا باعث ہوا ہے یا ہم سے کوئی کسی قسم کی زیادتی ہوئی ہے تو بلا تامل ہمیشہ عذر خواہی کرنے اور معافی مانگ لینے پر آمادہ رہیں۔ ایسا غرور جو تمہیں یہ الفاظ زبان سے ادا کرنے کو منع کر رہا ہو کہ "مجھ سے غلطی ہوئی معاف کرو" بیاہی زندگی کی عملداری میں بالکل بے محل ہے۔

ایک مصنف اس مضمون کے ختم کرتے وقت اپنی کتاب میں فقرات ذیل لکھتا ہے :۔

"تم اس طریق پر بیاہی زندگی بسر کرو کہ جب وقت تم دونوں میں سے ایک کا اخیر وقت آ پہنچے اس وقت تمہارے دل میں سوا اس خیال کے کہ

اللہ پاک کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں ہے کوئی اور کانٹا نہ کھٹک رہا ہو۔
تمہاری ساری بیاہی زندگی کے واقعات میں سے تمہاری یاد میں ایسا ایک
واقعہ بھی نہ آسکے جسے خیال کر کر کے تم پچھتاؤ کہ اس ہمیشہ کے لئے جدا ہونے
والے شریک زندگی کے ساتھ تم نے یہ کیا کیا تھا؟ اگر تم ان باتوں کو ذہن نشین
کر لوگے تو ہرگز کبھی نہ پچھتاؤ گے۔ اور وہ باتیں یہ ہیں۔ ہمیشہ قائم رہنے والا
پاسداری کا خیال۔ ایثار پاکبازی صاف بے لوث زندگی۔ اور خدا پرستی۔
اگر تم ایسا کروگے تو تمہاری زندگی پرامن رہے گی اور جب ایک دوسرے سے
جدا ہونے کا وقت آئیگا تو تم یہ خیال کر کے خوش ہوگے کہ اب کے بچھڑے
پھر اللہ کے گھر ملیں گے اور ایسے ملیں گے کہ پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔

اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں کہا جا چکا ہے کہ نکاح کے وقت
اللہ پاک کے دربار میں حضوری کا وقت ہوتا ہے اور خطبہ نکاح پڑھے جانے
کے وقت دولہا اور دولہن کے سروں پر رحمت کے فرشتے اپنے پروں سے
سایہ کئے رہتے ہیں۔ اگر ہماری بیاہی زندگی اللہ پاک کے پاک احکام کی
تعمیل کا نمونہ ہوتی ہے۔ اگر ہم سے وہی باتیں ظہور میں آتی ہیں جیسا کہ ہمارے
پاک آفریدگار کا مقدس منشا رہے تو ہمارا گھر رحمت کے فرشتوں کا ورودگاہ
بنا رہتا ہے۔ اور ہمارے ہر ہر کام میں تائید غیبی شامل حال رہتی ہے بحیثیت
ایک نیک اور فرماں بردار بندے کے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک پاک نفس
اور بے لوث زندگی بسر کریں صداقت ایمان اور نیکی کی شاہراہ پر چلیں تاکہ
ہماری زندہ مثال نہ صرف ہماری اولاد کے لئے بلکہ ہمارے عزیز و اقارب

دوست احباب اور ہمسایہ کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ پیش کرسکے اور ہمارے بعد سوانحکی صداقت خداشناسی حق گوئی اور حق پسندی کے اور کوئی بات ہمارے حق میں نہ کہی جاسکے۔ ہماری زندگی کا یہی بہترین مقصد ہے۔ اور یہی ہمیشہ ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ تن آسانی غرور خودپسندی ریاکاری اور بدی شیطانی افعال ہیں۔ اور جس انسان سے ایسے افعال سرزد ہوں وہ انسان صورت حیوان ہے اشرف مخلوقات نہیں۔ خودغرضی خودمطلبی بھی دلیل شرافت نہیں۔ اپنے آرام پر دوسروں کے آرام کو فوق دینا اچھی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اور قومی اور ملکی خدمت کا وہی اہل ہوسکتا ہے جوان اوصاف سے متصف ہو۔ (باقی آئندہ)

ترجمہ واقتباس

ڈاکٹر اسمائیلس کیریکٹر

عرصہ ہوا رسالہ کی پچھلی اشاعتوں میں اس نایاب زمانہ کتاب کے متفرق اجزا کا ترجمہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے۔ مگر اب کئی مہینے سے اس کی اشاعت موقوف ہے۔ اس درمیان میں اکثر معزز خریداران رسالہ نے ہم پر تقاضہ کیا اور اسی کے ساتھ ایک معزز مالک مطبع نے بھی ہم سے اُن متفرق اجزا کی کتابی صورت میں اشاعت کی اجازت کی درخواست کی۔ ان وجوہ سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ یہ ترجمہ مقبول ہوا۔ ایسے مضامین کی قدر کرنا قومی دماغ کی بیداری کی دلیل ہے۔ خود مصنف صاحب اپنی کتاب کے مقدمہ میں جس کی تاریخ

تحریر ۱۸۸۳ء سے فرماتے ہیں کہ اس کا نہ صرف ملک انگلستان ہی میں گرمجوشی کے
ساتھ خیر مقدم کیا گیا ہے بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں سے قریب قریب ہر زبان
میں ترجمہ ہوچکا ہے اور اسی طرح ایشیا کی بعض زبانوں میں بھی شائع ہوا ہے
اور امریکہ میں تو اس کی اشاعت اتنی ہی ہوئی ہے جتنی انگلستان میں ہوئی ہے
یہ حال ۱۸۸۳ء کا تھا۔ مگر حیف ہے کہ زبان اردو ایسی نایاب کتاب کے ترجمہ سے
اب تک محروم رہی۔ کیا آج بھی اس کا ترجمہ قبل از وقت کہا جا سکیگا!

پہلے جو ترجمہ شائع ہوچکا ہے اس کے مؤلف آزاد صاحب تھے۔ اور اب
بھی میں نے یہ بار انہیں کے سر رکھا ہے۔ خانہ آبادی کے عنوان سے جو
ترجمہ شائع ہورہا ہے وہ بھی انہیں کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم نے
مستقل ارادہ کرلیا ہے کہ اس کتاب کا باقاعدہ ترجمہ صفحہ اول سے لیکر اخیر صفحہ
تک مسلسل شائع کریں۔ چنانچہ اس کام کی ابتدا آج کی اشاعت سے ہورہی ہے۔
معزز ناظرین کی خدمت میں ہماری مودبانہ التجا ہے کہ ہماری کاوشوں کا صرف
اتنا ہی انعام ہے کہ ان اجزاء کو خاص توجہ اور غور کے ساتھ پڑھیں اور بالخصوص
زیر تعلیم لڑکے لڑکیوں کے مطالعہ میں لائیں۔ ایسی کتابوں کے مطالعہ سے قوم
قوم بنتی ہے۔ افراد کے مجموعہ سے خاندان بنتے ہیں۔ خاندانوں کا مجموعہ قوم
کہلاتا ہے۔ قوموں کے مجموعہ سے ملک آباد ہوتے ہیں۔ آج جو لڑکے لڑکیاں
ہیں کل وہی ہماری آیندہ نسل کہلائیں گے۔ انہیں کی سرسبزی اور شادابی
پر ہماری قومی نشوونما کا مدار ہے اور انہیں کی ترقی ہمارے ملک کی ترقی ہے
جو ہونہار لڑکے لڑکیاں ان آبدار موتیوں سے اپنا دامن بھریں گے اور

دل و دماغ کے خزانے اُن سے مالامال کریں گے وہی ہماری قوم کی اصلی دولت ہوں گے۔ اچھی کتابوں کے مطالعہ سے بھلائی کا گہرا نقش دل پر جمتا ہے۔ خیالات درست ہوتے ہیں۔ ہر اہم معاملہ میں صحیح رائے قایم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ نیک و بد کا صحیح معیار قایم ہوتا ہے۔ سلامت روی کی شاہ راہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہے اور خلاصہ یہ کہ انسان انسان بن جاتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اس پایہ کی کتابیں ہمارے برادران وطن تصنیف کرسکیں جس سست رفتار سے ہم ترقی کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے ابھی اس کے لئے صدیوں کا صبر درکار ہے۔ کم سے کم ترجمہ ہی سہی۔ بالکل کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے "پیام امید" سکوت اور استقلال کے ساتھ اپنا کام کئے جائیگا۔ آپ سے محض اتنی ہی درخواست ہے کہ ان صفحات کو بغور مطالعہ فرمالیں۔

ایڈیٹر

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی مشکلات کچھ وہی لوگ خوب جانتے ہیں جنھیں اس کام کا اتفاق ہوا ہو۔ اس کتاب کا نام "کیرکٹر" ہے۔ ہمارے مدارس میں زیر تعلیم بچوں کو بتادیا جاتا ہے کہ "کیرکٹر" کے معنی چال چلن کے ہیں بچے اپنے استاد کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے الفاظ کو وحی سمجھ کر ازبر کرلیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس لفظ کے مفہوم پر وہ اچھی طرح حاوی ہو گئے انگریزی زبان اس درجہ مشکل زبان ہے کہ اللہ کی پناہ! بڑا مزا یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان میں حرف شناس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے وہ تو اسے حد سے

زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی ڈاکخانہ یا ریلوے آفس میں جا کے تماشہ دیکھئے تو وہاں بے دھڑک انگریزی بول دینے یا لکھ مارنے میں ذرا بھی پس و پیش قیل وقال نہ پائیگا۔ مگر اس کم بخت زبان کا کچھ عجیب خاصہ ہے کہ جتنا ہی زیادہ پڑھیے اتنا ہی زیادہ گہرا نقش دل پر جمتا جاتا ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ابھی تک بالکل ہی کورے ہیں!

میں نے عرض کیا ہے کہ اس کتاب کا نام "کیریکٹر" ہے۔ کتاب میرے سامنے کھلی رکھی ہے۔ لیمپ جل رہا ہے۔ لکھنے بیٹھا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ کتاب کے نام کا بامحاورہ اور معنی خیز ترجمہ کروں مگر عقل خاک نہیں کام کرتی کہ "کیریکٹر" کی جگہ پر کون سا لفظ لاؤں۔ اس لفظ کا پورا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ ہی میسر نہیں آتا۔ حضرت اکبر کے طرزِ عمل کے خلاف میرا یہ اصول ہے کہ جہانتک ممکن ہوسکے انگریزی الفاظ اردو زبان میں آنے نہ دوں۔ مگر یہ کم بخت لفظ "کیریکٹر" ہے کہ زبردستی گھسا پڑتا ہے اور کسی طرح نکالے نہیں نکلتا۔

لیجئے میری مشکل آسان ہوئی۔ ڈاکٹر اسمائلس نے کتاب کے مقدمہ میں خود ہی اس لفظ کا مفہوم بتایا ہے اور مقدمہ کے اسی حصہ سے اپنا ترجمہ شروع کرتا ہوں

مترجم

ترجمہ

اس سے پہلے میں کتاب "سلف ہلپ" تصنیف کرچکا ہوں۔ اس کتاب کو

اس کتاب کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے۔ اس کتاب میں خواص انسانی (کیریکٹر) کی قوت اور اس کے اثرات سے مختصراً بحث کی گئی ہے۔ مگر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے بہت زیادہ لکھنا ابھی باقی ہے۔ بعض نقادان سخن نے باوجود اس کے کہ کتاب کے متعلق بکشادہ پیشانی بہت ہی اچھی رائے ظاہر کی ہے مجھ پر یہ اعتراض ظاہر کیا ہے کہ میں نے لفظ "کیریکٹر" کی تعریف نہیں لکھی اور نہ اس کا مفہوم ظاہر کیا۔ (ملاحظہ فرمایے اس لفظ کا مفہوم کس درجہ اہم ہے)۔

لفظ کیریکٹر جس کا اطلاق خصائل انسانی سے علاقہ رکھتا ہے بیشک اسکی متعدد تعریفات کی جا سکتی ہیں۔ اس سے مقصد ہیں وہ مخصوص اوصاف جن کی بنا پر دو انسانوں میں باہمی تفریق کی جا سکتی ہے۔ جس کے ذریعہ سے دو انسانوں کی شخصی خصوصیات کے موازنہ کرنے پر امتیاز کا درجہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ مفہوم انسانی کمزوری یا مستعدی اور سرگرمی پر حاوی ہو سکتا ہے جو بھلائی خواہ برائی کی صورت میں ظہور پذیر ہو۔ اس کی تعریف ان اتفاقی اوصاف کی خصوصیات پر بھی حاوی ہو سکتی ہے جو عادت یا فطرت سے کے اثرات کا نتیجہ ہوں۔ اور اس صورت میں جس انسان سے بحث کی گئی ہو وہ تمام دوسرے انسانوں سے ان خصوصیات کے اعتبار پر امتیاز رکھتا ہے۔ اور ایک مخصوص "کیریکٹر" رکھتا ہے۔ مثلاً ڈگلس جیرولڈ نامی مصنف نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "کیریکٹر" رکھنے والے اشخاص" (MEN OF CHARACTER.) رکھا ہے۔ مگر جن اشخاص کا اس کتاب میں ذکر لکھا گیا ہے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی اخلاقی کمزوری ہے (صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ یہاں انگریزی الفاظ (MORAL TWIST.) ہیں۔

.... ڈکنس کی تصانیف میں بھی "کیرکیٹر" کے اوصاف سے متصف اشخاص کا ذکر ہے ..... مگر یہ اشخاص عامہ خلایق کے اعتبار سے مستثنیات کا درجہ رکھتے ہیں اور خلاف معمول پیچیدہ روش رکھنے والے اور بعض صورتیں نصف مجنون ہیں۔

(مصنف کا مقصد تحریر یہ ہے کہ عموماً انگریزی زبان میں MEN OF CHARACTER. (یا کیریکٹر رکھنے والے اشخاص سے مقصد ہوتا ہے قابل احترام طرز معاشرت دیکھنے والے بزرگ مگر برخلاف اس کے جن مصنفین کا ذکر کیا گیا ہے انہوں نے اپنی تصانیف میں اس رائج عام مفہوم کے خلاف مقصد ظاہر کرنے کے لئے لفظ "کیریکٹر" استعمال کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس لفظ کا مفہوم کتنا وسیع ہے اور کن کن مطالب اور مقاصد کے ادا کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال میں لایا جاسکتا ہے)

اس کتاب میں جس قسم کا کیریکٹر بیان کیا گیا ہے وہ ایک بالکل ہی شے دیگر ہے۔ میں کسی شخص کے ذاتی خصوصات کو (کیریکٹر) بڑی سے بڑی انسانی خصوصیت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ شرافت کی بہترین دلیل ہے۔ یہی وہ شے ہے جو اس کی زندگی کو پُر شوکت بناتی ہے۔ یہی وہ شے ہے جو اُسے انسانی ہستی کی ہموار سطح سے بلند ترین رفعت پر پہنچاتی ہے۔ اسی کا نام سوسائٹی کا ضمیر ہے اور یہی ایسی طاقتور ترین قوت ہے جس کے بل پر سوسائٹی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ سکتی ہے۔

.... اس کتاب کے مطالعہ سے ناظرین دیکھیں گے کہ کیریکٹر کا

مفہوم پورا کرنے کے لئے بہت سی اقسام کی بہترین انسانی اوصاف کے کام میں لانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً راست بازی۔ صداقت۔ پاکبازی رحم۔ دیانت۔ امانت۔ جرأت۔ استقلال۔ القصہ مختلف اشکال میں ہر قسم کی نیکیوں۔ خصایل حمیدہ اور اوصاف ستودہ سے کام لینا پڑتا ہے۔

ناظرین کرام کی وقفیت کے لئے عرض ہے کہ اس کتاب کی پہلی اشاعت دسمبر ۱۸۰۱ء میں ہوئی تھی۔ اسی مہینے کے اندر پھر دوسری اشاعت کی نوبت پہنچی۔ اس کے بعد چار ہی مہینے پر اپریل ۱۸۰۲ء میں چوتھی مرتبہ اشاعت ہوئی۔ القصہ اسی سال کے اندر دسمبر ۱۸۰۲ء میں چوتھی مرتبہ اشاعت ہوئی۔ القصہ اسیطرح ۱۸۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک (اس وقت ۱۹۰۷ء کی اشاعت میرے سامنے موجود ہے) بتیس اشاعتیں ہو چکی ہیں اور نہیں معلوم ہے کہ ۱۹۰۷ء کے بعد کتنی اشاعتیں اور ہو چکی ہوں گی۔ انگلستان میں مقبول عام کتابوں کی فہرست جس تعداد میں ہوتی ہے وہ بھی معلوم ہے۔ کوئی اشاعت دس بیس ہزار جلدوں سے کم کی نہیں ہوتی ہے۔ اگر ہر اشاعت دس ہزار جلدوں ہی کی فرض کر لی جائے تو ۱۹۰۷ء تک صرف ملک انگلستان کے اندر اس کتاب کی اشاعت کا تخمینہ کم سے کم تین لاکھ بیس ہزار جلدوں تک پہنچتا ہے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ کم و بیش اتنی ہی اشاعت امریکہ میں بھی ہوئی ہے تو صرف انگلستان اور امریکہ کی مجموعی اشاعت چھ لاکھ چالیس ہزار جلدوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد یورپ کی مختلف زبانوں میں جو ترجمے شائع ہوئے ہیں اُن کا شمار مزید ہے

براں ہے۔

ایک حد تک یہ شکایت ضرور صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں علم کی قدر نہیں ہے اور یہاں کتابیں تصنیف یا شائع کرنے کے لئے کوئی حوصلہ افزا صورت نظر نہیں آتی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں ہر شخص مؤلف یا مصنف بن بیٹھتا ہے اور اناب شناب جو چاہتا ہے چھپا کے شائع کرا دیتا ہے۔ جس پایہ کے مؤلف اور مصنف انگلستان اور امریکہ میں ہیں اس کا یہاں کہیں خواب و خیال بھی نہیں۔ سب صحیح سہی۔ مگر آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اچھی اچھی کتابوں کے بامحاورہ ترجمے بھی کبھی اتنے کامیاب نہیں ہوتے جتنی کامیابی کے وہ حقیقت میں مستحق ہوتے ہیں!

آج کی اشاعت مراتب ابتدائی ہی کے نذر ہو گئی۔ اب آیندہ اشاعت سے کتاب کے صفحۂ اوّل سے باقاعدہ ترجمہ شروع ہو گا۔ ناظرین کرام منتظر رہیں۔

مسترجم

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

اہل قریش

ہم عرض کر چکے ہیں کہ اہل قریش شہری تھے اور تجارت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس تجارت کا مدار حج کے موقعوں اور خاص تہواروں کے وقت دُور دُور از حصۂ ملک سے حاجیوں اور سیاحوں کے آنے پر تھا۔ چونکہ اہل قریش کے

لئے ان بیرونی اشخاص کی آمد و رفت تجارت کرنے اور مالی فائدہ اٹھانے کا باعث ہوئی تھی لہٰذا انہوں نے راستہ سہولیت سے منقطع ہونے اور حج کے موقعوں پر لوگوں کے زیادہ تعداد میں آنے کی تدبیریں اختیار کیں۔ سب سے بڑا سبب زائرین کے زیارت کعبہ کے لئے آنے کا یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل میں سے ہر ہر قبیلہ ایک خاص بت کا پرستار تھا۔ اور ہر قبیلہ کا بت خانہ کعبہ میں موجود تھا۔ یہانتک کہ ان بتوں کی تعداد تین سو سے اوپر بتائی گئی ہے (کم و بیش ساڑھے تین سو) ان بتوں میں سے کسی کی صورت انسان کی سی تھی تو کسی کی حیوان کی سی۔ بعض شکل و شباہت میں نباتات سے مشابہ پائے جاتے تھے۔ قبائل عرب کا یہ دستور تھا کہ موسم اور اوقات معینہ پر ہر ہر قبیلہ اپنے اپنے خاندانی بت کی زیارت کرنے اور قربانی پیش کرنے کی غرض سے خانہ کعبہ میں آیا کرتا تھا۔

سوق عکاظ نامی ایک بازار طائف سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ مقررہ موسم پر یہاں کثرت سے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ یہاں کھجور کے درختوں کے سایہ میں خیمے ایستادہ کئے جاتے تھے اور خرید و فروخت اور مبادلہ اشیاء کا بازار خوب گرم رہا کرتا تھا۔ اس میلے میں ملک کے مختلف حصوں کے باشندے دور و دراز مقامات سے آکر جمع ہوتے تھے اور ہر قبیلہ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ اہل قریش کی ذہانت نے اس مجمع کو زیادہ اہم اور کامیاب بنانے کی یہ تدبیر نکالی تھی کہ اس موقع پر ملک کے مشہور نامور اور مستند ادیب شاعر اور اہل کمال نثار اور فاضل مدعو کئے جاتے تھے۔ قبائل عرب اپنے اپنے فرقہ کے نامور شعراء اور

مقرروں کو پیش کیا کرتے تھے۔ ان کی تصانیف سُنی جاتی تھیں۔ دلچسپ علمی مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے اور ہر ہر قبیلہ یہی کوشش کرتا رہتا تھا کہ میدان میرے ہی ہاتھ رہے۔ اس کے علاوہ اس موقعہ پر اس امر کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ جس کسی کا کوئی عزیز یا اہل برادری سزائے قید میں مبتلا ہو وہ اُس کی رہائی کے لئے فدیہ پیش کر سکتا تھا۔ ایسی درخواست گذرنے پر اس معاملہ کی روبکاری ہوتی تھی اور معاملہ کے حالات پر غور کرنے کے بعد اُس درخواست پر حاکم مجاز حکم مناسب صادر فرماتا تھا۔ علاوہ اس کے اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر کوئی شخص دعویدار حکومت ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ اس کے معاملہ میں انصاف نہیں ہوا تو وہ اپنی حق رسی کے لئے جلسۂ عام میں قوم کے سامنے اپنے حقوق دکھا کر اپنا استحقاق ثابت کرتا تھا۔ اور اس معاملہ میں بھی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کیا جاتا اور حکم سُنایا جاتا تھا۔ اختلاف رائے کے موقعوں پر نزاعی امور کے فیصلہ کے واسطے اس میلے کے زمانہ کی مدت کے لئے ایک بزرگ "والیٔ عکاظ" کے لقب سے میعادی حاکم مقرر کر دیے جاتے تھے۔ اس حاکم کا انتخاب عموماً بنی تمیم کے خاندان سے ہوتا تھا۔ عکاظ کے میلے کے بعد سب لوگ عرفات میں جمع ہوتے تھے۔ وہاں سے مکہ جا کر ارکان حج ادا کرتے تھے۔ اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے۔

عکاظ کے علاوہ اور اور مقامات پر بھی مختلف اوقات میں میلے ہوا کرتے تھے۔ مگر ان میلوں میں صرف مقامی آدمی قرب وجوار کی شریک ہوا کرتے تھے اور جو خاص اہمیت عکاظ کے میلے کو حاصل تھی یہاں اُس کا کہیں نام و

نشان بھی نہ تھا۔ (باقی آیندہ)

مورخ

اُردو کانفرنس کے مباحثہ میں جناب ایڈیٹر صاحب الناظر کی گوہر افشانی

"ہمدم" کی اشاعت مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء میں جناب ایڈیٹر صاحب "الناظر" کا طول وطویل مضمون نظر سے گذرا۔ اصلی واقعات "پیام امید" شایع کر چکا ہے۔ اب اگر ایڈیٹر صاحب "الناظر" اُنہیں غلط کہتے ہیں یا اور طور پر اُن کا وقوع پذیر ہونا بیان فرماتے ہیں تو مجھے اس بحث میں پڑنے کی حاجت نہیں ہے۔ کانفرنس کے اجلاسوں میں نہ تنہا آزاد ہی شریک تھے اور نہ ایڈیٹر صاحب "الناظر" ہی دُنیا خود دیکھ لیگی کہ کس کا بیان صحیح ہے اور کس کا غلط۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو کانفرنس کا پردہ فاش کرنے میں میں نے سختی سے کام لیا ہے۔ مگر میری رائے ناقص میں ایسی سختی کی ضرورت تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی میرے سخت سے سخت فقرات بھی ایسے وحشیانہ ذاتی حملے نہیں تھے اور نہ اہانت آمیز تھے۔ معزز ایڈیٹر صاحب "الناظر" کے مضمون نے جو بدنما صورت اختیار کی ہے میں اُس سے مقابلہ کے لئے تیار نہیں ہو سکتی ہوں۔ تو تو میں میں کوسا کاٹی گالی گلوج میرا شعار نہیں۔ میں "پیام امید" میں صاف صاف لکھ چکی ہوں کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا

اور آخری فیصلہ قوم کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ مجھے کسی سے کوئی پرخاش یا عداوت رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور نہ میں ایسی سیاہ قلب بن سکتی ہوں۔

آزاد پر جو حملہ کیا گیا ہے اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اس کے متعلق مجھے محض اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ آزاد نے نہ کبھی اپنے کو شاعر کہا اور نہ اب کہتے ہیں "برق" کے عنوان والی نظم جس کا خاکہ اُڑانے کی کوشش کی گئی تھی اور اب پھر "ہمدم" والے مضمون کے ذریعہ سے اس مفید کوشش کی دوسری قسط ادا کیگئی ہے "پیام امید" میں شائع ہو چکی ہے اور اسی دسمبر ہی کی تعطیل میں اُردو کانفرنس کے اجلاسوں کے بعد ہی لکھنؤ کے اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کے اہل کمال سُن چکے ہیں اور اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرما چکے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے اس نظم کے متعلق خطوط آچکے ہیں جو دفتر رسالہ میں موجود ہیں یہ بات ہر وقت ممکن ہے کہ ایک طرف تو آپ کسی بھلے آدمی سے کہیں کہ ایک جلسہ عام میں کوئی اعلیٰ پایہ کی نظم مثلاً گلزار نسیم سُنائے اور دوسری طرف دو چار دس بیس مدرسے کے لڑکوں کو اس اہم قومی خدمت پر مامور فرما دیں کہ نظم سُناتے وقت طرح طرح کی بولیاں بولیں ہنسیں اور منھ چڑائیں۔ گر اس طرح سے آفتاب پر خاک ڈالنے میں کامیاب ہونا اگر ممکن ہے تو ہم بھی اس کامیابی پر مبارکباد دینے کے لئے تیار ہیں۔ بہر حال وہ نظم یعنی "برق" اگر بالکل ہی پوچ اور لچر ہے تو بھی دنیا کو معلوم ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو بھی اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔ وہ نظم تو ہزاروں لاکھوں اللہ کے بندوں کی نظر سے گذر چکی ہے۔ اس کے لئے بھی مجھے تو توییں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ مجھے

یہاں اس بات کے لکھنے کی ضرورت ہے کہ اس موقع پر واقعات اصلی کیا تھے اور کیا بیان کئے گئے ہیں۔

آزاد کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور تالیف اُنکا ترجمہ شیکسپیر ہے جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں پسند کر چکی ہیں۔ جس کی اشاعت ہندوستان کے مختلف دور دراز حصّوں ٹراونکور، میسور، ممبئی، برہما، وغیرہ کی حدود سے گذر کر بلوچستان، افغانستان، مصر، ایران اور روم تک پہنچ چکی ہے جس نے آزاد کو آزاد بنا دیا ہے۔ آزاد انٹرنیشنل کلب لندن کے تین سال تک ممبر رہ چکے ہیں جس سے کثرت مشاغل اور خرابیٔ صحت کے وجوہ پر انہیں علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ وہ رائل ایشیاٹک سوسایٹی لندن کے ممبر ہیں۔ رائل سوسائٹی آف آرٹس اور ایسی پایہ کی بہت سی علمی انجمنوں نے جن کا صدر مقام لندن ہے اُنہیں اپنا ممبر بنانے کی از خود تحریک کی مگر عدیم الفرصتی کی وجہ سے وہ اپنا وقت نہ دے سکے۔ یہ سب تحریرات بجنسہٖ میرے پاس موجود ہیں۔ انگلستان کے مشہور اہل قلم مسٹر اسٹڈ آنجہانی اور اسی پایہ کے اور بہت سے موقر اہل کمال کی تحریرات جو محبت اور خلوص سے لبریز ہیں اکثر اُن کے نام آئی ہیں اور میرے پاس موجود ہیں۔ آزاد صاحب کے احباب اور شناسا حضرات میں سے جن صاحبوں کی نظر سے وہ تحریرات گذر چکی ہیں کچھ وہی اُنہیں پہچان سکتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہیں۔ لکھنؤ کے عمائدین سے بعض حضرات کے ملاحظہ میں یہ تحریرات آچکی ہیں اگر ایڈیٹر صاحبؔ "الناظر" چاہیں تو نجی تحریر سے اُن حضرات کے اسمار گرامی بتائے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آجکل بھی وہ ایک اہم مضمون پر انگریزی زبان میں ایک ضخیم کتاب کی تصنیف میں مصروف ہیں جس کے بعض اجزا بعض بلند پایہ یورپین حضرات سن کر داد دے چکے ہیں۔ اگر اللہ پاک کو منظور ہے تو ایک دن یہ کتاب بھی دنیا کے سامنے پیش کیجائے گی۔

آزاد کو گالیاں دینا تو بہت آسان ہے۔ اس میں قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر "جام الفت" کے پایہ کا شیکسپیر کے کسی ڈراما کا ترجمہ کرکے پبلک کے سامنے پیش کر دینا آسان نہیں ہے۔ اسی طرح "برق" کے پایہ کی دوسری نظم لکھدینا آسان نہیں ہے۔ عاجزہ کی رائے ناقص میں آزاد کو گالیاں دینے سے پہلے آزاد کے معترضین اُن کی مشہور زمانہ تصانیف کے پایہ کی دوسری تصنیف یا تالیف پیش کردیں تو یہ ایک نہایت ہی مفید اور کارآمد مشغلہ اُن کے لئے ہو سکتا ہے۔ آزاد کے معترضین اگر ایسا کرسکتے ہیں تو باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ کرکے دُنیا کو دکھا دیں۔ کیونکہ اُردو علم ادب کی اس سے اچھی دوسری خدمت ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو آسمان پر تھوکنے کا جیسا کچھ نتیجہ ہو سکتا ہے وہی سامنے آئیگا۔

رہی ہمارے مکرم ہمعصر کی یہ تمنا یا دعا یا بد دعا کہ "پیام امید" آخرکار "پیام حسرت" ثابت ہوگا یا آزاد موجودہ حالت سے بھی آگے ترقی کرکے گھسیاری منڈی کے گھسیاروں کی صف میں نظر آئیں گے تو اگر اللہ پاک کو یہی منظور ہے تو اس میں ہمارا کوئی بس نہیں ہے۔ ہم بھی اسی میں خوش ہیں جس میں اس کی خوشی ہو۔

البتہ اگر زمانہ کی نامساعدت کی وجہ سے بعض حضرات اُن کی توہین یا

تذلیل پر کمر بستہ ہو جائیں گے تو اس کا جواب ہم آزادہی کے کلام سے منتخب کر کے اُن کے سامنے پیش کریں گے ؎

تو زلعل و سنگ پارہ نہ اگر تمیز کردی
چہ گناہ شد یمین را کہ خجل شود بنامے

عاجزہ (آزاد بیگم)

نوٹ - اپریل نمبر میں ہم نیابت دہلی کی مطبوعہ یادداشت کی نقل شائع کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ مگر ہمیں بڑا افسوس ہے کہ تبادلہ کی وجہ سے ہمارے کاغذات وہاں سے یہاں آنے میں وہ یادداشت غالباً آگرہ ہی میں رہ گئی۔ اور اب ہم اس کی اشاعت سے مجبور ہیں۔ ناظرین کرام میں سے جو حضرات اُسے دیکھنا چاہیں۔ عالیجناب ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی سے مراسلت کریں۔ ہم خود اسے منگا کے شائع کر دیتے مگر اب اس بحث کو زیادہ طول دینا ہمیں منظور نہیں ہے۔

ایڈیٹر

ضمیمہ مکتوبات حسن آرا

"ہنسو اور موٹے ہو جاؤ" (انگریزی ضرب المثل)

حاجی بغلول کا خط راوی ضعیف کے نام

کیا نام کہ ۔ وعلیکم السلام

تم کہوگے کہ القاب کیوں نہیں لکھا تو کیا نام کہ تمہاری ایسی تیسی ۔ خدا کی مار ایسے بے ادب بے تمیز پر جو ہم کو خط میں حاجی بغلول لکھتا ہے ۔ اور ذرا نہیں شرماتا ۔ بچہ جی ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو تمہاری عمر ہے ۔ اور بقول کیا نام کہ میاں فرخندہ جمال کے ابھی تو تمہارے منہ سے دودھ کی بُو بھی نہیں گئی ہے اور چلے ہو ہم پر آوازے کسنے ۔ اللہ کی شان ہے یہ منہ اور کہائے چولائی! تم نے شاید کبھی ابا جان سے سنا ہوگا کہ اللہ انہیں بخشے ہمارے والد مرحوم اور تمہاری پردادا جان بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے کودتے تھے ۔ اجی اس وقت یہ کم بخت کرسٹانی کھیل کیا نام کہ ارکٹ کرکٹ ہاکی واکی ٹورنامینٹ ڈیوک بال اور کین ہینڈل ننگ پانگ لگ گارڈ اور ٹرا وزر اسٹریچر کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا ۔ وہ تو گولیاں کھیلا کرتے تھے ۔

ہائیں ۔ ہائیں ۔ ہائیں ۔ یہ بے تمیزی ! (دانت پیس کر) بوٹیاں نوچ لونگا جھبنی کی ۔ پھر کہا "حاجی بغلول" تو بغلول تیرا باپ بغلول! ۔ اور لیگا ! بڑا آیا ہے کہیں سے وہ بن کے ۔ بات تیری گیدی کی!

ہاں تو تم نے نحق (ناحق) بن نحق کو غصہ دلا دیا تھا۔ بیٹا اب ایسا نہ کرنا۔
تمہارے ابا جان مرحوم اللہ انہیں جنت نصیب کرے ہمارا ہمیشہ بڑا ادب کیا
کرتے تھے اور سوا مولانا حاجی بلغ العلا صاحب قبلہ وکعبہ کے اور کچھ نہیں کہا
کرتے تھے۔ وَلی کے پیٹ سے شیطان! کہاں وہ نمازی اور پرہیزگار دیندار
بزرگ ہاں البتہ وہ حاجی تو بیشک نہ تھے۔ مگر نہ تھے تو نہ سہی پھر بھی تم سے
تو لاکھہ درجہ اچھے تھے۔ دیکھو بیٹا بزرگوں کا ادب کرنا عین سعادت ہے۔
ادب تاجیست از لطف الٰہی (کیا نام کہ) بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی
ہاں تو کہاں وہ نمازی پرہیزگار دیندار بزرگ اور کہاں تم۔ دیکھو چھچھورے
پن کی عادت چھوڑ دو۔ بزرگوں کا ادب کیا کرو۔ اللہ تمہیں کیا نام کہ بڑا رتبہ
دے گا۔ دیکھو تم کیسے ہونہار سپوت ہو۔ بس کیا نام کہ ایک شرارت چھوڑ دو تو
کیا نام کہ اللہ جانتا ہے وَلی ہو وُلی۔
دیکھو ایک دن کا ذکر ہے کہ تمہارے پردادا جان ہمارے دادا جان
کے گھر میہمان ہوئے تھے۔ ہمارے دادا جان مرحوم مغفور کے باغ میں آموں
کی پاٹی (پارٹی) تھی۔ کیا نام کہ سارے ہندوستان کے عمائد شریک دعوت تھے
ملانا تو میرا ڈنڈا! کہاں گئی میری کتے والی لاٹھی! ابے مردود۔ ابلیس
جہنمی۔ لعین کافر دجال خنزیر۔ اللہ قسم کیا نام کہ جان سے مار ڈالوں گا!)
تم بُرا مت ماننا۔ بات یہ تھی کہ ابھی میں تمہیں خط لکھ رہا تھا ابھی حجامت
بنوائی تھی۔ سر کے بال منڈوا ڈالے تھے اور خوب سا مصالحے کا تیل سر میں
چپڑ کر تم سے باتیں کرنے بیٹھا تھا کس واسطے کہ تم جانتے ہو کیا نام کہ نامہ نصف ملاقات

تو بس کہاں تو میں تمہیں چپ چاپ سر جھکائے خط لکھ رہا تھا اور کہاں وہ پڑوسی کا حرامزادہ شریر لونڈا شامت اللہ اُسے غارت کرے بھیگی بلی کی طرح پاؤں دبا کے چُپکے چُپکے پیچھے سے آیا اور میرے کدو پر اس زور سے ٹیپ رسید کر گیا کہ اللہ جانتا ہے کھوپڑی بھنّا اُٹھی۔ تم جانتے ہو جب میں کام میں منہمک ہو جاتا ہوں تو دُنیا و مافیہا کی خبر باقی نہیں رہتی۔ اس میں شک نہیں کہ تڑاقے کی آواز تو میں نے بہت صفائی سے سُنی۔ اور کیوں نہ سُنتا۔ وہ تو کیا نام کہ کان ہی کے پاس تڑاقا ہوا تھا۔ مگر خط لکھنے میں انہماک ہونے کی وجہ سے واللہ باللہ میں بھی سمجھا کہ کہیں اور سے آواز آئی۔ اور ذرا بھی اُدھر مخاطب نہ ہوا۔ کہ تھوڑی دیر میں دوسری آواز آئی۔ پڑاق!۔ پھر بھی میں نے سماعت نہ کی اور دل میں سوچا کہ پڑوسی کے لونڈے ہیں بڑے شریر کسی غریب کو چھپیا رہے ہوں گے۔ تیسری مرتبہ پھر بڑے زور کا تڑاقا ہوا اور یقین مانو اب کی مرتبہ تو سر سے کنپٹی تک جھن جھنا اُٹھی میں اب بھی اُدھر مخاطب نہ ہوتا اور اسے اتفاقی درد سر ہی سمجھے جاتا مگر اب کی مرتبہ لونڈے کا پاؤں میری زیتونی جریب میں اُلجھ گیا اور وہ مردود لڑکھڑا کے دھڑام سے چت ہو گیا۔ گرا تو مُنہ کے بل میرے ہی اوپر بچہ گیا۔ میں بھی چارپائی پر چت ہو گیا۔ میں جُھک کر زیتونی جریب اُٹھانے کو بڑھا تھا کہ اتنے میں وہ شرارت کا پتلا رفو چکر ہو گیا۔ اور جاتے جاتے ایک ڈھیلا بھی پھینکتا گیا کہ وہ بھی بھق سے آ کے میری تنگی توند میں لگا تب جا کے میں سمجھا کہ یہ حرام زادہ میری ہی گھُٹی ہوئی کھوپڑی پر دیر سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ تو غصہ میں تھا ہی۔ اس مردود کو گالیاں دیتا جاتا تھا اور خط بھی لکھتا جاتا تھا اب جو دیکھتا ہوں تو کیا نام کہ وہی گالیاں یہاں

بھی لکھ گئی ہیں۔ تو تم سعید ازلی ہو اس کا بُرا نہ ماننا۔ یہ گالیاں اُسی مردود شہامت کے لئے ہیں۔ تمہیں گالیاں نہیں دی ہیں۔ تم تو کیا نام کہ برخوردار سعادت اطوار خجستہ کردار ہو بھلا تم سے اور گالیوں سے کیا مطلب! مگر بات یہ ہے کہ کیا نام کہ میں چونکہ صاف دل واقع ہوا ہوں اس وجہ سے جو بات پیٹ میں ہے جو دل میں ہے وہی مُنہ میں ہے۔ سچا سیدھا سادہ بندہ مومن ہوں۔ ظاہر و باطن یکساں رکھتا ہوں اس وجہ سے جو دل میں اُس وقت موجود ہوتا ہے وہی قلم سے بھی نکل جایا کرتا ہے۔ اور میرے اُستاد مرحوم وصیت کر گئے ہیں کہ بھئی لکھ کر کاٹ دینے کی عادت بُری۔ ایک بار لکھا سو لکھا۔ یہ کاٹنا واٹنا کیا نام کہ کہاں کا جھگڑا بکھیڑا ہے۔ تو مطابق وصیت شریف اپنی اُستاد کی کو یاد کرکے کیا نام کہ عمل کیا کرتا ہوں۔ جو لکھ جاتا ہوں اُسے پھر کیا نام کہ حشر تک کبھی نہ کاٹوں گا۔ چاہے اسمیں سر کٹ جائے تو بلا سے مگر لکھا نہ کٹے۔

(ہات تیری گیدی کی۔ تیری گالیوں کا جواب کس مزے سے دیا ہے۔ کہ واہ رے میں! ابا جان مرحوم زندہ ہوتے تو قسم ہے انہیں کے سر کی بھئی اس وقت تو ضرور پیٹھ ٹھونک دیتے۔ دیکھو "راوی ضعیف" نے بے ادبی کی تھی مردود نے مجھے حاجی بغلول لکھدیا تھا۔ میں نے بھی اُس مسخرے کو خوب ہی گالیاں سُنائی ہیں کہ بچہ جی کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ مگر کس پروازاور کس پیرائے میں کہ سب کچھ لکھ گیا اور پھر کچھ بھی نہیں۔ اپنے حساب گویا پڑوسی کے لونڈے شہامت کو گالیاں دی تھیں (قہقہا لگا کر) میں بھی کیا ہی چلتا پرزہ ہوں۔ بھلا میری باتیں یہ کل کے لونڈے کیا خاک سمجھیں گے۔ اے لاحول۔ اے

لعنت ۔ اے پھٹکار !) ہیں ! یہ میں کیا لکھ گیا ! یہ تو راوی ضعیف ہی کے نام خط جا رہا ہے اور اسی میں یہ بھی لکھ گیا ! اس وحشت کا بُرا ہو ۔ اچھا کچھ پرواہ نہیں ابھی اس چھوکرے کو باتوں ہی باتوں میں پھسلائے لیتا ہوں ۔ دیکھئے کیسا کرتب دکھاتا ہوں اجی یہ تو کیا نام کہ یاروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ! ہیں توبہ ! اور یہ بھی اسی خط میں لکھ گیا !!! غضب ہی ہو گیا ! مگر میں اپنے اُستاد مرحوم مغفور کی وصیت کے خلاف عمل کروں اور وہ رات کو شیخ سدو بنکر کہیں لگیں میرا گلا گھوٹنے تو پھر کیسی ٹھرےگی ۔ نا بابا (کانوں پر ہاتھ دھر کر) نا بابا ۔ مجھ سے تو یہ کبھی حشر تک بھی نہ ہوگا ! ہشت ! کیا غم ۔ کوئی ہمارا کیا کرے گا ۔ کیا کسی کے دبیل ہیں ۔ کسی کا دیا کھاتے ہیں یا کسی کے قرضدار ہیں ۔ استغفراللہ ! پھر آخر ڈر کا ہے کا ! ہشت ! (ارے اللہ یہ بھی لکھ گیا !)

ہاں تو میاں صاحبزادے راوی ضعیف میاں ہمیں تم سے اللہ جانتا ہے بڑی محبت ہے ۔ (کیسی کچھ) کیا مصیبت ہے ۔ جو بات دل میں آتی ہے جو بات منھ سے نکلتی ہے وہ سب کی سب کاغذ پر اللہ جانے کون لکھ جاتا ہے ۔ اس کاغذ کے اندر ۔ نہیں نہیں تو یہ اس قلم کے اندر ۔ نا ۔ نہیں ۔ اس دوات کے اندر ہو نہو کوئی چڑیل ضرور چھپ کے بیٹھ گئی ہے ۔

ہاں تو میاں راوی ضعیف اللہ تمہارا بھلا کرے تم ہو بڑے اچھے آدمی ہمیں تم سے بڑی محبت ہے ۔ اور کیوں نہ ہو ۔ آخر ہمارے دادا جان سے اور تمہارے پردادا جان سے کیسی گاڑھی چھنتی تھی ! ہاں لے تو پھر وہ آموں کی پاٹی (پارٹی) والا تو قصہ تو رہا ہی جاتا ہے ۔ تو کیا نام کہ پاٹی ہوئی ۔ سارے ہندوستان کے

بڑے بڑے لوگ شریک دعوت تھے۔ سب کے نام بلوا بھیجا گیا تھا۔ اور ہمارے
دادا جان کی وہ عزت تھی کہ جھوٹ موٹ کو بھی کہلا بھیجیں تو لوگ دوڑتے آتے تھے
پھر چاہے اسمیں کوئی بھی ہو۔ کیا نام کہ اسی دعوت کو دیکھ لو کیسے کیسے لوگ آکے جمع
ہو گئے۔ دادا جان مرحوم مشہور آدمی کون تھا جو انہیں نہیں جانتا تھا۔ کون تھا جنھیں
وہ نہیں جانتے تھے۔ پھر چاہے اسمیں کوئی بھی ہو۔ کیا اعلیٰ طبقہ والے اور کیا کیا
نام کہ ادنےٰ طبقہ والے تو اس دعوت میں مہاراجہ الور و بیکانیر و جودھپور و جیپور
و رام پور و حیدر آباد و بڑودہ و رتلام و ٹراونکور و نظام و گائیکوار سے لیکر میاں فرخندہ
جمال والے نواب سلیمان قدر بہادر دام دولتہٗ و حشمتہٗ تک شریک حال قال تھے۔
یہ تو اعلیٰ طبقہ کا حال ہوا۔ پھر ادنیٰ طبقہ کی بات کیا پوچھتے ہو تم جانتے ہو کیا نام کہ
امیروں کی بات تھی تو چل اور میں چل اور گھیسا تمباکو والا۔ اور ڈمڑ یز قصاب
اور شبراتیا نان بائی۔ اور ہینگن چوڑی والا۔ اور ہنسا شتربان۔ اور کھا ایکہ بان۔
اور شیر اشتعلچی اور بدہوا رنگریز۔ اور کندا حلوائی اور ہیرا نان بائی اور با دام تیلی
اور حتیٰ کہ منوا مہتر تک شریک خوان دعوت تھے۔ اس پارٹی کا انتظام ہمارے دادا جان
نے تمہارے پر دادا جان کے سپرد کیا تھا۔ اور وہ انتظام تھا کہ تھالی پھینکو تو سروں ہی
سر جائے۔ اور کوٹھے پر سے تھالی گری جھنا ننا ننا ننا! سوئی بھی گر پڑے تو
ٹپ سے وہیں جل جائے۔ تو کیا نام کہ تمہارے پر دادا جان بھی کوئی ایسے ویسے
آدمی نہ تھے وہ بھی بڑے بڑوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور پٹا اور بانک بنوٹ
اور کشتی اور ہاتھی کی سواری اور اونٹ کی سواری۔ اور گھوڑے کی سواری اور خچر
کی سواری اور بکرے کی سواری الغرض قصہ کوتاہ کیا نام کہ ساری دنیا کی سواریاں

جانتے تھے ۔ بڑے زیرک فہیم، لئیق خلیق دقیق شفیق رفیق رقیق تھے آدمی کیا تھے کیا نام کہ خاصے عمر عیار کی زنبیل تھے ۔ غرضکہ بڑے اچھے لوگ تھے ۔

تو پھر ہاں دعوت ہوئی ناچ رنگ ہوا ۔ آموں کی پالی ہوئی ۔ باغ تو ہمارا تم نے سُنا ہی ہوگا کتنا بڑا تھا ۔ اور کیسے کیسے درخت اس کے بیچ میں کھڑے آسمان سے باتیں کیا کرتے تھے ۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ پانی برسا اور برسا اور برسا اور کھلنے کا نام ہی نہیں لیتا تو کیا نام کہ بڑا ہی مزا آتا تھا ۔ ہمارے دادا جان کے باغ میں کیا نام کہ یوں تو سب ہی درخت سر بفلک کشیدہ تھے ۔ مگر انمیں خاص کر ایک درخت لنگوری آم نامی اتنا اونچا تھا کہ رات کو جب چاند نکلا تو کئی بار اس درخت کی شاخوں میں یوں اُلجھ گیا کہ وہیں ٹنگا رہگیا ۔ اور لگا دادا جان کی دوہائی دینے ۔ تب جا کے کہیں دادا جان نے رحم کھا کے اُسے لگّے سے ڈالیاں ہلوا کے چھوڑ دادیا ۔ ایک بار ہمارے دادا جان مرحوم کے پاس حضرت جبرئیل اللہ میاں کا حکم تحریری لائے تھے کہ تم اپنے باغ کے درختوں کی شاخیں فوراً ترشوا ڈالو ۔ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا ۔ اس وجہ سے کہ اُن اونچے اونچے درختوں کی شاخیں اتنی گستاخ اور بے ادب ہوگئی ہیں کہ بہشت کے درختوں کی جڑوں کو رگڑتی ہیں اور یہ کیا نام کہ ایک ناقابل معافی بے ادبی اور بے تمیزی ہے ۔ یہ حکمنامہ پاکر ہمارے دادا جان مرحوم کانپ اُٹھے اور اسی دم سارے درختوں کی شاخیں ترشوا ڈالیں جب حضرت جبرئیل ؑ اللہ میاں کا حکمنامہ لیکر ہمارے گھر آئے تھے تو ہماری عمر کیا نام کہ کوئی ڈیڑھ پونے دو برس کی تھی ۔ بلکہ حضرت جبرئیل نے ہمیں گود میں لیکر کیا نام کہ خوب سا پیار کیا تھا اور ہمارا مُنہ بھی چوم لیا تھا کہ اتنے میں دادا جان مرحوم

دوڑ پڑے اور جھپٹ کر اُن کی گود سے مجھے چھین کر بولے کہ جناب اسے نہ لیجئے ایسا نہو کہ کہیں یہ مُوت دے تو آپ کے سارے نمازی کپڑے نجس ہو جائیں۔ بس پھر کیا تھا کہ حضرت جبرئیل کھسیانے ہو کر پھرسے اُڑ گئے۔

ہمارے دادا جان والے لنگوری آم کا کیا کہنا۔ جتنا اونچا درخت تھا ویسا ہی پھل بھی اتنا بڑا ہوتا تھا کہ کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اور پھر اتنی اونچائی پھر جب آم پھلتے تھے اور پک کر زرد اور سُرخ ہو جاتے تھے واللہ باللہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دن دوپہر آسمان میں تارے نکلے ہیں۔ بڑا ہی مزا آتا تھا۔ وہ اتنی اونچائی کی وجہ سے اتنے چھوٹے چھوٹے نظر آتے تھے۔ نہیں تو اتنا بڑا کوئی پھل تو دنیا میں ہوتا نہیں۔ کس چیز سے تشبیہ دوں تمہیں سمجھاؤں! ہاں خوب یاد آیا۔ تمہیں ایک قصہ سُنائے دیتا ہوں جس سے تم اندازہ کرسکو گے کہ کتنے بڑے بڑے آم ہوتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ تمہارے پردادا جان ہمارے لنگوری آم کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر سو رہے تھے۔ رات کا وقت ہوگیا سب لوگ باغ سے گھر چلے آئے۔ مگر وہ وہیں پڑے سوتے رہے۔ اتفاق کی بات کہ کہیں کیا نام کہ بہشت سے کوئی طوطا کچھ نیچا ہو کے اُڑا۔ ہمارے لنگوری آم دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آکے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ گیا۔ آم خوب پک گیا تھا۔ رس سے بھرا ہوا تھا۔ چھلکا نہایت ہی باریک تھا۔ طوطے نے چونچ ماری۔ آم سے رس کے فوارے چھوٹنے لگے۔ طوطا تو کیا نام کہ گھبرا کے اُڑ گیا۔ مگر اب لگا رس بہنے۔ تو صبح ہوتے ہوتے ایک قیامت برپا ہوگئی۔ دادا جان کے باغ سے دس دس بیس بیس کوس کے فاصلہ تک ندی نالے سب ایک ہو گئے تھے۔ کوئی دس بارہ

گاؤں بہ گئے - ہزاروں مکانات گر پڑے - باڑہ آگئی تھی - طوفان بپا تھا - کسی
کے حواس ٹھکانے نہ تھے کہ اتنے میں باغبان نے دادا جان مرحوم کو یاد دلایا
کہ رات تمہارے پردادا جان نے اپنی چارپائی آم کے نیچے بچھائی تھی اور وہیں
سو گئے تھے - یہ سُن کر اُن کا رنگ فق ہو گیا - فوراً کشتی پر سوار ہو کر باغ پہنچے
تو وہاں چارپائی کہاں! وہاں تو ہاتھی بھی جائے تو ڈوب جائے - کیا مجال
کیا نام کہ نکل کر نکل تو آئے - اور پھر کسے سودا ہوا تھا کس کا سر پھرا تھا کہ وہاں
جانے کا نام لے - اور پھر کیا نام کہ کوئی جائے تو کیونکر جائے اور جائے تو کہاں
جائے! نفسی نفسی مچی ہوئی تھی - سب کو اپنی اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے
قصہ کوتاہ تمہارے پردادا جان کی چارپائی باغ سے جو بہ نکلی تو ندی نالوں میں بہتی
ہوتی جا کے گومتی میں پہونچی - اور لکھنؤ پہنچکر خدا خدا کر کے گومتی کے کنارے
لگ گئی - بارے کیا نام کہ اللہ نے بڑی خیر کی کہ اُن کی جان سلامت رہی -
تمہارے پردادا جان اُس وقت تک کنوارے تھے - لکھنؤ پہونچے تو وہیں شادی
کر لی اور وہیں کے ہو رہے - ورنہ اصل میں ہم اور تم تو ہموطن ہیں -
بیٹا یہی کہتے ہیں کہ بڑے بوڑھوں کو ڈبیا میں بند کر کے رکھتے ہیں -
ان کی باتیں سنو اور نصیحت پکڑو - دیکھو میں نے تمہارے خاندان کی تاریخ
باتوں ہی باتوں کیسی تمہارے ذہن نشین کرا دی ہے - اب کبھی مجھ سے بے
ادبی نہ کرنا - تم خود سعید ہو ان باتوں کو گرہ میں باندھ لوگے - مجھ سے خط و
کتابت کا سلسلہ جاری رکھو تو بڑے بڑے کام کی باتیں تمہیں بتایا کروں گا
کہ جنہیں سنکر تمہاری عقل بڑھے اور کام کے آدمی بن جاؤ -

کاتب الحروف
بندہ عاصی حاجی بلیغ العلیٰ خلف الرشید جناب مولینا حاجی عبدالحی
عفی اللہ لہٗ

تنقیدات

"مسجد ووکنگ کے ابتدائی خطبات" ذیل کے چار خطبات کا ایک مختصر رسالہ چھوٹی تقطیع کا۔ کاغذ سفید۔ لکھائی چھپائی اوسط درجہ کی حجم ۳۶ صفحہ قیمت فی جلد ۵ر ملنے کا پتہ :۔ منیجر اشاعت اسلام۔ احمدیہ بلڈنگس۔ عزیز منزل۔ نولکھا۔ لاہور، بپتسمہ (۱) میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی (۲) خدا کی کامل تصویر (۳) اسلام ہی تبسمہ آتشیں ہے (۴) الہام ایک فیض ربوبیت ہے۔ یہ چار خطبات مغرب میں اس اسلامی تحریک کے سنگ بنیاد ہیں جس کی بنا خواجہ کمال الدین کے مبارک ہاتھوں سے ووکنگ۔ لندن میں رکھی گئی۔ یہی وہ خطبات ہیں جو خطبہ۔ لکچر اور تقریروں کے مختلف پیرایوں میں انگلستان فرانس اور اسکاٹلینڈ کے تربیت یافتہ سوسائٹی کے سامنے ایک نئی اسلامی تحریک کی صورت میں پیش کئے گئے تھے۔ اور جس طرح ہمارے باقاعدہ اسلامی مشن کا آغاز خواجہ کمال الدین کے دم سے ہوتا ہے اسی طرح خواجہ کمال الدین کے کام کا آغاز ان خطبات سے ہوتا ہے۔ انہیں کے ذریعہ سے حضرت کمال الدین نے ظلمت آباد لندن میں ضیائے اسلام کی اوّلین شعاعیں پھیلائیں اور انہیں کے ذریعہ سے ذہین ذکی اور منصف مزاج عیسائی دیکھ سکے کہ ایک گم کردہ راہ کے لئے ہر وقت یہ بات ممکن ہے کہ باطل کی گمراہ کن راہ ترک کر کے فوراً صداقت کی شاہ راہ پر چلنا شروع کر دے۔ ان خطبات میں تیسرا خطبہ خاص کر قابل ذکر ہے۔ اور فخر اسلام لارڈ ہیڈلے کی فرمایش سے لکھا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے حوارئین میں سے پولوس جن کا انگریزی نام سینٹ پال ہے انجیل متی باب ۳ آیت ۱۱ میں فرما گئے ہیں کہ "میں تو تمہیں توبہ کے لئے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن وہ جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے زور آور ہے۔ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے قابل نہیں۔ وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دیگا۔" اس خطبہ میں حضرت کمال الدین فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطب حضرت مسیح نہیں ہیں بلکہ جناب سرور کائنات صلعم ہیں۔ اس دعوے کو شرح و بسط کے ساتھ بیان فرماتے ہیں اور نہایت ہی صفائی اور خوبی سے اس کی صداقت ظاہر کرتے ہیں

اسلام دنیا سے تفریق مٹانے آیا تھا۔ ایک ادنیٰ درجہ کا مہتر یا بہشتی خلیفۂ وقت کے ساتھ ایک مضبوط رشتۂ اخوت میں وابستہ تھا۔ وہ انہیں "سلام علیک" کہہ کے مخاطب کرتا تھا اور جواب میں "وعلیکم السلام" پاتا تھا۔ وہ ایک ہی جماعت میں صف بہ صف ایک ساتھ ملک وزیروں اور امیروں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ غلام اور آقا کا درجہ مساوی تھا۔ آج اس گئی گذری حالت پر بھی خاص عرب میں ایک دسترخوان پر بٹھا کے ایک امیرزادہ ایک مہتر کو کھانا کھلاتا ہے۔ مگر جائے عبرت ہے کہ ہم ہندی مسلمان اس شامت میں مبتلا ہیں کہ بھائی کو بھائی سے مغائرت ہے! اسلام فرقہ بندی کا دشمن ہے۔ اگر ہمارا بھائی نیک نیتی سے مذہبی عقائد میں ہم سے جزئیات میں کچھ اختلاف رکھتا ہے تو یہی اختلاف ہمارے اور اس کے درمیان میں مغائرت کا ایک خلیج نہیں پیدا کر سکتا۔ کیسا ستم ہے کہ ایسے ہی فضول اوہام کی بنا پر ہم اپنے قابل فخر بھائی حضرت کمال الدین کی وہ عزت نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اسلامی

مشن کے بانی اور اسلام کے محسن ہیں۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ رنج دہ کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ اُن کی اس مبارک تحریک پر بلا قید اندرونی فرقہ بندی کے ہر مسلمان پوری توجہ نہیں کرتا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ہم سنیوں کا یا ہمارے عزیز بھائی، شیعوں کا کوئی خدا اور ہے یا کوئی رسول اور ہے یا کوئی قرآن اور ہے؟ جس حال میں کہ خواجہ کمال الدین کو خدا اور رسول اور قرآن ہی سے بحث ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ساری قوم اُن کے کام پر توجہ نہیں کرتی! اسلام کے لئے اس سے بڑھ کر کیا شرم ناک بات ہو سکتی ہے کہ ہماری سات کرور کی مردم شماری ہے جس میں چھوٹے بڑے امیر غریب سب ہی طرح کے افراد ہیں مگر پھر بھی ہمارے چلائے ایک اسلامی مشن بھی نہیں چل سکتا؟ جس حال میں کہ یہ اسلامی مشن ہے۔ کسی خاص فرقہ سے اسے کوئی بحث نہیں ہے اور اسلام خالص اسلام کی سچی خدمت ہو رہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم سب کے سب یک دل و یک زبان ہو کر اس مشین کے پُرزے درست کر کے اس کے ذخیرہ کا خزانہ اتنی چاندی سے نہیں بھر دیتے جس کا زور اس انجن کو برابر باقاعدہ چلاتے رہنے کے لئے کافی ثابت ہو سکے۔ کیا ہمارے لئے یہ بات شرمناک نہیں ہے کہ اس اہم اسلامی خدمت کا مدار آئے دن کی دریوزہ گری ہی پر رہے! اگر ہم حساب لگائیں تو ہماری سات کرور کی مردم شماری کم سے کم ایک کرور روپیہ سالانہ خیرات میں صرف کر رہی ہے۔ مگر بے قاعدہ اور بے فائدہ جیسا کہ ہم اپنے ایک مضمون میں دکھا چکے ہیں۔ کاش کوئی ایسی صورت پیدا ہو سکتی جیسی کہ مثلاً ہم نے ایک مضمون کے ذریعہ سے پیش کی ہے۔ ہمارا سارا روپیہ ایک صدر مقام پر جمع ہوا کرتا اور قوم کی متحدہ قوت اُسے جائز مصارف میں لانے کی راہ

تجویز کیا کرتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ ہم نے مانا کہ اس خیرات کی مد کو روبراہ کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ مگر قطع نظر اس سے پھر بھی ہم نہیں بھول سکتے کہ ہم سات کرور ہیں۔ اور ہمارا یہ محض ایک اکیلا مشن ہے۔

یہ کتاب ہمارے بچے بچے کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ اور اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہونا چاہئے۔ اگر ہم اپنے اسلامی مشن کی اور طرح مدد نہیں کرتے تو ایسے مفید مطبوعات ہی کیوں نہیں خرید کرتے۔ امیر خریدیں۔ غریب طلبا کو مفت تقسیم کریں۔ یہ بھی ایک مفید طریقہ مشن کی امداد کا ہوگا۔ ہمارے بچوں کے خیالات کی اصلاح ہم خرما و ہم ثواب کی مصداق ہوگی۔

"زینت وحش وطیر" انجمن صنایع وفنون الہ آباد کا رسالہ نمبر ۳ چھوٹی تقطیع سفید کاغذ۔ باتصویر۔ لکھائی چھپائی صاف اور خوشخط حجم ۸۰ صفحہ۔ بابو سالگ رام صاحب ورما کے ایک ہندی مضمون کا اردو ترجمہ پروفیسر مہدی حسین صاحب ناصری ایم۔ اے کے قلم سے۔

بچوں کے معلومات میں مفید اضافہ ہونے کے لئے ازبس کافی ہے۔ قیمت صرف ۱ر ہے جسے بالکل مفت سمجھنا چاہئے۔ ایسی کتابوں کی تو لاکھوں کاپیاں بک جانا چاہئے۔ ہماری "انجمن تنزل اردو" کے قابل قدر آنریری سکرٹری اپنے کارنامے دیکھیں اور ان سے ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن صنایع وفنون کے کارناموں کا مقابلہ فرمائیں۔ مگر ان کی دستار افتخار میں دو طرّے پہلے ہی سے لگے ہیں ایک بی اے کا دوسرا آنریری سکرٹری کا۔ اب تیسرے دُم چھلے کے خیر سے وہ محتاج نہیں ہیں۔ خذ ما صفا۔ دیکھا۔ بعض مضامین بدرجہ اوسط خاصے ہیں۔ بعض ادنیٰ

درجہ کے ہیں۔ انتخاب کرنے کے لئے مذاق صحیح کی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ یوں تو دنیا بھر کے اخباروں سے لاکھوں مضامین جمع کرکے ہزاروں ایسے رسالے چھاپے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ کام اسی کا ہے جو اسے کرسکتا ہے۔

تعزیت نامہ۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی کون عزت نہ کرے گا۔ یہ اور بات ہے۔ رہا یہ کہ ان کی وفات کے موقع پر کن کن اخبارات نے کن کن الفاظ سے انہیں یاد کیا تھا دنیا کو اس سے کچھ زیادہ بحث نہیں ہے۔ اور نہ کام کرنے والوں کے پاس ایسے کاغذات پڑھنے کے لئے وقت ہے

"علیگڈھ کا رازِ سربستہ" کتاب کا نام ہی کتاب کے فروخت کی ایک معقول وجہ بن رہا ہے۔ مگر کس رازِ سربستہ کا افشا کیا گیا ہے؟ کچھ بھی نہیں! مطلب صرف اسی قدر ہے کہ کوئی رازِ سربستہ ہے ہی نہیں جس کے افشا کی ضرورت ہو۔ اگر یہی بات ہے تو پھر کتاب لکھے جانیکی لئے بھی اس کے ساتھ کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

"ترجمان" فلسفہ۔ سائنس اُردو لٹریچر کا ایک ماہوار رسالہ جو مسٹر تیرتھ رام صاحب فیروزپوری کی ایڈیٹری میں ہرماہ کی یکم کو پارسنز روڈ نولکھا۔ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ معہ محصول تین روپیہ۔

اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیشہ وقت معینہ پر بلا ناغہ شائع ہوا کرتا ہے۔ یہی ایک بات کیا کم ہے۔ جو اُردو رسالوں میں کم یاب ہے۔ اس کے مضامین دلچسپ اور مفید معلومات سے لبریز ہوتے ہیں مضمون

نگار اکثر بہت ذی علم اور قابل ہیں۔ معزز ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں ہماری مودبانہ گذارش ہے کہ نظم کے متعلق معیار میں کسیقدر سختی کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ اس سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ "ترجمان" کا معیار کسی اور اُردو رسالہ کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ البتہ ہم یہ بات بیشک دیکھ رہے ہیں کہ ابتدا میں "مخزن" نے جو معیار مقرر کردیا تھا ہمارے اخبارات اور رسالے اب تک اُس معیار کی حدود کے اندر مقید ہیں۔ ترقی نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ غزلیات کی جگہ آجکل "نیچرل شاعری" نے لی ہے۔ مگر سب سے پہلے تو ہم آجتک اس خبط بے ربط "نیچرل شاعری" کے معنی ہی نہ سمجھے۔ "نیچر" ضرور انگریزی لفظ ہے "نیچرل" بھی انگریزی لفظ بیشک ہے۔ مگر لفظ "نیچرل" کا جب "شاعری" کے ساتھ گٹھ بندھن کیا جاتا ہے اور جتنا مہمل بے معنی اور لغو نتیجہ نکلتا ہے اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔ ہم نے مانا کہ آپ غزل نہ لکھیں گے۔ اچھا نہ لکھئے۔ مگر آخر اِس ولندیزی پشتو "نیچرل شاعری" کے بھی کچھ معنی ہیں! خیر یوں سہی۔ معنی بھی نہ سہی۔ شاعری کی ایک نئی گھڑت سہی۔ انگریزی اُردو کا معجون مرکب ہی سہی۔ مگر آخر وہ ہے کیا بلا؟ ذرا یہ تو معلوم ہو؟ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

"چاند"	"پھول"
اے چاند ارے تو چاند ہے	اے پھول ارے تو پھول ہے
تو چاند ہے۔ تو چاند ہے	تو پھول ہے۔ تو پھول ہے
تو چاند ہے۔ تو چاند ہے	تو پھول ہے۔ تو پھول ہے

تو چاند ہے ۔ تو چاند ہے   تو پھول ہے ۔ تو پھول ہے
تو چاند ہے ۔ تو چاند ہے   تو پھول ہے ۔ تو پھول ہے

یہ ہے ہماری "نیچرل شاعری" کا خلاصہ غزل پر ہمارا اعتراض تھا کہ (۱) مخرب اخلاق ہے (۲) بے نتیجہ ہے ۔ اس کی جگہ پر آپ کی "نیچرل شاعری" تشریف لائی ۔ خیر یہ مخرب اخلاق نہیں ہے تو نہ سہی ۔ مگر آخر اس بکواس سے سوا اس کے کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کا دماغ خراب ہو وقت ضائع ہو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے ۔ کچھ کاغذ ضرور سیاہ ہو جاتا ہے ۔ اور کچھ نہیں ۔ اگر نتیجہ نکالنے کی کوشش کیجاتی ہے تو وہ نتیجہ اتنا ارزل اور پست اور معیار سے گرا ہوا ہوتا ہے کہ اسے نتیجہ کہتے بھی شرم آتی ہے ۔ بڑی سے بڑی فلسفہ کی پوٹلی جب کھول کے پلائی جاتی ہے تو یہیں بتایا جاتا ہے کہ زندگی بے ثبات ہے ۔ یا دُنیا فانی ہے ۔ یا سب کو ایکساں مرنا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ مگر یہ ایسا بازاری فلسفہ ہے کہ ردی کاغذوں کی پڑیاں باندھنے والے عطاروں ۔ محکمہ رجسٹری کے قبالہ نویسوں سے لیکر پھیری کرنے والے فقیروں تک کو نوک زبان ہے ۔ اور کسی ساتھ آٹھ برس کے بچے سے لیکر کسی خبطی سودائی فاتر العقل تک سے پوچھئے تو وہ بھی اتنا ضرور ہی کہہ دے گا کہ ایک نہ ایک دن سب کو مرنا ہے ۔ جب یہ حال ہے تو ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے لایق فایق عالم فاضل قابل فخر ۔ ہمہ دان ۔ روشن خیال مضمون نگار کیا سمجھ کے اسی فلسفہ سے ہمیں مرعوب یا معزوب کرنا چاہتے ہیں ! ہم ایک ایڈیٹر کی دشواریاں اور اس کی مصائب کا کافی تجربہ رکھتے ہیں ۔ اور خوب سمجھتے ہیں کہ خود پبلک بھی اس حد سے آگے بڑھنا پسند نہیں

کرتی۔ مضمون نگاروں نے تو یہاں پہنچکر جیسی کچھ زمین پکڑلی تھی وہ تو تھا ہی خود پبلک بھی اس سے آگے بڑھنا کفر سمجھنے لگی ہے۔ مگر ایک اعلیٰ اخبار نویس یوں پبلک کے ہاتھ اپنی باگ نہیں دیدیتا۔ ایسے موقعوں پر ہمارا آپ کا کام ہے کہ خود آگے بڑھیں اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے ناظرین کو بھی لئے چلیں۔ عمدہ مضامین لکھنے والے تو عنقا ہیں۔ مگر انگریزی۔ عربی۔ سنسکرت میں اچھی اچھی کتابوں کا خزانہ ہمارے آگے کھلا ہے۔ ہم آپ اگر چاہیں تو رسالہ کا اعلیٰ معیار برقرار رکھ کر بیش بہا ترجموں سے زبان کو مالا مال کردیں۔ رہی نظم اگر حسب خواہ نظم نہ ملے تو نہ سہی۔ ہمیں پرواہ نہ کرنا چاہئے۔ معیار سے گری ہوئی نظم شائع کرنے سے نہ شائع کرنا ہی بہتر ہے۔ ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ اوپر کے سطور کے ذریعہ سے جن نکات پر ہم اپنے معزز ہمعصر کو توجہ دلا رہے ہیں وہ اس نیت سے نہیں ہے کہ "ترجمان" کے مضامین پر اعتراض کرنے کا ہمارا انشاء ہو۔ ہمارا انشاء محض اسقدر ہے کہ ہمارے معزز ہمعصر بھی ہمارے ہمخیال ہو جائیں تاکہ ہم اور وہ ایک ساتھ ایک ہی مشترک مقصد کی جانب ترقی کے قدم بڑھاتے نظر آئیں۔

رہا اعتراض کرنا تو برعکس اس کے ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمیں معزز ایڈیٹر صاحب "نظارہ" کی رائے سے اتفاق نہیں ہے جو فرما چکے ہیں کہ "ترجمان" کے مضامین میں زبان کی بہت سی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پنجاب سے نکلے ہوئے کس اخبار یا رسالہ میں ایسی غلطیاں نہیں ملتیں؟ آپ ایک کا ہی نام بتا دیجئے۔؟ پھر آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہمارے پرجوش سرگرم سچے خلوص ایثار اور محبت سے بھرے ہوئے پنجابی بھائی اردو اخبارات اور رسالے

نکالنا بند کردیں؟ یا در کہئے اگر وہ ایسا کر گذریں تو اُردو کی کمر ٹوٹ جائے۔ کون ایسا انسان دُنیا میں مل سکتا ہے جو غلطیوں سے مبرا ہونے کا دعوےٰ کر سکتا ہو! خود "پیامِ اُمید" ہی میں باوجود ہمارے دوبارہ اور سہ بارہ نظرِ ثانی کر لینے کے بیسیوں بار ایسی ایسی فاش غلطیاں چھپ چکی ہیں جنھیں دیکھ دیکھ کر ہمیں شرم آتی ہے۔ خود "نظارہ" کی اُسی اشاعت میں جس میں "ترجمان" کی حرف گیری کی گئی ہے ایسی ایسی اغلاط موجود ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے! جس کسی نے جامۂ انسانی پایا ہے وہ اغلاط سے مبرا ہونے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ انسان پھر بھی انسان ہی ہے وہ فرشتہ نہیں بن سکتا۔

معزز بھائی عبدالحمید صاحب (جو میرے حقیقی بھائی کے ہمنام ہیں) انصاف فرمائیں ہمارے ہندو ابنائے وطن میں بعض بیرحم بھائی ایسے بھی ہیں جو اُردو زبان کے خون کے پیاسے ہیں۔ بھائی عبدالحمید صاحب پہلے اُدھر ایک نظر کریں۔ اس کے بعد معزز بھائی مسٹر بیتھراہ صاحب کی طرف دیکھیں کہ برخلاف اُن خون آشام بھائیوں کے آپ اُردو سے کتنی محبت رکھتے ہیں اور کس خلوص اور شفقت سے اُس کی خدمت میں کمربستہ ہیں۔ کیا ایسے محسن کی خدمات کا یہی صلہ ہے جو ہمارے معزز بھائی صاحب اُنہیں دے رہے ہیں!

ایک وہ زمانہ تھا جب اُردو زبان محض مسلمانوں کی میراث خیال کیجاتی تھی اب وہ زمانہ گیا اب اللہ کے فضل سے ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے کہ آج اُردو زبان سرزمین ہند کی ساری ہندی اقوام کے خاندان اجمالی کی مشترکہ ملکیت ہے اور ہمارے ہندو بھائی اس شاندار میراث کے اُتنے ہی مستحق ہیں جتنے حقدار ہم

مسلمان ہیں۔
بہرحال "ترجمان" ایک قابل وقعت رسالہ ہے اور اردو اخبار نویسی میں اسکا وجود ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

--------- * ---------

تعلیم نسواں

"مسلم گرلس اسکول لکھنؤ"

"پیام امید" کے قدر دان اس صوبہ کے ایک معزز ڈپٹی کلکٹر صاحب نے مضمون ذیل بغرض اشاعت ارسال فرمایا ہے۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ بجنسہ بلا ترمیم شائع کرتے ہیں۔

ہمارے معزز کرمفرما اپنی تحریر کے ذریعہ سے مطلع فرماتے ہیں کہ اگرچہ ایک محترمہ عزیزہ کی خواہش پر میں نے ایک نقل اس مضمون کی روزانہ اخبار میں بھیجدی ہے۔" مگر یہ مضمون" بالخصوص" "پیام امید" ہی کے لئے لکھا گیا تھا۔

ایڈیٹر

ہم نے جو زمانہ کے تقدیری تحریر کے ورق پر پڑھتے ہوئے نگاہ ڈالی تو یہی نظر آیا کہ زمانہ اپنے ہر ہر ساعتوں اور گھڑیوں کے انداز و روش پر قرار پذیر نہیں بلکہ ہر ہر لحظہ آگے بڑھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ" اٹھو اور آگے بڑھو" جملہ قومیں جو زندہ ہیں اپنی ہستی اور بقا کے قیام کے لئے دل سے شب و روز

زمانہ کی روش کے ہمرکاب ہیں حق یہ ہے کہ دانشمند وہی لوگ ہیں جو انجام پر نگاہ رکھتے ہیں اور بلا تاخیر موقع کا فائدہ مناسب اُٹھاتے ہیں اور اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہماری ہمعصر قومیں جو اس زمانہ میں موجود ہیں اُن کو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمت کی لگام اُن کی ہاتھوں میں ہے اور اس معرکہ میں کیسی تیزی سے قدم بڑھا رہی ہیں مگر افسوس کہ وہ امت جو زمانہ گذشتہ میں مکہ کے رسول کی زیر تعلیم رہ چکی تھی کیا رسول جس نے محض اصول دین ہی کی تلقین نہیں فرمائی اور جس کا کلام فقط ہوا ہی میں متوج پذیر ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ ہدایت عام کو علی جامہ میں مرصع کر کے ہمارے واسطے ودیعت کر گیا۔ آج وہی اُمت خواب غفلت میں پڑی ہے اور کسی جگانے والے کی محتاج ہے۔ جب کبھی آفتاب علم کی ضیا اُن کی آنکھ کھلنے پر اپنی جھلک دکھاتی ہے تو وہی قوم غفلت کیش کام کرنے کی دِن چڑھے قدم آگے بڑھاتی ہے مگر گیا جبکہ اور قومیں تاروں کے چھاؤں میں آگے بڑھ جا چکی ہیں اُن کی ہمراہی کوسوں دُور جا چکے ہیں اور اُن کے گرد قوم کا بھی ملنا دشوار ہے ہماری اس غفلت کی بہت سی مثالیں ہماری پیش نظر ہیں مگر اس جگہ اُن کے اعادہ کرنے میں سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ حاصل نہیں۔ ہم کو خوب یاد ہے کہ کسی زمانہ میں انگریزی تعلیم کی طرف بے توجہی کیجاتی تھی اور کسی حد تک مخالفت تھی۔ مگر سرسید مرحوم کی اَن تھک اور بے لوث کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی انگریزی تعلیم کا جوش پیدا ہو گیا اور ہر شخص انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرنے لگا۔ گو اس ابتدائی غفلت سے ہم دوسری قوموں کے ہمراہ نہ دوڑ سکے۔ اور قومی تگ و دو میں اُلٹے بہت پیچھے رہ گئے۔ یہ فسانہ تعلیم اطفال کا ہے نسوانی تعلیم میں بھی ہمارا طرز عمل اسی طرح

ہے اس موقع پر نسوانی تعلیم کے فوائد اور ضرورتوں پر بحث کرنا بے سود ہے چونکہ آج کل کے جدوجہد میں مرد کثیر المشاغل ہوتے جاتے ہیں اس وجہ سے انتظام خانہ داری اور بچوں کی پرورش و تربیت کے لئے عورتوں کی ہاتھ بٹانے کی سخت ضرورت ہے مگر یہ مقصد حسب دلخواہ بلا تعلیم حاصل ہونا دشوار ہے۔ ہم اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس ضرورت کو اور قوموں نے محسوس کرکے عملی کوشش کرنا شروع کر دی ہے مگر باستثنا چند افراد کے ہماری قوم خواب غفلت میں پڑی ہے خدا کرے کسی طرح کروٹ بدلے اور "پیام امید" کی خوش آیند اور بیدار کن آواز "اٹھو اور آگے بڑھو" اُن کے کانوں میں بھی گونج جائے تاکہ مستعد ہو کر عملی کوششیں شروع کر دیں۔ اب تاخیر کا موقع نہیں ہے ہر والدین کا فرض ہے کہ جہاں اپنی لڑکوں کی تعلیم میں کوشاں ہیں وہاں اپنی لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت پر خاص توجہ مبذول کریں اگر کسی اسکول میں بھیجنے کا موقع یا مصلحت نہ ہو تو اپنے گھروں ہی میں لڑکیوں کو تعلیم دلائیں جس شہر میں اسکول ہیں اور جہاں پردہ داری اور عفت و عصمت قائم رکھنے کا معقول انتظام ہے اپنی لڑکیوں کو ضرور داخل کر دیں جیسے "مسلم گرلس اسکول لکھنؤ" جو جناب مولوی سید کرامت حسین صاحب و چند خواتین لکھنؤ کی خاص نگرانی میں چل رہا ہے جناب موصوف نے ہماری قوم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے اپنی تمام زندگی کا ملیہ نسوانی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے اور خود نہایت سادگی سے بسر کر رہے ہیں ؎

جہل کی ظلمت میں گھٹتا دم یوں ہی شام سحر
یک بیک ہوتا نہ گر مہر کرامت جلوہ گر
جس نے باندھی بے زبانوں کی حمایت پر کمر
ایک نکلا مرد میداں بس یہ ساری قوم میں

دوسروں کے فائدہ پر لحاظ کر کے جناب موصوف نے اپنے آرام نفس کا کچھ

خیال نہ فرمایا اس کو ایثار کہتے ہیں اور اس سے دوسروں کو سبق لینا چاہئے۔ مجھے یہ سُن کر خاص مسرت ہوئی کہ لکھنؤ کی دو خواتین جو انجمن مدرسہ کی رکن ہیں ہر ہفتہ میں ایک گھنٹہ اپنے فرقہ کی لڑکیوں کو وعظ دیتی ہیں یہ نہایت اچھا اور باعث اطمینان خیال ہے خدا اس میں برکت دے اور اسے ہمیشہ قائم رکھے۔ ایک شیعہ خاتون نے سُنّی لڑکی کو جو سالانہ امتحان دینیات میں اوّل آویگی انعام دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور غالباً کوئی سُنی خاتون بھی شیعہ لڑکیوں کو انعام دیں گی یہ اچھا طرز عمل اتحاد قائم رکھنے کا ہے۔ اس موقع پر یہ کہنا غیر مناسب نہیں ہے کہ بیسویں صدی میں جس کو زمانہ "مادی" کہنا چاہئے "مادیت" قوت پذیر ہو رہی ہے اور "روحانیت" زوال کے بھنور میں گرفتار ہو گئی ہے اور تعلیم اطفال کے رائج الوقت طرز تعلیم کے جو نقصانات تجربہ کی روشنی میں منکشف ہوئے ہیں اُن کا لحاظ کر کے یہ بہت ضروری ہے کہ تعلیم نسواں کا جزو اعظم مذہبی تعلیم ہو۔ عورتیں مذہب کی پشت پناہ ہیں اور سچے دل سے حامی رہتی ہیں۔ اگر مذہبی تعلیم کی جانب اس وقت توجہ نہ کی جاوے گی تو شدید مضرت کا اندیشہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ خواتین لکھنؤ جو ہمیشہ دین کا مرکز رہا ہے مذہبی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں۔ موعظہ بہت اچھا ذریعہ دلچسپ پیرایہ میں اخلاقی اثر ڈالنے کا ہے ہمیں اُمید ہے کہ باشندگان لکھنؤ خصوصاً اور دیگر مسلمانان عموماً اس بیش بہا موقع کو ہاتھ سے نہ دیں گے اور دیگر مدرسہ جات نسواں کے منتظمین خواتین لکھنؤ سے سبق لیکر اپنے مدرسہ میں مذہبی تعلیم کا خاص اہتمام کریں گی۔

"ہمدرد تعلیم نسواں"

افسوس کہ ان سطور کی اشاعت پذیر ہونے سے پہلے فخر قوم مولوی سید کرامت حسین صاحب

راہیٔ جنت ہو چکے ہیں۔ اللہ پاک اُنہیں غریقِ رحمت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ مولوی سید کرامت حسین نہیں رہے مگر اُن کی قابلِ رشک خود فراموشی مثال ہمیشہ زندہ رہیگی اور ہمارے بچوں کے دلوں میں اُس پاک۔ بے داغ۔ سادہ اور سچے ایثار میں ڈوبی ہوئی زندگی کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیگی۔ مولوی کرامت حسین سچے معنوں میں محسن الملک تھے اور قوم اور ملک پر جو احسان عظیم وہ کر گئے ہیں اُسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

وہ پاک نفس شیعہ خاتون جنھوں نے سُنّی لڑکی کے لئے انعام فرمایا ہے بڑی عزت کی مستحق ہیں۔ ہمیں ایسی ہی نمونوں کی ضرورت ہے۔ معزز خاتون کی تقلید میں ہم بھی بڑی خوشی اور سچی مسرت کے ساتھ شیعہ لڑکی کو جو امتحان دینیات میں اوّل رہیگی "پیام امید" میڈل کے نام سے ایک نقرئی تمغہ دینا تجویز کرتے ہیں۔ ہماری سُنّی اور شیعہ لڑکیاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ جس طرح اُن کے لئے دینی تعلیم حاصل کرلینا ازبس ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ دینی تعلیم حاصل کرکے وہ تنگ خیال اور متعصب نہ بنجائیں۔ ہماری لڑکیوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شیعہ اور سُنّی کی تفریق اسلام کی اندرونی تفریق ہے۔ اس فرقہ بندی سے ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ دو علیحدہ علیحدہ فرقے قایم ہوں اور ایک دوسرے میں باہمی رقابت کی بنا پڑے۔ ہماری مذہبی تعلیم کا نتیجہ قومی اتحاد کی بنیادیں مضبوط کرنا ہونا چاہئے نہ کہ متزلزل کرنا۔ ہماری قومی بقا کا مدار شیعہ اور سُنیوں کے اتحاد پر ہے۔ جب تک قوم کی ساری قوت ایک متحدہ قوت نہ ہو ہم زندہ قوم نہیں بن سکتے۔ بعض مذہبی عقائد میں اختلاف اگر ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہ کرنا چاہئے۔ ہمیں جاپان

کی مثال پیش نظر رکھنا چاہئے جہاں ایک ہی گھر کے اندر چار بھائیوں میں سے اگر ایک عیسائی ہے تو دوسرا یہودی۔ تیسرا مسلمان اور چوتھا لامذہب مگر باوجود اس کے چاروں بھائی آپس میں اس طرح شیر و شکر ہیں کہ بجائے یک جان و دو قالب کے یک جان و چار قالب بنے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم یہ حالت پیدا نہ کرلیں ہم میں کسی ترقی کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

اراکین مدرسہ سے ہماری التجا ہے کہ براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں کہ امتحان سالانہ کب ہوگا اور اس کا نتیجہ کس وقت تک شائع ہوگا۔

"آزاد بیگم"

مشرق اور مغرب

"WEST IS WEST AND EAST IS EAST,

AND NEVER THE TWAIN SHALL MEET."

RUDYARD KIPPLING.

ہر بات میں مغرب جب مشرق سے نرالا ہے
مشرق کبھی مغرب سے مل ہی نہیں سکتا ہے

(ترجمہ از رڈیارڈ کپلنگ)

ہمارے ہمعصر نامور امریکی شاعر رڈیارڈ کپلنگ کا قول ہے کہ "مشرق مشرق ہی ہے

اور ہمیشہ مشرق ہی رہیگا۔ تم اُسے مغرب نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح مغرب مغرب ہی ہے اور ہمیشہ مغرب ہی رہیگا تم اسے مشرق نہیں بنا سکتے" اور گویا ہمارے ہمعصر اردو شاعر حضرت صفیؔ لکھنوی کے کلام کی ایک طور پر تردید کرتا ہے۔ وہ "مشرق کا سر اُٹھکر مغرب سے" ملا دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ مگر اُدھر کپلنگ کہتا ہے کہ یہ بات ہوئی ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولینا صفیؔ نے دوسرے ہی موقع پر کہا ہے اور کچھ اور ہی کہا ہے اور امریکن شاعر نے بالکل ہی مختلف موقع پر ایک بالکل ہی دوسری بات کہی ہے۔ مگر اس موقع پر دونوں کے قول فیصل کا اجتماع اور پھر اُن دونوں کی ضد بھی مزے سے خالی نہیں ہے۔

اگر آپ غور سے دیکھیں تو چاہے کسی پہلو سے دیکھئے مشرق اور مغرب میں واقعی زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہاں یہ فرق نمایاں صورت میں پیش نظر کرنے کی غرض سے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ اہل مشرق کا نمایندہ ایک ہندی مسلمان ہے۔ اور اہل مغرب کا نمایندہ ایک اعلیٰ طبقہ کا تربیت یافتہ انگریز ہے۔ یہ دونوں دوست ہیں۔ دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ دونوں اس وقت مخلع بالطبع اور تصنعات سے بالکل ہی علیٰحدہ ہو کر اپنے اپنے ملک کے نمایندے بنے ہیں اور اپنی طرز معاشرت کا دوسرے کی طرز معاشرت سے مقابلہ کرنے کے لئے مزے مزے کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ بھی ذرا چل کے سُن لیجئے۔

مغرب۔ بھائی معاف کرنا مگر تمہاری بعض باتیں مجھے بہت ہی بھونڈی نظر آتی ہیں۔ واقعی بُرا نہ مانو تو کہوں۔

مشرق۔ بُرا ماننا کیسا! یہاں تو اس وقت مذاق ہی مذاق میں ایک دوسرے

کی خامیوں پر حاشیہ چڑہانے بیٹھے ہیں۔ صاف کہو گے تو صاف سنو گے بھی۔ نہ تم بُرا مانتا نہ میں مانوں گا۔ اِس ہاتھ دو۔ اُس ہاتھ لو۔ بُرا تو جب ماننا چاہئے کہ بُرائی کی نیت ہو۔ یہاں تو صرف ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کوئی دوسری غرض نہیں ہے۔ پھر منہ پُھلا بیٹھنا اور رَو دینا یعنی چہ!

مغرب۔ اچھا لو سُنو۔ تمہارے کہانے تو مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ ثقیل۔ دیرہضم۔ بدمزہ مضرصحت۔!

مشرق۔ جسطرح تمہارے کھانوں کی فہرست میں بعض روزمرہ کے سادے کہانے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو خاص خاص موقعوں پر خاص اہتمام سے تیار کرائے جاتے ہیں۔ یہی حال ادہر بھی ہے۔ اس حدتک تو میں بھی بے دلیل تسلیم کر لینے پر تیار ہوں کہ ہمارے غیر معمولی کہانے تمہارے غیر معمولی کہانوں کے مقابلہ میں نسبتًا دیرہضم ضرور ہیں۔ مگر وہ مضر صحت ہوتے تو ہمارے اگلے زمانے کے بادشاہ۔ امرار وزرار امیرزادے۔ رئیس زادے سب کے سب دائم المرض رہا کرتے اور انمیں سے ایک بھی عمر طبعی کو نہ پُہنچتا۔ کیونکہ انہیں غیر معمولی غذاؤں پر وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اب بھی ہمارے خوشحال اور فارغ البال طبقہ کی بسر ایسی ہی غذاؤں پر ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ہم متوسط الحال عمومًا سادہ غذاؤں پر بسر کرنے والوں کے مقابلہ میں اُن کی صحت خراب ہے یا اُن کی عمریں ہمارے مقابلہ میں کم ہوتی ہیں یا وہ ہم سے جلد مر جاتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ہمارے کہانے بدمزہ ہوتے ہیں تو بھائی جان پلاؤ۔ قورمہ۔ مزعفر۔ متنجن کو تو بھلا کوئی کیا بدمزہ کہہ سکیگا۔ اسی طرح ہم اہل مشرق کہا کرتے ہیں کہ یورپین کہانے عمومًا بدمزہ ہوتے ہیں۔ مگر

میں اسے بھی نہیں مانتا۔ بات یہ ہے بچپن سے جس قسم کے کھانے کھانے کی طبیعت عادی ہو رہی ہے وہی ہمیں بھلے معلوم ہوں گے۔ ان کے خلاف جب کوئی کھانا ہمارے سامنے آئیگا تو چاہے وہ کیسا ہی اچھا ہو مگر چونکہ طبیعت اسکی عادی نہیں ہے وہ کبھی ہمیں پسند نہ آئیگا۔ یہاں خوش مزہ اور بدمزہ کا معیار اگر غور سے دیکھئے تو محض عادت ہی پر ہے۔ عادت ہی ایک خوش مزہ اور دوسرے کو بدمزہ کا لقب دے دیتی ہے اور ہماری طبیعت اس فیصلہ پر بے دیکھے بھالے بے سوچے سمجھے مہر تصدیق لگا دیتی ہے۔

مغرب۔ کیا عجب ہے اگر واقعی یہی بات ہو۔ ایسا ہی سہی۔ مگر ہاتھ سے کھانا تو بڑی گندہ بات ہے۔ یہ زمانہ حال کی تہذیب اور شائستگی سے پہلے وقتوں کی بات ہے اور آجکل کے زمانہ میں۔ ترقی۔ تہذیب اور شائستگی سے بہت پیچھے ہے۔ تم ہی دیکھو اس طریق پر کھانے سے سارے ہاتھ لتھڑ جاتے ہیں۔ اور پھر آخر اُنہیں دھوتے اور صاف کرتے پھرتے ہو۔

مشرق۔ بیشک کانٹے چھری سے کھانا نہایت صفائی کی بات ہے۔ اور واقعی بیسویں صدی کی تہذیب اور شائستگی یہی چاہتی ہے۔ مگر قدامت پسند مشرق اپنا قدیم رنگ بدل کر اپنا رنگ اختیار کر لینا اپنی سخت توہین سمجھتا ہے۔ وہ اوروں کی تقلید کرنا اپنے لئے باعث فخر نہیں سمجھتا۔ بلکہ شرمناک سمجھتا ہے۔ اور نئے خیال کے لوگ جب اتنی جلد بات کی بات میں اپنا پرانا رنگ بدل ڈالنے پر تل جاتے ہیں تو وہ اُن سے دست و گریبان ہونے پر فوراً کمربستہ ہو جاتا ہے یہ لوگ اُسے "پرانا۔ دقیانوسی کرم خوردہ" کہہ کر اپنا دل خوش کر لیا کرتے ہیں

اور وہ اُنہیں "چھچھورے" اور گرگٹ کہہ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑا کرتے ہیں۔

مشرق۔ہاں خوب یاد آیا! خیر صاحب ہمارے کھانے تو دیرہضم ہیں اسوجہ سے مضر صحت قرار پائے۔مگر یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ آخر ہمارے عطریات کیوں ناپسند آئے اور کیوں آپ کی لطافت پسند طبیعتیں ان لطیف خوشبویوں کی قدر نہیں کرتیں!

مغرب۔میں سُنتا ہوں بعض ہندوستانی حضرات کا خیال ہے کہ ہم لوگ عطر کی خوشبو سے قطعی نفرت رکھتے ہیں۔یہ سراسر بہتان ہے۔بھلا دنیا میں کون ذی روح ہے جو خوشبو کو بدبو کہہ سکیگا یا اُس سے قطعی نفرت رکھیگا! ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض وجوہ سے وہ ہمارے مذاق کے موافق نہ ہو۔

مشرق۔کیا آپ مہربانی کرکے وہ وجوہ بیان فرمائیں گے؟

مغرب۔بڑی خوشی سے۔جس طرح ہماری شاعری۔جسطرح ہمارے موسیقی نسیم لطائف کی بالائی سطح کی ایک لطیف موج ہے بعینہ یہی حال ہماری خوشبو کا بھی ہے۔یہاں ہم دُرد آشام ہونا نہیں چاہتے۔ہم اتنا گہرا رنگ پسند نہیں کرتے جسے جب تک عوام الناس رنگ کے نام سے ملقب نہ کریں گے کہ وہ ایک فرلانگ کے فاصلہ سے صاف صاف نظر نہ آئے۔جس طرح تمہارے اہل لکھنؤ ایسا ہی لطیف رنگ پسند کرتے ہیں جو رنگوں کی اقلیم میں رنگ کا خواب وخیال۔رنگ کی لطافتوں کا طلسم ہو بعینہ وہی حال خوشبو کے متعلق ہمارے مذاق کا ہے۔ہم فطرت کی دلفریبیوں کے عاشق ہیں۔ہم ایسی ثقیل خوشبو پسند نہیں کرتے جو فطرت کی جولانگاہ سے باہر ہو۔جو فطرت سے صاف اجنبی نظر آتی ہو۔تم ایک خوشبودار

پھولوں سے لدے ہوئے خطۂ چمن کی سیر کرو۔ نسیم سبک روکے کاندھوں پر سوار ہو کر فطرتی لطافتوں کا عطر مجموعہ تمہارے دماغ کی ضیافت کرنے آئیگا۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ وہ خوشبو کس سے زیادہ مشابہ ہوگی؟ تمہارے عطریات سے یا ہماری ولایتی خوشبوؤں سے؟ تو بس یہی وجہ ہے کہ ہمیں وہی پسند ہے۔ اب تو آپ میرا مطلب سمجھ گئے؟

مشرق۔ اچھی طرح۔ (باقی آیندہ)

ستم ظریف

شکریہ

معزز خواتین ذیل کے ہم شکر گزار ہیں کہ اُن کی ہمدردی ایک عملی ہمدردی ثابت ہوئی ہے ہمارے عظیم مقاصد میں کامیابی جب ہی ممکن ہے جب اسی طرح ہمارے اور معزز جوہر شناس بھی توسیع اشاعت میں مدد دینے پر کمربستہ ہو جائیں۔

۱۔ نعمہ خاتون۔ بنت خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب — ۲ خریدار

۲۔ بلقیس بیگم صاحبہ حصار۔ پنجاب — ۲ خریدار

۳۔ عطا بیگم صاحبہ۔ گجرانوالہ۔ پنجاب — ۱ خریدار

اس کے علاوہ پندرہ حضرات از خود خریدار رسالہ بنے ہیں۔ ان سب حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

آزاد بیگم

ناول

واقعات کا انکشاف اسٹوارٹ ڈان کی زبانی

ایک دوست۔ کیا تم نہیں کھیل رہے ہو؟

میں۔ ہاں ہاں کھیل تو رہا ہوں۔

میری نظر لوح پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے نام ہارمیں پانچ پونڈ کی رقم درج ہے۔ میں اس رقم کے ادا کرنے کی وسعت رکھتا تھا۔ مگر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھکر میں نے کہا۔

میں۔ قسمت میری مخالف ہورہی ہے۔ اور اب دس بج چکے ہیں۔ رات ہی کو شراب فروش پر مجھے ایک مضمون تیار کرنا ہے۔ اب تو میں گھر ہی جاؤنگا۔ اگر کوئی اور صاحب میری عوض کھیلنے رہنے پر آمادہ نہیں ہیں تو اس وقت میرے گھر چلے جانے اور پھر علی الصباح آکر کھیلنے میں آپ کا کیا ہرج ہے؟

برڈی شا۔ ارے میاں پہلے بائیں ہاتھ سے ہاری ہوئی رقم دھر دو پھر باتیں بنانا۔ کل کو تم مکر جاؤ تو کوئی تمہارا کیا کرلے گا!

میں۔ میں اور مکر جاؤں! پانچ پاؤنڈ کی کیا ہستی ہے۔ اگر پچیس پاونڈ بھی ہار جاؤں تو بھی اپنی بات پر قایم رہونگا۔

جو مسگریو۔ اجی یہ سب جھول ہے۔ لو میری بات سنو۔ آؤ ہم گھوڑ دوڑ کا اشتہار دے دیں۔

گھوڑے کے سر پر کھڑے ہو کر ٹٹی اُڑانے کی اور کاوا دینے کی قید ہو۔ اسٹوارٹ ڈان ہمارے نمائندے ہوں گے۔ فیس داخلہ ایک شلنگ رکھ دو۔

ڈینس پارک۔ میں کاوا دینے والی قید کے خلاف ہوں۔ بھلا ہم کلب کے کاوے باز سے بازی لیجا سکتے ہیں! اتنا کہہ کر اس نے کاوے باز کی طرف دیکھا۔ اور کاوے باز ایک خاص انداز سے اُسے دیکھ کر مُسکرا دیا۔ ایک اور صاحب کھڑے ہوئے اور بولے کہ گھوڑے کے سر پر کھڑے ہونے کی شرط ٹھیک نہیں۔ جم بلیک کا سر اتنا بڑا ہے کہ اُسکے لئے پاؤں کے بل کھڑے رہنے سے سر کے بل کھڑا رہنا آسان ہے۔ جو مسگریو سے اب رہا نہ گیا اور بولا جب آپکو ہر ہر بات میں ایک فی نکالنا ہے تو پھر آخر انجام ہی کیا ہونا ہے مجھے تو صاف بات آتی ہے۔ صاف صاف کہئے ہاں یا نہیں۔ اس کے جواب میں سب مل کر بولے "ہاں اور برابر ہاں" اور بچوں کی طرح ایسا اودھم مچا دیا کہ پیچھے کی دو چار کُرسیاں اُلٹ گئیں۔ یہ شور و شغب سُنکر دو تین اور شخص کلب کے اندر کمرے میں آ گئے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا معاملہ ہے! مسگریو نے بتایا کہ ایک گھوڑ دوڑ کی تجویز در پیش ہے گھوڑے کے سر پر کھڑے ہو کر ٹٹی اُڑانے کی شرط ہے۔ اور کاوا دینے کی اور یہ سب ہمارے کلب کے معزز ممبر اسٹوارٹ ڈان کی پاس خاطر سے ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے آپ مفلس اور نادار ہو گئے ہیں۔ فیس داخلہ ایک شلنگ ہے۔ یہ ایسا موقع ہے کہ آپ اپنی فیاضی اور اولو العزمی کا ثبوت دل کھول کر دے سکتے ہیں۔ اس گھوڑ دوڑ میں جو صاحب بازی جیتیں گے وہ انعام کی رقم ہمارے نادار ممبر کے حوالے کر دیں گے حضرات میں آپ سے اتنا اور عرض کروں گا کہ افلاس کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا کوئی...

.... وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ میں بول اُٹھا۔ اب یہ قصہ مختصر

کیجئے۔ میں گھر جا کے ایک مضمون لکھتا ہوں[1]۔ خدا حافظ!

غزل

کہتا نہ تہا میں تجہ سے عالم میں تو ہی تو ہے

ہر گل میں تیری رنگت ہر پنکھڑی میں بو ہے

خم خانہ سے جو تیرے اس درجہ منحرف ہے

زاہد کو پہر حرم میں کیا تیری جستجو ہے

قلقل سے آرہی ہیں تکبیر کی صدائیں

حق حق پکارتا اس میخانہ کا سبو ہے

کفار عشق کا دل اس بت کا بتکدہ ہے

سجدہ پہ جسکے دیتا فتوائے کفر تو ہے

مقتل میں قتل ہو کر ہر سر ہے سجدہ کرتا

خوں سے شہید غمزہ کرتا یہاں وضو ہے

خون شہید غمزہ ہے آسماں پہ چہایا

جس کی شفق سے روشن یاں جام اور سبو ہے

نام و نمود والو تم کو سلام رخصت

اس کوچہ ملامت کی مجہہ کو آرزو ہے

---

[1] اس فقرہ کا یہ مطلب ہے کہ ایک مضمون لکھ کر کسی اخبار میں بہیجونگا اور اسکی اجرت سے یہ ہار کی رقم ادا کردونگا انگلستان کے اخباروں میں جو مضامین اشاعت کیلئے بہیجے جاتے ہیں ان کی ہمیشہ معقول اجرت ملتی ہے۔ یہی حال وہاں کے ماہوار رسالوں کا ہے۔ رسالوں کے مضمون نگاروں کو ہر مضمون کی اجرت کم و بیش ڈہائی تین سو روپیہ ملتی ہے۔ ایڈیٹر

اعلان

میری معزز و محترم بہنو۔ السلام علیکم۔ میں نے شریف مگر غریب پردہ نشین بیوہ نیز جس کے شوہر نا خدا ترس اور ظالم ہیں ایسی عورتوں کی حالت نہایت قابل رحم دیکھی آخر یہ سوچکر کہ ان بیچاریوں کو کس طرح گھر بیٹھے کام مل سکے ایک زنانہ سٹور کھول دیا ہے اس سے بیک کرشمہ دو کار حاصل ہوں گے۔ غریب عورتوں کو مزدوری مل سکیگی اور باہر کی ذیمقدرت خواتین کو ان کے کارآمد اشیاء بہ سہولت و کفایت بہم پہنچنے کا انتظام ہو جائیگا۔ مراد آباد کے برتن مشہور ہیں اور دُور دُور منگوائے جاتے ہیں۔ اس لئے علاوہ پُرانے فیشن مثلاً گلاس تھالی جوڑ پاندان خاصدان ناگردان۔ پیکدان۔ بھرت کے پلنگوں کے پائے۔ بھرت کی لُٹیاں۔ حقہ۔ سادہ قلمکار۔ و سیاہ قلم کے نئے فیشن کا بھی خیال کر کے تیار کرائے ہیں مثلاً پلاؤ و شوربہ رکھنے کی ڈشین۔ صابن دانی۔ نمکدانی۔ انڈا دانی۔ دودہ دانی معہ سرپوش۔ مصری دان پھولدان۔ بتی دان۔ راکھہ دانی۔ چائے دانی اور اسی قسم کی اشیاء۔ نیز کارچوبی کام کے کف۔ کالر۔ گریبان۔ واسکٹ کے بٹن۔ بلیس۔ مقیش یعنی کامدانی کا کام بھی ہر طرح کا حسب فرمائش بھیجا جا سکتا ہے۔ سٹور کے متعلق کتابوں کی ایجنسی بھی ہے جس میں زنانہ تصنیفات اور ہر قسم کی کتب مل سکیں گی!!

خاکسار

والدہ سید محمد افضل علی بی اے مصنفہ گودڑ میں کا لال و شعلہ نہاں

منیجر زنانہ اسٹور مراد آباد

مروارید ثلاثہ

یہ ہرسہ کتب مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مسلم مشنری ہیں۔ جو تین خاص مضمون پر نایاب اور بےمثیل کتابیں جو بتفصیل ذیل درج ہیں۔

(۱) براہین نیرہ حصہ اوّل۔ (معروف بہ زندہ وکامل الہام) قیمت - - - ۱۲ر

اسمیں یہ دکھلایا گیا ہے کہ قرآن ایک خاتم اور ناطق الہامی کتاب ہے جسمیں تہذیب تمدن کے کامل قوانین موجود ہیں۔ اس ضمن میں مصنف نے ایک حکیمانہ بحث میں موجودہ تہذیب پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ کل مذاہب دیگر کے عقائد اور اصولوں پر نہایت منطقی بحث کیگئی ہے۔

(۲) ام الالسنہ (معروف بہ زندہ وکامل الہامی زبان) قیمت - - - ۱۲ر

یہ کتاب بالکل جدید تصنیف ہے اور جدید مضمون پر لکھی گئی ہے۔ اپنی نوع کی یہ پہلی کتاب اردو انگریزی لٹریچر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں یہ دکھلایا گیا ہے۔ کہ عربی الہامی زبان ہے۔ اور کل دنیا کی زبانیں اس زبان سے نکلی ہیں۔ اور ابتدا میں سب ملکوں کے آبا واجداد عربی الاصل تھے یہ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) اسوہ حسنہ (معروف بہ زندہ کامل نبی) قیمت صرف - - - - ۸ر

اسمیں آنحضرت صلعم کا کامل نمونہ بحیثیت انسان کامل پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ اس کو پڑھ کر ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ کہ محمد صلعم خاتم النبیین ہیں اگر کوئی کامل نبی ہوسکتا ہے تو آپکی ذات پاک ہی ہے۔ **نوٹ**۔ محصولڈاک وغیرہ بذمہ خریدار ہوگا

احباب ان ہرسہ کتب کے آرڈر ارسال فرمانیمیں عجلت فرمائیں۔ ورنہ بعد ازاں مایوسی ہوگی۔

پتہ:۔ مینیجر اشاعت اسلام بکڈپو۔ عزیز منزل احمدیہ بلڈنگس۔ نولکھا لاہور

جنگ ! جنگ !! خونریز جنگ !!! اور فتح !!!!

ن و شباب کے دو بڑے حجاب شرم و حیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمنا و شکی پیدل۔ ارمانوں کے
علا آشام سوار۔ حسرتوں کے شریر بار رسالے دل کے سنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور غنیم کی
علہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادھر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا
جوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اور اضطراب کے توپخانے
ے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش سے
نگ جاری ہو کر ہلتے ہیں کچھ اداؤں کا غنیم جنرل "وفا" کی ڈویژن پر ایک سخت خونریز
ور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "وفا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہے
نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے پھر تو قصہ
ل "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آ گئے ہیں۔ ایمن
ی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے اُسے دیکھتے ہی
نیم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات۔ یہی حسن و عشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے
جذبات کی تصویر۔ عفت اور حیا کا دلنشین مرقع خلوص صدق و صفا کے [illegible] شفاف
ئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادھر آئیے ہم دکھاتے ہیں سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت
ستاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت خلیل
شاعر [illegible] کی زبان سے مرصع اردو نظم میں بڑے آب و تاب بڑی خوبی
[illegible] چھپ کر تیار ہے حجم [illegible] صفحہ قیمت فی جلد [illegible]

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

شیکسپیر اردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار	چھائی ہوئی ظلمت شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت	اُلفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان	ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی	کانوں میں صدائے یار آئی



فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پاچکا ہے اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انھیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔ اصلی قیمت ۱۲؍ تھی۔ اب رعایتی قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے۔

فہرست مضامین رسالہ پیام امید ماہ جولائی سنہ ۱۷ء

امید کا پیام ——"اُٹھو —— اُٹھو —— اور آگے بڑھو!"

پیامِ امید

نمبر ۲۷	محمود آباد ۔ سیتاپور ۔ جولائی ۱۹۱۷ء	جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیامِ اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے ۔ اسمیں جنس کی قید نہیں ۔ جس حال میں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گزرے گا ؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ۔ ایسی رائے قایم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے ۔

ایڈیٹوریل نوٹس

ناظرین کرام سے ہماری مودبانہ درخواست ہے کہ تبادلہ یا رخصت یا کسی وجہ سے تبدیل مقام کی صورت میں ایک مختصر کارڈ کے ذریعہ سے دفتر کو ضرور مطلع فرما دیا کریں کہ

کن کن تاریخوں کے درمیان کے پرچے کہاں کہاں اور کس پتہ سے روانہ ہوں گے ہم انہیں نمبر رجسٹر کا حوالہ دینے کی زحمت بھی نہیں دیتے۔ محض اتنی ہی اطلاع کافی ہوگی۔
ہمیں افسوس ہے کہ بہت سے حضرات نے ہمیں اپنے تبدیل مقام کی کوئی خبر نہ دی۔ ہم برابر اسی پُرانے پتہ پر رسالہ بھیجتے رہے۔ ششماہی یا سال کی میعاد پوری ہونے پر قیمت طلب پیکٹ بھیجا گیا وہ انکاری ہو کر واپس آیا۔ خریداران رسالہ نے تو یہ سمجھ لیا کہ ہم نے انکی خدمت میں رسالہ بھیجنا بند کر دیا۔ ڈاکخانہ والوں نے تبدیل شدہ پتہ پر رسالہ روانہ نہیں کیا۔ اور نہ ہمیں واپس بھیجا۔ ناظرین کرام کی ایک ذراسی لاپروائی کی کتنی سخت قیمت ہمیں ادا کرنا پڑی!

---

۱۴ ارمئی کی اشاعت اخبار "شریف بی بی" لاہور میں محترمہ مکرمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ کی کھلی چٹھی ذیل کے عنوان سے شائع ہوئی ہے:۔ "مرد عورتوں کے لباس میں" اس چٹھی میں علاوہ بعض قابل اعتراض فقرات کے ایک فقرہ یہ تھا۔
"میرے علم میں سوا شریف بی بی کے اور کسی زنانہ اخبار یا رسالہ کی ایڈیٹر عورت نہیں ہے"۔ محترمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ اور ایڈیٹر صاحبہ شریف بی بی سے "پیام اُمید" کے متعلق اس فاش فروگذاشت کا ہونا بیحد تعجب خیز معلوم ہوا۔ میں نے دونوں محترم خواتین کو لکھا ہے اور جواب ملنے سے پہلے اس معاملہ پر اور کچھ لکھنا قبل از وقت سمجھتی ہوں۔ مجھے دونوں کے خلوص اور نیک نیتی سے قوی اُمید ہے کہ اس گتھی کے آسانی کے ساتھ سُلجھانے کی کوشش میں مجھے مدد دیں گی۔ اور طوالت اختیار کرنے کی زحمت سے بچائیں گی۔

آج (۱۳ رمئی) کی ڈاک سے محترمی مکرمی جناب خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ مدظلہٗ کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے جس کے ذریعہ سے یہ فروگذاشت تسلیم کی گئی ہے اور محترمہ مکرمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ کی مفصل تحریر کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ میں اس خط کی اور اسی طرح محترمہ ایڈیٹر صاحبہ اخبار "شریف بی بی" کے خط کی منتظر رہوں گی اور جب تک یہ تحریرات موصول نہ ہو جائیں یا کافی انتظار نہ کر لیا جائے مجھے سکوت ہی قایم رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

معاونین ذیل کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اُنھوں نے توسیع اشاعت میں گرانقدر اعانت فرمائی ہے۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ معاونین کرام اپنی معنید کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور اسی طرح ہمارے اور معزز ناظرین "پیام امید" کے دائرہ عمل کی توسیع میں اعانت فرما کر "پیام اُمید" کو اس کی کامیابی کی منزل مقصود کے قریب تر پہنچانے میں معین ہوں گے۔

ہمشیرہ جناب اصغر امیر علی صاحب دہرہ دون۔
جناب بلقیس بیگم صاحبہ حصار۔
مس خان بہادر قاضی عزیزالدین احمد صاحب دھولپور۔
جناب مولوی نذیر حسین صاحب صدیقی حیدرآباد دکن۔

عاجزہ
آزاد بیگم

اسمائیلس کیریکٹر

پہلا باب

کیریکٹر کی قوت

جب تک انسان اپنی شخصی (ذاتی) خامیوں اور آلائشات کی سطح سے اپنے کو بالاتر رکھ سکنے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ انسان کی بساط ہی کیا ہے؟ ——— وڈنیل

کیریکٹر[1] اُس اخلاقی انضباط کا نام ہے جس کی جھلک کسی شخص کی ذاتی خصوصیات کے آئینہ سے نظر آرہی ہو۔ کیریکٹر سے متصف اشخاص سوسائٹی کا خمیر ہیں (گویا جس قوم میں اعلیٰ کیریکٹر کے لوگ نہ ہوں وہ قوم ہی نہیں ہے) ایمرسن

کسی ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا مدار اس امر پر نہیں ہے کہ اُس کی آمدنی وافر ہو یا اُس کے قلعے مضبوط ہوں۔ یا اُس کی عمارات نہایت ہی شاندار ہوں بلکہ اس کا مدار محض اسی بات پر ہے کہ اُس ملک میں اعلیٰ پایہ کے تربیت یافتہ اور صاحب الرائے

---

[1] گذشتہ اشاعت میں ہم دکھا چکے ہیں کہ کیریکٹر کا لفظ کتنا وسیع ہے اور اس کا مفہوم کن کن معانی پر حاوی ہے۔ اردو میں ہمیں کوئی لفظ اب تک نہیں مل سکا۔ جو اس لفظ کا پورا پورا قایم مقام بن سکے اسی معذوری کی وجہ سے ہم انگریزی لفظ ہی کا بدستور قائم رکھتے ہیں۔

مترجم

اہل دماغ کتنے ہیں۔ اور کتنے آدمی ایسے ہیں جنکی تعلیم روشن خیالی اور کیریکٹر پر بھروسہ کیا جا سکے۔ محض انہیں باتوں پر اس ملک کے حقیقی بہبود کا مدار ہے۔ یہی اسکی اصلی قوت۔ یہی اس کی واقعی طاقت ہیں۔ مارٹن لوتھر

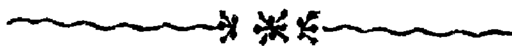
دنیا کا طاقتور ترین ذخیرۂ قوت کیریکٹر ہے۔ اس کے لطیف ترین مظاہر بہترین خواص انسانی کے جلوہ نما ہوتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ سے انسانیت کے بہترین جوہر کھلتے ہیں۔ دنیاوی کاروبار کے ہر شعبہ میں حقیقی خوبیوں کے لوگ بنی آدم کی فطرتی گرویدگی کا باعث ہوتے ہیں۔ کون ہے جو اہل ریاض۔ اہل دیانت۔ اعلیٰ اصول کے پابند اپنے نیک ارادوں میں پختہ مسعد حضرات کی دل سے عزت نہ کرے گا۔ ایسے آدمیوں کا اعتبار کرنا۔ اُن پر اعتماد رکھنا۔ اُن کے نقش قدم پر چلنا مقتضائے فطرت ہے۔ دُنیا میں جو جو بھلائی کی باتیں ہیں وہ اُنہیں کے دم سے قایم ہیں اور اگر یہ لوگ دُنیا میں موجود نہ ہوں تو ان کے بغیر دُنیا اس قابل باقی نہیں رہ سکتی کہ اُس میں کوئی بھلا آدمی رہ سکے۔

کسی فن میں عروج کمال پر پہونچنے کا خداداد مادّہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں ایک حیرت آمیز ولولۂ جوش پیدا کر دیتا ہے۔ اس ولولہ میں استعجاب حقیقی دلی مسرت اور تعظیم کا عطر مجموعہ جمع ہوتا ہے۔ مگر کیریکٹر ہمیں اعلیٰ کیریکٹر سے متصف شخص کی دل سے عزت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اول الذکر صفت دماغی خوبیوں کا مظاہرہ ہے۔ آخر الذکر دلی قوتوں کا۔ مگر انسانی ہستی کی کارگاہ میں دل ہی ایک شے ہے جس کی حکومت ہر جگہ موجود ہے۔ اول الذکر طبقہ قوم کے ذہن کا نمایندہ ہے

آخرالذکر قوم کے خمیر کا۔ اوّل الذکر صفت کی عزت کیجاتی ہے۔ آخرالذکر صفت کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اُس سے سبق سیکھا جاتا ہے۔ اُس کے نمونہ کی پیروی کیجاتی ہے۔

دُنیا کے اہل کمال مستثنیات میں سے ہیں اور خود نقطہ کمال دوسروں سے مقابلہ ہونے کے ساتھ ایک امتیازی نسبت کا مفہوم رکھتا ہے۔ واقعی ہم میں سے بیشتر اشخاص کے دائرۂ عمل کی وسعت اس درجہ محدود ہے کہ معدودے چند افراد کو کمال کے درجہ تک پہونچنے کا موقع مل سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی کم سے کم ہر شخص اپنے حصّہ کا کام اپنی انتہائی قوت خرچ کر کے دیانت اور آبرو کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یہ بات ہر شخص کے احاطۂ امکان کے اندر ہے کہ اپنے جوہروں کو جائز مصرف میں لائے اور اُنہیں ناجائز یا بیجا طور پر استعمال میں نہ آنے دے۔ ہر پیش آنے والے موقعہ سے جائز فائدہ اُٹھا کر اور ہر حال میں اپنے کو خوش رکھہ کر اپنی زندگی کو ایک کامیاب زندگی بنائے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی جو اُس سے متعلق ہوں دیانت صداقت نیکی اور پاک نفسی سے کام کرے۔ قصّہ مختصر یہ کہ اپنے فرایض کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرے اور اُنہیں صحیح طور پر انجام دے۔ چاہے جیسا چھوٹا یا بڑا کام اللہ پاک نے اُس کے لئے مخصوص کر دیا ہو۔ (باقی آیندہ)

مترجم



تاریخِ اسلام کا ایک صفحہ

گذشتہ اشاعت سے آگے

اہلِ قریش تجارت کے اغراض سے سال میں دو مرتبہ وطن سے باہر جایا کرتے تھے موسمِ سرما میں یمن کی طرف اور موسمِ گرما میں بصرے کی سمت۔ آخرالذکر سمت میں صوبہ حوران ملک شام کا ایک مشہور تجارتی شہر تھا اور تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس طریق پر یمن اور شام کے درمیان میں مکہ تجارت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ بدوی قبائل کی لوٹ مار کی وجہ سے تجارت مخدوش سمجھی جاتی تھی اور تجارتی راستے خطرناک تھے مگر چونکہ اہلِ قریش کو خادمِ کعبہ ہونے کا شرف حاصل تھا اس وجہ سے قبائل بدوی اُن سے معترض نہیں ہوتے تھے اور یہ لوگ اطمینان اور فراغت سے اپنے کاروبار میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اہلِ قریش انہیں تجارتی اغراض سے وقتاً فوقتاً فارس اور حبشہ میں بھی جایا آیا کرتے تھے۔ عموماً کپڑے اور غلہ شام سے اور شکر اور موم وغیرہ فارس سے لاتے تھے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اہلِ مکہ کا ذریعہ معاش خانہ کعبہ ہی تھا۔ اگر مکہ کو یہ شرف حاصل نہ ہوتا جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے تو اہلِ مکہ کا ایسی سرزمین پر بسر کرنا جہاں پانی عنقا تھا۔ جو بالکل بے آب و گیاہ تھی اور جہاں زراعت ناممکن تھی محال یا دشوار ہی نہیں بلکہ بالکل ہی غیر ممکن تھا۔

عراق اور شام کی متمدن دنیا سے تجارتی تعلقات رکھنے اور ملنے جلنے کی وجہ سے اہلِ قریش عرب نے مختلف قبائل میں اپنی معاملہ فہمی تجربہ کاری اور علمیت کی وجہ

سے ممتاز ہو گئے تھے اور چونکہ خانہ کعبہ کی رونق پر اُن کی معاش کا بہت کچھ مدار تھا لہذا اُن کی پوری توجہ اس بات پر مصروف تھی کہ وہاں آنے جانے کے لئے جسطرح ممکن ہو سہولتیں پیدا کی جائیں اور ہر طرح خانہ کعبہ کو رونق دیجائے۔ چونکہ وہاں پانی ملنا دشوار تھا اہل قریش نے خانہ کعبہ کے گرد و پیش سبیلیں لگائی تھیں اور کھانا کھانے کے لئے مکانات تعمیر کرا دیئے تھے۔ اسی کے ساتھ اُنہوں نے کعبہ کے آس پاس کی زمین کو حرم قرار دیا تھا اور اس کی معینّہ حدود کے اندر جنگ اور قتل حرام قرار دیا تھا۔ آنے جانے والوں کی آسایش کے لئے جو جو سامان بہم پہنچائے تھے اس کی نگرانی کا اہتمام اُنہوں نے اپنے ہی گھرانے یعنی اہل قریش میں رکھا تھا۔ مثلاً کوئی صاحب سبیل کے متولی قرار پائے تو کسی دوسرے صاحب کے تعلق کھانا کھانے کے مکانات کے انتظام کی نگرانی ہوئی۔ غرضکہ انتظامی خدمات اپنے ہی گھرانے میں تقسیم کر دیں۔ رفتہ رفتہ ضرورتیں بڑھتی گئیں اور انہیں کے ساتھ مختلف خدمات کے لئے اسامی درکار ہوئے۔ حتیٰ کہ ظہور اسلام سے پہلے پندرہ[۱۵] سولہ[۱۶] خدمات معین ہو چکی تھیں۔ (باقی آیندہ)

مورّخ



خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

شوہر کے فرایض

خانہ آبادی میں خاندان کے ہر ہر متنفس کے فرایض کا ایک مخصوص حصہ ہے اور سارے خاندان کی خوش حالی اور فارغ البالی کا مدار محض اسی امر پر ہے کہ انمیں سے ہر ہر متنفس اپنے اپنے فرایض کا پورا پورا حصہ دیانت، صداقت - راستبازی اور شرافت کے ساتھہ انجام دے - اگر ان افراد میں سے کوئی متنفس اپنے متعلق حصہ کی انجام دہی میں اپنے معینہ فرایض کی انجام دہی یا خلوص اور محبت میں کمی کرے گا تو اس کمی کا بدنتیجہ سارے خاندان کی رونق چہل پہل خوشی اور کامیابی پر پڑیگا - دیکھو جہاں کئی گانے والے ایک ساتھہ مل کر گا رہے ہوں - کئی آدمی آواز ملا کر مرثیہ پڑھ رہے ہوں یا ایسا باجہ بج رہا ہو جس میں کئی تار ہم آہنگ ہو کر کوئی خاص ترانہ یا نغمہ پیدا کر رہے ہوں اگر انمیں سے ایک گانے والا یا ایک تار بے سرا ہو جائے تو سارے ترانے یا مرثیہ کی کیسی ستیاناسی ہو جاتی ہے - بالکل یہی حال خاندان کے مختلف افراد کا ہے جو ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے اہم مقصد میں ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کر رہے ہوں - اگر ان سب میں سے ایک بھی اپنی معینہ حدود سے باہر قدم رکھیگا تو سارے گھر کی مشین کا نظام درہم و برہم ہو جائیگا گھڑی کے مختلف پرزے اپنا کام جدا جدا کرتے ہیں - سارے پرزوں کا ایک واحد مقصد صحیح وقت بتانے میں مدد دینا ہے - مگر جب ان میں سے ایک پرزہ بھی اپنے

معینہ فرائض کی انجام دہی میں تساہل کریگا تو اسُ کا اثر گھڑی کے سارے نظام پر فوراً ہی پڑیگا اور وہ کبھی صحیح وقت بتانے کے قابل باقی نہ رہیگی۔ کوئی واحد متنفس محض اپنی واحد قوت کے بل پر گھر کا نظام برقرار نہیں رکھ سکتا جیسا نظام کہ ایک کامیاب گھر کا ہونا چاہیئے۔ مگر پھر بھی ایک پُر حلاوت روح اپنی روح پرور مہک سے سارے گھر میں محبت کی خوشبو پھیلا کر سارے گھر کو مخمور اور سرشار بنا سکتی ہے۔ چاہے اسُ گھر کے اندر ایسے افراد بھی یکجا ہو گئے ہوں جن میں سے بعض دوسرے سے خلش یا پرخاش رکھتے ہوں۔ دیکھو کانٹے دار جھاڑیوں کے اندر ایک خوشبودار پھول کھلا ہوا ہے۔ مگر ان ہزاروں کانٹوں میں سے ایک بھی اس پھول کی مہک کے لئے سدِ راہ نہیں بن سکتا۔ ذاتی اغراض کی آلائشات سے پاک۔ بے لوث اور شریفانہ جذبات میں ڈوبا ہوا ایک متنفس اپنی مسلسل کوششوں سے آہستہ آہستہ مختلف افراد کے دلوں سے کدورت۔ خشونت اور ایک دوسرے کے ساتھ ناگوار برتاؤ کرنے کی عادات دُور کر کے تمام افراد کو خلوص اور محبت کے رنگ میں رنگ سکتا ہے۔ لیکن باوجود اسکے پھر بھی یہ بات بالکل سچ ہے کہ محض ایک ہی واحد متنفس وہ تمام مدارج طے نہیں کر سکتا جو ہر ہر متنفس کو فرداً فرداً اپنے فرائض کے مخصوص حصہ کے طور پر ادا کرنا پڑیگا۔ اسلئے یہ امر لازمی اور لابدی ہے کہ گھر کے مختلف افراد میں سے ہر ہر متنفس اپنے اپنے جُداگانہ فرائض کا احساس پیدا کرے اور اُن کی انجام دہی میں مصروف ہو۔ ان اہم فرائض میں شوہر کا حصہ بالخصوص شوہر ہی کے لئے مخصوص ہے اور اس حصہ کی انجام دہی اسُ کے سوا کسی اور سے غیر ممکن ہے۔ اسی طرح بیوی کے فرائض ہیں۔ پھر لڑکوں کے اسُ کے بعد بھائی بہنوں کے۔ القصہ گھر کا ہر ہر متنفس اپنا حصہ دوسروں

سے بالکل ہی علیحدہ رکھتا ہے۔ اُسے اس امر کا احساس ہونا چاہیئے اور اپنے اہم فرائض کو اچھی طرح ذہن نشین کرکے میدانِ عمل میں قدم رکھنا چاہیئے۔ جس طرح پانو یا ہارمونیم کے مختلف سروں کے پردے سب باہم ہم آہنگ ہو کر ایک دلکش سریلی لے پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح کسی کامل فن مصور کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر کے مختلف رنگ آپس میں مل جل کر ایک پیکر دلربا پیدا کرتے ہیں جسے سُن اور دیکھ کر ہمیں مجبوراً خراجِ تحسین ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح کسی انجن کے مختلف پرزے ملکر ایک قوت یا حرکت پیدا کردیتے ہیں بالکل اسی طریق پر ایک خاندان کے مختلف افراد اپنے اپنے جداگانہ فرائض اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرکے پاک نفسی اور شرافت سے جب انہیں انجام دینا شروع کردیتے ہیں تو سارے گھر پر برکت نازل ہوتی ہے اور نور برسنے لگتا ہے۔

(باقی آیندہ)

مترجم

شادی کی ضرورت

دو صاحبزادیوں اور ایک فرزند کی شادی کی ضرورت ہے جو صورت و سیرت میں نیک اور خواندہ ہیں۔ اُن کے والدین کی آمدنی چھ سو روپیہ ماہوار سے زاید ہے۔ شریف خاندان و شیعہ مذہب ہیں (شرایط) لڑکا کنوارا اور انگریزی داں ہو۔ لڑکیاں صورت دار اور سلیقہ شعار ہوں۔ والدین خوش حال و عہدہ دار ہوں۔ خط و کتابت اس پتہ سے ہونا چاہیئے۔

ایڈیٹر رسالہ "پیام امید"

محمود آباد۔ سیتا پور (اودھ)

مجوزہ سلطانیہ کالج

مئی کی اشاعت میں "لیڈیز کانفرنس" والے مضمون میں ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ آیندہ نمبر میں کانفرنس کی روئداد پر ہم اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔ مگر ہمدم کی اشاعت مورخہ ۲۱ مئی پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ اس اشاعت کے ذریعہ سے مجوزہ "سلطانیہ کالج" کی اسکیم شائع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے متعلق جو خیالات ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں قریب قریب وہی ہیں جو لیڈیز کانفرنس کے متعلق ہم شائع کرتے۔

یہ اسکیم حضرات ذیل کے دستخط سے شائع ہوئی ہے۔ نواب زادہ میجر حاجی محمد حمید اللہ خانصاحب بی۔ اے۔ بھوپال۔ مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے ڈایریکٹر تعلیمات بھوپال۔ حاذق الملک حکیم حاجی محمد اجمل خاں صاحب دہلی۔ مسٹر محمد نسیم ایڈووکیٹ لکھنؤ۔ نواب عماد الدولہ عماد الملک مولوی سید حسن صاحب بلگرامی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ علی یار خانصاحب بہادر موتمن جنگ حیدرآباد دکن۔ ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا مراد آباد۔ آنریبل سید علی امام صاحب۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی بیرسٹرایٹ لا۔ بانکی پور۔

جن بزرگان قوم کے دستخط اس شاندار پروگرام پر ثبت ہیں وہی اسمار گرامی اس اسکیم کے ایک صائب اسکیم ہونے کی کافی ضمانت ہو سکتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ ایک اہم قومی معاملہ ہے اور اس اسکیم کی اشاعت ایک موقر روزانہ اخبار کے ذریعہ سے ہوئی ہے لہذا امید ہے کہ عاجزہ کو بھی ایک موقعہ اپنے پریشان خیالات ظاہر کرنیکا دیا جائیگا

اتنے اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ اور روشن خیال بزرگان قوم کے مقابلہ میں ایک جاہل بے بس پردہ نشین کی کمزور صدا کی کیا ہستی ہے۔ مگر جن بزرگوں کا اس اہم قومی کام سے تعلق ہے اُن کی رواداری۔ اخلاق اور کریم النفسی سے اُمید ہے کہ اگر انہیں فرصت مل سکے تو ان سطور کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ اسمیں اُن کا شاید کوئی نقصان نہ ہوگا۔

اس اسکیم کا سب سے پہلا یہ فقرہ ہے "یہ امر مسلم ہے کہ ہم مسلمانان ہندوستان کی ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی کا دارومدار محض تعلیم پر ہے۔ اور ہمارے سارے قومی اسقام و آلام کا علاج اشاعت و تعمیم تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "مسلمانان ہندوستان کی ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی کا دارومدار محض تعلیم ہی پر ہے" مگر نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گی کہ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا حل درکار ہے آپ "ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی" کا نام لیتے ہیں اور اس کا علاج "تعلیم" بتاتے ہیں۔ مگر "ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی" اُس "تعلیم" سے حاصل نہیں ہوسکتی ہے جیسی کہ رائج ہے۔ اور اس اعتبار سے کیونکر اُمید کیجا سکتی ہے کہ جس قسم کی تعلیم سے جو باتیں کم وبیش ایک صدی کے تجربہ سے حاصل نہیں ہوسکتی ہیں۔ - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - اُس قسم کی تعلیم سے اب وہی باتیں حاصل ہو جائینگی؟

"ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی" سے آپ کا کیا مفہوم ہے؟ یورپ اور امریکہ کی سرزمین میں ان الفاظ سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا کہ اس تعلیم سے ملک اصلی معنوں میں ترقی کریگا۔ ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہوگا۔ اور جس طرح اور مہذب ملکوں میں آئے دن نت نئی کلیں نئی نئی مشینیں ایجاد ہوا کرتی ہیں وہی بات یہاں بھی

نظر آنے لگیگی۔کیونکہ "ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی" کا اس کے سوا اور کیا مفہوم ہوسکتا ہے۔ لیکن آپ کی اسکیم ایسے شیریں ثمرات سے بارور ہونے والی ہے تو کس بنا پر اس دعوے کی صحت تسلیم کرلیجائے۔ جب حال یہ ہے کہ جس قسم کی تعلیم دینے کا ارادہ کیا گیا ہے وہ کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ وہی تعلیم ہے جو انگریزی عملداری میں ایک صدی سے رائج ہے۔ مگر اس ایک صدی کے اندر جو ہزاروں گریجوئیٹ موجودہ درسگاہوں سے نکل چکے ہیں ان میں سے ایک نے بھی اب تک دنیا کی تمدنی اور معاشرتی ترقی میں کوئی درجہ نہیں لیا ہے۔ اب کس بنا پر امید کیجا سکتی ہے اسی تخم سے وہ ثمرات پیدا ہوں گے جو آجتک گذشتہ سو برس کے عرصہ میں کبھی نہیں پیدا ہوئے! اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر "ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی" کا نام لینا ہی فضول ہے۔ جب حال یہ ہے کہ باوجود پوری ایک صدی تعلیم پانے کے بھی ہمارے بچے ایک سوئی ایک پن ایک بٹن کے لئے دنیا کی ہنرمند قوموں کے ذخیرہ مشقت کی ذکوٰۃ کے محتاج ہیں۔ جب حال یہ ہے کہ اے اے داور اختراع تو درکنار ہم اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اب سے دس بیس پچاس برس پہلے کی ایجاد کردہ کلوں اور مشینوں کی نقل اپنے ملک کے اندر تیار کرسکیں۔ اگر ہم لوہے کی گھڑی لوہے کی بائسکل۔ لوہے کی ٹائپ رائٹر۔ لوہے کا گراموفون نہیں بنا سکتے تو اسکی بھدی سی لکڑی ہی کی بنا کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوسکیں۔ جب یہ صورت ہے تب ہمارا یہ دعویٰ کرنا کہ ہماری رائج الوقت تعلیم "تعلیم ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی ترقی" کا پیش خیمہ ہے۔ جس حد تک صحیح ہوسکتا ہے جہاں ظاہر ہے اور یہ کہنا کہ اس تعلیم سے گذشتہ سو برس کے اندر جو بات کبھی خواب و خیال میں بھی

نظر نہ آسکی اب وقوع میں آئیگی جس حدتک درست ہوسکتا ہے۔ موجودہ طرز تعلیم نے آجتک نہ ہمیں کوئی ایسا بلند پایہ انجنیر۔ فلسفی۔ شاعر۔ مورخ وغیرہ وغیرہ دیا ہے جس کی زندہ مثال مہذب دُنیا کے سامنے پیش کرکے ہم اپنا شمار دُنیا کی زندہ قوموں میں کراسکیں اور نہ ہمارے کسی فرزند قوم نے علم سائینس یا کسی دوسرے علمی شعبہ میں اتنا کمال حاصل کیا ہے جو مہذب ملکوں کے بلند پایہ افراد کی صف میں ملکر دوش بدوش ایستادہ ہوسکے انسائیکلوپیڈیا بڑٹینکا کے اوراق ہندی مسلمان اہل کمال کے ناموں کی فہرست سے بالکل خالی ہیں۔ یہ ہے نتیجہ ہمارے بچوّں کی صد سالہ انگریزی تعلیم کا۔

موجودہ اسکیم صاحب الفاظ میں علیگڈھ کالج کو ایک مکمل نمونہ تسلیم کرکے اسکی تقلید پر کمربستہ ہے۔ اور اس سے معنوی الحاق رکھ کر اسی کا تتبع کرنا چاہتی ہے مگر تجربہ نے صاف صاف روز روشن کی روشنی میں بتلادیا ہے کہ موجودہ روش کی تعلیم نہ صرف ہماری "تمدنی اور معاشرتی ترقی" کے لئے ناکافی ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو شائد ہماری اس ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

آگے چلکر ارشاد ہوا ہے کہ "اب مذہبی تعلیم اخلاقی تعلیم کے لئے لازمی سمجھی گئی ہے"

اس میں شک نہیں کہ مذہبی تعلیم ہمارے بچوّں کی تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم حصہ ہے۔ مگر جس طریق پر مذہبی تعلیم ابتک کسی اسلامی کالج میں ہوئی ہے یا ہوچکی ہے اسکے تجربہ سے ہم بلاخوف تردید صاف صاف عرض کرسکتے ہیں کہ یہ تعلیم بالکل ناکافی ہے۔ اور اس کا بہت ہی کم اثر ہمارے بچوں کے عادات اطوار اور اخلاق پر پڑرہا ہے جسے اہل نظر اچھی طرح دیکھ رہے ہیں اور دیکھ دیکھ کر رورہے ہیں

اس میں شک نہیں کہ ہمیں ایک غیر متعصب مذہبی تعلیم درکار ہے۔ نہ ایسی تعلیم جو ہمارے انسان صورت بچوں کو بہائم سیرت بنا دے کہ اُن کے عقائد سے مخالفت رکھنے والا جب کبھی سامنے نظر آجائے تو اُسے اپنے سینگوں پر اُٹھا کے پٹک دینے کے سوا اُن سے کچھ نہ ہوسکے اور نہ برعکس اس کے ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے جو "تعلیم مذہبی" کے عنوان کی خانہ پُری سے زیادہ وقعت نہ رکھتی ہو۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے بچے اسلامی عقائد اسلامی رواج اسلامی روایات کی صاف فرح بخش اور روح پرور ہواؤں میں بڑھیں اور نشو ونما پائیں۔ اُن کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا گہرا نقش ڈالا جائے۔ وہ سمجھیں جانیں اور صاف صاف دیکھ سکیں کہ وہ کون ہیں۔ ملت بیضا کی روشنی سے اُن کی چشم بینا منور ہو۔ اسلام کی حرمت اللہ و رسول کی محبت سے اُن کے دل و دماغ منور ہوں۔ سچے مسلمان پکے دیندار ہوں۔ اور مسلمانان قرون اولیٰ کے نمونوں کو پیش نظر رکھ کر دنیا میں قدم رکھیں۔ اگر مذہبی تعلیم یہ باتیں پیدا کر سکتی ہے تو ایسی تعلیم بیشک ہزار رحمتوں کی ایک رحمت بن سکتی ہے۔ اور برخلاف اس کے اگر وہ تعلیم محض سطحی تعلیم ہے تو ایسی تعلیم پر روپیہ پھونکنا ایک فعل عبث ہے۔ اس تعلیم نے نہ آج سے پہلے ہمیں کوئی مفید نتیجہ دکھایا ہے اور نہ اب دکھا سکتی ہے۔ یہی تعلیم ہے جسے پاکر ہمارے بچے خلیق بامروت حیادار بہادر۔ صادق الاقرار۔ وفادار۔ فیاض۔ منکسر المزاج۔ رحیم اور خدا ترس بن سکتے ہیں۔ اور قوم اور ملک اور سلطنت کے لئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں۔ نہ کہ ایسی "تعلیم" سے جس پر قوم کا روپیہ اور اُن کا وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے بچوں کی موجودہ طرز تعلیم میں بعض بہت ہی بڑے بڑے اور اہم نقائص ہیں۔ "سلطانیہ کالج" اگر ان نقائص پر توجہ کر کے اُن کے دفعیہ کی کوشش

کرے گا تو حقیقت میں اس کی تاریخ میں یہ کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل سمجھے جائیں گے۔

مثلاً موجودہ طرز تعلیم کا ایک بہت ہی بڑا عیب یہ ہے کہ ہمارے بچے مغرور۔ خود سر۔ خود غرض۔ مطلب آشنا۔ نمائش پسند۔ اور زیادہ تر آرام طلب بنجاتے ہیں۔ نہ ان میں عزیزوں کی محبت باقی رہتی ہے۔ نہ بڑوں کا ادب کرتے ہیں۔ نہ چھوٹوں سے پیار اور اخلاص رکھ سکتے ہیں۔ کاہلی انہیں تن آسانی پر مائل کر دیتی ہے۔ فیشن کی تقلید انہیں فضول خرچ بنا دیتی ہے۔

وہ کالج اور اسکولوں میں محض اسی غرض سے جاتے ہیں کہ امتحان پاس کریں اور محض اتنے ہی معلومات پر بس کرتے ہیں جن کا بہم پہنچانا امتحان پاس کرلینے کیلئے ضروری ہے اور محض موجودہ طرز تعلیم ان کے دلوں میں حصول علم کا کوئی حقیقی شوق پیدا نہیں کرتا۔ کوئی علم کی پیاس نہیں پیدا کرسکتا۔ جس کے بجھانے میں وہ کسی دراز مدت تک مصروف رہ سکیں۔ وہ امتحان پاس کرکے گھر آتے ہیں۔ کتاب طاق نسیاں پر رکھکر بھول جاتے ہیں اور وہ دیمک کے نذر ہو جاتی ہے۔ کالج میں جو کچھ تھوڑا بہت سیکھ کے آئے تھے دو چار دس برس بعد رفتہ رفتہ دماغ سے نکلتے نکلتے آخر کار اس کا ایک مبہم سا نشان باقی رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں۔

ہم اوپر عرض کرچکے ہیں کہ مذہبی تعلیم جب تک اپنے صحیح مرکز ثقل پر نہ قائم کیجائے وہ ہمیشہ بے نتیجہ رہیگی۔ اور ایسی ناقص مذہبی تعلیم کا یہ ثمرہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ مذہب کے معاملہ میں جتنے لاپرواہ اور ڈہل مل یقین مسلمان بچے ملیں گے کسی دوسری قوم کے بچے نظر نہ آئیں گے۔ کیا ہم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے

کہ آخر یہ بات کیا ہے۔ ہمارا مقدس مذہب سارے دُنیا کے مذاہب کے مقابلہ میں بہترین
مذہب ہے۔ مگر کیا یہ بات ہمارے لئے شرمناک نہیں ہے کہ اور قوموں کے بچّے تو
جتنی زیادہ انگریزی پڑھیں اتنے ہی زیادہ اپنے مقدس مذہب کے احترام میں ہم سے آگے
آگے نظر آیئں اور برعکس اس کے ہمارے بچے چار حرف انگریزی پڑھتے ہی جہاں انہوں
نے ٹوں ٹاں کرنا شروع کیا وہاں اُن کی "آزادانہ روشن خیالی" نے اپنے وحشیانہ
ہاتھہ پاؤں پھیلانا شروع کردیئے۔ کیا یہ بات ہمارے لئے باعث شرم نہیں ہے کہ
ایک طرف تو ظلمت آباد لندن اسلام کی نورانی شعاعوں کی دُھندلی سی جھلک دیکھ
کر روشنی کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے اور دوسری طرف ہمارے اپنے بچّے جو اسلام
ہی کے گہوارے میں پلے اور بڑھے ہیں وہ اس نور سے بھاگ بھاگ کر ریشنلزم
(RATIONALISM.) اور میٹیریلزم (MATERIALISM.)
کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں ایک جگنو کی چمک کو شعاعِ نور سمجھکر اُسی کے پیچھے برہنہ پا ہانپتے
کانپتے دوڑے چلے جارہے ہیں! اوپر کی مثالیں جو حقیقت میں مشتے نمونہ از خروارے
ہیں غالباً ہمارا مقصد ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوسکیں گی۔ ان مثالوں کی روشنی میں صاف
صاف نظر آئیگا کہ علیگڈھ کالج کو اسلامی طرز تعلیم کا ایک مکمل نمونہ قرار دینا کس حد تک
صحیح قرار پا سکتا ہے۔ اور اُس "مکمل نمونہ" کی تقلید سے ہمیں کیا کیا ثمرات ملنے کی امید ہوسکتی
ہے۔ اگر مجوزہ سلطانیہ کالج بجائے اس "مکمل نمونہ" کے چربہ اُڑانے کے ایسی روش اختیار
کرسکتا ہے جس سے ان خامیوں کا علاج ہوسکے تو وہ ایک اہم ترین مقصد پورا کرسکیگا
اور کیسا اچھا ہو اگر بانیاں کالج افتتاح کالج سے قبل ان نکات پر بھی اچھی طرح غور فرمائیں
اوپر کے معروضات سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ اگر ہمیں پورنی ردٹی میسر نہیں

آسکتی ہے تو ہم آدھی روٹی لینے سے بھی دست بردار ہو جائیں۔ میرا مدعا محض اسیقدر ہے کہ سلطانیہ کالج کا پروگرام منضبط کرنے سے پہلے ہمیں اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے کہ ہمارے موجودہ طرز تعلیم میں کیا کیا خامیاں کیا کیا نقائص ہیں۔ اور تا حد امکان اپنی پوری کوشش کرنا چاہیئے کہ جہانتک ہمارے امکان میں ہے سلطانیہ کالج کی تعلیم ان خامیوں کا خاطر خواہ علاج کرسکے۔ میری رائے ناقص میں کسی موجودہ کالج کو ایک مکمل نمونہ فرض کرکے بے سوچے سمجھے آنکھ بند کرکے اس کی تقلید پر کمربستہ ہو جانا ایک ایسی شدید۔ ایسی فاش اور ایسی ناقابل معافی غلطی ہوگی جس کا علاج ہونا ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہوگا۔ اور ہمیں ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

یہاں تک تو ہم نے ان امور پر بانیان کالج کی توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھی ہے جن کی ہماری رائے ناقص میں شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اب ہم اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے جن کے متعلق بانیان مجوزہ کالج بلاشبہ قابل مبارکباد ہیں اور جن کے متعلق ہمارے نزدیک قوم کو بلا استثنا ہر طرح اتفاق رائے کرنا چاہیئے۔

کفایت شعاری اور ایثار دو بہت ہی زبردست پہلو اس تجویز کے ہیں اور ان کی تعریف میں جو کچھ کہا جائے کم ہے۔ مجوزہ سلطانیہ کالج مسٹر گوکھلے (یا دش بخیر) کے انجمن خدام ہند کا مثنی تیار کر رہا ہے۔ اگر وہ اس قابل عزت تحریک میں کامیاب ہو گیا تو ہم ہندی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک طلائی ورق کا اضافہ ہو جائیگا۔ یہ کام بیشک ہے کرنے ہی کے قابل اور ہزار بار ہزار رحمت ہو ان حضرات پر جو اس تحریک کے بانی محرک اور موید ہیں۔ ہمارے بچے اعلیٰ تعلیم پر اگر نازاں ہیں۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ اُن کے دل و دماغ بھی اسی اعلیٰ جوہر سے منور ہیں تو یہی وقت ہے کہ آگے آئیں

یہی وقت امتحان کا ہے۔ ایسا ایثار قومی عروج اور قومی ترقی کی بنا ہے اور اگر بانیان کالج کو سارے ہندوستان میں ایک درجن مسلمان بھی ایسے مل گئے جیسے ہمیں درکار ہیں تو ہم یقین کرلیں گے کہ ہمارے ادبار کے دن دور گئے اور اب ہم بھی اس قابل ہوگئے ہیں کہ دنیا میں کچھ کریں۔ کچھ کرکے دکھائیں۔ کفایت شعاری کا مسئلہ اسی ایثار کا ضمیمہ ہے۔ جب ہمیں ایسے خودفراموش افراد میسر آجائیں گے تب ہی کفایت ممکن ہے بلکہ اور ایسے بیش بہا نادرالوجود افراد کی زندہ مثال نہ صرف ایک کفایت شعاری ہی بلکہ ہزاراں ہزار خوبیوں اور جوہروں کا روشن سبق ہوگی۔

ہماری رائے ناقص میں مجوزہ سلطانیہ کالج کے لئے علیگڈھ ہی کا مقام تجویز کرنا ایک شدید ترین اور ناقابل تلافی غلطی ہوگی۔ وجوہ صاف ظاہر ہیں اور محتاج تشریح نہیں۔

آزاد بیگم

اردو انسائیکلوپیڈیا

اس مبحث پر ایک نہایت ہی پرمغز مدلل اور قابل وقعت مضمون آزاد صاحب کے دوست جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے۔ نے رسالہ "گلچین" میں شائع کرایا ہے۔ میں عموماً کسی اخبار یا رسالہ سے مضمون نقل کرنا پسند نہیں کرتی۔ مگر مجبور ہوں کہ اس اہم اور ضروری مبحث پر یہ بیش بہا مضمون چھوڑ نہیں سکتی۔ ناظرین کرام ذیل کا مضمون دس پانچ بار بغور ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ایک نہایت ہی اہم قومی مسئلہ ہے - اور اس کے متعلق صاف صحیح اور قطعی فیصلہ کی ضرورت ہے -

ایڈیٹر

اردو انسکلو پیڈیا کے مباحث اکثر اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اور جس وسیع پیمانے پر اس کام کی انجام دہی کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے وہ تاریخ اردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتی - لیکن مجوزین نے شاید اس کے ہر پہلو پر کافی غور نہیں کیا ہے ورنہ ایک ایسی تجویز جس کے لئے پانچ چھ لاکھ روپئے کا صرف بتایا جاتا ہے اور جس میں صدہا لکھنے والے شریک ہوں گے وہ اس طرح یکایک قطعی صورت میں ملک کے سامنے نہ پیش کر دی جاتی اسلئے کہ

(۱) یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جسمیں صلاح و مشورے سے وقتاً فوقتاً تدریجی ترقی ہو سکے - بلکہ جو کچھ ہوگا وہ ایک انقطاعی صورت میں ہوگا - اس لئے اور بھی زیادہ ضرورت تھی کہ قطعی تجویز شائع ہونے کے قبل اس کا خاکہ مشورۃً شایع کیا جاتا اور ملک کی رائے معلوم کرنے کے بعد آخری فیصلہ کیا جاتا -

(۲) جب کوئی تجویز قطعی طور پر قرار پا جاتی ہے تو پھر اس پر اظہار رائے اور تنقید کا وہ فائدہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے تنقیداً جو کچھ کہا جاتا ہے خواہ کیسی ہی نیک نیتی سے کہا جائے مجوزین علی العموم اسے اپنی مخالفت تصور کرتے ہیں اور اختلاف رائے و مخالفت میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے اور بحث ذاتیات پر آجاتی ہے اور پھر ایسی رائے سے بدیں عذر لاپرواہی برتی جاتی ہے کہ بڑے کاموں کی ہمیشہ مخالفت ہی ہوا کی ہے

مخالفت کے دلائل کیسے ہی قوی ہوں بات کا نباہنا لازم آجاتا ہے۔

پس دانستہ یا نادانستہ اس معاملے میں اول فروگذاشت یہ ہوئی کہ ایک بڑی تحریک ایسے عاجلانہ طریق پر پیش کردی گئی کہ کسی کو رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اس سے بڑی غلطی یہ ہوگی کہ چونکہ تحریک پیش ہوچکی ہے اس لئے اب اس کے حسن و قبح پر غور نہ کیا جائے۔ جن اصحاب کی مالی و علمی شرکت کا اس وقت تک اظہار ہوچکا ہے ان کی نسبت میرا یقین ہے کہ اس تجویز پر تنقیداً جو کچھ کہا جائیگا وہ اس کی حیثیت و صورت پر غور کریں گے اور بشرط ضرورت اپنی رائے میں ترمیم کو جائز رکھیں گے۔ اسی اعتماد کے بھروسے پر **انسکلوپیڈیا** کی تدوین کے متعلق میں سردست چند اجمالی خیالات عرض کرتا ہوں۔ اور اگر مجوزین نے اس پر توجہ فرمائی تو تفصیلی خیالات کا بھی اظہار کرونگا

انسکلوپیڈیا کی ضرورت۔ مثل تمام دیگر اشیا کے اس ضرورت پر بھی دو طریق سے نظر پڑتی ہے۔ تجریدی و تعلیقی۔ تمام تعلقات و مؤثرات کو علیحدہ کرکے مجرداً خیال کیا جائے تو کسی معمولی کتاب کا بھی کسی زبان میں اضافہ ہوجانا مفید ہی تصور ہوسکتا ہے، مضر نہیں خیال کیا جاسکتا چہ جائیکہ انسکلوپیڈیا جیسی جامع تصنیف اردو جیسی بے مایہ زبان میں آجائے۔ لیکن جب دوسرے تعلقات کو ملحوظ رکھکر غور کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ اردو میں ابھی مدت تک ایسی وسیع انسکلوپیڈیا کی تصنیف کی مطلقاً ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے اول یہ دیکھنا ہے کہ انسکلوپیڈیا کا موضوع و غایت کیا ہے؟ اور بحالات موجودہ ہم اس غایت سے مستفید ہوسکتے ہیں یا نہیں۔

انسکلوپیڈیا کا موضوع۔ اردو انسکلوپیڈیا کی تصنیف کے لئے

انگریزی کی جن تین انسکلو پیڈیاؤں پر انحصار کیا گیا ہے۔ ان میں سے انسکلو پیڈیا برٹینیکا نے اس لفظ کی تعریف علیحدہ نہیں کی ہے، صرف ضمناً یہ لکھا ہے کہ ایک کتاب ہے جو تمام اصناف علوم سے بحث کرے" پاپولر انسکلو پیڈیا نے کیقدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ابتداءً اس کا مفہوم وہ تمام شعبہائے علوم تھے جنکا جاننا قدماء کے نزدیک لبرل ایجوکیشن (تشحیذ ذہن) کے لئے ضروری تھا۔ زمانۂ مابعد میں اسکا استعمال ہر منضبط ترتیب علوم پر ہونے لگا۔ خواہ وہ جملہ معمولات انسانی پر حاوی ہوں یا اس کے خاص حصّوں پر محدود ہوں۔ اس عام تدوین کی ضرورت کا احساس بہت جلد ہونے لگا تھا اور جس جس قدر معلومات میں ترقی ہوتی گئی یہ ضرورت بہی زیادہ محسوس ہوتی گئی۔ کچھ اس وجہ سے کہ مختلف علوم منضبط ترتیب میں اپنے فطری تعلقات کے لحاظ سے ہوں اور کچھ اس وجہ سے کہ خاص مکاتب کا جلد تر پتہ چل جائے اور انھیں دو وجوں سے اس قسم کی تصانیف کی ترتیب کبھی فلسفیانہ طریق سے ہوتی ہے اور کبھی حروف تہجّی کے اعتبار سے۔

چیمبرس انسکلو پیڈیا نے سب سے زیادہ واضح طریق پر بحث کی ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ فی زماننا انسکلو پیڈیا سے وہ تصنیف مراد ہے جس کے معلومات یا تمام علوم انسانی پر حاوی ہوں یا اس کے کسی خاص علمی یا امتیازی تقسیم کے جملہ جزئیات پر محیط ہوں لازماً علوم کی وسعت و قدر کے متعلق ہمارے تغیّرِ خیال اور خود علوم کے فیمابین تعلقات کے تبدلات سے اس قسم کی تصانیف کی نوعیت بہی تغیر پذیر ہوتی رہی ہے؛ اسلئے کوئی انسکلو پیڈیا اپنے زمانہ کے مذاق علمی سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ زمانۂ وسطیٰ کی انسکلو پیڈیا اپنے تقسیم مضامین و حدّ نظر میں ویسی ہی متوسط ہوگی جیسی انتخاب و اظہار

واقعات ہیں"

ان بیانات سے واضح ہو گیا کہ

(۱) انسکلوپیڈیا یا جملہ علوم کی جامع ہوتی ہے یا کسی خاص علم کے جملہ جزئیات پر حاوی ہوتی ہے۔

(۲) انسکلوپیڈیا اپنے زمانے کے تمام مذاق علمی کی سطح سے بلند نہیں ہو سکتی

(۳) انسکلوپیڈیا جدید انکشافات کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ انہیں مباحث کی ایک مرتب صورت ہوتی ہے جو فی الوقت موجود و مروج ہوتے ہیں۔

جو بیانات انسکلوپیڈیا اردو کی نسبت اب تک شائع ہوئے ہیں ان سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس انسکلوپیڈیا کی تقسیم علوم کے اعتبار سے نہیں ہو گی اور میں اسے بہت بڑی دانشمندی سمجھتا ہوں کہ مجوزین نے اس پُرخار روش کو نہیں اختیار کیا۔ کیونکہ خود یورپ میں یہ طریقہ متواتر ناکامیاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ پینکوک کی کوشش اس ترتیب میں ایکسو چھیاسٹھ جلدوں تک جا کر بھی ناتمام رہی (عربی میں اس طرز کو ضرور غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن اوّل تو عربی کی تصانیف جو اس مقصد کی معاون ہو سکتی ہیں وہ انسکلوپیڈیا کا مفہوم پورا نہیں کرتے ہیں بلکہ فی حد ذاتہا علیحدہ علیحدہ علم ہیں اور دوسرے یہ کہ عربی و انگریزی کی بنائے تقسیم علوم میں بہت ہی نازک فرق ہے جو تفصیلی مباحث پر بڑا اثر رکھتا ہے) بہر حال مجوزہ انسکلوپیڈیا کی تقسیم علوم کے اعتبار سے نہیں ہو گی۔ بلکہ وہ جملہ علوم کی جامع بہ ترتیب حروف تہجی ہو گی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ انسکلوپیڈیا اپنے زمانے (یعنی اردو) کے عام مذاق علمی کی سطح پہ ہو گی یا اس سے بلند ہو گی یعنی

(۱) یہ علوم خود اردو کے موجودہ لٹریچر سے اخذ کئے جائیں گے ۔ یا

(۲) انگریزی علوم ترجمہ ہوکر انسکلوپیڈیا میں شامل کئے جائیں گے ۔

بہ صورت اول نہ اس قدر کثیر سرمایے کی ضرورت ہے اور نہ کارکن جماعت میں صدہا اشخاص کے شمول کی حاجت ۔ چند اشخاص تھوڑے صرف سے اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں لیکن مجوزین کی یہ غرض نہیں ہے ۔ وہ اس انسکلوپیڈیا کو نہ صرف یوروپ کے انتہائی مدارج ترقی کی حد پر لانا چاہتے ہیں بلکہ مشرقیات کے متعلق تحقیقات یوروپ پر کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر وہ اس انسکلوپیڈیا کو اپنے زمانے کے مذاق علمی سے نہ صرف بلند بلکہ بے انتہا بلند کر دینا چاہتے ہیں اور یہ امر موضوع انسکلوپیڈیا کے منافی ہے ۔

یہیں سے یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ اتنے صرف سے اس طرز کی کوشش اردو کے لئے سودمند بھی ہے یا نہیں ؟ اسکا صحیح فیصلہ اس امر کے یقین پر منحصر ہے کہ انسکلوپیڈیا کی غرض و **غایت** ہر زبان و زمان میں کیا رہی ہے ؟ (۱) آیا انسکلوپیڈیا مثل لغت و فرہنگ کے حوالجات کی ایک کتاب ہے یا (۲) اس سے مقصود جدید علوم کی اشاعت و تعلیم ہے ۔ میں نے جہانتک غور کیا ہے کوئی ایسی نظیر مجھے نہ ملی کہ کسی انسکلوپیڈیا کی غرض "اشاعت علوم و تعلیم" رہی ہو ۔ بلکہ پلینی کی انسکلوپیڈیا سے لیکر اس وقت تک جتنی انسکلوپیڈیاؤں کے حالات معلوم ہوسکے وہ ایک ہی واحد غرض سے لکھی گئی ہیں یعنی جب علوم و فنون کی اتنی کثرت ہوئی کہ ان سب پر نظر کرنا دشوار ہوگیا ۔ تو انکے ایجاد و احصا کی ضرورت پیش آئی ۔ جیسا کہ خود چیمبرس انسکلوپیڈیا نے لکھا ہے کہ علوم میں جسقدر ترقی ہوتی گئی اسیقدر یہ زیادہ ضروری ہوتا گیا کہ ہر شئے کے متعلق قدر قلیل (یا وہ قدر قلیل اسکا اہم ترین جزو) کہنے کے لئے کسی ایک شئے پر تمام و کمال بحث

کرنے سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ ہر جدید اردو کے بعد جو اہم ترین انسکلوپیڈیا ئیں لکھی گئی ہیں وہ خود اسکی شاہد ہیں میں بہت ہی مختصر لفظوں میں ان کا ذکر کرتا ہوں۔

(۱) سب سے قدیمی انسکلوپیڈیا پلینی کی انسکلوپیڈیا ہے جو ہسٹر دیا نیچر س کے نام سے اول صدی عیسوی میں روم کے زمانہ دوم میں تیار ہوئی تھی۔

(۲) علوم اسلامی جب مدارج کمال کو پہنچ گئے تو دسویں صدی عیسوی میں فارابی نے احصار العلوم کے نام سے علوم اسلامی کی انسکلوپیڈیا تیار کی جو اس وقت اسکیوال (اسپین) میں موجود ہے۔

نوٹ

(میرے خیال میں دائرۃ المعارف سے انسکلوپیڈیا کا صحیح مفہوم ہرگز ظاہر نہیں ہوتا۔ محیط العلوم اس سے بہتر ہے مگر احصار العلوم ایسا جامع و مانع لفظ ہے کہ اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا۔)

(۳) یورپ کے زمانہ وسطےٰ کے تیرہویں صدی میں ونسنٹ نے اپنی ان تھک کوششوں سے ایک انسکلوپیڈیا (تاریخ۔ طبیعیات و دینیات کی) تین حصوں میں مرتب کی اور اس کے بعد مختلف وقتوں میں یورپ میں اور تصانیف بھی اسی انداز پر ہوتی رہیں۔

(۴) دورِ جدید ۱۶۲۰ء میں اوّل بار موجودہ مفہوم میں آلسٹڈ کی انسکلوپیڈیا شائع ہوئی اور یہی جدید طرز کی انسکلوپیڈیاؤں کی بنیاد ہے۔

(۵) انگریزی زبان میں (الف) سب سے اوّل انسکلوپیڈیا لکسیکن ٹکنیکم (فرہنگ علوم و فنون) کے نام سے ۱۷۰۴ء میں ایک جلد میں شائع ہوئی ۱۷۱۰ء میں ایک اور جلد کا اضافہ ہوا۔ بعدازاں (ب) ۱۷۲۸ء میں چیمبرس کی انسکلوپیڈیا دو جلدوں میں

مکمل ہوئی اور (ج) ۱۹۶۸ء و ۱۹۷۱ء کے درمیان انسکلوپیڈیا برٹینکا تین[۳] جلدوں میں شائع ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں اگر اسکا دسواں اڈیشن چونتیس جلدوں میں پورا ہوا اور پھر ٹامس نے اسے از سر نو مرتب کرکے اٹھائیس جلدوں میں شائع کیا۔

ان بیانات سے سرسری نظر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اول صدی عیسوی میں انسکلوپیڈیا لکھی جائے اور مقبول ہو، دسویں صدی عیسوی میں اسلامی انسکلوپیڈیا تیار ہو، یورپ کے زمانۂ تاریک میں متعدد انسکلوپیڈیائیں شائع ہوں تو علوم و فنون کے اس روشن زمانہ میں اردو میں انسکلوپیڈیائیں کیوں نہ لکھی جائیں اور کیوں نہ مقبول ہوں۔ لیکن یہ مغالطہ ان کتابوں کی ماہیت و نوعیت پر غور نہ کرنے سے واقع ہوتا ہے۔ غائر نظر سے انکی ماہیت و نوعیت پر غور کیا جائے تو نتیجہ بالکل ہی بدل جاتا ہے۔ میں طویل استدلال میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مختصراً وہ کیفیت پیش کرتا ہوں جس سے ان کتابوں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو میں اس قسم کی انسکلوپیڈیا جس کا اعلان کیا گیا ہے، انسکلوپیڈیا کی غایت کو حاصل نہیں کرسکتی۔

(۱) جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے یونان میں لفظ "انسکلوپیڈیا" کا یہ مفہوم نہیں تھا جو آج ہم سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہاں اس سے مراد وہ نصاب تعلیم تھا جو ایک جامع شخص کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا۔

(۲) پلینی کی انسکلوپیڈیا علمائے اسکندریہ کے گراں بہا تصانیف سٹوبیس سڈاس اور کیپیلا کے مساعی اس دور کے انتہائی علمی عروج کی یادگاریں ہیں۔ پلینی کی اسکلوپیڈیا میں سو مصنفین کی کوشش اور چار سو چونسٹھ مصنفین کے حوالجات اور دو ہزار کتابوں کے اقتباسات شامل ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج اردو میں اس سے زیادہ کتب و مصنفین کے حوالے

دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اوّل تو اردو کے تصانیف اس پائے کی نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ روم کی ترقی اس زمانے کی انتہائے حد علمی تھی اردو ابھی اس سے بمراتب دور ہے۔ علاوہ ازیں سامان کتابت کی گرانی بلکہ نایابی، نقول کتب کی جان کادی، وسائل آمدورفت کی دشواری ایسے موانع ہیں جو ہمارے موجودہ دَور کے مقابلے میں اس زمانے کی کتابوں کی قدر وقیمت ہزارہا گونہ بڑھا دیتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یونان وروم واسکندریہ میں جو کچھ ہوا وہ اپنے ہی علوم کی حد کے اندر ہوا، انسکلوپیڈیا کے ذریعہ سے جدید علوم دیگر ممالک کے نہیں پیش کئے گئے۔ با ایں ہمہ بالفاظ دیگر پاپولر انسکلوپیڈیا، یہ کوشش صرف آئندہ کے لئے داغ بیل ڈالنے والی نہیں۔

(۳) اسلامی زمانے میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے مشرق میں بنی عباس۔ مغرب میں بنو امیہ وفاطمین نے علوم کو جس حد پر پہونچایا تھا اُسکا طبعی اقتضا یہ تھا کہ جب قلمی کتابوں کی تعداد کتبخانوں میں ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پُہنچ جائے۔ تو الفہرست، کشف الظنون، اخبار العیون، معجم البلدان، فتوح البلدان کے مثل کتابیں تیار کی جائیں، اور فارابی نے دسویں صدی میں جو کچھ کیا وہ اور قبل ہونا چاہئے تھا۔ یہی سب جگہ ہوا ہے اور یہی اُردو میں بھی ہونا چاہئے کہ اوّل علوم شائع کئے جائیں اور پھر اُن کی فرہنگ مرتب ہو۔

(۴) یہ کتابیں جسقدر بھی لکھی گئیں وہ اس معنی میں انسکلوپیڈیا کے مقصد کو پورا نہیں کرتیں جو آج ہم سمجھ رہے ہیں، غرض مشترک کے اعتبار سے وہ انسکلوپیڈیا کے تحت میں داخل کر لی گئی ہیں مگر بیشتر یہ کتابیں ڈکشنری ولکسیکن (لغت وفرہنگ) کے نام سے لکھی گئی ہیں اور مختلف علوم پر نئی علیحدہ علیحدہ جلدیں مخصوص کی گئی ہیں۔ لیکن اُردو

میں نہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ مجوزین کا یہ مقصود ہے۔

(۵) یورپ کی ازمنہ وسطیٰ کی علمی حالت اور اس زمانے میں متعدد انسکلوپیڈیاؤں کا لکھا جانا، موجودہ تحریک کے حق میں ایک قوی تائید ہو سکتی ہے۔ مگر خیال رکھنا چاہئے کہ یہ تمام تصانیف بیشتر لاطینی زبان میں ہوئی ہیں۔ جو اس زمانے میں یورپ کی مشترکہ زبان تھی اور تمام یوروپ میں جو علمی سرمایہ موجود تھا یہ انسکلوپیڈیائیں ان کا خلاصہ تھیں۔ بلکہ بعض تو محض نو مستقل کتابوں کا مجموعہ تھیں۔ السٹڈ کی انسکلوپیڈیا جو ۱۶۲۰ء میں شائع ہوئی اور جس نے موجودہ طرز کی بنا قائم کی وہ بھی لاطینی میں تھی۔ انگریزی زبان میں اول انسکلوپیڈیا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں شایع ہوئی جب انگریزی علوم کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا تھا اور انگریزی نہ صرف ملکی بلکہ تعلیمی زبان کے اعتبار سے مستحکم ہو چکی تھی۔ (فرانسیسی کا شمار اس معاملے میں انگریزی کے بھی بعد ہے)۔

(۶) جسقدر انسکلوپیڈیا بھی قدیم زمانے سے اس وقت تک شائع ہوئیں۔ وہ اپنی زبان کے علوم کے پہلو بہ پہلو رہیں۔ ان کی تعداد ایک سے سات جلدوں تک رہی۔ انگریزی کی پہلی انسکلوپیڈیا ایک ہی جلد میں شائع ہوئی تھی۔ انسکلوپیڈیا برٹینکا تقریباً ڈیڑھ صدی میں تین جلدوں سے اٹھائیس جلدوں تک پہنچی۔ برخلاف اس کے کہ اردو میں یہ چاہا جاتا ہے کہ ایک دم سے ایک بار گراں اس پر رکھدیا جائے۔ اس کی کوئی مثال کسی زمانے اور کسی ملک میں نہیں ملتی۔

(۷) یوروپ میں اور ممالک اسلامیہ میں جو انسکلوپیڈیائیں لکھی گئی وہ ایسے لوگوں کے لئے لکھی گئیں جن کے دسترس سے تفصیلی علوم (جن کے خلاصے انسکلوپیڈیا میں دیئے جاتے ہیں) باہر نہیں تھے مگر ہماری مجوزہ انسکلوپیڈیا اس اصول پر لکھی جانے

والی ہے کہ اس کے ناظرین کے پاس اس انسکلوپیڈیا کے سوا دوسرا ذریعہ علوم تک دسترس کا نہیں ہے۔ اور نہ ایک مُدت تک ہونے کی اُمید ہے۔ یہ ایسی کمزوری ہے جو مجوزہ انسکلوپیڈیا کی غرض و غایت کو کلیتہً معطل کر دیتی ہے۔

اِن حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسکلوپیڈیا کی جو غایت ہر زبان و زمان میں سمجھی گئی ہے وہ ہماری مجوزہ انسکلوپیڈیا سے حاصل نہیں ہوسکیگی۔ بلکہ ایک بالکل نئی غرض اس انسکلوپیڈیا سے متصور ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ

مجوزہ انسکلوپیڈیا علوم موجودہ کی ضابط نہیں بلکہ بجائے خود اُردو میں اشاعت علوم کا ذریعہ ہوگی۔ گو انسکلوپیڈیا کا یہ بالکل نیا مقصد ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ ایک شے سے ایک نیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے اس کی تنقیص نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اگر وہ اس نئے مقصد کو پُورا کر سکے تو اس کی عزت افزائی و قدردانی ہونا چاہئے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس مقصد کی نی نفسہٖ تنقیح کرکے دیکھا جائے کہ انسکلوپیڈیا سے یہ غرض حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں اس کا مثبت یا منفی جواب امور ذیل کے صحیح نتائج پر منحصر ہے۔

(۱) انسکلوپیڈیا پڑھنے والے کون لوگ ہوں گے اور ان کی علمی استعداد کیا ہوگی؟

(۲) اتنی گراں قیمت کتاب اُردو میں کسطرح شائع ہوسکیگی؟

(۳) وہ اپنے زمانے کے علوم سے کسطرح ہمقدم رہے گی؟

(۴) اگر نہیں رہے گی تو اس کی تلافی کس طرح ہوگی؟

(۵) انسکلوپیڈیا کی طرز کی کتابوں سے تعلیم حاصل کیجا سکتی ہے یا نہیں؟

ان کی نسبت بلا ردّ و قدح جو حالات پیش نظر ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) بظاہر انسکلوپیڈیا کے پڑھنے والے اُردو خواں اصحاب ہوں گے، اُردو

میں اس وقت تک اگرچہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہوگئی ہیں۔ لیکن وہ کتابیں ایسی منتشر ومتفرق ومختلف المدارج ہیں کہ ان سے اردو خواں طبقے میں کسی علم کو علم کی حیثیت سے بہت ہی کم ترقی ہوئی ہے، چنانچہ موجودہ انسکلوپیڈیا کے مجوز اوّل (مولوی سید سلیمان صاحب) نے اپنے دارالمصنفین کے خواب تمنا میں تحریر فرمایا ہے کہ "آج بڑا رونا یہ ہے کہ مذہب، زبان، فلسفہ، صناعت، اخلاق ہماری ترقی کے لئے جن قوائے نامیہ کی بھی ضرورت ہے ان کے تغذیہ ونشوونما کے لئے ہمارے ہاں کوئی سامان نہیں" ایسی حالت میں انسکلوپیڈیا کے مباحث پر عبور حاصل کرنا اردو خواں طبقے کے لئے قریب بہ محال ہے۔ یہ انسکلوپیڈیا، انسکلوپیڈیا برٹینکا سے بھی کچھ متجاوز ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مگر انگریزی خواں طبقہ اس امر سے اچھی طرح آگاہ رہے کہ انسکلوپیڈیا برٹینکا سے مستفید ہونے کے لئے کس قابلیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں اس کے بعض مضامین داخل ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا پایہ کیا ہے۔ خود عربی میں دائرۃ المعارف موجود ہے۔ مگر اس سے مستفید ہونے کے لئے کم از کم ندوے کی مولویت تک کی تعلیم تو ہونا چاہئے۔ اردو خواں طبقے کے کتنے اصحاب ہیں؟ اگر مقصود یہ ہے کہ انگریزی خواں طبقہ انگریزی کتابوں کو ترک کرکے اسی کا ہو رہے گا۔ تو یہ نہ مفید رہے گا اور نہ قابل العمل۔ اگر کسی گروہ کو اس سے مستفیض ہونے کی توقع ہو سکتی ہے تو صرف اس عربی خواں طبقے کو، جو تراجم کے ذریعے سے علوم جدیدہ سے کچھ واقفیت حاصل کرکے اپنے معلومات کو نئے طرز پر ڈھالنا چاہتا ہے۔ مگر یہ جماعت خود اس قدر قلیل ہے کہ محض اسی کے لئے یہ تمام زحمت گوارا کرنا بڑا سخت بار ہے۔ بس جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہی معلوم

ہوتا ہے کہ اس انسکلوپیڈیا کے پڑھنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانیوالے بہت ہی کم ہیں

(۲) پڑھنے والوں کی اس محدود تعداد پر جب گرانی قیمت کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے تو حالت اور بھی یاس افزا ہو جاتی ہے۔ اردو میں جب معمولی کتابوں کا رونا رویا جاتا ہے اور دو دو تین تین روپئے کی علمی کتابوں کے اتنے بھی قدردان نہیں ملتے کہ لکھائی چھپائی کا خرچ نکل آئے تو اتنی گراں قیمت کتاب کی فروخت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اگر امرا و رؤسا نے کچھ جلدیں خرید بھی لیں تو عام اشخاص کو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔

بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ گرانی قیمت اس کے نفع کو بالکل محدود کر دیگی۔ لیکن مجوزین نے اگر کوئی خاص تدبیر اس کے لئے سوچی ہو تو اس کی ہمیں خبر نہیں ہے

(۳) ایک بہت ہی اہم سوال یہ ہے کہ جس طرز پر انسکلوپیڈیا لکھی جانیوالی ہے وہ ضرور کئی برس کا کام ہوگا اور انکشافات علمی کی کیفیت یہ ہے کہ برٹینکا کی انسکلوپیڈیا میں ہر سال ایک نئی جلد کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور دوسری انسایکلوپیڈیائیں بھی زمانے کے ہم قدم رہنے کے لئے جلد جلد اپنے اڈیشن بدلتی رہتی ہیں۔ یورپ و امریکہ میں علاوہ عوام کے ہزاروں کتبخانے ایسے ہیں جو بالالتزام اسی قسم کی تصانیف کو خرید کر لیتے ہیں اس لئے وہاں اس التزام کے قایم رکھنے اور صرف کثیر برداشت کرنے میں کسی طرح کی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن ہماری حالت اس کے برعکس ہے، یہاں نہ کتبخانے ہیں اور نہ عوام کا یہ مذاق ہے۔ پس اول تو دوران ترتیب ہی میں یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ کل مضامین ایک حد پر قائم رہ سکیں اور بدشواری اگر اس کا انتظام کیا بھی گیا تو دو ہی چار برسوں

میں اہمیں کمی محسوس ہونے لگیگی۔ اور انسکلوپیڈیا اسناد کے درجے سے ساقط ہوجائیگی۔

(۴) ہمیں معلوم نہیں کہ اس کمی کی تلاش کی کیا صورت اختیار کیجائے گی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہمارے حالات کے اعتبار سے انسکلوپیڈیا کے اڈیشن کا بدلتے رہنا قریب بہ محال ہے۔ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ وقتاً فوقتاً اسمیں جدید جلدوں کا اضافہ کیا جائے۔ یہ جلدیں اگرچند صفحوں کی ہوں گی تو اس کے لئے وہ تمامی اسٹاف (باستثنائے عام مترجمین ومحررین کے) برقرار رکھنا ہوگا جو اس کی ابتدائی تدوین میں شریک رہا ہو، ایک اتنے بڑے اسٹاف کا جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے بالاستقلال اسی کام پر آمادہ رہنا کہ وہ انسکلوپیڈیا کی تصیحح کی غرض سے اپنے اپنے صیغے کی جزئیات پر بھی نظر رکھیں بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے اور اس کے لئے جس مستقل خرچ کی ضرورت ہے۔ شاید اس کا تحمل بھی قوم سے نہ ہوسکے۔

(۵) یہ دشواریاں اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے شاید ان سے سابقہ پڑنے کے قبل اس کا وزن کم سمجھا جائے۔ لیکن خود انسکلوپیڈیا کی ترکیب میں فی نفسہ ایک ایسی پیچیدگی ہے جو کسی طرح بھی انسکلوپیڈیا کو ایک تعلیمی کتاب نہ بننے دے گی اور اگر اسے تعلیمی کتاب بنایا جائے گا تو وہ انسکلوپیڈیا نہ رہے گی۔ کسی انسکلوپیڈیا کی ترتیب بلا باہمی حوالجات کے نہیں ہوسکتی۔ یعنی ہر علم متعدد اجزا میں تقسیم ہوکر منتشر ہوجائیگا اور ہر جزو کے تحت میں دوسرے اجزاء کے حوالجات پر کفایت کرنا ہوگا لیکن یہ طریقہ جو انسکلوپیڈیا کی جان ہے وہ تعلیمی کتاب کے لئے سخت ناموزوں بلکہ اس کے مقصد کا برباد کن ہے۔ اور اگر اس کے برخلاف کیا گیا یعنی علم کو متعدد اجزا میں تقسیم کردیا گیا تو وہ انسکلوپیڈیا نہ ہوگی۔ بلکہ ایک سلسلے میں علوم وفنون کی مستقل کتابوں کا

جمع کرنا ہوگا۔

غرضکہ ان وجوہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس انسکلوپیڈیا کا موضوع وہی ہے جو دوسری اسی قسم کی کتابوں کا ہوسکتا ہے تو غایت اصلی میں اہل علم کے لئے علوم موجودہ کا خلاصہ فرہنگ وار جمع کردیا جائے کہ عندالضرورت حوالجات میں آسانی ہو وہ غایت کسی طرح موجودہ انسکلوپیڈیا سے حاصل نہ ہوسکے گی۔ کیونکہ خود موضوع لہٗ موجود نہیں ہے اور اگر اس کا موضوع بدل دیا جائے یعنی اسے علوم مروّجہ یوروپ و علوم قدیمہ اسلامیہ کے شیوع کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ تو یہ غرض اور بھی زیادہ عسرالحصول ہوجاتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ جس انداز پر یہ انسکلوپیڈیا اٹھائی گئی ہے وہ ابھی

بہت قبل از وقت ہے

کسی شے کے قبل از وقت ہونے اور اس کے فی نفسہٖ مفید یا مضر ہونے میں فرق ہے اور اکثر اس مغالطے سے بحث کو طول ہوجاتا ہے۔ اس لئے میں اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ قبل از وقت ہونے سے میری غرض یہ ہے کہ کوئی قوم یا ملک کسی مفید کام کے لئے تیار نہ ہو بلکہ ضرورت ہے اسے تیار کرنے کی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی کام جو قبل از وقت ہو نہ کیا جائے بلکہ ہر قسم کی ترقیاں قبل از وقت" ہی کاموں سے ہوتی ہیں۔ سر سیّد نے جس وقت قوم کو انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دلائی، وہ تیار نہ تھی "مگر مادہ موجود تھا" آج سیلف گورنمنٹ کے خواستگار بھی اسی اصول پر کام کررہے ہیں۔ کسی کام کے قبل از وقت" ہونے یا نہ ہونے کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس کے اجرا و قیام کے لئے خارجی امداد کی ضرورت

ہے یا نہیں ؟ اگر ضرورت ہے تو وہ قبل از وقت ہے اور اگر ضرورت نہیں ہے تو وقت کے مطابق ہے ۔ لکھنؤ میں مکرمی سید یوسف علی صاحب کا اسکول بلا کسی اعانت کے چل رہا ہے بنگال میں بہت سے اسکول اپنے بانیوں کے لئے مالی منفعت کا سبب ہیں ۔ پس یہ قبل از وقت نہیں ہیں ۔ یعنی قوم و ملک ان کے لئے تیار ہے ۔ لیکن لندن کا مشرقی زبانوں کا مدرسہ جو لارڈ کرام متوفی و لارڈ کرزن جیسے با اثر شخصوں کی کوشش اور خود ملک معظم کی سرپرستی سے قایم ہوا ہے وہ ابھی انگلستان کے لئے قبل از وقت ہے، یعنی وہ خود اپنے کو سنبھال نہیں سکتا بلکہ اسے خارجی امداد کی ضرورت ہے ۔ پس اس معیار کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسکلوپیڈیا کی تدوین ابھی قبل از وقت ہے ۔ کیونکہ اس کے لئے ابتدا سے انتہا تک خارجی امداد پر بھروسہ کیا گیا ہے اور ملک اس کے لئے تیار نہیں ہے ۔ میرے نزدیک فی نفسہ اس طریقے کے اختیار کرنے میں قباحت نہیں ہے بلکہ غور طلب یہ ہے کہ قبل از وقت کے مدارج کیا ہیں اور کس حد پر آکر ہمیں رُک جانا چاہئے ۔ اس کی نسبت صحیح رائے قائم کرسکنے کے لئے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ جو کام مقصود ہے اس کے قبول کرنے کے لئے ملک تیار ہے یا ابھی اسے قابل قبول بنانے کے لئے تیاری کی ضرورت ہے، بصورتِ اوّل کام کا اجرا کردینا چاہئے اور صورتِ دوم مشکوک ہے، سر سیّد کی زندگی کے اوّل بیس برس اسی میں صرف ہوئے کہ اُنہوں نے ایک مختصر گروہ ایسا پیدا کیا جو اُن کا ہمخیال ہوسکا، مسٹر دادا بھائی نوروجی لال موہن گھوش، عنبر ہم کی سالہا سال کی کوششوں کے بعد ملک اس قابل ہوسکا کہ کانگرس کی بنا پڑی۔

انسکلوپیڈیا کے معاملے میں ہم درمیانی زینوں کے طے کئے بغیر اوپر پہنچ جانا

چاہتے ہیں۔ اور یہ مشکل ہے۔

یورپ و امریکہ میں پانچ چھ لاکھ روپیہ کسی کتاب پر صرف ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں ہے انسکلوپیڈیا برٹینکا کے گیارہویں اڈیشن کی صرف ترتیب پر ۲۴ - ۲۵ لاکھ روپئے صرف ہوچکے ہیں۔ لیکن اب اپنی حالت پر غور کرنا چاہیئے کہ ہمارا مذاق علمی کس درجے پر ہے۔ سر سید مرحوم کی شخصیت اور تیس برس کی دلفگاری محسن الملک کا تدبّر اور دس برس کی جانفشانی بھی مسلمانوں کے واحد مرکز علمیت کے لئے پانچ لاکھ روپئے کا مستقل سرمایہ نہ فراہم کرسکی اگر غیر معمولی شخصیتیں غیر معمولی اثرات سے تحریک یونیورسٹی میں اس طرح شریک نہ ہوگئی ہوتیں جس طرح وہ شریک ہوئیں تو یہ تیس لاکھ جو جمع ہوگئے وہ ابھی مدتوں کی باتیں تھیں انسکلوپیڈیا کی ترتیب میں اگرچہ ہندوں کا بھی نام لیا جاتا ہے مگر عملاً مالی وعملی کام جو کچھ بھی ہوگا مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوگا۔ پس ان فیاض ہمدردان قوم سے زیادہ (جن کی جبین ہر اُس کام کے لئے جو قوم کے لئے ظاہر کیا جائے کشادہ رہتی ہیں) خود مجوزین کا یہ فرض ہے کہ وہ اچھی طرح اندازہ کریں کہ جس کام کیلئے وہ اس کثیر سرمائے کے خواستگار ہیں۔ اس کا صرف قوم کے مالی وعملی حالات کے لحاظ سے مفید بھی ہے یا نہیں؟۔ اگر مزید غور سے وہ اسے مفید نہ سمجھیں تو ان کے خلوص قومی سے مجھے یہ اُمید ہے کہ وہ اپنی رائے کی تبدیلی میں اپنی کسرشان نہ سمجھیں گے۔ بلکہ اُس روپئے اور محنت کو اس سے زیادہ مفید کاموں میں صرف کرینگے۔

علاوہ ازیں کہ بعد تیاری انسکلوپیڈیا مفید ہوگی یا نہیں۔ ہمیں خود کام کی عملی دشواریوں پر بھی نظر کرنا چاہیئے، بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تراجم کے ذریعے سے کام چل جائیگا۔ مگر تراجم کی کیفیت یہ ہے کہ جس زمانے میں علامہ شبلی مرحوم

انجمن ترقی اردو کے سکرٹری تھے انہوں نے چاہا تھا کہ مصطلحات علوم کا ترجمہ اردو میں
ہو جائے، اس غرض کیلئے اوّل علم کیمیا منتخب کیا گیا اور اس کے انگریزی مصطلحات
ایک کتاب کی شکل میں چھاپ کر بہت سے ذی علم کیمیاب کے پاس بھیجے گئے مگر نتیجہ
کچھ نہ ہوا۔ علم کیمیا خود عربی سے انگریزی میں آیا، عربی و فارسی زبانیں ایسی غیر مانوس
نہیں ہیں، جب ان کا یہ حال ہے تو انسکلوپیڈیا میں تو بیسوں ایسے علوم داخل ہو گئے
جن کا زمانہ قدیم میں کبھی ذکر بھی نہیں تھا۔ ان کے ترجموں میں جو دشواری پیش آئیگی
وہ ظاہر ہے، اور محض ترجمہ مقصود نہیں ہے بلکہ محققانہ مضامین کی ضرورت ہے اور اس
کے لئے ایسے لکھنے والے درکار ہوں گے جو انگریزی و اردو دونوں پر پوری طرح
حاوی ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے اصحاب کا شمار ہم میں بہت کم ہے جو مختلف شعبہائے
علوم پر ایسی قدرت رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے اپنے حال کے
پمفلٹ (متعلق بہ یونیورسٹی) میں لکھا ہے کہ قانون مسعودی کا ترجمہ یورپ میں اسوقت
تک صرف اسی وجہ سے نہ ہو سکا کہ قدیم و جدید دونوں ___ کا جاننے والا کوئی موجود نہ
تھا، یہ خیال کرنا بہت آسان ہے کہ مضامین انگریزی میں لکھائے جائیں گے اور پھر
معمولی مترجمین اس کا ترجمہ کر دیں گے اور ان کی اصلاح ہو جائے گی مگر محض زباندانی
کے سہارے پر جو ترجمہ ہوگا اور جو اصلاح ہوگی وہ کبھی مستند نہ ہو سکیگی۔ انڈین پنل کوڈ
کا ترجمہ تعزیرات ہند کے نام سے مولینا نذیر احمد مرحوم نے بھی کیا ہے اور اب بھی قوانین
کے ترجمے ہوتے رہتے ہیں، دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ علوم کے ترجمے
کے لئے صرف زباندانی کافی نہیں ہے بلکہ خود اسی علم میں کامل ہونا لازمی ہے۔ ورنہ
ترجمے میں کامیابی ہونا غیر ممکن اور قطعی غیر ممکن ہے۔ اگر اس کے خلاف ہوا (جیسا کہ

اس تجویز سے ظاہر ہوتا ہے جو شائع ہو چکی ہے) تو یہ انسکلوپیڈیا نہ صرف غیر مستند ہو جائیگی بلکہ آیندہ لکھنے والوں کی گمراہی کا باعث ہوگی۔

مشرقیات کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ انسکلوپیڈیا خود یورپ کو سبق آموز ہوگی، جو لوگ یورپ کی تحقیقات سے کچھ بھی واقف ہیں وہ مشکل سے اس کا یقین کریں گے کہ ہندوستانی بحالات موجودہ ان سے گوئے سبقت لیجا سکیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی انسکلوپیڈیاؤں میں اسلامی معاملات کو کم جگہ دیگئی ہے اور ہم بلا اعانت یوروپ اُسے جس حدتک چاہیں پھیلا سکتے ہیں۔ اور غالباً یہی ہوگا، لیکن پیچیدگی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر مشرقی (اور علی الخصوص اسلامی) معاملات کو وُسعت نہیں دیتے تو انسکلوپیڈیا بہت ہی نامقبول ہو جائیگی اور اگر علوم مغربی کو کم کرتے ہیں تو یہ بھی مضر ہے، اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کتاب غیر معمولی طور پر ضخیم ہو جائے گی یا اس کی ترتیب میں تناسب و توازن قایم نہ رہ سکے گا۔

ایک مشکل یہ بھی پیش آئے گی کہ چونکہ اس انسکلوپیڈیا سے مقصود قوم میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے اس لئے ضروری ہوگا کہ ہر مضمون مبتدیانہ طرق سے شروع ہو کر منتہیانہ حد پر پھنچایا جائے اگر اس کے خلاف کیا گیا تو عوام کیا خواص کے لئے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس میں جو طوالت و دشواری ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ بالفرض اگر عام پسند مضامین مبتدیانہ لکھے جائیں اور خاص مضامین منتہیانہ تو اس شتر گربہ سے کتاب بالکل غارت ہو جائے گی۔

غرضکہ اس قسم کی بہت سی عملی دشواریاں خود ترتیب کتاب میں پیش آئیں گی۔ مگر چونکہ مجوزین نے تفصیل شائع نہیں کی ہے۔ اس لئے میں نے بھی چند اصولی اُمور

اکتفا کی ہے۔ لیکن جزئیات پر جسقدر غور کیا اُسی قدر نئی نئی دشواریاں نظر آتی ہیں۔ اگر اس تمام دردسر کا یہ ماحصل کہا گیا ہو کہ آیندہ نسلوں کے لئے یہ انسکلوپیڈیا کارآمد ہوگی تو یہ بجائے خود بنا ر غلط بر غلط ہے۔ کیونکہ

(۱) بوجہ شمول تراجم انگریزی یہ انسکلوپیڈیا ہمارے موجودہ علوم کی کوئی جامع یادگار نہیں ہوگی (جیسی پلینی، السٹ وغیرہ کی انسکلوپیڈیا اپنے وقت کے مدارج علوم کا پتہ دیتی ہیں) جس سے آیندہ زمانے میں یہ اندازہ ہو کہ اشاعت انسکلوپیڈیا کے وقت اُردو میں اسقدر ذخیرہ جمع ہوچکا تھا اور علمی زبانوں میں اُردو کا یہ پایہ نہیں۔

(۲) جس رفتار سے علوم میں ترقی ہو رہی ہے اُس کے لحاظ سے چند ہی برسوں میں اس کے مضامین فرسودہ ہوجائیں گے اور وہ آیندہ نسلوں کے لئے کچھ بھی مفید نہ ہوں گے۔

(۳) تمام زبانوں کے دستور کے خلاف یہ انسکلوپیڈیا یہ چاہتی ہے کہ اپنے لئے مصطلحات علوم خود وضع کرے (کیونکہ اُردو میں دوچار عام علوم کے ابتدائی مصطلحات کے سوا اس وقت تک کچھ بھی موجود نہیں ہیں) لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہی مصطلحات متفق علیہ ہوجائیں۔ اور آیندہ تمام مصنفین و مؤلفین اُنہیں پر کاربند رہیں اس لئے مصطلحات میں اختلافات کا ہونا قطعی ہے اور اس خلاف معمول سبقت سے انسکلوپیڈیا کے مضامین میں بڑے مغالطے پیدا ہوجائیں گے۔

پس شخصی یا قومی فیاضیوں سے اس قسم کے کام کا انجام پا جانا ایک بات ہے اور اُس کا سودمند ہونا دوسری بات ہے۔ چنانچہ شہنشاہ چین (کنگ) ہی کے حکم سے ۱۷۲۶ء میں چینی انسکلوپیڈیا پانچ ہزار بیس جلدوں میں طبع ہوئی مگر اس کا کیا

حشر ہوا؟ وہ صرف سو نسخوں تک محدود رہی اور اب وہ عجائب خانوں کی زینت ہے اور بس۔
چونکہ چینی قوم میں اس سے مستفید ہونے کی اہلیت نہیں۔ اتنی بڑی انسکلوپیڈیا بھی
اشاعت علوم کا باعث نہ ہو سکی۔ بادشاہوں کی موج طبیعت سے ایسے بہت سے
کام انجام پائے اور پھر نقش بر آب کی طرح مٹ گئے ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا و پست

یہ ایسے اسباب ہیں جن سے ہماری مجوزہ انسکلوپیڈیا کی کامیابی بہت ہی
مشکوک ہو جاتی ہے اور میں مجوزین سے نہایت خلوص دل سے عرض کرتا ہوں کہ وہ
اپنی تجویز پر کاربند ہونے کے قبل ایک بار اس پر اور غور کر لیں اور پھر بھی اُن کی ہمت
بلند اگر پست نہ ہونا چاہے تو انہیں اختیار ہے۔ مگر

کسے را کہ ہمت بلند اوفتد
مُرادش کم اندر کمند اوفتد

راقم

قاضی تلمذ حسین بی اے (علیگ)

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

ہماری خواہش پر جناب قاضی صاحب نے جس تحقیق و تدقیق سے دلنشین پیرائے

میں اپنے سُلجھے ہوئے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔اس کے لئے خراج تحسین کے ذخائر ناکافی ہیں بظاہر حرف حرف مخالفت سے محفوظ معلوم ہوتا ہے۔اس کام کے لئے جس سرمائے اور جتنے دل ودماغ کی ضرورت ہے۔اگر نتائج اس کا گراں بہا معاوضہ نہیں ہیں تو دُنیائے اُردو کی ہستی کے لئے کارفرمائی اجل اس کا ادنیٰ کرشمہ خیال کیجا سکتی ہے۔جس سے آیندہ کے لئے ہمتیں پست ہوجائیں گی۔ضرور اس بحث میں آزادی کے ساتھ کچھ تاریک پہلو روشنی میں لائے گئے ہیں۔مگر بیان کی دوستانہ طرز صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے لئے صرف دوستانہ توجہ اور نگاہ لطف کی ضرورت ہے۔جن سنجیدہ اصحاب نے یہ کام اپنے ہاتھوں لینے کا قصد کیا ہے۔وہ ہر طرح اس کے اہل ہیں اور انکی قابلیت مسلمہ ہے۔

ہماری طرح عام رائے کو ان پر اعتبار ہے ہم ان کی خاموشی پر بھی اس لئے مطمئن رہ سکتے ہیں کہ ہم سے زیادہ اُنھوں نے نتائج پر اطمینان حاصل کرلیا ہوگا۔لیکن اگر وہ اپنے تابان خیالات کی توضیح سے بیان کردہ تاریک پہلوؤں کو صاف کردیں تو عام رائے تائید تدوین میں زیادہ قوی ہوجائے گی۔اور عرش کے تارے توڑنے کو زبردست ہاتھوں کا سلسلہ قائم ہوجائیگا۔

ناتواں آہ کہاں لب سے نکلکر پہنچی
ہم نے گھر بیٹھے ہوئے عرش کے تارے توڑے

گلچین

قانون تعلیل

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو پیام اُمید ماہ جنوری ۱۹۲۶ء)

ہیوم کے اس تصور تعلیل پر مختلف جانب سے اعتراضات ہوئے۔ لیکن اس کے سب سے بڑے مخالف ریڈ کینٹ اور ان کے مقلدین تھے۔ ہیوم نے سبب کو ایک ناممکن التغیر مقدم سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اکثر ایسے ناممکن التغیر مقدم و موخر بھی دیکھے جاتے ہیں جو دراصل علت و معلول کے رشتہ میں منسلک ہی نہیں۔ مثلاً رات دن۔ اگر ہم ہیوم کے ادعا کو صحیح باور کرلیں تو ہمیں مجبوراً رات کو دن کا سبب ماننا پڑیگا۔ حالانکہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔ علوم جدیدہ ہیوم کے خیال ذاتیت تعلیل کی بھی تردید کرتے ہیں۔ تعلیل ذہن میں احساس و خیالات کے ذاتی تعلق کا نام نہیں بلکہ فطرت کے دو واقعات کے درمیان جو خارجی تعلق پایا جاتا ہے اس کو تعلیل کہتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر تعلیل توقع کے احساس کا نام ہے تو جس طرح توقع کے مدارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے بھی ہونے چاہئیں۔ پھر لفظ توقع صرف مستقبل پر دلالت کرتا ہے حالانکہ تعلیل میں ماضی و استقبال دونوں شامل ہیں بلکہ سچ پوچھو تو تعلیل کا اطلاق ماضی ہی پر زیادہ صداقت کے ساتھ ہوتا ہے۔ استقبال کی صورت میں تو احتمال کو کافی دخل ہے اگر کوئی نتیجہ زمانۂ گذشتہ میں واقع ہوچکا ہے تو تجربہ کے طور پر ہم اسے واقعۃً تعلیل کہتے ہیں لیکن اس امر کو کہ وہ آئندہ پھر واقع ہوگا صرف یقین ہی کا درجہ حاصل ہے اور اسے ہم امکان کے نام سے موسوم کرتے ہیں ماسوا اس کے علوم جدیدہ نے اس امر کو بھی پایۂ تحقیق تک پہنچا دیا ہے کہ تکرار مشاہدہ تعلیل کے واسطے

کوئی ضروری شے نہیں۔ مثلاً کیمیادان یا ماہرین طبیعیات تعلق سببیت کے قائم کرنے کے واسطے نقد و تجربہ سے کام نہیں لیتے۔ غرض کہ ہیوم کی تعریف تعلیل پر متعدد اعتراض وارد ہو سکتے ہیں اور اسلئے ڈاکٹر براون اور مل نے اس میں رد و بدل کرکے اس کو زیادہ صفائی و وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر براون کہتے ہیں کہ سبب وہ واقعہ مقدم ہے جو کسی واقعہ موخر سے ہمیشہ "فوراً پیشتر" صدور میں آیا کرتا ہو۔ اس طرح دن کی علت رات کے بجائے طلوع آفتاب ہے مل تعلیل سے اس غیر متغیر نتیجہ کو مراد لیتا ہے جو مظاہر طبعی کے مابین موجود ہوتا ہے اور علت کو مقدم کا مجموعۂ شرائط قرار دے کر یہ زیادہ کرتا ہے کہ تالی غیر مشروط ہوں۔ اس کی تعریف کو ہم تقریباً ان الفاظ میں ظاہر کر سکتے ہیں

"کسی واقعہ کی علت وہ واقعہ ہے جو اسکا
غیر متغیر اور غیر مشروط مقدم ہو"

مل کی تعریف کی جان دو جملے ہیں (۱) غیر متغیر مقدم اور (۲) غیر مشروط تالی لیکن یہی دونوں جملے اس کی تعریف کو اس کے نقطۂ نظر سے بالکل کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلا اعتراض جو اس پر وارد ہوتا ہے یہ ہے کہ مل کی تعریف کی رو سے مقدم کا غیر متغیر ہونا لابدی ٹھہرتا ہے۔ جس کا نتیجہ فی الحقیقت یہ نکلتا ہے کہ ہر ایک علت کا صرف ایک ہی معلول ہوا کرتا ہے اور گو یہ ایک سائنٹفک صداقت ہے لیکن دراصل مل کا معہود ذہنی نہیں ہے وہ تو علی الاعلان تعدد علل کا قائل ہے ممکن ہے کہ مل کے موافقین یہاں یہ تاویل کریں کہ سبب کو ناممکن التغیر مقدم قرار دینے سے مل کا مقصد دراصل یہ ہے کہ تالی میں کسی قسم کا تغیر نہ ہونا چاہئے۔ یعنی

یہ کہتا ہے کہ جب سبب ظہور پذیر ہوگا تو مسبب بھی اس کے بعد ہی بلا کسی تغیر کے لازماً ظاہر ہوگا اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو ہم کو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ مل نے اپنے اظہار خیال کے لئے بالکل نادرالوجود طریقہ اختیار کیا ہے اور اس کی نظیر شاید دنیا کے کسی لٹریچر میں نہ مل سکے ۔

یہ نہ سہی تعدد علل کا عقیدہ اس امر کی بھی تو اجازت نہیں دیتا کہ ہم علت کو غیر مشروط تالی تصور کریں ۔ ا و ب دو مظاہر کے مابین غیر مشروط توالی ہونیکا مطلب یہ ہے کہ جب ب کا وقوع ہوگا تو ا اور صرف ا استقدام کر سکتا ہے اور ا کا وقوع ہو تو ب اور صرف ب کو اس کا جلو دار ہونا چاہئے اور اس کا انحصا کسی شرط پر نہیں ۔ بہ الفاظ دیگر ہر ایک علت کا صرف ایک ہی معلول ہوتا ہے اور ہر ایک معلول کی صرف ایک ہی علت یعنی یا تو غیر مشروط توالی کو تسلیم کیجئے یا تعدد علل کے تصور سے دست بردار ہو جائیے ۔ دونوں کا اجتماع ضدین ہے پس مل کی تعریف اس کے نقطۂ خیال سے درست نہیں اگرچہ اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ۔ (باقی آئندہ)

صدیقی

— ✿ —

جس کا درد وہی جانتا ہے
دوسرا کیونکر جان سکتا ہے

یوں تو کوئی ایسا مرض نہیں جسکی تکلیف سے مریض نالاں اور پریشان نہو مگر دمہ کے مریض خاصکر دمہ کی ناقابل برداشت تکلیف سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور راتدن سانس پھولتے کیوجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند حرام ہوجاتی ہے دیکھئے آج انکو کسقدر تکلیف ہے لیکن افسوس ہے کہ اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیا ردھتورہ بھنگ بلاڈونا پوٹاش ای اوڈائڈ دیگر بنتی ہیں اسلیئے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا۔ ایک انمول جوہر ہے۔ آپ نے بہت خرچ کیا ہوگا۔ لیکن ایک مرتبہ اسے بھی آزمالیں قیمت عہ فی شیشی محصول ڈاک ۵

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی خون سے ہے اس لئے خون صاف رکھنا ضروری ہے اور اس کی ترکیب بھی آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی اوڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں پوٹاش ای اوڈائڈ وغیرہ کئی ایک آزمودہ ادویات ملا کر بنتا ہے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے۔ گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ گیا ہو تو اس کو استعمال کیجئے۔ اگر آپ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو تندرست رکھنا چاہتے ہوں تو لال شربت پلادیں کلیجہ کی کمزوری و کھانسی و لاغری کو دور کرنا چاہتے ہوں تو

لال شربت

پلادیں پیدائش کیوقت سے ہوشیار ہونے تک دوا یکساں فائدہ کرتی ہے پینے میں شیریں اور رنگ سُرخ ہونے کی وجہ سے لڑکے خواہش سے پیتے ہیں قیمت ۱۲ر فی شیشی محصول ڈاک ۴ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

مُوسُو

یہ دوا اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں۔ تمام دردوں مثلاً وجع المفاصل۔ نقرس۔ گٹھیا۔ عرق النسا۔ درد پشت۔ فالج۔ ادھرنگ۔ ذات الصدر۔ ذات الجنب۔ خارش جسم وغیرہ۔ جیسی تمام شکایات کو رفع کرنا اس کا اصلی کام ہے۔ یہ مالش کرنے کی صورت میں اپنا اثر فوری دکھاتا ہے۔ اکثر بادی۔ بلغم اور ریح وغیرہ یا بے اعتدالیوں کی وجہ سے بڑھاپے میں جن کو ایسے دردوں کی تمام شکایات پائی جاتی ہیں اُن اصحاب کے لئے موسو کا استعمال نہایت مفید ہے۔ بطور حفظ ماتقدم اس کی مالش سے آنے والی شکائیتیں رُک جاتی ہیں۔ ایک بکس جس کی قیمت صرف ۱۲؍ ہے مدت کے لئے کافی ہے۔

جنگ! جنگ!! خونریز جنگ!!! اور فتح!!!!

حسن و شباب کے دولہے حجاب، شرم و حیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمناؤں کے پیدل۔ ارمانوں کے شعلہ آشام سوار۔ حسرتوں کے شرربار رسالے دل کے سنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور غنیم کی شعلہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادھر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا پرجوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اضطراب کے توپخانے سے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش سے جنگ جاری ہی کہ اتنے میں کچھ اداؤں کا غنیم جنرل "وفا" کی ڈویژن پر ایک سخت خونریز اور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "وفا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہے مگر نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ پھر دفعۃً "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آتے ہیں۔ اس نئی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے۔ آتے دیکھتے ہی غنیم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات یہی حسن و عشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے جذبات کی تصویر، عفت اور حیا کا دلنشین مرقع، خلوص صدق و صفا کے صاف شفاف آئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادھر آئیے ہم دکھاتے ہیں۔ سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت استاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت جلیل شاعر دربار راج رام پور کی زبان سے مرصع اردو نظم میں بڑے آب و تاب بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے چھپ کر تیار ہے حجم ۱۰۰ صفحہ قیمت فی جلد ۱۰/

ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

شیکسپیر اردو نظم میں

ظلمت پہ ہے مثل کاکل یار	چھائی ہوئی ظلمت شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت	الفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان	ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی	کانوں میں صدائے یار آئی

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟ یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پا چکا ہے اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔ اصلی قیمت ۱۲؍ تھی۔ اب رعایتی قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

فہرست مضامین پیام امید بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۷ء

امید کا پیام..."اُٹھو.....اُٹھو.....اور آگے بڑھو!"

پیامِ امید

جلد ۳	محمود آباد سیتاپور۔ اگست ۱۹۱۷ء	نمبر ۲۸

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ جس حال میں کہ ہزاروں اخبارات اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گذرے گا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

ایڈیٹوریل نوٹس

میں ادب کے ساتھ ناظرین کرام کی خدمت میں عذرخواہ ہوں کہ اگست کا پرچہ مہینے کے ہفتہ اوّل کے اندر شائع نہ ہو سکا۔ ضوابط رسالہ کی رو سے اشاعت کیلئے کوئی خاص تاریخ معین نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ محض اتنی ہی ہے کہ ہمارا اپنا

پریس نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہم کیونکر دعوے کر سکتے ہیں کہ کسی خاص تاریخ کے اندر اشاعت ضرور ہی کر دیں گے۔ مگر باوجود اس کے ہماری پوری کوشش رہتی ہے کہ رسالہ ہر مہینے کے پہلے ہفتہ کے اندر آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کرے ہم اپنے فرض میں کوتاہی کرتے ہیں اگر ہم **منیجر صاحب عزیزی پریس** آگرہ کی بیش بہا اعانت کا اعتراف نہ کریں جو ہمیشہ محنت شاقہ اور سرگرمی سے اپنی سچی ہمدردی اور برادرانہ خلوص کا عملی ثبوت رسالے کے وقت سے پہلے تیار کر دینے کی صورت میں ظاہر فرماتے رہتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالہ کی وقت پر اشاعت اور لکھائی چھپائی وغیرہ کی صفائی اور خوش اسلوبی سے جہاں تک تعلق ہے بغیر انکی مخلصانہ توجہ اور کرمفرمائی کے یہ سب باتیں کبھی یکجا نہیں ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا رسالہ کی وقت پر اشاعت کے متعلق جو کچھ تعریف ہو سکتی ہو یہ سب انہیں کی تعریف ہے۔

اس مہینے کی اشاعت میں تاخیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے عزیز بھائی عبد المجید کی شادی کا زمانہ قریب آگیا ہے اور مجھے مجبوراً ضروری سامان میں اپنی والدہ صاحبہ قبلہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے پنجاب آنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیل مقام کا کتنا بڑا اثر رسالہ کی وقت پر اشاعت پر پڑ سکتا ہے۔ انشاء اللہ آیندہ پرچے وقت ہی پر شائع ہوں گے۔

ایک معزز بھائی "تاریخ اسلام" والے سلسلہ مضمون کو بہت پسند فرماتے ہیں اور خاص کر اس وجہ سے کہ "وہ چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کے نقطہ خیال سے لکھا جا رہا ہے۔ بچوں کی طبیعت سنہ اور تاریخ سے گھبرا اٹھتی ہے اس وجہ سے متروک

کر دیے گئے ہیں۔ اور طرز ادا سلیس اور سادہ رکھا گیا ہے تاکہ قصہ کے طور پر ان صفحات کو بہ آسانی شوق کے ساتھ پڑھ لیا کریں۔" مگر ساتھ ہی اس کے ہمارے معزز بھائی کو خوف ہے کہ آگے چلکر جہاں ایسے واقعات اور مسائل آئیں گے جن کے متعلق شیعہ اور سُنّی حلقوں میں اختلاف رائے ہے" وہاں مضمون نگار صاحب کون سی روش اختیار کریں گے اور کدھر ڈھلیں گے۔" معزز بھائی صاحب اور ان کے ہمخیال حضرات مطمئن رہیں کہ اس کا ہمیں کوئی خوف نہیں ہے۔ جس راہ سے کشیدگی یا نفاق کی ذرا بھی بو آتی ہوگی ہم اُس کوچہ میں قدم ہی نہ رکھیں گے۔ ہمیں مضمون نگاری کی اوٹ میں اپنے شیعہ بھائیوں پر حملہ کرنا منظور نہیں ہے " پیام اُمید" شیعہ اور سُنیوں کو ایک جان دو قالب بنانے آیا ہے نہ اس واسطے کہ بھائی کو بھائی سے لڑا کے تماشہ دیکھے۔ اور تعصب کی ایک چنگاری چھوڑ کر اپنا سارا گھر خاک سیاہ کر ڈالے " پیام اُمید" کے تاریخی صفحات ایسے صفحات ہوں گے جسے شیعہ اور سُنی بچے لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی گول میز کے گرد بیٹھ کر مزے لے لے کر پڑھ سکیں۔

جولائی کی اشاعت میں اخبار " شریف بی بی" لاہور کی اشاعت مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۱۷ء کے حوالے سے ہم محترمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ کی کھلی چٹھی کے متعلق چند سطور لکھ چکے ہیں عین انتظار میں محترمی مکرمی حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ مدظلہ کی ایک مختصر تحریر حجرہ رین بسیرا سے تحت تاریخ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء صادر ہوئی جس میں مرقوم ہے کہ محترمہ خواجہ بانو صاحبہ نے ایڈیٹر صاحبہ شریف بی بی کی خدمت میں وہ موجودہ

تحریر بھیجدی ہے۔ ہم نے خود معزز بہن ایڈیٹر صاحبہ موصوفہ کی خدمت میں عریضہ بھیجا تھا مگر خط کی رسید تک نہ ملی۔ اور نہ اس وقت تک محترمہ خواجہ بانو صاحبہ ہی کی تحریر روشنی میں لائی گئی۔ ہمیں اپنی معزز بہن کے بے ریا خلوص اور بے مثال فراست پر پورا اعتماد ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس گتھی کے سلجھانے میں وہ ہمیں مدد دیں گی اور طوالت اختیار کرنے سے بچائیں گی جیسا کہ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں۔

اسی مختصر تحریر کے ساتھ محترمہ خواجہ بانو صاحبہ کا ایک خط معہ سولہ[۱۶] سوالوں کے موصول ہوا ہے جن کے جوابات عاجزہ سے مانگے گئے ہیں۔ یہ تحریر دفتر رسالہ کے پتہ سے میری عدم موجودگی میں محمود آباد پہونچی اور وہاں سے ہو کر میرے پاس یہاں آئی۔ سوالات اور اُن کے جوابات اسی اشاعت میں کسی دوسرے مقام پر ملیں گے۔ جوابات مختصر مانگے گئے ہیں۔ مگر یہاں اختصار سارا مطلب ہی خبط کر دیگا۔ اس وجہ سے مجبوراً مفصل جوابات عرض کئے گئے ہیں۔

معزز روزانہ اخبار "ہمدم" کی اشاعت مورخہ ۷ رجولائی میں مسٹر محمد امین صاحب زبیری نے اسلامی تعلیمی کانفرنس کے متعلق معزز بھائی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر بعض شدید اعتراضات عائد کئے ہیں جن کے پڑھنے سے بادی النظر میں صاحبزادہ صاحب کے خلاف رائے قایم ہوتی ہے۔ صاحبزادہ صاحب کا فرض ہے کہ ان اعتراضات کے متعلق قوم کے سامنے اپنی صفائی پیش کریں۔

محترمہ مکرمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ کے سوالات اور اُن کے جوابات

(۱) بچوں کو دینی تعلیم کیونکر دینی چاہیئے؟

جواب۔ اگر "دینی تعلیم" سے اتنا ہی مقصد ہے کہ کاغذ پر اس مد کی خانہ پُری ہو جائے اور ہمارے عوام الناس کی تشفی کر کے اُن کا مُنہ بند کر دیا جائے تو یہ بات چنداں دشوار نہیں ہے۔ کوئی کتاب یا چند کتابیں یا کئی کتابوں کا انتخاب ایک مختصر سی جلد میں جمع کر کے ہمارے بچوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔ واہ واہ کرنے والوں کی کمی نہ رہیگی۔

اگر یہ قصد نہیں ہے۔ قوم کی سچی خدمت کرنا مقصود ہے اور ہماری آئندہ نسلوں کو سیدھی شاہ راہ پر لانا مدنظر ہے تو یہ کام بہت دشوار ہے۔ سب سے بڑی دشواری تو یہی ہے کہ ملک میں اہل نظر کا قحط ہے۔ کوئی بات جس سے قوم کا اصلی اور حقیقی فائدہ نکلتا ہو شامت اعمال سے نہ ہمارے عوام الناس کے فہم ناقص میں آتی ہے اور نہ اُس پر توجہ فرما سکتے ہیں۔ ہمارا قومی ادبار ہمیں مشکلات کا سامنا کرنے سے دُور بھگا دیتا ہے اور تن آسانی کا شوق سہل الحصول راہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ہم کوئی کام قاعدے سے جی لگا کے کرنے اور اُس کو جہ میں منزل بمنزل ترقی کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر بات میں اور ہر موقعہ پر ہتیلی پر سرسوں جما کے دکھا دی جائے۔ اگر میں سخت غلطی پر نہیں ہوں تو میری رائے ناقص میں بچوں کی نہ صرف دینی ہی بلکہ دُنیاوی تعلیم و تربیت بھی بہت بڑی

حدتک محتاجِ ترمیم ہے۔ مگر اس پر آج تک کسی بزرگ قوم نے توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ مجوزہ سلطانیہ کالج کے شاندار پروگرام کے متعلق بھی "پیامِ امید" نے اپنا فرض اپنی بساط کے موافق ادا کردیا۔ اگر آپ اس مضمون کو ملاحظہ فرمائیں تو کیا عجب ہے کہ ہمارے بچوں کی دینی تعلیم کے متعلق بعض نکات آپ کو مل سکیں۔ اسی طرح لیڈیز کانفرنس کے متعلق جو مضمون شائع ہوچکا ہے وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

قصہ مختصر دینی تعلیم کے لئے آپ کیسا ہی اچھا اور مفید نصاب مقرر فرمائیں مگر اُس سے کوئی خاص عملی فائدہ حاصل ہونا نظر بحالاتِ موجودہ قریب قریب غیر ممکن ہے جب تک کہ گردو پیش کے حالات میں انقلابِ عظیم نہ پیدا کیا جائے۔ اس خطرناک حالت کی مشکلات کا اندازہ نکاتِ ذیل پر غور کرنے سے کسیقدر ہوسکیگا۔

(۱) دینی تعلیم کا اصلی گہوارہ ہمارا گھر ہے۔ دس لاکھ زبانی نصیحتوں سے ایک زندہ مثال کا قابلِ تقلید نمونہ کروڑ درجہ بہتر ہے۔ ہمارے اخلاق عادات اطوار بگڑے ہوئے ہیں۔ جب ہم خود دن میں ہزار بار بے وجہ بلا سبب جھوٹ بولنے کے عادی ہو رہے ہیں تو ہم کس زبان اور کس منہ سے بچوں کو سکھا سکتے ہیں کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ اور محض اتنے ہی زبانی خرچ کا جس پر خود ہمارا اپنا عمل نہیں ہے ہمارے بچوں پر کیا خاک اثر پڑسکتا ہے!

(۲) "تعلیم یافتہ" والدین اور اسکولوں کے اُستاد خود ہی اس وہمِ باطل میں گرفتار ہیں کہ سائنس نے مذہب کی جڑ کاٹ دی ہے۔ حالانکہ اُن کا یہ خیال محض خبطِ بے ربط ہے ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

(۳) انگریزی اسکولوں کے اُستاد اور لڑکے جو دن رات آپ کے بچّوں سے شیر وشکر رہیں گے وہ سب کے سب مذہبی عقائد میں ڈانواں ڈول اور ڈھل مل لقین ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کیونکر اُمید کر سکتے ہیں کہ آپ کے بچّے دو چار مذہبی کتابیں پڑھ کر پکے مسلمان اور سچّے دیندار ہو جائیں گے؟ مگر آپ پوچھیں گے کہ پھر آخر کیا کیا جائے؟ کوئی علاج بھی ہے یا یہ مرض لاعلاج ہے؟ جی نہیں لاعلاج نہیں ہے۔ ہاں البتہ علاج دشوار ضرور ہے۔

ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ سائنس کے مذہب کی جڑ کاٹنے والے وہم باطل کی شافی تردید کر کے شکوک اور اوہام باطل کے گرفتاروں کو ساکت کر دیں۔ اگر آپ یہ اہم خدمت انجام دے سکیں تو یقین مانئے یہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ اس کے بعد آپ کا راستہ صاف ہوگا گو پھر بھی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔

اس وہم کی شافی اور قطعی تردید کا بار "پیامِ اُمید" اپنے سر لیتا ہے۔ انگلستان کے سربرآوردہ علمائے سائینس کے تازہ ترین اقوال جن سے اس بحث کی پوری تائید اور اس کے خلاف بحث کی قطعی تردید ہوتی ہے ہم نے جمع کئے ہیں اور ان صفحات کے ذریعہ سے ہم انہیں شائع کرنا شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلی قسط اس کام کی موجودہ اشاعت ادا کر دے گی۔ یہ آپکا کام ہوگا کہ جب یہ بحث ختم تام پر پہونچے تو اسے ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے ہمارے بچّوں کے ہاتھ میں دیجئے اور لاکھوں کی تعداد میں لکھیں شائع کرائے۔ کہ اُستاد اور شاگرد سب کے خیالات کی اصلاح ہو جائے۔

اس کے بعد دینی اور دنیاوی تعلیم کو اس کے صحیح مرکز ثقل پر قائم کرنے کے لئے آپ ہمارے بچوں کے نصاب تعلیم میں - اشاعت اسلام لاہور - اسوۂ حسنہ میرٹھ اور ناچیز "پیام امید" کو داخل فرمائیے - آخر الذکر رسالہ کو محض اسی صورت میں جب آپ اس کے متعدد پرچے دیکھ کر مطمئن ہو سکیں کہ یہ صلاح واقعی صائب ہے یا نہیں - اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی تعلیم کے لئے مناسب نصاب تجویز فرمائے اگر اللہ پاک کو منظور رہے تو نتیجہ خاطر خواہ ظہور میں آئیگا - مگر جب تک جڑ میں کیڑا لگا ہوا ہے شاخوں پر آب حیات یا آب کوثر بھی چھڑک دیجیگا تب بھی کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی امید نہیں کی جا سکتی -

(۴) لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے ؟

میں اس بحث کو تو فی الحال نظر انداز کرتی ہوں کہ ہمارے لڑکوں کی طرح ہمارے لڑکیوں کی تعلیم بھی نامکمل ناقص اور سطحی ہوتی ہے اور وہ علم کے کسی شعبہ میں درجہ کمال تک نہیں پہنچائے جاتے جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے - میری رائے ناقص میں یہ بحث چھیڑنا نظر بحالات موجودہ لاحاصل ہے - اور اس سے کوئی مفید یا کارآمد نتیجہ نہیں نکل سکتا -

سردست ہمیں اپنے افکار اس نقطہ تک محدود رکھنا چاہیئے کہ موجودہ تعلیم خواہ وہ کیسی ہی خام یا ناقص ہو اسی میں کس حد تک ترمیم و تنسیخ اور ضروری ردّ و بدل کر کے ہم اسے اپنے لڑکی لڑکیوں کے مناسب حال بنا سکتے ہیں - موجودہ صورت کی تعلیم میں حسب ذیل خامیاں نمایاں ہیں - انہیں اہل نظر دیکھتے اور روتے ہیں مگر عوام الناس "تعلیم تعلیم" کی رٹ لگانے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے -

(ا) موجودہ تعلیم ہماری لڑکیوں کو آرام طلب - کاہل - خود پسند - مغرور بناتی ہے
(ب) فیشن کی تقلید اور فضول خرچی کی عادات بد اُن میں پیدا کرتی ہے -
(ج) بڑوں کا ادب چھوٹوں کی پاسداری - عزیزوں سے محبت میں کمی پیدا کرتی ہے -
(د) اس خام تعلیم پر ایک نازیبا پیدا کرتی ہے اور ہر حرف شناس لڑکی مصلح قوم اور ریفارمر بننے پر تلنے لگتی ہے - اپنی اصلاح نہیں کرتی -
(ہ) مذہب کے معاملے میں لاپروائی برتی جاتی ہے جا بجا مذہب سے سوء عقیدت کی سُن گُن بھی آنے لگی ہے -

میرا تجربہ زیادہ تر صوبہ پنجاب پر محدود ہے - مگر صوبہ پنجاب تعلیم نسواں کے معاملہ میں اس صوبہ سے بہت آگے ہے - مجھے بڑا خوف ہے کہ جو شکایات آج اس صوبہ میں سُنی جاتی ہیں گمان غالب ہے کہ اگر یہی لیل و نہار غالب رہے تو کل یہی شکایات یہاں بھی سُننے میں آنے لگیں گی - اگر ہم آج ہی سے حفظ ماتقدم کر کے مناسب تدابیر سوچنا شروع کر دیں تو میری رائے ناقص میں کچھ بیجا نہیں کہا جا سکیگا - اب میں عرض کروں گی کہ میرے خیال میں ان نقائص کے دُور کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیجا سکتی ہیں -

ان تدابیر میں عملی حصہ لینے کا بار زیادہ تر ہمارے مردوں پر پڑتا ہے - اور اُن سے علیحدہ ہو کر کام کرنا ہمارے مناسب حال بھی نہیں ہے - سب سے پہلی منزل اس کوچہ کی یہ ہو گی کہ ہمارے عوام الناس میں ان نقائص اور خامیوں کا پُورا پُورا احساس پیدا کر دیا جائے تاکہ کچھ عرصہ کی کوششوں کے بعد ایک

معقول تعداد کاموں میں سرگرمی سے عملی حصہ لینے والوں کی پیدا ہو جائے یعنی مردوں اور عورتوں کے طبقہ میں اپنے ہم خیال پیدا کر لینے کی ضرورت ہے۔ یہ کام رسالوں میگزینوں اور اخباروں کا ہے۔ اور اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اخبار نویسوں کا طبقہ اِن ضروریات کا احساس پیدا کرے "پیامِ میتؔ" اپنے وجود میں آنے کی ساعت سے اسی کام میں دن رات منہمک ہے۔ اس کی پچھلی اشاعتوں کے مطالعہ سے اس امر کا شافی ثبوت مل سکتا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ اس طرح اور اخبار۔ اور رسالے بھی اپنا فرض ادا کرنا شروع کر دیں جب ہماری پبلک کو اِن ضرورتوں کا احساس ہو لے تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں اور منزل بمنزل ترقی کر کے رفتہ رفتہ سارے نقایص دُور کر سکتے ہیں۔ والدین اس امر کو بخوبی تمام ذہن نشین کر لیں کہ لڑکے یا لڑکیوں کو کسی اُستاد یا اُستانی یا اسکول کے حوالہ کر کے وہ اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو گئے ہیں اور بچپن ہی سے نگراں رہیں کہ اُن کی لڑکیوں کی طبیعت میں وہ خامیاں نہ آنے پائیں جن کی شکایت کی گئی ہے۔ ماں باپ اور بالخصوص ماں کے بعد اُستانی یا اسکول کا کام آتا ہے۔ کیونکہ اسکول میں تعلیم پانے کے زمانہ میں بھی ماں کو اپنی نگرانی اور اُس نگرانی کی اخلاقی قوت اس کا اخلاقی اثر زایل نہ ہونے دینا چاہیئے۔

میں اوپر عرض کر چکی ہوں کہ ہماری لڑکیوں کا نصاب تعلیم بہت کچھ ترمیم طلب ہے۔ اور اب تک جتنے نصاب دیکھے گئے ہیں ان میں سے کوئی اِن خامیوں پر توجہ کرتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ "تعلیم یافتہ" لڑکیاں لکھنا پڑھنا سینا پرونا۔ کھانا پکانا وغیرہ سیکھ لیں

مگر خود غرض بے مروت خود پسند فضول خرچ مذہب سے لاپرواہیں۔ بہن بھائی ماں باپ کے دُکھ درد سے بے فکر رہیں نہ بڑوں کا ادب کریں نہ چھوٹوں سے محبت تو آپ اس حرف شناسی کا نام "تعلیم" رکھ سکیں گی؟ اگر اس کا نام "تعلیم" ہے تو ایسی "تعلیم" کو دُور ہی سے سلام۔ اس سے تو جاہل ہی بھلا۔

مذہبی نقطہ خیال سے ہماری لڑکیوں کی موجودہ روش کی تعلیم اسلام کے لئے ایک خطرہ عظیم ہے ابھی تک تو ہم یہی دیکھتے آئے ہیں کہ مرد چاہے کیسے ہی ڈہل مل یقین ہو جائیں مگر مستورات اپنے مذہبی عقاید میں راسخ ہیں۔ وجہ صرف یہی ہے کہ انہیں "تعلیم" نہیں دی گئی ہے۔ پنجاب میں دیکھیے کیا حال ہے۔ وہاں یہ شکائتیں پیدا ہو چلی ہیں کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے مذہبی خیالات اور بے پڑھی لکھی لڑکیوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب تک ماں کے عقائد درست ہیں مذہب خطرہ میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بچوں کو سکھا سکتی ہے۔ مگر جب ماں اور باپ دونوں ڈہل مل یقین بن گئے تو آپ ہی فرمائیے مذہب کہاں جائیگا اور کس کا ہو کے رہیگا! ہماری منحوس "روشن" خیالی مذہب کی قایم مقام بننے پر تلی ہوئی ہے۔ ہندوں سے ہم تعلیم میں بہت پیچھے ہیں مگر وہ جتنا پڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اپنے مذہب کے احترام میں چند قدم اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ شامت ہماری کہ ہم دو حرف پڑھتے ہی روشن خیالی کا لٹھ لیکر مذہب کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ہندو تعلیم میں تو ہم سے آگے آگے ہیں۔ مگر انہیں "روشن خیالی" کا سبق نہیں یاد ہے۔ آپ ہی فرمائیے اس کا نام روشن خیالی ہے یا شامت! اللہ کی شان ہے کہ ظلمت آباد لندن کے عیسائی تو اسلام کی دُھندلی سی جھلک

دیکھ کر جوق جوق ملت بیضا کی نورانی شعاعوں کی روشنی میں آتے جاتے ہیں اور ہمارے بچے اسلام کے گہوارہ میں پلکر (MATERIALISM. اور (RATIONALISM.) ریشنلزم کی گھٹا ٹوپ اندھیر نگری میں کسی جگنو کی چمک کو نور قدرت سمجھکر اُسی کے پیچھے دوڑتے اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ کیا یہ بات ہمارے لئے جائے عبرت نہیں ہے!

(۳) شادی غمی کی فضول خرچیاں کس طرح کم ہوسکتی ہیں؟

جواب - شادی غمی کی فضول خرچیاں گذشتہ دس سال کے عرصہ میں فیصدی اسّی کے پرتہ سے کم ہوگئی ہیں یہاں زمانہ خود مصلح ثابت ہورہا ہے اور آپسے آپ اصلاح کردیگا۔ ہمیں زیادہ فکر کی حاجت نہیں ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ اُمرا آگے چلتے ہیں۔ غربا اُنہیں کے نقش قدم پر پیچھے پیچھے چلنا شروع کردیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے اُمرا نے اس پر توجہ کی ہے۔ پڑھے لکھوں کی نقل جاہل اُتارتے ہیں۔ امیروں کی نقل غریب کرتے ہیں۔ مگر جب پڑھے لکھے اور امیر خود ایک نئی راہ نکال چکے ہیں تو صورت اُمید افزا ہے۔ اور کسی خاص کوشش کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اب اگر فضول خرچی روکنے کی ضرورت ہے تو یہاں نہیں بلکہ کہیں اور ہی اس کی ضرورت ہے۔ امیروں کی تقلید میں غریب لڑکیوں کا فیشن ایبل بن کر اصراف پر کمر باندھنا غریبوں کا امیری ظاہر کرنے کے شوق میں اوقات سے زیادہ خرچ کرنا اور اس پر تل جانا کہ شاہ کا گھوڑا اور میرا گھوڑا برابر چلے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۴) میاں بیویوں میں محبت اور سلوک قائم رکھنے کی کیا تدبیر ہے؟

جواب۔ معاف فرمائیگا یاں صاف گوئی کی شدید ضرورت ہے۔ آپ پوچھتی ہیں "کیا تدبیر ہے؟" میں عرض کروں گی کہ سب سے پہلی تدبیر یہ ہے کہ ہم "ناقص العقل" عورتیں نیک و بد کی تمیز پیدا کریں اپنا دوست اور دشمن پہچانیں۔ یہی بہترین علاج اور سب سے بڑھ کر موثر تدبیر ہے۔ میاں بیویوں میں محبت اور سلوک کیا خاک قائم رہ سکتا ہے۔ جب روز اوّل ہی سے ہماری زیر تعلیم لڑکیوں کے کانوں میں یہ بات پھونکی جانا شروع ہو جاتی ہے کہ "مرد ظالم ہیں اور عورتیں مظلوم۔ مردوں نے ہمارا یہ حق چھینا وہ حق چھینا مردوں نے یہ ستم ڈھایا اور مردوں نے وہ قیامت برپا کردی" بعض زنانہ اخبارات نے سالہا سال سے یہی شیوہ اختیار کر رکھا ہے۔ بےجا اور بیجا خوشامد کی چکنی چپڑی باتیں بنا کے وہ ہماری ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم انہیں اپنا سچا دوست ہمدرد اور بہی خواہ مان لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جو زہر اُگلتے ہیں۔ ہم اُسے آنکھیں بند کرکے غٹا غٹ نگلتے چلے جاتے ہیں اور ہلاک ہوتے جاتے ہیں۔ اگر آپ ایمان کی بات سُننا چاہتی ہیں تو زمانہ حال میں میاں بیویوں کے درمیان میں کشیدگی اور نااتفاقی کے بانی یہی اخبارات ہیں۔ آپ ہی غور فرما کے انصاف کیجئے کہ اب سے دس ہی برس پہلے کیا حال تھا اور اب کیا حالت ہو رہی ہے گھر گھر سوء مزاجی اور نفاق کی صورتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ اب سے دس پندرہ برس پہلے کیوں یہ باتیں نہیں تھیں اور اب کیونکر پیدا ہو گئیں! اسمیں شک نہیں کہ موجودہ طریق تعلیم بھی ایک حد تک اس نفاق کا ذمہ دار ہے۔ مگر یہ اخبارات جو قومی اخبارات بنتے ہیں انہیں جلتی آگ پر سرد پانی کے چھینٹے دینا چاہیے تھا یا اُلٹے اُس پر مٹی کا تیل چھڑک دینا! آپ ہی انصاف کیجئے۔ اور پھر مزا تو یہ ہے

کہ ہم اور اُلٹے اُنھیں کی اعانت کرتے ہیں اُنھیں کی جڑیں اور مضبوط کر رہے ہیں! پھر کیا تعجب ہے اگر دُنیا ہمیں ناقص العقل کا خطاب دے رہی ہے!

سب سے پہلے تدبیر تو یہی ہے کہ ان اخبارات پر دباؤ ڈالا جائے کہ فوراً اپنی روش بدلیں ورنہ وہ کسی گھر میں آنے نہ دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد دوسری تدبیر یہ ہے کہ ہماری لڑکیوں کے ہاتھ میں "پیام اُمید" کے "خانہ آبادی" والے صفحات دیئے جائیں اور کہا جائے کہ انہیں غور سے مطالعہ کریں اور جو جو باتیں اِن اوراق میں پائیں انھیں گرہ میں باندھیں۔ یہ سلسلہ مضامین ختم ہونے پر اس کی لاکھوں کاپیاں چھپوا کے لڑکیوں میں مفت تقسیم کرادی جائیں۔ زیر تعلیم لڑکے بھی اسے دیکھیں۔ اگر ساری کتاب پڑھ لینے کے بعد اُن کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا نہ ہو جائے تو میرا ذمہ ہے "پیام اُمید" اس حد تک تیار ہے کہ محض لاگت پر اس کتاب کو چھپا کے تقسیم کرے۔

(۵) بعض مرد اپنی بیویوں پر ظلم کرتے ہیں۔ مستورات اپنی اس ہم جنس بہن کی مدد ظلم سے بچانے میں کیونکر کر سکتی ہیں اور کیا طریقہ ایسا ہو جس سے دوسری بہنیں اِن مظالم سے آگاہ ہو جایا کریں۔

جواب۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض مرد اپنی بیویوں پر ضرور ظلم کرتے ہیں۔ مگر کیا بعض عورتیں اپنے مردوں پر ظلم نہیں کرتی ہیں؟ بعض عورتوں نے تو اپنے مردوں پر ایسے ایسے ظلم کئے ہیں کہ سُن سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بعض واقعات خود میرے ذاتی علم کے اندر ہیں۔ اور شاباش ہے اُن مردوں کے جگرے کو جنھوں نے سکوت اور خاموشی سے یہ

کڑی کڑیاں جھیلیں مگر اُف بھی نہ کیا۔ اور آخرکار اللہ پاک کے دربار سے چپ کی داد پائی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرد حاکم ہیں اور عورتیں محکوم۔ مردوں کو بمقابلہ عورتوں کے ظلم کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اور عورتیں بے زبان پردہ نشین ہیں .... اس وجہ سے اُن کی صدا کسی کے کانوں تک نہیں پہونچنے پاتی۔ مگر جوجو پاپڑ بعض ظالم عورتیں بیل جاتی ہیں اُنکو مظالم کی داد بیداد میں زبان والے مردوں کی لب تک بھی حرف شکایت نہیں آنے پاتا۔ وہ بات ہی ایسی ہوتی ہے کہ زبان والے کو بھی بے زبان بنا دیتی ہے۔ کوئی کہے تو کیا کہے اور کس سے کہے!

سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ کچھ تو زمانہ حال کی مروجہ تعلیم نے ہماری لڑکیوں کو چھوئی مُوئی بنا رکھا ہے اور اس پر سونے میں سہاگا یہ ہاں میں ہاں ملانے والے اخبارات مل گئے۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے چڑھا نیم پر! بیوی نے کہا آج بہن کلثوم کے گھر جانے پر بلائی گئی ہوں۔ میاں نے کہا چھوٹا بچہ علیل ہے نجانا تو اچھا تھا۔ بیوی نے سر پیٹ لیا کہ اے ہے غضب ہوگیا! یہ آزادی کا خون۔ یہ ظلم۔ یہ زبردستی۔ یہ حکومت! بیوی نے کہا میں تو اب کی لیڈیز کانفرنس میں ضرور شریک ہوں گی۔ کوئی تین چار اچھے اچھے سے جوڑے بنوا دو۔ میاں نے عذر کیا کہ تم جانتی ہو میں پہلے ہی سے مقروض اور زیر بار ہوں۔ قرض پر قرض لینے کی جرات نہیں کرسکتا۔ بیوی نے منہ پھلا لیا کہ یہ تو مردوں کی غلامی ٹھری۔ اے واہ اچھے ملے!۔ اب گویا ہم ان کے قیدی ٹھرے کہ بے اجازت نہیں تو ہم گھر کی چار دیواری سے باہر جا ہی نہیں سکتے! وغیرہ وغیرہ۔

ایک صورت تو ایسے "مظالم" کی ہے جن کے بانی یہ معزز قومی نسوانی اخبارات ہیں۔ اب دوسری صورت واقعی مظالم کی ہے اور میں پہلے ہی تسلیم کر چکی ہوں کہ بعض مرد واقعی وحشیانہ مظالم عورات پر کرتے ہیں اور یہ بھی مان چکی ہوں کہ ظالم عورتوں کے مقابلہ میں ظالم مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

میں ایک منٹ کے لئے تسلیم کئے لیتی ہوں کہ مردوں میں سے فیصدی سنؤ یعنی سب کے سب وحشی اور خونخوار درندے ہیں اور دن رات سوا ظلم کرنے کے انہیں اور کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ مگر یہاں بڑی سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ ان مظالم کا روزنامچہ کیونکر آپ کے پاس پہنچ سکیگا اور اگر پہنچ بھی سکے تو آپ مردوں کے خلاف کون سا ایسا مارشل لا جاری کرا سکتی ہیں کہ وہ ظلم کرنے سے باز رکھے جاسکیں۔ ہاں اگر یہ معزز اخبارات ہر گھر میں بے تار برقی کا آلہ لگا دے سکیں جنہیں سے ہر ایک کا سلسلہ اُن کے دفتروں سے ملا ہوا ہو تو البتہ السداد غالباً بہت آسان ہو جائے یہ بات تو آپ بھی مان لیں گی کہ جو مرد مسلمہ طور پر ظالم ہیں اُن کے عادات اطوار اور اُنکا اخلاق بھی مسلمہ طور پر نہایت ہی ادنیٰ پایہ کا ماننا پڑے گا کیونکہ کوئی شریف زادہ جو ذرا بھی انسانیت رکھتا ہو گا کمزور جنس پر ایسے بربری مظالم روا رکھنا مرتے دم تک گوارہ نہیں کرسکتا۔ فرض کیجئے کہ زید ایک ایسا ہی وحشی درندہ ہے۔ وہ اپنی بیوی کو آدمی اور جاندار سمجھتا ہی نہیں۔ ہر وقت اُس کے گھر اُٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات والی مثل رہتی ہے۔ بات بات پر فحش بکنا اور مار بیٹھنا اُس کا کام ہے اب ہمارے آپ کے پاس اس کا کیا علاج ہے؟۔ مان لیجئے کہ ہمیں ان واقعات کی خبر مل بھی گئی! ہم کیا السداد کر سکتے ہیں اور کیونکر۔ فرض کیجئے کہ آپ سارے

ملک میں اس کی ایک باقاعدہ تحقیقات کراتی ہیں اور تحقیقات کے لئے تنخواہ دار معز
کمشنر مقرر فرماتی ہیں۔ کمشنروں کی رپورٹ آتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ اس وقت دکن
میں چار ہزار عورتیں۔ برہما میں تین ہزار عورتیں۔ صوبجات متحدہ ا پنجاب میں ملا
بیس ہزار عورتیں ٹراونکور اور مدراس میں پانچ ہزار عورتیں ایسے ہی وحشیانہ بربر
مظالم کی شکار ہو رہی ہیں۔ پھر آپ اس کا کیا علاج کر سکتی ہیں؟۔ کیا قانون انسدا
بیرحمی جانوران میں کوئی دفعہ اضافہ کرائیگا یا مردوں میں سے سب وہاں بائیسیں منیہ
کی شرح قایم کر کے سب کے خلاف مارشل لا جاری کرا دیجئے گا ! معزز بہن جو
ہیں وہ تو ایسی نامعقول حرکتیں کرتے ہی نہیں کہ سمجھانے بجھانے ڈرانے دھمکا
سے راہ راست پر آ جائیں۔ رہے ایسے ویسے تو اللہ جانتا ہے مجھے تو بڑا ڈر ہے
کہ اس پوچھ گچھ تلاش تحقیقات سمجھانے بجھانے لعنت ملامت کرنے سے کہیں اور ا
ایک ظلم کی جگہ پر دس نہ کرنے لگیں کہ روزہ چھوڑانے کی جگہ پر اور نماز گلے لگ

معزز پیاری بہن۔ ہماری خامیوں کا سرچشمہ اچھی اور باقاعدہ تربیت کی کمی ہے جو مرد آج ظالم ہیں اور وحشیانہ مظالم عورتوں پر کر رہے ہیں کاش بچپن ہی سے اُن کی تربیت اچھی ہوئی ہوتی تو وہ بجائے وحشی اور خونخوار درندہ ہونے کے آج بہترین انسانوں میں سے شمار کئے جاتے۔ جڑ میں کیڑا لگا ہوا ہے۔ اُسے نکالئے پھر کونپلیں آپ سے آپ ہری ہو جائیں گی۔ نہیں تو کونپلوں پر آب حیات کے چھینٹے مارنا بے سود ہے۔ یہ کام ہے بڑے صبر کا۔ اللہ پاک سے دعا کیجئے کہ ایسے سیاہ قلب مردوں کے دل میں رحم ڈالے۔ وہ مقلب القلوب ہے ایک دم میں جانور کو آدمی اور وحشی کو انسان بنا دینا اسی کا کام ہے۔ یہ کام ہمار

آپ کا نہیں ہے۔

شریعت نے میاں بیوی کو ایک مستحکم رشتہ میں وابستہ کر دیا ہے۔ قانون وقت نے بھی اس باہمی تعلق کو بخوبی تسلیم کر لیا ہے۔ میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں کوئی مفید مطلب تبدیلی اگر پیدا ہو سکتی ہے تو فریقین ہی کے کرنے سے ہو سکتی ہے جب ایک کو دوسرے کی آرام تکلیف پاسداری غمخواری کا خیال پیدا ہو نہ کہ بیرونی اشخاص کی مداخلت سے۔ بیرونی اشخاص کی مداخلت وسائل معلومات کی قلت کی وجہ سے بعض حالتوں میں اگر ممکن ہے تو سخت دشواری کے ساتھ ورنہ باقی حالتوں میں قریب قریب غیر ممکن ہے

اس کے بعد اگر مداخلت کی بھی گئی تو اگر فی صدی دس صورتوں میں شاید کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی صورت پیدا ہو سکے تو فی صدی نوے صورتوں میں یقینی بد نتیجہ اور برا انجام ہونا لازمی ہے۔ باہر والے کیا جان سکتے ہیں کہ نفاق کے اصلی وجوہ کیا تھے۔ یہ عموماً ایسے وجوہ ہوتے ہیں کہ میاں بیوی کے سوا کسی اور کو صحیح علم ہونا غیر ممکن ہوتا ہے۔ اصلی واقعات سے لاعلمی کی حالت میں ہماری مداخلت کیا فائدہ کر سکے گی سوا اس کے کہ اور نقیض بڑھائے۔

ہاں البتہ فیصدی دس صورتوں میں جہاں کامیابی کی امید ہو سکتی ہے ان صورتوں میں عموماً صرف ایک ہی راہ نکل سکیگی اور وہ راہ یہ ہو گی کہ جواز مسئلہ طلاق سے مدد چاہی جائے۔ اور عورت کی دوسری شادی کرنے کا بار آپ اپنے سر لیں۔ اور ساتھ ہی اس کے اس بات کا بھی کہ یہ دوسری شادی ضرور کامیاب ثابت ہو گی۔

آپ ایک منٹ کے لئے فرض کر لیجئے کہ بیوی کے ساتھ بُرا سلوک رکھنے کی علت میں آپ کسی شوہر کو قید بھی کرا دیں تو بھی آخر اس کا مآل کیا ہوگا؟ کیا آپ اُمید رکھ سکتی ہیں کہ جیل سے واپس آنے کے بعد وہ شوہر اپنی اُس بیوی کو پہلے سے زیادہ چاہنے لگیگا محض اس وجہ سے اُسکی بیوی نے اُسے قید کرا دیا تھا؟ اس سے بھی اور آگے بڑھئے آپ اس سے بھی سخت سزا دلا دیں کالے پانی بھجوا دیں۔ بیڑ لگوا دیں۔ بالفرض محال پھانسی بھی دلوا دیں تو کیا اس سے اُس مصیبت زدہ عورت کو آسایش مل جائیگی؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ کا پروگرام کیا ہے اور آپ کیونکر اصلاح چاہتی ہیں؟۔ اس اصلاح کو کیونکر عملی جامہ پہنایا جائے؟

(۶) ہندوستان کا موجودہ پردہ قابل اصلاح ہے یا نہیں اور اصلاح کس حد تک ہونی چاہئے۔

جواب۔ تعلیم یافتہ مردوں کے حلقوں میں اس معاملہ میں دو مختلف رائیں ظاہر کیجاتی ہیں۔ ایک فریق کی یہ رائے ہے کہ پردہ بالکل ہی فضول شے ہے اسے القط کر دو۔ دوسرے فریق کی رائے بالکل ہی اس کے برعکس ہے۔ یعنی پوری سختی کے ساتھ اسے قائم رکھو۔ میں پڑھی لکھی لڑکیوں کے خیالات سے بھی واقف ہوں اور لڑکوں کے خیالات کا بہت کچھ اندازہ کر سکتی ہوں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ انگریزی تعلیم پردے کی بیخ کن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض طبیعتوں پر اس کا اثر کم پڑسکے اور بعض پر زیادہ۔ میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر غریب شریف رزیل سب کو خاص کر ریل کے سفر میں جب زنانی سواریاں ساتھ لے کر دُور دراز کی منزل

قطع کرنا پڑتی ہے تو ہمارے مروجہ پردہ کی رسم کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور دیتی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ممالک متحدہ میں مروّجہ صورت کا پردہ ایک حد تک ضرور اصلاح طلب معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اتنا پردہ جتنا پنجاب کے شریف گھرانوں میں رائج ہے ہماری ضروریات کے لئے بہت کافی ہے۔ پردہ سے غرض حجاب اور ستر پوشی ہے۔ اور یہ غرض اس پردہ سے اچھی طرح پوری ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کردوں گی کہ پنجاب کی حالت اس صوبہ سے کچھ مختلف بھی ہے سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ وہاں مسلمان شرفاء کی مردم شماری بمقابلہ ہنود کے بہت زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں ہر بڑے شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے محلّے علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں۔ برعکس اس کے یہاں کے شہروں میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ پس ایسی صورت میں وہاں اور یہاں کی حالت یکساں نہیں قرار پاسکتی۔ البتہ ریل کے سفر میں پنجابی شرفاء والا پردہ یہاں بھی حد اعتدال کا پردہ مانا جاسکتا ہے۔

(۷) اسکولوں میں بھیجکر لڑکیوں کو تعلیم دلوانا کیسا ہے؟

جواب۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تعلیم جس سے تربیت مقصود ہے وہ تو بغیر اسکول کے گھر پر حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ مختلف طبیعت مختلف مزاج مختلف مذاق مختلف حیثیت کی لڑکیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا سہنا پڑھنا لکھنا تعلیم کا ایک اہم اور ضروری جزو ہے اور اس فروگذاشت کے معنی ہوں گے تربیت کا ناقص رہجانا۔ مگر مشکل تو یہی ہے کہ ہمارے اسکولوں اور مدرسوں کی تعلیم خود ہی ناقص ہے۔ تعلیم اپنے اصلی مرکز ثقل پر قایم ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ "پیام امید" مختلف مضامین کے

ذریعہ سے بارہا توجہ دلا چکا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بہت طویل ہو گی۔ اچھا ہو کہ "پیام امید" کے مضامین ہی ملاحظہ فرما لئے جاویں۔ بعض نکات دوسرے سوال کے جواب میں بھی عرض کئے جا چکے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔ میں تعلیم کا بڑا مقصد اخلاق کی درستی سمجھتی ہوں۔ وہ تعلیم جو اخلاق درست نہیں کر سکتی محض سطحی تعلیم ہے جو حرف شناسی کی حد سے آگے نہیں بڑھا سکتی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں کی موجودہ تعلیم کہاں تک ہماری لڑکیوں کے اخلاق درست کر رہی ہے؟

(۸) نئی روشنی کی تقلید میں ترقی کرنا چاہئے یا قدیمی دستور کی پیروی میں۔

جواب "نئی روشنی" کی سب سے پہلے تعریف بیان فرمایئے۔ اس وجہ سے کہ اس کی تعریف میں نے آجتک کسی اخبار یا رسالہ میں نہیں پڑھی ہے۔

بعض تو کوٹ پتلون پہننا۔ کالر ٹائی اور ہیٹ لگانا یا بلاؤس اور اسکرٹ پہننا۔ کانٹے چھری سے کھانا اسی کو نئی روشنی سمجھتے ہیں۔ بعض اس حد سے آگے بڑھ کر کالا پانی پی لینا تک نئی روشنی کی حدود جائز کے اندر سمجھتے ہیں۔ بعض اور بڑے جید روشن خیال بزرگوار خدا اور رسول، بہشت و دوزخ اور عذاب ثواب تک سے انکار کو بھی نئی روشنی ہی میں داخل سمجھتے ہیں۔ تو آپ کس نئی روشنی کے متعلق استفسار فرما رہی ہیں؟ کس حد تک کی۔ کس نمبر والی نئی روشنی؟ اگر نئی روشنی کے مدعی کوٹ پتلون پہن لینا۔ کانٹے چھری سے کھا لینا۔ ہیٹ سر پر رکھ لینا اسی حد کے اندر ہی اندر رہتے ہیں تو ہمیں ان سے عداوت رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ وہ شوق سے جیسا لباس چاہیں زیب تن فرمائیں۔ محض اتنے ہی کے لئے ہم انہیں اعلان جنگ نہیں دے سکتے مگر وہ اس حد سے ایک انچ بھی آگے

پڑھیں گے تو ہم فوراً ہی اپنا الٹی میٹم دیدیں گے۔

صاف صاف بات تو یوں ہے کہ آپ کے لباس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

حاجت بکلاہ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش وکلاہِ تتری دار

لباس میں کیا دھرا ہوا ہے۔ اسلام کو اعمال سے بحث ہے نہ کہ لباس سے۔ کوئی شخص عمامہ عبا اور قبا پہنکر مرد صالح نہیں بن سکتا اور نہ برعکس اس کے عیسائی لباس پہن کر دائرہ اسلام سے خارج ہو سکتا ہے۔ ہمیں ترقی کرنا چاہئے۔ اصلی اور حقیقی ترقی "پیامِ اُمید" کی اصطلاح میں حقیقی ترقی تو جب ہی ہو گی جب ہمارے بچے دُنیا کی زندہ قوموں کی صفوں میں شامل ہو کر دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل بن سکیں گے۔ اللہ وہ دن جلد لائے۔ ہم اس نیک ساعت کے منتظر ہیں۔ ہم وہ روز سعید دیکھنے کے منتظر ہیں جب ہمارے بچے خود اپنی بنائی ہوئی بائیسکل۔ اپنی بنائی ہوئی ٹائپ رائیٹر۔ اپنا بنایا ہوا گراموفون۔ اپنی بنائی ہوئی موٹر کار لا کر ہمارے سامنے دھر دیں گے اور اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے جہازوں پر اُڑے اُڑے پھریں گے۔ ہم تو اسی کو ترقی سمجھتے ہیں۔ ہماری اصطلاح میں نہ بی لے پاس کر لینا ترقی ہے اور نہ کوٹ پتلون پہنکر ہٹ لگا لینا ترقی ہے۔

(۹) عورتوں کو نئے اصول کے موافق تیمارداری کی تعلیم کیوں کر دی جائے۔

جواب۔ بہت سی ضخیم کتابیں اس مضمون پر انگریزی زبان میں مل سکینگی اُن کے ترجمے کرا لیجئے۔ یہ کام بہت کچھ دشوار نہیں ہے۔

(۱۰) مختلف صوبوں کی عورتیں کن طریقوں سے آپس میں میل جول اور اتحاد پیدا کریں۔

جواب - اس بات کی بہت ضرورت ہے اور ہم مدت سے اسے محسوس کر رہے ہیں۔ سب سے پہلی منزل ہماری یہ ہونا چاہئے کہ اس صوبہ کی مستورات آپس میں میل جول پیدا کر لیں۔ اس کے بعد آگے بڑہیں۔ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم سب متفق ہو کر کسی ایک اخبار یا رسالہ کو اپنا بنا لیں۔ اس کی بنیاد چاندی کی کافی مقدار سے خوب مضبوط کر دیں اور وہی اخبار یا رسالہ جس کی بلا استثناء ہر تعلیم یافتہ بیوی خوش دہند خریدار بن جائے آپس میں میل جول اور محبت بڑہانے کا ذریعہ بنے۔ اس کے متعلق ایک مستقل عملی پروگرام میں بنا چکی ہوں۔ اور آپ جب چاہیں مجھ سے حاصل کر سکتی ہیں۔

(۱۱) اخباروں میں مضامین لکھنا۔ زنانہ جلسوں میں تقریر کرنا۔ عورتوں کو کیونکر سکھایا جائے۔

جواب - آپ اخبار یا رسالہ کو اپنا قومی آلہ تسلیم کر لیں گی اور اسے مستحکم بنا دینگی تو یہ سب کام وہ خود کر لیگا۔ اور ہر ایسے معاملہ میں ایک مفید رائے قائم کر لینا اسکے ذریعہ سے آسان ہوگا۔

اردو اخباروں اور رسالوں میں مرد مضمون نگار ہی اعلیٰ پایہ کے کمیاب ہیں۔ عورتوں میں مضمون نگاری اگر عنقا ہے تو کون سی تعجب خیز بات ہے۔ ہمارے اردو اخباروں اور میگزینوں میں مضمون نگاری کا معیار حد سے زیادہ پست اور رذل ہے حقیقت میں ہماری لڑکیوں کو مضمون نگاری کی باقاعدہ تعلیم ملنی چاہئے۔ اور یہ تعلیم

بغیر ایک خاص بلند پایہ اخبار یا رسالہ کے غیر ممکن ہے۔

(۱۲) اگر ہندوستان کو خود مختاری کی حکومت مل جائے تو عورتوں کا حصہ اسمیں کیا ہونا چاہئے یعنی اس خود اختیار حکومت سے ان کو بھی کچھ فائدہ حاصل کرنے کی توقع ہے یا نہیں؟

جواب - ہمارا رسالہ بالکل غیر سیاسی ہے - اس سوال کے جواب سے معذوری ظاہر کر کے معافی چاہتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں گی تو البتہ نج کی تحریر کے ذریعہ سے جواب دے سکتی ہوں۔

(۱۳) غریب اور محتاج لڑکیوں کی تعلیم کا کیا بندوبست مناسب ہوگا؟

جواب - بہت سی صورتیں ممکن ہیں - مگر جو بات مشکل یا نظر بحالات موجودہ شائد ناممکن ہے وہ یہ ہے کہ اگر سارے ہندوستان کی نہیں تو سارے صوبہ ہی کی عورتیں یک دل ویک زبان ہو کر کسی کام میں عملی حصہ لینے کے لئے تیار ہوسکیں۔ سب سے پہلے یہ منزل طے کرنا پڑے گی کیونکہ اس کے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ایسے کام کسی شخص واحد یا چند انے گنے افراد کے کرنے کے نہیں ہوتے اور نہ وہ اس بار کے متحمل ہو سکتے ہیں - اس منزل پر بھی مقدم ایک خاص اخبار یا رسالہ کا انتخاب ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

(۱۴) عورتوں کی جبریہ تعلیم ہونا چاہئے یا نہیں؟

جواب - پہلے لڑکوں کی جبریہ تعلیم ہی رائج کرا لیجئے - اصولاً تو لڑکیوں کی جبریہ تعلیم بیحد مفید ہوگی مگر اس کی راہ میں بے شمار دقتیں ہیں - لڑکوں کی جبریہ تعلیم رائج ہو لینے پر البتہ اس میں قدرتی طور پر کچھ سہولتیں پیدا ہو سکتی ہیں - مگر مجھے خوف

ہے کہ یہ صوبہ ابھی لڑکیوں کی جبریہ تعلیم کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور میری رائے ناقص میں یہ سوال بہت قبل از وقت ہے۔

(۱۵) مسلمان عورتوں کا قومی لباس کیا ہونا چاہئے اور اس کی ضرورت ہو یا نہیں؟

جواب ۔ یہ سوال بہت وسیع ہے۔ کیا آپ کا مقصد ساری دنیائے اسلام کی مستورات کے لباس سے ہے۔ اگر یہی بات ہے تو ترک، عرب، مصر، ایران افغانستان، حبش، چین، روس اتنے مختلف ملکوں کی مستورات ایک ہی لباس کیونکر پسند کرسکیں گی۔ کوئی ملک گرم ہے کوئی سرد۔ اس کے علاوہ ہر ملکے دہر رسمے والا مضمون ہے۔ اگر آپ کا مطلب سارے ہندوستان کی مسلمان مستورات سے ہے تو بھی بنگالی مستورات کے لباس اور پنجاب و دکن کی مستورات کے لباس میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عادات رسم و رواج کا اختلاف وضع کے اختلاف کا باعث بن رہا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر سارے ہندوستان کی مسلمان بیویاں متفق الرائے ہو کر کسی ایک خاص لباس کو پسند کرسکیں جو قومی لباس قرار پائے تو ضرور ایک اچھی بات ہوسکے گی۔ مگر پھر وہی دقت یہاں بھی سامنے آتی ہے۔ یعنی سارے ہندوستان کی مسلمان بیویوں کا متفق الرائے ہونا۔ اگر ہم آپ مل کر سارے ملک کی بیویوں کے لئے کوئی خاص وضع اپنی پسند سے تجویز کرلیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سارے ملک میں رائج بھی ہوسکیگی؟

(۱۶) حفظان صحت کے اصول میں عورتوں کو کیا کیا کام کرنے لازم ہیں؟

جواب ۔ اس کا جواب بھی بہت سی انگریزی کتابوں میں آسانی سے

مل سکتا ہے۔ چنداں دشوار نہیں۔

آزاد بیگم

مذہب اور سائینس

ہم مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں اپنی اعلیٰ پایہ کی مغربی تعلیم پر ناز ہے۔ جو لوگ تربیت یافتہ اور روشن خیال سمجھے جاتے ہیں وہ لوگ جو حقیقت میں ہماری سوسائٹی کی جان اور ہماری قوم کی روح رواں ہیں شامت اعمال سے اُن میں سے فی صدی ننانوے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سائینس مذہب کا بدترین دشمن ہے۔ ان میں سے جو لوگ خوش عقیدہ رہنا پسند کرتے ہیں وہ مذہب اور سائینس کی بحث سے عمداً و قصداً گریز کرتے ہیں۔ اور اس کا خیال بھی اس خوف سے اپنی قریب نہیں آنے دیتے کہ مبادا عقاید مذہبی میں تسرق نہ پڑ جائے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنی اخلاقی جرات کی زبردست قوت کو حرکت میں لانا پسند کرتے ہیں وہ اِس مسئلہ پر اپنی سمجھ کے موافق تھوڑا بہت غور کرکے گویا ہوتے ہیں کہ "بیسویں صدی کے زمانہ کے سائینس کے شاندار کارنامے مذہب نے دیکھے اور دیکھ کر جل مرا۔ مذہب نے سائینس کو الٹی میٹم دیدیا کہ یا تو کفر بکنا چھوڑ دو نہیں تو ہماری تمہاری جنگ ہے۔ سائینس سے مذہب کی یہ گستاخی سہی نہ گئی اور اُس نے مذہب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مذہب اور سائینس میں تصادم ہوا۔ سائینس کا دخانی جہاز تھا اور مذہب کا بادبانی۔ سائینس نے مذہب

کے وہ ٹھوکر رسید کی کہ وہ مقابلہ کرتے ہی ڈومنٹ کے اندر سمندر کی تہہ میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا!" گویا مذہب اور سائینس کی جنگ کی داستان کا یوں آغاز اور یہ انجام ہوا۔

ہم اس کے اصلی اسباب صاف صاف بیان کرنا محض اس وجہ سے مناسب نہیں خیال کرتے کہ سوسائٹی ابھی ایسے کڑوے گھونٹ پینے کے لئے تیار نہیں ہے نہ اس وجہ سے کہ خود ہم میں اخلاقی جُرات کی کمی ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس قسم کے اوہام باطلہ پڑھے لکھے ہندوستانی مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں اور برابر پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ اخلاقی زہر لڑکوں کے طبقہ سے ترقی کرکے ہماری زیر تعلیم لڑکیوں کے طبقہ کے گردوپیش کی ہوا سے ٹکرا رہا ہے۔ اگر اس ہوا نے بھی یہ سمیت قبول کرلی تو یقین مانئے ہماری آیندہ نسلیں اسلام کی فاتحہ خواں ہوں گی اور آخر کار جزیرہ نمائے ہند کے اندر اسلام حرف غلط کی طرح صاف مٹ جائیگا۔ بھائیو اسلام خطرہ میں ہے! - یہ وقت سونے اور باتیں بنانے کا نہیں ہے۔ اُٹھو اور کام کرو! ہم آج یہ دل شکن منظر ہر کوچہ و برزن میں دیکھ رہے ہیں کہ ہر انگریزی زبان کا ابجد خواں طفل مکتب کم و بیش یا قریب قریب ایسا ہی خیال رکھتا ہے۔ وہ سائینس کا نام سنتے ہی لرز اُٹھتا ہے اگر اسی کے ساتھ مذہب کا بھی نام لیا جائے اور وہ خایف ہے کہ یہ نازک اندام اور نرم دل فرشتہ (مذہب) اس دیو (سائینس) سے کیونکر پنجہ آزمائی کرسکیگا! کیا یہ حالت قائم رہنے دی جائے؟ کیا کوئی جائز اور مناسب سعی نہ کیجائے جس سے کلمۂ حق کا اظہار ہو سکے۔ کیا گم کردگان راہ سلامت کے آگے حق کی

مشعل روشن نہ کر دی جائے ؟ کیا روز روشن کی روشنی میں صاف صاف نہ دکھا دیا جائے کہ سائینس کے جائز حدود کس نقطہ سے آگے نہیں بڑہتی ہیں - اور یہ کہ سائینس کس حد تک مذہب کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لئے تیار ہے یا ہو سکتی ہے؟

ان اوہام باطلہ کی تردید دشوار نہیں ہے - اور ہمیں اس مبحث میں یہی دکھانا ہے کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سائینس کے عَلَم کے نیچے آجانا دراصل مذہب کی مخالف صفوں میں کھڑے ہونے کے معنی رکھتا ہے آہ ! کیسے یہ لوگ شدید اور فاش غلطی میں مبتلا ہیں۔

سائینس کے نام پر مرنے مٹنے والے یورپ اور خاص کر انگلستان کے مستند علمائے سائینس کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں - مگر ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ کیا کہیں گے اگر انگلستان ہی کے مستند علماے سائنس کے اقوال ہی ان کے سامنے سندیں پیش کر دیئے جائیں ! انگلستان کے مشاہیر سائینس میں اگر ذیل کے ناموں سے زیادہ موقر نام مخالفین اپنی جانب سے سندیں پیش کر سکیں تو ہم بے دلیل مان لیں گے کہ وہ سچے ہیں۔

ہم سات مشاہیر کے نام پیش کرتے ہیں اور دعوٰے کرتے ہیں کہ انگلستان میں ان سے زیادہ مستند کوئی اور عالم وہاں نہیں ہے۔

(۱) سر آلیور لاج - ایف - آر - ایس - ڈی - ایس - سی - ایل - ایل - ڈی محقق ریڈیم۔

(۲) پروفیسر جان امبروز فلیمنگ - ایم - اے - ڈی - ایس - سی - ایف آر - ایس۔

(۳) پروفیسر ڈبلیو - جی - بائم لے - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - ایف - ایل - ایس - ایف - سی - ایس - محقق نائٹروبکٹراٹین۔

(۴) پروفیسر ایڈورڈ ہل - ایل - ایل - ڈی - ایف - آر - ایس۔

(۵) جان آلسن ہارکر - ڈی - ایس - سی - ایف - آر - ایس۔

(۶) پروفیسر جی سیمس وڈ ہیڈ ایم - اے - ایل ایل ڈی - ایم ڈی - ایف آر - سی - پی - ایف - آر - ایس - ای۔

(۷) پروفیسر سیلونیس پی - ٹامسن بی - اے - ایم - ڈی - ایل - ایل - ڈی ڈی - ایس - سی - ایف - آر - ایس۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اگر ہم مستند علمائے سائینس کے فتاوی اپنے مفید مطلب پیش کرسکیں تو ہمارے بے پئے ہوئے ست رہنے والے حامیان سائینس ان کے اقوال کی تردید پر بھی تل جاتے ہیں یا بے لڑے ہوئے ہتیار ڈال دیتے ہیں؟ ناظرین اس سلسلہ مضامین کے لئے آیندہ اشاعتوں کے منتظر رہیں۔

معقول پسند



اسمائیلس کیریکٹر

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

گو یہ سادہ الفاظ بالکل ہی معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر انسان کا اپنے فرایض بوجہ احسن انجام دینا انسانی زندگی کے بہترین مقاصد اور کیریکٹر میں داخل ہے۔ فرض کی انجام دہی کوئی معرکتہ الآرا کارنامہ نہیں ہے۔ مگر عموماً عامہ خلایق کے حصّہ میں ایسے کارنامے نہیں آیا کرتے۔ اور ہمارے معینہ فرایض کی انجام دہی اگر ایک طرف زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمارے بازوؤں میں قوت بخشتی ہے تو دوسری جانب ہماری زندگی کے معمولی روزانہ کاروبار کے انصرام دینے میں ہماری ہمت برقرار رکھتی ہے۔ حقیقت میں انسانی زندگی نام ہے روز مرّہ کی زندگی کے کاروباری فرایض کا۔ انہیں فرایض کے احاطہ کے اندر ہماری زندگی کا دَور محدود کر دیا گیا ہے۔ نیکیوں میں مؤثر ترین نیکیاں وہی ہیں جن کا ظہور ہماری روزمرّہ کی زندگی کے چھوٹے بڑے کاموں میں روز ہوا کرتا ہے۔ انہیں نیکیوں کے جوہر خوب چمکتے ہیں اور دیر تک برقرار رہتے ہیں۔ اعلیٰ پایہ کی خلاف معمول نیکیاں جن کا معیار عامۂ خلایق کے معیار سے زیادہ رفیع ہے بعض اوقات ہمیں سخت امتحان اور خطرہ میں ڈال سکتی ہیں۔ برکلے نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ انسانی نظام جس کی بنیاد اعلیٰ پایہ کی قابل یادگار نیکیاں قرار دگئی ہیں۔ اس نظام کی ساخت میں بلاشبہ بعض خامیوں کی آمیزش بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر ایبٹ (ماں بعد آرچ بشپ آف کینٹربری) اپنے دوست متوفی ٹامس ٹیک وِل کے کیریکٹر پر رقمطراز ہوئے تو انہوں نے اپنے دوست کے اوصاف پر نظر ڈالتے وقت اُن کے سیاسی کارناموں کو قطعی نظرانداز کیا۔ اُن کی اعلیٰ پایہ کی شاعری کی تعریف نہیں کی مگر خوبیاں سراہیں تو محض انہیں اوصاف حمیدہ کی جو بحیثیت ایک معمولی انسان کے اُن کی معمولی روزمرہ کی زندگی میں نمایاں تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شخص متوفی میں کتنی خلاف معمول باتیں پائی جاتی تھیں! کون شخص اُن سے زیادہ اپنی بیوی سے محبت رکھ سکتا ہے؟ کون ہے جس نے اپنے بچوں سے اُن سے زیادہ محبت اور پیار کیا ہو؟ دُنیا میں کون شخص ہے جو یہ دعوے کر سکے کہ اس نے اُن سے زیادہ اپنے دوست احباب سے خلوص اور مروت آخر وقت تک بناہی ہو؟ کون ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس نے اپنے دشمنوں سے اُن سے زیادہ میانہ روی اور رواداری کا برتاؤ قائم رکھا ہو؟ کون ہے جو اُن سے زیادہ بات کا دھنی اور صادق الاقرار ہو؟" واقعی بات یہ ہے کہ ہم کسی شخص کا اصلی کیریکٹر اسی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس کی قرار واقعی داد دے سکتے ہیں کہ اس کے قریب ترین اعزا اور احباب کے ساتھ اس کے برتاؤ پر ایک غائر نظر ڈالیں۔ اور اس کی روزمرہ کی زندگی کے بظاہر محض معمولی کاروبار کو گہری نگاہ سے دیکھیں۔ کسی شخص کے کارنامے جو بحیثیت ایک مصنف یا مقرر یا ماہر سیاسیات ہونے کے اس کی جانب سے دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہوں اُن کے اعتبار سے بمشکل اس کے اصلی کیریکٹر کے متعلق کوئی صاف صحیح اور قطعی رائے قائم کرنے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ (باقی آئندہ)

مترجم

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

قریش کے ممتاز کنبے حسب ذیل تھے۔

تیم ۔ عبدالدار ۔ اُمیہ ۔ اسد ۔ ہاشم ۔ مخزوم ۔ سہم ۔ عدی ۔ جمح ۔ نوفل
انہیں سے ہر کنبے کے لئے ایک یا ایک سے زائد خدمت معین تھی ۔ خدمات جو اُس وقت رائج تھیں انہیں سے خدمات ذیل ممتاز سمجھی جاتی تھیں۔

(۱) قبہ ۔ یا دوسرے الفاظ میں قبہ برداری ۔ یہ قبہ زمانہ حال کے میگزین کا قایم مقام تھا ۔ مگر کسریٹ اور میگزین دونوں کاموں میں آتا تھا ۔ قوم کے نقل و حرکت کے موقع پر ایک خیمہ ایستادہ کیا جاتا تھا جسے قبہ کہتے تھے اور اس کے اندر سامان رسد اور اسلح رکھے جاتے تھے۔

(۲) رفادۃ ۔ اہل قریش اپنے مال میں سے ایک معینہ رقم نکال کر علیحدہ کر دیتے تھے ۔ یہ رقم صاحب رفادۃ کے پاس جمع ہوتی تھی ۔ اور اس کا مصرف یہ تھا کہ کھانا پکوا کر محتاجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا ۔ قصی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یہی شخص اس مد کا بانی تھا ۔ پہلے اس مد کا اہتمام بنی نوفل سے متعلق تھا ۔ اس کے بعد بنی ہاشم کے خاندان کے سپرد ہوا۔

(۳) مشورۃ ۔ یعنی رائے دینے کی خدمت میں ۔ اس خدمت کے لئے ایک دانشمند اور صائب الرائے بزرگ مامور کیا جاتا تھا اور تمام اہم معاملات میں ہمیشہ اُس سے رائے طلب کی جاتی تھی ۔ یہ خدمت بنی اسد کے خاندان میں تھی ۔ اور جبتک

صاحب خدمت کی رائے حاصل نہیں کرلی جاتی تھی اہل قریش کسی معاملہ میں متفق الرائے نہیں ہوتے تھے۔

(۴) عقاب۔ اہل قریش کے جنگی علم یا نشان کا نام تھا۔ یہ خدمت بنو امیہ کے خاندان سے متعلق تھی۔ اور یہ نشان اسی خاندان کی سپردگی میں رہتا تھا۔ اور جنگ کے موقع پر وہیں سے نکالا جاتا تھا۔

(۵) عمارت۔ یہ خدمت جس شخص کے سپرد ہوتی تھی اس کا یہ فرض ہوتا تھا کہ اس امر کی نگرانی رکھے کہ خانہ کعبہ کے اندر کوئی شخص کوئی فحش یا خلاف تہذیب بات زبان سے نکالنے نہ پائے۔ اور شور وغل نہ مچائے۔

(۶) سقایت۔ یعنی اہتمام آب رسانی۔ مکہ میں پانی کمیاب تھا۔ حاجیوں کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت تھی۔ اس خدمت کا مہتمم یہ انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ چمڑے کے حوض بنواکر خانہ کعبہ کے گرد وپیش رکھے جاتے تھے۔ میٹھا پانی مشکوں اور پکھالوں کے ذریعہ سے اونٹوں پر لایا جاتا تھا۔ یہ حالت چاہ زمزم کی تیاری سے قبل کی تھی۔ جب سے یہ کنواں بنگیا ہے پانی کی سبیلیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ خدمت بنی ہاشم کے خاندان میں تھی۔

(باقی آیندہ)

مترجم

خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

شوہر کے فرایض کیا ہیں؟ - اللہ پاک اپنے کلام[1] مبارک میں ان فرایض کے متعلق کیا ارشاد فرماتا ہے؟ زن و شو کے مبارک رشتہ کے متعلق شوہر کے فرایض کیا کیا ہیں؟ شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟ خطبہ نکاح پڑھے جانے کے وقت اللہ پاک کی بارگاہ میں حاضر ہو کر دنیاوی گواہوں کو شاہد قرار دے کر شوہر کس بات کا معاہدہ کرتا ہے۔

محض ایک ہی لفظ ہے جو سارے معانی پر یکساں حاوی ہے اور وہ کون لفظ ہے؟ "محبت"

اللہ پاک کا ارشاد ہے "شوہرو- اپنی اپنی بیویوں سے محبت رکھو" اور یہی ارشاد پاک احکام ربانی کی ہزاران ہزار شوکت اور جلال کے ساتھ بندوں پر نازل ہوتا ہے - نہایت ہی مختصر مشورہ دیا گیا ہے - مگر جب یہ مشورہ پورے طور پر قبول و منظور کر لیا جاتا ہے اور اس نصیحت پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو اس اختصار میں وہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

---

[1] جس کتاب کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے یہ ایک فاضل عیسائی مصنف کی تصنیف ہے "اللہ پاک کے کلام مبارک" سے یہاں انجیل مقصود ہے۔ اور انجیل مقدس کے کلام ربانی ہونے میں کس مسلمان کو کلام ہو سکتا ہے۔

زمانہ حال میں مصوری کے فن نے ایسی ترقی کی ہے کہ ایک صاحب فن مصور کسی بڑے سے بڑے عریض وطویل روزانہ اخبار کے پورے ایک صفحہ کا عکس ایک ننھی منھی سے کاغذ کے ٹکڑے پر اُتار کر آپ کی پن[۱] میں لگا دے سکتا ہے۔ اگر آپ خوردبین لگاکر اس پن پر نظر ڈالیں گے تو اس انگریزی اخبار کے پورے صفحہ کا ہر ہر لفظ صاف صاف نظر آئیگا۔ ہر ہر نقطہ صاف دکھائی دیگا۔

بعینہ اسی طرح اس مختصر اور جامع لفظ "محبت" کے اندر خیالات۔ نکات۔ مشورات اور ہدایات کی ایک ذخیم کتاب دکھائی دیگی اگر آپ چشم بینا رکھتے ہیں۔ اور ہر ہر لفظ اس کتاب کا فرائض اور ذمہ داریوں سے سرشار نظر آئیگا۔ شوہر کی محبت کن کن امور اور مقاصد پر حاوی ہو سکتی ہے؟۔ ان میں سے بعض کی تصریح سطور ذیل میں کیجاتی ہے۔

پیار۔ محبت آمیز پاسداری۔ ایجاب[۲] وقبول کے وقت جب شوہر بیوی کو نکاح میں قبول کرتا ہے تو اس طرز عمل سے معنوی طور پر گویا وہ اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے ساری دُنیا کی عورتوں میں سے یہ لڑکی اپنے شریک رنج وراحت ہونے کے لئے منتخب کی ہے۔ اور یہ کہ ساری خدائی کی عورتوں میں سے محض اسی ایک

---

[۱] انگلستان میں ٹائی کے اوپر اسکارف پن لگانیکا رواج ہے۔ اس پن کے سرے پر ہیرا یا کوئی اور قیمتی پتھر ہوتا ہے۔ مصنف کا مقصد یہاں اسی اسکارف پن سے ہے۔

[۲] اصل متن میں "نکاح کے وقت جب بیوی کا ہاتھ شوہر اپنے ہاتھ میں لیتا ہے" تحریر ہے مترجم نے بجائے اس فقرہ کے ایجاب وقبول والا فقرہ لکھا ہے۔

لڑکی کو وہ اپنے پیار محبت اور خلوص کا مستحق قرار دیتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ اس وقت معاہدہ کر رہا ہے کہ اس وقت سے لیکر مرتے دم تک وہ برابر اس کے ساتھ پیار محبت اور خلوص کا برتاؤ قایم رکھیگا۔ لہٰذا شوہر کا فرض ہے کہ جب حسن کے سبز باغ میں خزاں آئے۔ جب وہ زمانہ آئے کہ رنج افکار یا علالت کا شکار بن کر اس بھولے بھالے پیارے ملیح چہرے پر جھریاں پڑ جائیں اس وقت بھی شوہر کی محبت چار دن کی چاندنی نہ ثابت ہو بلکہ برعکس اس کے ثابت قدمی سے پختہ مغز ہو کر اس سچے خلوص محبت اور ایثار سے سرشار دل کی وہی قدر کرے جس قدر کا وہ انصافاً ہر طرح مستحق ہے وہ وفا شعار دل جو رنج فکر دکھ درد آرام تکلیف کے مختلف مدارج طے کر کے بڑے بڑے کڑے امتحان پاس کر چکا ہے۔ اور باوجود ایسے سخت امتحانات کے اب تک ویسا ہی صادق ویسا ہی خلوص آمیز اور ویسا ہی محبت سے سرشار ہے حقیقت میں بڑی عزت کا مستحق ہے اور ایسے دل کی قدر نہ کرنا بدترین سفلہ پن اور محسن کشی ہے۔ شرافت۔ اعلیٰ تربیت اور انسانیت کا یہی تقاضہ ہے کہ ہر مہذب اور تربیت یافتہ انسان اپنے عیش و آرام پر اپنی کمزور جنس کی شریک رنج و راحت کے عیش و آرام کو ترجیح دے اور مقدم سمجھے اور اس کی ہر طور پر پاسداری دلدہی اور غمخواری اپنا فرض عین تصور کرے۔ شرافت۔ انسانیت اور کریم النفسی چاہتی ہے کہ جہاں تک امکان میں ہو رنج۔ افکار۔ اور حوادث زمانہ سے مقابلہ کرنے کا بار شوہر اپنے سر رکھے۔ اور ایک نبرد آزما مرد میدان بن کر مصائب سے مقابلہ کے لئے تیار رہے۔ کمزور جنس کی نازک اور نرم دل بیوی ایسی نبرد آزمائی کے لئے نہیں بنائی گئی ہے اور اسے ہر طرح حق حاصل

ہے کہ جب مصائب کی باد مخالف کا طوفان سر پر آئے تو شوہر کا سینہ اس کے بیم و ہراس سے پریشان دل کا امن مستقر اور جائے پناہ بنے۔ بیوی کو قلبی راحت دلی اطمینان اور سکون قلب دینے کے لئے شوہر کو بڑے بڑے مصائب سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہ اس کا فرض ہے اور بیوی ہر طرح امن اور پناہ کی مستحق ہے یہ وہی پاک نفس خاتون ہے جس نے انتقائے خلوص اور وفا سے اپنا تن بدن دل، جان اور ارمان شباب کے ساری امنگیں اور ولولے زندگی کی ساری حلاوتیں خوشیاں ساری عمر کا عیش و آرام شوہر کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنا سارا گھربار۔ اپنے باپ ماں اور اعزا،۔ اپنے بچپن کے انیس و جلیس رفیق و غمگسار سب کو شوہر کا نام لیکر خیرباد کہدیا تھا۔ کنوارپن کے زمانے کی ساری خوشیاں اور تمام دلچسپیاں چھوڑ دی تھیں اور اپنوں سے بیگانہ بن کر شوہر کے گھر آئی تھی کہ شوہر کے گھر کو اپنا گھر بنائے اس امید پر کہ اس کی آئندہ زندگی ایک نامعلوم خوشیوں کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ اس امید پر کہ وہ ساری دنیا کو بھلا کر صرف شوہر ہی کی ہو کے رہے گی اور اسے پاکر دنیا کے کسی گوشہ میں اپنی ڈھائی اینٹ کی مسجد اپنے عیش و آرام اور خوشیوں کی بہشت علیحدہ ہی بنالیگی۔ امیدوں کا ترنم خیز نغمہ اس کے کانوں کو ایک سُریلا زمزمہ سُنا رہا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اس کی دنیاوی بہشت آسمانی بہشت سے بھی اچھی ثابت ہوگی کیونکہ یہاں سوا عیش و آرام سکون قلب سچی محبت اور سچی خوشی کے کچھ نہ ہوگا۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

کون کہتا ہے کہ "قدرت یا تقدیر سے لڑو۔ سب کو معلوم ہے کہ دنیا اگر افکار سے خالی ہو تو دنیا ہی باقی نہ رہے۔ بہشت کہلائے۔ سب جانتے ہیں کہ رنج و فکر آفات اور مصائب ہماری دُنیاوی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ اور اُنہیں قریب نہ آنے دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ یہ سب سہی مگر ایک بات تو ہے جو تمہارے قابو کے اندر ہے۔ وہ کیا ہے۔ خلوص محبّت۔ وفاداری۔ پاسداری۔ غمخواری۔ یاد رکھو کہ جس گھر میں سچی محبت خلوص اور وفا کا نور ہے۔ مصائب۔ رنج۔ افکار اور حوادث کی گھٹا ٹوپ اندھیری کبھی اُس گھر کو تیرہ و تار نہیں بنا سکتی۔ لاکھ یہ اندھیرا اس گھر کو تیرہ و تار بنانے پر تل جائے مگر اُس نور کی منور شعاعیں اس اندھیرے کو چیر کر ایک بار ضرور چمکینگی اور یہ ظلمت کدہ ایک بار پھر عشرت کدہ بنجاویگا۔

(باقی آیندہ)

مترجم

تنقیدات

بعض موقعوں پر شکایتیں سُننے میں آئی ہیں کہ "پیام امید" ایک "اچھا سا ریویو" دینے میں بہت بخیل ہے "پیام امید" کا جواب ہے کہ اچھا سا ریویو چاہتے ہو تو اچھی سی کتاب لاؤ۔ اگر نہیں لاسکتے ہو تو ایسی امید فضول ہے "پیام امید" نہ اپنا معیار گرا سکتا ہے اور نہ حق کے خلاف کوئی لفظ لکھ سکتا ہے۔

"پیام امید" کے ادبی نقاد کے دفتر میں آج ایک اچھی سی کتاب پہنچی ہے

اس کتاب کا نام "لمعات انوار احمدیہ" ہے جو سفید کاغذ پر صاف خط میں چھپی ہے اور اشاعت اسلام بک ڈپو - عزیز منزل - نولکھا - لاہور سے ۱۲ر قیمت پر ملتی ہے - یہ کتاب "پیام امید" کی تقطیع پر ہے اور حجم ۱۴۰ صفحہ ہے -

اس نایاب کتاب پر سرسری نوٹ لکھ کر سر کا بوجھ اتار دینا کتاب - اس کے مضمون اور اس کے مضمون نگاروں اور ایڈیٹر پر بڑا ظلم کرنا ہے - مضامین کا اخلاقی پہلو اس درجہ مضبوط اور مستحکم ہے - مضامین اس درجہ نتیجہ خیز اور نصیحت آمیز ہیں کہ اگر ہم اس کے ہر ہر لفظ کی نقل بھی شائع کر دیں تو بھی ہمارے سارے صفحات بھرتی کے ایک لفظ سے بھی پاک رہیں گے - اس کتاب کا ہر ہر مضمون اس قابل ہے کہ نہ صرف ہر مسلمان مرد عورت لڑکا لڑکی پڑھے اور ان بیش بہا نکات کو جو اس میں ملیں اپنا دستور العمل بنا لے - بلکہ غیر مسلم مرد و زن بھی اس سے ایک بڑی حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں - جن بہترین انسانی صفات کے نمونے ان صفحات کے ذریعہ سے ہمارے پیش نظر کئے گئے ہیں وہ ہر انسان کے لئے قابل عمل ہیں خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو - کیا ہم مسلمان سری کرشن جی اور راجہ رامچندر جی کے اعلےٰ اوصاف اور بہترین انسانی خوبیوں کے روشن کارنامے ادب اور عزت کے ساتھ نہیں دیکھتے ؟ - بھلائی - نیکی - صداقت - ایثار - پاکبازی - دیانت - شرافت - انکسار - مہمان نوازی - بہادری - حق پرستی کی قدر ہر مذہب و ملت میں یکساں ہے - اور جو کتاب ایک دلنشین پیرائے میں یہ سبق سکھاتی ہو اُسے کون نہ پڑھیگا ! علیٰ ہذا اگر بعض ایسے ہی مضامین سے ہم اپنے مختصر رسالہ کے سارے اوراق بھی بھر دیں تو کون شکایت کریگا کہ ہم نے کیوں ایک ہی مضمون پر سارے صفحات

سیاہ کر کے دہر دیئے!

اس مختصر کتاب میں کل ۲۶ مضامین ہیں۔ جن میں سے ۱۷ مضامین ایڈیٹر کے لکھے ہوئے ہیں باقی مضامین مضمون نگاروں کے ہیں۔ یعنی دو مضمون جنا ب مولوی صدر الدین صاحب بی اے مسلم مشنری کے ہیں۔ ایک جناب مولوی محمد علی صاحب ایم اے مترجم کلام اللہ کے قلم کا ہے۔ دو شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی کے ہیں۔ ایک مسٹر۔ ایس۔ ایچ لیڈر کا۔ ایک مولوی یحییٰ العزیز پارکینسن ڈاکٹر آف فلاسفی کا اور ایک پروفیسر نور الدین اسٹیفن کا۔ مولینا یحییٰ العزیز پارکینسن کے نام سے ناظرین "اشاعت اسلام" نا آشنا ہوں گے۔ البتہ انہیں ایک قسم کی مایوسی سی ہوئی ہوگی کہ اس فہرست میں ان کے پرانے دوست مولینا ڈوڈلے رایٹ صاحب کا نام کیوں نہیں ہے (ہم اپنے معزز قابل رشک یورپین نومسلم فاضل بھائیوں کو جن کے علمی ادبی اور مذہبی معلومات ہمارے کسی ایشیائے فاضل مولوی سے کم نہیں ہیں بجائے مسٹر کے مولوی یا مولینا کہنا زیادہ پسند کریں گے)۔ ہمارے نقطہ خیال سے اتنی کمی ضرور محسوس ہو رہی ہے کہ زمانہ حال کے رواج کے موافق ایڈیٹر کے قلم سے کوئی مختصر سی تمہید ہی کیوں نہ لکھوا دی گئی اگر پورا مقدمہ لکھنے کے لئے انہیں وقت نہ مل سکا تھا۔ ان کے دستخط اور تاریخ اور مقام سے آیندہ اتنا پتہ تو چل سکتا کہ طبع اوّل کی ترتیب فلاں وقت میں فدں مقام پر ہوئی تھی اور فلاں صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ موجودہ صورت میں تو ایڈیٹر صاحب کا نام تک بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ گو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ غالباً مولینا خواجہ کمال الدین ہی ایڈیٹر ہیں۔ کتاب کی لوح پر بھی مولف صاحب کا نام نہیں ہے۔ بیسویں صدی کی چھپی ہوئی کسی موقر تالیف یا تصنیف

ہیں اس قسم کی فروگذاشت قابل معافی نہیں سمجھی جاسکتی۔ زبان کے اعتبار سے سخت گیری کرنا ہمیں بالکل بیجا نظر آتا ہے۔ اور چونکہ ہمارا اسلامی مشن ہمارے پنجابی بھائیوں کے ہاتھ میں ہے ہم اہل نظر سے سفارش کرتے ہیں کہ ان خامیوں کو نظرانداز فرمائیں۔ وہ اپنا اصلی کام انگریزی زبان میں کر رہے ہیں۔ اس زبان پر وہ اچھی طرح قادر ہیں۔ اگر ترجمہ میں زبان کی کچھ خامیاں باقی رہجائیں تو انہیں نظرانداز فرمائیے۔

یہ انتہائی حد تھی جس کے آگے ہمارا قلم نہیں چل سکتا۔ اب خامیوں کا باب ختم ہوا۔ اور وقت آگیا ہے کہ اس بیش بہا تالیف کے محاسن پر نظر ڈالی جائے۔ جگہ کی قلت ہمیں مجبور کر رہی ہے۔ ہر ہر مضمون پر سرسری نظر ڈالنے کیلئے بھی ہمارے پاس کافی وسعت نہیں۔ ہم یہی غنیمت سمجھتے ہیں کہ خاص خاص مضامین کے خاص خاص نکات پر ناظرین کی توجہ مبذول کرائیں۔

چوتھے مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ جناب سرور کائنات انسانیت کا ایک کامل نمونہ اور ہادی تھے۔ پروفیسر رینان نے حضرت مسیحؑ کی نسبت لکھا ہے کہ "مذہب نے اس انسان کو انسانیت کا ایک کامل نمونہ منتخب کرنے میں ہرگز کوئی برا انتخاب نہیں کیا"۔ فاضل اڈیٹر صاحب فرماتے ہیں کہ قابل پروفیسر صاحب کی تحریر صداقت سے دور اور تعصب کی تنگ نظری کا نمونہ ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ انسانیت کا کامل نمونہ صرف وہی انسان کہا جاسکتا ہے جو انسانی زندگی کے مختلف مدارج مختلف حیثیتوں اور مختلف صورتوں سے منزل بمنزل طے کرنے کے بعد ہر ہر منزل پر ایک ایسا نشان راہ چھوڑ آیا ہو جو بنی نوع انسان کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے

لئے کار آمد اور رہبر بن سکتا ہو۔ انسانی زندگی کے مختلف مدارج سیاسی اعتبار سے بادشاہ ۔ مدبر۔ مقنن۔ جنرل ۔جج وغیرہ کی زندگی ہو سکتی ہے ۔ سوسائٹی کے اعتبار سے یہ مختلف مدارج ۔ شوہر ۔ باپ ۔ بیٹا ۔ ہمسایہ وغیرہ ہو سکتے ہیں ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی موقع بحیثیت بادشاہ ۔ مدبر۔ مقنن ۔ جنرل یا جج وغیرہ کے زندگی بسر کرنے کا نہیں ملا ۔ نہ بحیثیت شوہر یا باپ کے انہوں نے زندگی بسر کی انسانی زندگی کے ان مختلف مدارج کے متعلق جناب مسیحؑ کی زندگی سے کوئی سبق تلاش کرنا فضول ہے ۔ کوئی سبق مؤثر نہیں ہو سکتا جب تک خود معلم انہیں اصولوں پر خود عامل ہو کر اپنے متعلمین کو نہ دکھا دے ۔ محض زبانی ہدایت کرکے علیحدہ ہو جانا تعلیم کی تکمیل نہیں کرتا ۔ جب یہ صورت ہے تو حضرت مسیحؑ کیونکر "انسانیت کے کامل نمونہ" مانے جا سکتے ہیں !۔ برعکس اس کے ہمارے رسول کریمؐ ان مختلف مدارج میں سے ہر ہر درجہ کو خود بنفس نفیس طے فرما چکے ہیں اور ہر ہر منزل پر ایسے ایسے قابل تقلید نمونے نسل انسانی کے لئے چھوڑ گئے ہیں جو تیرہ سو برس سے دنیا کے لئے ایک پاک زندگی کی جیتی جاگتی مثال کے لازوال نمونہ بنے ہوئے ہیں اور اسی طرح قیامت تک بنے رہیں گے ۔ مولینا فرماتے ہیں کہ وہ انسانیت تہذیب اور شرافت کے قابل تحسین اصول جو ہیگ کانفرنس نے اب جا کے قائم کئے ہیں اسلام میں تیرہ سو برس سے قائم ہیں ۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہی ہے کہ ہیگ کانفرنس کے قائم کئے ہوئے اصول جو جنگ کی حالت میں بین الاقوامی اصول تو مانے گئے ہیں مگر اُن پر کوئی عمل نہیں کرتا ۔ محض اس وجہ سے کہ یہ اصول ہمارے اپنے قائم کئے ہوئے ہیں ۔ اور جن قوموں نے انہیں قائم کیا تھا وہی قومیں اُن مسلمہ اصولوں سے

انحراف کی گناہگار ثابت ہو رہی ہیں۔ مگر اسلامی اصول جو بانی اسلام صلعم یا اُن کے خلفائے راشدین نے قایم کر دیے ہیں دُنیائے اسلام اُنہیں احکام دینی ہیں داخل سمجھکر آج تک اُن پر عامل ہے۔

اس کے بعد "روحانیت کا ایک سچا نمونہ" قابل ذکر ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ جناب سرورِ کائنات صلعم روحانیت کا ایک سچا نمونہ تھے۔ فاضل ایڈیٹر فرماتے ہیں کہ روحانیت کے دو ضروری اجزا مسکینی اور فروتنی ہیں۔ مگر ان بہترین انسانی صفات کا ظہور اگر ایسی ذات سے ہو جسے کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل ہی نہیں ہوا تھا تو ان خوبیوں کا کوئی گہرا نقش ہمارے قلوب پر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے معنی عصمت بی بی از بے چادری ہوں گے۔ ہاں البتہ اگر یہی اوصاف ایک ایسی ذات میں پائے جائیں جو دولت حکومت قدرت اور اقتدار سے مالا مال ہو مگر باوجود اس کے وہ نیک نیت پاک نفس منکسر المزاج حلیم اور بردبار ہو تو البتہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے اخلاقی سبق کا کام دیتے ہیں۔ جناب رسالت مآب صلعم افلاس سے بادشاہت کی حالت پر پہونچ گئے مگر اس تبدیلی سے کیا اُن کے انکسار۔ خلق۔ مروت۔ رحم۔ بُردباری مسکینی اور فروتنی میں کوئی انقلاب پیدا ہوا؟ کیا آپ نے کوئی دولت جمع کی یا جائداد پیدا کی؟ آپ کو وہ قدرت اور وہ اقتدار حاصل تھا جو بڑے بڑے بادشاہوں کو حاصل نہ تھا مگر آپ ہمیشہ نمایش سے متنفر رہے۔ تکبر سے پاک رہے۔ ظاہری شان و شوکت کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ نہ شاندار وردیوں سے زرق برق خدم و حشم تھے۔ نہ ہٹو بچو کے پکار سے آپکی سواری نکلتی تھی اور نہ کوئی گارڈ آف آنر یا باڈی گارڈ تھا۔ یہی سچی روحانیت

تھی جو غربت اور اقتدار کے وقت برابر یکساں ایک ہی رنگ اور ایک ہی صورت میں جلوہ افروز رہی - آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص غربت اور افلاس کی حالت میں انکسار نرمی اور فروتنی سے بسر کرتا ہے اس کے لئے یہ باتیں قدرتی ہیں - البتہ جو شخص طاقتور اور دولتمند ہو کر اُسی رنگ پر قائم رہتا ہے - اس کی روحانیت فی الحقیقت امتحان کے دائرہ سے نکل کر اپنی پختگی پر مہر صداقت لگا دیتی ہے

پھر فرماتے ہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال اپنے مخالف کے سامنے کر دینے والی تعلیم اگرچہ بہت ہی انکسار اور نیکی کی تعلیم ہے - مگر دنیا میں اس نیکی کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی - تواریخ عالم کے صفحات ایسی خیالی نیکی کی مثال سے خالی ہیں - برعکس اس کے بانی اسلام صلعم کی تعلیم عملی تعلیم ہے - جس کا عامل خود معلم تھا اور متعلمین اس پر آجتک عامل ہیں اور ہمیشہ رہیں گے ناقابل عمل تعلیم کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی - (باقی آئندہ)

ادبی نقّاد

کیلہ کا حلوہ یورپین ترکیب سے

اچھے قسم کے کیلے کی پکی پھلیاں لیکر پوست اُتار ڈالئے - پھر اس کے گول گول باریک ٹکڑے کاٹئے - پڈنگ بنانے والے ظرف میں ایک تہہ مکھن کی لگا کر اُس کے اوپر ایک موٹی تہہ ان کیلے کے ٹکڑوں کی لگائیے اور اوپر سے دو بڑے چمچوں کی مقدار میں شکر چھڑک دیجئے - اس کے بعد کاغذی لیموں کا

عرق بمقدار پسند اوپر سے نچوڑ کر ڈبل روٹی کے باریک باریک ریزے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی ایک تہ بچھا دیجئے۔ یہ سب مل کر ایک تہ ہوئی۔ اس طرح پھر دوسری تہ اسی ترتیب سے کے ساتھ لگائے اور جب تک پورا ظرف لبالب بھر نہ جائے اسی طرح تہ بہ تہ جماتے جایئے۔ جب ظرف پُر ہو جائے تو اوپر سے پگھلا ہوا مکھن ڈال دیجئے اور کوئلوں کی دھیمی آنچ پر رکھ کر آہستہ آہستہ پکنے دیجئے۔ جب اوپر کا حصہ ہلکے بادامی رنگ کا ہو جائے تب اتار کر نوش جان فرمایئے۔

موسو

یہ دوا اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں تمام دردوں مثلاً وجع المفاصل۔ نقرس۔ گٹھیا۔ عرق النسا، درد پشت۔ فالج۔ ادھرنگ۔ ذات الصدر ذات الجنب۔ خارش جسم وغیرہ۔ جیسی تمام شکایت کو رفع کرنا اس کا اصلی کام ہے۔ یہ مالش کرنے کی صورت میں اپنا اثر فوری دکھاتا ہے۔ اکثر بادی۔ بلغم اور ریح وغیرہ یا بے اعتدالیوں کی وجہ سے بڑھاپے میں جس کو ایسے دردوں کی تمام شکایات پائی جاتی ہیں ان احباب کے لئے موسو کا استعمال نہایت مفید ہے۔ بطور حفظ ما تقدم اسکی مالش سے آنے والی شکائیتیں رک جاتی ہیں۔ ایک بکس جس کی قیمت صرف ۱۲؍ ہے مدت کے لئے کافی ہے۔

جس کا درد وہی جانتا ہے دوسرا کیوں کر جان سکتا ہے

یوں تو کوئی ایسا مرض نہیں جس کی تکلیف سے مریض نالاں اور پریشان نہو مگر دمہ کے مریض خاصکر دمہ کی ناقابل برداشت تکلیف سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور راتدن سانس پھولنے کی وجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند حرام ہوجاتی ہے دیکھئے آج ان کو کسقدر تکلیف ہے لیکن افسوس ہے کہ اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیا دھتورہ بھنگ بلاڈونا۔ پوٹاش ای اوڈ ائڈ دیگر بنتی ہیں اس لئے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا۔ ایک انمول جوہر ہے۔آپ نے بہت خرچ کیا ہوگا۔لیکن ایک مرتبہ اسے بھی آزمالیں قیمت عہ فیشیشی محصول ڈاک ۵/

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی خون سے ہے اسلئے خون صاف رکھنا ضروری ہے اور اسکی ترکیب بھی آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی اوڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں پوٹاش ای اوڈائڈ دغیرہ کئی ایک آزمودہ ادویات ملا کر بنتا ہے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے۔گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ گیا ہو تو اس کو استعمال کیجئے۔ اگر آپ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو تندرست رکھنا چاہتی ہوں تو لال شربت پلادیں کلیجہ کی کمزوری کھانسی ولاغری کو دور کرنا چاہتی ہوں تو

لال شربت

پلادیں پیدایش کے وقت سے ہوشیار ہونے تک دوا یکساں فائدہ کرتی ہے پینے میں شیریں اور رنگ سرخ ہونے کی وجہ سے لڑکے خواہش سے پیتے ہیں قیمت ۱۲ر فی شیشی محصول ڈاک ۴ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

شیکسپیر اردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار ،	چھائی ہوئی ظلمت شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت	اُلفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان	ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی	کانوں میں صدائے یار آئی

فہرست مضامین پیام امید بابتہ ماہ ستمبر ۱۷ء



امید کا پیام .... اُٹھو .... اُٹھو .... اور آگے بڑھو!

پیامِ امید

نمبر ۲۹	محمود آباد ۔ سیتا پور ۔ ستمبر ۱۹۱۷ء	جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے ۔ اسمیں جنس کی قید نہیں جس حال میں ہم مستورات مرد ایڈیٹروں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے سیکڑوں اخبار اور رسالے برابر بے تکلف پڑھ رہی ہیں روشن خیال مردوں کے طبقہ سے اس حد تک مایوسی نہیں ہے کہ انھیں ہمارے طبقہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ پڑھ لینا بھی گراں گزرے گا تعلیم یافتہ اور روشن خیال مردوں کا طبقہ ہماری سوسائٹی کا بہترین طبقہ ہے اور ہمیں اس معزز طبقہ کے خلاف ایسی یک طرفہ رائے قائم کر لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

ناچیز "پیام اُمید" معزز اخبار "پائنیر" کے نقطۂ خیال سے

الہ آباد کا مشہور زمانہ انگریزی روزانہ اخبار پائنیر اپنی اشاعت مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۷ء میں ایک لیڈر کے ذریعہ سے "پیام امید" کے متعلق یوں اظہار خیالات کرتا ہے۔

ترجمہ لیڈر (نوٹ) مندرجہ اخبار "پائنیر" الہ آباد مورخہ ۱۴ رجولائی ۱۹۱۷ء صفحہ اوّل کالم ۴۔

"دو برس کا زمانہ گذرا کہ اُس وقت سے صوبجات متحدہ کی ہندوستانی اخبار نویسی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے مگر پبلک نے اس پر اتنی توجہ نہیں کی جتنی توجہ کا وہ مستحق تھا۔ میرا مقصد "پیام اُمید" کے عالم وجود میں آنے سے ہے جس کے اندر سوشل۔ ادبی۔ تعلیمی اور فی الحقیقت ہر قسم کے دلچسپ مضامین کے باستثناء سیاسی مضامین کے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر اور روح رواں آزاد بیگم ایک سرکاری ملازم اظہر علی کی اہلیہ ہیں۔ جو رسالہ کی اوّلین اشاعت کے وقت تحصیل کرہل ضلع مین پوری میں تحصیلدار تھے۔ اُس وقت سے آجتک یہ رسالہ برابر قابل تعریف پابندی وقت کیساتھ ماہ بماہ شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ میں بیشتر مضامین ایڈیٹر ہی کے قلم سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو ہمیشہ پُر مغز اور زوردار ہوتے ہیں اور جن سے اس خاتون کی ذہانت اور صاحب فہم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حال کے پرچے یعنی جولائی نمبر میں ایک طویل اور دلچسپ مضمون ایڈیٹر ہی کے قلم کا ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ سے بعض سربرآوردہ مسلمان لیڈران قوم کی رائے کی نکتہ چینی کی گئی ہے جو اِن حضرات نے تعلیم کے مسئلہ پر ظاہر کی تھی۔ ان حضرات نے جن میں سر علی امام کے سے مشہور و معروف نام شامل ہیں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مسلمانوں کی سوشل اور ملکی ترقی کا مدار محض تعلیم ہی پر ہے اور بتایا تھا کہ قوم کے سارے اسقام اور

آلام کا علاج سوا ترویج اور تعمیم تعلیم کے اور کچھ نہیں ہے - خاتون موصوف کہتی ہیں
کہ اگر "تعلیم" سے مطلب وہی رائج الوقت تعلیم ہے جو گذشتہ ایک صدی سے
دیکھا رہی ہے تو ایسی تعلیم پاکر کبھی قوم اس قابل نہ بن سکیگی کہ دنیا کی ترقی کرنیوالی قوموں
کے ساتھ مل کر دوش بدوش کھڑی ہو سکے - ان کا قول ہے کہ باوجود صد سالہ تعلیم کے
آجتک سرزمین ہند میں ایک سوئی ایک پن ایک بٹن بنانیوالا موجود نہیں ہے ایجاد
واختراع کرنا تو درکنار ہم میں کوئی ایسا متنفس بھی نہیں ہے جو رائج الوقت اشیاء
مثلاً بائیکل - ٹائپ رائٹر - گراموفون وغیرہ بنا سکے - موجودہ تعلیم کے دوسرے
پہلوؤں پر بھی ایڈیٹر صاحبہ بہت کچھ روشنی ڈالتی ہیں مثلاً وہ شاکی ہیں کہ زمانہ حال
کے تعلیم یافتہ بچے نہ والدین اور بزرگوں کا ادب کرتے ہیں اور نہ برابر والوں سے
ملنے جلنے نشست و برخاست کے آداب سے واقف ہیں - اس کے بعد ایڈیٹر صاحبہ
اس سے بھی زیادہ کاری ضرب موجودہ تعلیم پر لگاتی ہیں جب وہ کہتی ہیں کہ زمانہ
حال کے طلبا محض اسیقدر معلومات بہم پہنچا لیتے ہیں جتنے امتحان پاس کرلینے کے
لئے ضروری ہیں - امتحان پاس کرلینے کے بعد کتاب طاق نسیاں پر رکھ کر سارا
سبق بھلا دیتے ہیں - یہ رسالہ آگرہ میں چھپتا ہے اور محمود آباد ضلع سیتاپور سے
جہاں ایڈیٹر صاحبہ کے شوہر بسلسلہ ملازمت تعینات ہیں شائع ہوتا ہے - ہم اس
رسالہ کی تمام علم دوست شایقین سے سفارش کرتے ہیں جو اردو علم ادب سے دلچسپی
رکھتے ہوں اور جنھیں صاف سلیس شگفتہ اور دلکش عبارت اور طرز ادا سے
رغبت ہو"

مشہور فاضل اور مستند ادیب عالیجناب آرچی ڈیوہرسٹ صاحب بہادر

باقاعدہ ڈسٹرکٹ جج گونڈہ کی سرپرستی اور معزز ہمعصر "پانیر" کا حسن ظن ناچیز رسالہ "پیام اُمید" کی ترقی کے لئے کافی ضمانت ہو سکتے ہیں۔ اگر اب بھی رسالہ کی مالی حالت مستحکم اور قابل اطمینان بنا دینے پر قوم اور ملک توجہ نہ کرے تو ہم اسے اپنی بڑی ہی بدقسمتی خیال کریں گے۔

مجھے بیحد ندامت اور سخت افسوس ہے کہ آخرکار مجبور ہو کر آج اپنی معزز بہن ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی" لاہور کے خلاف مجھے قلم اُٹھانا پڑتا ہے۔

معزز اخبار "شریف بی بی" نے اپنی ۱۴ مئی ۱۹ ء کی اشاعت کے ذریعہ سے "پیام اُمید" پر در پردہ حملہ کیا تھا۔ اور محترمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ کی کھلی چٹھی میں یہ فقرہ شائع کر دیا تھا کہ "..... سوا شریف بی بی" کے اور کسی زنانہ اخبار یا رسالہ کی ایڈیٹر عورت نہیں ہے" اگر محترمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ سے ایک فروگذاشت ہو گئی تھی تو ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی کو پورا موقع اصلاح کا حاصل تھا۔ اگر وہ اس چٹھی سے وہ فقرہ نکال ڈالنا مناسب نہیں خیال فرماتی تھیں تو اس کے نیچے "پیام اُمید" کے متعلق ایک نوٹ اضافہ فرما سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے بلاتاخیر محترمہ کرمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ اور کرمہ ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی" کے نام خطوط بھیجے اور اس فروگذاشت کی تلافی کی درخواست کی۔ محترمہ خواجہ بانو صاحبہ نے تلافی کر دی اور ایک خط اس کے متعلق ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی" کی خدمت میں بھی بھیجدیا تاکہ وہ بھی مناسب تلافی کر دیں۔ خواجہ بانو صاحبہ سے اب مجھے کوئی شکایت باقی نہیں رہی۔ بلکہ برعکس اسکے میں اُن کی پاک نفسی اور نیک نیتی کی مرہون منت ہوں کہ انہوں نے اپنی شرافت اور

بزرگی سے وہی کیا جو اُن کی شان کے شایاں تھا۔ مگر معزز ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی" نے نہ میرے خط کا کوئی جواب عنایت فرمایا اور نہ محترمہ مکرمہ خواجہ بانو صاحبہ ہی کی تحریر کی تعمیل کی۔ حالانکہ اُن کے لئے خواجہ بانو صاحبہ کی چٹھی کا شائع کر دینا ہی کافی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اپنی طرف سے کوئی نوٹ بھی نہ لکھتیں تو بھی چنداں مضائقہ نہ تھا اور میں اس کا کچھ خیال نہ کرتی۔ مگر معزز بہن کا طرز عمل بحالت موجودہ میری رائے ناقص میں ایک بڑی حد تک قابل شکایت ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے خط اور تاکید کا کافی انتظار کر لینے کے بعد رسالہ کے جولائی نمبر کے ذریعہ سے اس کی باضابطہ شکایت کی۔ اس پر بھی معزز بہن نے توجہ نہ فرمائی۔ اس کے بعد پھر اگست نمبر کے ذریعہ سے بھی شکایت کی۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ ۱۴ رمئی اور یکم اگست کے درمیان میں ڈھائی مہینے کا وقفہ کافی مدت انتظار کی سمجھی جاسکیگی اور اتنے موقعے دینے کے بعد مجبور ہو کر میرا قلم اُٹھانا قابل معافی متصور ہوگا۔

معزز بہن ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی" سے میری مودبانہ التجا ہے کہ ایسا طرز عمل اختیار کر لینے سے دنیا کو یہ سمجھ لینے کا موقع نہ دیا جائیگا۔ کہ "سوا شریف بی بی کے اور کسی زنانہ اخبار یا رسالہ کی ایڈیٹر عورت نہیں ہے" اور یہ طرّہ "شریف بی بی" کی دستار فضیلت پر باقی نہ چھوڑا جائیگا۔ محض اس وجہ سے کہ یہ جھوٹا طرّہ ہے۔ میں اس تحریر کی رو سے معزز ایڈیٹر صاحبہ "شریف بی بی" کو باضابطہ نوٹس دیتی ہوں کہ اگر وہ اس نمبر کی اشاعت کی تاریخ (یعنی یکم ستمبر ۱۷ء) سے دو ماہ کے اندر

(۱) اپنے معزز اخبار "شریف بی بی" کے ذریعہ سے فقرہ محولہ بالا باضابطہ طور پر

واپس نہ لیں گی اور

(۲) محترمہ مکرمہ لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ کی دوسری چٹھی لفظ بلفظ شائع نہ فرماوینگی

اور

(۳) اپنے اوّل سے آخر تک کے طرزِ عمل کے متعلق صاف الفاظ میں اپنا قصور تسلیم کر کے اپنے معزز اخبار کے ذریعہ سے معافی نہ مانگ لیں گی۔ تو دو ماہ مذکورۂ بالا کی میعاد ختم ہونے کے بعد ان کے اور ان کے معزز اخبار کے خلاف عدالتہائے فوجداری و دیوانی کے ذریعہ سے مناسب چارہ جوئی کیجائیگی۔

معزز ایڈیٹر صاحبہ موصوفہ کی اطلاع کے لئے عرض کرتی ہوں کہ

(۱) از روئے قوانین مجریہ وقت یہ نالشات "پیام امید" کے مقام اشاعت کی حدود ضلع کے اندر دائر ہو سکتی ہے۔

(۲) بار ثبوت اس امر کا کہ "پیام امید" کی ایڈیٹر عورت نہیں ہے ذمہ مدعا علیہ ہوگا۔ اور

(۳) رسالہ کے دفتر میں معزز ایڈیٹر صاحبہ شریف بی بی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط موجود ہیں جو مدعا علیہ کی نیک نیتی کی منافی شہادت بن سکتے ہیں۔ ان میں سے خطوط مورخہ ۱۶ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ایک خط کا ایک فقرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"میں اس رسالہ کو سب سے زیادہ اس وجہ سے پسند کرتی ہوں کہ یہ صنف نازک کے ایک لائق ممبر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ خداوند کریم آپ کو اس سے زیادہ قوم اور ملک کی خدمت کی توفیق عطا کرے۔" پھر آپ تحریر فرماتی ہیں کہ "پیام امید" واقعی پیام امید ثابت ہو۔"

ایک خط آپ اس فقرہ کے ساتھ ختم فرماتی ہیں " آپ کی ہمت کی مداح فاطمہ بیگم ایڈیٹر شریف بی بی" ان خطوط کے اقتباسات رسالہ کے اکتوبر نمبر ۱۹۵۱ء کے صفحہ ۴۵ پر شائع ہو چکے ہیں جو معززہ ایڈیٹر صاحبہ کی فائل میں ملیں گے - انہیں بھی ملاحظہ فرمالیں -

میں اپنی معزز بہن کو کافی موقع دے چکی ہوں - اور پھر اب بھی دو مہینے کی کافی مدت دے رہی ہوں - معزز بہن انصاف کریں کہ میں اس معاملہ میں کس حد تک تقصیروار ٹھہر سکتی ہوں - مگر اپنی اور اپنے رسالہ "پیام امید" کے حفظ امن میں مجبوراً مجھے یہ ناگوار روش اختیار کرنا پڑ رہی ہے - اب بھی وقت نہیں گیا ہے - اگر معزز بہن میرے معروضات پر توجہ فرمانا اپنی توہین نہ خیال فرمائیں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے -

جہاں تک میرے امکان میں ہے ناگوار پہلو اختیار کرنے سے گریز کر رہی ہوں - مگر ایک ہاتھ سے تالی بجنا غیر ممکن ہے معزز بہن اب بھی اگر چاہیں تو مجھے طوالت اختیار کرنے سے بچا لے سکتی ہیں - ورنہ اختیار بدست مختار - یہ میری آخری تحریر ہے اور اسے وہ میرا الٹی میٹم (Ultimatum) سمجھ لیں -

آزاد بیگم





ڈاکٹر اسمائیلس کیریکٹر

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فرایض منصبی کی انجام دہی ایک ایسی قوت ثابت ہوئی ہے جس کے سہارے سے اعلیٰ ترین اوصاف انسانی سے متصف اشخاص کو تقویت پہنچتی رہتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فرائض منصبی کی انجام دہی کا تعلق ایسے کاروبار سے ہے جو روزمرہ کی زندگی میں معمولی طبقہ کے انسان اداکیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ نہ اہل زر ہوں نہ صاحب جائداد ہوں نہ ذی علم ہوں نہ اہل حکومت و اقتدار ہوں مگر باوجود اس کے قوی دل اور بلند حوصلہ ہوں۔ دیانت دار ہوں۔ راستباز ہوں۔ فرائض کے پابند ہوں۔ جو شخص اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں دیانت داری سے سعی بلیغ کرتا ہے وہ اس مقصد کی تکمیل میں سعی کرتا ہے جس کے لئے اس کے خالق بے نیاز نے اُسے مخلوق کیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اپنے دل و دماغ کے اندر اُن اصولوں کو جاگزیں کرتا ہے جو مردانہ اوصاف (کیریکٹر) کی بنا ہیں۔ دُنیا میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جن کی نسبت صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالم اسباب کے مقبوضات میں سے سوا کیریکٹر (بہترین انسانی اوصاف) کے وہ کسی شے کے مالک نہیں ہیں۔ مگر باوجود اس کے وہ اُن بیش بہا اوصاف پہ ایسی سخت گیری سے جمے رہتے ہیں جیسے ایک تاجدار شاہنشاہ اپنی مملکت مقبوضہ پر۔

دماغی تربیت کا کوئی تعلق پاکبازی یا نیک چلنی سے نہیں ہے۔ انجیل مقدس میں بارہا انسان کا دل اور انسان کی روح مخاطب کی گئی ہے۔ مگر انسانی دماغ کو مخاطب

کرکے کوئی ارشاد نہیں آیا ہے۔ اگر آیا ہے تو شاذ و نادر۔ جارج ہربرٹ کا مقولہ ہے۔ کہ ایک مٹھی نیک چلنی کی زندگی برابر ہے ایک من علم کے۔ اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ علم کی تحقیر کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ علم اور نیک عمل کو ساتھ ہی ساتھ چلنا چاہئے۔

بعض اوقات دماغی قابلیت بدترین اخلاقی عیوب سے دوش بدوش پائی گئی ہے مثلاً بعض اعلیٰ دماغی قابلیت رکھنے والے ایسے پائے گئے ہیں کہ بلند پایہ حکام کی جھوٹی خوشامد میں ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ نخوت رعونت اور فرعونیت کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ ممکن ہے کہ کوئی شخص زباندانی علوم اور فنون میں کامل نہ ہو مگر باوجود اس کے دیانت، نیکی، راست بازی اور اپنے فرائض منصبی کی مناسب انجام دہی کے اعتبار سے اس کا پایہ بہت سے غریب جاہل دیہاتیوں سے فروتر ہو۔

پرتھن نے اپنے ایک دوست کو فقرات ذیل لکھے تھے " تمہارا اصرار ہے کہ ذیعلم لوگوں کی ضرور عزت کی جائے۔ میرا جواب ہے کہ آمین۔ مگر اس کے ساتھ تمہیں بھول نہ جانا چاہئے کہ وسیع الخیالی۔ باریک نظری۔ رفعت مضامین میں صحیح امتیاز دنیا کا تجربہ۔ سوسائٹی کے آداب رکھ رکھاؤ اور آپس میں مناسب برتاؤ قائم رہنے کے متعلق معلومات رکھنا۔ دانشمندی اور تدبر کے ساتھ موقعہ ومحل کے اعتبار سے مناسب طرز عمل اختیار کر لینے کا سلیقہ اور وقت آنے پر اپنی ساری قوت صرف کرکے مصروف کار ہو جانا۔ صداقت۔ دیانت۔ ملنساری یہ تمام باتیں ایسے شخص میں موجود نہ ہونا ہمیشہ ممکن ہے جو باوجود ان ساری خامیوں کے بہت ہی ذیعلم ہو۔

سر والٹر اسکاٹ کی سماعت میں کسی شخص نے علمی جوہر اور استعداد کی تعریف میں یہ دعویٰ پیش کیا کہ علم ساری دنیا کی فضیلتوں میں بہترین فضیلت ہے اور یہ کہ ساری

دنیا کی فضیلتوں پر اس فضیلت کی ترجیح اور عزت ہونا چاہئے - سر والٹر جواب میں گویا ہوئے "اللہ کی پناہ! جس دن اس اصول پر عمل شروع ہوگا دنیا کی شامت آ جائے گی - میں نے بہتیری کتابیں دیکھ ڈالی ہیں اور مجھے بہت سے ممتاز اور تربیت یافتہ لوگوں سے گفتگو کرنے اور ان کی حالت پر نظر تعمق ڈالنے کا موقع مل چکا ہے - مگر یقین مانو کہ میں نے تو غریب جاہل مرد اور عورتوں ہی کو ان سے اچھا پایا - آخر الذکر طبقہ کے مرد اور عورتوں کی زبان سے مصائب مشکلات اور سخت صدمات سے مقابلہ کرنے کی حالت میں جیسی صبر استقلال اور خود فراموشی کی باتیں ان کی اپنی یا اپنے ہمسایہ اور دوستوں کی مصائب کے متعلق سنی ہیں وہ باتیں ایسی سبق آموز ہیں کہ باستثنا انجیل مقدس کے اوراق کے میں نے کہیں اور نہ دیکھیں نہ سنیں - اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے اصلی پیشہ کی حرمت کی تعلیم دی جائے تو یہ بات حاصل کرنا غیر ممکن ہے تا وقتیکہ ہم اس امر کو بخوبی تمام ذہن نشین نہ کرلیں کہ دل[1] کی تربیت کے مقابلہ میں باقی اور ہر تعلیم محض برائے بیت ہے" (باقی آئندہ)

مترجم

---

[1] علوم اور فنون کی تعلیم دماغ کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے - مگر شرافت - نیکی - بردباری منکسر المزاجی فیاضی - خدا ترسی وغیرہ کی تعلیم دل کی تربیت میں داخل ہے - سر والٹر کا مقصد ہے کہ دماغی تربیت پر دل کی تربیت مقدم اس وجہ سے کہ دماغ کو علوم اور فنون سے بھر لینا دنیا کے لئے چنداں مفید نہیں ہے جتنا کہ نیک طبیعت - پاکباز - خدا ترس اور شریف ہونا مفید ہو سکتا ہے -

مترجم

مشرق اور مغرب

(معمہ کے لئے جون نمبر ملاحظہ ہو)

مغرب - معاف کرنا مگر ایشیائی طریق پر زندگی بسر کرنیوالے بعض باتوں میں بڑے ہی بے تمیز ہوتے ہیں - اُن کی دھوتی نیم برہنگی کی وضع ہے - گھٹنیاں ہر وقت کُھلی ہی رکھتے ہیں - کوئی مہذب آدمی اس طرح گھٹیاں اور آدھی ٹانگ کھول کر سر بازار نیم برہنہ نہیں پھر سکتا - بالخصوص اس نیم برہنہ وضع میں شریف مستورات یا تربیت یافتہ مہذب اعلیٰ طبقہ کی یورپین لیڈیوں کے سامنے آجانا تو انتہائے بے تمیزی ہے!

مشرق - تمہارے اس خیال پر میرا بھی چوب قلم سے صاد ہے - اعتراض تو بالکل ہی صحیح ہے - مگر مشکل یہ ہے کہ اس نیم برہنگی وحشت اور بے تمیزی کے ملزموں کی فہرست میں ایشیا کے بعد بطور ضمیمہ یورپ بھی شامل نظر آتا ہے -

مغرب - ہائیں! ہائیں! کیا ؟ ؟ ؟ ....

مشرق - گھبرامت اٹھو - تم جس ایشیائی کو اس طرح دھوتی باندھ کر سڑک پر گھومتا پاؤ بے تکلف اُس کا نام بے تمیزوں کی فہرست میں لکھ لو - خیر ہمارے یہاں تو اس گناہ کے گناہگار مسلّم بے تمیز ہی ٹھریں گے - مگر مشکل تو یہی ہے کہ تمہارے یہاں مسلّم تربیت یافتہ اور اعلیٰ طبقہ کے حضرات بھی ایسے ہی گناہگار ہیں جیسے ہمارے مسلّم بے تمیز!

مغرب - ہائیں ہائیں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟ آخر تم کیا بک رہے ہو!

مشرق - (قہقہہ لگا کر) کیا تم ہاکی نہیں کھیلتے ہو؟

مغرب (ہنسکر) اخاہ! اب سمجھے۔ یہ مطلب ہے! میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں آج سے پہلے میرا خیال اس جانب کبھی نہیں رجوع ہوا تھا۔

مشرق۔ جی ہاں۔ اور اب تو ایک اکی ہی پر کیا فرض ہے۔ آئے دن جب جس انگریز کو دیکھو آدمیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر۔ شارع عام پر۔ بازاریں۔ بے تکلف بے جھجک لنگوٹی باندہے گھوم رہا ہے! تم جانگیا کہو یا لنگوٹی۔ میں تو دونوں کو ایک ہی مد میں داخل سمجھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا کیا کہیگی۔ میرے نزدیک تو دونوں ایک ہی مد میں داخل ہیں۔ مگر مغرب کی یہ بے تمیزی میں تو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

مغرب۔ تمہاری مستورات کی وضع ولباس میں تراش وخراش کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ بابا آدم کے وقت میں۔ یا طوفان نوح کے بعد کسی پہلے آدمی نے ایک وضع نکال دی تھی۔ تم ابتک وہی پرانی لکیر پیٹے چلے جاتے ہو۔ وضع اور لباس کے معاملہ میں تم ہی اور ایشیائی قوموں سے آگے آگے نظر آتے ہو۔ اور اس معاملہ میں بعض ہندوستانی قومیں خاص کر تمہاری ہی مرہون منت ہیں مگر تم نے بھی اب تک کچھ نہ کیا۔ ہندوستان کی بعض قومیں تو اتنے پیچھے ہیں کہ ایک سب سے قطع و برید بے سلا ہوا کپڑا لیکے آدھا تو کمر سے لپیٹ لیا اور آدھا اوڑھ لیا۔ پھر مزا یہ ہے کہ اس پر بھی ناز ہے۔ اکڑتے پھرتے ہیں کہ ہماری وضع کیسی پیاری ہے! اے شاباش! اللہ ری "آپ کی وضع!" بھلا تم ہی سوچو کہ ایک بے کاٹے چھانٹے بے سلے ہوئے کپڑے کی نسبت کسی کو کیا حق ہو سکتا ہے۔ کیا دعویٰ ہو سکتا ہے! اسے جو کوئی اوڑھ یا لپیٹ لے اسی کی وضع بن سکتا ہے۔ پھر اس پر کیا ناز ہے

کہ یہ "ہماری وضع" ہے! مگر یہ تو اُن کا ذکر ہے جو تم سے پیچھے ہیں۔ تم تو سب سے
آگے آگے نظر آ رہے ہو۔ لیکن تمہیں نے کیا کر کے دھر دیا! کچھ بھی نہیں۔ تم
بھی اُسی پرانی لکیر کے فقیر نکلے!

(باقی آئندہ)

ستم ظریف

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

گذشتہ اشاعت میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ قبیلہ قریش کے مختلف کنبوں میں مختلف
خدمات تقسیم کی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض خدمات کا ذکر گذشتہ اشاعت میں کیا گیا
تھا۔ اُن خدمات کے علاوہ خدمات ذیل بھی نمایاں خدمات میں سے تھیں۔

(۷) اعنّہ۔ یہ عربی لفظ "عنان" کی جمع ہے جس کے معنی گھوڑے کی باگ کے
ہیں۔ اس خدمت کے صاحب منصب کے متعلق گھوڑوں کی نگرانی رہتی تھی اور انکی
دیکھ بھال اور ضروریات کا اہتمام اس کے سپرد ہوتا تھا۔

(۸) ایسار۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ جنگ کے موقع پر کوچ کرتے وقت
یا ایسے ہی اور اہم موقعوں پر سرداروں میں تقسیم خدمات ذریعہ قرعہ اندازی ہوا کرتی
تھی جو زمانہ حال کی "لاٹری" کی قایم مقام تھی۔ قرعہ اندازی کا یہ طریق تھا کہ تیراندازی

سے ذریعہ سے کام کی تقسیم کا فیصلہ کیا جاتا تھا - اور یہی فیصلہ قطعی ہوتا تھا - یہ خدمت بنی جمح کے کنبہ سے متعلق تھی -

(۹) اشناق - یعنی محکمہ خون بہا اور تاوان - ان معاملات کا تصفیہ کنبہ تیم سے متعلق تھا اور اسی خاندان میں سے ایک شخص اس خدمت کا منصب دار ہوتا تھا -

(۱۰) اموال محجرۃ - یہ محکمہ ایک حد تک "بیت المال" کا قایم مقام تھا - اس میں عموماً وہ رقوم یا زیورات رکھے جاتے تھے جو اہل عرب اپنے بتوں یعنی دیوتاؤں پر چڑھایا کرتے تھے - یہ منصب بنی سلیم کے گھرانے میں تھا -

(۱۱) حکومت - یہ ایک منصب تھا - منصب دار کا یہ فرض تھا کہ باہمی نزاعات اختلافات لڑائی جھگڑوں قضیوں کا تصفیہ کر دیا کرے یہ منصب عہدہ قضا سے مشابہ تھا -

(۱۲) ندوہ - جس سے زمانہ حال کے علما نے "ندوۃ العلما" کا نام عاریتاً لیا ہے - اسلام سے پہلے قصئی نے کعبہ کے ایک گوشہ میں ایک مکان تعمیر کرایا تھا جس کا نام "ندوۃ" رکھا تھا - یہاں سربرآوردہ اہل قریش جمع ہوا کرتے تھے - تاکہ تمام اہم معاملات کے متعلق آپس میں مشورہ کیا کریں - چالیس برس سے کم عمر کے لوگ اس گھر کے اندر آنے نہیں پاتے تھے - نکاح کے وقت دولہا دلہن کو لاکے اسی گھر کے اندر نکاح پڑھا جاتا تھا - فوج کا نشان بھی اسی گھر میں رہتا تھا اور سن بلوغ پر پہنچنے کے وقت بالغ لڑکیوں کو اس سن کے مناسب حال زنانہ لباس بھی پہلی مرتبہ وہیں لاکے پہنایا جاتا تھا - سردار الندوہ کا فرض تھا کہ یہ کپڑے اپنے ہاتھ سے قطع کر کے پہنائے - دار الندوہ کی منصب داری بنی عبد الدار کے گھرانے میں تھی

(۱۳) سفارت۔ جنگ کے موقع پر اگر صلح کی گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو ایسی گفت و شنید کے لئے سفیر بھیجا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت کے سب سے آخری سفیر حضرت عمر بن الخطاب تھے اور ظہور اسلام کے وقت تک یہ خدمت انہیں سے متعلق رہی۔

(۱۴) سپہ سالاری۔ زمانہ حال کے دستور کے برعکس جنگ کے موقعہ پہ سپہ سالار عساکر اسلامیہ لشکر کے آگے آگے چلتا تھا اور ساری فوج اس کے پیچھے ہوتی تھی۔ تجارتی قافلوں کی روانگی کے موقع پر بھی سپہ سالار امیر قافلہ بن کر سواروں کے آگے آگے چلتا تھا۔ یہ خدمت بنی امیہ کے خاندان میں تھی۔ ظہور اسلام کے وقت ابوسفیان معاویہ کے والد سپہ سالار تھے۔

(۱۵) سدانت۔ جس کا دوسرا نام (حجابت) تھا اس خدمت کا منصب دار خانہ کعبہ کا حاجب یعنی کلید بردار ہوتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولتا تھا اور اپنے ہی ہاتھ سے بند کرکے پھر مقفل کر دیتا تھا۔ یہ خدمت سب سے زیادہ معزز سمجھی جاتی تھی۔

(باقی آیندہ)

مورّخ



مذہب اور سائنس

زمانہ حال کی یک رُخی تعلیم جس کا ابتدائی اثر ہمارے بچوں کی نازک اور کمزور دماغوں پر اوائل سے پڑنا شروع ہو جاتا ہے بعض شدید خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً علم ہندسہ اُنہیں سکھاتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اب وہ کبھی نہیں مان سکتے کہ تین اور دو مل کر چار ہو سکتے ہیں۔ یا اقلیدس کی تعلیم انہیں عادی کر دیتی ہے کہ جو بات اُنکے سامنے پیش کی جائے سب سے پہلے صاف الفاظ میں پیش کرنے والا اپنا دعویٰ بیان کرے۔ اس کے بعد اس دعوے کے اثبات میں دلائل اور براہین کے ساتھ منزل بمنزل ثبوت دیتا ہوا اپنی آخری منزل پر پہنچے جہاں کھڑا ہو کر وہ دنیا کے سامنے اعلان کر سکے کہ یہ میرا دعویٰ تھا اس دعوے کے اثبات میں میں نے یہ دلائل پیش کئے۔ یہ دلائل منزل بمنزل پایہ ثبوت کو پہونچتے گئے جس سے آخر کار یہ نتیجہ صریح نکلا جس کی تردید نا ممکن ہے اور اس وجہ سے میرا دعویٰ ہر طور پر قابل تسلیم ہے۔ علیٰ ہٰذا منطق کی تعلیم بھی اُسے سکھاتی ہے کہ سچے اور جھوٹے دلائل میں امتیاز کر سکے اور با قاعدہ مدلل بحث کرنا سیکھے۔

کوئی نہیں کہتا کہ ایسی تعلیم مضر ہے۔ یا فضول ہے۔ اور اس وجہ سے نہ دی جائے۔ برعکس اس کے ہمارے بچوں کے دماغی نشو و نما کے لئے ایسی تعلیم نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ اور ایسی تعلیم تہذیب اور شائستگی کی تعلیم کہی جانے کے قابل ہے۔ دنیا کی ہر مہذب قوم نے اسی طریق پر اپنے بچوں کو تعلیم دی تھی زمانہ ما فیہ میں بھی یہی علوم اور فنون داخل نصاب تھے اور اب بھی داخل نصاب

ہیں اور ہمیشہ نمک رہیں گے اور رہنا چاہیئے۔ مگر ہمارے بچوں کی راہ میں جو مشکل ہے وہ
محض اسی قدر ہے کہ ایسی تعلیم پانے کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ مذہبی معاملات میں
بھی انہیں قواعد اور انہیں قیود کی پابندی کے ساتھ ہر ہر مذہبی معاملہ اُن کے
ذہن نشین کر دیا جائے - وہ اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہیں تو انہیں کوئی
مدد نہیں ملتی - وہ اپنے باپ ماں کی طرف رخ کرتے ہیں تو اُن میں اُن کے حسب
خواہ باقاعدہ طور پر دلائل اور براہین کے ساتھ اُن کی تشفی کر دینے کی صلاحیت
نہیں۔ وہ اپنے استاد سے رجوع کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اس پاؤں
پھسلنے والی زمین پر اُن کے ہاتھ میں عصائے رہبری دی جائے وہ اور اُلٹی
اُنہیں ایسی راہ چلاتے ہیں جہاں جا کے وہ ایسی دلدل میں پھنس جاتے ہیں
جس سے عمر بھر نکل ہی نہیں سکتے۔

میں اس سلسلہ مضامین کے آخیر میں بتلانے کی کوشش کرونگا کہ ہمارے
تعلیمی مشین کی نظام میں کہاں کہاں اور کون کون سا پیچ ڈھیلا ہے جسے پوری
قوت صرف کرکے کس دینے کی ضرورت ہے - سردست مجھے اتنا ہی عرض
کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ جو مشکلات ہمارے بچوں کی راہ میں حائل
ہیں انہیں مشکلات کا مقابلہ ملک انگلستان کے بچوں کو کرنا پڑا - مگر جس طرح عین وقت
پر کوئی معقول خارجی مدد نہ ملنے سے تباہ کن نتائج ہمارے اہل نظر صاف صاف
دیکھ رہے ہیں وہ ہی تباہ کن نتائج انگلستان میں پیش آچکے ہیں کیونکہ وہاں بھی
ایسی خارجی مدد پہنچانے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ آخر کار جو ہونا تھا
وہی ہو کے رہا - صدیوں کے پشت در پشت سکوک نے تشکک کی بنا رڈالی۔

اور مذہب کی فطرتی جگہ پر مادہ پرستی (Materialism) اور عقلیت (Rationalism) کے مہیب دیو اپنی آتشیں عصا اُٹھاتے اسٹیج پر نظر آنے لگے۔

پچھلے دس بارہ سالوں سے مزدوروں۔ کاریگروں اور اہل حرفہ کی جماعت نے ملک پر اپنا غلبہ ثابت کیا یہاں تک کہ انگلستان کے دارالعوام میں اس جماعت کی نمائندگی کے لئے جگہ بھی پیدا کی گئی۔ یہ جماعت قوم اور ملک کی فدائی۔ تاج اور تخت کی خیر اندیش اور بنی نوع انسان سے سچی اور دلی ہمدردی رکھنے والی ہے۔ اور یہی پہلا فرقہ ہے جس کا خیال ملک کے مذہبی عقائد کی اصلاح پر پہلے بار رجوع ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں اس طبقہ نے انگلستان کے مشاہیر اور ماہرین سائنس کو مدعو کیا تاکہ وہ مذہب کے متعلق تازہ ترین تحقیقات علم سائنس کی رو سے اپنے دلی خیالات اور رائے کا عوام الناس پر اظہار کریں۔ چنانچہ انگلستان کی مشہور حرفتی درسگاہ براؤننگ سٹلمنٹ میں ایک ہفتہ ان علما سائنس کے اظہار خیالات کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور اس ہفتہ کا نام ہفتہ سائنس (Science Week) رکھا گیا۔ ان ماہرین کے خیالات جو اس جلسے میں انہوں نے ظاہر کئے تھے ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے گئے ہیں اور ہم اسی کتاب کا ترجمہ اپنے زیر تعلیم لڑکے لڑکیوں کی پاس خاطر سے شائع کرنا شروع کرتے ہیں۔

انگلستان کی طرح اس ملک میں محض غلط طور پر یہ بات مشہور ہے کہ سائنس نے مذہب کی بیخ کنی کر دی ہے۔ اور اب کوئی تعلیم یافتہ اور سمجھدار

آدمی جو عقل سلیم رکھتا ہو مذہب سے عقیدت نہیں رکھ سکتا - ہمارے شامتِ اعمال سے ہمارے ملک میں بہت سے لوگ جو خوش قسمتی سے اپنے کو تعلیم یافتہ اور روشن خیال سمجھتے ہیں اس وہم باطل کے شکار بن چکے ہیں اور یہ زہریلی ہوا بُری طرح ملک میں پھیلتی چلی جا رہی ہے - اگر ہماری یہ محنت اور عرق ریزی ایسے لوگوں اور خاص کر ہمارے زیرِ تعلیم لڑکے لڑکیوں کے شکوک رفع کرنے میں کوئی مدد پہنچا سکے گی تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اپنی ساری محنتوں اور شب بیداریوں کا پورا پورا انعام پالیا - ہم اس قابلِ وقعت کتاب کو ایڈیٹر کی تمہیدی سطور کے اقتباس سے شروع کرتے ہیں -

مترجم

ہفتۂ سائینس

اس کتاب کے ذریعہ سے ہفتۂ سائینس کی ساری سرگذشت مجتمع کر دی گئی ہے جس کا انعقاد ۲۲ لغایت ۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو براؤننگ ہال - والورتھ لنڈن میں ہوا تھا - رابرٹ براؤننگ سٹلمنٹ کی جانب سے اہلِ ریاض کے پنج ہفتہ اجلاس کے ضیمہ کے طور پر "ہفتۂ سائنس" کا انعقاد قرار پایا تھا - چھ برس ہوئے کہ دور دور تک یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اہلِ ریاض (Scientists) کی تحریکات اور سوشل اصلاحات کی تجاویز مذہب کی مخالف ہیں - مخالفین مذہب اور اہلِ ریاض نے یہ ڈھول کی رسیاں بٹی تھیں - مگر پنج ہفتہ اجلاس نے اُن بہتانات کا قلع قمع کر دیا - اور دُنیا تعجب کے ساتھ یہ نظارہ دیکھ سکی کہ برطانیہ

کے اہل ریاض کے سردار اور سوشل اصلاحات کے ذریعہ سے انقلاب عظیم پیدا کرنے کی خواہش رکھنے والے حضرت عیسٰی کے پیرو اور علم بردار ہیں۔ ان کارروائیوں کی روئیداد پانچ مختلف زبانوں کے ذریعہ سے دنیا میں شائع کر دی گئی۔ یعنی انگریزی۔ ڈینشش۔ فینش۔ اسپینش اور جرمن۔

مخالفین کی دماغی جنگ کے اس محاذ کے پرخچے اُڑ گئے تو دشمن نے دوسری جانب رخ پھیرا۔ اُنھوں نے یہ روش اختیار کی کہ عیسائی عقاید اور عیسائیت کے خلاف مضامین چھپوا چھپوا کے بھیجنا شروع کر دیے اور جگہ جگہ پر اسپیچوں اور تقریروں کے ذریعے سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "جس چیز کا لوگوں نے " مذہب نام رکھا ہے وہ حقیقت میں ایک پُرانی کرم خوردہ دقیانوسی ضعیف الاعتقادی ہے کہ بے سوچے سمجھے ہر بعید از عقل اور خارج از امکان بات کا یقین کر کے اپنی بے تمیزی کم عقلی اور دماغی کمزوری سے بعض احمق ایسی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اُن توہمات باطل کا نام مذہبی عقاید مذہب اور ایمان رکھتے ہیں۔" انھوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ "اب سائنس نے تمام ایسے توہمات کا قلع قمع کر دیا ہے اور زمانہ حال میں مذہب کی جگہ سائنس نے لی ہے۔" اپنے دلائل کی تائید میں یہ لوگ بعض لامذہب ماہرین سائنس کی اب سے نصف صدی قبل کے زمانہ کی رائیں پیش کرتے تھے اور دعوے کرتے تھے کہ "مادہ پرستی" ہی زمانہ حال کی سائنس کا آخری فیصلہ کن لفظ ہے۔ ان بیہودہ تحریروں اور تقریروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ عوام الناس کے دل شکوک کے آماجگاہ بن گئے اور ہر شخص کا دل بیچینی سے کروٹیں بدلنے لگا کہ آخر کار سائنس نے اگر مذہب کی بیخکنی نہیں کی تو کم

از کم اس درخت کو جڑ پیڑ سے ہلا ضرور ڈالا۔ اور یہ کہ شاید صحیح معلومات بہم پہونچنے کے بعد مذہب کو بھی روز بد دیکھنا مقسوم تھا۔ بعض ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو مذہبی عقائد درست رکھنے میں ساعی ہیں اور جو دل سے چاہتے ہیں کہ ان عقاید پر برابر جمے رہیں۔ مگر اُن کا یہ خیال ہے کہ مذہب محض ایک شخص کی ذاتی رائے یا شخصی کمزوری ہے جس پر وہ معذرت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔ برعکس اس کے بعض ایسے بھی ہیں جو کسی خاص مذہبی عقیدے کے پابند رہنا پسند نہیں کرتے اور وہ صاف صاف بکشادہ پیشانی اپنے مذہب سے مخالفت کی وجہ سائینس بتاتے ہیں ایسے لوگ بھی کمیاب نہیں ہیں جو نہایت دلیری کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم عیسائیت سے عقیدت نہیں رکھتے بلکہ ہمارا ایمان مسئلہ ارتقا پر ہے اور یہی ہمارا مذہب[1] ہے۔ ایسے اُلٹے سیدھے خیالات کی تردید اور تصیح ضروری تھی۔ ان کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ سمجھ میں آیا کہ خود سائینس کو ان خیالات کی اصلاح کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے مستند مشاہیر کی زبان سے خود حقیقت حال بیان کرا سکے۔ اور یہی مقصد "ہفتہ سائینس" کے اجلاس کا تھا۔

(باقی آیندہ) مترجم

---

[1] ماہرین سائینس میں سے ایک ممتاز فاضل ڈارون نامی گذرا ہے جس نے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسان سب سے پہلے بندر رہتا۔ رفتہ رفتہ منزل بمنزل ترقی کرتے کرتے آخر کار وہ انسانی شکل پر آگیا۔ فطرت میں ترقی کرنے کا مادہ ہے اور ہر ناکمل شئے ترقی کرتے کرتے کافی عرصہ کے بعد ایک کمل شکل وصورت اختیار کرلیتی ہے۔ مترجم

خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

بیوی اپنی ذات اپنی ساری اُمنگیں ساری خوشیاں سارے ولولے شوہر کے حوالہ کرکے اسکو اپنا مالک اور مختار بنا لیتی ہے۔ کیا شوہر اپنے کو اس مقدس امانت کا اہل نہ ثابت کردیگا؟ کیا وہ اس کے ساتھ آخری دم تک محبت اور اخلاص نہ نباہیگا؟ کیا وہ اسے اپنے محبت سے لبریز دل میں جگہ دے کر اس کو ساری دُنیا کے افکار مصائب اور آلام سے نجات نہ دیگا؟ کیا وہ اس کی دوامی خوشی عیش و آرام کی خاطر حوادث عالم اور افکار ہستی کا سارا بار اپنے سر نہ لیگا؟ کیا وہ اُسے ایسی پُرامن و آسایش زندگی عطا کرکے اُسے موقع نہ دیگا کہ وہ اپنے اندرونی جوہروں کو جلا دیکر چمکائے اور دنیا کی نیک نہاد اور پاک نفس مستورات کی صف میں کھڑی ہونے کے قابل بن سکے؟ کیا وہ اس قابل نہ ہوگا کہ جو بے ریا خلوص اور سچی محبت کی ڈالی وہ اس کے قدموں پر رکھ رہی ہے وہ اپنے کو اس کا اہل ثابت کرسکے؟ کیا وہ آخری وقت تک اس قابلِ رشک امانت کا امین نہ بن سکیگا؟ ایسی برگزیدہ امانت۔ ایسی پیاری۔ نازک۔ محبت سے بھری امانت اپنے ذمہ لینا۔ اس کی پاسبانی کرنا۔ اُسے آخر وقت تک خوش رکھنا۔ خوش رہنا۔ خوش رکھنا اور خوش بسر کرنا۔ ایک قابل فخر مقدس فرض ہے۔ اور مبارک ہیں وہ لوگ جو اس فرض کو بوجہ احسن انجام دیتے ہیں اور اپنے لئے دنیا میں ہی بہشت بنا لیتے ہیں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ محبت کے لفظ میں پیار اور محبت آمیز پاسداری کا مفہوم شامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ شریفانہ اخلاق اور برتاؤ پر بھی حاوی ہے۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص بہت ہی صدق اور اخلاص رکھتا ہو مگر باوجود اس کے محبت آمیز برتاؤ۔ محبت آمیز طرز و انداز گفتگو کا عادی نہ ہو جسکا ایک محبت بھرا ہوا دل متمنی رہتا ہے۔ اور جس کے بغیر پیاسا ہی رہجاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ گفتگو یا برتاؤ میں تلخی اور ترشی آنے نہ دینا چاہیئے اور اس کی جگہ پر دلی خیالات کی رفتار اس طرح بدل دینا چاہیئے کہ یہ تلخی اور ترشی شیرینی سے بدل دیجائے۔

کیا ساری دنیا کے شوہر اس معاملہ میں بے قصور ہیں؟ کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو کبھی کبھی بیوی کے ساتھ ترش روئی کا برتاؤ کیا کرتا ہو؟ کیا ان میں سے کوئی بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکالتا جو تیر کی طرح دل پر لگتے ہیں؟ البتہ ایسی باتیں غفلت اور بے پروائی کی حالت میں زبان سے نکل جاتی ہیں۔ کیونکہ کوئی شوہر جو اپنی بیوی سے واقعی محبت رکھتا ہوگا وہ کبھی عمداً و قصداً اُسے رنج نہ پہونچائیگا۔

(باقی آیندہ)

مترجم



ناول

(سلسلہ کے لئے جون نمبر ۱۷ئہ ملاحظہ ہو)

مسگر یو بولا کہ اچھا اگر تمہاری جانے ہی کی مرضی ہے تو خیر۔ خدانخواستہ آج کی طرح کچھ ہمیشہ خالی ہاتھ تو رہو گے نہیں میں نے جواب دیا "اللہ نہ کرے" اور اپنی راہ لی۔ گلی تنگ و تاریک تھی مگر خدا خدا کر کے گلی سے نکلا ہی تھا کہ روشنی کی جگمگاہٹ سے آنکھوں میں چکا چوند چھا گئی۔ اس وقت ایک سکوت اور خاموشی کا عالم طاری تھا۔ میونسی اور ٹراکیڈرو ہوٹل میں کئی سو آدمی موجود تھے۔ کرائی ٹیرین تھیٹر میں تماشائی ابھی ڈٹے ہوئے تھے۔ بعض لوگ گاڑیوں سے اُتر اُتر کر ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ اور بعض گانے والے اپنی اپنی بردہام میں سوار ہو رہے تھے کہ کسی دوسری جگہ پہونچکر دوسرے جلسہ کی تیاری میں مصروف ہو جائیں۔ بعض لوگ گاڑیوں کے منتظر کھڑے تھے کہ جگہ ملجائے تو گاڑی کی سواری کا لطف اُٹھائیں۔ گاڑیاں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کوچبان اپنے ہاتھ بے تکلف جیبوں کے اندر پہنچا رہے تھے۔ راہ گیر دوست احباب سے علیک سلیک اور مزاج پرسی کر رہے تھے۔ جنازہ بردار گاڑیاں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور ان کے کوچبان کسی نووارد جنازہ کے انتظار میں چیخیں مار رہے تھے۔ پھول بیچنے والی لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ زندگی کے کاروبار کا چکر ختم گیا تھا۔ نبض کی رفتار بھی دھیمی پڑ چلی

تھی الغرض ہر سمت سکوت اور خموشی کے آثار عیاں ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہا
تھا کہ گاڑی پر سوار ہو جاؤں یا نہوں۔ ہاری ہوئی رقم کا خیال آیا۔ اور گریٹ جیمس
اسٹریٹ کی سمت اپنی قیامگاہ کی جانب چل کھڑا ہوا۔ شب شب دیجور تھی۔ تارے
کہیں کہیں جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں رطوبت کا غلبہ تھا۔ سردی سے بچنے کے
لئے میں نے اپنا کالر الٹ لیا۔ ہاتھ جیب میں ڈال لئے اور جلدی جلدی گھر کی
طرف قدم بڑھانے لگا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ پانچ پاؤنڈ ہار جانے سے میں افسردہ
خاطر ہوگیا تھا۔ سوچتا تھا کہ آج ہارا ہوں تو کل جیت لوں گا۔ میں روز رات کو تاش
کھیلا کرتا تھا۔ مجھے اس کھیل کا شوق نہ تھا۔ مگر روز کھیلنے کا کوئی سبب بھی معلوم نہ
تھا سوا اس مقولہ کے کہ "جیسا دیس ویسا بھیس"۔ مضمون کا خیال آیا تو قدم آہستہ
آہستہ پڑنے لگے۔ یہ مضمون آج ہی رات کو تیار کرلینا تھا۔ سارا دن اسی فکر میں گذر
چکا تھا اور اب رات ہی کا وقت باقی رہ گیا تھا۔ میں ہال بارن پہنچا۔ سڑک کی مسافت قطع
کی۔ گریز اِن[1] کے صدر دروازہ پر گھنٹی دی۔ اِن کے اندر میرے بہت سے شناسا
تھے۔ مگر مجھے ان سے ملنا منظور نہ تھا۔ میں اِن کے ایک گوشہ میں کھڑا ہوگیا۔ دربان
نے خندہ پیشانی کے ساتھ سلام کیا۔ میں وہاں سے بھی روانہ ہوا اور اسی سنسان

---

[1] گریز اِن۔ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے کئی کالج ایک ہی مقام پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ
سب کالج "ان آف کورٹ" کے نام سے ملقب ہیں۔ ہر کالج کا امتیازی نام علیحدہ علیحدہ ہے
مثلاً گریز اِن۔ لنکنس اِن۔ انر ٹمپل۔ مڈل ٹمپل۔ ان کالجوں میں لنکنس اِن اور انر ٹمپل
زیادہ ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ اور گریز اِن سب سے کم امتیاز رکھتا ہے۔

راستہ میں قدم بڑھانا شروع کر دیا۔ اس ویران سنسان راستہ سے قلب متاثر ہو رہا تھا۔ کسِ قدر سہم گیا تھا۔ چاندنی سبزہ اور بے برگ و بار جھاڑیوں کو اپنے رنگ میں رنگے ہوئے تھی۔ اب میرے سامنے دیرولام کی عمارتیں آگئیں۔ اسنے گذر کر ہیتو بالڈس رُوپہنچا۔ آگے بڑھا تو میری گلی سامنے آگئی میری گلی اس لئے تھی کہ اس گلی میں میرے اپنے دو کمرے تھے۔ اسمیں کوئی تعجب نہیں کہ جن کے پاس دو ایکڑ زمین ہے وہ ساری دُنیا اپنی ہی سمجھتے ہیں میرا مکان بیچ گلی میں تھا۔ وہاں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ گھروں کے کواڑ بند تھے۔ اس وقت یہاں بس فقط ایک میں ہی تھا۔ رات کا سکوت توڑنے والی کوئی شے نہ تھی۔ اگر تھی تو میرے ہی پاؤں کی آہٹ تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا" میں اب اندر جاؤں گا اور ایڈیٹر صاحب کی یادداشتیں دیکھونگا۔ ابھیں سے مجھے اپنا سیگار سلگانا اور مضمون سوچنا شروع کر دینا چاہئے۔ میں اپنے دروازہ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ کسی نے ایک چیخ ماری۔ یہ چیخ بڑی دلشکن تھی اور عورت کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ اس چیخ کی صدائے بازگشت ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میرے مکان سے متصل دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک عورت نکلی جو میرا راستہ کاٹ کر بڑی زور سے بھاگنے لگی میں نے دوڑ کے اُسے پکڑ لیا۔ مگر اس دوڑ دھوپ میں خود بھی گرتے گرتے بچا۔

(باقی آئندہ)

رشید احمد

مکتوبات حسن آرا

بیگم شاہد حسین صاحبہ کا خط حسن آرا کے نام۔

لکھنؤ

یکم جولائی ۱۷ء

پیاری حسنہ

اے ہے تم تو عید کا چاند ہوگئیں کہ دنیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے مگر تم ہو کہ نظر ہی نہیں آتیں! لکھنؤ کی اردو کانفرنس میں حضور آرہی تھیں دہلی کی لیڈیز کانفرنس میں سرکار تشریف لا رہی تھیں۔ عید لکھنؤ ہی میں کرنے پر تلی بیٹھی تھیں اور اب خیر سے بقر عید یہیں کرنے پر پر تول رہی ہیں۔ مہینوں برسوں مدتوں نہ نامہ ہے نہ پیام نہ خط نہ پتر نہ کسی کو تمہارا کوئی حال معلوم اور نہ تمہیں دنیا و مافیہا سے خبر۔ خط جاتے ہیں تو جواب ندارد۔ تار جاتے ہیں تو خدا جانے کہ بہرا ہوا ہو جاتے ہیں۔ ع

ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

کا مضمون نظر آتا ہے۔ بھئی واللہ تم نے بھی کیا خوب گونگے کے لڈو کھائے ہیں کہ منہ سے بولو اور نہ سر سے کھیلو۔ میں تو لکھتے لکھتے تھک گئی اب تم ہی بتاؤ کہ آخر کیا کروں جو تمہارے سر سے یہ موا سکوت کا جن اترے؟

اچھا لو سنو۔ اگر تم نے مجھے خط لکھنے یا میرے خط کا جواب بھیجنے کی قسم ہی کھالی ہے تو خیر یہی سہی۔ تم جیتیں اور میں ہاری۔ مگر آخر تمہیں کچھ اس کی بھی فکر ہے کہ تمہارا یہ بلاخیز سکوت کیا کیا قیامت برپا کر رہا ہے۔ تم کہو گی کیا قیامت

برپا کر رہا ہے؟ اسے وادا ایسی نہیں ہیں! کیا تم نے حاجی بغلول کی کھلی چٹھی بھی نہیں پڑھی! آخر پھر دُنیا تمہیں کیا کہیگی؟ اور دنیا کا اس میں کیا قصور ہے۔ نہ آپ اس بلا کا سکوت اختیار کرتیں نہ مکتوبات کا تار ٹوٹتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ مولنا حاجی بغلول صاحب قدس سرہٗ کی پسلی پھڑکتی۔ میں سُنتی ہوں راوی ضعیف صاحب نے بھی جواب ترکی بترکی دیا تھا مگر "پیام اُمید" کے سنسر نے ان کا جواب دبالیا دیکھو تم ہی انصاف کرو۔ کہاں تو مکتوبات حسن آرا کے ذریعہ سے کیسے کیسے اہم نکات حل ہوتے تھے اور با توں ہی باتوں میں ہمارے زیر تعلیم لڑکے لڑکیوں کو کیا کیا کچھ نہ گھول کے پلا دیا جاتا تھا اور کہاں ایک آج کا دن ہے کہ اُسی سلسلہ کا ضمیمہ بن کر حاجی صاحب قبلہ کی دماغ سوزیاں گویاں سامنے موجود ہیں آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا آپ فرمائیں گی کہ آپ نہیں ہیں؟ اب اس سے زیادہ اپنا سر خالی نہیں کر سکتی۔ جواب ملنے کی اُمید ہوتی تو ضرور کچھ اور بھی لکھتی۔

تمہاری

راوی ضعیف :۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس خط کے جواب میں یہی خط ایک تازہ لفافہ میں بند کرکے واپس بھیجدیا گیا۔ البتہ بعض فقرات پر سُرخ پنسل سے نشان کرکے خط کے حاشیہ پر کچھ عبارت لکھ دی گئی تھی جس کی نقل یہ ہے میں تصدیق کرتا ہوں کہ نقل ہذا مطابق اصل کے ہے۔

العبد

راوی ضعیف بقلم خود

حسن آرا کا حاشیہ	خط کا مضمون
اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نہ آئی وہ تو کہو ساعت تھی اچھی۔ کبھی کسی کا دیا لیا آڑے آگیا۔	اُردو کانفرنس میں حضور آ رہی تھیں۔
نہ شریک نہ ہونے کا افسوس ہی ہے	دہلی کی لیڈیز کانفرنس میں سرکار تشریف لا رہی تھیں۔
جی نہیں تقصیر معاف اس کے ذمہ دار حضور کے دشمن ہیں۔	آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا آپ فرمائیں گی کہ آپ نہیں ہیں؟

بیگم حبیب اللہ صاحبہ کا خط حسن آرا کے نام

لکھنؤ

۱۰ر جولائی ۱۹۱۷ء

پیاری حسنہ۔ اے واہ اچھی ملیں! سکوت سرکار کا اور ذمہ دار ہم! واللہ یہ ایک ہی ہوئی۔ صدقے اس ذہانت کے! بہت خوب اگر ہم ہی ذمہ دار ہیں تو پھر اس کا علاج بھی ہمارے ہی پاس موجود ہے۔ کلکتہ کی آب ہوا نے تمہیں ٹھس بنا دیا ہے اور تمہارا کلکتہ سے آج ہی یہاں کھینچ بلانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کہو اب کیا کہتی ہو؟ یہ میرا الٹی میٹم ہے۔ تمہاری یہی سزا ہے کہ جواب ایں زیر تعلیم بچوں کے متعلق کچھ مزے مزے کے نکات اپنی شیریں تحریر کی حلاوتوں میں لپیٹ کے بھیجدو۔ تمہارے ننھے ننھے بھانجے ایک مدت

سے ان شکر پاروں کے منتظر ہیں۔ الٹی میٹم کے جواب کے لئے عموماً اڑتالیس گھنٹہ سے زیادہ کی مہلت نہیں دی جاتی مگر تمہارے ساتھ اتنی رعایت ہے کہ ایک ہفتہ کی میعاد دیجاتی ہے۔

تمہاری

حُسنہ کا جواب

پیاری باجی جان

اللہ ری تیری ڈپٹ۔ الٹی میٹم کی بھی ایک ہی ہوئی! ہاں لگے ہاتھوں ذرا یہ تو بتا دیجیے کہ م ب لکھنوی آخر ہیں کہاں؟ زبیدہ لکھتی ہے کہ وہ کلکتہ گئی ہیں۔ الٰہی توبہ! یہاں کوؤں میں بانس ڈلوائے گئے کونے کونے جھانکے گئے چوہوں کے بل کھودے گئے۔ مگر کہیں بھی پتہ نہ چلا! بھلا تم ہی سوچو کہاں م ب اور کہاں کلکتہ! بہن اب تم میری طرح ذرا لکھنو میں بھی تلاش کر لو۔ شکر پارے وکرپارے تو میں جانتی نہیں کیسے ہوتے ہیں۔ البتہ آپ کے حکم کی تعمیل کئے دیتی ہوں۔

ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت

بعض حکماء کا قول ہے کہ بچہ کی تربیت عین اُس کے پیدا ہونے کے وقت ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور ماں کا چہرہ بچے کی کتاب تعلیم کا سب سے پہلا صفحہ ہے۔ بعض محققین اس حد سے بھی تجاوز کرتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ بچہ کی اصلی تعلیم و تربیت اُس کے ماں کے پیٹ میں آنے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور میرے نزدیک اس بیان میں بھی مبالغہ شامل نہیں معلوم ہوتا۔

قدرت نے لڑکے اور لڑکیوں کو دو مختلف اغراض پورے کرنے کے لئے بنایا ہے
اسی اعتبار سے اُن کی تعلیم بھی دو مختلف طریقوں پر ہونا چاہیے۔ فطرت نے مرد
کو عورت کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور سخت دل اور عورت کو نسبتاً نازک اور
نرم دل بنایا ہے جس کا منشا صاف یہی ہے کہ محنت اور جفاکشی کے کام
مرد ہی کے لئے ہیں نہ کہ عورت کے لئے۔ اس وجہ سے میری رائے ناقص میں
نہ خانہ داری کے انصرام کا بار مرد کے سر آنا چاہیئے اور نہ فکر معاش کا بار عورت
کے سر۔ میری رائے ناقص میں فطرت کا یہی تقاضہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ محنت
اور جفاکشی کے کام عورت نہیں کر سکتی یا ایسے کام کرنے کی اُس میں صلاحیت نہیں
ہے۔ سلف سے آج تک ایک عورت نے بڑے بڑے جفاکشی کے کام کئے
ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کارزار میں شمشیر بکف بہادری
کی داد دی ہے۔ آج بھی ملک انگلستان میں عورتیں مردوں کی طرح
گولے اور بارود کے کارخانوں میں ایسے ایسے سخت کام کر رہی ہیں کہ باید و
شاید۔ یہ سب صحیح ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ عورت مرد دونوں کے لئے
محنت اور جفاکشی کا عادی رہنا از بس مفید ہے۔ دونوں کی صحت کے لئے بھی
اور اس لئے بھی کہ محنت اور جفاکشی ترقی اور اقبال کا پیش خیمہ ہے اور برعکس
اس کے سستی اور کاہلی شامت اور ادبار کا ("پیام امید" کے کسی پچھلے پرچے
میں "زمانہ کا چکر" ملاحظہ طلب ہے) یہ سب کچھ بجا و درست ہے۔ مگر عورت اور
مرد کی علیحدہ علیحدہ جنس ہونا۔ مرد کے مقابلہ میں عورت کے قوا کمزور ہونا۔ عورت
کا مرد سے زیادہ نرم دل اور رحیم ہونا وغیرہ وغیرہ صاف بتاتا ہے کہ دونوں کے

خالق نے دونوں کے لئے ایک ہی کام تجویز نہیں کیا ہے۔ میری رائے ناقص میں جس طرح عورت فکر معاش کا بار اپنے سر لینے کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے اسی طرح مرد بھی خانہ داری کے انتظام کے لئے موزوں نہیں ہے۔ عورت کا فکر معاش میں حصّہ لینا میرے نزدیک ایسا ہے جیسے عورت کا مرد بن جانا۔ کسی گھر کا کام باقاعدہ چلانے کے لئے کام کی تقسیم ضروری شے ہے۔ ہر کچہری ہر دفتر میں باقاعدہ طور پر کام تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر ہر محکمہ کے لئے علیحدہ افسر دیا جاتا ہے اور ہر افسر کے ساتھ کام کرنے کے لئے ماتحت عملہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر مشین۔ ہر کل ہر انجن میں بھی کام کی تقسیم ہوتی ہے۔ ہر ہر پرزہ کے لئے ایک خاص خدمت معین ہوتی ہے اور اس خدمت سے کوئی خاص مقصد موجود ہوتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ گھر کی مشین کو باقاعدہ چلانے کے لئے کام کی باقاعدہ تقسیم نہ ہو۔ اگر فکر معاش عورت کے سر رکھدی جائے اور مرد کا کام گھر کا انتظام اور بچّوں کی تربیت قرار پائے تو چاہے زمانہ کیسا ہی بدل جائے چاہے ہمارے گرد وپیش کے حالات میں کیسا ہی انقلاب کیوں نہ آجائے مگر ایسے گھر کا سارا انتظام ہمیشہ درہم وبرہم ہی رہیگا اور ہمیشہ سوا ابتری کے اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

جب یہ صورت ہے تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں ہمارے زمانہ حال کے مدارس میں لڑکی اور لڑکیوں کا نصاب تعلیم کم وبیش یا قریب قریب یکساں ہی رہتا ہے۔ اور جس کا نام اعلیٰ تعلیم رکھا گیا ہے اس حد تک پہونچکر جو جو کتابیں پڑھ کر یا جس جس طرح کی تعلیم پاکر ہمارے بچے الیف اے۔ بی اے۔ ایم اے پاس کر سکتے ہیں بالکل یا قریب قریب بالکل وہی کتابیں پڑھکر اور ویسی ہی تعلیم پاکر ہماری لڑکیاں

بھی ایف اے - بی اے یا ایم اے پاس کر سکتی ہیں - دونوں کے طریق تعلیم میں کوئی خاص نمایاں یا بدیہی فرق نہیں رکھا گیا ہے - اگر لڑکے اس لئے پڑھائے جاتے ہیں کہ وہ فکرِ معاش اپنے سر لیں اور لڑکیاں اس لئے تیار کی جاتی ہیں کہ گھر کو گھر بنائیں اور ہماری آیندہ نسلوں کی استاد اور رہنما بنیں تو دونوں کی تعلیم کیونکر یکساں قرار پا سکتی ہے اور ایک ہی تعلیم دونوں کو زندگی کے دو مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لئے کیونکر تیار کر سکتی ہے؟

آپ نے بچّوں کے لئے کچھ نکات مانگے تھے - مگر یہاں تو ابتدا بڑوں ہی سے ہو گئی - اِن معاملات کا اصلاح پا کر رو براہ ہونا بچّوں کی کوشش سے ممکن نہیں ہے - یہ کام تو ہمارا آپ کا ہے - یعنی قوم کا - قوم اگر پسند کرے تو ان نکات پر غور فرمائیے - اب تو لکھتے لکھتے ہاتھ دُکھنے لگے - اگر آپ اس بکواس میں کوئی دلچسپی لیں گی تو آیندہ خطوط کے ذریعہ سے یہ سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے - اب تو آپ نے اپنا الٹی میٹم واپس لے لیا؟ جی نہیں میں نے ہی دب کر آپ کی اطاعت قبول کر لی اب آپ چاہیں تو ہوا سے لڑیں -

تمہاری مشتاقِ دیدار

حُسنہ



تنقید

"لمعاتِ انوارِ احمدیہ"
(گذشتہ اشاعت سے آگے)

بدی کا مقابلہ کسی صورت میں نہ کرنا گو بصورت ظاہر ایک دل خوش کُن تعلیم نظر آئیگی مگر ایسی تعلیم پر عمل کیا جائے تو انجام یہی ہوتا ہے کہ ظلم اور شرارت کی کوئی روک باقی نہ رہجائے اور جان و مال کی حفاظت کے سارے انتظام کا نظام درہم و برہم ہو جائے۔ ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ نہ ایسی تعلیم کوئی قابل عمل تعلیم ہو سکتی ہے اور نہ ایسی تعلیم دینے والا معلم ہی ہمارے لئے ہادی اور رہبر کامل بن سکتا ہے جیسا کہ پروفیسر ریان اُنہیں بنانا چاہتے ہیں۔ اسکے علاوہ حیا نرمی اور صبر پر اخلاق انسانی کی پوری فہرست کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ ان اعلیٰ اوصاف کے علاوہ اور بہت سے اوصاف ہے شجاعت۔ الضاف۔ فیاضی اپنے اوپر اعتماد اور ایسے ہی اور بہت سے مردانہ اوصاف ہیں جن کے ذکر سے "پہاڑی وعظ" خالی ہے۔

آگے چلکر مولیٰنا ارشاد فرماتے ہیں کہ زبانی جمع خرچ پر ختم ہو جانے والی تعلیم کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی اصلی اور سچی تعلیم تو یہ ہے کہ معلم جس بات کی نصیحت کرے پہلے خود اُن نصیحتوں پر عامل ہو کر دنیا کو دکھا دے تاکہ دُنیا اُس مبارک نمونہ کی تقلید کر کے سچے معنوں میں ترقی کر سکے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلعم کی پاک زندگی میں بادشاہ۔ مدبر۔ سپاہی۔ جنرل۔ مقنن۔ تاجر۔ دوست

باپ ۔بیٹا۔ خاوند۔ہمسایہ ۔یا دوسرے الفاظ میں انسانی زندگی کے یہ تمام شعبے کیسی خوبصورتی اور دل آویزی سے روشن ہیں۔ اگر تمہیں انسانی زندگی کے ان شعبوں کے متعلق کسی میں کسی بات کی ہدایت کی تلاش ہے تو آپ کی زندگی کے حالات میں وہ ہدایت تلاش کرلو۔ پھر فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلعم قیصر روم اور سکندر اعظم سے بھی بڑھکر تاریخی انسان تھے ۔آپ کی زندگی کے واقعات ایک شیشے کی طرح ہمارے سامنے موجود ہیں اور اس شیشہ میں پوری صفائی اور آب وتاب کے ساتھ فطرت انسانی کی نعمت شاخیں مثلاً بلند حوصلگی ۔عالی ہمتی ۔شجاعت ۔فیاضی ۔صبر انس ۔عفو وغیرہ وغیرہ کا انعکاس کمال صفائی سے نظر آرہا ہے ۔ اس کے بعد مولٰنا ایک فقرہ لکھتے ہیں ۔ ہائے ۔ ع

چوم لوں ہاتھ میں تیرے عجب اعجاز کیا

سنئے مولٰنا کیا فرماتے ہیں

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن کریم کی ایک موثر اور دلپذیر تفسیر ہے ۔کلام اللہ میں جس خوبی یا نیکی کے حاصل کرنے کا ارشاد آیا ہے ۔تم اسی نیکی اور خوبی کو آپ کی پاک زندگی میں دیکھ لو ۔اور جس بدی سے بچنے کا حکم ہے اس سے تنفر کا نقشہ بھی ایسی پاک زندگی کے واقعات میں نہایت خوشی اور صفائی سے کھچا ہوا دیکھ لو" اللہ اللہ کیا شان ہے !

صفحہ ۲۲ پر حضرت قدوائی کے قلم نے بھی کیا کیا شگفتہ گل کھلائے ہیں کہ فرشتے بھی سبحان اللہ اور صل علی پڑھیں گے ۔ہم اس گلدستہ میں سے ایک تازہ گلاب لیکر آپ کے دماغ کی ضیافت کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

فرماتے ہیں کہ

"اہل مکہ سے ایک عرصہ دراز تک تکلیفیں اٹھانے کے بعد آپ نے طائف کا رُخ کیا۔ مگر وہاں آپ کا استقبال پتھروں کے ساتھ ہوا اور آپ کو زخمی ہو کر وہاں سے واپس آنا پڑا۔ واپسی کے وقت آپ ایک درخت کے سایہ میں لیٹے اور سو گئے اتنے میں وہاں ایک دشمن آپہنچا اور اس نے آپ ہی کی تلوار ہاتھ میں لیکر آپ کو جگا دیا اور کہا "اے محمدؐ بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے ؟" اتنی ایذا ئیں اٹھانے - پتھروں سے زخمی ہونے بھاگنے اور پھر تھک کر سو جانے کے بعد اچانک آنکھ کھل جانے پر ایسا واقعہ پیش نظر ہو جانے پر اگر کسی انسان کے حواس خمسہ بجا نہ رہتے تو کہا جاتا کہ بالکل مقتضائے بشریت تھا۔ مگر یہ تقاضائے بشریت معمولی انسانوں کے ساتھ ہے۔ اب دیکھیے کہ اللہ پاک کا نبی برحق یہاں پر کیا کرتا ہے۔ قدوائی صاحب فرماتے ہیں کہ "آپ کے دل پر ایک لمحہ کے لئے بھی خوف طاری نہیں ہوا اور نہ آپ نے کچھ تامل کیا۔ بلکہ فوراً جواب دیا" سوال تھا کہ " اے محمدؐ بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے ؟ اس سوال کا جواب سُنئے "میرا خدا!" اللہ رے ایمان! خدا پر بھروسہ رکھنا اس کا نام ہے۔ اب سُنئے کیا نتیجہ ہوا" اس جواب سے جو ان حالات میں ایک عاجز انسان کے وہم میں بھی نہ آ سکتا تھا دشمن ایسا مرعوب ہو گیا کہ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور آنحضرت صلعم نے اسے فوراً اٹھا کر دشمن کو یوں مخاطب کیا "اب بتا میرے ہاتھ سے کون تجھے بچا سکتا ہے ؟" اس پر دشمن نے رحم کی درخواست کی۔ مگر حضور تو ایسے انسان نہ تھے کہ ایسے موقعہ پر اپنے غالب آجانے پر فخر کرتے۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ " وہی خدائے پاک

جس نے مجھے تیرے ہاتھ سے بچایا تھا تجھے بھی میرے ہاتھ سے بچا دیگا" دشمن جس نے مبہوت ہو کر یہ عظیم الشان اخلاقی معجزہ دیکھا تھا کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ اُسیوقت آپ کے قدموں پر گر پڑا اور وہیں مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ سبحان اللہ کیا شان ہے آپ کی!

مسٹر قدوائی اس واقعہ کا مقابلہ جناب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے اُس واقعہ سے کرتے ہیں جب آپ کو آپ کے دشمنوں نے طرح طرح کی وحشیانہ ایذائیں پہنچائی تھیں اور اُس موقعہ پر آپ کی زبان مبارک سے عبرانی زبان کا یہ فقرہ نکلا تھا" ایلی۔ایلی۔لما سبقتانی!" اے میرے خدا۔اے میرے خدا۔ تو نے مجھے چھوڑ دیا! اس کے ساتھ ایک اور ایسا ہی واقعہ قدوائی صاحب ہمیں یاد دلاتے ہیں جبکہ جناب سرور کائنات صلعم اپنے ایک رفیق[۱] کے ساتھ ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے اور خون آشام دشمنوں کی تعداد کثیر آپ کی جان لینے کی فکر میں تگ و دو کر رہی تھی۔ دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ پا کر آپ کے تنہا رفیق نے پاس کے ساتھ کہا کہ "ہم صرف دو ہیں اور دشمنوں کی کثیر تعداد ہمارے سر پر آپہنچی ہے" اس کے جواب میں حضور نے کیا ارشاد فرمایا؟ کیا یہ کہا تھا کہ اللہ نے ہمیں چھوڑ دیا۔یا کوئی اور ایسا ہی یاس یا خوف و ہراس کا فقرہ زبان مبارک سے نکالا تھا؟ نہیں نہیں۔آپ نے کچھ اور ہی فرمایا تھا۔اور وہی فرمایا تھا جو ایک برگزیدہ نبی کی شان کے شایاں تھا"لا تحزن ان اللہ معنا"

---

[۱] حضرت ابوبکر صدیق

یعنی "کچھ پرواہ نہیں - اللہ ہمارے ساتھ ہے" یا دوسرے الفاظ میں - اگرچہ
بصورت ظاہر ہم دو ہی افراد ہیں مگر چونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے ہم دو آدمی دو
کرور کی قوت رکھتے ہیں - ایمان اور اللہ پاک پر بھروسہ رکھنا اسے کہتے ہیں!
اس کے بعد "حصول طاقت پر آنحضرت صلعم کا اظہار اخلاق" والا مضمون قابل ذکر
ہے - اس مضمون میں بحث کی گئی ہے کہ عفو کی صفت وہی انسان دکھا سکتا ہے جو
تین قسم کے مختلف مدارج سے طے کر چکا ہو۔

(۱) وہ خود مصیبت میں مبتلا ہوا ہو اور بیکسی کی حالت میں اس کے دشمنوں
نے خوب دل کھول کے اسے ستایا ہو۔

(۲) وہ آخر کار مصائب اور مشکلات پر فتحیاب ہوا ہو - اور فتحیاب ہو کر
پھر طاقت قوت اور اقتدار اسنے حاصل کر لیا ہو۔

(۳) اس حالت پر پہونچنے کی حالت میں وہی موذی دشمن جو ابھی کل اسکے
خون کے پیاسے تھے اور اس کی ساری تکلیفوں اور مصیبتوں کے بانی تھے آج
بالکل بیکس اور بے بس ہو کر اس کے سامنے حاضر لائے گئے ہوں اور سوا
اس کے رحم کے اور کوئی دوسری صورت ان کی رستگاری کی باقی نہ رہی ہو - ایسی
حالت میں ایسے موقعہ پر اگر وہی شخص اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لیتا - انہیں
ان کی بداعمالیوں کی سزا دینے کی عیوض بکشادہ پیشانی ان کا قصور معاف
کر دیتا ہے تب ہی اور صرف تب ہی یہ بات کہی جا سکیگی کہ اس شخص نے
بنی نوع انسان پر رحم دکھایا - مگر برعکس اس کے جس شخص کے سامنے کوئی رحم کا خواستگار
بنکر آیا ہی نہیں تو اس شخص کی نسبت کیونکر کہا جا سکیگا کہ اس نے رحم دکھایا یا نہیں

رتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رحم اور جناب رسالت آب کے رحم کا ہے۔ اور
دونوں کے رحم میں اتنا ہی فرق ہے۔

مولوی صدرالدین صاحب مسلم مشنری امام مسجد ووکنگ کے قلم اعجاز رقم نے
بھی ایک گرانقدر ہدیہ آپ کے لئے بھیجا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمایئے۔ آپ ہمارے
نبی کریم صلعم کے حالات زندگی میں سے آپ کے ایک مشہور عیسائی خاتون کے
ساتھ برتاؤ کا واقعہ ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ یہ دل کش مرقع یوں آپ کے سامنے
پیش کیا گیا ہے "یمن کی ایک قوم طے کی شکست کے بعد اسیران جنگ میں کچھ عیسائی
عورتیں بھی آپ کے سامنے پیش کی گئیں ان میں ایک مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی
بھی تھی۔ جناب سرور کائنات صلعم کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حاتم کی بیٹی ہے تو آپنے
اس کی بڑی توقیر کی اور اُسے مخاطب کرکے فرمایا کہ " اللہ پاک ایسے لوگوں سے
محبت کرتا ہے جو اس کی مخلوق سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ چونکہ اعلیٰ درجہ کی انسانی
نیکیوں اور شرافت کا نام اسلام ہے لہذا اسلام کو جہاں کہیں نیکی اور شرافت نظر
آجائے وہ ہر صورت اور ہر حالت میں اس کی عزت کرتا ہے" یہ کہکر آپنے حاتم طائی
کی بیٹی کو آزاد کر دیا۔ مگر وہ فراخ حوصلہ لڑکی آخر حاتم ہی کی بیٹی تھی۔ اس کے
علاوہ ہمارے نبی کریم کا حسن سلوک اور آپ کی پاک سیرت دیکھ کر اُسے اور
بھی جرأت ہوئی اور اُس نے عرض کیا کہ میں تن تنہا آزاد ہو جانے پر اپنے باقی
قبیلہ کے ساتھ قید رہنے ہی کو ترجیح دوں گی۔ یہ سچا ایثار حضور انور کے سے
جوانمرد اور نیکی کے قدر دان کے سامنے رائگاں نہیں ہوسکتا تھا۔ اور اُس کی
سفارش منظور کرکے آپ نے حکم دیا کہ اس کی ساری قوم کے قیدی رہا کر دیے

جائیں۔ سبحان اللہ یہ شان تھی آپ کی!

اس کے بعد اسلامی "قوانین جنگ" والا مضمون قابل ذکر ہے۔ ان قوانین یا اصولوں میں سے خاص خاص احکام پر اکتفا کریں گے۔ اور مہذب دنیا سے کہینگے کہ وہ اپنے تیرہ سو برس بعد قائم کئے ہوئے اصولوں سے ان ابتدائی اصولوں کا مقابلہ کرے یہ اصول ہمارے دینی احکام میں داخل ہیں اور دنیائے اسلام تیرہ سو برس سے ان کی پابند ہے۔

(۱) خبردار۔ تم کسی حال میں اپنی تلواریں ایسے شخصوں کے خون سے داغدار نہ کرنا جنھوں نے تمہاری اطاعت کرلی ہو۔

(۲) دشمنوں کے بچے۔ عورتیں۔ ناطاقت مریض یا ضعیف اشخاص سے کبھی کسی حال میں مزاحم نہ ہو اور نہ انہیں کسی صورت سے ایذا پہنچاؤ۔

(۳) دشمن کے ملک میں فاتحانہ داخلے کے وقت کھجور کا یا کوئی دوسرا ثمردار درخت ہرگز نہ کاٹو۔ اسی طرح زمین کی پیداوار کو بھی نقصان نہ پہنچاؤ کھیتوں کو نہ اجاڑو۔ مکانوں کو نہ جلاؤ۔

(۴) اپنے دشمن کے ذخائر میں سے محض اسی قدر لو۔ جتنے کی تمہیں واقعی ضرورت ہو۔

(۵) دشمن کے شہر پر قبضہ کرلو۔

(۶) جو لوگ تم سے رحم کے خواستگار ہوں ان پر ضرور رحم کرو۔ جن لوگوں کا محض تمہارے ہی رحم پر مدار ہے انہیں مت ستاؤ۔ ہاں البتہ جو لوگ تمہارے دشمنوں کو پناہ دیتے ہوں انہیں بیشک تباہ کردو۔

(۷) اسیران جنگ کے ساتھ رحم اور شرافت کا برتاؤ کرو۔ متکبروں اور باغیوں کو ضرور روند ڈالو۔

(۸) اُن لوگوں کو قرار واقعی سزا دو جو عہد شکن ثابت ہوں۔

(۹) جو عہد نامے دشمنوں کے ساتھ کرو ان میں کسی قسم کی چالاکی۔ عیاری دغا بازی اور فریب نہ کرو۔

(۱۰) سارے معاملات میں دیانت اور صداقت کے ساتھ کام کرو۔ عادل رہو اور عدل کرو۔ شریف رہو اور شرافت قائم رکھو۔

(۱۱) راہب اور تارک الدنیا اشخاص سے کبھی مزاحم نہو۔ اور نہ اُن کے مکانات تباہ کرو۔

(۱۲) دشمن کی تعداد چاہے تم سے کتنی ہی زیادہ ہو۔ تم اس کی مطلق پرواہ نہ کرو۔

(۱۳) اللہ تعالیٰ جب تمہیں فتح نصیب کرے تو اپنی کامیابی سے کبھی کسی حال میں کوئی ناجائز فائدہ مت اُٹھاؤ۔

یہ ہیں اسلام کے جنگی قوانین۔ اہل نظر قوانین کا ہیگ کے بین الاقوامی قوانین سے مقابلہ کریں اور اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ ان دونوں قوانین میں سے کون کون قوانین محض کاغذ کی زیبایش کے مصرف میں آتے ہیں اور کن کن پر کون کون واقعی عامل ہے۔

اسلامی قوانین جنگ کے سلسلہ میں یہ امر بھی قابل یاد رکھنے کے ہے کہ محض اشاعت دین کی اغراض کے لئے جنگ کرنے کا حکم کلام اللہ میں کہیں نہیں ہے

اور جنگ کی اجازت نہیں دی گئی ہے جب تک کہ اسلام کی ہستی معرضِ خطر میں نہ آجائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس نایاب زمانہ کتاب کے ہر ہر مضمون سے اقتباس کرکے کچھ نہ کچھ ہدیہ ناظرین کرنا ہمیں غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں ایسے مضامین سے کبھی سیری نہیں ہوتی مگر وقت اور جگہ کی قلت ہمیں مجبور کردیتی ہے۔ ابھی بہت سے نکات قوم کے سامنے پیش کرنا باقی ہیں اس وجہ سے ہم اپنا ریویو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ ایسے ہی مضامین ہیں جن کے پڑھنے سے گھر آباد ہوتے ہیں۔ برکت نازل ہوتی ہے اور قومیں بنتی ہیں۔ اگر ایک کتاب پر ریویو کرنے ہی کے حیلہ سے ہم قوم کو بیدار کرنے کا موقع نکالنا چاہتے ہیں تو کیا گناہ کرتے ہیں! ہمیں امید ہے کہ ناظرین ان سطور کو خود بغور ملاحظہ فرمائیں گے اور زیرِ تعلیم لڑکے لڑکیوں کو بھی ضرور ان کے مطالعہ کا شوق دلائیں گے یہی وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ سے اسلام کی عظمت ہمارے بچوں کے دل پر نقش کیجا سکتی ہے۔ (باقی آئندہ)

پیام امید کا ادبی نقاد



گردشِ زمانہ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

نازنین۔ پاگلوں کی سی باتیں مت کرو۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھاؤ گے یا نہیں؟ تم کیسے آدمی ہو کہ اپنی بیوی کو نہیں پہچان سکتے۔ سچ ہے۔ (مصرع)

ابھی سن ہی کیا ہے جو بیباکیا ہوں

میں اس پری تمثال نازنین کی شیریں گفتاری پر محو حیرت ہو گیا۔ یکایک نازنین نے مٹھائی اپنے ہاتھ سے اٹھا کر مجھے کھلائی۔ انکار نہ کر سکا۔ جب کھانے سے فارغ ہوا تو اس نازنین نے دریافت کیا "کیا تم حقہ پیتے ہو؟ حکم ہو تو میں لے آؤں" میرا جواب نفی میں تھا۔ اس نے پھر کہا "اچھا اب تم کیا کرو گے؟ میری دانست میں تو تمہیں اب آرام کرنا چاہیے۔ کیونکہ سفر کا تکان بہت زیادہ ہو گیا ہو گا"

میں۔ (بڑی عاجزی سے) کیا کہوں مجھے بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم انہیں رفع کر دو گی۔

عورت۔ وہ کیا شکوک ہیں؟ میں تمہاری ایک ادنیٰ لونڈی ہوں جو کچھ پوچھو گے صاف بیان کر دوں گی۔

میں۔ کیا درحقیقت تم میری بیوی ہو؟ میرا دل کیوں گھبراتا ہے؟ سر میں کیوں چکر آتا ہے؟ طبیعت کے نڈھال ہونے کا کیا سبب ہے؟ کیا اس کھانے میں زہر ملا ہے؟ کچھ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیا کھلا دیا؟ اس آفت میں کیوں مبتلا کیا؟

نازنین - چہ خوش! میں کون ہوں یہ تم ابتک نہیں جانتے؟ میں تمہاری بیوی ہوں اچھا اب پھر ملوں گی - کیونکہ تم بہت تھکے ہوئے ہو - اس وقت تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے - بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تمہیں آرام کرنا چاہئے -

میرے سر میں بے انتہا چکر پیدا ہوگیا - اپنے بیگانے کی خبر نہ رہی اور غش آگیا کتنی دیر تک بیہوش رہا - اس کا مطلق علم نہیں - ہوش ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تمام جسم برہنہ ہے صرف ایک لنگوٹی بندہی ہے - پھوس پر پڑا ہوا ہوں - چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے - ہو کا مقام ہے - دل دہلنے لگا - کلیجہ ہاتھوں اُچھلنے لگا - یاس نے آکر گھیر لیا - اپنے حالِ زار پر بے اختیار رونے لگا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کیا دُنیا میں ایسے ہی باپ ہوتے ہیں؟ کیا اس حالت پر پہنچانے والا میرا باپ ہی ہے؟ کیا باپ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں؟ کیا مکان سے مجھے قید کرنے کے واسطے لائے تھے؟ کیا مجکو اُنھوں نے اسی واسطے پرورش کیا تھا؟ جب آنسو تھمے تو میں نے دیکھا کہ روشندان سے خفیف سی روشنی آرہی ہے جیسے ہی سورج بڑھتا گیا ویسے ہی روشنی بھی زیادہ ہوتی گئی - ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی - میں نے اندازہ کیا کہ جس کوٹھری میں میں قید ہوں وہ پانچ ہاتھ لمبی اور تین ہاتھ چوڑی ہے - ایک بہت مضبوط آہنی دروازہ لگا ہوا ہے - اس کے سوا اور کوئی راستہ کوٹھری کا معلوم نہیں ہوتا - کوٹھری اسقدر تنگ ہے کہ ایک آدمی کے واسطے بمشکل کافی ہوسکتی ہے - پھوس کے بچھونے کے سوا اور کچھ نتھا - میں نے چاروں طرف تلاش کی لیکن کوئی نکلنے کا راستہ نہیں ملا - مجبوراً اپنی قسمت کو رو کر چپ چاپ بیٹھ رہا - پھر دل میں خیال آیا کہ اگر ممکن ہو تو

دیوار کے سہارے روشندان کے ذریعہ سے چھت پر پہنچ جاؤں اور وہاں سے رہائی کی کوئی تدبیر نکالوں۔ لیکن یہ ناممکن معلوم ہوا۔ کیونکہ دیواریں بہت ہموار تھیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سر میں چکر آگیا اور میں پھر بیہوش ہو گیا۔ (باقی آیندہ)

عبید الحق

موسو

یہ دوا اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں تمام دردوں وجع المفاصل۔ نقرس۔ گٹھیا۔ عرق النسا۔ درد پشت۔ فالج۔ ادھرنگ۔ ذات الصدر ذات الجنب۔ خارش جسم وغیرہ جیسی تمام شکایات کو رفع کرنا اس کا اصلی کام ہے یہ مالش کرنے کی صورت میں اپنا اثر فوری دکھاتا ہے۔ اکثر بادی۔ بلغم اور ریح وغیرہ یا بے اعتدالیوں کی وجہ سے بڑھاپے میں جس کو ایسے دردوں کی تمام شکایات پائی جاتی ہیں اُن اصحاب کے لئے موسو کا استعمال نہایت مفید ہے۔ بطور حفظ ماتقدم اس کی مالش سے آنے والی شکائیتیں رُک جاتی ہیں۔ ایک بکس جس کی قیمت صرف ۲ ار ہے مدت کے لئے کافی ہے۔

المشتہر

سلیمان اینڈ۔ روز۔ ۱۱۵ بیگانڈیٹ سٹریٹ رنگون

ملک (برھما)

کتاب نسواں

مستورات ہند کے لئے دستور العمل

یہ کتاب اپنے نہایت مفید و کارآمد ہونے کے علاوہ تمام ہندوستان میں اسقدر مقبول ہوئی ہے کہ اب تیسری مرتبہ چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ تعلیم نسواں میں یہ سب سے بہتر کتاب ہے جس کی فی الحقیقت ہندوستان کی مستورات کے لئے ہر گھر میں اس کتاب کی ضرورت تھی۔ ضرورت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس میں بچپن سے لیکر عورت کی عمر کے موافق خانہ داری و دنیاداری کے لحاظ سے جو جو واقعات پیش آتے ہیں اُن سب کے متعلق عمدہ تدبیریں اور مناسب طریقے و ہدایتیں بتلادی ہیں گویا ہر وقت اور ہر کام کا ایک مکمل ہدایت نامہ ہے اس کتاب کے تین حصہ میں پہلا حصہ بچپن کے متعلق ہے جس میں ہر کام کے لئے نصیحتیں اور ہدایتیں سینے پرونے خطوط نویسی ضروری حساب کے گر۔ رقم ہندسہ کے طریقے کھانے مٹھائیوں کپڑے رنگنے کے عمدہ نسخہ۔ ترکیبیں حفظان صحت کے طریقے دوسرے حصہ میں جوانی کے متعلق شباب کی بیماریوں کا علاج سسرال اور شوہر کے اتحاد کے فوائد و طریقے حاملہ عورت کی پوری کیفیت و بیماریاں و علاج و بچہ کی پرورش کے بہترین طریقے اور تیسرے حصہ میں معاملات دنیاداری کے متعلق خانہ داری کا کامل مناسب انتظام اولاد کی شادی کے لئے بہترین ہدایتیں اصلاح رسومات ابتدائی عمر سے اولاد کی تعلیم دینے کا ڈھنگ آسمان و زمین کے دلچسپ حالات تمام معمولی بیماریوں کا مجرب علاج مفید صنعت و حرفت کے نسخے جدید قواعد ریلوے قواعد ڈاکخانہ وغیرہ وغیرہ حجم تقریباً ۴۰۰ صفحہ کاغذ عمدہ

[illegible]

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر رہنما بک ایجنسی شہر مراد آباد

جس کا درد وہی جانتا ہے دوسرا کیونکر جان سکتا ہے

یوں تو کوئی ایسا مرض نہیں جسکی تکلیف سے مریض نالاں و پریشان نہو مگر دمہ کے مریض خاصکر دمہ کی ناقابل برداشت تکلیف سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور رات دن سانس پھولنے کیوجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند حرام ہو جاتی ہے دیکھیے آج ان کو کسقدر تکلیف ہے لیکن افسوس ہے کہ اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیا، دھتورہ بھنگ بلاڈونا۔ پوٹاش ای اوڈ اُنڈ وغیرہ سے بنتی ہیں اسلئے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا۔ ایک انمول جوہر آپ بہت خرچ کیا ہوگا۔ لیکن ایک مرتبہ اسے بھی آزمائیں قیمت عہ فی شیشی محصولڈاک ۵؍

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی خون سے ہے اسلئے خون صاف رکھنا ضروری ہے اور اسکی ترکیب بھی آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی ڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں پوٹاش ای اوڈ اُنڈ وغیرہ کئی ایک آزمودہ ادویہ ملا کر بنا ہے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے۔ گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ گیا ہو تو اسکو استعمال کیجیئے۔ اگر آپ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو تندرست رکھنا چاہتے ہوں تو لال شربت پلا دیں کلیجہ کی کمزوری دکھانسی ولاغری کو دور کرنا چاہتے ہوں تو

لال شربت

پلا دیں پیدائش کے وقت سے ہوشیار ہونے تک دوا یکساں فائدہ کرتی ہے پینے میں شیریں اور رنگ سرخ ہونے کی وجہ سے لڑکے خواہش سے پیتے ہیں۔ قیمت ۱۲؍ فی شیشی محصولڈاک ۴؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

جنگ! جنگ!! خونریز جنگ!!! اور فتح!!!!

حسن و شباب کے ولولے حجاب شرم وحیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمناؤں کے پیدل۔ ارمانوں کے شعلہ آشام سوار۔ حسرتوں کے شرر بار رسالے دل کے سنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور غنیم کی شعلہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادھر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا پرجوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اضطراب کے توپخانے سے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش وخروش سے جنگ جاری ہی کہ اتنے میں کچھ ادائیوں کا غنیم جنرل "وفا" کی ڈویزن پر ایک سخت خونریز اور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "وفا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہی مگر نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ پھر وقفہ پاکر "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آتے ہیں۔ اس نئی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے اُسے دیکھتے ہی غنیم ہتیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات۔ یہی حسن وعشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے جذبات کی تصویر۔ عفت اور حیا کا دلنشین مرقع خلوص صدق وصفا کے صاف شفاف آئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادہر آئیے ہم دکھاتے ہیں سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت اُستاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت جلیل شاعر دربار راج بلرام پور کی زبان سے مُرصع اردو نظم میں بڑے آب وتاب بڑی خوبی وخوش اسلوبی سے چھپ کر تیار ہے حجم ۵۰ صفحہ قیمت مجلد ۱۰ / ر

ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ "پیام اُمید" آگرہ

شیکسپیر اردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار، چھائی ہوئی ظلمت شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت اُلفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی کانوں میں صدائے یار آئی

فرمائیے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟
یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پا چکا ہے
اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی
کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ
اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔
اصلی قیمت ۱۲؍ تھی۔ اب رعایتی قیمت عہ؍ رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

فہرست مضامین پیام امید ماہ اکتوبر ۱۷ء

اُمید کا پیام ..."اُٹھو ... اُٹھو ... اور آگے بڑھو"!

پیامِ امید

نمبر۳ || محمود آباد سیتا پور - اکتوبر ۱۹۱۷ء || جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام اُمید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے۔ اس میں جنس کی قید نہیں۔ جس حال میں کہ ہزاروں اخبارات اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گذریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قایم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

متفرق نکات

آج کی اشاعت میں کسی دوسرے مقام پر "زبان کی لڑائی" کے عنوان سے جناب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا مضمون رسالہ "گلچیں" سے

نقل کرکے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا موقع ہے کہ ہم دامن "گلچیں" اسے گل چینی
کرنے پر مجبور ہو گئے اور ہمیں بدرجہ مجبوری اپنے معینہ اصول سے تجاوز کرنا پڑا۔ اس
مضمون کے ذریعے جو اہم نکات حضرت عشرت لکھنوی نے پیش کئے ہیں ان پر قوم
اور ملک کی خاص توجہ درکار ہے۔ آپ کا فرمانا بالکل بجا و درست ہے کہ جب تک
ساری اردو بولنے والی دنیا یک دل و یک زبان ہو کر اس امر پر متفق الرائے ہو لیگی
کہ صرف لکھنؤ اور دہلی ہی کی ٹکسالی زبان مستند زبان ہے۔ اسی کا اور محض اسی کا
تتبع کیا جانا چاہئے اس وقت تک نہ اردو زبان ہی کوئی ترقی کرسکتی ہے اور نہ قوم
ہی۔ اس وجہ سے کہ قومی ترقی کا پیش خیمہ زبان ہی کی ترقی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا
بھی حق بجانب ہے کہ جب تک ہم اس حد تک نہ پہنچ لیں گے خود رَو اور خود سر
مصنفین کی اصلاح بھی ناممکن ہے۔ ایسے مصنفین جن کی تصانیف سے ملک کا
مذاق بھی بگڑ رہا ہے اور جو زبان اور محاورات کی بھی بُری طرح مٹی پلید کر رہے
ہیں۔ ہماری قومی ہستی کے لئے ان کا وجود کسی وبا یا طاعون سے کم نہیں ہے۔ اور
جب تک یہ وبا ترقی کر رہی ہے سوا تنزل شامت اور ادبار کے کسی اور بات کی امید
رکھنا بعید از عقل ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آجکل لوگ اردو تو باقاعدہ حاصل نہیں
کرتے اور ایک انجمن قائم کرکے اردو کے حقیقی وارث بنجاتے ہیں۔ پھر ایسی اردو میں
دو چار کتابیں ترجمہ کرکے چھپوا دیتے ہیں جن کی زبان دائرۂ اردو سے خارج ہے۔ ریاؤں
سے تحصیل زر کرکے زبان پر احسان کرتے ہیں۔" (جی وہ زبان پر احسان نہیں فرماتے
خود اپنے اوپر احسان کرتے ہیں اور بجائے قوم کے محسن ہونے کے وہ خود اپنے ہی
محسن ہیں "پیام امید") جن حضرات کی نظر سے "انجمن تنزل اردو کے معرکۃ الآرا

کارنامے" اور مولٰنا احمدؐ علی صاحب شوق کا "دریائے لطافت" پر تبصرہ گذر چکا ہے وہ اچھی طرح سمجھ جائیں گے کہ ان سطور کا اشارہ کن بزرگو!ر کی جانب ہے۔ اگر اس میں بھی کچھ شک باقی رہ گیا ہو تو حضرت عشرت کا فقرہ ذیل ملاحظہ فرمایئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "ریاستوں کو بھی اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ایسے لوگوں کی مدد کی جائے جو زبان اردو کے ماہر ہوں اور اس کی خدمت کرنے کے قابل ہوں" ایک طرف تو حضرت شوق اور حضرت عشرت کے خیالات ہیں۔ دوسری طرف ایک اور ہی طبقہ کی واہ واہ ہے جسے خوف ہے کہ خدا نخواستہ دور از حال نصیب دشمنان کہیں "مولٰنا" کے کام کو نظر نہ لگ جائے! حضرت عشرت کا آخری فیصل کن لفظ یہ ہے کہ یہ "کام ہے ملک کے ادبی رسائل کا۔ .... اب زبان کی لڑائی کا وقت آگیا ہے فصحا اپنی خدمت وقف کر دیں اور جدید مصنفین کی تصنیف پر تنقیدی نظر ڈالا کریں"

"پیام امید" ایک مدت سے اس ضرورت کی جانب قوم کو توجہ دلا رہا ہے۔ اور آج بھی ادب کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ ایسے فصحا کے افکار اور خیالات کے لئے "پیام امید" کے کالم ہمیشہ وقف رہیں گے۔ حیدر آباد کی اردو یونیورسٹی کے ساتھ قوم اور ملک کی بہت سی خوشگوار امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ وہاں بھی بعض نا اہل ہاتھ دخیل ہو رہے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں خوف پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں اردو یونیورسٹی کا مضمون بھی ٹائیں ٹائیں فش کا مصداق ثابت نہ ہو۔ اور بہت سا بیکار روپیہ اس طور پر نہ پھونک دیا جائے۔ جو آخر کار نہ دنیا کا ثابت ہو نہ دین ہی کا۔

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رئیس گورکھپور اور جناب مرزا شہید صاحب

امرتسری کا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ دونوں صاحبوں نے رسالہ کی مستقل طور پر مضمون نگاری قبول فرمالی ہے۔ دونوں صاحبوں کے مضامین نہایت اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہیں اور دونوں کی اعانت ہمارے لئے باعث طمانیت اور مسرت ہے ع

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

ہمارے معاونین برا مانتے ہیں اگر توسیع اشاعت کے باب میں ہم ان صفحات کے ذریعہ سے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ نیکی کرتے ہیں محض اسوجہ سے کہ یہ نیکی ہے مگر شہرت پسند نہیں کرتے۔ مجبوراً ہمیں بھی اپنی روش بدلنا پڑی اور ہم نج کے خطوط کے ذریعہ سے اُن کا دلی شکریہ ادا کردیا کریں گے۔

مجھے افسوس ہے کہ گذشتہ دو ماہ سے "پیام امید" کی اشاعت مہینے کے ہفتہ اوّل کے اندر نہیں ہو رہی ہے۔ اور خوف ہے کہ موجودہ اشاعت میں بھی کچھ نہ کچھ توقف ہوگا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی عبدالمجید کی شادی میں شرکت کی غرض سے پنجاب آئی تھی مگر عین شادی کے موقع پر سخت علالت کا سامنا کرنا پڑا داہنے جانب کی پسلیوں پر پہلے آماس ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر کی رائے سے پچیس جونکیں لگوائی گئیں افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار یہ آماس ایک خطرناک پھوڑا ثابت ہوا۔ اور دوائے بیہوشی سونگھا کر عمل جراحی کیا گیا۔ مواد پسلیوں تک پہنچ چکا تھا۔ نصف پاؤنڈ سے زیادہ مقدار میں نہایت ہی غلیظ مواد نکلا۔ زخم بہت گہرا تھا۔ اندمال کے لئے بھی کافی مدت درکار رہتی۔ ابھی

تک صحت نہیں ہوئی ہے۔ حال ہی زخم کے کنارے پھر دوسرا شگاف دیا گیا ہے۔ وہاں بھی مواد پڑ گیا تھا۔ القصہ صحت کی ایسی حالت میں اگر رسالہ ٹھیک وقت پر شائع نہ ہوسکا تو معزز ناظرین اس معذوری کو قابل معافی تصور فرمائیں گے میں ہمیشہ کوشش کروں گی کہ اشاعت ٹھیک وقت پر یعنی ہفتہ اوّل کے اندر اندر ہوجایا کرے

آزاد بیگم

خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

انگلستان کے مشہور شاعر کاؤپر نے اعلیٰ اوصاف انسانی سے متصف شخص کے اوصاف کا عجیب معیار مقرر کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ میں اپنے دائرۂ احباب میں ہرگز کسی حال میں ایسے بے درد شخص کو داخل ہونے دونگا جس نے بلا وجہ اور بے سبب کسی کیڑے پر بھی پاؤں دھر کے اُسے روندڈالا ہو چاہے وہ بہ ظاہر کیسا ہی سمجھدار اور تربیت یافتہ نظر آتا ہو" کاوپر کا تو یہ معیار ہے مگر دنیا میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو کبھی عمداً وقصداً کسی جاندار کیڑے کو اپنے پاؤں کے نیچے نہ آنے دیں گے۔ جو کسی بیزبان جانور کو کبھی بے ضرورت ایذا نہ پہنچائینگے مگر باوجود اس کے وہی لوگ اپنی بے صبری کی نگاہوں اور دلخراش الفاظ سے اپنی غمگسار اور محبت سے بھری ہوئی بیوی کے دل کو ضرور صدمہ پہنچائیں گے!

مشکل یہی ہے کہ جو لوگ گھر کے اندر کھلے بندوں رہنے کے عادی ہو ہے

ہیں اور تغافل شعاری ہمارا شیوہ ہوگیا ہے۔ دوست احباب کی صحبتوں میں غیر مستورات کے ساتھ ہمارا برتاؤ نہایت ہی شرافت اور اخلاق کا ہوتا ہے اور ہمیں اپنے ایسا شریفانہ آداب کے عادی ہونے پر بڑا ناز ہے۔ ہمیں ہمیشہ اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ ہماری نگاہ ہمارے تیور۔ ہمارے لہجہ سے کوئی ایسی بات نہ پیدا ہوسکے جس سے دوسروں کے دل آزردہ ہوں۔ مگر گھر پہنچتے ہی یہ سارے آداب ہم تہ کرکے دھر دیتے ہیں۔

ہماری تقریر کا لہجہ کرخت ہوتا ہے اور ہمیں بالکل اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ہماری باتوں کا کیا اثر ہماری بیوی کے دل پر پڑے گا۔ وہ ساری بدمزاجی جو سڑکوں اور شاہ راہوں پر پھرتے وقت ہم نے دبا رکھی تھی گھر پہنچتے ہی ہم اس کے ذخیرہ کا منھ کھول دیتے ہیں۔ ہم سیدھے سادے سوالات کا جواب خشونت آمیز لہجہ میں دیتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بے صبر بن جاتے ہیں۔ ہماری صورت پر غمگینی اداسی اور وحشت برستی ہے اور ہم میں نہ خلق کی جھلک نظر آتی ہے اور نہ ملنساری کی ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کی اور عورتوں کی طرح ہماری بیویاں بھی آپس کے برتاؤ میں شرافت اور نرمی پسند کرتی ہیں اور جس طرح غیر کنبہ کی بیویوں کے ساتھ اگر اس کے خلاف برتاؤ کیا جائے تو انہیں ضرور رنج پہونچے گا۔ اسی طرح انہیں بھی پہنچتا ہے ہم میں سے ہر شخص یہ امید رکھتا ہے کہ اس کی بیوی کو اس کی افتاد طبیعت سے واقف ہونا چاہیے اور اُسے جاننا اور یقین کرنا چاہیے کہ اس کا شوہر اس سے محبت رکھتا ہے۔ اگر ایسے شوہر کے منھ سے کسی وقت کوئی بے صبری کا فقرہ نکل جائے تو بیوی کو اس سے بدگمان یا ناراض نہ ہوجانا چاہیے۔ اور چاہیے نہ نیا میں

اور کوئی عورت اس موقعہ پر ویسے برتاؤ سے ناراض ہو جاتی مگر بیوی کو ناراض نہ ہونا چاہئے۔ مگر ایسی توقعہ محض فضول اور بالکل غلط ہے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ تمہاری بیوی ہے تمہیں جاننا چاہئے کہ ہر طرح اس کی دلداری اور پاسداری کرنا اُس سے ہمیشہ شرافت کا برتاؤ قایم رکھنا تمہارا خاص فرض ہے۔ تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ تمہارے ایک دلخراش لفظ کی جیسی چوٹ تمہاری بیوی کے کلیجے پر لگیگی دنیا کی کسی عورت کے دل پر لگ نہیں سکتی اور یہ کہ دنیا میں کسی عورت کی دل شکنی کا تمہیں اتنا خیال نہ رکھنا چاہئے جتنا اپنی بیوی کی دلشکنی کا کیونکہ ایسی پاسداری کی سب سے زیادہ وہی مستحق ہے۔ کسی کو چاہنے سے تمہیں اس بات کا ٹھیکہ نہیں مل جاتا کہ جب تمہارا جی چاہے بے تمیزی اور نا ملائمت کا برتاؤ کر کے اُس کا دل دُکھاؤ۔ جتنی ہی کسی کے دل میں تمہاری طرف سے زیادہ جگہ ہوگی اتنا ہی زیادہ تمہارے لہجے تمہارے تیور اور تمہاری ادنیٰ ادنیٰ سی بات کی جو خلاف ہوگی اس کے دل پر چوٹ لگیگی۔ (باقی آیندہ)

(مترجم)

اسمائیلس کیریکٹر

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ علمی قابلیت کا کوئی تعلق اعلےٰ اوصاف انسانی سے نہیں ہے۔ اور یہ امر بالکل ضروری یا لازمی نہیں ہے کہ جو شخص علمی قابلیت رکھتا

ہو وہ خواہ مخواہ ہی اعلیٰ اوصاف خصائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ سے بھی ضرور ہی متصف ہو۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ علم کے مقابلہ میں دولت وثروت کا اس سے بھی کم تعلق اعلیٰ ترین اخلاقی اوصاف (کیریکٹر) سے ہے۔ بلکہ برعکس اس کے بیشتر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ دولت وثروت کا بُرا اثر انسان کے اخلاقی اور انسانی جوہروں (کیریکٹر) پر پڑتا ہے۔ اور وہ ان جوہروں کی تباہ کُن ثابت ہوتی ہے۔ ہاں البتہ اگر ساتھ ہے تو دولت کا ساتھ اسراف۔ عیش پرستی اور بدچلنی کے ساتھ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ اور ان میں باہمی رشتہ اکثر برقرار دیکھا گیا ہے۔ دولت جب ایسوں کے ہاتھ آجاتی ہے جن کے ارادے مضبوط نہ ہوں یا جن میں ضبط کرنے کی کم صلاحیت ہو یا جو اپنی دلی اُمنگوں کو قابو میں نہ رکھ سکتے ہوں تو ایسی حالتوں میں دولت اُن کے حق میں محض ایک بدی کی ترغیب ہے ایک جال ہے جس میں ہر وقت اُن کا پھنس جانا ممکن ہے جو اُن کی اور اُن کے ساتھ اوروں کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔

برعکس اس کے ایسے دولت وثروت کے مقابلہ میں نسبتاً غریبی اعلیٰ پایہ کے انسانی اور اخلاقی جوہروں کی روادار بن سکتی ہے۔ یہ بات ہمیشہ ممکن ہے کہ کسی شخص کے قبضہ اقتدار میں سوا مشقت۔ کفایت شعاری۔ دیانت۔ راستبازی اور صداقت کے اور کچھ نہ ہو۔ مگر باوجود اس کے وہ بہترین اخلاقی اور انسانی جوہروں کا سرچشمہ ہو۔ اسکاٹ لینڈ کے مشہور شاعر برنس کو اسکے والد نے کیسی اچھی نصیحت کی تھی کہ تم اپنا کام مرد کی طرح کرو۔ چاہے تمہاری جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو۔ کیونکہ بغیر مردانہ دیانت صداقت اور راست روی کے

آدمی کسی کام کا نہیں ہے"

میرے ذاتی علم کے اندر شرافت صداقت اور راست روی کی اس سے اچھی کوئی مثال نہیں ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو محنت مزدوری کر کے ایک ہفتہ کے اندر ساڑھے سات روپیہ[1] پیدا کرتا تھا مگر اس حقیر آمدنی سے اپنے سارے خاندان کی پرورش کرتا تھا۔ اس شخص نے محض ابتدائی تعلیم پائی تھی مگر باوجود اسکے نہایت صاحب سلیقہ اور عقلمند تھا۔ اس کے مختصر سے کتب خانہ میں انجیل مقدس کے سوا دو اور مصنفین کی کتابیں تھیں جن کے نام سے کم لوگ واقف ہیں۔ اس شخص نے اپنی ساری عمر مشقت کے ساتھ روپیہ کمانے اور خدا پرستی میں گذاری اور جب وہ مر گیا تو عقلمندی نیکی اور بھلائی کی شہرت اپنے بعد چھوڑ گیا۔ اور یہ ایسی باتیں ہیں جس پر اہل ثروت کو رشک کرنا چاہیے۔

باقی آیندہ

مترجم

---

[1] انگلستان میں مزدوروں کی مزدوری کی شرح ہفتہ وار ہے روزانہ نہیں ہے۔ ساڑھے سات روپیہ فی ہفتہ وہاں کے اعتبار سے ایک غریب مزدور کی گاڑھی کمائی ہوئی۔ برخلاف ہمارے ملک کے وہاں کے مزدوروں کے کام کی نگرانی چنداں ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنی مزدوری معقول لیں گے مگر کام بھی پوری محنت اور مشقت کے ساتھ کریں گے۔ نہ وہ کام چور ہیں نہ حیلہ ساز۔ وجہ کیا ہے ماں کی تربیت ! (مترجم)

مذہب اور سائنس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

مقررین

"ہفتہ سائنس" میں سات ماہرین سائنس نے تقریریں کی تھیں جن کے اسماء گرامی کی فہرست پچھلی اشاعت میں پیش کی جا چکی ہے۔ ان کی خدمات بالکل آنریری تھیں یعنی ان بزرگوں میں سے کسی نے ایک حبہ اپنی فیس کے نام سے قبول نہیں فرمایا تھا۔ اور صرف یہی امر اس بات کے سمجھنے کے لئے کافی دلیل ہے کہ یہ خدمات بالکل مخلصانہ تھیں جن کا منشا اظہار صداقت اور اعلائے کلمۃ الحق تھا۔ جس سچے جذبہ شوق کے ساتھ یہ تقریریں کی گئیں وہ مقررین کے شوق خدمت اور ایثار کا بدیہی ثبوت تھا۔ سائنس کے جن شعبہ جات سے بحث کی گئی تھی یہ وہی شعبہ جات تھے جن کا اثر مذہبی عقائد پر پڑ سکتا ہے۔ بہت سے نیم تربیت یافتہ لوگ اس خیال خام میں مبتلا تھے کہ جس چیز کا نام "مذہب" ہے وہ دراصل ایک کمزور دل و دماغ کے آدمی کا مرض ہے جو شخص اپنی خامی کی وجہ سے اس میں مبتلا رہتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں مذہب علم امراض انسانی کا ایک باب ہے۔ علم امراض انسانی کے نامور اور ممتاز نمائندہ نے اس مضمون پر تقریر کی ہے۔ بعض نیم تعلیم یافتہ لوگوں کا خیال تھا کہ علم طبقات الارض نے مذہب کی بیخ کنی کر دی ہے۔ علم طبقات الارض کے ممتاز ماہر کی تقریر اس مبحث پر آپ کے سامنے موجود ہے۔ علم البرق کے تین سربرآوردہ محققین کے افکار اور خیالات آپ کے پیش نظر ہیں۔ علم البرق پر بالخصوص زور

دینے کی یہ وجہ ہوئی کہ زمانۂ حال یعنی جس زمانہ میں ہم آپ دنیا میں موجود ہیں یہ زمانہ محققین کی اصطلاح میں "زمانہ برق" کے نام سے ملقب ہے۔ اور بہت سے بے علم لوگ اس خیال میں محو ہیں کہ اگر برق مظہرِ جلال ربانی تھی تو انسان اُس پر دسترس حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب ہو گیا!

ان معززین میں سے ایک کا مقام پیدائش کمبرلینڈ ہے۔ ایک کا لنکا شائر۔ بتن پارک شائر میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک اسٹفورڈ شائر میں اور ایک انٹرم میں قومیت کے اعتبار سے چھ انگلش مین (انگریز) ہیں۔ اور ایک آئیرش ہیں (آئرلینڈ کا باشندہ) اسی طرح یہ لوگ عیسائیت کے مختلف فرقوں کے باعتبار عقیدت مذہبی تابع ہیں۔ علیٰ ہذا کیا باعتبار عمر اور کیا باعتبار تعلیم۔ مشاغل اور سیاسی خیالات کے ان میں ایک دوسرے سے بہت اختلاف ہے۔ لیکن یہ سب کے سب معلومات سائینس کے اعتبار سے بلند پایہ ماہر اور مبصر سمجھے جاتے ہیں۔

"مذہب اور سائینس۔ آیا یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں غیر جانبدار ہیں یا اتحادی ہیں" مزدوری پیشہ عورت مرد۔ استاد اور شاگرد بالخصوص مدعو کئے گئے تھے کہ اس مناظرہ کو بغور سنیں۔ خود معززین نے۔ خاص کر مسٹر گولڈسٹن ممبر پارلیمنٹ۔ شہر لندن کی مختلف انجمنوں۔ اسکولوں اور عیسائی طبقہ کی مجلسوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ بٹا کر ہفتۂ سائینس کی اجلاس کے اچھی طرح اشاعت کی تھی۔ (باقی آئندہ)

مترجم

قوتِ خیال

(۱)

قوتِ خیال ایک قسم کی ادراکی قوت ہے، جو دماغ میں دل کی لہروں سے موافق پیدا ہوتی ہے اور پھر بتدریج اس سے حرکت اور کام کا ظہور ہوتا ہے، جس وقت خیال کی تھرتھرانے والی لہریں پیدا ہونا شروع ہوتی ہیں تو ہوا کے ذرات جو ہماری جسم کے ارد گرد محیط ہیں تبدیل ہونے لگتے ہیں اور خیال کی لہر کو تمام کرۂ باد میں پھیلا دیتے ہیں، یہ کیفیت طاقتور خیال کی ہے، کمزور خیال ہوا پر بہت کم اثر پیدا کرتے ہیں، ان کی حالت ہوا کے ان خفیف جھونکوں سے مشابہ ہے جو زیادہ سے زیادہ کمزور پتیوں ہی کو ہلا سکتے ہیں، اگر طاقتور خیال وسیع اور لامحدود رقبہ کے ذرات کو ہلا دیتا ہے،

ایک لفظ میں بھی عجیب طاقت ہے، وہ انسان کے دل و دماغ میں ٹھوکر ہزاروں قسم کے جذبات کا باعث ہوتا ہے جو کبھی یاس و امید۔ رنج و راحت کے متضاد محسوسات میں ڈال دیتا ہے، لیکن وہ لفظ بھی کبھی نہ کسی دل و دماغ ہی میں مستور ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی آوازیں دراصل دل و دماغ کی عجیب الاثر قوت خیال کا نتیجہ ہیں۔ **مارکونی** جو "بے تار خبر رسانی" (WIRELESS TELEGRAPHY.) کا موجد ہے کہتا ہے۔

"ایک لفظ کی آواز خواہ وہ لفظ کسی حیثیت کا ہو ہوا میں اسی طرح جنبش پیدا کر دیتی ہے، جس طرح جھیل میں ایک کنکری ڈال دینے

سے لہریں اُٹھنے لگتی ہیں، اور آواز کی یہ لہریں دُور دُور تک پہنچتی
ہیں۔ خواہ فاصلہ کتنا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لہریں جس طرح تار برقی
کے ہر آلہ کو اپنی ہستی محسوس کراتی ہیں اسی طرح ایک آدمی کے
دماغ کے خیال کی لہریں باوجود مخالفت و مزاحمت کے بھی
اُس وقت تک برابر رواں رہتی ہیں جبتک اُن کو کوئی ایسا دل نہ
مل جائے جو خیال والے کے ساتھ ہمدردی اور موافقت رکھتا ہو"

جب انسان اپنے دماغ سے "ملامت یا تعریف" کے خیال کی لہریں جاری کر کے باہر بھیجتا ہے تو وہ زندہ طاقت بنجاتی ہیں اور وہ آواز دوسری لہروں کے ہجوم میں ضائع نہیں ہوتی، بلکہ اُس آدمی تک پہنچ کر رہتی ہے جس کے لئے یہ خیالات دل نے پیدا کئے ہیں یہ خیال خود بخود اُس شخص سے جا کر ٹکراتے ہیں یا اُسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اس امر کو ہر انسان تسلیم کرتا ہے کہ بسا اوقات اُس کا دل خود بخود پست ہو جاتا ہے۔ اُس کے دل میں خود بخود خوف پیدا ہونے لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ناگہانی آفت آنے والی ہے۔ یا اسی طرح بعض دفعہ خود بخود اُس کے دل میں مسرت کے خوشگوار اثرات گدگدی پیدا کرتے ہیں اُس کا غنچۂ دل کنول کی طرح کھل جاتا ہے، یا بعض دفعہ بعض آدمی جب مطالعہ میں ہمہ تن محو ہوتے ہیں۔ یکبارگی اُن کو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ "کوئی شخص" اُن کے پاس آگیا ہے اور اُس نے اُس کو چھو لیا ہے۔ یہ واقعات اس امر کی صریح دلیل ہیں کہ لوگ نہ صرف دوسروں ہی کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اپنے خیالات بھی اسی طرح دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔

انسان نے اس قوت کو مختلف ناموں سے موسوم کر رکھا ہے۔ علم الحیات کے علما اس کو زندگی کہتے ہیں۔ علم طبیعات والے اس کو خیال، کہتے ہیں اور فلسفہ (جس کا نمائندہ ہربرٹ اسپنسر ہے) اس کو لامحدود طاقت بتاتی ہے۔ اس صداقت سے انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ قوت خیال دُنیا میں سب سے زبردست طاقت ہے۔ اور دُنیا کی کُل طاقتوں پر غالب ہے۔ اس وقت تک اس سے زیادہ طاقت کا پتہ نہیں چلا۔ اسی کو قدرت کے عجائبات۔ زندگی کی حرکت۔ اور روح کی طاقت کہتے ہیں، خیال قدرت کا بہت بڑا محیط سامان ہے، جو انسان کے استعمال کے لئے اس مسبّب الاسباب خالق کی فیاضی سے ہر جگہ موجود ہے اور منتظر ہے کہ کوئی اُسے اپنے کام میں لائے۔

دُنیا کے سب کاروبار اور تمام سلطنتوں کے انتظام و قیام کا مدار اسی طاقت پر منحصر ہے۔ یہی چیز ہے۔ جس پر انسان کے محاسن اخلاق اور نسل انسانی کی بہترین زندگی کا انحصار ہے۔ انسان کا سارا عروج۔ کمال، ترقی و تنزل، مدوجزر اسی کے تابع ہے اہل دانش کی گرہ کشائیاں، حکمائے عالم کے کارنامے نازک خیال شعرا کی موشگافیاں۔ فضلا کی تحقیقات۔ اہل یورپ کی ایجادات اسی مبارک نہال کا ثمر ہیں۔ جب کسی قوم کی قوت خیال ایک مناسب انداز میں پیدا ہو کر یکساں ہو جاتی ہے تو وہ اچھی طرح سمجھ لیتی ہے کہ زمین کے اس وسیع بساط پر خدا نے اُسے کیا اقتدار دے کر بھیجا ہے، اس طرح فتوحات زندگی کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔

خیال ہی انسان کے تمام افعال کا متحرک ہے یہ اس کے کاروبار کی

عالیشان عمارت کا صرف معمار ہی نہیں بلکہ یہ وہ مزدور ہے جو لازمی ضروریات سے جسم کی ضروری مرمت کے فرائض انجام دیتا رہتا ہے" انسان جس طرح خیال کرتا ہے ویسا ہی بنجاتا ہے" کیونکہ ہر قسم کے خیالات جو انسان کے دماغ کو متحرک کرتے ہیں۔ وہ اس کے جسم کے رگ و ریشوں کو بھی حرکت دینے سے باز نہیں رہتے۔ اس کی لگاتار حرکت کی وجہ سے گوشت و پوست میں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہر خیال جو سوچا گیا ہے ہمیں پاک یا ناپاک باطن یا سیاہ قلب، قوی یا کمزور، امیر یا غریب، سُکھی یا دُکھی بنا سکتا ہے اور بناتا ہے۔ ماہرین سائینس نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ انسانی دماغ کے مسامات صرف ساٹھ دن کے عرصے میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خیال سے کمزور اور برباد شدہ مادہ کو خارج کرکے اس کی جگہ تندرست اور اچھا سامان پیدا کر دیا جاتا ہے۔ خیال سے ہم صرف اپنی جسمانی ترتیب کی شکل کو سڈول بنا کر اس کو اپنے اختیار ہی میں نہیں رکھ سکتے بلکہ دوسروں کے جسم پر بھی اثر اور تصرف کر سکتے ہیں۔ جو ماں اس راز کو جانتی ہے وہ اپنے خیالات کی اصلاح کرکے خوبصورت۔ ذہین۔ اور تندرست اولاد پیدا کر سکتی ہے۔ وہ اُن پر اپنا ذاتی اثر ڈال کر اُن کے جذبات کو خوبصورتی دے کر حوصلہ مندی اور بہتری کی جانب مائل کرتی ہے۔

ماں بچے میں وہ اوصاف پیدا کرنا چاہتی ہے جو اُس کی نظر میں اچھے ہیں۔ مگر بہت مائیں " قوتِ خیال " کے علم سے ناواقف ہوتی ہیں وہ نہیں جانتے کہ جو طریقہ وہ بچہ کو راہِ راست، پر لانے کے لئے استعمال کر رہی ہیں کسقدر خطرناک

ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ پیچھے میں برائی اور عیب تلاش کرکے بدی کو نابود کرنے کے لئے
لعنت ملامت کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بغیر کھڑکیاں کھولے اور
روشنی لانے کے کمرے میں سے تاریکی دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ دُنیا میں
عظیم ترین ظلم جو کسی پر کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ اُسے اس کی کمزوریوں اور خامیوں کے
لئے لعنت ملامت کی جائے، ایسے اشخاص کو جن میں کمزوریاں ہوں مدد اور ہمت
افزائی کی ضرورت ہے نہ کہ لعنت ملامت کی خیالات سے یا اس عیب سے مخلصی
پانے کے لئے جس کو تم برا سمجھتے ہو بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے سامنے ہمیشہ اعلےٰ
اور برتر حالات کا نمونہ رکھا جائے۔ جوں جوں بہتر اور نیک بننے کی عادت راسخ
ہوگی، برائیاں خود بخود دُور ہوتی جائیں گی، ان کے پودے خوراک کی کمی سے مرجھا
جائیں گے۔ دُنیا میں صرف وہی چیز بڑھ سکتی ہے جس کو خوراک ملتی ہے۔ اور
برائی یا عیب کے تباہ کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُن کی خوراک بند کردی جائے۔

مرزا شہید

زبان کی لڑائی

اردو زبان کی خدمت کا یہی وقت ہے۔ آجکل لوگوں کا رجحان بھی اسطرف
زیادہ پایا جاتا ہے۔ مختلف انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ ہندوستان کو یونیورسٹی
مل رہی ہے۔ مختلف مقامات کے لوگ آمادہ ہیں کہ زبان کو سنواریں سخت سی
سخت کوششیں کرتے ہیں۔ ان کی ہمت پر آفریں ہے۔ اگر ایسے وقت میں ادیب

ادھر خاموش بیٹھے رہے تو ستم ہو جائیگا - اور زبان مٹ جائیگی۔

چند روز ہوئے مجھ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ بہاری لوگ چین سے چلنا بولتے ہیں - کیا یہ محاورہ نہیں ہو سکتا - میں نے کہا نہیں فرمایا اس کی وجہ - جب تمام شہر اسطرح بولتا ہے تو یہ ہٹ دھرمی نہیں ہے کہ ہم اس کو محاورہ نہ کہیں - میں نے کہا بھائی اسی خیال نے ہلوگوں کی زبان کو آج تک ایک ہونے نہ دیا۔

عرب کی زبان اس واسطے مستند ہے کہ وہ لوگ صرف اہل مکہ میں قوم قریش کی زبان کی تقلید کرتے ہیں - اور انہیں کے بنائے ہوئے محاورات کو فصیح جانتے ہیں۔

عجم میں بھی یہی حال ہے - شیراز - طہران - اصفہان کی زبان کو مستند جانتے ہیں اور اسی کی پیروی کرتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ خرابی پہلی ہوئی ہے کہ جب یہاں سنسکرت کا رواج تھا اس وقت بھی لوگوں نے خود سری کی اور زبان کے پایہ تخت کے محاورات کی پیروی نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں دوسری زبان ہوگئی، پنجاب میں دوسری زبان ہوگئی، مدراس میں دوسری زبان ہوگئی، نیپال میں دوسری زبان ہوگئی، کشمیر میں دوسری زبان ہوگئی، کابل میں دوسری زبان ہوگئی - اس طرح تمام ہندوستان کی چھتیس زبانیں بن گئیں - اور مختلف لہجے ہوگئے - ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر رہا - پھر ملک کی آسانی کے واسطے برج بھاکھا بولی پیدا ہوئی - اس کا بھی یہی انجام ہوا کہ مخالفت کا شکار ہوگئی - اب اردو کا یہی حشر ہونا ہے۔

ہندوستان میں ایک زبان کا مروج ہونا بہت مشکل ہے - اسلئے کہ پورب میں پٹنے کے لوگ کہیں گے ہم چین سے چلنا بولیں گے - گیا کے لوگ کہیں گے ہم

اس معنی پر آرام سے ٹہلنا کہیں گے، بنارس کے لوگ کہیں گے ہم راحت سے گھومنا بولیں گے
پنجاب کے لوگوں میں لاہور کے لوگ کہیں گے ہم مسرت سے گھومنا بولیں گے جونپور
کے لوگ کہیں گے ہم خوشی سے پھرنا بولیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا جتنے شہر ہوں گے
اُتنے محاورے اُتنی ہی زبانیں ہوں گی ایک شہر کی گفتگو دوسرے شہر کے لوگ
نہ سمجھیں گے۔ اور ہم جہالت کے دریا میں ڈوب کر اُردو کو بھی مٹا دیں گے اگر زبان
کو برقرار رکھنا ہے اور اسے علمی زبان بنانا ہے تو اس کا ایک مرکز قرار دو۔
فی زمانہ موجودہ حالت میں دو شہر اس لایق نظر آتے ہیں دہلی اور لکھنؤ۔
انہیں دونوں شہروں کے فصحا کی تقلید کرکے اگر ہم زبان کی خدمت کریں گے تو
ہم سب کی ایک زبان اور ایک صرف و نحو اور ایک اصطلاح ہوگی اور ایک دوسرے
کی بولی سمجھ میں آئیگی۔ جس وقت ہماری زبان صرف و نحو سے آراستہ ہوجائیگی
اور اس کے قواعد مرتب ہوجائیں گے اور اس کے محاورے مدون ہوجائیں گے
اُس وقت ہماری زبان علمی بنجائے گی۔

آجکل لوگ اُردو کو تو باقاعدہ حاصل نہیں کرتے اور ایک انجمن قائم
کرکے اُردو کے حقیقی وارث بنجاتے ہیں۔ پھر اسی اُردو میں دو چار
کتابیں ترجمہ کرکے چھپواتے ہیں جن کی زبان دائرہ اُردو سے خارج
ہے۔ ریاستوں سے تحصیل زر کرکے زبان پر احسان کرتے ہیں۔
مجھے یاد ہے ایک پنجابی نے فلسفہ کی ایک کتاب خراب اُردو میں لکھی۔ جب لوگوں
نے اس کی طرف التفات نہ کیا تو اُس نے کہا۔ ہندوستان کے لوگ نام کی پوجا

کرتے ہیں۔ یہی کتاب اگر مولانا شبلی کے نام سے چھپی ہوتی تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی۔ مجھے اس بات پر سخت افسوس ہوا۔ کیونکہ میں نے مولانا شبلی کو تصنیف کے بارے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ تاریخ اسلام کو لکھنے کے بعد وہ کاتب سے صحیح لکھواتے تھے۔ جس محاورے میں شک ہوتا تھا تحقیق کرتے تھے اور اہل لکھنؤ سے پوچھتے تھے۔ اس کے بعد ترمیم کرتے تھے۔ علمی کتابوں کے ترجمے انہوں نے ایسی عام زبان میں کئے ہیں کہ اردو والے مزا اٹھاتے ہیں مگر ان خوبیوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جو زبان کی ماہیت سے واقف ہے۔

ایسے خودسر مصنفوں کے ہاتھوں ملک کا مذاق بگڑتا جاتا ہے اور زبان کے محاورے فنا ہوتے جاتے ہیں ابھی تک موقع ہے کہ اردو علم ادب کے ماہرین انکے مقابلے میں اگر ان کو راہ راست پر لے آئیں۔ ورنہ زبان مٹ جائے گی۔

مجھے گیا کے مشاعرے میں شریک ہو کر یہ بات معلوم ہو گئی کہ پورب کے اطراف میں اچھے اچھے زبان اردو کے محقق سخن فہم موجود ہیں، جو لکھنؤ کے محاورات کے موافق لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں اور جن کے لب ولہجہ میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ اسیطرح ہندوستان کے مستند شعراء اگر زبان کو قواعد اور لغات سے آراستہ کریں اور لغات و محاورات کی تکمیل کریں تو وہ لوگ جو زبان نہیں جانتے ہیں اور زبان کے مالک بنجاتے ہیں اُن کو گریبان میں منھ ڈالنا پڑے گا اور زبان کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔

یہ کام ہے ملک کے ادبی رسائل کا۔ رسالوں میں جہاں اچھے لوگوں کی غزلیں چھپ ہوتی ہیں، نثر کا مضمون ہوتا ہے وہاں محاورات کی تحقیق بھی ہوا

کرے تو لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچے۔

اب زبان کی لڑائی کا وقت آگیا ہے۔ فصحا اپنی خدمت کو وقف کردیں اور جدید مصنفین کی تصنیف پر تنقیدی نظر ڈالا کریں۔ میرے نزدیک گلچین کی اشاعت سے یہ غرض بھی ہونا چاہئے کہ وہ کچھ ادبی خدمت کو بوجوہ احسن انجام دیا کرے اور اس کام کے لئے حضرت ریاض بہت موزوں ہیں ورنہ زبان کی مٹی خراب ہوگی۔ اور ناواقفوں کے دشنۂ قلم اس کو ذبح کرتے چھوڑیں گے۔

ریاستوں کو بھی اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ایسے لوگوں کی مدد کیجائے جو زبان اردو کے ماہر ہوں اور اس کی خدمت کرنے کے قابل ہوں۔

خواجہ محمد عبدالروف عشرت۔ احاطۂ خانساماں لکھنؤ

مشرق اور مغرب

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

مشرق۔ خوئے بد را بہانۂ بسیار۔ یوں تو اگر چاہوں پورے ایک درجن بہانوں کے بنڈل کھول کے ابھی تمہارے سامنے دھر دوں کہ تم بھی پریشان ہوجاؤ۔ مگر مجھے باتیں بنانے سے قطعی نفرت ہے۔ میں بلا عذر آنکھیں بند کرکے ابھی تسلیم کئے لیتا ہوں کہ ہماری کاہلی نے جہاں ہر کام پر اوس ڈال رکھی ہے وہاں وضع اور لباس کے تراش و خراش پر بھی یہی آفت چھائی ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خامی تہذیب اور شائستگی کی منزل میں ہمیں کئی قدم پیچھے ہٹا دینے والی ہے۔ مگر ہر حال میں اس کا اثر تو ہماری ظاہری آرایش اور

زیبایش ہی تک محدود رہتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑہتا۔ اس کا اتنا غم نہیں ہے جتنا اور بڑی بڑی باتوں کا ہے۔ اچھا تو ہمارا نام تو ملزموں کی فہرست میں درج ہو چکا۔ مگر اب آپ کا نمبر آتا ہے۔ اپنی کہئے۔ وضع کی قطع و برید۔ کاٹ چھانٹ۔ تراش وخراش کے معاملہ میں فرانس سارے یورپ کا درزی ہے۔ وہی سب کا رہنما ہے۔ وہ موجد ہے اور تم سب مقلد۔ وہ روز ایک نیا راستہ اپنی ذہانت اور ذکاوت سے ڈہونڈ نکالتا ہے۔ تم لوگ اُس کے پیچھے آنکھیں بند کرکے ہاں میں ہاں ملاتے دوڑے چلے جاتے ہو۔ اپنی عقل پر ذرا بھی زور نہیں دیتے۔

اب سے دو تین تین برس پہلے تمہاری میموں کی وضع کیسی پیاری تھی۔ بڑی ہی خوبصورت اور نظر فریب تھی۔ اُسے تم نے زبردستی فیشن سے خارج کردیا۔ یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ فرانس نے خارج کردیا تھا۔ مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ ایک منٹ کے لئے فرانس کی تقلید کا خیال بالائے طاق رکھکر ذرا آنکھیں کھولو اور انصاف کی عینک لگا کر اپنی میموں کی آجکل کی مروجہ وضع سے اب سے دو ہی تین سال پہلے والی وضع کا مقابلہ کرکے دیکھو تو مجھے یقین کامل ہے کہ تمہاری آنکھیں کھل جائینگی اگر تم مذاق سلیم رکھتے ہو۔ میری رائے میں تمہارا مذاق حسن بالکل ہی خام ہے۔ اس وجہ سے کہ تم بالکل ہی۔ بہدّی۔ کاواک اور جھکول وضع اور ایک حسین اور نظر فریب وضع میں صحیح طور پر امتیاز کرنے سے قاصر ہو۔ ایک اب سے دو ہی تین برس پہلے کی ٹوپیاں تھیں۔ ایک آج کی ہیں۔ ایک آج کے بلاؤز اور سکرٹ ہیں اور ایک اب سے دو چار برس پہلے کے ہیں۔ وضع کا

اصلی مقصد یہ ہے کہ اس وضع کے اختیار کرنے پر ایک سادہ صورت بھی حسین اور دلفریب نظر آنے لگے - یہ بات اس وضع سے حاصل تھی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں - اگر اس حد تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے تو خیر سادہ صورت کی سادگی اس کی اصلی اس کی فطرتی سادگی ہی قائم رہجائے وہاں تک بھی غنیمت ہے - مگر تمہاری آجکل کی وضع تو ایسی ہے کہ حسین سے حسین صورت بھی اس وضع میں ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے تو کاداک اور کجکول نظر آنے لگتی ہے - آنکھیں کھول کے دیکھو کہ تم نے اپنے لباس میں ترقی کی ہے یا تنزل ہوا ہے - اس معاملہ میں تم اور فرانس دونوں حقیقی حسن کے ماہر نہیں ثابت ہو سکتے ہو - صفت کے لطیف فن میں کامیاب امتیاز قایم کرنے میں تمہاری آنکھیں ابھی بہت خام ہیں -

مغرب - یورپ اور ایشیا کے مذاق میں زمین و آسمان کا فرق ہے - تمہارا اور ہمارا مذاق حسن یکساں نہیں ہے - اس کے سوا کوئی دوسری وجہ تمہاری برہمی کی میری سمجھ میں نہیں آسکتی - مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کرسکتا - (باقی آیندہ)

ستم ظریف

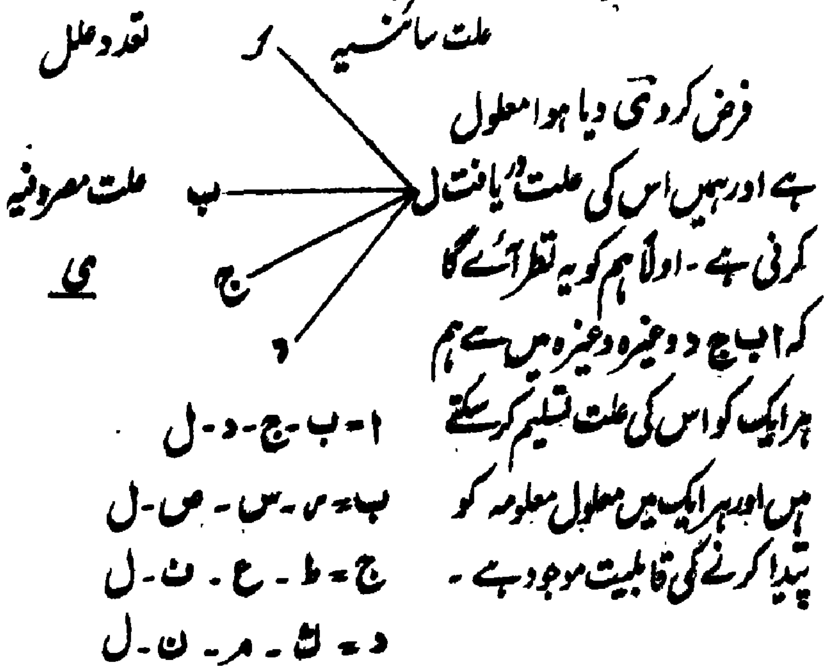
قانون تعلیل

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

غیر مشروط توالی کا عقیدہ صرف تعدد علل ہی کا دشمن نہیں بلکہ وہ مل کے
عقیدۂ تردید علل موثرہ کا بھی منافی ہے۔ ا و ب کے درمیان غیر مشروط تالی کے
وجود کے معنی جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں یہ ہیں کہ تمام شروط سے آزاد ا کی موجودگی
ب کی موجودگی کو لازمی قرار دیتی ہے اور جب یہ تسلیم کر لیا گیا تو علل موثرہ کے وجود
کو مانے بغیر چارہ ہی نہیں۔ علت موثرہ کوئی کوہ قاف کی پری تھوڑی ہی ہے۔
اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس کی موجودگی معلول کی موجودگی کو لازمی کر دیتی ہے
قطع نظر اس کے مل کی تعریف تعلیل میں ایک بات اور غور طلب ہے اور
یہ ہیوم کی تعریف میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی علت و معلول کے درمیان تقدیم و
تاخیر کا ہونا۔ مقدم کا لفظ ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علت و معلول۔ سبب
و مسبب کے درمیان تعلق زمانی موجود ہے۔ لیکن ولٹن کا خیال ہے کہ ان کے
درمیان وقفہ کا وجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس کے واسطے مثالیں بھی پیش کرتا
ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ مقیاس الہوا میں پارہ کے چڑھنے کی وجہ ہوا کا وزن ہے
ولٹن کہتا ہے کہ یہاں علت و معلول کا رشتہ زمانی حیثیت سے بالکل ہمساز ہے۔ یا
مثلاً پانی کا اتصال بھگا دیتا ہے اور آگ کا اتصال جلا دیتا ہے۔ یہاں بھی وہی
پہلی صورت ہے یعنی علت و معلول کا رشتہ زمانی حیثیت سے بالکل ہمساز ہے
اصل یہ ہے کہ علت و معلول کے درمیان وقفہ کے وجود کا خیال اس طرح پیدا

ہوا ہے کہ علت بعیدہ کو معلول بعیدہ سے مربوط کیا گیا ہے جیسا کہ اکثر عوام کے نقطۂ خیال سے ہوتا رہتا ہے۔

ل کے تصور تعلیل پر تنقید کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ تعدد علل اور غیر مشروط توالی کا وجود باہم بالکل متضاد ہے۔ چونکہ تعدد علل تصور تعلیل کا ایک نہایت ہی مہتم بالشان مسئلہ ہے اس لئے ہم یہاں اس کی مزید تشریح کر دینا چاہتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ چند اسباب میں سے ہر ایک سبب جس میں مسبب کے پیدا کرنے کی قابلیت موجود ہے اسے عالم ظہور میں لا سکتا ہے اور یہی تعدد علل ہے لیکن سائنس کا دعویٰ ہے کہ ہر ایک معلول کی صرف ایک ہی علت ہونی چاہئے اور اگر تجزیہ کو کافی وسعت دی جائے تو انجام کار ہر معلول کی صرف ایک ہی علت رہ جائیگی اور یہی اس کی حقیقی اور اصلی علت ہوگی۔ یہ شعائر ذیل کی مدد سے بہ آسانی سمجھ میں آجائیگا۔



فرض کرو کہ دیا ہوا معلول ہے اور ہمیں اس کی علت دریافت کرنی ہے۔ اولاً ہم کو یہ نظر آئے گا کہ ا ب ج د وغیرہ وغیرہ میں سے ہم ہر ایک کو اس کی علت تسلیم کرسکتے ہیں اور ہر ایک میں معلول معلومہ کو پیدا کرنے کی قابلیت موجود ہے۔

یہ تعدد علل کا مسئلہ ہوگیا۔ لیکن ہم تجزیہ کو یہیں نہیں ختم کر دیتے۔ بلکہ اس کو اور وسعت دیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام موجودہ مثالوں میں ایک مثال "ل" ایسی ہے جو شروع سے آخر تک سب میں موجود ہے۔ بس یہی مثال "ل" معلول معلومہ یعنی "ی" کی سائنٹفک علت ہے اور اسی کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تک علت کا وجود ہے معلول کا بھی وجود ہے اور جب یہ نہیں تو وہ بھی نہیں۔

بعینہ یہی حالت معلول کی بھی ہے۔ جس طرح ناکمل تجزیہ کے باعث ہم تعدد علل کو صحیح جانتے ہیں اسی طرح غیر کمل تجزیہ کے باعث ہم تعدد معلول کو بھی درست مانتے ہیں۔ لیکن سائینس کا دعویٰ یہاں بھی وہی ہے۔ یعنی ہر ایک علت کا ایک ہی معلول ہے اور یہ بھی اسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ اول الذکر۔

(باقی آیندہ)

صدیقی

ہمارا محکمۂ احتساب

بعض وقت بعض ایسی بات سامنے آ جاتی ہے کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ دنیا میں سب کی بھلائی چاہنا اور کسی کی برائی نہ چاہنا بڑی نیکی نیک نہادی اور شرافت کی نشانی ہے۔ اور جو بزرگ ایسے صفات سے متصف ہو وہ ضرور دنیا سے خراج تحسین وصول ہی کر کے چھوڑتا ہے مگر دنیا میں برائی کی طرح بھلائی اور نیکی کے لئے بھی حدود مقرر ہیں۔ اور مقررہ

حدود سے تجاوز کر جانے کا انجام ہمیشہ تباہ کن ہوتا ہے ۔ چاہے اس بدنتیجہ کا ظہور فوراً ہو جائے اور چاہے کافی مدت کے بعد ہو ۔ میں نے عرض کیا ہے کہ بھلائی کے بھی حدود معین ہیں ۔ اور ہمیں اپنی حد پہچان کر کام کرنا چاہیئے ۔ مثلاً سب کی بھلائی چاہنا اور کسی کی برائی نہ چاہنا ایک بات ہے اور اسی خیال کو وسعت دیکر حدود جائز سے باہر نکل جانا اور کسی نااہل کے مفروضہ کمال کی تعریف میں دنیا کے سامنے رطب اللسان ہونا بالکل ہی شے دیگر ہے " پیام امید" کسی پچھلی اشاعت میں کہہ چکا ہے کہ ہمارے اخبار اور رسالوں کے ایڈیٹروں کی ایسی شرافت اور کریم النفسی جو ہر لغو اور لچر کتاب پر ایک " اچھے سے ریویو" کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اس کی کتنی سخت قیمت قوم اور ملک کو ادا کرنا پڑتی ہے! انجام یہ ہوتا ہے کہ بے مغز بکواس سے صفحے سیاہ کرکے میدان میں آجانے والے تو کامیاب ہوتے ہیں مگر اہل دماغ جن کی دماغ سوزیاں ہر طرح انعام کے مستحق ہوتے ہیں بجائے اس کے کہ ان کا دل بڑھایا جاتا اور الٹی ان کی دلشکنی ہوتی ہے ۔ قوم کو لچر اور مخرب اخلاق لٹریچر کی عادت پڑتی ہے ۔ اور اچھی اچھی کتابوں کے مطالعہ سے جی چرانا اس کا شیوہ ہو جاتا ہے ۔ اس وجہ سے کہ ان کے پڑھنے میں بھی کچھ نہ کچھ دماغ صرف کرنا ہی پڑتا ہے ۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جسطرح کسی قابل قدر تصنیف یا تالیف کی قدر نہ کرنا نہ صرف اس کے مؤلف یا مصنف کی دلشکنی کا باعث ہوتا ہے بلکہ قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کے معنی رکھتا ہے اسی طرح ایک نااہل کی بکواس کی بیجا تعریف کر دینا نہ صرف صداقت اور انصاف کا خون ہی کرتا ہے بلکہ اسی طرح قومی ترقی کی راہ میں روڑے

اٹکانا۔ عوام الناس میں نیک وبد کی تمیز نہیں ہے۔ اُن کا معیار کیا ہے؟ یہی
اور صرف یہی کہ جو لوگ پڑھے لکھے اور صائب الرائے مانے گئے ہیں اُن کی
رائے فلاں تصنیف یا تالیف کی نسبت کیا ہے؟ اگر ان حضرات کی رائے اچھی
ہے تو کتاب بھی ضرور اچھی ہے۔ اگر بُری ہے تو کتاب ایک بار نہیں لاکھ بار
بُری ہے۔ چلئے قصہ ختم ہوگیا۔ جب حال یہ ہے کہ ہمارے اخبار اور رسالے
ٹکے سیر بکنے والے لچر قصوں کے لئے جو ناول کے نام سے گلی کوچوں میں وبا کی
طرح پھیلے ہوئے ہیں "ایک اچھا سا ریویو" لکھ دینے پر ہر وقت تیار بیٹھے رہتے
ہیں۔ اور جس طرح اور جیسے الفاظ میں ان "ناولوں" پر اظہار خیال فرماتے ہیں
قریب قریب انہیں الفاظ میں اعلیٰ درجہ کی تصنیفات اور تالیفات پر بھی "ریویو"
لکھتے ہیں تو آپ ہی فرمائیے کہ ہمارے عوام الناس کا کیا قصور ہے! وہ کیا کریں
کدھر ڈھلیں۔ کس سمت رُخ کرکے چلیں! یہی شرافت۔ یہی کریم النفسی اور یہی
نیکی قحط الرجال کی بانی ثابت ہو رہی ہے۔ اسی نے ٹھیکہ لے لیا ہے کہ ہمیشہ
آنکھیں بند کرکے بُرے کو بھی اچھا کہے جائے گی اور اچھے کو بھی قریب قریب
انہیں الفاظ میں اچھا کہے گی۔ اگر اسی کے اس طرز عمل سے اچھوں کے گلے
کٹ جائیں اور بُرے کامیاب ہو جائیں تو اُسے خس برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔
وجہ کیا ہے؟ اس کریم النفسی کی بھی تو داد مل رہی ہے۔ اچھے اور بُرے سے
میرا مقصد یہاں تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھے اور بُرے سے ہے۔ اس
سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کیا ہماری اخلاقی کمزوری کی اس سے بڑی اور کوئی دلیل
ہو سکتی ہے؟

اچھی اچھی کتابوں کی اشاعت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے ۔ بُری ۔ لغو اور لچر
کتابیں اچھی کتابوں کی قدرتی جگہ لیتی جارہی ہیں مگر ہم اپنی جگہ پر فراغت اور اطمینان
سے خوش خوش بیٹھے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہماری زبان ترقی کررہی ہے ! اگر آپکو
اس بات کا یقین نہ آئے تو کسی بڑے شہر کے چوک میں کسی بڑے کتب فروش
کی دوکان جاکے ملاحظہ فرمایئے اور ذرا گذشتہ چھ ماہ کا حساب کتابوں کی آمد اور
جانچ تو جا ئے ۔ دیکھئے فوراً آپ کے آنکھیں کھُل جائیں گی ۔ اگر آپ
اس سادہ مشورہ پر عمل کریں گے تو آپ کو پہلے بار معلوم ہوگا کہ اچھی اچھی کتابوں کی
مانگ قریب قریب یک قلم موقوف ہے ۔ اُن کا پڑھنے والا ہی نہیں ملتا ! اگر بھولا
بھٹکا کوئی آبھی جاتا ہے اور حسنِ اتفاق سے وہ آپ ہی کے سامنے آجاتا ہے
تو ذرا سُنئے کتب فروش سے اور اس سے کیا کیا باتیں ہوتی ہیں ۔ نمونہ کے
طور پر ایک نقل حاضر کرتا ہوں ۔ یہ اگرہ کا ذکر ہے ۔ تھوڑے ہی دن کی بات
ہے ۔ ابھی پورا سال بھی نہیں گذرا ہے ۔ ایک خریدار صاحب ایک کتب فروش
کی دوکان پر وارد ہوتے ہیں اور بہت سی کتابیں الٹ پلٹ کر کتب فروش سے
یوں مخاطب ہوتے ہیں ۔

خریدار ۔ کوئی علمی مذاق کی کتاب دکھاؤ (کتب فروش چند کتابیں پیش
کرتا ہے)

خریدار ۔ (ایک کتاب اٹھاکر) اس کی کیا قیمت لوگے ۔

کتب فروش ۔ ایک روپیہ

خریدار ۔ ایک روپیہ ! آخر وجہ !

کتب فروش - علمی مذاق کی کتاب ہے۔

خریدار - جی ہاں۔ شامت اعمال سے میں نے علمی مذاق کا نام لیا تھا یہ اسکی سزا ہے! بھلا تم ہی دیکھو کے جزو کی کتاب ہے۔

کتب فروش - جزو کے حساب سے تو صرف ناول بکتے ہیں۔

خریدار - تو کیا ناول میں کاغذ اور روشنائی صرف ہوتا ہے اور اس میں سونے کا پتر اور سونے کا پانی صرف کیا جاتا ہے؟

کتب فروش - جی نہیں۔ مگر......مگر......مگر۔ جو کتابیں سستی خریدتا ہوں وہ سستی بیچتا ہوں۔ جو گراں خریدتا ہوں انہیں گراں قیمت پر مجبوراً بیچنا پڑتا ہے۔

خریدار - مگر آپ بعض بڑے ہی پُر لطف اور دلچسپ ناول کوڑیوں کے مول بیچ رہے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے۔ مثال کے طور پر اس ناول کو دیکھئے (بنگالی مینا نامی ناول اٹھا کر) واہ وا! کیسا پیارا۔ کیسا دلکش۔ کیا ہی دلفریب ناول ہے۔ حسن و عشق کا مرقع ہے۔ پہلا صفحہ پڑھ کر بغیر ختم کئے ہوئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ (اب تو ضبط مشکل تھا مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بولا)

میں - گستاخی معاف اب تو بے بولے رہا نہیں جاتا۔ کہاں ڈاکٹر اقبال کا "علم الاقتصاد" اور کہاں "بنگالی مینا" قدر دانیٔ عالم بالا معلوم شد! کہاں بصرہ کا گلاب اور کہاں سنڈاس کی عفونت!

خریدار - گلاب اور عفونت! (کتب فروش سے) اور آپ کی تعریف؟ (کتب فروش نے بتا دیا کہ میں کون ہوں)

خریدار (مجھ سے) جی بجا ارشاد ہوا۔ مگر "پیامِ امید" کے وہ نمبر بھی آپ کو یاد ہیں جن میں ڈاکٹر اقبال کے کلام کی کس بیرحمی سے نکتہ چینی کی گئی تھی! یہ آج کیا بات ہے کہ ڈاکٹر اقبال یوں آسمان پر چڑھائے جا رہے ہیں؟

میں - بندہ پرور وہ اور بات تھی۔ مگر "علم الاقتصاد" تو موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔ مجھے ڈاکٹر اقبال سے عداوت نہیں .... مگر آپ کو "پیامِ امید" کا وہ نمبر بھی یاد ہے جس کے ذریعہ سے صاحب مجسٹریٹ ضلع کو "بنگالی مینا" کے ضبط کر کے تلف کر دینے پر توجہ دلائی گئی تھی!۔

خلاصہ یہ کہ خریدار صاحب فرار ہو گئے۔ اگر "بنگالی مینا" کی طرح کتاب "علم الاقتصاد" بھی ٹکے سیر بکتی تو البتہ فی ہزار دس خریدار مل سکتے تھے۔ موجودہ حالت میں فی دس ہزار دو خریدار سے زیادہ نہیں مل سکتے۔ اردو خواں پبلک کا مذاق بُری طرح بگڑ گیا ہے۔ اور اس بدمذاقی کی ذمہ دار محض ہمارے قابل اور صلح کل ایڈیٹر صاحبان کی کریم النفسی اور نیک نہادی ہے۔ ایک سخت مستحکم اور کاری ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔ اخلاقی جرات اور استقلال کا کام ہے۔ مگر ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ ہماری متحدہ قوت صرف ہونے کی احتیاج ہے مگر ہمیں اسکا انتظار نہیں ہے کہ اس "بدنامی" کا بار سب سے پہلے کوئی اور ہی اُٹھائے۔ ہمارا کام قومی خدمت کرنا ہے۔ جو کام قوم کے لئے ازبس نافع ہے ہم اس کے کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔ اگر ہماری اردو خواں پبلک کا نافہم حصہ ہمیں بُرا کہنا چاہتا ہو تو کہے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہ کرنا چاہئے۔ آئندہ نمبروں سے اب ہم

باقاعدہ تنقید شروع کریں گے اور سب سے پہلے ایسی کتابیں اٹھائیں گے جو بلاوجہ اور بے سبب اچھی سمجھی جاتی ہیں۔ مگر جن کے بکنے سے یا تو

(۱) اردو خواں پبلک کا اخلاق بگڑتا ہے یا

(۲) اس کا مذاق خراب ہوتا ہے یا

(۳) زبان پر برا اثر پڑتا ہے اور ان وجوہ سے ان کتابوں کی اشاعت اچھی کتابوں کی اشاعت کی راہ میں حائل ہو رہی ہے ہمیں امید ہے کہ ان کتابوں کے مؤلف اور مصنف یا اہل مطابع جو ان کتابوں کی اشاعت سے مالی منفعت اٹھا رہے ہیں وہ ہماری نیک نیتی کو کافی ضمانت سمجھ کر ہمیں معذور رکھیں گے اور معاف فرمائیں گے۔

ہمارے ملک میں بری کتابوں کی اشاعت کے روک تھام کے لئے ایک محکمہ احتساب قائم ہونے کی شدید ضرورت ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کوئی سرکاری محکمہ ہو۔ سارے کاموں کا بار گورنمنٹ کے سر پر لاد دینے کی ضرورت نہیں ہے گورنمنٹ کے پاس خود ہی کام کی اتنی زیادتی ہے کہ اسے اپنے ہی کاموں کے لئے بمشکل تمام کافی وقت مل سکتا ہے۔ یہ کام ہمارا اپنا ہے اور ہم ہی کو کرنا چاہئے مگر ہم پھر کہیں گے کہ یہ کام جب ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کی اہمیت پر نظر کر کے تمام اردو اخبارات اور رسالے اپنی متحدہ قوت صرف کریں۔ ہمارے معزز ہمعصروں میں کوئی صاحب اگر آمادگی ظاہر کریں گے تو چشم ما روشن دل ما شاد اگر وہ اس کوچۂ ملامت میں قدم رکھنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے ہیں تو ہم اپنا حصہ شروع کر دیں گے اور منتظر رہیں گے کہ اور ہمعصر بھی آگے چل کر ہمارے ہمنوا ہو جائیں۔

ایسی تنقیدات کے لکھنے میں ہم ایمان اور انصاف کی شاہ راہ پر چلیں گے۔ جو تصنیف یا تالیف جتنی تعریف کی ایماناً مستحق ہوگی اتنی ہی اُس کی تعریف کریں گے اور برعکس اس کے جو جتنی نکتہ چینی کے قابل ہے اتنی ہی اُس کی نکتہ چینی بھی کریں گے۔ نہ ہمیں کسی کے ساتھ کوئی رعایت کرنا منظور ہے اور نہ کسی کے ساتھ عداوت یا پرخاش رکھنا۔ ہم مشکور ہوں گے اگر ہمارے معزز ہمعصر ہمیں متنبہ کریں گے اگر کبھی کسی حال میں ہم جادۂ اعتدال سے متجاوز ہوتے نظر آئیں۔

ادبی نقاد

حضرت شیون مرحوم کی یاد

آزاد صاحب کے والد مرحوم جناب مولوی حافظ محمد جعفر علی صاحب شیون کاکوروی عربی فارسی کے زبردست عالم۔ فن موسیقی کے ماہر۔ خوش الحان اور شاعر تھے۔ آپ ۱۸۵۳ء میں بمقام قنوج ضلع فرخ آباد جہاں کہ اُن کے پدر بزرگوار جناب مولوی محمد باقر علی صاحب مرحوم منصف تھے پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۰۸ء میں بعارضہ طاعون بمقام کاکوری ضلع لکھنؤ فوت ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں سے "سہ سلک" بالخصوص قابل ذکر ہے جس کے تین سلک یا تین باب تھے۔ ایک باب بالکل منقوط تھا۔ یعنی ہر ہر لفظ جو استعمال کیا گیا تھا اُس کا ہر ہر حرف منقوط یعنی نقطہ دار تھا۔ بے نقطہ حرف استعمال نہیں کیا گیا تھا دوسری سلک میں اسیطرح ہر حرف غیر منقوط یعنے بے نقطہ استعمال کیا گیا تھا۔ تیسری سلک میں ایک لفظ منقوط اور ایک غیر منقوط تھا۔ ناظرین کرام کے

پاس خاطر سے چند غیر منقوط اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

داد گرا داورا سرور ہر دو سرا ۔ سرور لولاک را مورد احکام را

سالک مسلوک را ۔ مالک مملوک را ۔ مورد اکرام را ۔ مصدر الہام را

حامل ہر حلم را ۔ ناطل ہر عدل را ۔ محکم احکام را ۔ حاکم حکام را

واہ کہ سالہا ۔ ما سرور سر دار ما ۔ در گہہ اسلام کرد ۔ وا گہہ رام را

آخری شعر بتاتا ہے کہ اس کا اشارہ رامپور کی جانب ہے ۔ عہد نواب کلب علیخاں بہادر مرحوم بالقابہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی ۔ مصنف صاحب خود اس کتاب کو نواب صاحب کی حضوری میں پیش کرنے کی غرض سے لیگئے تھے ۔ دربار رامپور سے بطور انعام پنشن بھی مقرر ہوئی تھی جو عالم حیات نواب صاحب ممدوح میں وصول ہوتی رہی ۔ نواب صاحب کے بعد کاؤنسل ریجنسی قائم ہوئی ۔ پھر نہ کسی نے پنشن برقرار رکھے جانے کے لئے کوشش کی اور نہ پنشن ہی بحال رہی ۔ اس کتاب کے لکھنے سے مصنف صاحب کے دماغ پر ایسا خلاف معمول زور پڑا کہ اُن کے حواس بجا نہ رہ سکے اور رامپور سے واپس آتے ہی جنون کی شکایت پیدا ہو گئی جو افسوس کہ مرتے دم تک قایم رہی "مسلک سالک" کی تصنیف سے تین سال قبل آپ نے ایک نظم لکھی تھی ۔ خدا جانے وہ کیسا وقت تھا کہ جو جو باتیں آپ لکھ گئے تھے اُن میں سے ایک ایک پوری ہو کے رہی ۔ گویا عالم جنون سے تین برس پہلے اپنے ہی قلم سے اپنے آیندہ پر حسرت انجام کا خاکہ کھینچ گئے تھے ۔ نظم ملاحظہ ہو ۔

من ازیں باغ چگویم بچہ عنواں رفتم ۔ ہمچو سرو آمدہ بودم چو چراغاں رفتم

آمدم چوں گل نو رستہ بہ بستانِ حدوث — خشک و پرخار تر از شاخِ مغیلاں رفتم
آمدم چوں سحرِ عیش دریں دارِ الم — تیرہ و تار تر از شامِ غریباں رفتم
آمدم ہمچو نسیمے بہ شبیہم گلہا — ہمچو صرصر خس و خاشاک بداماں رفتم
آمدم من بسرِ وصل چو ناوک لیکن — زار و خمیازہ بہم آغوشِ کماں ساں رفتم
آمدم در چمنے من بہ ہوائے گلگشت — گلے ناچیدہ بکف بادلِ پژماں رفتم
سبز پوش آمدہ بودم چو بہاراں افسوس — ہمچو ایامِ خزاں با تنِ عریاں رفتم
بودہ ام گلبنِ گلزارِ تمنا لیکن، — بے گل و برگ پسِ بادِ زمستاں رفتم
آمدم پاک ز ہر عیب و خراماں چو غزال — ہمچو اشتر تنِ پر خار و گریزاں رفتم
خلد ہمیں محبت شگفا ندم صد حیف — ہمچو بادِ سحری آہ فروشاں رفتم
نقدِ جاں برکفِ تسلیم و الما بر دوش — تا بما تمکدۂ عشق بدینساں رفتم

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

آپ اعلیٰ پایہ کے خوشنویس اور دستکار بھی تھے۔ چنانچہ سارا قلمی نسخہ جو نایاب زنگار رنگ کے بیل بوٹوں سے مزین تھا خود اپنے ہی ہاتھ سے لکھ کر رامپور لے گئے تھے اور یہ نسخہ نواب صاحب ممدوح نے آپ سے لیکر داخل کتب خانہ ریاست کر دیا تھا۔ کیا عجب ہے کہ اب بھی وہاں موجود ہو۔

آپ حافظ قرآن بھی تھے۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ماہ رمضان المبارک میں آپ محلہ کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس موقعہ پر اتفاق وقت سے بعض بزرگوں نے افسوس ظاہر کیا کہ ہمارے محلہ میں کوئی حافظ قرآن نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی عمر پینتیس برس کی تھی۔ آپ نے

جواب دیا کہ اگر اللہ پاک کو منظور ہے تو انشاء اللہ آیندہ سال میں تراویح میں نماز جماعت کی امامت کروں گا۔ چنانچہ چھ مہینے کے عرصہ میں سارا کلام اللہ حفظ کر ڈالا۔ اور آیندہ سال تراویح کے موقع پر اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آپ معمولاً نماز فجر کے بعد تلاوت کلام شریف کیا کرتے تھے۔ باآواز بلند لحن کے ساتھ بھیرویں کی دھن میں کلام پاک پڑھا کرتے تھے۔ کوٹھے پر آپ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ نیچے پشت کی جانب راستہ تھا۔ جب تک آپ مصروف تلاوت رہتے تھے بلا مبالغہ راستہ بند ہو جایا کرتا تھا۔ اچھا برا جوان بوڑھا عالم جاہل عورت مرد جو کوئی ادھر سے گذرتا تھا محو حیرت ہو کر نقش بدیوار بن جاتا تھا اور ادب اور سکوت کے ساتھ کھڑا سنتا رہتا تھا۔

آپ کے جنون کے متعلق اکثر بزرگوں کا خیال تھا کہ جنون نہیں ہے رجعت ہے۔ جنون کا آغاز یوں ہوا کہ ایک دن حسب معمول آپ نماز فجر میں مصروف ہوئے۔ نماز ختم کی۔ سلام پھیرنے کا وقت آیا۔ مگر سلام پھیرنے کے بدلے تین شبانہ روز اسی طرح اسی حال میں وہیں کے وہیں بیٹھے رہ گئے۔ نہ جگہ سے جنبش کی نہ کچھ بولے۔ تیسرے دن "محمد یا اللہ" کی ضرب لگانا شروع کی اور دو تین روز تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد "سبحانی ما اعظم شانی" کی ضرب لگانا شروع کی اور کم و بیش ایک ہفتہ بالکل بے آب و دانہ رہے۔ اس واقعہ سے کچھ عرصہ پہلے آپ نے قصیدہ غوثیہ پڑھنا شروع کیا تھا اور نماز فجر کے بعد عمل کے طور پر باقاعدہ پڑھا کرتے تھے۔ دوا اور دعا سے غفلت نہیں کی گئی۔ مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

دیوان شیون اور اسی کے ساتھ اور متفرق کلام خاص آپ ہی کے قلم کا لکھا ہوا کلیات شیون کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں جمع تھا۔ مگر

افسوس کہ جنون کی حالت میں آپ نے اُسے پھونک ڈالا - اور ساری عمر کی محنت خاک میں ملادی - پھر بھی آپ کا متفرق کلام آپ کے چھوٹے بھائی جناب منشی محمد عسکر علی صاحب مرحوم وکیل و آنریری مجسٹریٹ ضلع بستی کے پاس محفوظ تھا - ان کے انتقال پر یہ دولت میرے قبضہ میں آئی ہے -

آزاد صاحب نے کسی زمانہ میں ایک قصیدہ لکھا تھا - اس قصیدے میں سے تعلی کے صرف تین شعر میرے ہاتھ لگے ہیں - باقی قصیدہ گاؤ خورد ہوگیا - چونکہ یہ اشعار بھی حضرت شیون مرحوم ہی کی جانب اشارہ کرتے ہیں لہذا اس موقع پر انہیں نقل کردینا بیموقعہ نہیں سمجھتی ہوں -

زشیونؔ ایں عنانِ سلطنت را دستیار آید | منم آزادؔ نے کز ذاتِ خود ملکِ سخن دارم
سوادِ نقطہ ام بر فرقِ کیواں مشکبار آید | سرِ یرِ خامہ ام را بادِ صرصر گر برد بالا
درونِ جدولم مریخ ہم اندر حصار آید | برد در برجِ عقرب ماہ را ہر دورِ نون من

مگر بقول آزادؔ کے " وہ تو جہالت کا زمانہ تھا" اب اس کا کیا ذکر" اب تو نہ وہ شاعر بنتے ہیں اور نہ تعلی کا نام جانتے ہیں -

حضرت شیونؔ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام جو میرے "خزانہ" میں موجود ہے وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین کرام ہوتا رہیگا -

آزاد بیگم



گردش زمانہ

تیسرا باب

جس شجر پہ تراجی چاہے نشیمن کرلے ۔ پھٹ پڑیگی نہ ترے بوجھ سے ڈالی بلبل

بیخبری اور بیہوشی کی مدت کا تو اندازہ نہیں کرسکتا۔ مگر یکایک ایک جھنجھناہٹ کی آواز کے ساتھ میں چونک پڑا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک آدمی جو شکل وصورت سے خدمتگار معلوم ہوتا ہے۔ کچھ کھانے پینے کا سامان لئے ہوئے کھڑا ہے۔ میں نے بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا کہ پرمیشور کے لئے میری جان بچاؤ عمر بھر تمہارا احسان مانونگا اُس شخص نے مطلق جواب نہیں دیا۔ بت سا بنا کھڑا رہا۔ کھانے کی تھالی اور ایک گلاس پانی سے بھرا ہوا میرے سامنے رکھدیا اور تھوڑی دُور ہٹ کر خاموشی کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ میں نے جب سمجھ لیا کہ وہ میرے سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتا ناچار خاموش ہوکر کچھ تھوڑا سا کھالیا۔ جب میں کھا چکا تو وہ آدمی تھالی وغیرہ لیکر واپس چلا گیا اور دروازے کو بدستور بند کرتا گیا۔

روشندان میری گھڑی تھی جس سے وقت کا اندازہ کرتا تھا۔ جب روشندان سے روشنی آنی بند ہوئی اور اس مکان میں تیرگی چھاگئی میں نے سمجھ لیا کہ رات ہوگئی۔ میری یہ حالت تھی کہ خوف سے دل کانپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور دل میں اپنی رہائی کی دعائیں مانگ رہا

تھا۔ کچھ عرصے تک اسی حالت میں رہا کہ پھر دروازہ کھٹکا۔ میں چونک پڑا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

جو آدمی دن کو کھانا لایا تھا وہی کھانا لئے ہوئے میرے سامنے موجود تھا میں نے پھر اپنی رہائی کے متعلق التجا کی۔ لیکن اوسنے کچھ توجہ نہ کی۔ مجبور ہو کر میں چپ ہوگیا اور کھانا جسقدر مجھ سے کھایا گیا کھالیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آدمی حسب دستور برتن لیکر دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ رات بڑھنے لگی۔ اندھیری نے کوٹھری میں دخل کرلیا۔ باہر سے زیادہ میری کوٹھری تاریک تھی۔ اپنے دل میں خیال کرتا تھا کہ نہ معلوم کتنے دن تک اس کال کوٹھری میں رہونگا۔ کبھی رہائی بھی ہوگی۔ یا اسی میں تڑپ تڑپ کر جان دینی ہوگی؟ میں نے کیا خطا کی ہے جس کے عوض مجھ سے یہ بدسلوکی ہورہی ہے۔ آہ و زاری میں رات تمام ہوئی۔

جوں ہی روشندان سے روشنی آئی معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی۔ اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر نکل بھاگنے کا راستہ ڈھونڈھنے لگا۔ رہائی کے خیال کے سوا اور مجھکو کچھ کام نہ تھا۔ آخر کار بڑی فکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ایسے مکانوں میں اکثر پوشیدہ راستے ہوتے ہیں۔ شاید میری خوش قسمتی سے اس میں بھی کوئی راستہ ہو بہت تلاش کی لیکن اس قسم کا کوئی راستہ نہ ملا۔ ناچار دیواروں کو غور کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ پچھم کی دیوار پر نگاہ پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کچھ لکھا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے لکھکر کاٹ دیا ہے بڑے غور کے بعد میں نے پڑھا کہ "شششی ولا" لکھا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے لکھکر کاٹ دیا ہے عورت کا نام کس نے لکھا۔ شاید یہی جگہ قتل گاہ کا کام دیتی ہے اور یہ لوگ جس کو قتل کرتے ہیں اُس کا

نام لکھدیتے ہیں - غالبًا "شمشی دلا" نامی کوئی عورت یہاں قتل کی گئی ہے - یہ بھی ممکن ہے کہ اسی مرنے والی عورت نے اوروں کے آگاہ کرنے کے واسطے اپنا نام دیوار پر لکھدیا - ضرور ہے کہ یہ عورت باعصمت ہو گی - اس وجہ سے ان بدمعاشوں نے قید کیا اور پھر قتل کر ڈالا - میں اپنی اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ یکایک بڑے زور سے دروازہ کھُلا اور جو شخص ہر روز میرے واسطے کھانا لاتا تھا آج خلاف دستور وہ کھانا نہیں لایا بلکہ ایک نہایت حسین خوشرو لڑکا بڑی سُتھری اور نفیس پوشاک پہنے ہوئے کھانے کی تھالی لیکر آیا - اُس کے دلفریب حُسن نے مجکو ہمہ تن محو دیدار بنا دیا - حُسن یوسف کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی جو کانوں سے سُنا کرتا تھا وہ آنکھوں نے دکھا دیا - لڑکا بہت کم سن تیرہ چودہ برس کا ہوگا - مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی ناپاک جگہ میں یہ مہ جبین لڑکا کہاں سے آیا - شاید یہی میری رہائی کا سبب ہو - میں نے نہایت خوشامد سے کہا "بھائی جان تم کون ہو؟ میری حالت پر رحم کرو اور مجھے بچاؤ - کیونکہ گرفتاران رنج والم کی امداد باعث ثواب ہے - میں عمر بھر تمہارا بندۂ احسان رہوں گا تازیست احسان نہ بھولوں گا - لڑکے نے خاموش رہنے کے لئے اشارہ کیا - اسی وقت باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی - ایک آدمی اندر آیا - یہ وہی دیو سیرت آدمی تھا جس کے اور میرے باپ کے درمیان لین دین کی گفتگو ہوئی تھی - اُس کو دیکھتے ہی ہوش بجانہ رہے - موت کا یقین ہو گیا -

آنے والا شخص نہایت ترشروئی سے میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا" تو ان کے سامنے کیا باتیں بنا رہا ہے (لڑکے سے مخاطب ہو کر) آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ (باقی آئندہ)

عبید الحق

انجیر کا پڈنگ یا حلوہ

پڈنگ بنانے والے ظرف میں پہلے ایک باریک تہہ جمے ہوئے مکھن کی لگا دیجئے۔ اس کے بعد ایک علیحدہ ظرف میں پاؤ بھر نان پاؤ (ڈبل روٹی) کے ریزے۔ آدھ پاؤ جمی ہوئی چربی (یا اس کی جگہ پر گھی)۔ آدھ پاؤ شکر (چینی) آدھ پاؤ۔ خشک انجیر کے ٹکڑے۔ دو انڈے۔ پاؤ بھر دودھ۔

ان سب اجزاء کو ملا کر تین گھنٹہ تک دھیمی آنچ میں پکنے دیجئے۔ اب حلوہ تیار ہے۔ نوش جان فرمائیے۔

ایڈیٹر



تنقید

کتاب "رہنمائے کشمیر" مؤلفہ مکرمی جناب محمد الدین صاحب فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور "پیام امید" کی تقطیع پر۔ کاغذ سفید لکھائی چھپائی بدرجہ اوسط اور خوشخط حجم ۲۵۲ صفحہ قیمت ۱۲ ار۔ ملنے کا پتہ :۔ ایڈیٹر صاحب اخبار کشمیری لاہور۔

ہمیں اوّل سے آخر تک کتاب کے مطالعہ کا موقعہ نہ مل سکا۔ مگر مختلف مقامات کی سرسری سیر البتہ کرلی ہے۔ ہماری رائے میں مؤلف صاحب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے معلومات فراہم کی ہیں۔ عازمان کشمیر کے لئے یہ کتاب ازبس مفید اور کارآمد ہوسکتی ہے۔ کشمیر جانے کے لئے کئی راہیں ہیں۔

ہر ہر راستہ کا پورا پورا حال راستہ کی حالت سواری کا انتظام بود و باش اور قیام کے متعلق ضروری معلومات۔ کہاں کہاں کس کس سواری کے ذریعہ سے جانا ہوگا اور ہر سواری کا کتنا کرایہ دینا پڑے گا۔

پارسل اور اسباب کی روانگی۔ ڈاک خانوں تار گھر شفا خانوں اور ڈاک بنگلوں کی تفصیل اور ضروری حالات۔ کشمیر کے موسم۔ وہاں کی آب و ہوا۔ قحط سیلاب۔ آتش زدگیاں اور وبائیں۔ باشندگان کشمیر۔ مسلمانوں کشمیری پنڈتوں اور سکھوں کے حالات ان کا لباس اور خوراک وہاں کے میوہ جات اور ترکاریاں ودیگر پیداوار۔ یہ مضامین مختلف ابواب میں درج ہیں۔ کشمیر کی مختصر تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد نظام ریاست اور تقسیم انتظامی سے بحث ہوئی ہے

پھر سرحدی اضلاع پر۔ اسکے جاگیردار زمیندار اور ماتحت ریاستوں کے حالات ہیں۔ پھر زراعت فارم اور دیہاتی بنکوں کا ذکر آیا ہے۔ پھر تعلیمی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے اس کے بعد صنعت وحرفت پر۔ پھر شکار کے متعلق حالات ۔ پھر ہائس بوٹ اور کشتیوں کا حال ہے وغیرہ وغیرہ۔ القصتہ یہ نادر کتاب نایاب مفید اور دلچسپ معلومات کا گنجینہ ہے۔ معلومات محنت کے ساتھ فراہم کی گئی ہیں اور بادی النظر میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی انگریزی گائڈ کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ اردو زبان میں ایسی کتابیں کہاں ہیں جن میں یہ بات پائی جاتی ہو کہ مؤلف کی ہمہ گیری نظر ہر ہر گوشہ ہر ہر نقطہ اور ہر ہر پہلو پر دوڑی ہے؟۔ یہاں تو مضمون نگاری کے معنی ہیں بکواس اور کتاب لکھنے کے معنی ہیں ہرزہ سرائی۔ ہاں خاص خاص مستثنیات البتہ ہیں۔

ہماری رائے میں رہنمائے کشمیر بھی انہیں مستثنیات میں سے ہے۔ محنت سے حالات اور واقعات جمع کرنے کی عادت رکھنے والے مؤلف صاحب کی ہمت بڑھانا چاہئے۔ تاکہ ان کی مشق جاری رہے اور پختہ کار ہوکر ایک وقت میں ایک مستند اور قابل فخر مؤلف بن سکیں۔

ایڈیٹر

پردہ نشین شریف بیگمات کے پڑھنے کی خاص دلچسپ کتابیں

کتاب	مضمون	قیمت
رسول عربی	حبیب خدا اشرف الانبیا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی متبرک سوانح عمری	۸/
بنت الرسول	سیدۃ النسا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مقدس حالات زندگی	۵/
راہ جنت	نیک اور پاکباز بی بیوں کے نتیجہ خیز اور قابل تقلید کارنامے۔	۳/
معلمہ یا بہشتی جوہر	لڑکیوں کو تمام مذہبی مسائل سکھانے والی لاجواب کتاب قصہ کے پیرایہ میں	۱۲/
صنعت خانہ	گھر میں جن چیزوں کی ضرورت رہتی ہے وہ چیزیں اس کتاب کی مدد سے بنائیے	۴/
حسن و صحت	خوبصورت اور تندرست زندگی حاصل کرنے کی مفید ترکیبیں	۶/
کفایت شعاری	فضول خرچ مردوں اور عورتوں کیلئے تازیانہ نہایت مفید کتاب	۴/
ناصح مشفق	نصیحت کے پورے ایک سو سچے موتیوں کا خزانہ	۳/
چپ کی داد	خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم کی لاجواب نظم عورتوں کی حمایت میں	۱۰/
رباعیات انیس و دبیر	دونوں معاصر شعرا کی منتخب رباعیات کا مجموعہ	۴/
چڑے چڑیا کی کہانی	انسان کی بے مروتی کا قصہ دو پرندوں کی زبان سے بیان کیا گیا ہے	۳/
جمیلہ خاتون	پردہ نشین بی بیوں کو کفایت شعاری سکھانے کی بے نظیر کتاب	۳/
عقیلہ بیگم	کفایت شعاری اور استقلال کیساتھ زندگی بسر کرنے کا طریقہ	۳/
آداب نسواں	دل پسند، مفید، اور قابل عمل نصیحتوں کا مجموعہ	۶/
کون تارا	قلعہ آگرہ کی داستان شہنشاہ اکبر اور ۔۔ وبائی کے حالات	۱/
پہیلی نامہ	سیکڑوں نایاب اور دلچسپ پہیلیاں معہ حل کے درج ہیں	۷/
لوری نامہ	روتے بچوں کو بہلانے اور جاگتوں کو سلانے والی دلچسپ لوریاں	۳/

اصلاح الرسوم	مسلمانوں کی تمام بری بُری رسموں کی اصلاح کس طرح ممکن ہے۔	۳/
مسدس حالی	خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم کا مقبول عام اور لاجواب مسدس	۶/
رباعیات حالی	خواجہ موصوف مرحوم ومغفور کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رباعیوں کا مجموعہ	۳/
لیکچر اسلام	مسز اینی بسنیٹ کے لیکچر کا اردو ترجمہ جس میں اسلام کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں	۳/
صبر کی دیوی	ایک معصوم لڑکی پر سوتیلی ماں کے مظالم اور اس کے صبر کا نتیجہ	۳/
حوران جنت	معزز اور مشہور خواتین کے دلچسپ اور مقدس حالات	۴/
نیا باورچی خانہ	تمام قسم کے کھانے، حلوے، اچار چٹنیاں، وغیرہ بنانے اور پکانے کی تعلیم	۶/
لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم	ایک غریب خاندان کی لڑکی کا لیڈی ڈاکٹر بننا اور پھر اسلام کی خدمت بجالانا	۱۲/
لاڈلا بیٹا	ماں باپ لاڈ اور پیار میں اولاد کو کس طرح بگاڑتے ہیں	۳/
زنانہ خطوط	عورتوں کو خطوط نویسی سکھانے کے آسان طریقے	۵/
مجموعہ وظائف	دن اور رات پڑھنے کے لئے مجرب اور نادر اوراد کا مجموعہ	۴/
قومی گیت	بچوں اور لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل اخلاقی گیت اور نظمیں	۵/
مجموعہ ظرافت	اس میں ظرافت آمیز ہنسنے ہنسانے کا مہذب سامان موجود ہے	۲/
تاثیر صحبت	نوجوانوں کی اصلاح ایک دلچسپ اور مؤثر پیرایہ میں	۱۰
رفیق مرزا	تعلیمیافتہ اور جاہل ماؤں کا مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے	۳/
جام کوثر	اعلیٰ درجہ کی نعتیہ غزلوں کا مجموعہ ہندوستان کے مشہور شعرا کا پرجذب کلام	۴/
تربیت النسا	دہلی کی صاف ستھری زبان میں ایک سبق آموز اور نصیحت خیز قصہ	۴/
حالات زمین	عورتوں کیلئے دنیا کا آسان جغرافیہ۔ سہل زبان میں	۱/
نظم لغت	انگریزی اردو کی خالق باری اس کے مطالعہ سے انگریزی آجاتی ہے	۵/

بچوں کا "عزیز"

جس طرح چھوٹے چھوٹے ہونہار بچے سب کو عزیز اور پیارے ہوتے ہیں اسی طرح یہ ان پیارے بچوں کا ایک خوبصورت اور پیارا اخبار ہے

بچے اور چھوٹی عمر کی لڑکیاں

جو تھوڑی سی اُردو پڑھ سکتے ہیں وہ "عزیز" کے اسقدر شایق ہیں کہ جہاں کہیں اُسے دیکھ پاتے ہیں بلا ختم کئے نہیں چھوڑتے وجہ یہ ہے کہ عزیز کی دلکش اور دلچسپ

چھوٹی چھوٹی تصویریں

اُنہیں اسکے مضامین پڑھنے کی خاص رغبت دلاتی ہیں "عزیز" کی کوئی نظم یا مضمون نصیحت اور نئی معلومات سے خالی نہیں ہوتا

بڑے بڑے عالم اور فاضل

"عزیز" کو بچوں کے واسطے مفید بتلاتے ہیں مثلاً مولانا شبلی، مولانا حالی مرحوم۔ خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج۔ پروفیسر اقبال۔ حضرت خاموش، جناب اختر وغیرہ نے عزیز کی بہت تعریف کی ہے نمونہ ۲ر کے ٹکٹ بھیجکر ضرور منگائیے۔ چندہ سالانہ مبلغ ۲ دو روپیہ معہ محصول وغیرہ

موسو

...اپ ہی ہے۔ اس کی تعریف کی ضرورت نہیں تمام دردوں مثلاً
...گٹھیا۔ عرق النسا۔ درد پشت۔ فالج۔ ادہرنگ۔ ذات الصدر۔ ذات الجنب
...م شکایت کا رفع کرنا اس کا اصلی کام ہے یہ مالش کرنے کی صورت میں
...۔ اکثر بادی بلغم اور ریح وغیرہ یا بے اعتدالیوں کی وجہ سے بڑھاپے
...ں تمام شکایات پائی جاتی ہیں اُن اصحاب کے لئے موسو کا استعمال
...ظ ما تقدم اس کی مالش سے آنے والی شکائتیں رُک جاتی ہیں۔
...ب ۱۲ رہے مدت کے لئے کافی ہے۔

المشتہر

...۔ روز۔ ۱۵ بیگانڈیٹ سٹریٹ

...رنگون ملک برہما

جس کا درد وہی جانتا ہے دوسرا کیوں کر جان سکتا ہے

یوں تو کوئی ایسا مرض نہیں جس کی تکلیف سے مریض نالاں اور پریشان نہ ہو مگر دمہ کے مریض خاصکر دمہ کی نا قابل برداشت تکلیف سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور ادمن سانس پھولنے کی وجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند حرام ہو جاتی ہے دیکھئے آج ان کو کسقدر تکلیف ہے لیکن افسوس ہے کہ اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیاء دھتورہ بھنگ بلاڈونا - پوٹاش ای اوڈائڈ وغیرہ سے بنتی ہیں اس لئے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے - ڈاکٹر برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا ایک انمول جوہر ہے آپ نے بہت خرچ کیا ہوگا - لیکن ایک مرتبہ اسے بھی آزمائیں قیمت ۱۲ فی شیشی محصولڈاک ۵ر

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی خون سے ہے اسلئے خون صاف رکھنا ضروری ہے اور اسکی ترکیب بھی آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی وائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں پوٹاش ای اوڈائڈ وغیرہ کئی ایک آموده ادویات ملاکر بنتا ہے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ گیا ہو تو اس کو استعمال کیجئے اگر آپ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو تندرست رکھنا چاہتے ہوں تو لال شربت پلادیں کلیجہ کی کمزوری کھانسی وغیرہ کو دور کرنا چاہتے ہوں تو

لال شربت

پلادیں پیدائش کے وقت سے ہوشیار ہونے تک دوا یکساں فائدہ کرتی ہے پینے میں شیریں اور رنگ سرخ ہونے کی وجہ سے لڑکے خواہش سے پیتے ہیں قیمت ۱۲ فی شیشی محصول ڈاک ۴ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

جنگ! جنگ!! خونریز جنگ!!! اور فتح!!!!

حُسن و شباب کے ولولے حجاب شرم و حیا سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ تمناؤں کے پیدل۔ ارمانوں کے شعلہ آشام سوار۔ حسرتوں کے شتر بار رسالے دل کے سنگین قلعہ سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور غنیم کی شعلہ افشانیوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ادھر یہ ہنگامہ بپا تھا ہی کہ عشق کا پرجوش جنرل آگے بڑھ کر فوج کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اضطراب کے توپخانے سے آہوں کے گولے برسنے لگتے ہیں۔ اب دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش سے جنگ جاری ہو کر اتنے میں کچھ اداؤں کا غنیم جنرل "دغا" کی ڈویژن پر ایک سخت خونریز اور وحشیانہ حملہ کرتا ہے۔ جنرل "دغا" کی فوج شکست فاش اٹھا کے پیچھے ہٹ جاتی ہے مگر نہ شکست ہی تسلیم کرتی ہے نہ غنیم کے مطالبات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ پھر دفعۃً پاک "وفا" کی کمک میں محبت کی تحت البحر کشتیاں اور ایثار کے ہوائی جہاز آتے ہیں۔ اِس نئی فوج کا کمانڈر ایک معصوم فرشتہ ہے۔ فرشتہ سامنے آتا ہے اُسے دیکھتے ہی غنیم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ہماری فتح کے شادیانے بجنے لگتے ہیں!

یہی واقعات۔ یہی حُسن و عشق کی زبردست معرکہ آرائیاں۔ پاک محبت کے اچھوتے جذبات کی تصویر۔ عصمت اور حیا کا دلنشین مرقع خلوص صدق و صفا کے صاف شفاف آئینے میں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ادھر آئیے ہم دکھاتے ہیں سنسکرت زبان کے مسلم الثبوت استاد کالیداس کا کلام "شکنتلا" ناٹک حضرت امیر مینائی مرحوم کی زندہ یادگار حضرت خلیل شاعر دربار راج بلرام پور کی زبان سے مُرصع اردو نظم میں بڑے آب و تاب بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے چھپ کر تیار ہے حجم ۱۵۰ صفحہ قیمت فی جلد ۱۰ ار

ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ "پیام اُمید" آگرہ

شیکسپیر اردو نظم میں

خلقت پہ ہے مثل کاکل یار ، چھائی ہوئی ظلمتِ شب تار
ظلمت کو ہے نور سے عداوت اُلفت کو نفور سے عداوت
یہ سب ہے مگر ہزار احسان ہے سامعہ زیر بار احسان
کی جب نہ بصر نے رہنمائی کانوں میں صدائے یار آئی

فرمایئے کیا ترجمہ معلوم ہوتا ہے؟ تالیف میں تصنیف کا لطف ہے یا نہیں؟
یہ وہی مقبول عام ترجمہ ہے جو ہندوستان سے لندن تک شہرت پا چکا ہے
اور جسے کئی صوبوں کی ٹکسٹ بک کمیٹیاں منظور کر چکی ہیں۔ کاغذ کی گرانی
کی وجہ سے جدید اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تھوڑے سے نسخے موجودہ
اشاعت کے باقی رہ گئے ہیں۔ انھیں رعایتی قیمت پر علیحدہ کر دینا منظور ہے۔
اصلی قیمت ۱۲ر تھی۔ اب رعایتی قیمت ۸ر رکھی گئی ہے۔

(ملنے کا پتہ)

دفتر رسالہ "پیام امید" آگرہ

فہرست مضامین دسمبر نمبر ۱۹۱۷ء

امید کا پیام ۔۔۔۔ اٹھو ۔۔۔۔ اٹھو ۔۔۔۔ اور آگے بڑھو!

پیام امید

نمبر ۲۸ | محمود آباد ۔ سیتاپور (اودھ) دسمبر ۱۹۱۷ء | جلد ۳

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے اسمیں صنف کی کوئی قید نہیں جس حال میں کہ ہزاروں اخبارات اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ سکتی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالے کا پڑھنا مردوں کو گراں گزریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنیکا کوئی حق نہیں رکھتے

متفرق نکات

"پیام امید" کے اکثر پرچوں میں نمبر اور جلد غلط درج ہیں ۔ ناظرین کرام تصحیح فرمالیں رسالہ ستمبر ۱۹۱۵ء سے جاری ہے ۔ لہذا ستمبر ۱۹۱۵ء نمبر ۱ ہوا ۔ یہ نمبر سلسلہ ہے برابر سلسلہ وار چلیگا اور اس طرح پر اس اشاعت کا صحیح نمبر (۲۸) آتا ہے ۔ جلد کی تقسیم ہم نے

ششماہی نہیں رکھی اس وجہ سے کہ سال بھر کے پرچوں کی ایک جلد رکھنے سے حجم زیادہ نہیں ہوجاتا۔ البتہ ستمبر ۱۹۱۵ء سے دسمبر ۱۹۱۵ء تک کی ایک جلد رکھی ہے، اس کے بعد جنوری ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۶ء تک کی ایک جلد قرار دی گئی اور تیسری جلد جنوری ۱۹۱۷ء سے دسمبر ۱۹۱۷ء تک کی ہوئی۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۱۸ء سے چوتھی جلد کا آغاز ہوگا۔

"نظارہ" کے مشترکہ جولائی و اگست نمبر میں حضرت یاس کا مختصر مضمون حضرت اکبر کی شاعری کے متعلق نظر سے گذرا۔ اس مضمون میں بعض نکات اچھے پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ "مرزا داغ دہلوی اور اکثر اہل لکھنؤ نے ۔ ۔ ۔ ۔ انگیز شاعری کو رواج دیکر تغزل کو ہوس پرستی کا مترادف بنا دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ابھی تک کچھ تعلیم یافتہ حضرات بھی داغ کے ہوا خواہ نظر آتے ہیں۔" اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ نیک کو اور زیادہ نیک اور بد کو بد سے بدتر بنا دیتی ہے یعنی فطرتی میلان جدھر ہوتا ہے اس کی رفتار اور زیادہ تیز کر دیتی ہے۔ آگے چل کر آپ پھر فرماتے ہیں کہ

"دیکھئے غزل گوئی سے صرف عورتوں کے ساتھ بات چیت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ ایسے خیالات عالی حوالۂ قلم کرنا چاہئے جو انسان کو انسان بنائیں۔ تہذیب نفس وجوہر شرافت سے آراستہ کریں۔"

بڑے شکر کا مقام ہے کہ ایک بزرگ کا خیال تو ادھر رجوع ہوا جس کے متعلق "پیام امید" اپنے دنیا میں قدم رکھنے کی تاریخ سے صدا بلند کر رہا ہے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی کمزور کون سنتا ہے۔ یہاں تو جو ہے اپنے ہی رنگ میں مست ہے۔ لنکا میں جو ہے باون گز

سے کم نہیں"۔

ہم بلاشبہ مولینا یاسؔ کی عرق ریزی کی داد دیتے ہیں۔ اور ان کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ جیسے پاکیزہ اشعار آج آپ نے منتخب کرکے سنائے ہیں انہیں پربس نہ کیجئے ایسے ہی اور منتخب کرکے سنایئے۔ گو ہم اس حد تک مولینا سے متفق نہیں ہوسکتے ہیں کہ "جس نے شیخ سعدی اور حکیم سنائی کو نہ دیکھا ہو وہ اکبر کو دیکھ لے" مگر ہم اتنا ضرور عرض کرسکتے ہیں کہ جیسے پاکیزہ اور بلند پایہ اشعار آج حضرت یاسؔ نے کلام اکبر سے اخذ کرکے پیش کئے ہیں ایسے اشعار لکھنے والے زمانۂ حال کے شعرا میں کمیاب ہیں۔ بلکہ ہم اس حد سے بھی کچھ اور آگے بڑھ کر یہانتک عرض کرسکتے ہیں کہ اس فن میں حضرت اکبر آپ ہی اپنا جواب ہیں کاش حضرت اکبر اس منحوس "گدامی شاعری" کی تک بندی سے دست بردار ہوکر ایسی شاعری کو اپنا مستقل رنگ قرار دیتے تو کیسا اچھا ہوتا۔ پھر تو اس میدان میں تنہا اکبر ہی اکبر نظر آتے اور کون ہے جو انہیں سر آنکھوں پر جگہ نہ دیتا!

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہمارے معاصرین میں سے دو موقر ہمعصروں کا خیال "فن تنقید کی ضرورت" پر رجوع ہوا۔ "مخزن" کے اکتوبر نمبر میں "اردو میں فن تنقید کی ضرورت" کے عنوان سے سب سے پہلا مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار صاحب کا نام "حضرت سالک بٹالوی ایڈیٹر تہذیب نسواں" بتایا گیا ہے۔ ہمیں علم نہیں ہے کہ مولوی ممتاز علی صاحب والے "تہذیب نسواں" کے سوا اور بھی کوئی "تہذیب نسواں" ہے۔ اگر یہ وہی تہذیب نسواں ہے تو ہمیں آج سے پہلے یہ علم نہ تھا کہ حضرت سالک بٹالوی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ غالباً یہ ردوبدل حال ہی میں ہوا ہے۔ حضرت سالک بٹالوی کے مضمون کی ابتدائی

سطور بہت ہی خوب لکھی گئی ہیں اور اُن کی نقل ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

"جس طرح دنیا کی سلطنتیں انتظام مملکت کو قائم رکھنے کے لئے ضابطہ و قانون کا نفاذ ضروری سمجھتی ہیں۔ اسی طرح سوسائٹی اپنے اُصول و قوانین سے افراد کو پابند رکھتی ہے۔ اور جادہ اعتدال و راستی سے منحرف نہیں ہونے دیتی۔ دنیا کے تمام کاروبار کسی نہ کسی قسم کے ماتحت مرتب و منتظم ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ادب اُردو کچھ ایسا اندھا دھند شتر بے مہار کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کہ نہ کوئی ترتیب ہے نہ تنظیم۔ نہ کوئی اصول ہے نہ قاعدہ! قانون کی دفعات کے خلاف ورزی کرنے والوں کا گلا دبانے کے لئے پولیس اور محکمہ احتساب ہر وقت تیار ہے۔ لیکن لٹریچر کے قواعد و اصول کے توڑنے والے کسی سزا کے مستحق نہیں ٹھیرائے جاتے۔ وہ آزادانہ کھُلے خزانے ایسی لطیف و نفیس زبان کے گلے پر کند چھری پھیرتے چلے جاتے ہیں۔ اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کہ تمہارے مُنہ میں کے دانت ہیں۔

انگلستان میں ہر موقر اخبار کے دفتر کے ساتھ ایک عملہ نقادانِ ادب کا بھی ہوتا ہے جن کے ذمے ملک کے لٹریچر پر صحیح معنوں میں تنقید کرنے کا مہتم بالشان کام ڈالا جاتا ہے جونہی کوئی نئی تصنیف نکلتی ہے۔ اُن خدائی فوجداروں کے پاس بغرض تنقید پہنچ جاتی ہے۔ وہ اس کے عیوب و محاسن کو صاف صاف لکھ دیتے ہیں لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ کیونکہ انہیں نہ کسی مصنف سے دب کے رہنا پڑتا ہے۔ نہ وہ اس بات کی پروا کرتے ہیں کہ کوئی جماعت اُن کی صداقت اور اظہار حق میں بیباکی سے ناراض ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جس کتاب کی بابت نقادانِ فن کا یہ فتویٰ ہو۔ کہ وہ اچھی ہے ملک کے لئے مفید ہے اور اہل ملک کو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ اس کا ایڈیشن ابھی پریس سے نہیں

نکلتا۔ کہ ہزاروں درخواستیں خریداری کی جمع ہو جاتی ہیں۔ اور جس کتاب کی بابت بدقسمتی
سے نقادوں کی رائے اچھی نہ ہو۔ اُس کا ایک ہی اڈیشن چھپ کے رہ جاتا ہے۔ اور وہ
جلدیں بھی مصنف کے غم خانے میں پڑی سڑتی ہیں۔ اور اُنہیں کوئی نہیں پوچھتا۔
اس طریقے سے غیر مفید لٹریچر ملک میں مروّج نہیں ہونے پاتا۔ اور ناکام مصنفوں کو
معلوم ہو جاتا ہے کہ ابھی اُنھیں چند سال تک اپنے نہاں خانہ مطالعہ سے منصہ تصنیف و
تالیف پر آنے سے باز ہی رہنا اچھا ہے۔ جن مصنفین کی کتابیں نقادوں کی نظروں میں
وقعت پا جاتی ہیں۔ اُن کی دماغ سوزی کی داد اور اُن کی تحقیق و تدقیق کی اتنی قدردانی
ہوتی ہے جو انگلستان جیسے دولتمند اور اور بیدار ملک کے شایانِ شان ہے تعریف
و قدر افزائی سے مصنف کا دل بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ آیندہ بیش از بیش محنت سے کتابیں
لکھ لکھ کے ملک کے لٹریچر کو مالا مال کر دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ وہاں ہمارے ملک کی طرح فضول قصّے بیہودہ ناول واہیات
مجموعہ ہائے اشعار اور ذلیل ڈرامے نظر نہیں آتے۔ وہاں جو کچھ ہے۔ پاکیزہ ہے۔ کیونکہ
سب سے پہلے وہ ان نقادوں کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ جن کا معیار تنقید عوام کے معیار
مطالعہ سے بھی بہت بلند ہے۔ جن دھاتوں میں میل کچیل اور رنگ نظر آئے اُن کو یہ
کہہ کر لوٹا دیا جاتا ہے کہ بازار میں ابھی اس جنس کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اسے محنت و عرق
ریزی کی کٹھالی میں صاف کر کے لائیے کہ مول تول میں بھاری ہو جائے۔

ہمارے ملک کی کیا حالت ہے؟ وہ بھی سُن لیجئے۔ یہاں اوّل تو سرے سے
تنقید اور ریویو کے اصلی معنے جاننے والے ہی شاذ ہیں اور شاذ کالمعدوم بالفرض
اگر وہ اُس کا مفہوم سمجھے بھی ہیں۔ تو اس کا استعمال نہیں کرتے۔ اور رونا ہی اسی بات

کاہے میں نے بعض اخباروں کے بڑے بڑے لایق اور فاضل ایڈیٹروں کو دیکھا ہے کہ
کسی تصنیف یا تالیف پر ریویو لکھنا ہو تو پہلے کتاب کو اُلٹ پلٹ کر یہ دیکھ لیتے ہیں۔ کہ کس
موضوع پر ہے پھر کہیں کہیں دو دو تین تین صفحے پڑھ کر اُس کی زبان کا اندازہ لگا لیتے ہیں
اور بس۔ اس کے بعد قلم ہاتھ میں لیا۔ اور ریویو دھر گھسیٹا "ہمارے دوست مولوی منشی مسٹر
فلاں نے ایک کتاب بنام ... "ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیجی ہے۔ کتاب فلاں موضوع
پر ہے۔ قابل مصنف نے کتاب خوب لکھی ہے۔ زبان بھی سلیس با محاورہ دلکش ہو لکھائی
چھپائی کاغذ بہت عمدہ قیمت ۸ مصنف مذکور سے مل سکتی ہے"

لیجئے۔ ریویو تیار ہو گیا۔ اللہ اللہ! جس ملک کے نامی اور لایق اڈیٹروں کی تنقید
کا یہ حال ہو۔ اُس کا انجام یوں سمجھ لیجئے۔ کہ "کار طفلاں تمام خواہد شد"

ضرورت ہے اس بات کی۔ کہ ادب کے تمام شعبوں کو ایک منظم حیثیت میں لایا
جائے اور ہر ایک پر جداگانہ تنقیدیں لکھی جائیں تاکہ ناقص مصنفوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ
لٹریچر پر دست تعلی دراز کرنے سے باز آئیں لایق مصنفوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور دنیا پر اُنکے کمالات اور اُنکی تصانیف
کی حقیقی قدر و وقعت روشن ہو جائے۔ حضرت سالک کے یہ الفاظ بھی آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

..... نقادان ادب فوراً تنقید لکھتے۔ جس مصنف کو ہونہار دیکھتے اُس کے عیوب ظاہر
کرکے ان کی اصلاح کے طریقے اُسے بتاتے اور جس کو ناقابل پاتے اس کے مضامین
کے ایسے پرخچے اُڑاتے کہ آئندہ وہ سر اُٹھا نہ سکتا۔ اور زبان پھر لٹریچر سے محفوظ رہتی

" ملک کے معزز اخباروں اور ادبی رسالوں کے اڈیٹروں کو چاہئے۔ کہ جہاں اپنے اور
بے شمار فرائض بجالاتے ہیں۔ وہاں تنقید کی طرف بھی توجہ مبذول فرمائیں۔ اور جب اُنکے
پاس کوئی تصنیف ریویو کے لئے آئے تو مصنف کے زیر بار احسان نہ ہو جایا کریں۔ بلکہ

فرصت کے وقت اس کو اچھی طرح دقیق نظر سے پڑھیں اس کے موضوع اور اس کے طرز بیان کو خوب اچھی طرح جانچیں۔ زبان کی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھیں۔ آٹھ۔ دس پندرہ۔ بیس دن میں اُسے ختم کریں۔ اس کے بعد نہایت دیانت وراستی سے ان نتائج کو جو اس کتاب کے متعلق دماغ میں مرتب ہوئے ہوں مدنظر رکھ کر ریویو لکھ دیں۔ کسی کی ملامت یا ناراضی کا ہرگز خیال نہ کریں۔ اگر کتاب اچھی ہو تو جی کھول کر تعریف کریں۔ اگر بُری ہو تو نہایت بے باکی سے اظہار صداقت کریں۔ لیکن لہجہ دل آزاری کا نہ ہو۔ نہ ذاتیات پر کسی قسم کا اشارہ ہو۔ کیونکہ یہ سفاہت کی دلیل ہے۔ ہمیشہ حُسن نیت اور راستی سے کام لیا جائے۔ اگر صرف ایک سال تک تمام قابل ایڈیٹر اس مشورے پر عمل کر کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ ادب اُردو کو اس قسم کی احتیاط سے کتنے قیمتی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور بیہودہ اور لغو کتابوں کی اشاعت کیسی جلد رُک سکتی ہے"

تنقید کا کام محض ایک اخبار کے تعلق کر کے علیحدہ ہو جانے کے ہم مخالف ہیں۔ اوّل تو ہماری اُردو خوان پبلک کا مذاق کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ ایسے رسالہ کو کافی خریدار نہ ملیں گے۔ دوسرے اس اخبار کے مضامین کی اشاعت محض اسی رسالہ کے خریداروں اور احباب تک محدود رہ جائے گی حالانکہ یہاں ملک کے مذاق کی اصلاح درکار ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر موقر اخبار اور رسالہ تنقیدی مضامین کے لئے کچھ کالم وقف کر دے۔ اور ایسے مضمون نگار پیدا کرے۔

بدقسمتی سے حضرت سالک کو بعض خیالات سے اتفاق کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں جو اس مضمون میں ظاہر فرمائے گئے ہیں۔ مگر ہم مضمون نگار صاحب اور ایڈیٹر صاحب مخزن دونوں کے مشکور ہیں کہ "پیام امید" کی اس تحریک میں انہوں نے حصہ لیا۔

اگر کچھ دوستانہ شکایت ہے تو محض اُس قدر کہ اس تحریک کو صاف الفاظ میں ظاہر کیوں نہیں کیا۔ اس سے اتفاق اور یک جہتی کی صورت پیدا ہوتی اور ہم سب کے ایک ساتھ مل کر ایک ہی و احد مقصد میں سرگرم سعی ہونے کی راہ صاف ہو جاتی۔ جب ایڈیٹر صاحب "مخزن" کو بہت ناگوار ہوتا ہے اگر کوئی صاحب بلا حوالہ اُن کے رسالہ کا مضمون نقل کر کے شائع کر دیتے ہیں تو اُنہیں اپنے معاصرین کے احساسات کا بھی خیال ہونا چاہئے۔ کیا "پیام نعید" کی تحریک کوئی ایسی قابل حقارت تحریک تھی جس کا نام لینا بھی ہمارے معاصرین کے لئے شرمناک تھا؟

ہمارا ادبی نقاد



ہمیں افسوس کے ساتھ معذرت کرنا ہے کہ ایڈیٹر صاحب کے کسی مضمون یا نوٹ سے موجودہ اشاعت خالی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ گو اُن کی صحت بہت ترقی کر چکی ہے البتہ ضعف بہت ہے مگر دونوں بچوں کی شدید علالت کی وجہ سے جن میں سے ایک کو طحال کی شکایت ہے اور دوسرے کو سوکھے کا مرض ہے اُنہیں اس کام کے لئے وقت نہیں مل سکا اسی طرح ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہمارے نئے نمبر کی اشاعت دیر کے ساتھ ہوئی۔ اس کی وجہ منیجر صاحب عزیزی پریس کی پریشانیاں ہیں جن کے کئی قریبی اعزاء ایک ساتھ سخت علیل ہو گئے ہیں۔ اور افکار سے اُنہیں فرصت نہ مل سکی۔ جن حضرات کے نام وی پی پیکٹ روانہ ہوئے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ اُنہیں اور دیر کے ساتھ پرچہ پہنچا ہو گا۔ مگر وہ بجائے وی پی کا انتظار فرمانے کے اگر منی آرڈر بھیج دیا کرتے تو یہ توقف ہرگز نہ ہوتا۔ ایڈیٹری کے عارضی چارج سے عاجز کو اور دفتر کے کام سے منیجر صاحب کو دم لینے کا بھی وقت نہیں ملتا۔

ادبی نقاد

خانہ آبادی

(سلسلہ کے لئے اکتوبر نمبر ۱۹۱۷ء ملاحظہ ہو)

محض یہی امر ذہن نشین کرلینا کافی نہیں ہے کہ میاں بیوی کے باہمی تعلقات تلخی کی چاشنی سے پاک رکھے جائیں یا دوسرے الفاظ میں شوہر کی جانب سے کوئی بات کوئی لفظ کوئی اشارہ کنایہ ایسا نہ پایا جائے جو ذرا بھی رنج دہ یا دلشکن یا حوصلہ پست کرنیوالا ثابت ہو سکے۔ محض اسی بات کا ذہن نشین کرلینا اس وجہ سے ناکافی ہے کہ کسی قصور بدی یا برائی یا کج خلقی کی عدم موجودگی کا نام نیکی شرافت یا بھلائی نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ دلشکن الفاظ منہ سے نکالنے کے مقابلہ میں چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ ایک پر شوکت اور رعب دار طرز عمل جس سے اس طرز عمل کا عامل اوروں کی نظر میں اپنا وقار پیدا کرانا چاہتا ہو گو ایک بیجان سنگ مرمر کے بت کی مثال سرد مہری کا نمونہ ہے مگر پھر بھی سخت الفاظ زبان سے نکالنے کے مقابلے میں نسبتاً اچھا ہی کہا جا سکے گا۔ ایسا باغ جس میں گھاس پھوس خس و خاشاک نہ اُگے ہوئے ہوں درختوں گھاس پھوس کی کیاریوں سے اچھا ہوتا ہے حالانکہ وہ باغ شاداب درختوں اور پھولوں سے بالکل ہی خالی ہو۔ مگر ایسا باغ جو طرح طرح کے رنگا رنگ پھولوں سے مزین ہو اور جس کے دل فریب پھولوں کی مہک سے ہوا معطر اور معنبر ہو رہی ہو مذکور باغ سے بھی اچھا کہلائیگا۔ اگر شوہر اپنی بیوی کو مخاطب کرتے وقت خیال رکھے کہ اس کی زبان سے کوئی سخت ناگوار دل شکن یا رنج دہ لفظ زبان سے نہ نکلنے پائے تو اُسے سمجھنا چاہئے کہ محبت ارتباط اور کامیاب بیاہی زندگی کے کوچہ میں وہ پہلا قدم رکھ رہا ہے۔ اس حد سے آگے بڑھ کر

اگر وہ بجائے سخت ناگوار اور دلشکن الفاظ کے نرم شیریں اور محبت آمیز الفاظ استعمال کرنا شروع کرتا ہے۔ اگر اس کا کرخت اور دلشکن لہجہ نرمی آشتی اور شیرینی پر مائل ہو کر محبت آمیز بن جاتا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ کامیابی کے کوچہ میں اسنے دوسرا قدم رکھا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے منہ سے کبھی کوئی ناگوار لفظ یا فقرہ نہیں نکلتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی زبان سے کبھی ایسا ایک لفظ بھی نہیں نکلتا جس میں پیار محبت یا اخلاص کی جھلک پائی جاتی ہو۔ نئی نئی شادی کے زمانہ کی محبت اور گرمجوشی اب ٹھنڈی پڑ گئی ہے اور ان کی گفتگو اور ان کا لہجہ معمولی کاروباری زندگی کا نمونہ ہے جہاں کام کی بات کے سوا محبت اور اخلاص کا نام ونشان بھی نہیں پایا جاتا۔ ایسے لوگ نہیں سمجھتے ہیں کہ ایسا برتاؤ ایک محبت سے لبریز دل میں سرد مہری پیدا کرتا ہے۔ محبت والا دل محبت کی غذا تلاش کرتا ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ محبت کی غذا بھی پیار بھرے الفاظ ہیں۔

پیار۔ پیار بھرے الفاظ بظاہر بے حقیقت اور فضول نظر آتے ہیں مگر ان کی اہمیت بہت بڑی ہے چاہے وہ کسی وقت اور کسی موقعہ پر استعمال کئے جائیں۔ ایسے الفاظ کا زبان سے نکالنا اتنا آسان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں یاد بھی نہیں رہتا کہ ہم کیا کہہ گئے گر ہمیں بھول نجانا چاہیئے کہ یہی وہ آلہ ہیں جن کے ذریعہ سے ہم ایک محبت کرنے والے کو رنج یا خوشی پہنچا سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ اس صفائی کے ساتھ زبان سے نکل جاتے ہیں کہ ہمیں اس کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ مگر زبان سے نکلتے ہی یہ سننے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں اور ایک خوشبودار پھول کی طرح وہیں سے اپنی خوشبو سننے والے کے دماغ میں دیر تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہے

کہ یہ بے حقیقت الفاظ کیا قوت رکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بھلائی یا بُرائی دونوں کے لئے ان کی قوت لامحدود ہے۔ یہی بے حقیقت الفاظ ہیں جو محبت یا نفرت کی عمارت کی تعمیر میں سنگ بنیاد بنتے ہیں۔ یہ ہمارے مُنہ سے تو نہیں کر نکل جاتے ہیں اور ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جس دل کے اندر راہ پاتے ہیں وہاں جم جاتے ہیں اور زمین پکڑ لیتے ہیں۔

مترجم

ڈاکٹر اسمائیلس کیریکٹر

(سلسلہ کے لئے اکتوبر نمبر ۱۹۱۷ء ملاحظہ ہو)

والٹر نے مرتے وقت ایک وصیت نامہ لکھا جس کے الفاظ یہ تھے " زر نقد ندارد۔ یہاں نہ کوئی خزانہ ہے نہ کسی قسم کا کوئی سکہ ہے " اس شخص کی زندگی کا ایک حصہ ایسی عُسرت کی حالت میں گذرا ہے کہ قوت لایموت حاصل کرنے کی غرض سے اُسے گھڑی سازی اور باغبانی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر عین اسی حالت میں جبکہ اس شخص کے ہاتھ ان ادنیٰ پیشوں کے مشاغل میں مصروف تھے اُس کا دماغ اپنے اہل وطن کے کیریکٹر کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی تجاویز اور مشاغل میں مصروف تھا۔ باوجود ان حقیر اشغال میں وقت صرف کرتے رہنے کے اُس کی اخلاقی قوت جرمنی کے سارے شاہزادوں سے افضل تھی اور درحقیقت قوم اور ملک نے اس کی عزت ان شاہزادوں سے بدرجہا زیادہ کی۔

کیریکٹر ایک جائداد ہے۔ اور دُنیا کی شریف ترین اور معزز ترین مقبوضات ہے۔ اس جائداد کا نام بنی نوع انسان کی دلی گرویدگی اور سچی مخلصانہ اور خلوص آمیز عزت ہے۔ جو لوگ یہ جائداد حاصل کر لیتے ہیں چاہے وہ اس فانی ہستی کے چند روزہ مقبوضات میں سے کوئی چیز کوئی شے نہ رکھتے ہوں مگر وہ ایک ایسی لازوال اور لافانی املاک کے مالک ہیں جو اُن کے دُنیا سے گذر جانے کے بعد ابدالآباد تک قائم رہتی ہے جسے کوئی چور چرا نہیں سکتا۔ کوئی ناعاقبت اندیش اولاد تباہ اور برباد نہیں کر سکتی۔ جو خشکی اور غرقی کے آسیب سے پاک ہے اور جس کی منور شعاعوں کی روشنی میں دُنیا کی آئندہ نسلیں صداقت نیکی اور شرافت کی شاہ راہ ترقی کے تیز قدم بڑھاتی ہیں[۵]۔

---

[۵] ہماری شامت ہے کہ ہم کیریکٹر کی بالکل قدر نہیں کرتے۔ صرف روپیہ جائداد اور بڑے خطاب کی عزت کرتے ہیں اور جب تک یہ حالت قائم ہے ہم میں اعلیٰ پایہ کے کیرکٹر والے افراد پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہیں۔ بہت زمانہ نہیں گذرا ہے کہ صوبجات متحدہ کے سابق لفٹنٹ گورنر سر انٹنی مکڈانل سے پولیس کی شدائد اور رشوت ستانی کی عام شکایت کی گئی۔ سر انٹنی نے سوال کیا کہ اس مسلۂ قابل افسوس حالت کا کون ذمہ دار ہے؟ گورنمنٹ یا رعایا؟ اس کے بعد بولے کہ سارا قصور رعایا کا ہے۔ جب تک تم اعلیٰ اوصاف سے متصف اشخاص (اہل کیریکٹر) کی عزت کرنا نہ سیکھو گے۔ اور بجائے اس کے صرف روپیہ ہی کی عزت کئے جاؤ گے اس شکایت کا سدباب گورنمنٹ کے امکان سے باہر ہے۔ ایک مسلے پولیس افسر بڑی مشقت اور جانفشانی سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتا ہے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳) ہمیشہ ایمان صداقت حق پسندی اور انصاف کی شاہ راہ پر چلتا ہے۔ مگر انجام کار مفلس اور بے زر رہتا ہے تم اس کی کوئی عزت نہیں کرتے۔ اس کی بات تک نہیں پوچھتے کہ کیسے ہو کس حال میں ہو۔ مرتے ہو یا جیتے ہو۔ دوسرا اعلیٰ افسر ظالم جابر اور سخت گیر ہے۔ وہ جبر ظلم اور تعدی روا رکھتا ہے اور غارت گری کر کے بہت سا روپیہ کما لیتا ہے۔ اور آخر کار رئیس اور صاحب جائداد بن بیٹھتا ہے۔ تم اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہو اور سر آنکھوں پر بٹھاتے ہو! جب تک تم اسے ذلیل نہ سمجھو گے اور جب تک تم اس اول الذکر قابل احترام ہستی کی پرستش کرنا نہ سیکھو گے اِن مظالم اور سخت گیریوں کا کوئی قرار واقعی انسداد غیر ممکن ہے یہ کام گورنمنٹ کا نہیں ہے۔ یہ تمہارے کرنے کا کام ہے۔ گورنمنٹ تا حدِ امکان اپنے سب کچھ کر رہی ہے۔ مگر اس خط پر پہنچ کے بعد جہاں اس کی حد ساقط ہو جاتی ہے امداد رعایا کی شروع ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کیا کر سکتی ہے! کیسے صاف اور کیسے سچے الفاظ تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ بچہ ان زرین الفاظ کو دل پر نقش کر لے۔ اگر آج ایسا ہو سکے تو کل ہماری قوم کے ایک زندہ قوم بننے کے مختلف مرحلوں میں سے ایک بہت ہی اہم مرحلہ طے ہو جائے۔

فقیر (مترجم)

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

ترقی کے میدان میں اہل عرب کا پہلا قدم ظہور اسلام سے قبل

اہل عرب مختلف قبیلوں جرگوں فرقوں میں تقسیم تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سنہ ہجری کی پہلی صدی سے قبل وہ کوئی نامور حکیم یکے نے فلسفی شاعر۔ کاہن یا خطیب پیدا نہ کرسکے۔ یہاں ناواقف لوگ یہ اعتراض عائد کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ کی کوئی باقاعدہ تاریخ موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ ایسے نامور اور اہل فن گذرے ہوں مگر ان کے حالات ہم تک نہ پہنچ سکے ہوں۔ مگر اس اعتراض کا یہ جواب ہے کہ اہل عرب کو کئی صدیوں کے پرانے قصے ایام جہالت بے تو زبانی یاد رہے۔ عاد اور ثمود کے واقعات تو نوک زبان رہے۔ مگر صرف دو ہی ایک صدی پہلے کی باتیں انہیں یاد نہ رہ سکیں یہ بات کیونکر باور کیجا سکتی ہے۔ اگر واقعی کوئی قابل ذکر اہل فن گذرا ہوتا تو اس کے کارنامے ضرور ہم تک پہنچتے ہاں یہ بیشک ممکن تھا کہ سو دو سو باتوں میں سے صرف دس ہی بیس باتیں یاد رہجاتیں باقی یاد نہ رہتیں۔

یہ امر علم سیاست مدن میں ایک اصول موضوعہ کے طور پر مان لیا گیا ہے کہ زبان کی ترقی قومی ترقی کا پیش خیمہ ہے۔ زمانہ ظہور اسلام سے ایک صدی پیشتر اہل عرب میں نامور شعراء اور فصحا کا ظہور زبان کی ترقی کا ہراول تھا۔ اور جو آگے چل کر قومی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ان شعراء اور فصحا کے افکار محض زبان ہی کی خوبیوں کے اندر محدود نہ رہے بلکہ مذہبی اور ایک قسم کے دینی جذبات

بھی ان میں موجزن تھے۔ زمانہ جاہلیت کے عرب یہ تو جانتے نہ تھے کہ ہم کس سے دُعا مانگتے ہیں اور کس کے وسیلہ سے مانگتے ہیں۔ہاں البتہ اُن میں ایک شخص کہانت کی خدمت پر مامور تھا جس کا کام تھا بتوں پر قربانی چڑھانا اور معبود کا نام لینا۔ اس طریق پر معبود کا نام لینا اُن کی "عبادت" تھی۔اور اس معبود سے دُعا مانگنا اُن کی "نماز" تھی۔بتوں کی۔پتھروں کی۔آگ کی پرستش ہوتی تھی۔اُن میں مشرک بھی موجود تھے اور کہیں کوئی موحد بھی نظر آجاتا تھا جو ایک ہی واحدیت کو سارے عالم کا خالق جانتا اور سمجھتا تھا اور اسی پر صدق دل سے ایمان لاتا تھا۔

ظہور اسلام سے پہلے دو صدیوں کا زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ اہل حبش یمن پر حملہ آور ہوئے تھے۔اس کے بعد سنہ ہجری سے ایک صدی پہلے اہل حبش پھر فتح مکہ کا خواب دیکھنے لگے اور دوبارہ فوج کشی کی۔کسی ملک پر غیر قوم کے حملہ آور ہونے سے معمولاً جو مصائب اُس قوم کو برداشت کرنا پڑتی ہیں جن پر حملہ کیا جاتا ہے یہ ساری مصیبتیں اہل عرب کو جھیلنا پڑیں اور یہی مصائب انہیں قومی ترقی پر ابھارنے کا باعث بنیں۔انکی رگ حمیت جوش میں آئی اور غیروں کی مداخلت بیجا سے ہمیشہ کے لئے نجات ملنے کی انہیں صرف ایک ہی راہ نظر آئی۔اور وہ راہ یہ تھی کہ قوم کی ساری خامیاں دُور کیجائیں اور ہر طور پر یہ قوم دنیا کی کسی موجودہ قوم سے کسی بات میں کم نظر نہ آئے۔

مؤرخ



مذہب اور سائنس

(سلسلہ کے لئے اکتوبر نمبر ۱۹۱۷ء ملاحظہ ہو)

جلسے اور اجلاس

بابیان "ہفتہ سائنس" کے سکریٹری (وارڈن) کی جانب سے لندن کے اخبارات میں سطور ذیل شائع ہوئی تھیں اُن کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

اِن اجلاسوں کی کامیابی ہماری بہترین توقعات سے کہیں زیادہ ہوئی۔ ساتوں اجلاسوں میں حاضرین کی تعداد بکثرت رہی۔ اور جتنے لوگ شریک جلسہ ہوئے وہ سب کے سب تربیت یافتہ اہل دماغ اور اہل بصیرت تھے۔ حاضرین میں سے ہر ایک میں سرگرمی اور جوش کی روح پائی جاتی تھی اور اُن کا برتاؤ اور طرز عمل ہمدردانہ رہا۔

ہمارا پیام بھی ویسا ہی شاندار تھا جیسا شاندار مجمع تھا اور جیسے شاندار اور موقر اور مستند ہمارے مقررین تھے۔ مقررین میں سے ہر ہر شخص اپنی ذاتی خصوصیات میں اور مقررین کے مقابلہ میں ایک جداگانہ شخصی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اُن کا مسلّم مستند ہونا ایک ایسا امر واقعی تھا جو اُن کے قول فیصل کو وہ وقعت اور اہمیت دیتا تھا جو اُن کے اقوال کے شایان شان تھی ان مقررین نے مادہ پرستی (MATERIALISM.) کی بہت ہی بُری طرح خبر لی۔

مادہ پرستی کے اوہام باطلہ کا دُنیا میں پھیلانے والا شخص ہیکل (HAECKAL) تھا۔ مگر ہیکل پر ایسی ضرب کاری رسید کیگئی کہ اُس کا عدم اور وجود برابر کردیا

گیا۔ اور دنیا کو دکھا دیا گیا کہ اس کے پرانے کرم خوردہ دقیانوسی خیالات بیسویں صدی کی دنیا میں زمانہ حال کی رفتار سے منزلوں پیچھے ہیں اور اس کی غلط رائیں اور اُس کا اجتہاد باطل اب کسی مہذب اور تربیت یافتہ دماغ میں راہ پانے کے قابل نہیں ہے۔ حاضرین جلسہ کو صاف صاف سمجھا اور دکھا دیا گیا کہ ہیکل کے زمانہ میں جو جو اجزاء "مادہ" کی فہرست میں داخل تھے وہ آج کی تاریخ اُس فہرست سے خارج ہیں۔ جو شئے ہیکل کے زمانہ میں "مادہ" کہلاتی تھی اب اُس کا نام "الیکٹرن" ہے اور زمانہ حال کی دنیا انہیں "الیکٹرن" کے اجزاء سے برقی قوت حاصل کر رہی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ اجزاء غیر مادی یا برقی ہیں۔ دنیا کو دکھا دیا گیا کہ "مادہ پرستی" جنھیں "مادہ" بتا رہی ہے وہ "مادہ" ہی نہیں ہیں اور گویا اس طریق پر مادیت کا سنگ بنیاد دراصل "غیر مادیات" پر نصب ہے۔ اور ایسی غلط بنیاد پر جو عمارت قائم کی گئی ہو وہ کیونکر قائم رہ سکتی ہے! "اگناسٹسزم (AGNOSTICISM.) یعنی خلاق عالم کے وجود سے انکار کرنے والوں کے ساتھ نسبتاً اتنا سخت برتاؤ نہیں کیا گیا۔ پروفیسر سلوینیس ٹامسن نے ہکسلے (HUXLAY.) کو مذہب پرست تسلیم کیا اس کے بعد اس عقیدت کے دوسرے حامی لارڈ کلون (KELVIN.) کی نسبت بیان کیا کہ اُن کی تصانیف نے ہماری موجودہ علمی معلومات کو ایک ادب آمیز خلط مبحث میں ڈال دیا ہے۔ ڈاکٹر ہارکر نے کہا کہ جو لامذہب انسان کہتا ہے کہ اُسے کچھ معلوم نہیں ہے زمانہ حال کے ماہرین سائینس اُس کی اس لاعلمی کو اُس دستار معلومات پر کوئی فضیلت کا طرہ خیال نہیں کرتے بلکہ برعکس اس کے اُس کی ناواقفیت پر ناز بیجا کرنے پر تاسف کرتے ہیں۔ پہلا دستور ایسیوں کو عزت بھری نگاہوں سے دیکھا

کافیشن سے خارج ہوگیا۔ اسی طرح سر آلیور لاج کا بھی یہی قول فیصل رہا کہ خلاق عالم کی ہستی سے منکرین ایسے عقیدت کی تشہیر کرنے کی ساتھ ہی ساتھ اپنی نافہمی اور کمی معلومات کی بھی تشریح کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہم کچھ نہیں سمجھتے" کہہ دینے سے ہر منکر گویا دوسرے الفاظ میں اعتراف کرتا ہے کہ اس کے معلومات کچھ نہیں ہیں اور اس کی سمجھ بالکل محدود ہے۔ دُنیا میں انسان معلومات فراہم کرنے آیا ہے۔ اور رفتہ رفتہ تھوڑی تھوڑی سی معلومات بہم پہنچاتے رہنے سے وہ اپنی عدم واقفیت رفتہ رفتہ زائل کرتا جاتا ہے۔ زمانہ حال کی تحقیقات سائنس نے اُس حدفاصل کی دیوار آہن توڑ ڈالی ہے جو پہلے سمجھا جاتا تھا کہ معلومات اور "اُس ناقابل دریافت ہستی" (خدا) کے درمیان حائل ہے۔ منکرین وجود باری تعالےٰ کسی بات کو بطور ایمان یا عقیدہ تسلیم کر لینے پر کسی طرح تیار نہیں ہو سکتے۔ مگر انہیں سنکر تعجب ہوگا کہ ہم ماہرین سائنس بغیر ایسے عقیدے کے ایک انچ آگے بڑھ نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہ تحقیقات سائنس کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ جن جن بڑے بڑے اور اہم اصولات سائنس پر ہمارے پیش رو محققین عقیدت رکھتے ہیں ہمیں بھی لازماً اور مجبوراً انہیں اصولات پر عقیدت رکھنا پڑتی ہے۔ بہت سے علل اور اسباب ہیں جن پر ہمارے پیش رو محققین کو عقیدت تھی۔ اِن علیلیوں کے معلول ہمیں معلوم نہیں۔ مگر اصل علت ہمیں عقیدتاً تسلیم کر لینا پڑتی ہے کیونکہ اسے وہ پیش رو محققین تسلیم کر چکے ہیں۔ اب اگر ان علتوں کو ہم تسلیم نہ کریں تو سائنس کی ساری عمارت جڑ پیڑ سے اُکھڑ کر آج ہی گری پڑتی ہے! بہت سے محققین کی نسبت ہمارے معلومات بالکل محدود ہیں اور ہم اُن کا خیال بہت ہی کم جانتے ہیں مگر باوجود اسکے اُن کے مسلمہ عقائد سائنس کو ہم اپنے عقاید مان کر آگے بڑھتے ہیں

کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہماری تحقیقات کی ساری قلیا ابھی اسی وقت ختم ہوئی جاتی ہے اس وجہ سے اپنے پیش رو محققین کی پسند پر عقیدت رکھنا سائینس کا سنگ بنیاد ہے۔[لہ] ڈاکٹر ہارکر کا قول ہے کہ معجزات کے وجود کے خلاف آج سے بہت پہلے نفی کے سوا اثبات کا لفظ نہیں سُنا جاتا تھا۔ مگر زمانہ حال کے محققین کا یہ طرز عمل ہے کہ بار ثبوت اُس شخص کے ذمہ ڈالتے ہیں جو اُن سے (معجزات سے) منکر ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ زمانہ حال کے محققین میتھوارنلڈ کے تحقیقات سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ میتھوارنلڈ نے صرف اتنی ہی عبارت لکھ کر سر کا بوجھ ہلکا کر دیا کہ "معجزات کا ہونا غیر ممکن ہے" یہ الفاظ ایک خاص طور پر واضح طرز تحریر میں لکھ دینے سے اور نلڈ نے سمجھ لیا کہ اُس نے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا۔

(باقی آیندہ)

مترجم

[لہ] مذہب اور سائنس کی لڑائی میں تو یہ دعویٰ بہ خوب دہل دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا کہ ہم بے دلیل کسی بات کے قائل نہ ہوں گے اور کسی بات کو بطور عقیدہ کبھی تسلیم نہ کریں گے۔ مگر آج تو خیر سے بُرا سامنا ہو گیا ہے۔ اب ہمارے روشن خیال حضرات فرمائیں کہ مزاج کیسے ہیں؟ یہاں تو بغیر عقیدہ رکھنے کے سائینس کی ساری عمارت ہی لڑکھڑا کے چڑ پڑ سے ڈھیر ہو جانے پر تلی ہوئی ہے۔ ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے صرف اتنا ہی سوال کرنے کی جراُت کرتے ہیں کہ کیا آپ کو محققین سائینس کے مسلمات بطور عقیدہ تسلیم کر لینے کے مقابلہ میں ہمارے وحدانیت کے محقق رسول عربی صلعم کے مسلمات تسلیم کر لینے میں کچھ زیادہ وقت پیش آسکتی ہے؟ پھر آخر اس قیل وقال کے کیا معنی؟ ۱۲

مترجم

قوت خیال

(۲)

قوت خیال کو انسان کی جسمانی و دماغی ترتیب کی ساخت میں بڑا دخل ہے۔ انسانی وجود کو خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ ظاہر انسان دراصل باطن انسان کا عکس ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم ہر شخص کے افعال۔ اقوال اور چال ڈھال دیکھکر فوراً نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے! اس صداقت کے ماننے میں ذرا شک نہیں کہ انسان اپنے جسم کو اپنے خیالات کے مطابق تیار کرتا ہے۔ ہر قسم کے خیالات خواہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ تمام جسم کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قوت خیال اندر ہی اندر بغیر مشورہ لئے اپنا عمل جاری رکھتی ہے یہ قوت آدمی کو نظر نہیں آتی۔ لیکن اسکی زندگی کو خاص وضع پر ڈھال کر اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ جس خیال کا دل ہوگا بعینہ ویسا ہی جسم بھی بن جائیگا۔ جن لوگوں نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اُنہوں نے ایک سال کے قلیل عرصہ میں اپنے خیالات کی اصلاح کرکے اپنے چہروں میں اتنی تبدیلی پیدا کرلی ہے کہ ان کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ وہ چہرے جن پر شک و شبہ نے جھریاں ڈال دی تھیں۔ جو فکر اور اندیشہ کے ہاتھوں خراب ہو گئے تھے، وہ چہرے جو بد اعمالیوں اور بے اعتدالیوں کی بدولت بدنما ہو گئے تھے۔ اتنے تھوڑے عرصہ میں اُمید۔ مسرت۔ کامیابی کی روشنی سے سُرخ ہو گئے۔ سویٹ مارڈن کہتا ہے

"ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی زندگی میں ایسے لمحے آچکے ہیں جبکہ دل میں دفعتاً تر و تازگی کی روح پھونکی گئی ہے۔ ہم مصیبت زدہ تھے تکلیف

اور دکھ میں تھے۔ مایوسی اپنا ڈیرا جما چکی تھی۔ چاروں طرف یاس کا
گھٹاٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ کہ یکبیک روشنی کی ایک شعاع نمودار
ہوئی اور اُس نے ہماری زندگی میں کایا پلٹ کردی۔ کوئی مدت سے
بچھڑا ہوا دوست مل گیا۔ جس کے ملنے کی خوشی نے ہمارے خیالات
پر غلبہ پاکر کم از کم تھوڑے عرصہ کے لئے ان کو باہر نکال دیا۔ یا ہم
سفر کررہے تھے۔ دل طرح طرح کے خیالات کا شکار بن رہا تھا
اچانک ایک ایسا نظارہ آنکھوں کے سامنے ہو گیا جس کی خوبصورتی نے ہمیں محو کرلیا۔ خوبصورتی
کے زبردست خیال نے ہمارے کمزور خیال پر فتح پاکر ہمیں کچھ
عرصہ کے لئے بالکل بدل دیا۔"

اگر تم اپنی قسمت کو بدلنا چاہتے ہو۔ اپنے چال چلن اور موجودہ حالات میں تبدیلی پیدا
کرنے کے خواہش مند ہو۔ اپنی زندگی میں زیادہ طاقت۔ نیکی۔ حُسن اور روشنی لانے
کے خواستگار ہو۔ تو اپنی قوت خیال کی لہروں پر قابو حاصل کرو۔ خیال کی لہروں کو غلط
راستے پر بہنے سے روکو۔ اپنے آپ کو اتفاقیہ دوستوں۔ کتابوں۔ مجلسوں۔ صحبتوں
اور مشغلوں پر ہرگز نہ چھوڑو بڑی احتیاط سے اِن سب باتوں کا انتخاب کرو تاکہ دل میں
بلند۔ پاکیزہ۔ اور نیک خیالات کی لہریں موجزن ہوں۔

بہت آدمی یا قریبًا تمام لوگ خارجی اور نواحی حالات کی تبدیلیوں کی طرف
متوجہ رہتے ہیں اور ان میں تبدیلی پیدا کرنے میں ناکامیاب رہ کر ہمیشہ شاکی
رہتے ہیں۔ لیکن معلول میں سب ہی تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے۔ جب کہ اس کی واقعی
علت کو سمجھکر اس میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ تمام حالات کی علت اولی خیال ہے

خیال کی زبردست لہروں کے سامنے پتھر موم ہو سکتا ہے۔ اس لئے غفلت اور بے پرواہی سے کبھی خیال کی لہر کو آوارہ گرد ہونے کی اجازت نہ دو۔ ناواجب ناجائز۔ مکروہ اور ناپاک خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کے متضاد۔ واجب۔ جائز۔ عمدہ اور پاکیزہ خیال سے اُسے دُور کرو۔ جس وقت سے اعلیٰ نورانی اور محبّت آمیز خیالات پیدا کرنا شروع کروگے اسی دم سے اپنی زندگی کے شاہانہ محل کی تعمیر کا کام شروع کردوگے مستقبل کی زمین میں راحت کا تخم بونا شروع کردوگے۔

اچھے خیالات ایک حد تک انسان کے مددگار ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسے نہیں ہیں تو ان کی وجہ سے تہذیب و تمدن کی رفتار کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ وہ لوگ اپنے فرائض اور ذمہ واری کا احساس نہیں رکھتے جو مضر خیالات پیدا کرتے ہیں یا ایسے خیال سے کام رکھتے ہیں۔ جو دوسروں کے واسطے مفید نہ ہوں۔ جو شخص قوتِ خیال کے صحیح استعمال سے واقف ہے وہ سوسائٹی کے ساتھ اپنی جوابدہی اور ذمہ واری کا احساس سب سے زیادہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قانون اخلاق کے متعلق غلط خیالات کا موجد اپنی نادانی کی وجہ سے ہزاروں اشخاص کی زندگیاں تباہ کر رہا ہے۔ کمزور آدمی اُن کے مضبوط خیالات کی طاقتور لہروں کے سیلاب میں آکر تباہ ہو رہے ہیں۔

مرزا آشہید

فرق زبان

حضرت ریاض کہیں گے کہ دامن ”گلچیں“ سے گل چینی کرنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے۔ یہ تو ایک حد تک صحیح ہے مگر ہم سارق ہونے پر گل چیں ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم کیا کریں ایسے مضامین جب ہمارے سامنے آجاتے ہیں تو ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اردو خواں اور اردو آموز دنیا کو حضرت عشرت لکھنوی کا ممنون احسان ہونا چاہئے کہ وہ زبان کے صاف رکھنے اور متروکات سے پاک رکھنے میں عملی حصہ لینا شروع کر رہے ہیں۔ یہ نکات ہمارے زیر تعلیم بچوں کو خاصکر ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ تاکہ صحیح اور غلط میں امتیاز قائم کر سکیں۔ ہم اسی کے ساتھ حضرت عشرت کی ”اردو آموز کتب“ کا اشتہار بھی ناظرین کرام کے سامنے پیش کر کے توجہ دلاتے ہیں کہ ہمارے بچے اس نعمت سے محروم نہ رکھے جائیں۔ ہم اس حد تک نہیں بڑھیں گے کہ ہمارے بچوں کو اور خاصکر لڑکیوں کو دیوان پڑھائے جائیں مگر ان کے علاوہ اور کتابیں ضرور ہیں اسی قابل۔

ایڈیٹر

زبان کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اس کے بقا کی کوشش کی جائے۔ اس کو علمی زبان بنایا جائے۔ اس کا تحفظ کیا جائے۔ ہندوستان کی قدیم مادری زبان سنسکرت تھی۔ زمانے کی ضرورت اور نئے ایجادوں نے اس میں کچھ ترمیم و تحریف شروع کی اور دوسری زبان کے الفاظ ملانا شروع کئے تو سنسکرت کی حفاظت کی غرض سے پنڈتوں نے جدید الفاظ سے پرہیز اختیار کیا۔ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے ”جب روزمرہ

کاروباری ضرورت سنسکرت پورا نہ کرسکی تو لوگوں نے اپنی ضرورت کے موافق اور لفظ بھی شامل کرلئے اور شامل کیا گئے۔ مجبوراً اُن کو جدید الفاظ شامل کرنا پڑے سنسکرت کے بعض لفظوں کو بدلنا پڑا۔ اس بازاری زبان کا نام بھاکا رکھا گیا۔ بھاکا تمام ہندوستان کی عام زبان ہوگئی اور آخر میں ہندوستان کی علمی زبان بنی۔ پھروہی بھاکا زبان شاہانِ اسلام کے مستقل قیام ہند سے اپنا لہجہ بدلنے لگی اور اس میں چند حروف فارسی عربی کے ضروری شامل کئے گئے۔ یعنی ٹ ص ض ط ظ ع ث ح ق رسم الخط بجائے ہندی کے فارسی قرار پایا۔ چونکہ یہ نئی ترمیم لشکریوں کی گفتگو سے زبان میں پیدا ہوئی تھی اس لحاظ سے اس کا نام لوگوں نے **اُردو** رکھ لیا۔ دہلی اس کا دارالخلافت قرار پایا، دہلی کے بادشاہوں نے اس خیال سے کہ یہ بازاری زبان کام کی ہے، اس کے روزمرہ اور اصطلاحات کو برقرار رکھنے اور صرف ونحو کی بنیاد قائم ہونے کی غرض سے اُردو زبان کے شاعر مہیا کئے۔ اور اُن کو اپنے دربار میں جگہ دی، اُن کی ہمت افزائی کی۔ دہلی میں گھر گھر مشاعرے ہونے لگے اور یہ شہر اُردو زبان کا مرکز اصلی قرار پایا۔

اب زمانے نے ایک اور پلٹا کھایا۔ دہلی کی مٹی اور برباد ہوئی۔ عسرت اور فاقہ کشی سے بڑے بڑے صابروں کے قدم اُکھڑ گئے۔ لوگ دہلی سے نکل کھڑے ہوئے دہلی کے شہزادے اور نواب زادے غربت نصیب ہوئے۔

اس زمانے میں شاہانِ اودھ کی فیاضیوں کی بہت شہرت تھی اور **نواب آصف الدولہ بہادر** لاکھوں لٹا رہے تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ علم وہنر کے جوہری تھے۔ جب متعدد واقعات سے نواب کی سخاوت کی صداقت ہوئی۔ تو

اُردو کے سرمایۂ ناز شعرا نے بھی لکھنؤ کا رُخ کیا "میر تقی میرؔ" ملک الشعرا سراج الدین خاں آرزوؔ کے بھانجے جن کی شاعری کے دہلی میں ڈنکے پٹے ہوئے تھے عازم لکھنؤ ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے سارے دہلی کے شاعر سیدھا منہ اُٹھائے ہوتے لکھنؤ چلے آئے یعنی مرزا رفیع السودا، میر حسن، میر ضاحک، میر تقی، ترقی، میرزا تقی، میر محمد سوز، میر خلیق، میر جعفر زٹلی، صاحبقران شاہ حاتم، شیخ قلندر بخش جرأت، نواب طالب علی عیشی، میر جعفر علی حسرت وغیرہ سبھی تو لکھنؤ میں جمع ہو گئے۔ اب جدھر دیکھئے دہلی کے اُمرا، شرفا شہزادے۔ نواب زادے دہلی کے شاعر چاروں طرف لکھنؤ میں نظر آتے ہیں اُن کی ذات سے لکھنؤ دہلی ہو گیا اور اُردو زبان کا مرکز قرار پایا۔

دہلی کی تقلید تو زبان کے بارے میں اطراف پنجاب میں ہونے لگی یہ خدمت شعرا کے متعلق تھی۔ اُستاد اپنے شاگردوں کو اصول زبان، محاورات روزمرّہ، اصطلاحات کی تعلیم دیتے تھے۔ شاگرد اپنے اُستاد کی تقلید سے قدم باہر نہ رکھتے تھے۔

لکھنؤ کی تقلید میں ہندوستان کا طبقۂ اعظم تھا پورب، اُتر، دکھن میں اکثر مقلد لکھنؤ کے شاعر زبان کے سکھانے پر مامور تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے استاد کی تقلید میں متروکات سے پرہیز کرتا تھا۔ ہر ایک استاد نے اپنے خاص متروکات قائم کئے تھے۔ اس تقلید سے یہ فائدہ تھا کہ تمام ہندوستان میں ایک ہی زبان پھیل رہی تھی اور تمام محاورات قید ضبط میں آ گئے تھے۔

کچھ دنوں سے لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ شاعری ذہنی ہے۔ شاعر سکھانے سے شاعر نہیں بنتا اور شاعر کو اُستاد کی ضرورت نہیں۔ اس خیال نے فن شعر کی تو جو کچھ مٹی پلید کرنا تھی کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زبان کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔ لوگ غلط

محاورے نظم کرنے لگے ۔ کوئی کچھ بولنے لگا کوئی کچھ ۔ ہندوستان کے خمیر میں یہ بات ہے کہ یہاں کے لوگ زبان کے قیود کے متحمل نہیں ہوتے اور اپنے مرکز سے ہٹ جاتے ہیں ۔ اس لئے ان کی زبانیں ہر ہر شہر ہر ہر قصبے کی جداگانہ ہو جاتی ہیں چنانچہ حال کی مردم شماری میں ہندوستان کی زبانیں تخمیناً تین سو لکھوائی گئیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی جہالت کا ثمرہ ہے جسے وہ بھگت رہی ہیں

اردو زبان کی جو خدمت اگلے بادشاہوں نے ، اگلے شعرا اور گورنمنٹ نے کی ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اردو بہت جلد ایک علمی زبان بن جائے اور اس کے متروکات زبان سے خارج ہو جائیں ۔ لیکن حال میں ایک بہت بڑا نقص یہ واقع ہوا ہے کہ حال کے شعرا بغیر تحقیق محاورہ اپنی طبیعت سے خلاف فصحا ایک اصطلاح قائم کر کے نظم و نثر میں لکھ جاتے ہیں ۔ جس کی مغائرت اور غرابت اس بات کی مقتضی ہے کہ انکی ہزبان تھوڑے زمانے کے بعد ایک جداگانہ زبان بنجائے گی ۔ جو مخصوص انہیں کے شہر میں بولی جاتی ہو گی اور جس کو دوسرے شہر کا آدمی سمجھنے اور بولنے سے قاصر ہو گا ۔ اور اسی طرح ہر شہر کیلئے نئے محاورے اور نئی زبان ہو گی اور ایک آدمی دوسرے آدمی کی بولی نہ سمجھے گا ۔

اس ضرورت نے مجھے مجبور کیا کہ شعرا کو "جن کی زبان مستند ہوتی ہے" ایک مرکز کی تقلید پر آمادہ کروں اور اس نامعلوم غلطی سے جو اُن کی زبان میں پیدا ہو رہی ہے ، آگاہ کروں ۔ کیونکہ جب تک زبان کا ایک مرکز نہ ہو گا زبان ہرگز ایک نہ ہو گی ۔ جس محاورے کو شعراء بزعم خود لکھنؤ اور دہلی کی زبان سمجھ کر نظم کر جاتے ہیں اور وہ محاورے ٹکسال باہر ہیں اُن کا اظہار نہ کیا جاتے تو بھی چھوٹی چھوٹی فردگذاشت ایک وقت میں زبان کو بہت

نقصان پہنچائے گی۔ لہٰذا ہم فی الحال محاورات کی غلطی کو مع مثال سمجھاتے ہیں ع

دہانِ زخم نے پانی چُرا کے چر کے لئے

چر کے لینا محاورہ نہیں ہے۔ چر کے کھانا بولتے ہیں ؎

شاد پینسٹھ برس اس عمر کے گزرے آخر　　طرز یارانِ حقیقت نہ فراموش رہا

ایسے محل پر فراموش رہنا بولنا خلاف محاورہ ہے۔ فراموش ہوا بولنا چاہیئے۔ ع

بس اب ان کے ہاتھوں ہی عزت ہماری

ہاتھ جب قابو اور اختیار کے معنی پر مستعمل ہوتا ہے تو مفرد بولتے ہیں۔ جیسے تمہارے ہاتھ آبرو ہے۔

داغ ۔ داورِ حشر ترے ہاتھ ہے عزت میری۔

میر نفیس ۔ عزت مری بہنوں کی ترے ہاتھ ہے یارب۔

دبیر ۔ پروردگار شرم مری تیرے ہاتھ ہے۔

امانت ۔ عزت مری ہے عشق بتاں میں خدا کے ہاتھ۔

میر ۔ اٹھنا ہمارا خاک سے اب ہے خدا کے ہاتھ۔

امیر ۔ آئندہ آن بان ہے اپنی خدا کے ہاتھ۔

اور جب سبب اور وسیلے کے معنی پر مستعمل ہوتا ہے تو جمع بولتے ہیں۔ جیسے محلّے والوں کے ہاتھوں ناک میں دم ہے **مصحفی**

مبتلا ہم رہے نشار رہے　　دل کے ہاتھوں ذلیل و خوار رہے

نالہ و شور و فغاں بلبل کے لب پر رکھدیا　　چپکے چپکے مسکرانا گل کے اندر رکھ دیا

مسکرانا رکھدینا محاورہ نہیں۔ مسکرانا سکھا دینا، مسکرانا بتا دینا بولتے ہیں۔

غنچے تجھے تیری دلفگاری کی قسم ۔۔۔ بلبل تجھے تیری آہ وزاری کی قسم

کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی ۔۔۔ بیتاب ہے دل جناب باری کی قسم

اس میں "تجھے تیری" ترکیب غلط ہے۔ اس لئے کہ دونوں ضمیریں ایک طرح کی ایک ساتھ بولنا غیر فصیح ہے۔ ایسے موقعے پر "تجھے اپنی" بولنا چاہئے۔ (باقی آیندہ)

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت سکریٹری انجمن اصلاح

اُردو آموز کتب

سرمایۂ زبان اُردو قیمت ۳؎ منتخب القواعد مصنفہ جلال لکھنوی قیمت ۴؎ اُردو زباندانی (اُردو صرف ونحو کے اصول وکلیات) قیمت ۴؎ اصلاح زبان اُردو متروکہ الفاظ کا بیان قیمت ۴؎ مضمون ہائے دلکش دیوان جلال قیمت عہ نظم نگارین دیوان جلال قیمت عہ مقیاس الاشعار عروض وقافیہ کی جامع مستند کتاب مصنفہ مرزا اوج لکھنوی قیمت عہ بدر کمال۔ دیوان کمال قیمت ۱۲؎ قواعد تاریخ گوئی مصنفہ جلال لکھنوی قیمت ۴؎ نظم رنگین دیوان کمال قیمت ۴؎ ردّ موازنہ انیس ودبیر تردید خیالات علامہ شبلی قیمت ۴؎ دیوان طاہر قیمت عہ دیوان نسیم قیمت ۱۲؎ بہار ہند لغت مصطلحات اُردو قیمت عہ

سرقہ ۔ توارد ۔ ترجمہ

اس عنوان کے تحت میں حضرت یاس لکھنوی نے ایک بیش بہا مضمون "مخزن" میں شائع کرایا ہے جس کی نقل ہم درج ذیل کرتے ہیں ۔ اس قسم کے مضامین کی از بس ضرورت ہے ۔ اور جہاں کہیں ملیں غور کے ساتھ پڑھے جائیں اور احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھے جائیں بشرطیکہ مضمون نگار بھی اس پایہ کے ہوں جیسے حضرت عشرت اور حضرت یاس ہیں ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے ۔ ایسے موقعوں پر ہمارا عمل ہے کہ "جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو" مگر اسی حد تک کہ مال مسروقہ نہ کہلائے (ایڈیٹر)

سلمان ساوجی

به گلم پائے فرو رفته چندانکه زغم
می زدم دست بسر پائے فروتری شد

فیضی

ما دست زغم نهاده بر سر
غم پائے فشرده در گل ما

استاذ الاساتذہ حضرت سلمان ساوجی نے اس شعر میں جس خیال کو نظم فرمایا ہے اساتذہ عجم میں سے کسی نے اس خیال کو اس انداز خاص سے ادا نہیں کیا ۔ علامہ فیضی نے اسی خیال کو نظم کیا ۔ مگر وہ زور پیدا نہ ہو سکا ۔ جو سلمان ساوجی کے شعر "می زدم دست بسر" الخ پائے فروتری شد) سے پیدا ہو گیا ہے ۔ اہل نظر سے مخفی نہیں ۔ کہ سلمان ساوجی کے شعر میں جو خیال قلم بند کیا گیا ہے ۔ وہ گہری فکر کا نتیجہ ہے ۔ کوئی سطحی خیال نہیں ہے بہ آسانی ذہن میں منتقل ہو سکے ۔ اس مقام خاص پر توارد کا گمان نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ یہی کہا جائے گا ۔ کہ فیضی نے سلمان ساوجی کے مضمون کو بجنسہ اپنے شعر میں نظم کرنے کی

کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ یہی مضمون اگر چست بندش کے ساتھ نظم ہوتا تو فیضی پر سرقہ کا الزام نہ آتا۔ مگر چونکہ فیضی کے شعر کی بندش اصل شعر سے بھی سست ہو گئی لہذا سرقہ کا حکم جاری ہوگا۔ اگرچہ علامہ فیضی بہ اعتبار علم و فضل کسی سے کم نہیں۔ مگر یہ علم و فضل اس موقعہ خاص پر الزام سرقہ سے بری نہیں کر سکتا۔ خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مرحوم اس دور آخری میں بہت اچھے فارسی داں۔ اور فارسی گو شاعر تھے۔ انکا یہ مطلع مشہور ہے۔ ؎

خواجہ عزیز۔ دہد حق عشق احمد بندگانِ چیدۂ خود را
بخاصاں شاہ می بخشد مے نوشیدۂ خود را

مگر اس مطلع کا ماخذ شفیعائے اثر کا یہ شعر ہے ؎

اثر شیرازی دوستاں را کسوتِ تجرید می پوشد خدا
شاہ می بخشد بخاصاں طلعتِ پوشیدہ را

خواجہ عزیز نے اپنے شعر کی بُنیاد یقیناً شفیعائے اثر کے شعر پر رکھی ہے۔ انداز بیان وہی ہے۔ مگر اک جداگانہ بات کہی ہے "خلعتِ پوشیدہ" کے مقابل "مے نوشیدہ" سے فی الجملہ تازگی سی پیدا ہو گئی ہے۔ اور بندش بھی چست ہے۔ لہذا خواجہ صاحب کے شعر پر سرقہ کا الزام نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خواجہ عزیز صاحب کا شعر خاص اُنہیں کی جدت تخیل کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اسکے فیضی نے سلمان ساوجی کے ہی خیال کو نظم کرنا چاہا۔ مگر نہ بندش چست ہو سکی۔ نہ خیال میں کوئی تازگی پیدا ہو سکی۔

(عرفی) مرا بر سادہ لوحی ہائے عرفی خندہ می آید
کہ دارد چشم لطف از دلبر نامہربانِ من

(فطرت) مرا بر سادہ لوحی ہائے فطرت خندہ می آید
که عاشق گشته وچشم وفا از یار ہم دارد

مضمون دونوں کا واحد ہے۔ بلکہ مصرع اولی میں لفظ بلفظ توارد ہو گیا ہے۔ مگر یہاں سرقہ کا حکم جاری نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ان دونوں اشعار میں جو خیال قلم بند کیا گیا ہے۔ وہ کوئی گہرے تخیل کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ روزمرہ کے مشاہدہ کی بات ہر ادنیٰ اعلیٰ جاہل فاضل ہر شخص اسکا تجربہ رکھتا ہے۔ یہ خیال خاص و عام کے ذہن میں مشترکہ طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایسے اشعار جن میں کوئی امر کثیر الوقوع قلمبند کیا گیا ہو۔ وہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں۔ نہ ایسے اشعار پر سرقہ کا حکم جاری ہو سکتا ہے۔ بلکہ توارد کہا جائیگا۔ دُنیا میں رنج و غم راحت و مسرّت ہر شخص پر یکساں اثر ڈالتے ہیں۔ ان تمام واقعات سے متاثر ہو کر انسانی جذبات میں جو تلاطم ہوتا ہے وہ قریب قریب مشابہت و مماثلت رکھتا ہے۔ ایسی حالتوں میں منہ سے بے ساختہ الفاظ جو اکثر نکل جاتے ہیں وہ بھی قریب قریب یکساں ہوتے ہیں۔ یہی کیفیتیں جب بے تکلف قید نظم میں آجاتی ہیں تو وہ بھی قریب قریب یکساں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایسے مضامین میں توارد کوئی غیر متوقع امر نہیں۔ بلکہ لازمی ہے۔ ہاں شاعر جس مقام پر اپنی قوت تخیل کی نیرنگیاں اور طرز استدلال کی جدتیں دکھاتا ہے۔ وہاں کسی کا وہم و خیال بھی نہیں جا سکتا اس تقریر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ توارد اسی جگہ ممکن بلکہ لازمی ہے۔ جہاں روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے نہایت سیدھے سادے الفاظ میں بے تکلف نظم کئے گئے ہوں اور جہاں قوت تخیل اور شاعرانہ استدلال کو دخل ہوتا ہے وہاں توارد ایک غیر متوقع امر ہے۔ الا۔ ماشاء اللہ۔ اگر اس مقام آخر الذکر پر توارد واقع ہو۔ تو اُسے توارد نہیں

کہتے - بلکہ سرقہ کہتے ہیں ؎

(میر سنجر) دم واپسیں زلیخا بہ ہمیں ترانہ تن زد
کہ بہ جذبہ محبت پسر از پدر گرفتم

(نقی) چہ غم از فریب دشمن کہ محبت زلیخا
بکشاکش نہانی پسر از پدر برآرد

دونوں جگہ مصرع ثانی کا مضمون واحد ہے مگر سرقہ کا الزام نہیں آسکتا - کیونکہ حضرت یوسف کے واقعہ سے ذہن اس نتیجہ پر بہت جلد پہنچ جاتا ہے - کوئی گہری تخیل نہیں ہے سامنے کی بات ہے - ایسے مقام پر توارد ہونا جائے عجب نہیں - ناظم ہروی معراج کے ذکر میں کہتا ہے ؎

چناں بگذشت زیں سقف شفاف کہ سیلاب نگہ از عینک صاف

طاہر وحید کہتا ہے ؎

زچشم مہ سوے بالا سفر کرد چو نور دیدہ از عینک گزر کرد

جناب رسالتمآب کا شب معراج میں عالم بالا کو صعود کرنا - اس کے لئے جو تشبیہ پیدا کی گئی ہے (جیسے نظر کا عینک سے گذر جانا) اگرچہ نازک ہے - مگر ایسی نازک نہیں کہ معمولی ذہن کی رسائی نہ ہوسکے - اسی طرح توارد کی ہزاروں مثالیں شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں - کیونکہ پیش پا افتادہ مضامین خاص و عام کے ذہن میں مشترک اور موجود ہوتے ہیں - یا ذرا سی توجہ کے بعد ذہن اُن کی طرف منتقل ہوسکتا ہے ایسے مقام پر توارد کے سوا سرقہ کا احتمال نہیں ہوسکتا - سرقہ کا الزام جبھی لگایا جاسکتا ہے - کہ کوئی اچھوتا مضمون بجنسہٖ دو شاعروں نے نظم کر دیا ہو - کلیم ہمدانی پر بعض

لوگوں نے سرقہ کا الزام رکھا۔ اس کے جواب میں اُسنے یہ قطعہ کہا ؎

منم کلیم بہ طُورِ بلندی ہمت | کہ استفادہ معنی جز از خدا نکنم
بخوان فیض الہی چو دسترس دارم | نظر بکاسۂ دریوزۂ گدا نکنم
ولے علاج تواردمی توانم کرد | مگر زباں بہ سخن گفتن آشنا نکنم

خاقانی کہتا ہے ؎

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت | خاقانی را دگر شب آمد

میر حسن دہلوی کہتے ہیں ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ | اب آج کی شب بھی سو چکے ہم

میر حسن نے خاقانی کے شعر کا بہت خوب ترجمہ کیا۔ اگر ترجمہ کا حق ادا ہو جائے۔ تو شاعر مستحق داد ہے۔ اگر نقش ثانی نقش اول سے بہتر نہ ہو تو کم از کم برابر تو ہو۔

(باقی آیندہ)

ہمارا محکمۂ احتساب

معزز ڈاکٹر اقبال صاحب ہمارے ادبی نقاد کی عینک سے

فقیر کا ارادہ موجودہ اشاعت میں اس عنوان کی تحت میں کوئی مضمون دینے کا نہیں تھا مگر حسن اتفاق سے "مخزن" کی اشاعت اکتوبر میں "بچوں کی تعلیم و تربیت" کے عنوان سے ڈاکٹر اقبال صاحب کا مضمون نظر سے گذرا جوان سطور کا محرک ہوا۔ معزز ڈاکٹر اقبال صاحب کو اُن مصنفین کی فہرست میں داخل کر کے اُن کے مضمون

کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر رہا ہوں جن کی تصریح رسالہ کے اکتوبر نمبر میں اس عنوان کی تحت میں عرض کر چکا ہوں ۔ برعکس اس کے میں معزز ڈاکٹر صاحب کی بڑی عزت کرتا ہوں اور اُن کے مضمون کے متعلق اظہار خیالات سے میرا منشا محض اسی قدر ہے کہ جہاں جہاں جن جن امور میں اُن سے اختلاف کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ان نکات پر معزز ڈاکٹر صاحب غور فرمائیں تاکہ اس غور و خوض سے اُس نقطہ سے آگے جا سکیں جہاں کہ وہ آج سے پہلے پہنچ چکے ہیں ترقی کی راہ مسدود نہ رہے ۔ نقاد اہل فن کا بہترین دوست ہے اگر وہ اپنی خدمت دیانت اور ایمانداری سے انجام دے اور رشک و حسد بغض و عناد نفسانیت اور بے انصافی کے لوث سے اپنا دامن پاک رکھے ۔ اور انشاء اللہ عاجز کے معروضات بھی ہمیشہ ان آلائشوں سے پاک رہیں گے ۔

اسمیں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ معزز ڈاکٹر صاحب کا مضمون بڑے اعلیٰ پیمانہ کا ہے ۔ بہت چھان بین اور بڑے غور و مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے ۔ جیسا کہ ہمیشہ ہونا چاہئے ۔ یورپ اور امریکہ میں کوئی مضمون نگار کسی مضمون پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا جب تک اُس مضمون پر اچھی طرح مطالعہ اور غور و خوض کر کے اپنے کو تیار نہ کرے ۔ اسی وجہ سے وہاں عام قاعدہ ہے کہ ہر معرکہ کا مضمون کسی بڑے کتبخانے میں بیٹھ کر لکھا جاتا ہے جہاں ضرورت کے وقت ہر قسم ہر فن ہر مذاق کی کتاب سے آسانی کے ساتھ مدد مل سکے ۔ مگر وہاں کی اخباری دُنیا ہماری اخباری دُنیا سے کیسی کچھ مختلف ہے ! میرا مطلب خاص کر اُردو اخباری دنیا سے ہے ۔ اس اختلاف کا سارا راز اس ایک سادہ فقرہ کے اندر مخفی ہے "یہاں

علم کی قدر ہے۔ ہماری اُردو خواں پبلک نے ابھی علم کی قدر کرنا نہیں سیکھا ہے۔

معزز ڈاکٹر صاحب نے اپنا مضمون چند ذیلی عنوانات پر تقسیم کر کے لکھا ہے۔ ہمارے مضمون نگاروں کو اس سے ایک سبق لینا چاہئے۔ ذیلی عنوانات پر تقسیم کرتے وقت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ مضمون کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں سب کے سب عنوانات کے اندر آ گئے یا نہیں ہر ہر پہلو کے مختلف شعبوں اور شاخوں کو اسی طرح ایک غائر نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس کے بعد ہر عنوان ایک ایک کر کے اُٹھانا چاہئے۔ اور ہر طرح غوص کر کے دیکھ لینا چاہئے کہ اس عنوان یا شعبہ عنوان کے تحت میں جو جو پہلو نکلتے تھے سب پر روشنی پڑ گئی۔ اور پڑی تو کافی روشنی ہے۔ یا تا کافی یعنی کوئی نکتہ کوئی بات کسی پہلو میں چھوٹ تو نہیں رہی جسے ایک ذہین اور ذکی شخص ضرور دیکھ لیتا مگر جہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچ سکی۔ عجلت ایسے کاموں کی جانی دشمن ہے۔ عجلت کو قریب نہ آنے دینا چاہئے۔ اگر ہمارے ذہین اور لایق مضمون نگار یہ طرز عمل اختیار کریں گے تو اُن کی یہی مضمون نگاری اُن کی درس گاہ بنیگی جہاں اپنے مشق عروج کمال پر پہنچا لینے کے بعد وہ نہ صرف اعلیٰ پایہ کے ادیب یا موقر اخبار نویس بن سکیں گے۔ بلکہ اگر علم و فضل میں بھی اسی کے ساتھ ترقی کرتے جائیں گے اور درس اور مطالعہ کی عادت کو ترقی دیتے جائیں گے تو سالہا سال کی مشاقی اور پختہ مغزی کے بعد اُن کا ایک قابل رشک مؤلف یا مصنف بن جانا بھی بعید از قیاس یا بعید از امکان نہ ہوسکیگا۔

معزز ڈاکٹر صاحب بالکل بجا و درست فرماتے ہیں کہ "قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے اگر طریق تعلیم علمی یعنے (SCIENTIFIC) اصولوں پر مبنیٰ ہو۔ اور اس فقرہ کا ہر ہر لفظ صداقت سے سرشار ہے۔ علیٰ ہٰذا

اس فقرہ کے بعد کے فقرات میں بھی بہت ہی صحیح رائے ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ بچّوں کی تعلیم اس طریق پر ہونا چاہئے کہ وہ بنی نوع انسان سے محبت رکھنا سیکھیں۔ یہاں معافی کے ساتھ اتنا عرض کر دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ بنی نوع انسان سے محبت کا سبق ہمارے بچّوں کے لئے کوئی نیا سبق نہیں ہے۔ وہ تو حضرت سعدی کے زمانہ سے ہماری پشتہا پشت کے بچے از بر کرتے چلے آتے ہیں اور ہمارے بچے بھی اسے بھول نہیں سکتے کیسے یاد نہ ہوگا کہ

بنی آدم اعضائے یک دیگر ند — کہ از آفرینش زیک جوہر ند

چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضو ہا را نماند قرار

یہ تو بہت ہی پُرانا اور فرسودہ سبق تھا۔ مگر افسوس اس نے ہمیں کوئی اہم فائدہ نہ پہونچایا۔ فارسی معلم (سعدی) سے اتنی ہی غلطی ہوئی کہ جو سبق اس سبق سے بھی پہلے انہیں پڑھانا چاہئے تھا اُس کا اُنھوں نے نام تک نہ لیا جیسا کہ بدقسمتی سے اس مضمون میں بھی ہوا ہے۔ ہمارے بچّوں کا سب سے پہلا سبق یہ ہونا چاہئے کہ تم ایک زندہ قوم کے ایک جیتے جاگتے عضو ہو۔ اور تمہارے فرائض نہایت ہی نازک اور اہم ہیں۔ اگر تم اُن کا قرار واقعی احساس پیدا کر کے قومی درد کا اپنی قوت کے موافق علاج تلاش نہیں کرتے ہو تو نہ تمہاری ہی خیریت نظر آتی ہے اور نہ قوم ہی کی! ہمارے بچّوں کی ابتدائی تعلیم میں ایسا سبق نہ داخل ہونا ایک ایسی سخت ایسی فاش اور ایسی ناقابل معافی غلطی ہے کہ جس کا حد و حساب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے جب بڑھ کر جوان ہوتے ہیں تو محض اُن کے کان ہی کان تو "قوم" کے لفظ سے آشنا ہو جاتے ہیں مگر دل "قوم" کی لذت سے ناآشنا اور ابدالآباد تک کے لئے محروم ہی رہجاتا ہے

کیا یہ خامی ہماری قومی ہستی کے لئے ایک خطرۂ عظیم نہیں ہے؟ اس کے بعد بچوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو عملی نکات معزز ڈاکٹر صاحب نے پیش کئے ہیں ہر طرح قابل داد ہیں۔ اور ان نکات کا ہر ہر لفظ بول رہا ہے کہ کتنی غور وفکر اور مطالعہ کے بعد یہ سادہ مگر معنی خیز ضوابط قائم کئے گئے ہیں۔ یورپ کے مستند اساتذہ کے خرمن سے خوشہ چینی کرنا یہاں داخل عیب نہیں ہے بلکہ داخل ہنر ہے۔ اور بچپن کی اوائل نشو ونما کے متعلق جتنے پہلو ان مستند اساتذہ کی تصانیف سے اخذ کئے گئے ہیں یقینی درست وراست ہیں۔ اینٹوں سے گھر بنانا یورپین بچوں کا ایک کارآمد مشغلہ مدتوں سے ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ اور ایسے ہی اور کارآمد مشاغل بچوں کے فطرتی نشو ونما میں معین بنانے اور اسی کے ساتھ انہیں ایک معنی خیز مشغلہ میں مصروف رکھنے کے لئے ہمارے ملک میں بھی کیوں نہ رائج کر دیئے جائیں۔ اسی طرح استاد کا ایک زندہ اور قابل تقلید مثال بنکر اپنے شاگردوں کے سامنے آنا مستند یورپین اساتذہ نے ایک نہیں ہزار بار نہایت ہی ضروری بتایا ہے اور حد درجہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ جب تک بچہ میں اچھی طرح سمجھ نہ آجائے اللہ پاک کی ہستی اس کے پیش نظر نہ کیجاتے چھوٹے بچے کبھی ایسے نکات کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھ سکتے۔ اور جب تک انکے دماغی قوائے کافی طور پر نشو ونما نہ پالیں ان کے سامنے ایسی بات پیش کرنا جس کے سمجھنے کی ان میں قابلیت ہی نہیں ہو نہ صرف بے سود ہی ہے بلکہ کیا عجب ہے کہ انہیں خلجان میں ڈالے یا ان کے قوائے ذہنی اور دماغی پر قبل از وقت زور ڈالنے کی وجہ سے ان کے لئے مضرت رساں ثابت ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اعتراض بالکل انکا اپنا اعتراض ہے اور کسی مستند مصنف کے خیال کا اردو ترجمہ نہیں ہے۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ میرا مقصد ایک مکمل ریویو یا تنقید لکھنا نہیں تھا محض اظہار خیال میرا منشاء تھا۔ اب اس کے بعد بعض بعض موقعہ پر زبان کے متعلق کچھ شبہات ہیں۔ معذرت کے ساتھ انہیں بھی پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

مضمون کی پہلی سطر میں معزز ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"پڑھے ہوئے شاگرد کو پڑھانا ایک آسان کام ہے۔ مگر انجان بچوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے وغیرہ وغیرہ"

اس عبارت کے پڑھنے سے شک ہوتا ہے کہ شاید لفظ "انجان" سے معزز ڈاکٹر صاحب کا مقصد "بے پڑھے بچوں" سے ہے اس وجہ سے کہ اس کے مقابلہ میں، "پڑھے ہوئے" کے الفاظ پہلے لائے جا چکے ہیں۔ مگر زبان اردو میں اوّل تو "انجان" کا لفظ ہی آجکل متروکات میں داخل ہو چلا ہے اور بہت ہی شاذ استعمال میں آتا ہے دوسرے "انجان" بچوں سے زبان اردو میں وہ بچے مقصود سمجھے جائیں گے جن سے متکلم ناواقف ہے یا جنھیں وہ نجانتا ہے اور نہ پہچانتا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا مقصد اس لفظ سے یہ معنی ظاہر کرنے کا نہیں ہے۔ اور صاف نہیں ہے۔

اسی صفحہ کے وسط میں "عملی طبیعت کے آدمی" لکھا گیا ہے۔ انگریزی داں طبقہ تو ضرور سمجھ لیگا کہ یہ الفاظ (PRACTICAL MEN.) کا ترجمہ ہیں۔ مگر جو لوگ انگریزی نہیں جانتے ہیں غالبًا وہ نہ سمجھ سکیں گے کہ عملی آدمی کیسے ہوتے ہیں اور فعلی آدمی کیسے۔

اسی صفحہ اوّل کے آخری حصہ میں آپ فرماتے ہیں کہ "تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کر وغیرہ وغیرہ" یہاں

یہ امر قابلِ گذارش نظر آتا ہے کہ اُردو زبان میں لفظ "دنیوی" لفظ "دینی" کا مترادف سمجھا گیا ہے اور یہاں پر اس وجہ سے "دنیوی زندگی" "دینی زندگی کی ضد سمجھی جائے گی۔ حالانکہ یہ مطلب ادا کرنا مقصود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں بجائے "دنیوی زندگی" کے "دنیاوی زندگی" اگر کہا جاتا تو مطلب صاف ظاہر ہو جاتا۔ اب صفحہ کو اُلٹ کر دوسرے صفحہ پر آتے ہیں جو رسالہ کا صفحہ ۱۴ ہے۔ یہاں تیسری سطر میں اس عبارت پر نظر رکتی ہے "اُن کو دیانت داری اور صلحکاری کے ساتھ زندگی بسر کرنیکا سبق دیویں" یہاں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "صلحکاری" اُردو زبان کے لئے ایک نیا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ اور "دیویں" تو برعکس اس کے بہت پُرانا لفظ ہے۔ اور اتنا پُرانا کہ کرم خوردہ سمجھ کر یک قلم متروک کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی آخری جائے پناہ کچہری دربار کے دفتروں میں بعض پُرانی چال کے لالہ لوگوں کا بستہ باقی ہے۔ پانچویں سطر میں یہ عبارت ملتی ہے "تاکہ اُس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینے سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دُور کر کے وغیرہ" زمانہ حال کے اہلِ زبان یوں لکھنا بہتر سمجھتے ہیں "اور توہمات کا زنگ دُور کر کے" اسیطرح وسط صفحہ میں "مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں" کے بجائے "آسمان کا دامن چھوتے ہیں" زیادہ فصیح اور بامحاورہ سمجھا جاتا ہے۔

اس سطر کے بعد کی چوتھی سطر میں یہ عبارت نظر سے گذری "جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور عملی اصول کو مدنظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں"۔ اس فقرہ کے پہلے حصہ میں فصاحت کا تقاضہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تربیت کے ... اصول کو" کی جگہ پر صرف "تربیت

کا صحیح اور علمی اصول مدنظر نہیں رکھتے" کہا جاتا - دوسرے حصّہ میں "حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں" کے معنی اُردو زبان میں یہ ہوں گے کہ وہ لوگ بچّوں کے حق غصب کرکے اُس حق پر خود متصرف ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مضمون نگار صاحب کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ اس کے بعد اس صفحہ کا سب سے آخری پیراگراف (معاف کیجئےگا اس کے لئے اُردو لفظ اسوقت ذہن میں نہیں آتا) آتا ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "اس مضمون کی تحریر سے ہماری یہ غرض ہے" یہاں پر الفاظ کی ترکیب سے تحریر کے معنی یا تو "کتابت" کے ہو سکتے ہیں یا "سیاق عبارت" کے مگر مضمون نگار صاحب کا مقصد صاف ان دونوں میں سے ایک سے بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہوتا کہ "اس مضمون سے ہماری یہ غرض ہے" اب دوسرا صفحہ شروع کرتے ہیں یعنی رسالہ کا صفحہ ۱۵ یہاں وسط صفحہ پر یہ فقرہ نظر آتا ہے "دیکھئے بلّی کا بچّہ کیا مزے سے خود بخود کھیلتا ہے۔ چھوٹے کتّے کو کھول دو تو اضطراری حرکت کی خوشی میں پھولا نہیں سماتا" یہاں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ اول تو "کیا مزے سے کھیلتا ہے" گھر کی گفتگو میں کوئی بولے تو البتہ بول جائے مگر لکھنے پڑھنے کی زبان میں "کس مزے سے یا کیسے مزے سے" کہتے ہیں۔ اس کے بعد "بلی کے بچے" کے تذکرے کے بعد "چھوٹے کتّے" کا لفظ صاف بول رہا ہے کہ لائق مضمون نگار صاحب کا مقصد کتے کے پلّے یا کتّے کے بچے سے ہے۔ مگر اردو زبان میں چھوٹے کتّے کے کے معنی کتّے کے پلّے کے نہ ہیں اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔ بڑا کتا اور چھوٹا کتا جب بولا جائیگا تو اس کے معنی ہوں گے بڑے قد والا یا چھوٹے قد والا کتا نہ کہ کتّے کا پلّا اسیطرح "پھولا نہیں سماتا" کے بجائے "پھولے نہیں سماتا" ہونا چاہئے۔

اس کے بعد دوسرے پیراگراف میں ایک ایسی تعجب خیز غلطی ملتی ہے جسے دیکھ کر ازحد حیرت ہوتی ہے یہ پیراگراف الفاظ "بین صاحب" سے شروع ہوتا ہے۔ مگر "بین صاحب" کوئی ایسے ویسے غیر موصوف آدمی نہیں ہیں "جو بین صاحب" لکھے جاسکیں۔ بین (BAIN.) ایک نہایت ہی مستند اور مشہور زمانہ صاحب فن ہیں۔ اُن کے نام کے بعد "صاحب" کیسا؟ حیرت اور استعجاب کی بات یہ ہے کہ جو غلطی ہوئی ہے وہ انگریزی زبان کے قواعد کی رو سے بھی غلطی ہے اور اُردو اور فارسی زبان کے قواعد سے بھی غلطی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی فاش غلطی کیونکر ہوگئی۔ عام قاعدہ ہے کہ مستند مصنفین کے نام کے ساتھ نہ اُردو یا فارسی میں صاحب کا لفظ آتا ہے اور نہ انگریزی زبان میں مسٹر یا اسکوائر کا۔ مثلاً نہ کوئی شخص ٹینین۔ ملٹن۔ اور شیکسپیر کو مسٹر ٹینیسن۔ مسٹر ملٹن۔ یا مسٹر شیکسپیر کہہ سکتا ہے اور نہ سعدی، عرفی۔ ظہوری۔ خاقانی یا داغ اور امیر کو سعدی صاحب عرفی صاحب خاقانی صاحب داغ صاحب یا امیر صاحب کہہ سکتا ہے۔ ایسی غلطی پر سخت تعجب ہے!

اس کے بعد صفحہ ۱۹ پر "مثلاً اینٹوں کے گھر بنانا۔ لڑی میں منکے پرونا" سامنے آیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ "منکے پرونا" والی لغت سینے آج پہلے بار سُنی ہے اور خاک بھی میری سمجھ میں نہ آئی۔ اسی صفحہ پر آخری پیراگراف سے پہلے کی سطر میں یہ عبارت ملی "یہ بھی لازم ہے کہ ہر سبق میں ایک خاص مشترک بات ہو تا کہ ایک خاص مقام پر توجہ لگانے کی عادت بھی ترقی کرتی جائے" اول تو "ایک خاص مقام" کی عبارت کے خدا جانے کیا معنی ہوجائیں گے۔ دوسرے ہماری زبان میں "توجہ لگانا" کوئی محاورہ نہیں ہے۔ ہمارے اہل زبان توجہ کرنا یا توجہ مبذول کرنا۔ یا توجہ صرف کرنا وغیرہ بولتے ہیں۔ اس کے

بعد صفحہ ۱۷ آتا ہے۔

یہاں دوسری اور تیسری سطر میں یہ عبارت ملتی ہے "معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے میاں اب چپ ہونے میں ہی نہیں آئیں گے۔" اوّل تو یہاں "میں" کا لفظ بالکل زاید ہے۔ دوسرے "چپ ہونے ہی نہ آئیں گے۔" زبانی گفتگو (COLLOQUIAL URDU) کا فقرہ ہے۔ تحریر میں یوں کہیں گے "چپ ہی نہ ہوں گے۔" یا "چپ ہونے کا نام ہی نہ لیں گے" وغیرہ۔ اسی طرح ہنسی ہی نکل جاتی ہے" بے محاورہ ہے۔ پھر اسی صفحہ میں نمبر (۴) کے ساتھ ذیلی عنوان کے اندر یہ عبارت ہے "بچہ کی توجہ صورت سے زیادہ رنگ شئے کی طرف لگتی ہے" اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے "توجہ لگنا" کوئی محاورہ نہیں ہے۔ اس عبارت کے بعد کی دوسری سطر میں "کسی اوّلی درجہ کے مصور کی بنائی ہوئی تصویر" فرمایا گیا ہے جس سے مقصد "کسی ادنیٰ درجہ کے مصور" سے معلوم ہوتا ہے اور اسی عنوان کی تحت میں آخری سطر سے ایک سطر اوپر "مربع۔ تکون وغیرہ" لکھا گیا ہے "تکون" کے جگہ پر اہل زبان مثلث بولتے ہیں اور عوام الناس کی زبان میں "تکون" کی جگہ پر "تکونا" اکثر سنا گیا ہے۔

اسی صفحہ پر سب سے اخیر سطر سے ایک سطر اوپر تحریر ہے "سودا سلف بیچتا ہے۔ کبھی پھر پھر کر اونچی آواز دیتا ہے۔" "اونچی دوکان اور پھیکا پکوان" تو البتہ سنا گیا ہے۔ مگر "اونچی آواز دینا" کبھی نہیں سنا گیا ہے۔

صفحہ ۱۹ پر جس میں عنوان (۹) یوں شروع ہوتا ہے "بچہ سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی علم اور تجربہ سے بڑھتی ہے۔" "فہمید" کے لفظ نے فقرہ کو لالہ ساہی اردو کا اچھا خاصہ نمونہ بنا دیا۔ یہاں تک تو سمجھ میں آ گیا۔ مگر "ابھی" کے یہاں کیا معنی ہوں گے یہ بات

ابھی تک سمجھ میں نہ آئی۔ الفاظ کی ترکیب تو یہی معنی پیدا کرتی نظر آتی ہے کہ "ابھی اسیدم پڑھی جاتی ہے"۔

صفحہ ۲۰ پر ذیل کی عبارت نظر سے گذری "اور صفات شے کا اس شے سے علیحدہ تصور کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا اس قسم کا علم دینا ممکن ہے کہ بعض وجوہات سے اچھا ہوا ہو۔ علمی اصولوں کی رو سے بچے کے حافظہ پر ایک بیجا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں ہے"۔ یہاں یہ امر قابل گذارش معلوم ہوتا ہے کہ "بعض وجوہات سے اچھا ہوا ہو" کی جگہ پر "اگر اچھا ثابت ہوا ہو" کہا جائے تو مطلب بہت صاف ہو جاتے۔ ہمارے خیال میں یہ غلطی کاتب کی معلوم ہوتی ہے جو نقل اُتارتے وقت "ثابت" کا لفظ نقل کرنا بھول گیا ہے۔ اسی طرح "علم دینا" بے محاورہ ہے۔ تعلیم دینا یا علم سکھانا بولتے ہیں۔ اسی صفحہ کے اخیر کے قریب "مصلحکاری" کا لفظ ملتا ہے جس کے متعلق ہم پیشتر اپنے خیالات عرض کر چکے ہیں۔

آخر میں پھر گذارش ہے کہ میری نیت دل آزاری کی نہیں ہے۔ اور اگر بلا ارادہ کوئی لفظ یا فقرہ ایسا نکل گیا ہو تو اس کا عذر خواہ ہوں۔ اسی مضمون کے اندر دو ایک باتیں اور ہیں جن کے متعلق ابھی کچھ عرض کرنا باقی ہے۔ مکتب میں پڑھنے والے بچوں کا کاغذ کی کشتیاں بنا کے کھیلنا مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ اگر خورد سال بچے جو بہت صغیر سن ہیں اپنے پڑھنے کا وقت پڑھنے میں صرف کرنے کے بعد یہ شغل کریں تو کچھ ہرج نہیں۔ اس کے خلاف عمل ہو تو ہرج ہے۔ بچوں کے حیوانوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کا تذکرہ تو کیا گیا اور بہت ہی اچھا کیا گیا۔ مگر اسی کے ساتھ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کرنا سکھانے کا نام ہی نہیں لیا گیا۔ حیوان اور عامۂ خلائق تو ایک

طرف رہیں سب سے اہم نکتہ جس کی ہمیں ان سب سے زیادہ ضرورت ہے قومی ہمدردی ہے مگر اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا!۔

بچوں کو عمدہ عمدہ اشعار اور نظمیں یاد کرانے کی صلاح بہت ہی اچھی ہے۔ مگر ایسی نظموں کا انتخاب اُستاد کی ذاتی رائے پر ہرگز نہ چھوڑنا چاہئے۔ ہماری رائے میں جو کوئی ایسا انتخاب کرے اُسے ڈاکٹر اقبال صاحب کا قومی ترانہ کبھی نہ بھولنا چاہئے اور ہمارے بچّے بچّے کو ضرور نوک زبان کرا دینا چاہئے۔

معزز ڈاکٹر اقبال صاحب کی ذات کے ساتھ ہماری بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ عاجز کی رائے میں معزز ڈاکٹر صاحب میں عروج کمال پر پہونچنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس وجہ سے اُن کی ترقی ہماری زبان کی ترقی اور ہماری عین قومی ترقی ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ترقی ہمارے لئے کتنی بیش قیمت ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمیں بیحد عزیز نہ ہو۔ مگر ایسی ترقی حاصل کرنے کے لئے محنت شاقہ برداشت کرنے کی ضرورت ہے جس میں بہت بڑا حصّہ درس اور مطالعہ کا شامل ہوگا اور اس کے بعد طبع آزمائی کے ذریعہ سے پوری مشاقی بہم پہنچانے کا۔ معزز ڈاکٹر صاحب کے لئے اہل فن سے ہمیں چشم بینا رکھنے کی توقع کا حق حاصل ہے تھوڑا سا غور کرنے پر وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں اہل نظر اور اہل بصیرت کم ہیں۔ اور عوام الناس میں نیک و بد کی تمیز کمیاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ ڈاکٹر صاحب معراج کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ اور جو لوگ اُن کی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے بدخواہ عیب جو اور دشمن ہیں۔ معزز ڈاکٹر صاحب اگر ذرا غور کریں گے تو انہیں صاف ظاہر ہو جائیگا کہ اُن کے

واقعی اور اصلی دشمن اُن کے یہی مداح اور عقیدت مند لوگ ہیں۔گو نیک نیت دشمن ہیں کیونکہ اپنے علم و یقین میں وہ ایسے طرز عمل سے بجائے عداوت صرف کرنے کے اُن کی ہر طرح بھلائی ہی چاہتے ہیں۔ان نیک نیت دشمنوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ڈاکٹر صاحب عروج کمال پر پہنچ گئے ہیں جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوتے ہیں کہ اب آگے آیندہ ترقی کی راہ بند ہے۔نہ اس نقطے سے آگے ترقی کرنے کی حاجت ہے اور نہ ایسی ترقی کا کوئی امکان ہو۔

اب دوسرا طبقہ اہل نظر اور اہل بصیرت کا ہے اگر وہاں اُس طبقہ میں لاکھوں کی تعداد تھی تو یہاں اِنے گِنے دو ہی ایک آدمی نظر آتے ہیں۔مگر مخالفین کا انبوہ کثیر انہیں مرعوب کر سکتا ہے نہ مغلوب۔یہ لوگ حق گو حق پسند اور حق نیوش ہیں۔نہ انہیں کسی سے عداوت یا پرخاش ہے۔نہ کسی کی بیجا پاسداری منظور ہو اور یہ سوا اللہ پاک کے کسی سے نہیں دبتے کسی سے نہیں ڈرتے۔ان کے دلوں میں سچا قومی درد ہے اور اپنے اہل کمال کی ترقی اپنی عین قومی ترقی سمجھتے ہیں۔ان کا قول ہے کہ معزز ڈاکٹر صاحب ابھی عروج کمال پر پہنچے نہیں ہیں۔مگر اُس نقطہ تک ترقی کر جانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔اگر یہ آرام طلب ہونے پائیں اور دن رات خوب محنت کریں۔وہ معزز ڈاکٹر صاحب سے اُن کی خامیاں بتاتے ہیں تا کہ اُنہیں ان کا احساس ہو اور ترقی کے لئے ابھریں۔یہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے نیک نیت دوست ہیں۔اب ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ معزز ڈاکٹر صاحب لاکھوں شور بے ہنگام مچانے والے نیک نیت دشمنوں کے مشورے پر عمل کر کے اپنی آیندہ ترقی کی راہ اپنے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے بند کر کے اطمینان کی مسند پر بیٹھتے

ہیں اور عوام الناس کی چند روزہ واہ واہ کا ترانہ سنتے ہیں یا دو ایک نیک نیت دوستوں کی رائے پر عمل کرکے آرام کے نرم بستر سے اٹھتے ہیں اور ترقی کی راہ میں تیز قدم بڑھا کر اس لازوال عروج کمال پر پہنچتے ہیں جہاں پہنچ کر فنا کا مدعل ساقط ہے اور جہاں پہنچ کر قیامت تک ان کا نام آفتاب کی طرح ہماری آیندہ نسلوں کو اپنی منور شعاعوں سے گرماتا اور دنیا میں روشنی پھیلاتا رہیگا۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ان نیک نیت دشمنوں کی فوج کثیر آخرکار اپنی نصرت اور فتحمندی کا علم بلند کرتی ہے یا نیک نیت دوستوں کے معدودے چند افراد کے سر کامیابی کا سہرا رہتا ہے۔

(باقی آیندہ) ہمارا ادبی نقاد

ضوابط رسالہ

اِس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہونگے۔ "پیام اُمید" تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا آلہ بننا چاہتا ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ اِسکے مخاطب تمام روشن خیال مرد اور مستورات ہیں۔ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اصلی کام آج ہی سے شروع نہیں کرایا جاسکتا۔ ہمیں سب سے پہلے اتحاد پیدا کرنا ہے جبتک ہندو مسلمان اور شیعہ سنی آپسمیں لڑتے رہینگے۔ قوم اور ملک کی ترقی اصلی اور حقیقی معنوں میں بالکل ہی غیر ممکن ہے ہماری کوشش کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم (۱) مسلمان خریداران رسالہ سے تین روپیہ سال قیمت لینگے اور اُردو خواں ہندو خواتین کو رسالہ مفت نذر کرینگے جہاں تک اور جس حد تک کہ ہماری اشاعت اِس بار کی برداشت کرنے کی قوت ہمیں دے سکیگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم ہندو خواتین سے متفق الرائے ہوجائیں تو مردوں کے خیالات اتنے جلد پلٹا کھاجائینگے کہ دنیا کو حیرت ہوگی (۲) قومی اور ملکی ترقی کی پہلی منزل زبان کی ترقی ہے۔ ہم اُردو علم ادب کی ترقی اور توسیع میں سعی بلیغ کرینگے اور وقتاً فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہیں گے۔ تاکہ لایق مضمون نگاروں کو اچھے اور مفید مضامین لکھتے رہنے کی ترغیب اور تحریص ہو۔ رسالہ کی اشاعت بڑھنے پر ہم کوشش کرینگے کہ مفید علمی کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے ہماری زبان میں کئے جائیں اور مناسب قیمت پر فروخت ہوں۔ (۳) ایسے بچے جو کافی طور پر علمی ترقی کرچکے ہیں اور ہر اہم مسئلہ پر ایک خاص رائے قائم کرنے کے متقاضی ہیں انہیں ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں خارجی مدد پہنچانے کی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ زمانہ انکے لئے نہایت نازک زمانہ ہے۔ اگر وہ کسی اہم مسئلہ پر کوئی غلط رائے قائم کرینگے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کے دماغوں میں نشو و نما پاکر وہ غلط رائے جم جائیگی تو ان کی ساری عمر برباد کردینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہوگی ہم انہیں ایسی خارجی مدد عین وقت پر پہنچائینگے تاکہ آگے چلکر وہ بھی ترقی کی رفتار میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھیں۔

اُجرت اشتہارات

توسیع اشاعت رسالہ کے ساتھ اُجرت اشتہارات میں تخفیف ہوئی ہے۔ موجودہ نرخ حسب ذیل ہے مگر اسمیں کمی ممکن نہیں ہے۔ اور نہ مزید تخفیف کے لئے مراسلت ہونے پر کوئی جواب دیا جائیگا۔

اندازہ صفحہ	ایکبار	سہ ماہی	ششماہی	سالانہ
چوتھائی صفحہ	1/-	2/8/-	4/8/-	7/8/-
نصف صفحہ	2/-	5/-	9/-	15/-
پورا صفحہ	4/-	10/-	18/-	30/-

رقوم مندرجہ بالا پیشگی واجب الادا ہیں اور یکمشت وصول ہونا چاہئے۔ مینیجر رسالہ

فہرست مضامین جنوری نمبر ۱۹۱۸ء

امید کا پیام ــــ اُٹھو ــــ اُٹھو ــــ اور آگے بڑھو!

پیامِ امید

نمبر ۲۹	محمود آباد۔ سیتاپور (اودھ) جنوری ۱۹۱۶ء	جلد ۴

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہی اسمیں جنس کی قید نہیں جس حال میں کہ ہزاروں اخبارات اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گزریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے

متفرق نکات

معزز ہمعصر "ہمدم" نے اپنی کسی اشاعت میں شکایت کی ہی کہ بعض ہمعصر ہمدم پر طعنہ زنی کر رہے ہیں کہ یہ امیروں کا اخبار ہے - اگر امیروں کا اخبار ہونا کوئی عیب ہے تو انگلستان کے نام آور اخباروں میں شاید فی صدی نوّے پرچے اس

میں داخل ہوجاینگے اور اگر "ہمدم" میں یہ "عیب" ہے تو اس "عیب" میں اسکے شریک حال دُنیا کے بڑے بڑے نام آور اخبار اور ماہوار رسالے ہوں گے۔ کسی بڑے آدمی یا چند بڑے آدمیوں کے متحدہ سرمایہ سے کسی اخبار کا جاری ہونا اُسے کسی حال میں اُن اہم قومی اور ملکی خدمات کے لئے ناقابل نہیں بنا سکتا جن کی امید ایک اعلی پایہ کے معزز اخبار یا رسالہ سے کیجا سکتی ہے "ہمدم" اس وقت تک اپنے خدمات بوجہ احسن نہایت قابلیت رواداری اور غیر جانب داری کے ساتھ انجام دے رہا ہو۔ اگر کہیں کبھی کسی موقعہ پر کسی انسان سے انسانی لغزش ہوجائے تو وہ قابل درگذر ہے۔ ایسی لغزش کس سے نہیں ہوتی یا نہیں ہوسکتی ہے جس نے انسانی جامہ پایا ہے؟

ہمیں اپنے معزز ہمعصر "ہمدم" سے اور اسی کے ساتھ "نظارہ" سے ایک ہمدردانہ شکایت ہو۔ اور وہ شکایت یہ ہے کہ اُردو زبان میں انگریزی الفاظ زبردستی کھینچ لانا زبان کی ترقی نہیں ہے تنزل ہے۔ جس حد تک اُردو زبان ہمارے روزمرہ الفاظ میں سے بہت سے الفاظ پہلے ہی سے جذب کر لیجا چکی ہے اور وہ الفاظ زبان اُردو میں اپنی اصلی یا مسخ شدہ صورتیں داخل ہوچکے ہیں ہمیں اسی پر بس کرنا چاہئے امتداد زمانہ سے رفتہ رفتہ اور نئے الفاظ جو اسی طرح داخل زبان ہوتے جائیں اُن سے تو ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ اور اُن کے استعمال کرنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مگر حضرت اکبر کی تقلید میں جا اور بیجا اُردو لفظ چھوڑکر زبردستی انگریزی لفظ اُردو لفظ کی قدرتی جگہ پر اُٹھا کے دھر دینا مذاق صحیح سے اعلان جنگ کرنا ہے۔ اور

اس کا نام زبان کا ستیاناس کرنا ہے ۔مثلاً آرٹیکل پوزیشن ۔یا ایسے ہی اور درجنوں الفاظ ہیں جنھیں "ہمدم نے" بے تکلف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے ۔یا جس طرح حضرت حمید میرٹھی نے "کالرا" اور اس سے بھی بتر "کالرے" دو مختلف قطعات تاریخ میں نظم کئے ہیں جن کے پڑھنے سے بجائے لطف آنے کے متلی آنے لگتی ہے در حقیقت اس ستم کے ذمہ دار حضرت اکبر ہیں۔ مگر ہمارے لئے ان کی بیجا تقلید قابل فخر نہیں ہے ۔شرمناک ہے ۔



ہم نے دسمبر کی اشاعت میں معزز ڈاکٹر اقبال کے ایک مضمون پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کئے تھے ۔ اُس موقعہ پر اس حد سے آگے بڑھنا ہمیں اچھا نہ معلوم ہوا ۔آج ہم اپنے قابل رشک ہموطن بنگالی شاعر سر ربندر ناتھ ٹگور کے خیالات کا اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ آپ ایک ہی مسئلہ پر دونوں کے خیالات دیکھ کر موازنہ کر سکیں کہ ہم مسلمان دُنیا کی ترقی کرنے والی قوموں کا تو نام نہ لیجئے اپنے ہمسایہ ہندو ابنائے وطن سے کتنے پیچھے ہیں ۔معزز ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کے لکھنے میں بہت سے مستند یورپین مصنفین کی تصانیف کی ورق گردانی کی تھی ۔مگر اتنی محنت کے بعد کس حد تک پہنچ سکے تھے ؟ اور اس نامور بنگالی شاعر کے خیالات ملاحظہ فرمایئے جو دوسروں کے خرمن سے خوشہ چینی کرنے کے بجائے خود ایسے عروج پر پہونچ کر چراغ رہنمائی ہاتھ میں لیتا ہے کہ مہذب قوموں کو بھی اُس سے سبق لینا عار نہیں معلوم ہوتا ۔مسلمان شاعر کے افکار پرانی لکیر پیٹ کر پلٹ آتے ہیں ۔بنگالی شاعر ایک نیا راستہ نکالتا ہے ۔جہاں وہ خود آگے آگے چلتا ہے

اور دنیا سے کہتا ہے کہ اگر تمہیں ترقی کرنا ہے تو میرے پیچھے آؤ۔ جو نسبت مسلمان شاعر کے کلام کو بنگالی شاعر کے کلام سے ہے وہی نسبت اصناف شاعری سے باہر مسلمان شاعر کے افکار کو بنگالی شاعر کے افکار سے ہے۔ دونوں کی معلومات دونوں کی دماغی قابلیت میں بھی وہی نسبت قائم ہے۔ بنگالی شاعر کی انگریزی انشا پردازی پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک مستند یورپین نقاد اُس انشاء کو "انگریزی زبان کے پھول بوٹے" کہتا ہے۔ مسلمان شاعر کی انگریزی تحریر دیکھنے کا آج تک دُنیا کو موقع ہی نہیں دیا گیا ہے۔

-----------------------×-----------------------

سر ربندرا ناتھ ٹیگور کی تصانیف پر مسٹر راما سوامی شاستری بی اے۔ بی ایل نے ایک تبصرہ انگریزی زبان میں شائع کیا ہے جس کا حجم باریک حروف میں ۳۶۵ صفحہ ہے۔ کیا باعتبار ــــ انگریزی علم ادب کیا باعتبار وسعت معلومات۔ اور کیا باعتبار فن تنقید یہ کتاب نہایت ہی اعلیٰ پایہ کی ہے۔ اور اگر مولف کا نام نہ بتا دیا جائے تو محض کتاب ہی پڑھ کر کوئی نہ کہہ سکیگا کہ ایک نہایت ہی اعلیٰ تربیت یافتہ یورپین مولف کی تالیف نہیں ہے۔ ہمیں رشک آتا ہے کہ یا اللہ ہم میں ایسے افراد کب پیدا ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی علم ادب قانون اور سیاسیات میں ہم میں بلند پایہ حضرات موجود ہیں۔ گو ایسوں کی تعداد سیاسیات میں معدودے چند ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر فن تنقید میں تو ہم اتنے پیچھے ہیں کہ اگر میں سخت غلطی نہیں کر رہا ہوں تو میرے علم الیقین اور عقیدے میں سارے ہندوستان بھر میں ہمیں ایسا ایک شخص بھی نظر نہیں آتا جو اس پایہ

کا تبصرہ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کر سکے ۔ صاف اور صریح دلیل اس کی یہ ہے
کہ اگر ہم میں اس پایہ کے لوگ موجود ہوتے تو آج ہماری زبان ایسی ردی حالت
میں کبھی نہ پڑی رہنے پاتی ۔ نہ ہماری شاعری پستی کی ایسی سطح پر رہنے پاتی جہاں
پڑی وہ دنیا کو اپنی شامت اور ادبار کا تماشہ دکھا رہی ہے ۔ اور نہ یہی ممکن تھا
کہ ہم میں آجتک ایک بھی ایسا شاعر پیدا نہ ہوا ہوتا جو اس پُرانے مقررہ چکر کے دائرہ
سے باہر نکل کر دُنیا کی صاف اور فرح بخش ہوا میں نشو و نما پاتا اور سر رہندر و ناتھ
کی طرح ساق عرش کا رُخ کر کے ہوا پر بلند پرواز ہو کر ہم سے کہتا کہ آؤ میرے پیچھے
ہو لو ایسے بلند پایہ تبصرہ لکھنے والے ہم میں کہاں سے آئیں گے جب حال یہ ہو
کہ جو نکات اس میں پیدا کئے گئے ہیں اُن کے سمجھنے والے بھی ہم میں بہت کم
موجود ہیں ۔ ہماری تنقید زبان اور محاورہ سے شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم
ہو کے رہ جاتی ہے ۔ اس وجہ سے کہ جب ہماری شاعری ہی نے ان ابتدائی حدود
سے آگے قدم نہیں رکھا ہے پھر تنقید اس حد سے آگے بڑھے تو کیونکر بڑھے اور
جائے تو کہاں جائے ؟ ۔



ہماری موجودہ انگریزی طرز تعلیم میں جو یونیورسٹی کے طابع کالجوں اور اسکولوں
کے ذریعہ سے ہمارے بچوں کو مل رہی ہے اُس تعلیم کی خامیوں کا خلاصہ ان پُر
زور الفاظ میں مسٹر راماسوامی نے اپنی کتاب میں کیا ہے "یک طرفہ ۔ اصل فن
اور ہنر سے بے واسطہ ۔ صحت پر بُرا اثر ڈالنے والی محبت اخلاق اور ہمدردی سے
خالی اور مذہب سے بے تعلق ہے ۔ ہمارا محکمہ تعلیم کرایہ کا ٹٹو ہے " کیا یہی تعلیم

ہے جس کے نام لیوا "روشن خیالی" کا جامہ پہن کر "تعلیم دو تعلیم دو" کی لایعنی رٹ لگاتے پھرتے ہیں - اور خاک نہیں سمجھتے کہ ع

این رہ کہ تو میروی بترکستان است

ہمارا ادبی نقاد



معزز روزانہ اخبار ہمدم کی اشاعت مورخہ ۹ر دسمبر میں صفحہ ۵ پر "جلسۂ سنگ بنیاد شیعہ کالج" کے عنوان سے عالیجناب نواب فتح علی خاں صاحب قزلباش سی آئی ای کی ایک مراسلت شائع ہوئی ہے جو ہماری نظر سے گذری - ہمیں ادب کے ساتھ معافی چاہنے کے بعد عالیجناب نواب صاحب موصوف کی خدمت میں یہ امر گذارش کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اس مراسلت کے ذریعہ سے شرکت جلسہ کے لئے "مومنین" مدعو کئے گئے ہیں - عرف عام میں اب تک یہی سمجھا گیا ہے کہ ہمارے شیعہ بھائی جب یہ لفظ استعمال فرماتے ہیں تو "مومنین" کے معنی شیعہ حضرات سمجھے جاتے ہیں - ہمیں خوف ہے کہ یہ مراسلت غلط فہمیوں کا باعث ہو سکتی ہے - اور بار بار اس لفظ کے قریب قریب ہر موقعہ پر استعمال کئے جانے کی وجہ سے سُنی بھائیوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس جلسہ میں محض شیعہ بھائیوں ہی کی شرکت کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور سُنی بھائی نہ صرف یہی کہ مدعو نہیں کئے گئے ہیں بلکہ برعکس اس کے شاید اُن کی شرکت غیر ضروری اور فضول سمجھی گئی ہے - ظاہر ہے کہ سنگ بنیاد کی نصب کردگی کا جلسہ ایک عام جلسہ ہوتا ہے اور ایسے جلسہ میں بھی سُنی بھائیوں کی شرکت کیوں نہ چاہی جاتی -

گر لفظ "مومنین" کی ہر موقعہ پر تکرار یقینی ایسی غلط فہمی پیدا کرسکتی ہے اور اگر اس جلسہ میں سُنی بھائی شرکت سے معذور رہیں تو وہ مورد الزام نہیں ٹھہرسکتے

رسالہ "تمدن" کے دسمبر نمبر میں ترقی "اُردو کی عام درخواست اعانت" کے عنوان سے مسٹر عبدالحق صاحب "آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو" کی مراسلت ملاحظہ سے گذری۔ اس کے قبل غالباً یہی مراسلت معزز روزانہ ہمعصر "ہمدم" میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس مراسلت میں بعض نکات اہم اور غور طلب نظر آتے ہیں مسٹر عبدالحق فرماتے ہیں "میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم اپنے خیال کے مطابق چند سال بھی یہ کام کرسکے تو زبان اُردو میں علم کا ایک معقول ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔ جس کے فائدے غیر محدود اور شائد کئی کالج بنانے کی نسبت زیادہ حقیقی اور پائدار ہوں گے" آگے چل کر فرماتے ہیں کہ (انجمن) "اپنی چھ سو اچھ ہزار روپیہ سالانہ کی موجودہ آمدنی ہے زیادہ سے زیادہ تین چار کتابیں شائع کرسکتی ہے۔ اس کے بعد خود ہی اعتراف فرماتے ہیں کہ "اگر حامیان اُردو کے نزدیک سال بھر میں اسی قدر کارگزاری اس کی بس ہے تو یہ اُمید نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ اتنا ہی کام کرسکیگی جتنا بعض نامور مصنفوں نے محض ذاتی محنت سے اور بلا امداد کے کر دیا ہے" اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ انجمن کو ایسے "ارکان" کی ضرورت ہے جو چھ روپیہ سالانہ چندہ سے انجمن کی اعانت کیا کریں۔ اور ایسے ایک ہزار "ارکان" کی ضرورت ظاہر فرماتے ہیں۔ اور اُردو اخبارات اور آنریری ایجنٹوں کے ذریعہ سے ارکان انجمن پیدا کرنے کی فکر میں منہمک ہیں۔ آپ سب سے آخر میں اس فقرہ پر اپنی تحریک

ختم فرماتے ہیں کہ "انجمن ترقی اُردو کی اعانت حقیقی معنوں میں ایک قومی کام ہے جس کے فائدے زمان اور مکان سے مقید نہیں بلکہ بہت ہیں اور غیر محدود ہیں"

اس مراسلت سے یہ امر تو صاف صاف ظاہر ہے کہ حالت موجودہ میں "انجمن ترقی اردو" کی سالانہ آمدنی چھ سوا چھ ہزار" ہے ۔ اور یہ کہ اتنی رقم صرف کرنے پر سال بھر کے عرصہ میں انجمن "زیادہ سے زیادہ تین چار کتابیں شائع کرسکتی ہے۔" مگر بایں ہمہ معزز آنزیری سکرٹری صاحب کا یہ "اعتقاد" ہے کہ اگر نام خدا وہ اسی طرح "چند سال" اور کام کرتے پائے تو اردو زبان کو اتنا فائدہ ہوگا کہ "کئی کالج بنانے کی نسبت زیادہ حقیقی اور پائدار ہوگا۔" ہمیں معزز آنزیری سکرٹری صاحب کی خوش عقیدگی سے اعلان جنگ کرنا منظور نہیں ہے مگر یہ معاملہ سادہ جمع کا ہے ۔ اور یہ ایسا آسان سوال ہے کہ شاید ہر دوسری یا تیسری جماعت کا بچہ آسانی سے حل کرسکتا ہے ۔ البتہ "چند سال" کا ایک معمہ ضرور اس کے اندر حائل ہے ۔ اگر فرض کیجئے ہم "چند" کے معنی پانچ سال مان لیں تو فی سال تین کتابوں کے حساب سے پندرہ کتابیں ہمیں ملتی ہیں ۔ اگر سات برس مان لیں تو اکیس کتابیں ہمارے ذخیرہ میں شامل ہوتی ہیں ۔ مگر جو بات "خوش عقیدہ" افراد کے حلقہ اثر سے باہر باقی "بدعقیدہ" دُنیا کی سمجھ سے باہر ہے وہ یہ ہے کہ یہ کون سی پندرہ بیس کتابیں ایسی ہوسکتی ہیں جن کا ہاتھ میں آجانا "کئی کالج بنانے سے زیادہ" مفید ہوسکتا ہے! کیا یہ کوئی سحر کی کتابیں ہوں گی کہ ان کے ہاتھ میں آتے ہی ہمیں ہوا کے گھوڑوں پر گھوڑ دوڑ کرنا سکھا دیا جاوے گا ۔ یا ان کے ذریعہ سے کرامات اور معجزات کی تلقین فرمائی جائے گی یا کتاب ملتے ہی ہمیں ساری دُنیا

کے مدفون خزانے نظر آنے لگیں گے اور ہماری ساری قوم ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کے ساری دُنیا پر اپنی افضلیت کا پھریرا اُڑاتی پھرے گی!

معزز سکرٹری صاحب بہادر کو ایک ہزار ارکان کی شدید ضرورت ہے۔ یعنے دوسرے الفاظ میں چھ ہزار روپیہ سالانہ کی مزید آمدنی کی۔ موجودہ چھ ہزار سالانہ سے اگر تین کتابیں ہمیں ملتی ہیں تو بارہ ہزار سے چھ کتابیں مل سکیں گی یعنی ہر نئی کتاب کی قیمت دو ہزار ٹھہرتی ہے۔ غریب قوم کے حال زار پر اللہ رحم کرے! اور لطف یہ ہے کہ جو کتابیں ہمیں ملنے والی ہیں اُن کا ایک نمونہ "دریائے لطافت" ہمارے سامنے موجود ہے اور اسی کے ساتھ حضرت شوق قدوائی کا تبصرہ بھی تھا جس نے ہمیں روز روشن کی روشنی میں نہایت صفائی سے دکھلا دیا ہے کہ معزز آنریری سکرٹری صاحب بہادر اس خدمت کے لئے کس حد تک موزوں ہیں اور نیز یہ کہ آپ کی نگرانی میں جو کام ہوگا وہ کس پایہ کا ہوگا۔

آزاد بیلم

تاریخ اسلام کا ایک صفحہ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

اہل عرب کے دلوں میں ترقی ابتدائی کی اُمنگیں اس واقعہ سے پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ اہل حبش نے اہل عرب کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اور ایک جرار فوج ساتھ لیکر مکہ پر حملہ آور ہوتے۔ ان کا اصل مقصد اس جنگ سے یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو مسمار کردیں۔ لشکر شمار میں بہت زیادہ تھا اور سامان حرب سے اچھی طرح آراستہ

وپیراستہ تھا۔ لشکر کے ساتھ ہاتھیوں کی قطاریں اہل عرب کے لئے ایک نیا نظارہ تھا
اور حملہ کی عظمت اُن کے دلوں پر چھاگئی تھی۔ اہل عرب کے دلوں میں خانہ کعبہ کا احترام
پشتہا پشت سے جما ہوا تھا اور اس وجہ سے اس حملہ کے مقصد کی اہمیت بہت بڑھ گئی
تھی۔ انہیں کبھی خیال بھی نہیں گزرتا تھا کہ کوئی غیر قوم اس طرح ان پر حملہ آور ہو سکیگی
اور اپنے کو محفوظ حالت میں سمجھکر بالکل بے فکر تھے۔ مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ دشمن سر
ہی پر آپہونچا تو اُنہیں اس خطرۂ عظیم کی اہمیت پر پوری توجہ کرنے کی ضرورت محسوس
ہوئی۔ اس خیال کے دل میں راہ پاتے ہی انہیں سب سے اہم اور سب پر مقدم
احتیاج قومی اتحاد کی نظر آئی تاکہ ان کی متحدہ قوت اس جنگ دفاعی میں صرف کی جاسکے
اس اتحاد کی تکمیل میں انہیں کامیابی ہوئی اور یہی کامیابی ان کی ظفر یابی کا ذریعہ
بنی۔ جنگ کا نتیجہ اہل عرب کے موافق ہوا اور دشمن کو ناکام ہو کر واپس جانا پڑا۔ اس
جنگ کے زمانہ میں خانہ کعبہ کی خدمت کے منصب دار ہمارے رسول کریم کے جد
امجد عبدالمطلب تھے۔

اس جنگ کا دیرپا اثر اہل عرب کے دلوں میں رہا۔ اُنہوں نے اس جنگ کا نام
"عام الفیل" رکھا اور اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے سنہ عام الفیل کی بنا برپا
کی۔ اس جنگ نے ان کی غیور طبیعتوں پر تازیانہ عبرت کا کام کیا اور اسی واقعہ کے
بعد میں انہوں نے ترقی کی مختلف اصناف میں سرگرمی کے تیز قدم بڑھانا شروع
کر دیئے یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں اُن میں نہ صرف قابل ادیب اور فاضل ہی
پیدا ہونے لگے بلکہ جلیل القدر مدبر۔ صاحب فن سپہ سالار اور دانشمند اہل حکومت
بھی نکلنے لگے جن کے ناموں کی شہرت نزدیک و دُور پھیلی اور وہ ایک ممتاز قوم

بلکہ دنیا سے خراج تحسین حاصل کرنے لگے گو بصورت ظاہر "عام الفیل" کا واقعہ ترقی کے تگ و دو میں اُن کا نشانِ راہ نظر آتا ہے مگر حقیقت اصلی یہ ہے کہ جنگ یمن ہی کے زمانہ سے جب اہل حبش نے انپر پہلا حملہ کیا تھا اُسی وقت سے یہ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ بیرونی حملوں سے مستقل پناہ کا علاج ایک جان توڑ دماغی حملہ نہیں ہے بلکہ اس کا قرار واقعی انسداد قومی عروج اور قومی ترقی ہی ہے۔ اللہ پاک کو اس سرزمین کا ستارہ اقبال چمکانا منظور تھا۔ ایک ہادی کامل کے ظہور کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ تقدیر نے جس قوم اور جس سرزمین کو عروج کے لئے منتخب کیا تھا اسمیں عروج کا مادہ اور عروج کی صلاحیت اگر پہلے ہی سے پیدا کر دی تھی تو یہ کون سی تعجب خیز بات ہوسکتی تھی! کاشتکار جب کسی زمین پر عمدہ فصل کاشت کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اُسے زمین تیار کرنے کی فکر ہوتی ہے تاکہ اُس نایاب تخم کی ودیعت کی اہل بن سکے اور کاشت سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیتا ہے کہ زمین میں اس تخم کی اچھی طرح بارور کرنے اور نشوونما دینے کی قوت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں۔ قدرت نے بھی بعینہٖ ایسا ہی کیا تھا۔ اب زمین تیار ہے۔ دُنیا ترقی کے لئے اُبھر رہی ہے۔ سڑک بن کر تیار ہوگئی ہے۔ پٹریاں بچھ گئی ہیں۔ زمین پختہ کر دی گئی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ کی ریل گاڑیاں پٹریوں پر کھڑی منتظر ہیں۔ اُن کے جوہر حجاب میں ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ گاڑیاں فی گھنٹہ نوّے میل کی رفتار سے اُڑی اُڑی پھرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایک تا قتور انجن کا زمانہ منتظر ہے کہ آکے ان سب کو ایک ہی قطار میں شامل کرکے ہوا ہو جاتے اور لیکر اڑا اڑا پھرے۔ (باقی آیندہ)

مورّخ

لطف سخن

"پیام امید" ماہ بماہ غور طلب نکات پیش کرکے ناظرین کرام کے دماغ پر بار ڈالتا رہتا ہے۔ ہمیں فکر رہا کرتی ہے کہ دماغی افکار میں منہمک رہنے والے دماغوں کی تفریح کا بھی کچھ نہ کچھ سامان کبھی کبھی کرتے رہنا چاہئے۔ چنانچہ آج بھی کچھ ایسا ہی سامان کیا گیا ہے۔ جو غزل آج پیش کی جا رہی ہے اس کے قابل رشک مصنف صاحب کا اسم گرامی جناب منشی ٹھاکر پرشاد صاحب ہے۔ آپ "شاداں" تخلص فرماتے ہیں۔ اور عجائب روزگار خاک پاک لکھنؤ شریف کا نمونہ ہیں۔ آپ صاحب دیوان ہیں۔ یعنی ایک چھوڑ دو دو دیوانوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے ایک کے اخیر صفحہ پر آپ کی شبیہ مبارک بھی شائع ہو چکی ہے۔ دنیا میں قدر دانوں اور جوہر شناسوں کی کمی نہیں ہے۔ اور ہمیں قوی امید ہے کہ آپ کی غزل پڑھ کر آپ کے دیوانوں کے مطالعہ کا شوق بھی دل میں گدگدی ضرور پیدا کرے گا۔ دونوں دیوان بلا قیمت پیڈ پارسل کے ذریعہ سے آپ کے قابل صاحبزادہ سے دستیاب ہو سکتے ہیں جن کا پتہ یہ ہے۔ جناب بابو شنکر دیال صاحب وکیل پرتاب گڈھ۔ اب غزل ملاحظہ فرما کر لائق مصنف صاحب کو داد سخن دیجئے اور انتخاب کے لئے عاجز کو بھی دعائے خیر سے یاد فرمائیے۔

غزل

جبیں آیا یہاں پر وہ دل شکن نہ کہا کسی کو یہ اس نے کن
تہیں فارسی میں یہ بولے کن جبیں باجے چھن تری گھونگرو

نہیں ؟ یا یہاں پر جو گلبدن اسی آرزو میں گیا یہ دن
کہا حیف حیف ہے یہی دن جھنیں باجے چھن تری گھونگرو

پھروں دشت و جنگل میں وبن ہوا خوار میں یوں ہی تیرے بن
یہاں آ ہی تے میرے سرو بن جھنیں باجے چھن تری گھونگرو

نہیں دیکھتا ہوں کبھی سجن نہ سُنا ہے گولی کی کچھ بھی پن
نہ کیا ہے دیکھیے کچھ پن جھنیں باجے چھن تری گھونگرو

نہیں ہے یہ دولت اور دہن لگی انکو ہے یہی دُھن پہ دُھن
وہ سُنیں ہیں طبلہ کی نت ہی دُھن جھنیں باجے چھن تری گھونگرو

لگا سورج کو ہی جو گہن تو خراب باتوں سے آوے گہن
لگا ہے اُنہیں سے یہ دل میں گہن جھنیں باجے چھن تری گھونگرو

کریں ہیں جو کہیاں یوں ہی ہن کریں پھر یہاں ہی وہی ہن
گیا شادان کا یہی دل بھی ہن جھنیں باجے چھن تری گھونگرو

مقطع سارے غزل کی جان ہے اور اس میں جو لطف ہے وہ کسی شعر میں اس درجہ کمال تک نہیں پہنچا ہے۔

ایسے باکمال حضرات بہت کمیاب ہیں۔ اور اُن کی جتنی قدر کی جائے کم ہے آجکل کے شاعروں میں سے ہمیں تو کسی سے اُمید نہیں ہے کہ اس عروج تک پہنچ سکیں ہاں البتہ میاں فرخندہ جمال کی ایک ذات ہے جن کے ساتھ قوم اور ملک کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ اُنہیں زندہ رکھے۔

ہمارا ادبی نقاد

شانتی نکتیاں

سر رابندر ناتھ ٹگور نے مقام بال پور میں اپنا مدرسہ ۱۹۰۱ء میں کھولا تھا۔ پہلے دن جب مدرسہ کھلا تو طلبار کی تعداد صرف دو یا تین تھی۔ دو برس کے عرصہ میں یہ تعداد اٹھارہ تک پہنچی۔ اور چار سال میں ساٹھ لڑکے ہو گئے۔ آج کے دن شانتی نکتیا میں درس گاہ میں زیر تعلیم بچوں کی تعداد دو سو ہے۔ مانٹی سورائی اور دیگر یورپین مستند ماہرین تعلیم کی جو رائے ہے وہی رائے قرون اولے کے ماہرین تعلیم ہند کی بھی تھی اور وہی رائے سر رابندر ناتھ کی بھی ہے۔ وہ رائے ان سادہ الفاظ میں ظاہر کیجا سکتی ہے "بچے پر بھروسہ کرو اور اُسے ترقی کرنے دو" اس مدرسہ میں تعلیم و تربیت کا آلہ انگریزی یا کوئی اور غیر ملکی زبان نہیں ہے۔ بلکہ زبان بنگالی ہے۔ طلبار کی تقسیم اوقات سبق آموز ہے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے عین صبح کاذب کے وقت ایک منتخب گروہ گانے والے بچوں کا مدرسہ میں گشت کرتا ہے اور اپنے سریلے نغمہ کی شیریں حلاوتوں کی چاشنی چکھا کر میٹھی نیند کے متوالوں کو عالم خواب کی تسکین بخش دلفریبیوں سے عالم وجود کی دلچسپیوں پر مائل کرتا ہے۔ بچے اپنی نیم خواب آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ پھولوں کی دل آویز خوشبوؤں سے بسی ہوئی نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے اُن کے دماغوں کو اپنی فرح بخش لطافت سے ضیافت کرتے ہیں۔ اور وہ نیلوفری آسمان کی سطح میں جھلملاتے ہوئے تاروں کی چھاؤں چلتے پھرتے ہیں مطلع خورشید انور انہیں صبح اُمید کی دلفریب نظم کا درخشندہ مطلع نظر آتا ہے اور نئی اُمنگیں اور پُرجوش ولولے دوڑ سے آنکا خیر مقدم کرتے ہیں۔

بچے اُٹھتے ہیں اور اٹھتے ہیں اُن کا سب سے پہلا کام اپنے ہاتھ سے اپنا کمرہ صاف کرنا ہوتا ہے۔ اور گویا اس طریق پر اُنہیں عملی سبق دیا جاتا ہے کہ ہاتھ پاؤں سے کام لینا کوئی حقیر یا قابلِ نفرت فعل نہیں ہے بلکہ مردانہ زندگی کا ایک نہایت ہی خوشگوار فرض ہے بشرطیکہ ہر چھوٹا بڑا کام جو کچھ کیا جائے وہ ایسی خلوص نیت کے ساتھ کیا جائے کہ ہماری دُنیاوی زندگی کے سارے اعمال اور افعال محض اللہ پاک کے لئے اور اسُی کی رضا اور خوشنودی کی غرض سے ہیں[1]۔ اس کے بعد طلباء کے لئے میدان میں ورزش

---

[1] خاکسار مترجم معافی کے ساتھ عرض کریگا کہ چاہے جتنے ہی خوشگوار الفاظ میں یہ واقعہ بیان کیا جائے مگر یہ الفاظ واقعات کی حقیقت نہیں بدل سکتے۔ یہ امر حفظ صحت کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ مکان یا کمرہ صاف کرتے وقت جو گرد اُڑتی ہے اور انسان کی ناک کی راہ اسکے پھیپھڑوں کے اندر اس کے ذرات جم جاتے ہیں صحت انسانی کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں شاید ہی کوئی اور چیز ہو۔ رات بھر کے تازہ دم بچے جن کے نیند سے جگانے کا تو ایسا دلچسپ انتظام کیا گیا ہے۔ جن کے رہنے سہنے پڑھنے لکھنے کے لئے ایسا خوشگوار اور پرفضا موقع دیا گیا ہے مگر یہ کیا ستم ہے کہ نیند سے اُٹھتے ہی اُن کے نازک پھیپھڑوں کے اندر روزانہ کئی تولہ اس منحوس گرد کے ذرات زبردستی اُتار دیے جاتے ہیں۔ اگر ان ذرات کی تعداد یومیہ آپ کم سے کم ایک ماشہ ہی رکھئے تو ہر مہینہ کے تیس[30] ماشہ ہر سال کے ۳۶۰ ماشے ہوئے اور ہر دس برس کے ۳۶۰۰ ماشہ ہوئے جن میں سے اگر نصف مقدار بھی ایک تندرست مزاج خارج کر سکے (جو حقیقت میں یقینی نہیں ہے) تو ہر دس برس کے اخیر میں ایک ہزار آٹھ سو ماشہ ان ذرات کا وزن پھیپھڑے کی تہوں میں لپٹا ہوا نکلیگا جو ایک اچھے سے اچھے شہزور (ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۷)

کے بعد غسل کرتے ہیں۔ اور غسل کے بعد پندرہ منٹ کے عرصہ تک سکوت کے عالم میں
غور کرتے ہیں[۵]۔ اس کے بعد گھنٹہ بجتا ہے اور لڑکے باقاعدہ صفیں باندھ کر ادب
اور تعظیم کے ساتھ مدرسہ کی عبادتگاہ میں داخل ہوتے ہیں[۶]۔ سات بجے صبح سے
دس بجے دن تک اس عمارت میں مختلف جماعتوں کی تعلیم جاری رہتی ہے۔ اس کے
بعد ناشتہ کا وقت ہے اور پھر بعد دوپہر دو بجے سے پانچ بجے شام تک تعلیم کا وقت ہے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶) انسان کو دائم المریض بنا دینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے۔ مسٹر بندرناتھ
ٹگور تو انگلستان کی ہوا بھی کھا چکے ہیں۔ مگر کیا انہوں نے کبھی اپنے دل سے یہ سوال نہیں
کیا کہ آخر کیا وجہ ہے جو وہاں کی تربیت یافتہ سلطنت اپنا لاکھوں روپیہ ہر سال سڑکوں
پر سیمنٹ یا تارکول یا ایسی ہی لس دار اشیاء کا چھڑکاؤ کراتے رہنے میں صرف کرتی ہے
تاکہ گرد نہ اڑنے پائے۔ کیا اس مضمون نگار نے تازہ ترین طبی معلومات بہم پہنچانے کی
کوئی کوشش نہیں کی! غلطی غلطی ہی ہے اور غلطی ہی رہیگی چاہے وہ کسی غیر معروف
آدمی سے سرزد ہو اور چاہے کسی بڑے نام آور شخص سے ظہور میں آئے۔ (مترجم)

۵ غالباً اس غور و خوض سے عبادت الٰہی مقصود ہے۔ اس وجہ سے کہ آگے چلکر بتایا گیا ہے
کہ ان کی عبادتگاہ کے اندر کوئی بت یا تصویر یا مورت رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

۶ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی عمارت ہے جس سے عبادت گاہ اور مدرسہ دونوں
کے مقاصد پورے کئے جاتے ہیں۔ اور گویا اس طریق پر درس گاہ کی عظمت کا استادوں
اور شاگردوں کے دلوں پر گہرا نقش جمایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی عمارت کے اندر
بیٹھ کر لڑائی جھگڑا اور فساد یا کوئی خلاف تہذیب گفتگو ہونے میں عبادت گاہ کا احترام
مانع ٹھہرتا ہے۔

زمانہ حال کے مدارس میں دوپہر کا بے جوڑ وقت تعلیم دینے کے لئے کس قدر غیر موزوں ہے یہاں اس کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے۔ موسمی حالت پر لحاظ کرکے عموماً درختوں کے سایہ میں تعلیم دی جاتی ہے۔ کھانا ٹھیک بارہ بجے دیا جاتا ہے۔ پھر سہ پہر کے ناشتہ کے بعد مردانہ کھیل ہوتے ہیں (مثلاً کرکٹ۔ فٹ بال ہاکی) کھیل ختم کرنے اور رات کا کھانا کھانے کے درمیان کا وقت بچوں کو نصیحت خیز قصے اور کہانیاں سنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔ اور موسیقی اور ایکٹ[ف] کرنے کی تعلیم بھی اسی وقت دیجاتی ہے۔

[ف] معافی چاہتا ہوں کہ مجھے "ایکٹ کرنے" کے لئے اور موزوں الفاظ اردو زبان میں نہیں ملے اصولاً میں اردو عبارت میں انگریزی الفاظ لکھنے کے ہمیشہ خلاف ہوں۔ "ایکٹ کرنے" سے یہ مقصد نہیں ہے کہ بچوں کو تھیٹر کے ایکٹر کا پیشہ سکھایا جاتا ہے۔ یورپین ممالک میں بھی تعلیم کا یہ طریقہ بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اس سے بیشمار فوائد ہیں جن میں سے چند عرض کرنے کی کوشش کرونگا۔ فرض کیجئے بچوں کے سبق میں دو آدمیوں کا مکالمہ داخل ہے۔ یہ مکالمہ زید اور بکر کے درمیان میں ہو رہا ہے۔ اب ایک بچہ زید کے الفاظ از بر کر جائیگا اور دوسرا بکر کے۔ اس کے بعد جلسہ عام میں زید اور بکر کی صورت اور وضع کی نقل اُتار کر دونوں اس مکالمہ کا اس طرح اعادہ کریں گے کہ نقل کو اصل بنا کر دکھانے کی پوری کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے تو ان کے حافظہ کے لئے نہایت عمدہ مشق بہم پہنچتی ہے۔ اس کے بعد اس طرح پر نقل اُتارنے اور نقل کو اصل کر دکھانے میں سبق کے اندر جو جو رموز نکات اور باریکیاں ہیں سب نہایت اچھی طرح سے نہ صرف انہیں دو نقل اُتارنے والوں کے بلکہ تمام شائقین کے دلوں پر نقش کالحجر ہو جائینگی۔ پھر جلسہ عام میں کھڑے ہو کر تقریر کرنیکی مشق حاصل ہوگی۔ ایک بڑی مجمع کا رعب جو ایک نو آموز کے لبوں پر مہر سکوت لگانے پر آمادہ رہتا ہے اسکا اثر زائل ہوگا۔ اخلاقی جرأت پر نہایت ہی اچھا اثر پڑیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اوپر کی صفوں کے بڑے بڑے لڑکے گرد و نواح کے مواضعات میں بھیجے جاتے ہیں اور شام کا وقت یہ لوگ ان دیہاتی لڑکوں کو باقاعدہ صف بندی کر کے تعلیم دینے میں صرف کرتے ہیں۔ یہاں کے زیر تعلیم بچوں اور دوسری درسگاہوں کے بچوں میں یہ فرق ہے کہ اور درسگاہوں کے بچے اپنے معلمین کی زبان سے "قومی خدمت" کے خشک الفاظ ہی سُنکر مدرسہ سے باہر آتے ہیں۔ اور بھول جاتے ہیں۔ مگر یہاں کے بچے عملی طور پر قومی خدمت ادا کرنے کا فرض سیکھتے ہیں اور اس فرض کو بوجہ احسن انجام دیتے ہیں۔ دن کا کام ساڑھے نو بجے رات تک ختم ہوتا ہے اس کے بعد آرام کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اور صبح کی طرح پھر اس وقت بھی ایک گروہ منتخب لڑکوں کا گاتا ہوا گشت کرتا ہے۔ ان کا کام گانے ہی سے شروع اور گانے ہی کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور گویا انہیں عملی طور پر بتایا جاتا ہے کہ ایسی معصوم اور ایسی خدمت اور خداشناسی میں سرشار زندگی جو فطرت کی دلچسپیوں سے یوں دوش بدوش ہو کر چل رہی ہو حقیقت میں اپنی شیرینی میں ایک دلکش ترانہ اور ایک فطرتی ادوں سے لبریز راگ سے مشابہ ہوگی جس کا اثر جہاں تک پہنچیگا قلبی سکون۔ سچی روحی فرحت صلح۔ امن۔ آسایش اور آرام کے تسکین دہ اثرات سے دلوں کو جمعیت اور اطمینان بخشیگا۔

استادوں اور شاگردوں کا ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر[۱] کے

---

[۱] کہاں ہیں وہ حضرات جو غزل گوئی کی بوسیدہ ہڈیوں سے چمٹ کر زمین پکڑے بیٹھے ہیں اور اس حد سے آگے بڑھنا کفر اور الحاد سمجھتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ حضرات جو دعویٰ فرماتے ہیں کہ داغ اور امیر سے بڑھکر استاد دنیا کے پردہ میں کوئی ہوا ہی نہیں۔ کہاں ہیں ہمارے

(صفحہ ۲۰ ملاحظہ ہو)

گیت گانے اور سننے میں محو ہو کر وجد میں آنا ایک نظارہ ہے جو فرشتوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

اُستاد نہایت خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کوئی ہیڈ ماسٹر نہیں ہے سب اُستاد مساوی رتبہ کے ہیں۔ اور آپس میں اتفاق رائے سے کام تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اتفاق رائے سے ہر سال خود ہی ہیڈ ماسٹر کا انتخاب کر لیتے ہیں اُستادوں اور شاگردوں کے درمیان نہایت ہی گہرے محبت آمیز تعلقات ہیں۔ ہفتہ میں دو بار مندر کے اندر عبادت کی جاتی ہے۔ یہ عبادت اُن کی موجودگی کی حالت میں سر رابندرا ناتھ ہی کی امامت میں ہوتی ہے۔ اُن کی عدم موجودگی کی حالت میں سے اُستادوں میں سے ایک شخص اس خدمت کے لئے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ ہر قسم کی جسمانی سزا سخت ممنوع ہے۔ اسکول کا ترتیب نظام برقرار رکھنے اور سزائیں دینے کے لئے طلباء کا ایک محکمۂ عدالت قائم ہے جس کا افسر اعلیٰ کپتان کہلاتا ہے۔ اس عدالت کا انتخاب ماہ بماہ ہوتا ہے۔ لڑکوں کی اس سلطنت جمہوری میں زر نقد یا کسی اور قسم کا انعام تقسیم کرنے کا کوئی قاعدہ نہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹) معزز روشن خیال حضرات جو معزز ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو شاعری کی معراج ترقی بنا رہے ہیں۔ اس "ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر" کے مقابلہ میں اپنے "استاد" کو لا کے کھڑا کریں۔ حضرات آپکو اختیار ہے کہ آپ اپنے گھر میں بیٹھ کر جسے چاہیں جتنا بڑھا لیں۔ مگر بیسویں صدی کی ترقی کرنیوالی دنیا کا معیار کچھ اور ہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا کے صفحات آپکے "اُستادوں" کے ناموں سے جسطرح آج خالی ہیں ہمیشہ خالی رہیں گے اگر آپ آج ہی سے بیداری کے علامات ظاہر کرنا شروع نہ کر دیں گے۔ فقیر کے عاجز قلم سے یہ اعتراف نہایت ہی دردناک ہے۔ مگر حق گوئی کا فرض تو ادا کرنا ہی پڑیگا۔ اگر سچی بات کڑوی معلوم ہوتی ہے تو مجبوری ہے۔ افسوس آج ہم یہ دلشکن نظارہ دیکھ رہے ہیں کہ اردو کے اتنے بڑے بڑے نامور شعراء میں سے سب کے سب معیار رسی خارج سمجھے گئے ہیں۔

[illegible]

رکھا گیا ہے۔ تعطیلات کے زمانہ میں اُستاد باہمی تصفیہ سے طے کرتے ہیں کہ کن کن مختلف مقامات کی سیر کو چلنا چاہیئے۔ ٹگور کو بچوں سے بڑی محبت ہے اور اُن کا قول ہے کہ اُن کے ساتھ رہنے میں مجھے جو سچی روحی فرحت حاصل ہوتی ہے وہ ساری دنیا میں کہیں اور حاصل نہیں ہوتی۔ بچے اُنہیں "گرو" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں جو دینی اُستاد کے مخاطب کرنے کا معزز ترین لفظ ہے۔ بچوں کی روزانہ تعلیم کے معینہ اوقات میں سے خود تعلیم دینے کے لئے ٹگور نے کوئی وقت نہیں رکھا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ادب اور موسیقی کی تعلیم وہ خود ہی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی بچوں سے فرمایش کرتے ہیں کہ طلباء اپنی اپنی مشق نقشہ کشی۔ رنگ آمیزی یا نظم کے نمونے اُن کے سامنے پیش کریں۔ وہ اکثر ہمت فزا اور حوصلہ افزا الفاظ میں اُن کی مشق کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کی محنت اور ذہانت کی یہ شیریں ثمرات دیکھ کر اُنہیں بے انتہا مسرت ہوئی۔ اسی طرح ہر فن اور ہر علم کے حصول میں وہ بچوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے ہیں۔ تعلیم کی ہر میعاد معینہ کے اخیر میں لڑکے عموماً سر رابندر ناتھ کا کوئی ڈراما کھیلتے ہیں[1]۔ ٹگور خود اس کھیل میں شریک ہوتے ہیں۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ جب بچوں نے "اندھیر نگری کے بادشاہ" (THE KING OF THE DARK CHAMBER) کا ڈراما کھیلا تھا تو ٹگور بادشاہ بنے تھے۔ اور جس خوش اسلوبی سے ٹگور نے بادشاہ کا پارٹ کھیلا ہے[2] اُن لوگوں کو مدت تک یاد رہیگا جو اُنکے ساتھ بحیثیت ایکٹر شریک تھے یا جنہیں یہ تماشہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا

(باقی آیندہ) (ہمارا ادبی نقاد)

---

[1] "PLAY" کا ترجمہ کھیلنے میں مجھے پسند نہیں ہے۔ مگر آجکل اسیطرح بولنا رواج پکڑ گیا ہے۔ اور مجھے کوئی اچھا لفظ نہیں ملتا کہ اس معنی کے ادا کرنے کے لئے قائم کروں [2] بڑی بے جوڑ اردو ہے۔ مگر یوں ہی رواج پا گئی ہے اور اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔

سرقہ توارد۔ ترجمہ

(سلسلہ کے لئے دسمبر نمبر ۱۹۵۸ء ملاحظہ ہو)

غالب کہتے ہیں۔

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

پہلے تو میں اس شعر کو خاص غالب کا نتیجہ فکر سمجھتا تھا۔ مگر بعد کو ثابت ہوا کہ اس کا ماخذ مُلّا فیاض قمی کا یہ شعر ہے ؎

فیاض قمی — ہر کس کہ زخم کاری مارہ نظارہ کرد
تا حشر دست و بازوِ او را دعا کند

حق یہ ہے کہ ملا فیاض قمی نے اپنے شعر میں جو زور قلم دکھایا ہے غالب نے ترجمہ میں بھی وہی قوت دکھادی۔ اور ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ غالب کے اس شعر پر سرقہ کا الزام نہیں آسکتا۔ بلکہ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل" کا مصداق ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ یہ شعر خاص غالب کی تخیل کا کرشمہ ہے ترجمہ ہے۔ مگر بہت اچھا ترجمہ ؎

(غالب) — کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس شعر کا ماخذ ملاحظہ ہو:۔

(خسرو دہلوی) — زہے عمر دراز عاشقاں گر
شب ہجراں حساب عمر گیرند

(لامعلوم) زخضر عمر فزوں است عشقبازاں را
اگر زعمر شمارند روز ہجراں را

اس شعر میں عمرِ خضر کی قید سے قیدِ حیات پھر بھی محدود ثابت ہوتی ہے مگر غالب نے "کب سے ہوں کیا بتاؤں" کے ٹکڑے سے قیدِ حیات کو نامحدود کر دکھایا ہے۔ یہاں بھی نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر نظر آتا ہے۔

غالب کہتے ہیں۔ ؎

غالب گرچہ ہے کس کس برائی میں ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

شرف قزوینی کہتا ہے ؎

(شرف) ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا
چوں بایں تقریب می آرد بیاد او مرا

غالب کے اس شعر پر نہ سرقہ کا حکم جاری ہو سکتا ہے۔ نہ ترجمہ کا۔ بلکہ توارد ہے۔ کیونکہ یہ خیال ایسا پیش پا افتادہ ہے کہ ہر شخص کا ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے غالب کے شعر کی بندش بھی چست ہے ؎

غالب اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی تبریزی کہتا ہے ؎

(فسونی) ز وچہ میرسم آسودہ می شوم از دُرد
ندیدہ حال مرا وقت بیقراری حیف

غالب نے فسوفی کے اس خیال کو دوسرے پیرایہ میں نہایت خوبی سے قلمبند کیا بلکہ یہ کہئے کہ اس مضمون کو اپنا کرلیا۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ مضمون غالب ہی کا نتیجہ فکر ہے

(غالب) اور بازار سے لے آتے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے تو مرا جام سفال اچھا ہے

(عُرفی) کے لازم است بادہ کشیدن زجام زر
مقصود تو گرایں است قصور سفال چیست

غالب کے شعر کا ماخذ عرفی کا شعر ہے مگر غالب نے پھر بھی تازگی پیدا کی ہے۔

غالب خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

حسن بیگ رفیع کہتا ہے ؎

خوش دلم زیں کہ باو نامہ نویسم شب روز
مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

بنائے تخیل تو وہی رفیع کا شعر ہے مگر غالب نے یہاں بھی تازگی سے کام لیا ہے

(غالب) نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

(عاقل خاں رازی) نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا
اوّل ایں حادثہ برآدم وحوا بگذشت

یہ شعر بھی غالب کا نتیجۂ تخیل نہیں ہے۔ بلکہ عاقل خاں رازی کے شعر سے ماخوذ مگر ترجمہ کا حق ادا ہو گیا ہے۔

یہاں تک تو غالب کے اُن اشعار کا ذکر ہوا جو فارسی اشعار کے ترجمے ہیں اور ترجمہ بن پڑا ہے۔ جس کے لئے غالب مستحق داد ہیں۔ اب کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

(غالب) ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

غالب کے اس شعر کو میں ایک کارنامہ سمجھتا تھا۔ مگر میر عبداللہ پیامی کا ایک شعر دیکھکر غالب کا یہ شعر نگاہوں میں ہیچ ہو گیا ؎

(پیامی) بیم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

سبحان اللہ وصل علیٰ "بیم از وفا مدار" "از ذوق وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم" کیا کیا نگینے جڑے ہیں۔ پیامی نے اس شعر پر قلم توڑ دیا ہے۔ غالب نے ترجمہ تو کیا مگر عشر عشیر بھی اُس کا نہ ہو سکا۔ اہل نظر کے سوا اور کوئی اس فرق کو نہیں پکڑ سکتا۔ "بفردا نمی رسم" کا جواب کہیں ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عنانگیر بھی تھا

اُردو میں عنانگیر کی ترکیب خصوصًا معشوق کی شان میں نہایت مضحک ہی ایک ہی لفظ ہے۔ جو فارسی میں جائز اور اُردو میں ناجائز ہو جاتی ہے اسے اہل فن سمجھ سکتے ہیں۔ اس پہلوی ذم کے علاوہ غالب کا یہ شعر عرفی کے ایک لاجواب شعر سے ماخوذ ہی کہتا ہے ؎ عرفی

زغیرت پیچ و تاب افتاد در رگہائے جان من
ہمانا دست امید کسے دارد عنانش را

عرفی کے شعر کی بلاغت کا کیا پوچھنا ۔ غالب نے خواہ مخواہ اس شعر کی مٹی خواب کی ۔ غیرت ۔ پیچ وتاب ۔ رگہائے جان ۔ دست امید ایک لفظ کی بلاغت قابل دید ہے ۔ بخلاف اس کے غالب کے شعر میں ایک لفظ بھی قابل تعریف نہیں ۔ ہاں فقط لفظ عنانگیر میں ایک نفرت انگیز جدت ہے ۔ زبان اردو اس قسم کے الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔

(غالب) فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

نظیری نیشاپوری کہتا ہے ؎

نشاط رفتہ ز دوران بہ صبر بستانم
کہ بدمعاملہ آزردہ از تقاضا نیست

یہاں بھی غالب نے نظیری کے شعر پر ظلم کیا ہے ۔ بدمعاملہ کی لفظ سے شعر میں جو خوبی پیدا ہو گئی اس کے لئے غالب کے شعر میں کوئی لفظ نہیں پایا جاتا دوسرا عیب متاع بردہ کی ترکیب ہے اردو میں یہ ترکیب بالکل غیر مانوس ہے ۔ غالب نے نظیری کی خیال کو نظم کرنا چاہا ۔ مگر بن نہ پڑا ۔ اس پر بھی سرقہ کی تعریف صادق آتی ہے ۔

(غالب) شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشا ہے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

(صائب) ز مکر سبحہ شماران خدا نگہ دارد
کہ صد سر است بہ یک حلقہ کمند اینجا

یہ شعر بھی صائب کے شعر سے ماخوذ ہے ۔ مگر صائب کے شعر کے مقابلہ میں غالب

کا یہ شعر نہایت حقیر ہے۔ بندش نہایت سست۔ ترکیبیں غیر مانوس۔ اس کے علاوہ مرغوب آیا اُردو کے روزمرہ کے اعتبار سے بالکل غلط۔ اُردو میں مرغوب ہونا بولتے ہیں۔ مرغوب آنا ہرگز نہیں بولتے۔ دراصل یہ مرغوب آمد کا ترجمہ ہے۔ مگر فارسی محاوروں کا ترجمہ اُردو میں ہر جگہ پسندیدہ نہیں ہوتا۔ اس شعر پر بھی سرقہ کا الزام عائد ہوتا ہے

غالبؔ حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

یہ شعر بھی ملا شیدا کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

گفتن دعا بزلف تو تحصیل حاصل است
با خضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

ملا شیدا کے شعر کے آگے غالبؔ کا نہایت بے وقعت ہے۔ کھلا ہوا سرقہ ہے۔

مومن خاں اُس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

غالبؔ جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

مومن خاں کے شعر میں جو جدت تخیل پائی جاتی ہے غالب کے شعر کو اُس سے کوئی نسبت نہیں۔

مولوی عبدالباری صاحب آسی ہاپوڑی نے غالبؔ کے اس مختصر دیوان سے سوڈیڑھ سو شعر ایسے چھانٹے ہیں جن پر ترجمہ یا سرقہ کی تعریف صادق آتی ہے۔ عُرفی۔ ظہیری۔ نظیری۔ ظہوری۔ بیدل کے سیکڑوں اشعار پر غالبؔ نے دست تصرف دراز

کیا ہے ۔ اور ایسی پیچیدہ فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے ۔ کہ اُردو کی صورت ہی بگڑ گئی ہے ۔ غالب ایسے شخص کے یہاں اس قسم کے تصرفاتِ بیجا نہایت افسوس ناک ہیں ۔ دوسروں کے مال پر تصرف کرنے کا مزہ جب ہے کہ شاعر خود اپنی قوت بھی اس قدر صرف کرے ۔ کہ وہ اسی کی ملک معلوم ہونے لگے ۔ جب تک یہ بات نہ ہوگی آپ سے آپ سرقہ کا الزام عائد ہوگا ۔ مگر ان باتوں کے پرکھنے والے کہاں ہیں ۔ جو اس قسم کے ترجمے اور سرقہ میں فرق پیدا کر سکیں ۔

مولوی عبدالباری صاحب آسی نے دیوان عرفی سے جو غالب کے سرقے دکھائے ہیں ۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

عرفی — حلہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت
تا شہیدان تو گلگوں کفنے ساختہ اند

غالب — اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

عرفی کے شعر کے آگے غالب کے شعر کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی ۔ کھلا ہوا سرقہ ہے ۔

عرفی — غم ہمرہ جاں رفت و نرفتیم بہ منغش
بادے زازل آمدہ و ہمسفر اوست

غالب — قید حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کا شعر عرفی کے شعر کا ترجمہ ہے ۔ مگر اچھا ترجمہ ہے ۔

عرفی — نالہ ام پرورش آموز نہالِ اثر است
در بہارت بنایم کہ سراپا ثمر است

غالب — دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

عرفی — ز فروغ آفتابم نبود خبر کہ بے تو،
چو دو زلف تست یکساں شب روزم از سیاہی

غالب — جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

عرفی — بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید
ہزار زمزمہ اندر دل بیک پیالہ برآید

غالب — پھر دیکھئے اندازِ گل افشانئ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عرفی — مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموش اند
کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند

غالب — محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خسرو دہلوی — اے گل چو آمدی ز زمین گو چگونہ اند
آں روئے ہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

غالب — سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب کے اس شعر پر سرقہ کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ مضمون غالب کے شعر میں نہایت خوبی سے نظم ہوا ہے۔

بہ بیں اندر رکوع آں پارۂ نور
ہلالش گوی خواہی خواہ ذوالنون

مولوی عبدالباری صاحب آسی فرماتے ہیں کہ ہلال کا رکوع میں ہونا اک نئی بات ہے۔ غالب نے اپنے شعر میں صرف اسی خیال کو لے لیا ہے باقی کو چھوڑ دیا ہے۔ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

ہاں مہ نو سنیں تو اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

لامعلوم — دریاب کہ مانده است ز دل قطرۂ خونے
آں قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

غالب — بساط عجز میں تھا ایک دل اک قطرۂ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

فارسی میں لبریز چکیدن نہایت فصیح مگر اردو میں نہایت قبیح ہے۔ اردو نظم و نثر میں مصادر فارسی کا استعمال اور وہ بھی عطف و اضافت کے ساتھ۔ مکروہ بلکہ حرام ہے۔ اور مرتکب اس جرم کا سوائے غالب اور کوئی نہیں اس کے علاوہ غالب کا یہ شعر سر سے پاؤں تک مضحک و لغو ہے اس پر سرقہ کا عیب المضا

مولوی عبدالباری صاحب آسی نے غالب کے ان اشعار پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ غالب نے اہل فارسی کے اشعار کا ترجمہ کر کے اردو کی شاعری میں

اضافہ کیا ہے اِسے سرقہ نہ سمجھنا چاہیئے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ سرقہ شاعر کے لئے بڑا عیب ہے اور عیب ہمیشہ عیب رہے گا۔ مگر عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیئے۔ غالب مغفور سے جہاں فارسی اشعار کا ترجمہ بن پڑا ہے (جیسا کہ اکثر شعر سے ظاہر ہے) وہ یقیناً قابل مدح ہیں اور اُردو کے لئے سرمایہ ناز ہیں۔ اور جہاں اہل فارس کے کلام پر چھُری پھیری گئی ہے وہ ہرگز قابل تعریف نہیں ٹھر سکتے۔ اس مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ کہ غالب کے اکثر وہ اشعار جو اُن کے لئے سرمایہ ناز سمجھے جاتے تھے اور خاص انھیں کی جدت تخیل کا کرشمہ تصوّر کئے جاتے تھے۔ دراصل وہ غالب کا نتیجہ فکر نہیں ہیں بلکہ اہل عجم کی ملک ہیں۔ بعض مقام پر غالب نے ترجمہ کا حق کافی طور پر ادا کیا ہے۔ اور بعض جگہ سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ زمانہ جس قدر ترقی کرتا جائیگا۔ نظریں جس قدر وسیع ہوتی جائیں گی غالب کا یہ مختصر دیوان اور بھی مختصر ہوتا جائے گا۔ عرفی۔ ظہوری۔ نظیری۔ بیدل کے دیوان ہمیشہ غالب کے مطالعہ میں رہتے تھے۔ ان بزرگواروں کے کلام پر نہ معلوم غالب نے کتنا تصرّف کیا ہے۔ شوق تحقیق جس قدر ترقی کرتا جائیگا حقیقت حال روشن ہوتی جائیگی۔ علامہ فیضی سے شخص پر کسی کو سرقہ کا گمان کبھی ہو سکتا ہے؟ مگر سلمان ساوجی کا شعر دیکھ کر ایک بچہ بھی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ فیضی سرقہ کا مرتکب ہوا کلام پاکیزہ ایسی نعمت ہے۔ کہ غالب تو کیا بڑے بڑے علامہ کے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے دست تصرف بڑھا دیتے ہیں۔ مگر یہ راز پوشیدہ کبھی نہ کبھی کھُل ہی جاتا ہے۔

(مرزا یاس لکھنو مقبرہ گولا گنج)



پردہ

میں اس اصول کے سخت مخالف ہوں کہ اگر ہم مثلاً "پردہ" کے موافق عقیدت رکھتے ہیں تو "پردہ" کی مخالفت میں کوئی مضمون ہمارے رسالہ میں شائع ہونے ہی نہ پائے۔ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ ہماری عقیدت کی بنیاد اتنی کمزور ہے کہ بادِ مخالف کے ایک ہی ادنےٰ سے جھونکے میں اس کی ساری عمارت لڑکھڑا کے زمین پر آ رہیگی۔ مخالفت اور اعتراضات سے ڈرنا اخلاقی کمزوری کی علامت ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ہم کوئی خاص عقیدت رکھتے ہیں ہمارے کچھ اخلاقی محسوسات ہیں تو وہ احساسات اتنے سست اور اتنے کمزور نہ ہونا چاہیئے کہ مخالفت اور اختلاف کی ہوا سے بھی بچتے رہنے کی ضرورت پڑے۔ ہم چھوئی موئی بن کر دُنیا میں رہنے نہیں آئے ہیں۔ اگر ہم دُنیا میں کوئی باعزت اور باوقعت زندگی چاہتے ہیں تو ہمیں ہر قسم کی مخالفت اور اختلاف آرا سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آزاد صاحب کے پرانے دوست جناب مسٹر ایشور سرن صاحب بی اے وکیل ہائیکورٹ الہ آباد نے جو ہمارے صوبہ کے ممتاز گریجویٹ اور لسّان مقرر ہیں ہمارے حال پر توجہ فرما کر ایک مضمون پردہ کی مخالفت میں اشاعت کے لئے بھیجا ہے۔ اصل مضمون انگریزی زبان میں ہے۔ ہم شکریہ کے ساتھ اس کا ترجمہ شائع کرتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مضمون نگار صاحب نے بکشادہ پیشانی نکتہ چینی کی اجازت دیدی ہے۔

معزز مضمون نگار صاحب کے مضمون میں بعض نکات ایسے ہیں جن پر پوری توجہ کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے اور جن سے ہمیں لفظ لفظ اتفاق ہے۔ مثلاً آپ کا یہ فرمانا کہ غیر قوموں کی بیجا تقلید کبھی نہ کرنا چاہئے۔ ہم اس تقلید کو مقلدین کے لئے ازحد شرمناک خیال کرتے ہیں۔ ہماری مستورات کا میم صاحب یا مس صاحب بنجانا ان کے لئے کوئی قابل فخر بات نہیں ہے بلکہ ہر طرح قابل شرم ہے۔ معزز مضمون نگار صاحب بہت صحیح فرماتے ہیں کہ آجتک دنیا میں کسی قوم نے کسی قوم کی نقل اتار کر کوئی مستقل عزت نہیں حاصل کی ہے۔ دوسروں کا سہارا ڈھونڈ کر کھڑے ہونا طاقت کی علامت نہیں ہے ضعف کی علامت ہے۔ خود اپنے بل پر کھڑے ہونا صحت اور تندرستی کی علامت ہے۔ دوسری قوموں کی تقلید کے معنی اہل نظر کے نزدیک صرف یہی ہو سکیں گے کہ ہمارے اسلاف بالکل ناکارہ تھے اور وہ کوئی قابل تقلید نمونہ ہمارے لئے نہیں چھوڑ گئے۔ اور آج مجبور ہو کر ہمیں دوسری قوموں کی روش اختیار کرنا پڑی ہے۔ ہماری قومی خصوصیات کو اس کورانہ تقلید سے ایک شدید نہ ضرب لگتی ہے۔

یہ سب کچھ تو درست و بجا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمیں کبھی اور کسی حال میں اپنی قومی خصوصیات زائل نہ ہونے دینا چاہئے۔ مگر کیا معزز مضمون نگار صاحب بھول جاتے ہیں کہ بعض اور باتوں کی طرح "پردہ" بھی ہماری قومی خصوصیات سے ہے۔ اور ہم مسلمان مستورات کا پردہ سے دست کش ہونا سوا اس کے اور کچھ معنی نہیں رکھ سکتا کہ اسی کے ساتھ ہم نے اپنی قومی خصوصیات میں سے ایک اہم اور دیرینہ خصوصیت علیحدہ کر دی۔ اسلام میں پردہ کی عمر تیرہ سو برس کی ہے۔ اور اس رسم

کے ساتھ مذہبی احکام کی معیت اس رسم کو ہماری قومیت کا ایک جزو لاینفک بنا رہی ہو
یہ بالکل دوسری ہی بحث ہے کہ جس شدت اور سختی کا پردہ ممالک متحدہ میں رائج ہے
آیا اس کو اسی حال میں اسی صورت میں اسی حد تک قائم رکھنا چاہیئے یا اس میں کسی
ترمیم کسی ردو بدل کی گنجایش ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ پردہ باہمی میل جول اور ارتباط
کی راہ میں حائل ہے اور ہماری قومی ترقی میں سدراہ بنکر کھڑا ہو گیا ہے ۔ یہ دن ہمارے
زوال کے ہیں ۔ آپکا جو جی چاہے کہ لیجئے ۔ جس بات کو چاہئے ہمارے زوال کا
باعث قرار دے لیجئے ۔ جس چیز کو چاہئے ہماری ترقی میں سدراہ بنا بتا دیجئے ۔
مگر تواریخ عالم کے اوراق الٹ کر دیکھ لیجئے کہ ہمارے عروج کے زمانہ میں ہماری دادیوں
اور پردادیوں نے کیا کیا کر دکھایا تھا ۔ علوم وفنون کا ذکر تو درکنار یہ بیبیاں گھوڑے
کی پیٹھ پر بیٹھ کر تلوار سے دشمن کا مقابلہ کرتی تھیں اور بہادری میں ان کے کارنامے
کسی بہادر مرد سے کم نہیں ہوتے تھے ۔ ہماری تاریخ میں ایک واقعہ ایسا بھی ہے جہاں
ان نیک اور جانباز بیویوں نے خیمہ کے چوبوں سے تلوار اور نیزہ کا مقابلہ کیا ہے
اور دشمن کو مار بھگایا ہے ۔ اسی طرح جنگ احد میں بھی جہاں رسول اللہ صلعم کے
جسم مبارک پر اتنی سے اوپر زخم آچکے تھے اور زخموں سے چور ہو کر آپ ایک غار
میں گر پڑے تھے ۔ اس نازک موقع پر بھی جانباز صحابہ کرام کے ساتھ یہ پردہ نشین
بیویاں بھی برہنہ شمشیر ہاتھ میں لئے ہوئے داد شجاعت دے رہی تھیں ۔ کہاں دشمن
کی فوج تین ہزار اور کہاں ان جانباز صحابہ اور ان پردہ نشین خواتین کے چند انے
گنے پاک نفوس ۔ مگر انجام یہ ہوا کہ دشمن کچھ نہ کر سکا اور اسے ناکام ہی واپس جانا
پڑا مسلمان خواتین کو پردہ سے باہر نکال کر میموں کی طرح بے تکلف غیر مردوں سے میل

جول پیدا کرنے دنیا عورتوں کو مرد بنانا ہے۔ہم مسلمان خواتین اپنی حدود اچھی طرح
پہچانتی ہیں۔ اور ہمیں مرد بننے کی تمنا نہ کبھی تھی نہ اب ہوسکتی ہے۔ اگر اسلامی ملکوں
کی سی سہولتیں اس ملک میں بھی پیدا ہوسکیں تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا اگر ہم اپنا پردہ
یہاں بھی اسی حد پر لاکے قائم کردیں جس حد پر کہ وہاں قائم ہے۔ اور وہی شعار
خود بھی اختیار کرلیں۔ مگر جب تک ہماری راہ میں یہ رکاوٹیں حائل ہیں جنکی تفصیل
چنداں ضروری نہیں ہے ہم اپنی موجودہ روش بدلنے پر کیونکر مجبور کئے جاسکتے ہیں
ہمیں بڑا مزا اس بات پر آرہا ہے کہ معزز مضمون نگار صاحب ساری دنیا کو
تو پردہ سے باہر نکال رہے ہیں مگر اپنی بیگم صاحبہ سے کچھ نہیں بولتے۔ کیا وہ مجھے
اجازت دیں گے اگر میں اپنے ذاتی تجربہ سے عرض کروں کہ ہم پرانی دقیانوسی
خیال والی بیچاریاں تو صرف مردوں ہی سے پردہ کرنے پر قناعت کرتی ہیں مگر انکی
معزز بیگم صاحبہ تو مستورات سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ میرا قیام کافی عرصہ تک شہر
گورکھپور میں رہا۔ ہمارے بھائی صاحب کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ سے زیادہ ایک
فرلانگ کے فاصلہ پر تھا اور وہاں ان کی بیگم صاحبہ موجود تھیں مگر مجھے افسوس ہے
کہ باوجود ان تمام دیرینہ مراسم کے جو بھائی ایشور سرن صاحب سے اور آزاد صاحب
سے ہیں اور باوجود میرے بارہا تحریک کے مجھے معزز بیگم صاحبہ سے ملاقات کی تمنا
ہی دل میں لیکر گورکھپور سے واپس آنا پڑا۔ یہ تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ مردوں
سے وہ اتنا ہی پردہ کرتی ہیں جتنا ہم سب کرتے ہیں۔ مگر عورتوں سے پردہ کرنے
میں وہ ہم سب سے بہت آگے ہیں۔ کیسا اچھا ہوتا اگر معزز بھائی صاحب یہ اصلاح
گھر ہی سے شروع کرتے۔ میں تو اس دن دو رکعت نماز شکرانہ پڑھوں گی جس دن

وہ عورتوں سے پردہ کرنا چھوڑ دیں گی۔ مگر بھائی ایشور سرن صاحب کی راستے میں تو عورتوں کا مردوں سے پردہ کرنا ہماری قومی ترقی میں سد راہ بن رہا ہے۔ شاید عورتوں کا عورتوں سے پردہ کرنا باہمی میل جول اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوا ہو

قابل مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ ملکی اتحاد کو پیش نظر رکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا ہندو یا مسلمان ہونا پس پشت ڈال دینا چاہئے۔ وہ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں اس کے بعد ہندو یا مسلمان۔ ہم مسلمان ملکی اتحاد کے لئے دل و جان سے حاضر ہیں۔ اور ہندو بھائیوں بہنوں سے ہم ہمیشہ دو قدم آگے ہی آگے نظر آئیں گے۔ مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی قومیت کو اس اتحاد کے بت پر قربانی بنا کے چڑھا دیں۔ اگر ہم مسلمان ہی نہیں ہیں تو آپ اتحاد کس سے کر رہے ہیں؟ آپ تو مسلمان سے اتحاد کرنے کے لئے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ مگر جب آپ ہماری زبان ہی بند کئے لیتے ہیں اور ہمیں اتنا بھی نہیں کہنے دیتے کہ ہم مسلمان ہیں تو پھر آپ کیونکر کہہ سکیں گے کہ آپ مسلمان سے اتحاد کر رہے ہیں۔ ہمیں صاف گوئی کے لئے معاف فرمائیے۔ اگر ہم مسلمان ہی نہیں ہیں تو ہم کچھ نہیں ہیں اور نہ کچھ ہو سکتے ہیں۔ ہم تو سب سے پہلے مسلمان ہیں اور مسلمان ہونا ہی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ ہم سے اتحاد قائم کرتے ہیں تو آپ یہ دیکھ اور سمجھ کر اتحاد قائم کیجئے کہ آپ مسلمان سے اتحاد قائم کر رہے ہیں نہ کہ ایک ایسی ہستی سے جسے اس کی بھی پرواہ نہ ہو کہ وہ مسلمان ہے یا کوئی اور۔ علی ہذا ہم آپ سے بھی یہ سخت اور غیر واجبی مطالبہ نہیں کرتے کہ ہم سے اتحاد قائم کرنے سے پہلے آپ اپنی قومیت کو خیرباد کہہ دیجئے۔ اگر اس اتحاد کی یہ

قیمت قرار دیجائے گی تو آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اتنی سخت قیمت پر اسے کون خرید سکیگا! ہم معزز سر علی امام صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی بھی کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ ہر ہر بات میں جا اور بیجا اُنہیں کی مذہبی تقلید پر کمر بستہ ہو جائیں۔ اگر چند بڑے نام والے افراد اپنی پسند اور اپنی خوشی سے کوئی نئی راہ اختیار کرلیں جو واقعی نہایت ہی خطرناک ہو تو وہ اپنی ذاتی ذمہ داری پر خود اپنی ذات کے لئے جو روش چاہیں اختیار کرلیں۔ ہم اُن کے مزاحم نہیں ہوتے۔ مگر ہم سے یہ اُمید رکھنا فضول ہے کہ ہم بھی آنکھیں بند کرکے اسی راہ اُن کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیں گے یہ تو نہ ہم سے ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی کہ ملکی اتحاد قائم کرنے کے لئے یہ سخت شرط کیوں پیش کی جاتی ہے کہ پہلے ہم اپنی قومیت سے دست بردار ہولیں اس کے بعد ملکی اتحاد کا نام لیں۔ کیا اس ملکی اتحاد کے مذہب میں بپتسمہ لینے کے لئے یہ کلمہ پڑھنا۔ اس پر خلوص عقیدت سے بے دلیل ایمان لانا لازمی ہے؟ اس بحث کے موافق کوئی صاف وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہم کو اب تک بتائی گئی ہے۔ کیا معزز بہائی صاحب مہربانی فرماکے اس کی وجہ معہ دلائل اور براہین کے ہمکو سمجھا دیں گے؟ کیا جس طرح کہا جاتا ہے کہ بے دلیل مان لو اللہ ایک ہے اسی طرح اس ملکی اتحاد کے مذہب میں بھی آپ ہم سے اقرار باللسان اور تصدیق القلب کرانا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور کوئی معقول وجوہ و دلائل اور براہین بھی ہیں تو ہم بیحد مشکور رہوں گے اگر آپ اُنہیں بیان کرنے کی زحمت

گوارہ فرمائینگے۔ جب تک اسی دلائل سے پڑا ہیں اور وجوہ پیش نہ کئے جائیں گے ہمارا راسخ عقیدہ یہی رہیگا کہ یہ لایعنی شرط نہ صرف بے ضرورت بلکہ بالکل فضول ہے اور بجائے اس کے کہ کسی طرح مفید ثابت ہو اور اُلٹے اس ملکی اتحاد کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ آپ کو ہماری اتحاد سے مطلب ہے یا ہماری قومیت یا مذہب سے؟ اگر ہماری قومیت اور ہمارے مذہب سے آپ کو کوئی بحث نہیں ہے جیسی کہ واقعی نہ ہونا چاہئے تو پھر اس بیکار محض اور بالکل فضول اور غیر ضروری شرط کے پیش کرنے سے کیا حاصل ہوا!

ہمیں اعتراف ہے کہ ہندو خواتین کے نقطہ خیال سے نہ انکی تاریخ میں پردہ کی عمر اتنی دراز ہے اور نہ پردہ اُن کی قومی خصوصیات میں داخل ہے۔ ایسی صورت میں اس مقابلہ میں ہمارے اور اُن کے نقطہ خیال میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور اگر وہ پردہ سے باہر نکل آنے کا قطعی فیصلہ کرلیں تو یہ فیصلہ ہم پر کوئی اثر ڈال نہیں سکتا۔

ہم ہر ایسی تحریک پر بکشادہ پیشانی غور کرنے کے لئے تیار ہیں جس سے ہماری قومی خصوصیات برقرار رہ سکیں۔ قومی خصوصیات سے علیحدگی آگے چل کر ایک نہ ایک دن ہماری قومی ہستی کو معرض خطر میں ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور ہم کوئی گناہ نہیں کرتے اگر اسے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔

معزز بہا نصاحب اپنے مضمون میں خود فرماتے ہیں کہ وہ ہم سے یورپین اقوام کی تقلید کرانا نہیں چاہتے۔ مگر وہ اس سے بھی انکار نہیں کرسکتے۔ کہ ان خیالات کی اصلی محرک انگریزی تعلیم اور یورپین طرز معاشرت کا نمونہ ہی گھوم پھر کے ٹھہرتا ہے۔ اس وجہ سے کہ آج سے بیس تیس برس پہلے تو کسی صاحب کو ایسی ضروریات محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ آج جو محسوس ہو رہی ہیں تو آخر کیوں ہو رہی ہیں؟ اس کے اصلی اسباب کیا ہیں؟ کیا یہ

پردہ کی بیخ کنی گھوم پھر کر در پردہ انگریزوں ہی کی طرز معاشرت کی تقلید نہیں ٹھرتی۔ چاہے بادی النظر میں قابل مضمون نگار صاحب محسوس نفرما رہے ہوں۔

معزز مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ "ہم اپنے پرانے قومی شعار پر برقرار رہیں گے ہماری پرانی روش ہماری قدیم ہدایات ہماری قوم تہذیب اور شائستگی ہمیں نہ صرف عزیز ہی ہیں بلکہ اُن کی تقدیس پر عقیدت رکھتے ہیں اور اُن کا دل سے احترام کرتے ہیں۔" جب یہ حال ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں وہ ہمارے اس تیرہ سو برس کے پرانے رواج کو جس کے ساتھ ہمارے قدیم روایات اور ہماری قدیم تہذیب اور شائستگی وابستہ ہیں کس منھ اور کس دل سے بیخ کنی پر آمادہ ہیں! اب یہاں سے معزز بہائی صاحب کا مضمون شروع ہوتا ہے۔

آج ہندوستان کے جسم میں ایک تازہ روح حلول کرگئی ہے۔ ہمارے خوش آیند خوابوں کی تعبیر جلد ظہور میں آنے والی ہے۔ ہماری ساری سرگرمیوں کا ترجمان ایک ہی لفظ ہے "ملکی اتحاد" ہر شخص جو تربیت یافتہ ہونے کا کچھ بھی دعوے رکھتا ہے یا جس کے دل میں ذرا بھی حب وطن ہے وہ سب سے پہلے ہندوستانی ہے۔ اس کے بعد ہندو ہے یا مسلمان۔ اس میں شبہہ نہیں کہ آج بھی بعض تنگ نظر اور جاہل افراد نظر آرہے ہیں جو اپنے زعم باطل میں سمجھ رہے ہیں کہ ملکی اتحاد ایک عارضی نظارہ ہے۔ اور کچھ دن بعد یہ اس طرح غائب ہو جائیگا کہ اس کا نشان راہ بھی نظر نہ آئیگا۔ مگر جو لوگ اہل نظر ہیں وہ صاف صاف روز روشن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں کہ ملکی اتحاد کا عمل شروع ہو گیا ہے اور جس طرح ہر رات کے بعد دن کا ظہور یقینی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی بالکل یقینی ہے کہ ملکی اتحاد کا عمل ایکدن

سارے ملک میں جیتی جاگتی شکل و صورت میں جلوہ افگن دکھائی دیگا۔ میں اس دن کا خواب دیکھ رہا ہوں جب ہم میں سے ہر ایک بلا لحاظ مذہب و ملت قوم اور ذات کے ادر ہند کے قدموں پر پیار۔ محبت۔ خلوص۔ عقیدت اور سچی رفاقت کی قربانی چڑھائیگا۔ کوئی شخص اس خیال خام میں نہ رہے کہ یہ خیالی پلاؤ یونہیں پکتا رہیگا اور اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ مثال کے طور پر سابق ممبر قانون سر علی امام ہی کو دیکھئے۔ انہیں بالکل یاد نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ انہیں محض اتنا ہی یاد ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ میرا مقصد ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی مثال کافی ہے اور میں کوئی اور مثال پیش کرنا نہیں چاہتا۔ یہ خیال صاف اور صریحی نتیجہ ملکی اتحاد کا ہے۔ چاہے آپ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر یہ ایک امر واقعی ہے کہ ملکی اتحاد ہی ایک خیال ہے کہ جو ہماری ساری سرگرمیوں کا سرچشمہ اور رہنما بنا ہوا ہے۔

یہ ملکی اتحاد ہی ہے جو ہمارا خیال ہماری خامیوں اور کمزوریوں کے جانب متوجہ کر رہا ہے۔ ہم ان خامیوں کی اندیشات کو دُور کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے اہم مقاصد انجام دینے کے قابل بن جائیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمیں اپنے تمام جوہروں اور مسلمہ خوبیوں کو نشوونما دینے کی پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ ہم کسی کی تقلید اس مقصد سے نہیں کرنا چاہتے کہ ہم اسی کی نقل اتاریں۔ ہم نئے سبق سیکھنے کے لئے تیار ہیں مگر اسی کے ساتھ ہم نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ ہم اپنے قومی شعار پر برقرار رہیں گے۔ ہماری پرانی روش۔ ہماری قدیم روایات۔ ہماری قدیم تہذیب اور شائستگی ہمیں نہ صرف عزیز ہی ہیں بلکہ ہم ان کی تقدیس پر عقیدت رکھتے ہیں اور ان کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ ہم ہندوستانی ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کچھ اور بننا نہیں

چاہتے۔ ہم اسی ملی اتحاد کی نئی عینک سے اپنے نظام تمدن پر نظر ڈالتے ہیں۔ سب سے
پہلی بات جو ایک ملکی ہمدردی حد سے زیادہ قابل توجہ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مادر ہند
اپنی لڑکیوں کی خدمات سے محروم ہے۔ ہندوستان کو نہ صرف فرزندان وطن کی
خدمات کی ضرورت ہے بلکہ لڑکیوں کی خدمات کی بھی ضرورت ہے۔ دونوں کو
ملکر اپنی متحدہ قوت ہمارے قومی عروج کے پیدا کرنے میں صرف کرنا چاہئے۔ اس
بات کی امید رکھنا دیوانگی ہے کہ محض مردوں ہی کی قوت کسی قوم کو عروج کمال پر
پہنچا سکتی ہے۔ اور جب کوئی ہمدرد ملک اپنی بہنوں اور لڑکیوں کی حالت پر غور
کرتا ہے تو جو شے اس کی نظر کے سامنے ایک دیوار آہن بن کر سامنے نظر آتی ہے
وہ "پردہ" ہے۔ مجھے اس کم بخت رواج کی ابتدائی اصلیت پر بحث کرنا منظور نہیں
ہے۔ بعض لوگ یہ ثابت کرنا اپنے لئے مایۂ ناز تصور کرتے ہیں کہ اس رواج کے
بانی مسلمان ہیں سرگرمی سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچانا چاہتے ہیں کہ یہ رواج ملک
ہندوستان کا ایک قدیم رواج ہے۔ بحیثیت ایک ہمدرد وطن کے میری رائے
میں معاملات کی حالت موجودہ کے اعتبار سے اس قسم کے مباحثے نہ صرف محض
غیر ضروری اور فضول ہیں بلکہ ان سے بہت سے شر پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں دیکھتا
ہوں کہ دونوں نامور قومیں اس ظالم رواج کے ہاتھوں ہلاک ہو رہی ہیں اور
میری قطعی رائے ہے کہ یہ جڑ پیڑ سے غائب کر دیا جائے۔ یہ کام وقت لیگا۔
مگر ہمیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ ہمیں اس دشمن ترقی کے ساتھ کوئی
رعایت کرنا منظور نہیں ہے۔ اسے معدوم ہونا چاہئے۔ اور یہ ضرور معدوم
ہو جائے گا۔

ایک سرسری نظر سے دیکھنے والا بھی کہہ سکتا ہے کہ تعلیم اور پردہ ساتھ ساتھ
چل نہیں سکتا۔ اگر تعلیم سے آپ کا مقصد محض ایک قسم کی کتابی تعلیم ہے تو شاید یہ
ممکن ہوسکیگا کہ ایک قسم کا پردہ قائم رکھہ کر کسی لڑکی کو کچھ کتابی معلومات بہم پہنچا دی
جاسکیں۔ مگر اس قسم کی معلومات کا نام ہرگز تعلیم نہیں ہے۔ دونوں تعلیموں میں
اتنا فرق ہے جتنا سنیدہ (کھریا مٹی) اور پنیر میں ہے۔ ہمیں صاف صاف بتا دینا
چاہیئے کہ لفظ "تعلیم" سے ہمارا کیا مقصد ہے۔ اصلی تعلیم کے ذریعہ سے تعلیم پانے
والے لڑکے یا لڑکی کے تمام تر جوہر۔ قابلیتیں۔ رجحان۔ خیالات۔ میلان طبع۔ اور
احساسات صحیح راستے پر لاکر نشو ونما دیئے جاتے ہیں اور تکمیل کو پہنچائے جاتے
ہیں۔ ہر تعلیم جو اس بلند معیار کی سطح تک نہیں پہنچ سکتی اس کا آپ چاہے جو کچھ
نام رکھہ لیں مگر بلا شبہ وہ تعلیم نہیں ہے۔ کیا ہمارا محض یہی مقصد ہے کہ ہماری
لڑکیوں کو چند کتابیں پڑہا دی جائیں یا ہمارا یہ منشا ہے کہ وہ وطن کی حقیقی لڑکیاں
اور مادر ہند کی سچی خادمہ بنا دی جائیں؟ ایسی تعلیم جو اُنہیں قابل فخر افراد
بنا سکے پردہ کے اندر نہیں دیجا سکتی۔ ہماری غریب لڑکیاں بہت سے امراض
کا شکار بن رہی ہیں محض اسی وجہ سے کہ اُنہیں میدان کی تازہ ہوا اور جسمانی
ورزش میسر نہیں آسکتی۔ اگر آپ میری رائے سے اتفاق نہیں کرتیں تو مہربانی
کرکے مردم شماری کے اعداد ملاحظہ فرمایئے۔ اور لایق ڈاکٹروں سے مشورہ
لیجیئے۔ یہ لوگ آپ کو بتائیں گے کہ جسمانی ورزش کی جتنی ضرورت لڑکوں کو
ہے اتنی ہی لڑکیوں کو بھی ہے۔ ہر باپ اپنے بیس برس کی عمر کے لڑکے سے
اصرار کرتا ہے کہ کرکٹ اور ہاکی کھیلو۔ مگر اس کے احساسات کو ایک سخت صدمہ

پہنچیگا۔ اگر وہ دیکھیگا کہ اس کی چودہ پندرہ برس کی لڑکی مکان کی چار دیواری کے
اندر دوڑ کے چلتی ہے یا کودتی پھاندتی ہے۔ یہ سخت دیوانگی ہے۔ ہم اپنی لڑکیوں
کے بدترین دشمن ہیں۔ ہم انہیں اتنا نحیف و ناتواں بنا دیتے ہیں کہ وہ بہت سے
ایسے امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں جن میں دوسرے حالات کے اندر وہ مبتلا نہ
ہوتیں۔ ان دلشکن حالات کا عموماً پردہ ہی ذمہ دار ہے۔

ہماری مستورات کوئی مفید عام یا ملکی خدمت انجام دینے کے قابل نہیں ہیں
بالعکس ہمدردی۔ رحم۔ سخاوت۔ الوالعزمی۔ ایثار اور وفاشعاری میں ہماری ہندوستانی
خواتین سے کون سبقت لیجا سکتا ہے؟ آج بھی کسی قوم کی مستورات ان اوصاف
میں ان سے سبقت نہیں لیگئی ہیں۔ مگر ایک طور پر ان کے سارے اوصاف حمیدہ
ضائع ہو رہے ہیں جہانتک کہ اس کا تعلق رفاہ عام سے ہے۔ کوئی شریف بیوی
جس سے مجھ سے قرابت یا عزیزداری نہ ہو پھر بھی اس کا ایک بہن کی طرح میری
تیمارداری کا خیال رکھنا ممکن ہے۔ مگر باوجود اس کے اگر میں کسی بدترین قسم کے
خطرناک مرض میں مبتلا ہو جاؤں تو بھی وہ میری تیمارداری نہیں کر سکتی۔ وہ مجبور
ہے کہ وہ اپنے سارے احساسات دبائے رکھے اور اپنی آنکھوں کے سامنے
مجھے مر جانے دے۔ یہ امر فطرت انسانی کے بالکل ہی خلاف ہے۔ عورت کو اللہ
نے ایک رحمت کا فرشتہ بنا کے دُنیا میں بھیجا ہے۔ اور یہ اُسی کا کام ہے کہ جہاں
غم اور مصیبت ہو وہاں اُس کی جگہ فرحت اور خوشی پیدا کر دے۔

ان رفیع خیالات سے قطع نظر کر کے آجکل کے زمانہ میں پردہ نے ایک
نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ شریف مستورات اکثر سفر کرتی

ہیں اور بعض وقت اتفاق سے وہ اکیلی چھوٹ جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر اُن کی
حالت نہایت ہی افسوس ناک ہو جاتی ہے۔ میرے ذاتی تجربہ کے اندر ایسے
ایک ہی دو واقعات نہیں ہیں۔ میں اُن کے مصائب کا حال الفاظ کے ذریعے
سے ادا نہیں کر سکتا۔ ہائے افسوس! ہماری مستورات بالکل بے بس ہو گئی
ہیں اور اُن کی یہ بے بسی ہماری تہذیب اور شائستگی پر ایک بدنما داغ بن کر
چپک گئی ہے۔ زمانۂ سلف میں ہندو اور مسلمان خواتین اس بے بسی کی حالت
میں نہ تھیں۔ ہم کب تک یہ حالت قائم رکھنا چاہتے ہیں؟

کوئی شخص یہ نہ خیال کرے کہ ہم اپنی خواتین سے اُن کی مغربی بہنوں کی
نقل اُتروانا چاہتے ہیں۔ میری قطعی رائے ہے کہ ہماری خواتین اپنی خصوصیات
کا ایک مخصوص طبقہ رکھتی ہیں اور یہ طبقہ قائم اور برقرار رکھنے کی ضرورت ہے (افسوس!
ہماری "روشن خیال" مسلمان عورتیں اس اہم نکتہ پر کبھی غور نہیں فرماتیں۔
ہم بارہا توجہ دلا چکے ہیں۔ ایڈیٹر) میں دُنیا کی کسی شے کے بدلے میں کبھی رضا
مند نہیں ہو سکتا کہ ہماری خواتین (غیر قوموں کی نقل اُتار کے) "غیر ہندوستانی"
بنا دی جائیں۔ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو اوروں کی اندھی نقل اُتارنا
چاہتے ہیں۔ کسی قوم نے کسی دوسری قوم کی نقل اُتار کر کبھی عروج کمال نہیں
حاصل کیا ہے۔ ہر ملک کا مخصوص ذاتی جوہر۔ ہر ملک کی مخصوص مقامی خصوصیات
اُس ملک کا عنصر لطیف یعنی "روح" ہے اور اس روح کو برقرار رکھنے نشو و
نما دینے اور تقویت پہنچانے کی ضرورت ہے۔ وہ ہندوستانی عورت جو میم صاحب
بن جاتی ہے اس کی حالت قابل رحم ہے اگر ہم کوئی سخت لفظ استعمال کرنا

نہیں چاہتے ۔ بعض مرد اپنی خواتین کو اس طرح "غیر ہندوستانی" بنا دینے کے ذمہ دار ہیں ۔ مگر میری عقیدت ملک کی متحدہ قومیت پر ہے ۔ اب مردوں نے "غیر ہندوستانی" طریق ترک کرنا شروع کر دیا ہے (یہ سب مرد ہمارے عزیز ہندو ہی بھائی ہیں ۔ مسلمانوں کے کان پر ابھی تک جوں بھی نہیں رینگی ہے اور جس طرح ہر ترقی کے معاملہ میں وہ ہمیشہ دنیا سے پیچھے چھوٹ جانے کے عادی ہو رہے ہیں آج یہاں بھی وہی حالت نظر آ رہی ہے افسوس ! ۔ ایڈیٹر) اور اب اس خدشہ کا امکان باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری خواتین "غیر ہندوستانی" بن جائیگی ۔ (اللہ کرے ایسا ہی ہو ۔ مگر جہاں تک اس کا تعلق مسلمان خواتین سے ہی مجھے اس خدشہ سے مطمئن ہو جانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ۔ ایڈیٹر)

یہ زمانہ ہمارے جذبات اور دلولوں کا اپنے انتہائی جوش میں آنے کا ہے ۔ "بعضوں کا قول ہے کہ یہ زمانہ ہمارے انتہائے اولعزمی اور ایثار کا مظاہر بنکر رہیگا اگر یہی بات ہے تو ہمیں انتہائے اوالعزمی اور ایثار صرف کرنے کی ضرورت ہے ۔ بے دلی سے ڈرتے ڈرتے ایک قدم آگے بڑھنے اور پھر ایک قدم پیچھے ہٹنے سے کام نہیں چل سکتا ۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ترقی کی منزل میں تیز قدم بڑھائیں تو ہمیں پردہ کی قلیا فوراً ختم کر دینا چاہئے (یہ تو اچھا نمازی کا لگتا ہے ۔ ایڈیٹر) ہمیں اپنی لڑکیوں کو مدرسہ بھیجنا چاہئے ۔ ہمیں ان کی جسمانی صحت پر اتنی ہی توجہ صرف کرنا چاہئے جتنی ہم اپنے لڑکوں پر صرف کرتے ہیں ۔ اور انہیں اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھانا چاہتے ۔ ہمیں انہیں اس قابل بنا دینا چاہئے کہ سوسائٹی (معافی چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی موزوں لفظ سوسائٹی کا مفہوم ادا کرنے کے لئے نہیں

ملا۔ مترجم) سے متعلق اپنے تمام اہم فرائض بوجہ احسن انجام دیسکیں۔ تب ہی یہ بات ممکن ہوسکیگی کہ مادر وطن کو ایسی لڑکیاں دستیاب ہوجائیں جن کا شہرہ پھر ایک بار ساری دنیا میں پھیل جائے۔ ہماری خواتین میں بزرگی کے سارے اوصاف موجود ہیں مگر ہم اُنہیں کوئی موقع نہیں دیتے۔ کوئی سامان بہم نہیں پہنچاتے کہ وہ اپنے جوہروں کو نشو ونما دیکر مصرف میں لاسکیں۔ یہ حالت بے انتہا افسوس ناک ہے۔ اس سے زیادہ کہنا میں نہیں چاہتا۔

میں نے سخت لہجہ میں اظہار خیالات کیا ہے اس وجہ سے کہ میرے محسوسات کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں ہے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ (معزز ناظرین میں سے کوئی صاحب) بُرا نہ مانیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ معزز خواتین اور دیگر حضرات جو اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہوں اس رسالہ کے ناظرین کو اپنے خیالات سے مستفیض ہونے کا موقع دیں گے۔ مجھے نکتہ چینی کا خوف نہیں ہے۔ اختلاف آراء ہی ایک شے ہے جس کے ذریعہ سے صداقت کو جلوہ آرائی کا موقع ملتا ہے۔ اللہ کرے صداقت ہمیں اپنا جلوہ دکھائے اور ہم بیخوف ہوکر اُس کی روشنی میں جادہ پیما ہوں۔

ایشور سرن

پاؤن باون ہیر آئیل

جناب من! یوں تو آپ نے بالوں کے لگانے والے ہزاروں خوشبودار تیل دیکھے ہوں گے لیکن یہ تیل بھی اپنی بیش قیمت اجزا اور عجائب وغرائب خواص کے لحاظ سے یگانہ روزگار ہے۔ درد سر۔ نزلہ۔ زکام فوراً دور۔ بال سیاہ کرنے۔ گھنے اور گھنگریالے چمکدار ملایم بنانے میں اکسیر ثابت ہوا ہے۔ دماغی طاقت کو بڑھانا اس کا اصلی کام ہے۔ اس کی مہک اس قدر تیز ہے۔ کہ شیشی کھولتے ہی خوشبو کی بے اندازہ لپٹیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جس نے ایک دفعہ اس پاؤن باون تیل کا استعمال کیا وہ ہمیشہ کے لئے اس کا شیدائی بن گیا۔

صرف آزمایش شرط ہے۔ قیمت صرف بارہ آنے محصول ڈاک چار آنے

ہر ایک شیشی کے ساتھ انعامی چیزیں ملفوف ہیں

المشتہر

میسرز سلیمان اینڈ روز ۵۲ بار سٹریٹ رنگون

نورالاسلام

مشتری کیوں نہوں احباب زلیخا بنکر　　یوسف مصر معانی سر بازار ہے آج

یہ روزنامہ اخباری اور علمی چمکتے ہوتے مضامین کا جامعہ سیاسۃ اور تمدن و اقتصاد کا ذخیرہ، دینی مذہبی اخلاقی خیالات کا مجموعہ، آسمان تاریخ و تصوف کا پر ضیاء ستارہ دریاء علوم قدیم و جدید کا درخشندہ گوہر، نور صداقت سے مالامال اور تحقیقی نتائج کا تابندہ جوہر، سچی خبروں معتد آراء کا میٹر، مذاقی حیثیت سے سوداگران وذان نمائی کا مینو فکچر، مراسلات کارسپانڈنس اور لوکل کو الفت کا خزینہ، اہل ملک کی عام رائے کا آئینہ، گورنمنٹ اور رعایاء کا خیر اندیش، مشیر دلیسی رؤساء کا ایک عمدہ سفیر نہایت آب و تاب کے ساتھ کرتپور ضلع بجنور سے چند مشہور اہل قلم کی ادارت اور صحافت میں شائع ہوتا ہے۔ شائقین جرائد اور ملکی قدر دانوں سے قدر افزائی اور جوہر شناسی کی امید ہے۔ اس اخبار میں اسلامی ملکی شاہی جذبات مساوات کے ساتھ ہمیشہ درج ہوتے ہیں۔ نمونہ مفت طلب فرما کر ملاحظہ فرمایئں۔ چندہ قیمت ہر حال میں پیشگی لیا جائیگا یہ پرچہ روزانہ ہفتہ وار ہفتہ میں دوبار نکلتا ہے قیمت اشتراکی بابتہ ہفتہ وار چار روپیہ للعہ ہفتہ میں دوبار سات روپیہ معہ، روزانہ پندرہ روپیہ (ﷲ ۵) قیمت عام سے، اور خواص اور والیان ملک اور امراء و رؤساء سے اعلیٰ کاغذ پر مطبوعہ پرچہ کی قیمت دوچند ہوگی۔

اسکے ساتھ ظل سلطانی زنانہ اخبار عرف اخبار النساء ہفتہ وار ھہ اور دو رسالہ ماہوار، ۱۔ نورالعرفان تفسیری مضامین اور تصوف میں (ہے) ۲۔ نور رشیدی شرح مثنوی مولانا روم نظم قیمت چار روپیہ (للعہ)

المشتہر:۔ نورالحسن ذہن مالک ایڈیٹر و منیجر و پروپرائٹر و پرنٹر

از کرتپور ضلع بجنور (روہیلکھنڈ)

ضوابط رسالہ

(عام)

اِس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) اُردو علم ادب کی ترقی اور توسیع میں کوشش کرنا۔ (۲) خصوصیت سے ہندو مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو اور ترقی اتحاد میں ہر جائز طریق سے کوشش کرنا (۳) ان اغراض کے حصول کیلئے فی الحال طریق ذیل اختیار کرنا تجویز ہوا ہے۔ (الف) مسلمان خریداروں سے چندہ رسالانہ یا عہ ششماہی بشمول محصولڈاک قیمت رسالہ وصول کیجائے (ب) ہندو تعلیم یافتہ خواتین جو اُردو لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ اُنہیں رسالہ مفت نذر کیاجائے محصولڈاک بھی رسالہ خود ادا کرے۔ البتہ ہندو خواتین جو بلاقیمت ادا کئے ہوئے پرچہ لینے سے انکار کریں اُنکے خلاف مرضی ہم اُنہیں مجبور بھی نہ کرینگے۔ مگر عموماً و اصولاً اُردو خواں ہندو خواتین کو ہم بلاقیمت رسالہ بھیجیں گے۔ ہم ہمیشہ بلحاظ اشاعت بقیمت۔ بلاقیمت اشاعت کیلئے ایک خاص تعداد معین رکھیں گے اور اپنی وسعت کے مطابق بلاقیمت اشاعت کرتے رہینگے۔ جتنی اشاعت کی ترقی ہوتی جائیگی اتنی ہی بلاقیمت کی اشاعت کی تعداد بتدریج بڑھتی جائیگی (ج) ہم اپنی وسعت و مقدرت کے اندر کوشش کرینگے کہ اعلیٰ پایہ کے اہل قلم بھی اعلیٰ درجہ کے مضامین بھیجیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنیکے لئے ہم وقتاً فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہینگے۔ اور ہم یہ بات باندھتے ہیں کہ ہر ایسا انعام ایک سا ورن یعنی ہے سے کم نہ ہوگا۔ ہر انعامی مضمون کے اعلان کے ساتھ انعام مجوزہ کی اشاعت کیجائیگی۔ اور جس مضمون نگار کو جس مضمون پر انعام دیا جائیگا اُسکی اشاعت بھی وضاحت کے ساتھ کردیجائیگی (د) مستقل مضمون نگار صاحبوں کی خدمت میں رسالہ بلاقیمت پیشکش ہوتا رہے گا

انعامی مضامین

(۱) انعامی مضامین جس مہینے کے پرچہ کیلئے مطلوب ہونگے۔ اُسکا نام بھی شائع کیا جائیگا اور منظور شدہ انعام کا بھی اعلان کیا جائیگا اور نیز اس امر کا کہ وہ مضمون کس وقت تک مطلوب ہوگا (۲) انعامی مضامین پر ہر شخص طبع آزمائی کرنیکا مجاز ہوگا عام اس سے کہ وہ خریدار رسالہ کا ہو یا نہو (۳) تاریخ اور وقت معینہ کے بعد جو مضامین موصول ہونگے وہ شریک مقابلہ نکئے جائینگے۔ دفتر کو اختیار ہو کہ خاص صورتوں میں کسی خلاف معمول چیدہ مضمون کے بارہ میں قاعدہ مذکور سے کسی حد تک تجاوز کرے یعنی بعد میعاد معینہ موصول ہونے پر بھی اُسے شریک مقابلہ ہونے دے (۴) میعاد سے مقصد ہے مقررہ وقت اور گھنٹہ کے اندر (۵) ہر انعام ذریعہ منی آرڈر بھیجا جائیگا اور رقم منظور شدہ انعام سے محسوب کیا جائیگا

اشتہارات

شرح اُجرت اشتہارات ذریعہ مراسلت دریافت ہوسکتی ہے۔

قیمت رسالہ

ہندوستان کے لئے - سالانہ Rs 2/- ے
" ششماہی Rs 1/8 بمع محصول
انگلستان کے لئے - سالانہ چار شلنگ

کوئی اشتہار تہذیب و اخلاق کے منافی شائع نہ کیا جاوے گا - دفتر کو ہر وقت اختیار ہو گا کہ جس اشتہار کی اشاعت اسے مناسب نہ معلوم ہو بند کر دے ایسے اشتہار کی رقم وصول شدہ اجرت اشاعت مبلغ وضع کر کے باقی ماندہ اشتہارات مشتہرہ بقیہ واپس کر دی جاویگی -

ایجنسی - اسکے قواعد درخواست کرنے پر دفتر سے بلا قیمت ملینگے -

ایجنٹوں کی ضرورت ناظرین پر ہمارے اغراض و مقاصد روشن ہو چکے ہیں ہم ایک مقام پر بیٹھکر اپنا رسالہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں نہیں پہونچا سکتے - پبلک سے اس طرح ہمارا سیدھا واسطہ (تعلق) ہو گا۔ دیگر یہ بھی معلوم ہو کہ کاروباری آدمیوں کیلئے ہمارے کام کو اسقدر وقت نکالنا ہر صورت میں ہر موقع پر آسان نہیں ہے لہذا ضرورت اس امر کی محسوس ہوئی کہ ہم ایسے پُرجوش اہل بھائیوں کو اپنا شریک حال کریں جنکے پاس کام کم ہے یا جو بیکار ہیں اور بیکاری کے لئے کوئی مشغلہ تلاش کرتے ہیں - ایسے صاحبوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بہت جلد ہم سے مراسلت کریں اور ہمارے دفتر سے ایجنسی کے قواعد منگا کر ملاحظہ فرمائیں - ان قواعد کے پڑھنے سے ظاہر و واضح ہو گا کہ کیونکر ہم ایک دوسرے کیلئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں - وہ لوگ ہماری اشاعت میں ہاتھ بٹائیں اور جتنا وقت وہ ہمارے کام میں صرف کرینگے وہ رائیگاں نہ جائیگا - بلکہ اسکے معاوضہ میں ہم انکی خاطر خواہ مالی اعانت کرنیکو تیار ہیں اس اجمال کی تفصیل ایجنسی کے قواعد کے ملاحظہ سے ہوگی جو ہمارے دفتر سے بلا قیمت ملیگی - ہر قصبہ اور ہر شہر میں ہمیں ایجنٹوں کی ضرورت ہے - پبلک کی اطلاع کیلئے گزارش ہے کہ ہر ایجنٹ کے پاس ہمارا ایجنسی سارٹیفکٹ ہو گا جس پر ہمارے دفتر کی مہر اور ہمارے دستخط ہونگے - ان ایجنٹوں کو قیمت رسالہ وصول کرنیکی اجازت نہیں ہے صاحب خواہش صرف اگلا نمبر رسالہ کا بذریعہ ویلیو پے ایبل بھیجنے کی اجازت دینگے -

خط و کتابت اس پتہ سے کیجئے

مس آزاد
دفتر رسالہ پیام امید
ذریعہ تحصیلدار صاحب صدر تحصیل ...

پرنٹر منشی فضل علی نے اکتوبر ۱۹۱۵ء میں مقام ... تحصیل ... سے ... رسالہ ...

فہرست مضامین فروری ۱۹۱۸ء

امید کا پیام اُٹھو اُٹھو اور آگے بڑھو!

پیامِ امید

نمبر ۳۰	محمود آباد۔ سیتاپور۔ (اودھ) فروری ۱۹۱۶ء	جلد ۴

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے اس میں جنس کی قید نہیں جس حال میں کہ ہزاروں اخبارات اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گزریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔



متفرق نکات

اخبار "تہذیب نسواں" لاہور کی ۸ دسمبر کی اشاعت کے ذریعہ سے جناب مولوی سید ممتاز علی صاحب قبلہ نے "پیام امید" اور اُسکی بے علم جاہل ایڈیٹر کے متعلق جیسا کچھ زہر اُگلا ہے۔ ہماری نظر سے گذرا۔ اس اظہار

حسن ظن کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ وصل علیٰ۔ بندہ مومن کا قلب ایسا ہی صاف ہونا چاہیئے۔ جیسا قلب مولوی صاحب قبلہ کی تحریر کے آئینے کی راہ صاف جھلک رہا ہے۔ ایک بھلے آدمی کو دوسرے بھلے آدمی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیئے۔ جیسا نمونہ ہمارے "خضر نسواں" نے پیش کیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اپنے معاصرین کے ساتھ سلوک کرنے کی اس سے بھی زیادہ نیک توفیق اللہ پاک اُنہیں عطا فرمائے۔

"مخزن" "عصمت" "خاتون" وغیرہ کے ساتھ آج سے پہلے جیسا شریفانہ برتاؤ جناب مولوی صاحب قبلہ فرما چکے ہیں۔ کچھ ویسی ہی توجہ ناچیز "پیام امید" اور اس کی عاجزہ ایڈیٹر کے حال زار پر آپ نے فرمانا شروع کر دی ہے۔ اس حسن ظن کی جزائے خیر اللہ اُنہیں دے۔

عاجزہ تو پیرزادی ہے۔ ہمارا کام گالیاں کھانا ہے۔ گالیاں دینا ہمارا شعار نہیں۔ ہمارے مورث اعلیٰ عرب سے کشمیر میں آئے ہم لوگ کشمیری کہلانے لگے۔ مگر جب وہاں ہم پر مظالم ہونے لگے۔ ہماری جاگیریں ضبط ہوئیں تو ہم خانہ برباد وہاں سے بھاگ کے پنجاب میں پناہ گزین ہوئے۔ بابا داؤد خاکی ہمارے مورث اعلیٰ کا مزار سری نگر کشمیر میں موجود ہے جہاں اب تک باقاعدہ سجادہ نشینی ہوتی ہے اور منتیں مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ یہ ہمارا دادہالی سلسلۂ نسب ہے۔ نانہال کے سلسلے سے ہم مخدوم زادے ہیں۔ تین پشت سے ہم لوگ پنجاب میں آکے بسے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی پنجابی کہے تو ہمیں بُرا ماننے کا کوئی حق نہیں۔ اب میرا مستقل قیام ممالک متحدہ

میں ہے۔ اور ہماری اولاد ہندوستانی کہلائے گی۔ یہ ہے تاویل جناب مولوی صاحب قبلہ کے "ایک پنجابی دوست کی لڑکی کی" ہم لوگ قریشی اور پیرزادے ہیں ہمارا وطن کشمیر بھی ہے پنجاب بھی ہے اور اب ہندوستان یعنی ممالک متحدہ بھی۔

مجھے اپنے قلم سے اپنی تعلیم کے متعلق ایک لفظ بھی لکھنا سخت گناہ سا معلوم ہوتا ہے۔ میرے لئے۔ میری بے علمی ہی میرا افتخار ہے۔ میری تعلیم کے متعلق ابتدائی درجہ کا نام لکھنا بھی فضول ہے۔ ابتدائی درجہ کی تعلیم تو جب ہی کہی جاتی کہ میں مثلاً مڈل پاس ہوتی۔ یا مڈل سے بھی نیچے درجہ تک کچھ تعلیم پائی ہوتی۔ میں نے تو اسکول کی خواب میں بھی صورت نہیں دیکھی پھر جہاں کوئی درجہ ہی نہ ہو وہاں ابتدائی کیسا اور انتہائی کے کیا معنی! یہاں تک تو مولوی صاحب کا جو کچھ جی چاہے شوق سے فرمائیں۔ مگر اس حد سے آگے بڑھ کر اُن کا یہ فرمانا کہ جو مضامین میرے دستخط سے شایع ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں یا آیندہ ہونگے۔ وہ میرے نہیں ہیں۔ بلکہ کسی اور کے ہیں۔ تو اس کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جناب مولوی صاحب قبلہ کو جو کچھ فرمانا ہو صاف الفاظ میں فرمائیں۔ کسی نسوانی پرچے کے مالک ہونے کی یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ پرائی بہو بیٹیوں کا تو بے اُن کی اجازت کے نام چھاپتے پھریں مگر خود جو بات فرمائیں وہ گھونگٹ کی آڑ لے کر فرمائیں۔ مولویت اور گھونگٹ میں پہلے تو کوئی رشتہ اتحاد نہ تھا اب اگر ایک نسوانی پرچہ کے مالک اور منیجر ہونے کی رعایت سے گھونگٹ

پسند کیا جاتا ہے تاکہ "خضر نسواں" کے لقب کے ساتھ کوئی معقول موزونیت پیدا کرسے تو دنیا اس بدعت کو گوارہ نہیں کر سکتی۔ مولوی صاحب قبلہ کو باایں ریش وخش یہ گھونگٹ زیب نہیں دیتا۔ اگر انہیں کہنا ہے تو اس گھونگٹ سے باہر نکل کر کھلے میدان میں آئیں اور مردوں کیطرح صاف صاف سیدھے سادے الفاظ میں کہیں کہ عاجزہ کے دستخط سے جو مضامین شایع ہوتے ہیں وہ عاجزہ کے نہیں ہیں بلکہ عمر بکر زید اور خالد کے ہیں۔ اس سے پہلے میں اس لایعنی بکواس کا کوئی جواب نہیں دیسکتی میرے قلم کے مضامین کے متعلق تو گھونگٹ کی آڑ لے کر یہ فرما دیا گیا کہ میرے نہیں ہیں۔ آزاد صاحب کے ہیں۔ مگر اس ترکیب سے کہا گیا کہ سب کچھ کہہ گئے اور پھر کچھ نہیں۔ کسی بات کی جواب دہی اپنے سر لینے سے گریز ہے۔ خیر بقول حضرت کے جو مضامین میرے دستخط سے شایع ہوتے ہیں وہ تو آزاد صاحب کے ہوتے ہیں۔ مگر جو مضامین میری منجھلی بہن عطا بیگم صاحب کے دستخطی شایع ہوئے ہیں۔ وہ کس نے لکھدیے تھے۔ اب آپ اُن کا نام بھی چھپاتے پھرئے۔ خضر نسواں کے معنی شاید خدائی فوجدار کے ہیں۔ میں خود اُن کا پتہ بتاسے دیتی ہوں۔ وہ مسٹر عطا محمد صاحب بی اے۔ ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ (وکیل سرکار) کی بیوی ہیں۔ اُن کا مستقل قیام گوجرانوالہ میں ہے۔ وہ ہماری طرح مفلس نہیں ہیں۔ فضل الٰہی سے اُن کے شوہر کی اوسط ماہواری آمدنی ڈہائی ہزار روپیہ ہے۔ پنجاب میں اُن کا نام آفتاب کی طرح روشن ہے۔ عطا بیگم نے اپنی ذاتی کوشش سے کئی زنانہ مدرسے بھی جاری کئے ہیں۔ مگر وہ کام کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کو ڈھول پیٹنا منظور

نہیں ہے۔ اُن کے دستخطی مضامین کس کے لکھے ہوئے تھے! کیا مسٹر عطا محمد صاحب جب وکالت سے فرصت پاتے ہیں تو جعل سازی کا کام بھی کرتے ہیں۔ اگر کسی کو جرأت ہو تو یہ بھی کہدے۔ مگر گھونگٹ کی سند نہیں ہے۔ جو کہنا ہو صاف صاف کھلے الفاظ میں کہیئے۔ اور مرد میدان بن کر سامنے آئے۔ تاکہ ہر ہر لفظ کا جوابدہ اور مواخذہ دار بن سکے۔ بیچاری عطا بیگم کی نہ صحت ہی ٹھیک رہی اور نہ دنیا کے جھگڑے انہیں فرصت لینے دیتے ہیں۔ اب تو برسوں سے اُن کے مضامین کو آنکھیں ترس گئیں۔ مگر "پیام امید" میں مضمون دینے کی ایک سزا تو انہیں یہی مل گئی کہ اُن کی تعلیم بھی ابتدائی درجوں سے کم قرار پائی۔ ہاں وہ مڈل پاس تو ہیں نہیں اور یہاں تو مڈل کی سند اعلیٰ تعلیم کی بُرہان قاطع ہے اور جس نے ایسی تعلیم نہیں پائی ہو وہ کامل انسان کیا۔ بلکہ اشرف المخلوقات بھی نہیں۔ مولوی صاحب کے ایک "پنجابی دوست" جن کی لڑکی ہونے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ جناب غلام محمد صاحب قبلہ سپروائیزر ریلوے ہیں۔ یہ عہدہ اسسٹنٹ انجنیر کے عہدہ کے مساوی ہے اُن کا قیام اندنوں امرتسر میں ہے۔

جاہل مطلق

عاجزہ

ایڈیٹر

جناب مولوی صاحب قبلہ بقول ایڈیٹر صاحبہ "بایں ریش و خش

گھونگٹ کی آڑ لے کر" اپنے حسنِ زن (حسن ظن) کی ہم سے داد چاہتے ہیں
مگر وہ ہمارے حسن ظن کی کوئی داد دینا نہیں چاہتے۔ ایڈیٹر صاحبہ اپنے بچپن
کے زمانے سے "تہذیب نسواں" کی محض اس وجہ سے خریدار رہیں کہ یہ ایک
زنانہ اخبار ہے۔ "پیام امید" جاری کرتے وقت اُنھوں نے جناب مولوی
صاحب قبلہ کی خدمت میں ایک سال کی قیمت بھیجکر ایک خط لکھا تھا جس کا
مضمون یہ تھا کہ اس روپیہ سے ایک سال کے لئے جس کے نام چاہیں اخبار
جاری کردیں۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ اگر آپ چاہیں گے تو میں قلمی اعانت کو بھی
حاضر ہوں۔ مولوی صاحب قبلہ نے روپیہ تو وصول فرمالیا مگر خط کا کوئی
جواب عنایت نہ فرمایا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے اپنی کتاب "تذکرۃ الانبیاء"
دفتر رسالہ میں ریویو کے لئے بھیجی۔ ایڈیٹر صاحبہ نے اُس میں زبان اور محاورہ
کی بے شمار غلطیاں نکالیں مگر رسالہ پر ریویو کرتے وقت ساری غلطیوں پر
پردہ ڈال دیا۔ البتہ مجھسے ہدایت کی کہ مولوی صاحب کو خط لکھوں۔ میں نے
لکھا کہ اِس کتاب میں زبان اور محاورہ کی سیکڑوں ناقابل معافی غلطیاں ہیں
اگر آپ اجازت دیں تو ہم ایک فہرست اغلاط بنا کے بھیجدیں اور آپ اُن
اغلاط کو "غلط نامہ" کی صورت میں شایع فرمادیں تاکہ کتاب کی صحت ہو جاوے
ہم کسی سے اس کا ذکر نہ کریں گے کہ یہ غلطیاں ہمنے نکالی ہیں۔
مولوی صاحب قبلہ بجائے مشکور ہونے کے اور اُلٹے خفا ہو گئے۔ اور اس کی
بھی پرواہ نہ کی کہ کتاب تو اغلاط سے پاک ہو جائے۔ اگر ایڈیٹر صاحب کی
ابتدائی درجوں سے ہی کم تعلیم کا محض اس قدر ثبوت کافی نہ ثابت ہو تو

ہم اس حد تک طیار ہیں کہ "تہذیب نسواں" کے مسودات مطبع میں بھیجنے سے پہلے جناب مولوی صاحب قبلہ ایڈیٹر صاحبہ کے پاس بھیجدیا کریں اور وہ نظر ثانی کر کے مطبع کو روانہ کر دیا کریں۔ موجودہ صورت میں تو مولوی صاحب قبلہ خود اور اُن کی بہو۔ بیٹے۔ داماد اور سارا گھر ملکر اخبار نکال رہے ہیں۔ مگر اس پر بھی کوئی صفحہ فاش اور ناقابل معافی غلطی سے خالی نہیں ہوتا۔ کیا سوا ہندوستان کے کسی اور ملک میں یہ بات ممکن ہے کہ جس زبان میں اخبار نکالا جاے اُس زبان کی سیکڑوں غلطیاں اُس کے اندر موجود ہوں اور پھر بھی ایسے اخبار کو قیمت دیکر دنیا خرید سکے! کیا مولوی صاحب ہمارے اس حسن ظن کی کوئی داد دینگے کہ مولوی صاحب عربی، فارسی تو درکنار چار سطر صحیح اردو بھی لکھہ نہیں سکتے۔ مگر باوجود اس کے ہم انہیں جناب مولوی صاحب قبلہ ہی کہے جاتے ہیں! البتہ اِس ڈھٹائی کی بھی داد دینا کفر ہے کہ باوجود اس قابلیت کے وہ ایسوں کے منہ آتے ہیں جو اچھی طرح اُنہیں برسوں اُردو سکھا سکتی ہیں۔

ہم نے مانا کہ ایڈیٹر "پیام امید" تو بالکل ہی جاہل ہیں اور ابتدائی صفوں سے بھی کم درجہ تک اُن کی تعلیم ہوئی ہے۔ مگر مولوی صاحب ذرا یہ تو فرماویں کہ "تہذیب نسواں" کی سب سے پہلی ایڈیٹر مولوی صاحب کی زوجہ محترمہ محمدی بیگم مرحومہ نے کہاں تک تعلیم پائی تھی اور مولوی صاحب کی بہو موجودہ ایڈیٹر نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔ ہاں وحیدہ بیگم مرحومہ البتہ لے دے کے اُردو مڈل پاس تھیں جس پر مولوی صاحب کو عمر بھر ناز رہیگا۔ مگر "تہذیب نسواں" کے جیسے بے جوڑ مضامین آج ہوتے ہیں اسی پایہ کے ہمیشہ ہوتے ستھے اور ابتدا،

سے آج تک تو ایک پرچہ بھی ہماری نظر سے نہیں گزرا جو فاش اور ناقابل معافی اغلاط سے پاک کہا جا سکے۔

اسی ۸ دسمبر کے "تہذیب نسواں" میں جہاں "حسن ظن" کے عنوان سے جناب مولوی صاحب قبلہ نے جلے دل کے پھپولے پھوڑے ہیں ایک مضمون صفحہ ۱۱ پر "حسد" کے عنوان سے شایع ہوا ہے جس کی راقمہ اہلیہ عبدالرحمٰن صاحبہ ہیں۔ اس مضمون میں سطور ذیل مولوی صاحب قبلہ کی خاص توجہ کی قابل ہیں۔ کاش اس نیک دل شریف خاتون کی نصیحت پر جو اوروں کے فائدے کے لئے شایع کی گئی ہے خود مولوی صاحب عمل کرنا سیکھتے۔

"حاسد جو اوروں کی تباہی اور بربادی چاہتا ہے اکثر اپنی بھلائی اور ترقی میں کوشش نہیں کرتا۔ اس کو اپنے بنانے کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی کہ دوسروں کے بگڑنے کی آرزو ہوتی ہے۔ جب حسد کی بیماری زور پکڑ جاتی ہے تو وہ لوگوں کے گلے شکوے غیبت اور بدگوئی میں مصروف رہتا ہے تہمت لگانے اور بہتان باندھنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اسلئے حسد کا نام عداوت ہے اور عداوت بھی ایک دوسے نہیں بلکہ ہر خوش نصیب اس کا دشمن ہوتا ہے اور ہروہ اسے ہی جیسے کمبخت سے ملکر خوش ہوتا ہے"

سطور بالا کو دوبارہ اور سہ بارہ بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد مولوی صاحب قبلہ کا دل خود ہی بول اٹھے گا کہ ان سطور کا مصداق کون ٹھیرتا ہے۔

ہم آج پھر حضرت ریاض کے گلچین سے جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے

علیگ کا پر مغز مضمون "انجمن ترقی اُردو" کے "ایجوکیشنل کانفرنس" سے اخراج کے مسئلہ پر شایع کر رہے ہیں۔ معزز مضمون نگار صاحب کی جو رائے مسٹر عبدالحق کے کام کے متعلق ہے ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ مگر جو معقول وجوہ آپ نے لکھنؤ میں اس "انجمن ترقی اُردو" کے منتقل ہونے اور کانفرنس سے علیحدہ کر دیے جانے کے خلاف تحریر فرمائے ہیں وہ ضرور ٹھنڈے دل سے غور کئے جانے کے قابل ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نئی انجمن لکھنؤ یا دہلی یا کسی اور مقام پر قایم ہونے میں کوئی خرابی نہیں ہو سکتی اگر تقسیم کام اور اتحاد عمل کے اصول برقرار رکھ کر کام کیا جائے اور یہ سب انجمنیں ایک ہی واحد مرکزی قوت یعنی ایجوکیشنل کانفرنس کے تابع رہ کر کام کر سکیں۔ اس صورت میں ایک نہیں دس بیس اور شاخیں مختلف مقامات پر کھول دی جائیں تو کام کی رفتار ترقی کی سرعت بدرجہا زیادہ ہو سکتی۔ مگر اس کا بھی ضرور لحاظ رہنا لازم ہے کہ اگر بدقسمتی سے کام کرنے والوں میں سے بعض افراد سے بھی مل جائیں جو اپنی کم عقلی کی وجہ سے کسی معاملہ میں کوئی صائب رائے نہ دے سکتے ہوں یا صحیح اردو میں اپنا مطلب نہ ادا کر سکتے ہوں تو انہیں سمجھا دینا چاہیئے کہ اِن غلط رائے غلط اجتہاد اور غلط اُردو سے زبان کو بجائے فائدہ کے نقصان نہ پہونچائیں اور "ترقی اردو" کے نام سے دنیا کو تنزل اردو کا تماشہ نہ دکھائیں۔ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے حیدرآباد دکن میں ہیں۔ اور مسٹر عبدالحق کی ماتحتی میں "انجمن ترقی اُردو" کے لئے ترجمہ کرنے کے کام میں مصروف ہیں۔ اسی طرح "فرق زبان" کے عنوان سے جناب خواجہ عبدالرؤف

صاحب عشرت لکھنوی کا مضمون بھی "گلچیں" سے نقل کیا گیا ہے ایسے مضامین ہم کبھی نظرانداز نہیں کرسکتے۔

ہم کئی بار قبل ازیں اپنے معزز معاصرین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرا چکے ہیں کہ اردو حروف اور اردو عبارت میں بلا وجہ معقول اور بے ضرورت انگریزی الفاظ لکھنے سے حتی الامکان باز رہیں۔ معزز ہمعصر "ہمدم" کو بھی خاصکر اس قابل اعتراض روش پر ہم توجہ دلا چکے ہیں مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معزز ہمعصر سید جالب دہلوی میں یہ خطرناک مرض روز افزوں ترقی کرتا نظر آرہا ہے۔ ہم لایق ہمعصر کی بڑی عزت کرتے ہیں اور انہیں ایک قابل فخر ایڈیٹر خیال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس خطرناک مرض میں انہیں گرفتار پاکر اور بھی زیادہ رنج ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ۲۳ر دسمبر کے "ہمدم" کے صفحہ ۲ کے سب سے پہلے کالم کا آخری نصف حصہ پیش کرکے ہم دکھاتے ہیں کہ اس مختصر نصف کالم کے اندر کتنی جگہہ انگریزی الفاظ لائے گئے ہیں۔

(۱) "تقریر کے لئے انٹروڈیوس کرتے ہوئے کہا تھا" (۲) پریسیڈنشل ایڈریس (۳) لٹریچر (۴) ایڈریس (۵) ایڈریس (۶) پوزیشن (۷) "تھیا سوفیکل سوسائٹی کو بھی یہ کریڈٹ دیا ہے" (۸) "دونوں سوسائٹیوں کی سرگرمی" (۹) زمانہ حال کی آزادانسٹی ٹیوشنوں کا" معزز ہمعصر خود اس افسوسناک حالت پر غائر نظر ڈالیں اور جلد اس کا علاج شروع کریں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا پڑتا

ہے کہ اس لغت کالم کے اندر بعض انگریزی الفاظ ایسے بھی آتے ہیں جن کا
انگریزی تلفظ غلط اور صاف غلط لکھا گیا ہے۔
مثلاً "مسس" کی جگہ "مسز" یا "تھیا زافیکل سوسائٹی" کی جگہ پر "تھیا سوفیکل سوائٹی"
اس کے علاوہ Woman with silver tongue.
کا اُردو عبارت میں تلفظ "وومیں وسلور ٹنگ" لکھا گیا ہے۔ حالانکہ woman
کا صحیح تلفظ "وومَن" ہے نہ کہ "وومین"۔ "وومَن" بصیغہ جمع البتہ "ویمین" women
ہوجاتا ہے۔ مگر بصیغہ واحد اس کا صحیح تلفظ "وومَن" ہے نہ کہ "وومین"۔ مزید ے
براں سلور ٹنگ Silver tongue کا ترجمہ "سنہری زبان"
کیا گیا ہے۔ حالانکہ سلوَر silver کے معنی چاندی ہیں نہ کہ سونا۔
ہمیں مجبوراً اپنے لایق ہمعصر کی ناگوار نکتہ چینی کرنا پڑتی ہے کیونکہ معمولی
طور پر سمجھانے سے وہ باز نہیں آتے۔ اوّل تو اُردو زبان میں انگریزی لکھنے کی
کوشش سخت ذلیل اور از حد شرمناک ہے۔ دوسرے اُس سے بھی بدرجہا بتر
یہ بات ہے کہ اظہار قابلیت کے لئے کوئی روش اختیار کی جائے مگر اُس سے
بجائے قابلیت ظاہر ہونے کے نتیجہ بالکل ہی برعکس نکلے تو کیسی بری بات ہوگی!
ہم صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ اُردو عبارت میں انگریزی الفاظ لکھہ دینے سے
کوئی شخص انگریزی داں تسلیم نہیں کیا جاسکتا اگر اُسے یہ بات ثابت کرنا ہے
تو انگریزی عبارت انگریزی زبان میں لکھہ کے دنیا کے سامنے پیش کرے اور
غریب اُردو کو تختۂ مشق بنانے سے باز رہے۔

آج کی ڈاک سے اخبار "الفضل" قادیان کی اشاعت مورخہ ۱۰ر دسمبر ہمیں موصول ہوئی ہے جس میں فیصلہ "حق و باطل" کے عنوان سے جناب میرزا محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح ثانی" اور جناب محمد عمر صاحب اسسٹنٹ سرجن میڈیکل کالج لکھنؤ کے مضامین ہم نے بغور دوبارہ اور سہ بارہ پڑھے۔

ہمیں ابتداء ہی سے اس ناگوار اور افسوسناک مباحثہ کے چھڑ جانے پر ازحد ملال تھا۔ مگر تازہ واقعات نے تو ایسی خبیث صورت اختیار کر لی ہے جسے دیکھ کر ہر دردمند دل خون کے آنسو روئے گا۔ اسلام صلح امان اور محبت کا پیام لے کر دنیا میں آیا تھا۔ اسلام غیروں کو اپنا اور دشمنوں کو دوست بنانے آیا تھا نہ اس لئے کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا بن جائے۔ اس سے بڑھ کر ہماری شامت اور ادبار کی کیا دلیل ہو سکتی ہے!

جہاں ہم فرقہ احمدیہ میں سے اُن اِسے گنے چند افراد کو اچھا نہیں سمجھ سکتے جن کے طرزِ عمل کی شکایت ہم آج سے پہلے کر چکے ہیں اور جن کے مفصل حالات جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی اپنی چٹھی کے ذریعہ سے قوم اور ملک پر ظاہر کر چکے ہیں۔ وہاں حق گوئی اور حق پسندی ہمیں اس بات کے تسلیم کر لینے پر بھی مجبور کر رہی ہے کہ قادیانی عقیدت رکھنے والے اور افراد جو اسلامی عقائد میں ہمارے شریک حال ہیں۔ یعنی خدا و رسول اور کلام اللہ پر ہماری ہی طرح عقیدت رکھنے والے ہیں دنیا کی کوئی اور بات اور کوئی کسی قسم کا اختلاف عقیدت اُنہیں دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا۔ جناب میرزا محمود احمد صاحب کے سارے مضمون میں ہمیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا

جو ان اہم اور لازمی عقائد میں انہیں ہم سے جُدا کر سکتا ہو۔ ہم نے مانا کہ ہم جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کو کسی طرح مسیح موعود ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ کبھی کسی حال میں ہو سکتے ہیں۔ ہم نے مانا۔ اس دعوے کو کہ قادیانی صاحب مرحوم کا پایہ جناب سید الشہداء علیہ السلام سے بھی افضل تھا ایک لمحہ کے لئے مان لینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ برعکس اس کے جناب سید الشہداء علیہ السلام کی شان میں اسے سخت اور ناقابل معافی بے ادبی خیال کرتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارے ہی عقیدت کی رو سے آخرالذکر عقیدت رکھنے والا سخت گناہگار اور بُری طرح سخت بازپرس کے قابل تو ضرور ہو جاتا ہی مگر باایں ہمہ اسی عقیدت رکھنے کی بناء پر دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا۔ بے شک وہ گناہ گار ہے۔ مگر مسلمان گناہ گار۔ اس گناہ کی بخشایش کا فیصلہ جناب سید الشہداء علیہ السلام اور اللہ پاک کے ہاتھ ہے۔ ہم کوئی خدائی فوجدار نہیں ہیں۔

حضرت قادیانی مرحوم ایک زبردست عالم تھے۔ کلام اللہ کے حقایق بیان کرنے اور اسلام پر حملہ کرنے والوں کو دنداں شکن جواب دینے میں جو کمال آپ کو حاصل تھا اس کی نظیر زمانہ حال میں بہت ہی کمیاب ہے۔ اور آج بھی بہت سے حضرات ایسے موجود ہیں جو اسلام کی اور مذہبوں پر فضیلت ثابت کرنے میں کمال رکھنے کی وجہ اسی خرمن کی خوشہ چینی بتاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ بالکل سچ بتاتے ہیں۔ اسی کی ایک زندہ مثال جناب خواجہ کمال الدین صاحب کا اسلامی مشن ہے جس نے اسلام کی وہ خدمت کی ہے

کہ باید و شاید۔ کیا خواجہ کمال الدین صاحب کی خدمت جسکی بنا ء جناب قادیانی مرحوم کی تعلیم ہی ٹھیرتی ہے عین قادیانی صاحب مرحوم ہی کی خدمت نہیں کہی جاسکتی؟

کیا حضرت قادیانی مرحوم کی یہ گرانقدر خدمات کسی عزت کے قابل نہیں ہیں! انصاف فرمائیے۔

بحیثیت ایک مسلمان کے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حضرت قادیانی یا اُن کے پیرو مسلمان ہیں یا نہیں۔ اگر وہ مسلمان ہیں تو اُن کے ہمارے اختلاف عقیدت کا ہرگز یہ مقصد نہونا چاہئے کہ ہم ایک دوسرے کو کھاجانے پر تُل جائیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو عیسائیوں میں کم وبیش ساڑھے تین سو فرقے ہیں جن میں سے ہر ایک کے عقاید دوسرے فرقوں سے کچھ نہ کچھ ضرور ہی مختلف ہیں۔ مگر انہیں کبھی اس سے بحث نہیں رہتی۔ ہمارا سب سے پہلا سوال تو یہی ہونا چاہئے۔ کہ تم مسلمان ہو یا نہیں؟ اگر مسلمان ہو تو ہمارے بھائی ہو اور ایسے بھائی ہو جو ہمیں کسی طرح اپنے سگے بھائی سے کم عزیز نہیں ہو سکتا ہم بس اتنے ہی سے واسطہ رکھنا چاہتے ہیں۔ باقی جھگڑوں میں ہم نہیں پڑتے عیسیٰ بدین خود۔ موسیٰ بدین خود۔

کیا یہ بات کبھی کسی طرح ممکن ہوسکتی ہے کہ سارے دنیا کے مسلمان ایک ہی واحد فرقہ کے اندر داخل ہو جائیں؟ اگر ممکن ہو بھی تو کم سے کم یہ کام انسانی طاقت سے باہر ہے۔ پھر اختلاف عقیدت کو اعلان جنگ کی بناء بنانا جہانتک صحیح ہے صاف ظاہر ہے۔

میں جناب حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کو مورد الزام ٹھیرانا نہیں چاہتا
اور نہ میرا یہی مقصد ہے کہ اُن کی مخالفت کرکے قادیانی فرقہ کی تائید پر کمر بستہ ہوں
میرے عرض کرنے کا جو کچھ مقصد اور مدعا ہے وہ یہی ہے کہ جناب خواجہ صاحب
موصوف کی شان بزرگی کے ہر گز کسی حال میں یہ بات شایاں نہیں ہے کہ ایسی
معرکہ آرائیوں کی بناء ڈالی جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ قادیانی حضرات کی
جانب سے جو جو تحریرات شائع ہوئی ہیں وہ سب میری نظر سے نہیں گزری
ہیں۔ میرا منشا محض اسی قدر ہے کہ اس بحث کو اب طول نہ دینا چاہئے۔ جو ہوا
سو ہوا۔ فریقین پچھلی باتوں کو بُھلا دیں۔ اور دونوں اپنے کو ایک چلتی ہوئی مشین
کے پرزے تسلیم کرکے تقسیم کام اور اتحاد عمل کے اصول پر کاربند ہو کر اپنے اپنے
شعبوں کے اندر نظام قایم رکھ کر اسلام کی سچی خدمت انجام دیں۔ جو اصلی مقصد
اُن کے دنیا میں آنے کا ہے۔ بیسویں صدی کی دنیا کا یہی مقولہ ہے۔
"زندہ رہو۔ اور زندہ رہنے دو" جب ایسے ہی ایسے پاک نفوس جن کا کام
خلق اللہ کی رہنمائی کرنا ہے آپس ہی میں لڑنے مرنے پر تل جائیں گے تو پھر
ما و شما کا تو خدا ہی حافظ ہے!

آیندہ کے لئے ہمیں ایک مستقل اصول قایم کرنا چاہئے کہ کوئی فرقہ کسی دوسرے
فرقہ کی اہانت کرنا ایک ناقابل معافی گناہ سمجھے۔ اس وجہ سے کہ اس کا نتیجہ قوم
میں تفرقہ ڈالنا ہے اور انجام اخیر خانہ جنگی اور ساری قوم کی تباہی ہے! اللہ
اس بدبلا سے ہمیں بچائے۔ آمین یارب العالمین۔

ہمارا ادبی نقاد

قوّت خیال

(۳)

جن لوگوں نے انسانی طبیعتوں کا مقابلہ کیا ہے اور زندگی کے معاملات و واقعات کو بغور دیکھا ہے انہیں یہ پتہ بہ آسانی لگ گیا ہے۔ کہ جو شخص کمزور قوت خیال رکھتا ہے، وہ اپنی رائے بدلتا رہتا ہے۔ وہ ایک پہلو چھوڑ کر دوسرا پہلو اختیار کرتا رہتا ہے، اور اسی طرح اُس سے زندگی کے اصلی مقصد کی تکمیل ہونی ناممکن ہے سمندر کی سطح پر تیرنے والے کاگ کی طرح لہروں کے طمانچے کھا کر ہر وقت پہلو بدلنے والے اشخاص مستقل کامیابی حاصل نہیں کر سکتے: بلکہ یہی ہیں وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ ناکامیابی کی شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ جب کسی اہم مقصد کے فیصلہ کا وقت قریب آتا ہے۔ جو اُن کی آیندہ حالت کو تبدیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ فیصلہ کرنے کے بالکل ناقابل ہو جاتے ہیں، موقع آتا ہے، چلا جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ موقعہ نکل گیا۔ وہ اپنی قسمت کا گلہ کرنے لگتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اُن کی ایسی قسمت کس نے بنائی؟ ——— دوسروں کے خیالات نے! کیونکہ اُن میں قوت خیال کے کمزور ہونے کی وجہ سے اپنا کوئی خیال نہیں ہے۔ وہ قوت ارادی نہیں رکھتے۔ کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

ہر شخص کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے خاندان، اور اپنی قوم کی منفعت کے لئے اپنی قوت خیال کی تکمیل کرے۔ بغیر خیالات کی لہروں پر قابو حاصل کئے نہ اُس میں مضبوطی آئیگی اور نہ آزاد خیالی۔ اور نہ اُس کو اپنی شخصیت

کی اہمیت کا خیال پیدا ہوگا۔ بغیر اس کے وہ اپنی طاقت کو مؤثر نہ بنا سکے گا۔ اور نہ اُس کے اخلاق کو اصلی حالت میں فروغ پانے کا موقع ہاتھ آئیگا۔ نہ وہ دوسرے آدمیوں کی غلامی سے اپنے آپ کو بچا سکے گا۔ پہلے آدمی کو سوچنا چاہیے پھر اُس کے بعد مضبوطی کے ساتھ ارادہ کرنا چاہیئے۔ بعدہٗ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے کام میں اس طرح لگنا چاہیئے۔ کہ دقتیں اور مشکلات اُس کو پست ہمت نہ بنا سکیں۔ جو لوگ ان قاعدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی ترقی کے زینہ پر بہت اونچے نظر آتے ہیں۔

انسانی زندگی دراصل خیالات ہی پر موقوف ہے۔ اس صداقت کے قبول کرنے میں شک کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ہر واقعہ خواہ راحت کا ہو یا غم و مصیبت کا، انسان پر گذر کر کالعدم ہوجاتا ہے، لیکن اُس کا خیال اور اُس خیال کا اثر باقی رہتا ہے۔ یہ اثر واقعہ سے بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے اور اُس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مسرت اور راحت کا اثر زندگی کے پودے کے لئے باران رحمت ہی لیکن غم اور مصیبت کا اثر خزاں کا اثر رکھتا ہے۔ وہ نوجوانوں کی اٹھتی جوانی کے لئے عارضۂ دق سے زیادہ خطرناک ہے۔ ایسا خیال ایک گیلی لکڑی کی طرح دل کی انگیٹھی میں دہکتا رہتا ہے۔ نہ اُس سے شعلہ نکلتا ہے۔ کہ ایک ہی مرتبہ جل کر خاتمہ ہوجائے اور نہ دھواں نکلتا ہے۔ یہ زہریلا دھواں ہر وقت اسکی زندگی کو اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اختلاج قلب و کمزوری جگر کے عارضے آج کل عام طور پر لاحق ہوتے رہتے ہیں۔

پست ہمت کرنے والے انتشار انگیز اور فکر افزا خیالات کا دروازہ اُس وقت تک کبھی بند نہیں ہو سکتا جب تک ہم نئے مسرت افزا خیالات کے لئے دروازہ نہ کھولدیں۔ اگر دماغ کو مسرت اور اطمینان کے خیالات سے بھر دیں۔ تو پھر دوسرے خیالات کے لئے گنجایش باقی نہ رہیگی۔ اِس بات کا ثبوت موجود ہے کہ انسان دنیا میں خالی اور کمزوری کے اظہار کے لئے نہیں۔ اپنی طاقتوں کے نصف یا چوتھائی ثبوت دینے کے لئے نہیں۔ بلکہ مکمل حالات کے اظہار کے لئے آیا ہے۔ انسان متوسط زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اونچی سے اونچی چوٹی تک پہنچنے کے لئے بنایا گیا ہے اور وہ نصف یا چوتھائی زندگیاں جو اس وقت دنیا میں ہیں اِس عظیم تعداد میں نظر آتی ہیں۔ خلاف فطرت اور مصنوعی ہیں۔ قدرت کو اُن کی ساخت میں دخل نہیں۔

جو کچھ تمہیں اپنے آپ میں نظر نہیں آتا۔ اس کے حصول کے لئے پوری قوت صرف کرکے خواہشمند ہو اور دلیری سے کہو کہ یہ طاقتیں یہ صفات تمہارا پیدائشی حق ہیں۔ جنہیں تم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور اس صداقت پر پورا یقین رکھو۔ کہ یہ صفات تمہاری ہیں۔ تمہارے اندر موجود ہیں۔ اگر تم اتنا کر سکو گے تو تمہاری فتح یقینی ہے۔

مرزا شہید

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے انجمن ترقی اردو کا انفکاک

اس وقت یہ ایسا مطالبہ پیش ہوا ہے کہ شاید اس سے زیادہ عجیب مطالبہ پبلک میں کم پیش ہوا ہوگا۔ انجمن ترقی اردو نے یہ خیال کر کے کہ (دسمبر ۱۹۱۶ء میں) لکھنؤ میں ایک غیر معمولی اجتماع ہر قسم کی انجمنوں کا ہوگا اور ہر خیال و مقام کے اکابر قوم و ملک وہاں جمع ہوں گے، ہندی کانفرنس بھی منعقد ہوگی، اپنا ایک غیر معمولی اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس سے علیحدہ اردو کانفرنس کے نام سے لکھنؤ میں منعقد کرنا چاہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید کانفرنس انجمن ترقی اردو سے علیحدہ قایم کی جارہی ہے مگر مولوی عبدالحق صاحب نے نہایت صاف لفظوں میں اس غلط فہمی کو رفع کر دیا اور پھر انعقاد کانفرنس تک اس کی نسبت کسی نے کچھ نہیں کہا مگر کانفرنس کے اجلاس کے بعد ہی بعض حلقوں میں یہ گفت و شنود ہونے لگی کہ انجمن کا تعلق ایجوکیشنل کانفرنس سے نہ رہے اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس سبب سے ہندوؤں کو انجمن کی شرکت میں عذر و تامل ہے۔ یکایک ۲۷ر فروری ۱۹۱۷ء کے مشرق میں یہ نوٹ نظر سے گزرا کہ "اب یہ عذر بھی اٹھا دیا گیا اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب راضی ہیں اور غالباً ہر مسلمان راضی ہو جائیگا۔ کہ کسی طرح اردو کی ترقی کی کوشش ہندو مسلمان ملکر کریں" اگرچہ اس نوٹ سے سخت حیرت ہوئی مگر اس کا مفہوم ہی معلوم

ہوتا تھا۔ کہ فیصلہ ہو چکا ہے اور بحث کی گنجایش باقی نہیں رہی ہے، الحمد للہ کہ ۲۹ مارچ ۱۹۱۷ء کے "ہندوستانی" سے اس خیال کی قطعی تردید ہو گئی اور مولوی عبدالحق صاحب (سکرٹری انجمن) نے اس معاملے کو جہاں تک ان کا تعلق ہے بالکل صاف کردیا۔ اس کے بعد اپریل کے الناظر میں صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب کا خط مع کسی قدر حاشیئے کے طبع ہوا۔ اس سے اور بھی واضح ہو گیا کہ کسی قسم کا فیصلہ ہونا تو در کنار خود جناب موصوف نے جو رائے دی ہے وہ محض ایک اصولی اور اجمالی رائے ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر یہ بحث بند نہ کردی جائے تو فیصلے میں عجلت بھی نہ کی جائے اور اس کے تمام مالہٗ و ماعلیہ پر پوری طرح غور کرلیا جائے چونکہ میں اس تجویز انفکاک کو کانفرنس و انجمن کے حق میں نہایت مضر سمجھتا ہوں اس لئے چند ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔ جن پر فیصلے کے قبل غور کرنا مناسب ہے۔

سب سے اول یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا اردو کو ترقی دینا ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد مشخصہ و فرایض میں داخل ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں مجھے یا کسی کو بجز اس کے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کانفرنس کے مطبوعہ قواعد میں مقاصد کانفرنس کا مطالعہ کرلیا جائے۔ اجرا سے کانفرنس کے وقت سے اس وقت تک ترقی اردو کا کام کانفرنس کے اہم ترین مقاصد میں داخل رہا ہے اور تین متواتر دفعات میں اسکے مختلف نوعیات تک کو واضح کردیا گیا ہے۔ اور ان دفعات میں کسی قسم کے ابہام و تاویل کی مطلقاً گنجایش نہیں ہے۔

پس جب تک یہ دفعات مقاصد کانفرنس میں داخل ہیں اُس وقت تک اگر خود سنٹرل اسٹنڈنگ کمیٹی بھی چاہے تو وہ بھی انجمن کے تعلق کو کانفرنس سے منقطع نہیں کرسکتی۔ ہاں اگر کانفرنس ان دفعات کو اپنے اغراض سے خارج کردے اور اردو کی ترقی سے کوئی غرض نہ رکھے اس وقت البتہ انجمن ترقی اردو کی اسے ضرورت نہ رہے گی اور اُس کا تعلق کانفرنس سے منقطع ہوجاتے مگر اس کے قبل ایسا کرنا صریحاً مقاصد معینہ کانفرنس کے خلاف کرنا ہے۔

لیکن اغراض و مقاصد کی عام وسعت کا اندازہ جو حال ہے اس کے لحاظ سے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ آیا یہ دفعات محض کاغذی دفعات ہیں یا کانفرنس نے ان پر کچھ عمل بھی کیا ہے؟ جس شخص کو کانفرنس کے حالات سے واقفیت ہی اور جس نے اس کے مطبوعات کا مطالعہ کیا ہے وہ یقین کے ساتھ یہ کہے گا کہ کانفرنس نے اس امر میں ہر قسم کی کوششیں کی ہیں اور بدو قیام سے وہ اس فرض کو بہت خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہی کہ کانفرنس اپنے بعض دیگر مقاصد پر اس وقت تک کچھ بھی عمل نہ کرسکی تو ترقی اردو کے لئے کانفرنس نے جو کچھ کیا اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اُس نے اسی فرض کو زیادہ اہم و مقدم سمجھا۔ علاوہ اس وسیع لٹریچر کے جو خود کانفرنس کی تقریروں اور نظموں وغیرہ سے پیدا ہوگیا۔ بہت سی مستقل تصانیف کانفرنس ہی کے سبب سے وجود میں آئیں۔ سید محمود مرحوم کی یادگار زمانہ کتاب (تاریخ تعلیم انگریزی) کانفرنس ہی کا نتیجہ ہے۔ مولوی شبلی مرحوم کے رسائل کانفرنس ہی کے اثر سے نکلے گئے۔ سید علی بلگرامی کے متعدد مضامین کانفرنس ہی کے سبب سے

وجود میں آئے، علاوہ ان تصانیف کے جن کا تعلق براہ راست کانفرنس سے ہے سر سیّد مرحوم کے زمانے کا مہتم بالشان علمی کارنامہ کانفرنس و کالج سے کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا، ماسوا اس کے اُردو کی تخریب و اخراج کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اس میں کانفرنس نے اُردو کی جیسی کچھ حمایت کی محتاج بیان نہیں ہے۔ سرکاری مدارس میں اشاعت اُردو کے متعلق تمام ہندوستان میں کانفرنس نے جو کچھ اثر ڈالا، اس کی کسیقدر تفصیل تمہید رپورٹ سالانہ ۱۹۱۳ء سے معلوم ہو سکتی ہے۔ غرضکہ ترقی اُردو کا خیال کانفرنس کے ساتھ وجود میں آیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ منجملہ دیگر ضروریات کے اُردو کا ترقی دینا بھی ایک اہم ضرورت تھی جس کے لئے کانفرنس کا قایم کرنا لازمی سمجھا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب کانفرنس مجموعۃً اُردو کے لئے سب کچھ کر رہی ہے تو پھر ایک علیحدہ انجمن قایم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس کی کیفیت یہ ہے کہ سر سید مرحوم کے انتقال کے بعد علی گڈھ کالج کی جو مایوس کن حالت پیدا ہوگئی وہ اگرچہ نواب محسن الملک مرحوم کی عاقلانہ تدابیر، مسٹر ٹیک متوفیٰ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب و شیخ عبداللہ صاحب و غیرہم کی ان تھک کوششوں سے تھوڑے ہی دنوں کے اندر اندر مبدل بہ امید ہوگئی اور چند برسوں میں مالی و تعلیمی اعتبار سے کالج کی حالت نہایت مستحکم و پائدار ہوگئی۔ مگر افسوس و صد افسوس کہ سر سید کے انتقال کے بعد علی گڈہ کا علمی شیرازہ جو بکھرا تو پھر نہ بندھا، سید محمود مرحوم، مولوی شبلی مرحوم، آغا سجرا

مسٹر آر اور حاجی اسمٰعیل خاں سب یکے بعد دیگرے علیگڈھ سے رخصت ہوگئے اور جو رہے اُن پر بھی ایک طرح کی خاموشی چھا گئی اور پھر وہ رنگ نہ پیدا ہوا جو سرسیدؒ کی زندگی میں تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ نواب محسن الملک کی دوربین نگاہ سے یہ حالت پوشیدہ رہتی مگر انھوں نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ مرکزی حیثیت سے اس کے دوبارہ اجتماع کی کوشش زیادہ مفید نہ ثابت ہوگی۔ اس لئے ۱۹۱۲ء میں بمقام دہلی کانفرنس کے شعبے کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی گئی کہ اہل علم و صاحبان ذوق جہاں کہیں بھی ہوں اس میں شرکت کر سکیں اور کالج اور کانفرنس کے دیگر خرخشوں کا اس پر اثر نہ پڑے۔ مولوی شبلی مرحوم اس کے اول سکرٹری قرار پائے۔ وہ اُن دنوں حیدرآباد میں قیام پذیر تھے۔ اسلئے اس صیغہ کا کام بھی وہیں سے ہوتا رہا جب مولانا لکھنؤ آگئے اور ندوے کی مصروفیتیں بڑھ گئیں تو انھوں نے انجمن کی نظامت سے استعفاء دیدیا اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی ناظم مقرر ہوئے۔ مگر اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک اس عہدے پر قایم نہ رہے اور بالآخر قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا اور انجمن کا دفتر اورنگ آباد کو منتقل ہوگیا۔

اوّل الذکر دو نظامتوں میں انجمن کی ایک مستقل بنیاد قایم ہوگئی اور چند مفید کتابیں بھی انجمن کی طرف سے شایع ہوئیں مگر انجمن کے عملی کاموں کا دور مولوی عبدالحق صاحب کی نظامت سے واقعتاً شروع ہوتا ہے آپ نے انجمن کے کام پر جیسی توجہ کی وہ محتاج بیان نہیں۔ اب انجمن اس درجے پر آگئی کہ کانفرنس اس کے بلکہ اپنے علمی کارناموں پر فخر کر سکے۔ اور جس غرض سے انجمن کانفرنس سے علیحدہ مستقل

حیثیت سے قایم کی گئی تھی وہ غرض اب باحسن وجوہ پوری ہو رہی ہے کہ ایک مجمع گروہ مصنفین و مولفین کا پیدا ہو جائے اور اردو زبان ایک علمی زبان بن جائے۔

انہیں ضرورتوں سے کانفرنس نے شعبہائے تعلیم نسواں و اصلاح تمدن و تعلیمی مردم شماری وغیرہ کے بھی قایم کئے اور یہ شعبے بھی مختلف مرکزوں سے کام کرتے رہے، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس تفرق سے اگرچہ بہت سے مفید کام انجام پاگئے اور انجام پا رہے ہیں مگر نہایت اصولی خرابی اس سے یہ پیدا ہوئی کہ کانفرنس اور مجموعۂ علی گڈہ کی مرکزی قوت کو سخت صدمہ پہنچ رہا ہے، سر سید کی کامیابی کا بڑا راز یہی ہے کہ انھوں نے منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر لیا تھا، بعد کے زمانے میں اس کے برعکس ہوا لیکن اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ لگاؤ ان شعبوں کا کانفرنس سے ہے وہ بھی منقطع کر دیا جائے۔ بلکہ کوشش یہ ہونا چاہئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایسے اسباب مہیا کئے جائیں کہ سب شعبے مرکزی حیثیت سے علی گڈہ سے کام کرنے لگیں اور بکھرا ہوا شیرازہ پھر بندھ جائے۔

ان تمام واقعات و ضروریات کے باوجود انجمن کی جداگانہ ہستی سے بعض اصحاب یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ اس کا تعلق کانفرنس سے منقطع کر کے اُسے اپنی روش پر آزادانہ طور سے چلائیں۔ لیکن ایسے خلاف اصول کام کے لئے کوئی شخص اُسوقت تک آمادہ نہو گا جب تک نہایت ہی قوی اسباب اس کی تائید میں نہوں۔ ایسے سبب دو ہی ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایسا کرنے سے انجمن کو کسی عظیم نفع کی توقع ہو ——— یا

(۲) کسی شدید مضرت سے اس کی حفاظت متصوّر ہو

اگر یہ دونوں سبب نہیں ہیں تو سوا اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض جدّت آفریں طبیعتوں کا رجحان ذاتی اگر اس کا باعث نہیں ہے تو ضرور اس رنگ میں بھی حب وطن پرستی کچھ اپنا کرشمہ دکھانا چاہتی ہے۔ بہرحال ان دونوں اسباب پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کہ اس کی حقیقت عیاں ہو سکے۔

(۱) تمام مباحث میں انجمن کے فائدے کا پہلو دکھایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کانفرنس سے تعلق نہ رہنے کی صورت میں ہندو اصحاب بھی اسمیں شریک ہو جائیں گے لیکن جن لوگوں کو معاملات ملکی کا ذرا بھی تجربہ ہے خوب سمجھتے ہیں کہ کوئی امید اس سے زیادہ موہوم نہیں ہو سکتی کہ ہندو کسی نوع سے بھی انجمن ترقی اردو کی امداد کریں گے، بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن ہندوؤں نے ایسا خیال ظاہر کیا ہے انہوں نے ایک الزامی جواب دیکر اپنا پیچھا چھڑانا چاہا ہے۔

اس موقعہ پر دو سوال از خود پیدا ہوتے ہیں اور انہیں کے صحیح جواب پر اس مسئلے کا تصفیہ منحصر ہے۔

(الف) انجمن میں بحالت موجودہ ہندوؤں کے شمول میں کیا شے مانع ہے؟

(ب) ابتک ہندوؤں کی عام روش اردو کے بارے میں کیا رہی ہے؟

پہلے سوال کا جواب نہایت صاف ہے کہ انجمن کے نظام ترکیبی میں کوئی امر ہندوؤں کے شمول کا مانع نہیں ہے۔ مولوی شبلی مرحوم کی خاص کوشش یہ رہی کہ وہ ہندوؤں کو بھی اس طرف راغب کریں اور اسی خیال سے امراء ہنود وغیرہ سے بھی کتابیں لکھوائیں۔ اور مولوی عبدالحق صاحب تو جس یک جہتی و صلح

پسندی سے کام کرنا چاہتے ہیں وہ ظاہر ہے مگر

مری حسرت تبسم آفریں معلوم ہوتی ہے

چھپی تیرے تبسم میں نہیں معلوم ہوتی ہے

اب جب بعض اطراف سے اخلاقی دباؤ پڑا تو یہ عذر کیا گیا کہ انجمن کا تعلق کانفرنس سے ہے اور کانفرنس مسلمانوں کی تعلیم کی حامی ہے۔ اس لئے ہندو کیونکر اس انجمن میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی مجلس مسلمانوں کی تعلیم کی حمایت کرے تو اس کی ایک آزاد شاخ میں ہندو نہیں شریک ہو سکتے۔ لیکن دوسرے موقعے پر وہ اس کلیے کو قطعاً فراموش کر دیتے ہیں۔ کونسی شئے علی گڈھ کالج سے زیادہ مسلمانوں کی تعلیم کی حامی و کفیل ہے۔ مگر کالج سے بیش از بیش فائدہ حاصل کرنے میں ہندو مطلقاً تامل نہیں کرتے۔ اصل یہ ہے کہ جو قوم اپنے مرکزی کالج کا دروازہ مسلمانوں کے لئے بند کر دے، جس قوم کا ایک یونیورسٹی پروفیسر ایک مسلمان کو ویدکی تعلیم دینے سے انکار کر دے (حالانکہ وید نصاب میں شامل ہو) اس قوم کو رواداری کے اصول پر چلانا بہت مشکل کام ہے۔

دوسرا سوال ہندوؤں کی روش کے متعلق ہے، اس کی نسبت کچھ لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے، لالہ شیو پرشاد کے وقت سے اردو کی تباہی کی جو کوشش شروع ہوئی ہے وہ ہر حال میں برابر ترقی ہی کرتی گئی۔ تا آنکہ مسٹر گندھی کی تقریر صدارت ہندی کانفرنس سنہ ۱۹۱۶ء نے آیندہ کی کل امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ سوا چند کشمیری الاصل ہندوؤں کے دو چار سر برآوردہ ہندوؤں کے نام بھی اس صوبے میں نہیں لئے جا سکتے جو اردو کو ایک آنکھ دیکھنا گوارا کریں (جو چند پرانے خیال کے ہندو

تعصب جدید کے اثر میں نہیں آئے ہیں اُن کا دم ہر طرح غنیمت ہے کہ کچھ تو یادگار اتفاق باقی ہے۔ مگر اس طوفان بے تمیزی میں ان چند نیک صفات افراد کا عام ہندو رائے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے) پس اگر گزشتہ واقعات و تجارب سے آیندہ کی نسبت کوئی رائے قایم کی جا سکتی ہے تو اُردو کی نسبت اس سے زیادہ روشن و قطعی کوئی رائے نہیں ہو سکتی کہ جب تک تعصب کا یہی دور دورہ ہے ہندوؤں سے اُردو کی ترقی کی امید رکھنا ایک نہایت ہی بے بنیاد و فریب دہ خیال ہے اور اس وہم میں پڑ کر ایک چلتے ہوئے کام کو معرض خطر میں ڈالدینا حد درجے کی ناعاقبت اندیشی ہے۔

(۲) دوسری وجہ انجمن کو کسی مضرت سے بچانا۔ اس کی نسبت چند ممکن الوقوع خیالات درج ذیل ہیں اور ان پر من وعن غور کرنے سے یہ سبب بھی بے اصل معلوم ہوتا ہے۔

(الف) ایک بات تو وہی ہندوؤں کا عدم شمول ہے مگر اُس کی جو حالت ہے وہ بیان ہو چکی ہے کہ جو گروہ اُردو کی تخریب کے درپے ہے وہ اپنے کام سے باز نہیں آئیگا۔ بلکہ اس کانفرنس میں ہندوؤں کے اُردو پر حق مرجح ہونے کی بابت تمام شاعرانہ انشا پردازی صرف کرنے کے بعد ہی الہ آباد میں جو کارروائی شروع کی گئی اور جو بہت کوشش کیساتھ پھیلائی جا رہی ہے اُس کا علم اب مخفی نہیں رہا ہے۔

(ب) کانفرنس کا مرکزی اثر انجمن کی آزادانہ کارروائیوں میں خلل انداز ہوتا ہو اُس کی نسبت ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں شکایت کرنیوالے

برعکس شکایت کرتے ہیں یعنی کانفرنس کی عدم توجہی کا گلہ ہے کہ وہ اپنے شعبوں کی طرف سے لاپرواہی (اگرچہ میں خود اس کا معترف نہیں ہوں)

(ج) کچھ دنوں سے علی گڈھ کے کاموں کی جو ہوا خیزی ہو رہی ہے اس کا اثر انجمن پر بھی پڑتا ہے مگر یہ نہایت ہی فتنہ انگیز و نا دانشمندانہ خیال ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ باوجود ان تمام دشواریوں کے جو ناگزیر اسباب سے پیدا ہوتیں یا بالارادہ پیدا کی گئیں۔ اسوقت بھی جو عام اعتماد کالج و کانفرنس کو حاصل ہے وہ مسلمانوں کی کسی اور انجمن کو حاصل نہیں ہے اور نہ کالج، کانفرنس سے کسی انجمن کا وابستہ ہونا اُس کے اعتماد و اعتبار کو بدرجہا بڑہانے والا ہے محافظت و ترقی اردو کے لئے ایک یہی انجمن نہیں ہوئی ہے۔ بہت سی انجمنیں ذی اثر و ذی مقدرت اصحاب کی سرپرستی میں قایم ہوئیں۔ مگر انہوں نے جس حد تک کام کیا یا اُن کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ اسی انجمن کی غیر معمولی ترقی اگرچہ مولوی عبدالحق صاحب کے مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کانفرنس ہی کے تعلق نے انجمن کے وقار و اعتماد کی بنا ڈالی۔ اور مولوی صاحب موصوف نے اسی بنیاد پر عمارت کھڑی کی۔ یہ تعلق ہر حیثیت سے انجمن ہی کے لئے مفید ہے اور جو لوگ اس کے خلاف راے قایم کرتے ہیں وہ صریحی واقعات سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

(د) بقول الناظر انجمن کا کام تنہا مولوی صاحب موصوف کی ذات پر موقوف ہے اور اگر ان کی تھوڑی بہت فرصت جاتی رہے تو انجمن کے سب کام ابتر ہو جائیں یہ ایسا کلیہ ہے کہ اگر اس کلیئے پر احکام جاری کئے جائیں تو کوئی اعزازی کام کرنے والا اپنی جگہہ پر قایم نہیں رہ سکتا آب ندیدہ موزہ ازپاکشیدہ اسی کو کہتے ہیں۔ جب ایسی صورت پیش آئے گی اُسوقت اولاً تو موصوف الیہ خود کوئی انتظام کریں گے اور اگر وہ ایسا نہ کریں اُس وقت کسی کو کچھ کہنے کا حق ہو سکتا ہے۔ مگر محض اس بعید اندیشے سے انجمن کو اورنگ آباد سے لکھنؤ منتقل کرنا درآنحالیکہ یہ نہیں بتایا جاتا کہ لکھنؤ میں مولوی صاحب موصوف کے مثل ذی اثر و صاحب ایثار کام کرنے والا کون ہے۔ جو ان سے زیادہ اپنا وقت اس کام میں دے سکے درحقیقت انجمن کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ دشمنی کرنا ہے۔

(ہ) مگر ان سب سے اہم و قابل توجہ الناظر کا یہ اعتراض ہے کہ "انجمن نام ہے مولوی عبدالحق صاحب اور اُن کے نصف درجن دوستوں کا، یعنی جمہور کو اس میں دخل نہیں ہے اور نہ کانفرنس سے اس کا تعلق منقطع کر دینے اور لکھنؤ میں منتقل کر دینے سے جمہور کا اس میں دخل ہو جائیگا" کسی چلتے ہوئے کام پر اعتراض کرنے کے لئے خیالی طور پر اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے کہ پبلک کی عدم شرکت کی شکایت کی جائے مگر عملی طور پر بتایا جائے کہ علی گڈھ کالج، کانفرنس، مسلم لیگ،

دارالعلوم ندوہ، دارالعلوم دیوبند کونسی انجمن مسلمانوں کی ہے جسمیں
پبلک خود شرکت کے لئے آمادہ ہے۔ یونیورسٹی ایسی اہم تحریک میں
اس کا تجربہ کرکے دیکھہ لیا گیا کہ جن جماعتوں کو حقوق انتخاب دیے
گئے اُن کے کتنے افراد نے اس سے فائدہ اٹھایا اوروں کو جانے
دیجئے، اگریجوئیٹوں کی دلچسپی کا یہ حال ہوا کہ باوجود دفتر کی تمام
کوششوں کے آخر وقت تک بیس جگہوں کے لئے صرف بیس ہی نام
موصول ہوئے حقیقت یہ ہے کہ صحیح معنوں میں نہ کوئی پبلک ہم میں
موجود ہے اور نہ اس کا کوئی عمل و دخل اس قسم کے کاموں میں ہے
لوگوں نے اپنی اپنی ضرورتوں سے خیالی پبلک قایم کرلی ہے یہ
ایسا ہی ہے جیسا کہ عباسیہ کے آخر زمانے میں دیالمہ و آل بویہ سب
کچھہ کرتے تھے نام خلیفہ کا لیتے تھے یا خود ہمارے وہاں اواخر اٹھارہویں
صدی میں پیشوا، وکیل مطلق، سندھیا، مدار المہام، شجاع الدولہ،
وزیر الممالک اور انگریز تجار صاحب دیوان بنکر بادشاہ کے نام سے
ملک کو تہ و بالا کیا کرتے تھے۔

دراصل پبلک کی بحث میں ایک نکتہ اگر مرعی رہے تو جو مغالطہ پیش آتا ہے وہ نہ
پیش آئے۔ وہ یہ کہ ہمارے یہاں پبلک میں ابھی یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوئی ہے
کہ وہ مجموعی حیثیت سے عملاً کسی کام کو با استقلال انجام دے سکے بلکہ جو کام عمدہ
طریقے سے چلائے جاتے ہیں پبلک کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ کام کے
چلانے والے ہمیشہ چند افراد ہی ہوتے ہیں۔ پس دلچسپی اور خود عمل میں فرق ملحوظ رکھنا

چاہتے۔ انجمن سے جواب تھوڑی بہت دلچسپی لوگوں کو پیدا ہوئی
سے پیدا ہوئی ہے کہ اس کا کام سلیقے سے چلنے لگا ہے۔ پس یہ
کو اس میں دخل نہیں ہے (حالانکہ ہر شخص جسکو اردو زبان سے دلچسپ
شرکت کر سکتا ہے) اور لکھنؤ میں انجمن کے مستقر ہو جانے سے پبلک
ہو جائے گا۔ ایک غیر قابل یقین خیال ہے کیونکہ اس وقت تک
اس کی نہیں دی گئی ہے۔ جو لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں انہیں اس
صاف طور پر یہ بتانا چاہیے کہ لکھنؤ میں وہ کون عبدالحق اور ان کے
دوست ہیں جو اورنگ آبادی عبدالحق اور ان کے نصف درجن د
بہتر طریقے سے انجمن کو چلا سکتے ہیں اور اس کی کیا ضمانت ہے
غرضکہ موجودہ تعلق سے کسی قسم کا کوئی نقصان ثابت نہیں
باتیں جو کہی جاتی ہیں وہ محض سطحی ہیں اور مشکل سے کوئی شخص آ
کی موہوم باتوں کی وجہ سے یقینی نقصان برداشت کرے۔
برخلاف ازیں کانفرنس کے تعلق سے جو فوائد ہیں وہ نہا
صاف ہیں۔
(۱) اس تعلق سے خود کانفرنس کی علمی حیثیت سے قا
حیثیت کا قایم رکھنا کانفرنس کا فرض ہے اور اب جدید دفتر
تعلیمی کتب خانہ کے جمع ہو جانے سے کانفرنس کے علمی کاموں کو
اور اس کا اخلاقی اثر انجمن پر بھی پڑے گا۔
(۲) انجمن کی حالت ابھی ایسی مستحکم نہیں ہے کہ وہ

مستغنی ہو جائے اور کوئی بھی اس کا سکرٹیری بنا دیا جائے کام یکساں حیثیت سے چلتا رہے۔ اس حالت میں علی گڈہ کی پختہ روایات انجمن کو ناتجربہ کاروں کا تختۂ مشق بننے سے محفوظ رکھیں گی اور انجمن کی زندگی کے لئے اس کی بیحد ضرورت ہے کہ بے اعتدالیوں سے بچا کر نہایت جچی ہوئی معتدل روش پر اُسے چلایا جائے۔ بہت سے بنے بنائے کام اس قسم کی روک کے اٹھہ جانے کے باعث تیز مزاجونکی جولانی طبع کا شکار ہو کر مٹ گئے یا بگڑ گئے۔

(۴) ایک اصولی امر یہ ہے کہ علی گڈہ کی مرکزیت کو ہر حالت میں بر قرار رکھا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ سرچشمے سے نہریں جاری کی جائیں خود سرچشمے کو تقسیم نہ کیا جائے۔ یونیورسٹی کے معاملے میں علی گڈہ کے مرکزی اثر کا خیال نہ رکھنے سے جو خرابیاں واقع ہوئیں وہ ظاہر ہیں۔

ان تمام حالات کے باوجود بھی جو اصحاب صدق دل سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ انجمن کو کانفرنس سے علیحدہ کئے بغیر وہ انجمن کے توسط سے اردو کی خدمت نہیں کر سکتے اُن کے لئے نہایت صاف راستہ یہ ہے کہ ایک مستقل انجمن لکھنؤ میں قائم کریں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اپنے مضمون مندرجہ ہندوستانی میں بھی صلاح دی ہے۔ اس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ کام کرنے والوں کی تعداد محدود ہے لامحالہ قوت منتشر ہو گی۔ لیکن یہ ایک نہایت ہی بودا اور کمزور خیال ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ خود کام محدود نہیں ہے کیونکہ اب تک باوجود تمام کانفرنسوں اور انجمنوں کے جو کچھ ہوا۔ وہ اُس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔ اگر اردو کی ترقی کے لئے پچاس انجمنیں بھی ہوں اور ہر انجمن ایک ایک شعبہ علم کو اپنے ذمے لے لے تو بھی

نہ توں کام پورا ہوگا۔ رہگیا یہ کہ خود کام کرنے والے محدود ہیں، یہ ایک صریحی مغالطہ ہے۔ درحقیقت کام لیتے نہیں ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ علمی کام ہندوستان میں ابھی کلی مالی مفاد کا ذریعہ نہیں قرار پایا ہے اگر یہ ہو جائے تو کام کرنے والے سیکڑوں موجود ہو جائیں۔ اسی انجمن کو دیکھئے کہ تھوڑا سا سرمایہ جمع ہو گیا تو بہت سے کام کرنے والے مل گئے۔ اعظم گڈھ کا دارالمصنفین اس کی ایک عمدہ مثال ہے اور پانچ سو روپیہ ماہوار کی مستقل امداد اسے نہ ملتی ہوتی تو جو لوگ وہاں کام کر رہے ہیں وہ آج دوسرے مشاغل میں ہوتے۔ پس اصل کام سرمایہ کا جمع کرنا ہے، جمع شدہ سرمایئے کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر دینے کی کوشش کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی مشتبہ ہی کہ سرمایہ منتقل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں، میرا قطعی خیال یہ ہے کہ نہیں ہو سکتا، انجمن کو جو سرمایہ دیا گیا ہے وہ کانفرنس کی ایک شاخ کی حیثیت سے دیا گیا ہے پس جب انجمن کا تعلق کانفرنس سے نہ رہیگا تو یہ سرمایہ یا تو کانفرنس کے عام سرمایے میں شامل ہو جائیگا یا عطا کنندگان کو واپس ہوگا اور چندے اور گرانٹ جو انجمن کو شعبۂ کانفرنس کی حیثیت سے ملتے ہیں وہ سب اس حیثیت سے بند ہو جائیں گے پس نئے ہاتھوں میں جانے کے لئے جو کچھہ باقی رہے گا وہ صرف نام باقی رہیگا۔

"اگر انجمن ترقی اردو" کا نام ایسا دلکش ہے کہ صرف اس کے لئے یہ تمام بحثیں پیدا کی گئی ہیں تو میرے خیال میں اب بھی کوئی اس کا مانع نہیں ہے کہ ایک انجمن اسی نام سے لکھنؤ میں بھی کیوں نہ قایم کر دی جائے اور میں یہاں تک کہوں گا کہ وہی اصحاب جو انجمن ترقی اردو کے رکن ہیں ذاتی حیثیت سے اس جدید انجمن یا کانفرنس

کے بھی رُکن ہو جائیں۔ مگر کام اُس وقت ہوگا جب کوئی کام کرنے والا ہو۔ اور پیٹو ہو
(قاضی) تلمذ حسین (صاحب ایم اے علیگ)

فرق زبان

اُٹھتے اُٹھتے پر جبریل پہ مُنہ ڈال دیا

یہ مصرع تلوار کی تعریف میں ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "تلوار نے پر جبریل پہ مُنہ ڈال دیا" یعنی پر جبریل کٹ گئے۔ مگر ایسا استعمال درست نہیں ہے اسلئے کہ مُنہ ڈالنا محاورہ ہے اور ذی روح کے واسطے بولا جاتا ہے۔ غیر ذی روح کے ساتھ اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اِس طرح بول سکتے ہیں کہ کتے نے پتیلی میں منہ ڈال دیا، گھوڑی نے پانی میں منہ ڈالدیا۔ لیکن اس طرح نہیں بول سکتے کہ چمچے نے پیالے میں مُنہ ڈالدیا۔ اگر ایسا بولنا جائز کر لیا جائے تو زبان کا معیار قایم نہ رہے اور ہر شخص الگ الگ زبان بولنے لگے۔ کوئی کہے "دروازے نے مکان میں مُنہ ڈالدیا۔ چمٹی نے چولہے میں مُنہ ڈالدیا۔ اس صورت میں بہت جلد زبان کی خصوصیت مٹ جائیگی۔ اس لئے ضرور ہوا کہ محاورات مستعلہ عام کی حفاظت کی جائے اور جو کوئی محاورہ خلاف قیاس و اصول زبان استعمال کیا جائے اِس سے احتیاط کرنا چاہیئے تاکہ زبان خراب نہ ہو۔

غصے میں آکے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے

اِس جگہہ پر کڑکڑانا غلط بولا گیا ہے اِس لئے کہ غصے میں جو دانت پیستے ہیں اُسکو دانت کٹکٹانا بولتے اور سردی سے جو دانت بجتے ہیں اُنکو کڑکڑانا بولتے ہیں۔

اُگیں گی بجلیاں اس مزرعِ آشوب حاصل سے

بجلیاں اُگنا محاورہ نہیں ہے اور استعارہ نہیں بن سکتا جب تک کہ بجلیوں کو نخل نہ کہا جاتے۔ بجلی کے واسطے چمکنا اور کڑکنا بولتے ہیں۔ اُگنا کے ساتھ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہاں بجلی کا کڑکنا بھی بولتے ہیں۔

غش دلکو آئے جلوۂ اشعار دیکھکر

جلوۂ اشعار غلط ہے۔ اس لئے کہ اشعار میں جلوہ نہیں ہوتا۔ درحقیقت آجکل لوگوں نے یہ استعارات کی خرابی کی ہے۔ ناقص اور بے معنی استعارہ کہتے ہیں اور اسکو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس طرح کہنا چاہئے کہ جلوۂ آفتاب اشعار یا جلوۂ مہتاب اشعار یا جلوۂ شاہد اشعار کہنا چاہتے اور اسی پر فصحا کی طرز عمل رہی ہے۔

تری محفل سے اے پیرِ مغانِ عاشقی اکثر

"پیرِ مغانِ عاشقی" بھی غلط ترکیب ہے۔ یہ بھی پنجاب کی بگاڑی ہوئی زبان کی تقلید ہے۔ عاشقی کو میخانے سے استعارہ کیا جاتے تو پیرِ مغان کا استعمال صحیح ہو سکتا ہے یعنی پیرِ مغانِ مے خانۂ عاشقی۔ ورنہ عاشقی کا پیرِ مغان کسی نے نظم نہیں کیا۔

جان دینے کو ارادہ کوچۂ قاتل کا ہے

اس کی ترکیب صرفی بالکل غلط ہے۔ اس طرح بولنا چاہئے تھا۔ کہ

جان دینے کا ارادہ کوچۂ قاتل میں ہے

شاعر نے محض ردیف کی پابندی سے شعر کی ترکیب غلط کر دی۔

رات کا انجام ہے تارے ہیں مرجھاتے ہوئے

تاروں کا مرجھانا خلاف محاورہ ہے۔ رات کا انجام ہے یعنی رات آخر ہے یہ

بھی غلط ہے۔ ایسی ایسی جدت سے زبان خراب ہو رہی ہے اور یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ لوگ بغیر زبان کے حاصل کئے نثار اور ناظم بن جاتے ہیں۔

حرص و ہوا سے دب نہ کہیں جائے نور عشق
واجب ہے اس چراغ فروزاں کی احتیاط

چراغ فروزاں کی احتیاط ایسے محل پر نہیں بولتے۔ چراغ حفاظت بولنا چاہیے احتیاط اور حفاظت میں فرق ہے اور یہ غلط ہے کہ ہم احتیاط کی جگہ حفاظت اور حفاظت کی جگہ احتیاط بولیں۔

خدا کے ناز بھی بندہ وہی اُٹھائے گا
بتوں کے ناز ہوں جسنے کبھی اُٹھائے ہوئے

اٹھائے ہوئے ترکیب غلط ہے۔ اُٹھائے ہوں کہنا چاہیئے۔ شاعر نے محض ردیف وقافیے کے لحاظ سے زبان کی صرف ونحو کی مٹی خراب کی۔

پئے توصیف قاتل پاک کرنے کو دہن آیا
کئے ہیں غرغرے زخموں نے آب تیغ قاتل سے

اوّل تو غرغرہ غلط ہے۔ غرارہ بولتے ہیں۔ دوسرے آب تیغ قاتل سے غرارہ کرنا ترکیب مہمل ہے۔

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

معزز ڈاکٹر اقبال صاحب ہمارے ادبی نقاد کی عینک سے

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

ایک زمانہ وہ تھا کہ اُردو مسلمانان ہند کی میراث سمجھی جاتی تھی وہ دَور اب ختم

ہوا۔ زمانہ حال میں اُردو زبان ہندوستان کے مختلف اقوام کے خاندان اجمالی کی جائداد مشترکہ ہے اور اس شاندار میراث کے حقدار جیسے مسلمان ہیں ویسے ہی ہمارے ہندو بھائی ہیں۔ ہندوستان کے قومی اور ملکی اتحاد کے مسئلہ کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے سامنے مختلف ہندی قوموں کی مشترکہ زبان کا مسئلہ درپیش ہے اور یہ مسئلہ ہمیں حل کرنا پڑے گا۔ اگر ہم تدبر اور دانشمندی سے کام نہ لیں گے اور موجودہ روش پر چلے جائیں گے تو ہی زبان کا مسئلہ بھر جدا گانہ فرقہ بندی کی بنا ڈال دیگا اور کسی مصلح قوم کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوگی۔ ہمارے ہندو بھائی فطرتاً ہندی کی حمایت پر کمر بستہ ہو جائیں گے کہ ہندی ہی ہماری ہندی بین الاقوامی مشترکہ زبان بنائی جائے اور مسلمان اسی طرح چاہیں گے کہ اُردو بنائی جائے۔ ہمارے موجودہ روش پر قایم رہنے کی حالت میں اس گتھی کا سلجھانا سخت دشوار نظر آئیگا اسوجہ سے کہ ایک طرف تو معزز ڈاکٹر اقبال صاحب اور اُن کے مقلدین آغا حشر صاحب وغیرہ اُردو کو فارسی آمیز اردو کی صورت میں اسٹیج پر لانا چاہیں گے دوسری طرف ہمارے مکرم حضرت اکبر الہ آبادی دیسی عیسائیوں کی زبان "گڈامی اُردو" کو ٹکسالی زبان کا جامہ پہنا کر ملک کے سامنے پیش کریں گے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی زبان ہماری مختلف اللسان ہندی اقوام کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتی جب تک وہ ایسی عام فہم نہ بن جائے کہ اُسے مختلف حصۂ ملک کے لوگ اچھی طرح نہ سمجھ سکیں۔ رہی رسم خط تو اس کے جدا رکھنے میں ہمارا کوئی ہرج نہیں ہے۔ ہم واحد زبان کے حامی ہیں۔ واحد رسم خط کے حامی نہیں ہیں۔ لہذا اگر ہم اُردو کے سچے بہی خواہ ہیں تو ہمارا فرض اوّلین یہ ہونا چاہیئے کہ اُردو

زبان کو اس کام کے قابل بننے دینے کی راہ میں کانٹے نہ بوئیں۔ ہمیں معزز ڈاکٹر اقبال سے بے حد عقیدت ہی مگر ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے ان اہم نکات پر کبھی غور نہیں فرمایا۔ معزز ڈاکٹر اقبال صاحب سے ہم یہ امید رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسی راہ اختیار کریں کہ اُن کی ترقی زبان کی ترقی کہی جا سکے۔ اور آنکھیں کھول کر دیکھیے تو یہی ترقی دیرپا ہوگی۔ موجودہ صورت میں معزز ڈاکٹر صاحب کی ترقی ایک شخصی ترقی سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں رکھ سکتی۔ زبان یا تو بالکل ہی علیحدہ رہی جاتی ہے۔ یا اگر ساتھ دیتی ہے تو ایسی سخت مشکل میں گرفتار ہو جاتی ہے کہ اُس کی جان بری محال ٹھیرتی ہے۔

دوسری بات جو ہمیں معزز ڈاکٹر صاحب کے گوش گذار کرنا ہے یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کو آیندہ نسلوں کا شاعر بنانا چاہتے ہیں۔ ایسا شاعر جسے زمانہ فنا نہ کر سکے۔ یہ تو ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ فارسی آمیز اُردو اور مشکل فہم طرز ادا کا قیام عارضی ہے۔ زمانہ اسے قایم نہیں رکھ سکتا۔ اگر اُردو زبان کی ہستی ایسی ہی زبان اسی طرز ادا میں مسخ ہو گئی تو اسی کے ساتھ اُردو کا بھی فنا ہو جانا یقینی ہے۔ لہذا اس سے علیحدگی اختیار کرنیکی شدید ضرورت ہے مگر اس کے علاوہ ہمیں ایسی ہی ضروری ایک بات یہ بھی عرض کرنا ہے کہ گرد و پیش کی دنیا سرعت کے ساتھ بدل رہی ہے۔ اب سے دس بیس برس پہلے دنیا کا کیا رنگ تھا اور اب کیا ہو گیا۔ دور نجائیے ہندوستان ہی میں اس کا تماشہ دیکھ لیجیے آج سے بیس برس پہلے بنگالی اور گجراتی زبانوں کا کیا پایہ تھا۔ اُنکی کیا حالت تھی۔ اب اُنکا کیا پایہ ہی اور کیا حالت ہو گئی ہے۔ یہانتک کہ بنگال نے ایک سربند رانا تھ ٹیگور بھی پیدا کرکے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ بنگال نے علم و فضل میں ترقی کی اور اُس نے مذاق

شاعری بدلا اور جب اُس کا مذاق شاعری مہذب دنیا کے مذاق شاعری کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا تو مہذب دنیا نے بنگالی شاعر کو سر آنکھوں پر جگہہ دی۔ مہذب دنیا کی عزت کرنے میں باقی اور ساری دنیا نے سروقد استادہ ہوکر فاضل بنگالی شاعر کا خراج تعظیم ادا کیا۔ اہل نظر صاف صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہماری اُردو خوان پبلک ترقی کرنے والی دنیا سے کتنی پیچھے ہے۔ مہذب دنیا کے شعراء کے ساتھ ہمصفیر ہونے کی کوشش بڑے صبر استقلال اور محنت شاقہ کا کام ہے۔ مگر اس کا انعام بھی مستقل اور دیرپا ہے اُردو خواں پبلک سے واہ واہ لے لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جو چاہے یہ کھیل کھیل لے۔ مگر آنیوالی نسلیں اسکے بعد کونسا کھیل کھیلینگی؟ اُن کا کھیل ہوگا "یہ گاؤں اُجاڑ اور وہ گاؤں بسایا" جب تک ہماری قوم ترقی نہیں کرتی ہماری بوسیدہ کرم خوردہ شاعری اپنی زندگی کے دن پورے کرتی رہیگی۔ ہماری آیندہ نسلوں کے کان کوئی اور ہی لے تلاش کرینگے اور اگر ہم اُنکے دماغ کے لایق کوئی ترانہ نچھوڑ جائیں گے تو اُنہیں از سرنو کوئی نیا ساز ہی بنانا پڑے گا۔ موجودہ روش کی شاعری ہماری آیندہ نسلوں کے لئے کوئی نشان راہ نہیں چھوڑ رہی ہے اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" والا مقولہ صحیح ہے اور اگر ہم ترقی کرنیوالی دنیا کی صفوں سے دوش بدوش ہوکر کھڑے ہونے کے قابل نہو سکے تو ہمارے بیٹے اور پوتے ضرور اس قابل ہو سکینگے۔ اگر یہ صحیح ہے تو انہیں ضرور از سر نو ایک نیا راستہ بنانا پڑے گا۔ معزز ڈاکٹر اقبال صاحب کے سے تربیت یافتہ اہل دماغ سے دنیا کو یہ امید رکھنے کا حق حاصل ہے کہ بیسویں صدی کی دنیا کی ترقی کرنیوالی صفوں میں بڑھ کے مل جائیں اور اپنے پیچھے پیچھے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو بھی آگے بڑھا لیچلیں۔ اگر ایسی ہی قابل احترام ہستیاں ہو اسکے رُخ پر چلکر اور

چندروزہ واواہ میں پڑکر اپنی آیندہ نسلو پر پانی پھیر دیگی تو ہوا کا رُخ بدلنے کون آئیگا؟ آسمان کے فرشتوں سے ایسی امید فضول ہے۔ ہمارا ادبی نقاد

ہمارا محکمۂ احتساب

(تنقیدات)

کتاب سرور انبیا ، مولفہ جناب پروفیسر حمدی حسین صاحب ناصری۔ ایم اے ایم۔آر۔اے۔ایس مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد "پیام امید" کی تقطیع پر۔ کاغذ سفید لکھائی۔ چھپائی صاف اور خوشخط حجم ۲۰۶ صفحہ دار الترجمہ آل انڈیا۔شیعہ کانفرنس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب ہمارے دفتر میں تنقید کے لئے آئی ہے۔ فاضل مؤلف صاحب نے ان اوراق میں طامس کارلائل مشہور مصنف ملک انگلستان کی کتاب "دی ہیرو اینڈ پرافٹ" کا اردو ترجمہ کر کے مفید حواشی اور چار ضمیمہ جات اضافہ کئے ہیں جنکی تصریح موقعہ مناسب پر کیجائیگی اس ترجمہ کی بعض خصوصیات یہ ہیں۔

فاضل مؤلف صاحب نے ساری کتاب میں انگریزی کا ایک لفظ بھی آنے نہیں دیا ہے۔ اور واقعی اہل علم کا یہی شیوہ ہونا چاہئے۔ ہمارے تجربہ میں اردو زبان میں انگریزی الفاظ زبردستی کھینچ لانے کے محض ایسے ہی حضرات عادی ہیں جو در اصل انگریزی علم میں کامل دستگاہ نہیں رکھتے۔ تھوڑی بہت انگریزی پڑھ لی ہے۔ دلمیں اُمنگ آتی ہے کہ اوروں کی طرح ہمارے انگریزی مضامین بھی اخبارات میں نکلتے۔ ہم بھی کوئی انگریزی کتاب یا رسالہ لکھتے۔ جب اُن کا یہ شوق پورا نہیں ہونے پاتا تو اردو عبارت میں انگریزی الفاظ

زبردستی کھینچ لاتے ہیں دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اور یوں کہو کہ شہید و نیم داخل ہو جاتے ہیں کہ "ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں"! جو حضرات انگریزی میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اُن کا ہرگز یہ شیوہ نہیں ہے بلکہ اسے سخت عیب میں داخل سمجھتے ہیں۔ زبان بُری طرح بگاڑی اور ستیاناس کی جا رہی ہے۔ جو لوگ اس طرح ہم پر اپنی انگریزی دانی کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ سکہ اُردو میں انگریزی لکھنے سے نہ بیٹھا ہے اور نہ کبھی بیٹھ سکتا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ انگریزی عبارت انگریزی زبان میں لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کریں اور مظلوم اُردو زبان کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔

فاضل مؤلف صاحب نے اصطلاحات فلسفہ جدیدہ کا بھی جہاں جہاں وہ سامنے آگئی ہیں اُردو ہی میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ آپ کے حواشی نہایت مفید ہیں۔ اور محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ جہاں جہاں اسلامی عقاید یا جناب سرورِ کائنات صلعم کے حالات بیان کرنے میں اصل مصنف سے لغزش ہوگئی ہے یا جہاں اختلاف عقائد یا خیالات کی وجہ سے واقعی حاشیہ کی ضرورت ہی وہاں فاضل مؤلف صاحب نے زبردست دلائل اور معقول براہین کے ساتھ اپنا بیش قیمت حاشیہ مستزاد فرمایا ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً کارلائل کے یہ الفاظ تھے " ان اُمّی اہل عرب کے قلب کو منور کرنے کے لئے یہی نور آیا تھا۔ یہی عظیم الشان نور جس میں بالاجمال حیات و عالم جبروت کی حقیقت مضمر تھی۔ اُس جہالت کی تاریکی میں جس کا انجام ہلاکت ہی آیا تھا۔ اسی کو آنحضرت وحی اور جبرئیل کہا کرتے تھے" اب یہاں فاضل مؤلف صاحب کا حاشیہ ہے کہ "حکماء کے نزدیک جو فیضان نور دلپذیر ہوتا ہی وہی فرشتہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اہل ملّت کو عقاید حکماء سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیئے"۔ کارلائل نے کہا ہے کہ "اب حضرت کو کبھی غاروں میں پناہ لینی پڑتی ہی اور کبھی بھیس بدل کر

نکل جاتے ہیں" یہ اُسوقت کا ذکر ہے جب حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہ کا انتقال ہو چکا تھا اور اعداے دین جناب رسالت مآب صلعم کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے مگر مصنف کی اس عبارت پر قابل مؤلف صاحب کا حاشیہ ہے کہ جان بچانے کی غرض سے آپکا تبدیل لباس یا تبدیل صورت کرنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح کارلائل نے بیان کیا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ گو وہ اس کی تاویلات پیش کرکے بجاے اختلاف کرنے کے اس طرز عمل سے اتفاق کرتا ہے۔ مگر فاضل مؤلف صاحب نے گاڈفرے ہگینس کے قول سے مدد لیکر ایک اوسط درجہ کا بسیط حاشیہ اضافہ کیا ہے جو اس منطق سے شروع ہوتا ہے کہ "تلوار چلانے کی علت ہاتھ کو حرکت ہے۔ ہاتھ کی حرکت کا باعث حرارت دینی ہے جس سے اُن کی فتح ہوئی۔ اور حرارت دینی کی علت وہ راسخ اعتقاد ہے جو جناب رسالت مآب کے مسائل کے برحق ہونے پر اُنہیں تھا" اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ تلوار میان سے باہر لانے سے پہلے مدینہ فتح ہو گیا تھا یہ فتح بزور شمشیر نہیں کہی جاسکتی۔ پھر کہتے ہیں کہ آپ کی پہلی مہم میں صرف تیس غازی شریک تھے۔ اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ آپ کی سپاہ کرایہ کی سپاہ نہ تھی۔ اور نہ ایسی سپاہ تھی جو بلا قید مذہب وملت بھرتی کر لی گئی ہو۔ ہر مجاہد نہ صرف کلمہ گو ہی تھا بلکہ اللہ کی راہ میں جان ومال قربان کر دینے والا تھا" جزاک اللہ۔ کارلائل نے اسلام کو "عیسائیت کی مسخ شدہ صورت" بتایا ہے۔ اِس کے جواب میں مؤلف صاحب کا طویل نوٹ قابل ملاحظہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس عیسائیت سے زمانہ بعثت کی عیسائیت مراد ہے تو اسکے متعلق باسورتھ سمتھ کا قول ہے کہ اسوقت کے عیسائی زبان سے تو خدا خدا کہتے تھے مگر دلمیں اللہ کی وحدانیت کا ایک شمہ بھی نہیں رکھتے تھے" اور ڈیون پورٹ کہتا ہے کہ "زمانہ ظہور اسلام میں عیسائیت سے زیادہ کوئی چیز بالتصریح خراب نہ تھی"۔ آگے

چلکر مولف صاحب فرماتے ہیں کہ ایسی عیسائیت کی بگڑی ہوئی حالت تو بقول پروفیسر مار جلیوتھ اسلام نے بنا دی تھی پھر وہ اس عیسائیت کی مسخ شدہ صورت کیونکر کہی جاسکتی ہے! وغیرہ وغیرہ

کارلائل کہتا ہے کہ" میں آنحضرت کے علی الاتصال خلوص کا دعوی نہیں کرتا۔ کون علی الاتصال خلوص رکھتا ہے؟" اس کا جواب فاضل مؤلف نے اپنے حاشیہ میں کیا اچھا دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ" یہ کارلائل کی ذاتی رائے ہے۔ حق یہ ہے کہ علی الاتصال خلوص کے اہل ایسے لوگ کب ہوسکتے ہیں جن کے نفوس کامل نہوں۔ مگر جن کے پیش نظر رضائے خداہی اور جن کے نفوس کامل ہیں وہ نہ صرف علی الاتصال خلوص رکھنے والے ہی ہیں بلکہ خلوص کے پتلے خلوص کی جیتی جاگتی تصویر خلوص مجسم ہیں۔

قرآن شریف کے مبحث پر کارلائل سے اکثر لغزشیں ہوئی ہیں۔ مثلاً اسکے خیال میں (۱) کلام اللہ کی ترتیب و نظم اچھی نہیں ہے (۲) ترتیب ادا میں کہیں سادگی پائی جاتی ہے اور کہیں خوبی (۳) کارلائل کے نزدیک کلام اللہ کتاب آسمانی نہیں ہے نہ وہ کوئی معجزہ ہے بلکہ جناب رسالتمآب کی ذاتی تصنیف ہے۔ قابل مؤلف نے کتاب کے اخیر میں ضمیمہ نمبر (۴) کے عنوان سے ان شکوک کا ازالہ قابل داد محنت تحقیق اور تدقیق سے کیا ہے اور یہ حصہ بالخصوص قابل توجہ ہے۔ علی ہذا مولف صاحب کے بیشتر حواشی نہایت ہی گرانقدر اور بیش قیمت ہیں اور کتاب کے مطالعہ کے وقت غور سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

اس کتاب میں مختصر سوانحعمری کارلائل اور کاونٹ ٹالسٹائے کی درج کی گئی ہے اسکے پہلے دیباچہ طبع دوم اور دیباچہ طبع اول ہیں۔ سوانحعمریوں کے بعد اصل کتاب کا ترجمہ ہے اسکے بعد ضمیمہ اول میں سیرت جناب سرور انبیا صلعم بیان کی گئی ہے جسکے اصل مصنف کاونٹ ٹالسٹائے ہیں ضمیمہ دوم میں سیرت حضرت علی کرم اللہ وجہ مؤلف صاحب نے

اضافہ کی ہے ضمیمہ سوم میں جناب سالت مآب صلعم کے متعلق بشارات توراۃ اور انجیل مقدس سے اضافہ کیگئی ہیں اور ضمیمہ چہارم میں معجزات کلام اللہ سے بحث کی گئی ہے۔

عاجز کی رائے میں یہ ضمیمہ جات کتاب کی جان ہیں۔ اور فاضل مولف کی عالمانہ تحقیق وجستجو پر دال ہیں۔ حواشی میں یورپین مولفین کیطرح ہمارے قابل مولف نے جس شخص کے نام پر حاشیہ دیا ہے اس کا سنہ ولادت اور سنہ وفات معہ مختصر حالات کے حیطہ تحریر میں لائے ہیں اور کتاب کے پڑھنے سے ہمیں وہی لطف آتا ہے جو ایک یورپین فاضل کی تالیف پڑھنے سے آسکتا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہی جو ہماری مولفین اور مصنفین میں نہ صرف کمیاب ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے ہی نہیں مشہور مقامات یا شہروں کے نام یا نامآور آدمیوں کے نام جہاں آجاتے ہیں عموماً تاریکی میں چھوڑ دیے جاتی ہیں اور اچھی سے اچھی طرح علمی کتاب بھی اس خامی کی وجہ سے قصہ کہانی کی کتاب سے زیادہ موثر حیثیت پیدا نہیں کرنے پاتی یہی ایک بڑی کمی ہے جس سے ہمارے بچوں کی تربیت ناقص رہ جاتی ہی یعنی ابتدا ہی سے انکی عادت بگڑتی ہی معلومات فراہم کرنیکا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علم کی پیاس ہی نہیں پیدا ہوتی۔ وہ سوال ہی نہیں کرنا جانتے کہ فلاں بات کہاں سے آئی۔ اسکی جڑ اسکی بنا اسکی حقیقت ابتدائی کیا تھی۔ یہ خامی لچر اور لغو اردو ناولوں کا مطالعہ اور بھی بڑھا دیتا ہی اور بچوں کی عادت پڑجاتی ہے کہ ہر کتاب جو وہ پڑھیں ذرا سا ہی کوئی مسلسل قصہ ہو جسکے پڑھنے ہیں دماغ پر زور نہ دینا پڑے اور اسکے بعد اگر انکے مطالعہ کے راہ میں ایسے حواشی حائل ہوتے ہیں تو وہ ایک پھلانگ میں اڑکر اس پار پہونچ جاتے ہیں اور حاشیہ کی ہوا تک انہیں نہیں چھونے پاتی تعلیم کا اصلی مقصد ہی ہر چیز ہر شے کی تہ میں غوطہ مارنے کی عادت پیدا کر دینا۔ اگر ہماری تعلیم اتنا بھی نہیں کرسکتی تو وہ تعلیم ہی نہیں محض حرف شناسی کا سبق ہے۔ فاضل مولف کی تالیف اس اعتبار

سے نہایت ہی گرانقدر تالیف ہے

ہمیں افسوس ہے کہ اصل کتاب کے ہر ہر عنوان پر بحث کرنے کے لئے کافی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ مگر ہم بڑے شد و مد سے سفارش کرتے ہیں کہ ضمیمہ جات سوم و چہارم جنمیں بالترتیب بشارات بعثت اور وجوہ اعجاز قرآن شریف سے بحث کیگئی ہے عمیق نظر سے مطالعہ کے قابل ہیں بشارات کے ضمیمہ میں قابل مؤلف نے دس بشارتیں جمع کی ہیں۔ اور صاف صاف دکھا دیا ہے کہ اناجیل مقدسہ میں جابجا جناب سرور کائنات صلعم کے بعثت کی بشارتیں موجود ہیں۔ اسیطرح دس وجوہ موجہ ضمیمہ چہارم میں دکھائی گئی ہیں جو قرآن شریف کے آسمانی کتاب اور کلام اللہ ہونیکی حجت قاطع کہی جاسکتی ہیں۔ اسکے بعد سب سے آخر میں واشنگٹن ارونگ۔ ڈین اسٹینلے سیل۔ ہربرٹ ایڈ منڈ برک۔ باسورتھ اسمتھ۔ ڈاکٹر سوزان۔ ڈاکٹر لی بان اور سر ولیم میور کے سے موقر غیر مسلمین کی شہادت پر استدلال کرکے کلام اللہ کی عظمت کا نقش ہمارے پیش نظر کیا ہے جو ان عیسائی مشاہیر کے دلوں پر ہمیں صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ اس قابل احترام تالیف کی خوبیوں کا جتنا حق تھا ہم اسے اپنی مرضی کیموافق اسیطرح ادا نہ کرسکے۔ وقت اور جگہہ کی قلت ہمیں اختصار پر مجبور کر رہی ہے۔

ہمیں اس کتاب کے دیباچہ دوم نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ فاضل مؤلف صاحب اندنوں ایک ضخیم انگریزی کتاب (کی تالیف میں مصروف ہیں جو "ادب، سیاست، معاشرت و صنعت و حرفت اسلام" کی ایک تاریخ کہی جائیگی۔ اور "کئی جلدوں میں شایع ہوگی" ہم ابھی سے اُس نایاب زمانہ کتاب کے منتظر ہیں۔ اللہ پاک فاضل مؤلف کے علمی شوق اور طلب صادق میں آپ کا معین ہو اور آپ کی مساعی جمیلہ بارآور ہوں۔ آمین۔ (باقی آیندہ)

ہمارا ادبی نقاد

پاؤں باون ہیئر آئیل

جناب من! یوں تو آپ نے بالوں کے لگانے والے ہزاروں خوشبودار تیل دیکھے ہونگے لیکن یہ تیل بھی اپنی بیش قیمت اجزا اور عجائب وغرائب خواص کے لحاظ سے یگانہ روزگار ہے۔ درد سر۔ نزلہ۔ زکام فوراً دُور۔ بال سیاہ کرنے۔ گھنے اور گھنگوریالے چمکدار ملایم بنانے میں اکسیر ثابت ہوا ہے۔ دماغی طاقت کو بڑہانا اس کا اصلی کام ہے۔ اِس کی مہک اس قدر تیز ہے کہ شیشی کھولتے ہی خوشبو کی بے اندازہ لپٹیں آنی شروع ہوجاتی ہیں جس نے ایک دفعہ اس پاؤں باؤں تیل کا استعمال کیا وہ ہمیشہ کے لئے اس کا شیدائی بن گیا۔

صرف آزمایش شرط ہے قیمت صرف بارہ آنے محصول ڈاک چار آنے

ہر ایک شیشی کے ساتھہ انعامی چیزیں ملفوف ہیں

المشتہر

میسرز سلیمان اینڈ روز ۲۵ بار سٹریٹ رنگون

مراد آباد کی ایک خاص خبر

قابل توجہ ناظرین کرام

صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کے مشہور شہر مراد آباد سے ایک نہایت دلچسپ و اخبار "رہنما" حال میں جاری ہوا ہے۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جاتا۔ ڈیڑھ آنہ (۱۰) کا ٹکٹ بھیجکر طلب فرمایئے "رہنما" کی ارزانی قیمت اور ظاہری ومعنوی خوبیاں آپ سے خریداری کی خود سفارش کرینگی۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ خط لکھتے وقت "پیام امید" کا حوالہ ضرور دیجئے۔

المشتہر:۔ مینجر اخبار "رہنما" محلہ مفتی ٹولہ شہر مراد آباد (روہیلکھنڈ)

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹۱۸ء

کافوری جنتری ۱۹۱۸ء

کی نہایت خوبصورت اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپ چکی ہے اور جنوری ۱۹۱۸ء کے پہلے ہفتہ سے بلاقیمت و محصول ڈاک قدردانوں کے پاس بھیجی جا رہی ہے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ پر دس متفرق جگہہ کے لکھے پڑھے شریف اشخاص کے نام اور پتہ لکھکر بھیجدیجئے مذکورہ بالا جنتری وقت پر آپ کے پاس روانہ کردیجائیگی۔

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

آپ جانتے ہیں انسان کی زندگی خون سے ہے اس سے خون صاف رکھنا ضروری ہے۔ اس کی ترکیب آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی اوڈائڈ سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اس میں کسی چیز کا پرہیز نہیں ہے یہ سالسہ صاف کر اس میں پوٹاس ای روڈائڈ وغیرہ کئی ایک آموزدہ ادویات ملا کر بنا ہے اسلئے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے۔ قیمت ؏ محصول ۶ر

مسافر حیران ہوگئے

جب اُنھوں نے کولاٹانک کی تاثیر دیکھی۔ سفر میں گھوڑے کی سواری ہوئی مگر کچھ بھی تھکن معلوم نہوئی۔ پہاڑوں پر میلوں چڑھے اُترے لیکن ذرا بھی سانس نہ چڑھا کشتی کے لئے سفر کرنیوالے پہلوان ناچنے گانے والے مسافر لیکچرار۔ واعظ۔ ایدیٹیک مسافری میں کولاٹانک ساتھ رکھتے ہیں کیونکہ اسکے استعمال سے انکے پھیپھڑے کی قوت بیٹھیرہو جاتی ہے شراب اور افیون کی عادت کولاٹانک ہی چھڑا سکتا ہے قیمت ۲۴ خوراک کی شیشی عہ ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ سے منگائیے

ضوابط رسالہ

اس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہونگے "پیام امید" تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا آلہ بننا چاہتا ہے۔ اسمیں جنس کی قید نہیں۔ اسکے مخاطب تمام روشن خیال مرد اور مستورات ہیں۔

ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں، ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اصلی کام آج ہی سے شروع نہیں کرایا جاسکتا۔ ہمیں سب سے پہلے اتحاد پیدا کرنا ہے۔ جبتک ہندو مسلمان اور شیعہ سنی آپسمیں لڑتے رہینگے قوم اور ملک کی ترقی اصلی اور حقیقی معنوں میں بالکل ہی غیر ممکن ہے۔ ہماری کوشش کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم (۱) مسلمان خریداران رسالہ سے تین روپیہ سال قیمت لیں گے اور اُردو خواں ہندو خواتین کو رسالہ مفت نذر کرینگے جہانتک اور جس حد تک کہ ہماری اشاعت اس بار کی برداشت کرنیکی قوت ہمیں دیگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم ہندو خواتین سے متفق الرائے ہوجائیں تو مردوں کے خیالات اتنے جلد پلٹا کھاجائینگے کہ دُنیا کو حیرت ہوگی (۲) قومی اور ملکی ترقی کی پہلی منزل زبان کی ترقی ہے۔ ہم اُردو علم ادب کی ترقی اور توسیع میں سعی بلیغ کریں گے اور وقتاً فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہینگے تاکہ لائق مضمون نگاروں کو اچھے اور مفید مضامین لکھتے رہنے کی ترغیب اور تحریص ہو۔ رسالہ کی اشاعت بڑھنے پر ہم کوشش کریں گے کہ مفید علمی کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے ہماری زبان میں کیے جائیں اور مناسب قیمت پر فروخت ہوں (۳) ایسے بچے جو کافی طور پر علمی ترقی کر چکے ہیں ہر اہم مسئلہ پر ایک خاص رائے قائم کرنے کے متلاشی ہیں انہیں ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنیمیں عارضی مدد پہنچانیکی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ زمانہ ان کے لیئے نہایت ہی نازک زمانہ ہے۔ اگر وہ کسی اہم مسئلہ پر کوئی غلط رائے قائم کرلیں گے اور امداد زمانہ کے ساتھ ان کے دماغوں میں نشو و نما پاکر وہ غلط رائے جم جائیگی تو ان کی ساری عمر برباد کردینے کیلیئے کافی سے بھی زیادہ ہوگی۔ ہم انھیں ایسی خارجی مدد عین وقت پر پہنچائیں گے تاکہ آگے چلکر وہ بھی ترقی کی رفتار میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھیں

قیمت رسالہ

ہندوستان کے لیے۔ سالانہ ؎

" " ششماہی ۸؍ مع محصول

انگلستان کے لیے۔ سالانہ چھ شلنگ

کوئی اشتہار تہذیب اخلاق کے منافی شایع نہ کیا جائیگا۔ دفتر کو ہر وقت اختیار ہوگا کہ جب جس اشتہار کی اشاعت نامناسب معلوم ہو بند کردے ایسے اشتہار کی رقم وصول شدہ اُجرت اشاعت بعد وضع رقم بابتہ اشتہارات مشتہرہ بقیہ واپس کردیجائیگی۔

ایجنسی ۔ اس کے قواعد درخواست کرنے پر دفتر سے بلا قیمت ملیں گے۔

ایجنٹوں کی ضرورت ۔ ناظرین پر ہمارے اغراض و مقاصد روشن ہو چکے ہیں ہم ایک تمام پرچیکا اپنا رسالہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہونچا سکتے ہیں پبلک سے ہر طرح ہمیں اُمید حوصلہ افزائی ہے مگر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کاروباری آدمیوں کیلیے ہمارے کام کے واسطے وقت نکالنا ہر صورت و ہر موقع پر آسان نہیں ہے لہذا ضرورت اس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ ہم ایسے پرجوش بہن بھائیوں کو اپنا شریک حال کریں جنکے پاس کام کم ہے یا جو بیکار ہیں اور بیکاری کے لیے کوئی مشغلہ تلاش کرتے ہیں۔ ایسے صاحبوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بہت جلد ہم سے مراسلت کریں اور ہمارے دفتر سے ایجنسی کے قواعد منگاکر ملاحظہ فرمائیں۔ ان قواعد کے پڑھنے سے آپ پر واضح ہوگا کہ کیونکر ہم ایک دوسرے کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔ وہ لوگ ہماری اشاعت میں ہاتھ بٹائیں اور جتنا وقت ہمارے کام میں صرف کرینگے وہ رائیگاں نہ جائیگا۔ بلکہ اسکے معاوضہ میں ہم اُنکی خاطر خواہ مالی اعانت کرنیکو تیار ہیں اس اجمال کی تفصیل ایجنسی کے قواعد کے ملاحظہ سے ہوگی جو ہمارے دفتر سے بلا قیمت ملیگی۔ ہر قصبہ و ہر شہر میں ہمیں ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ پبلک کی اطلاع کیلیے گزارش ہے کہ ہر ایجنٹ کے پاس ہمارا ایجنسی سارٹیفکیٹ ہوگا جس پر ہمارے دفتر کی مُہر اور ہمارے دستخط ہونگے۔ ان ایجنٹوں کو قیمت رسالہ وصول کرنیکی اجازت نہیں ہے صاحب فرمائش صرف اگلا نمبر رسالہ کا ذریعہ ویلیو پی ایبل بھیجنے کی اجازت دینگے۔

تمام مراسلت اس پتہ سے کیجیے۔

مس آزاد

دفتر "پیام اُمید"

ذریعہ تحصیلدار صاحب صدر تحصیل ایٹہ

رسالہ کے پبلیشر منشی فضل علی نے مقام صدر تحصیل ایٹہ سے شایع کیا

فہرست مضامین پیام امید ماہ اپریل ۱۹۱۸ء

امید کا پیام ـــــ اُٹھو ـــــ اُٹھو ـــــ اور آگے بڑھو!

پیامِ امید

نمبر ۳۲	محمود آباد سیتاپور - (اودھ) اپریل ۱۹۱۸ء	جلد ۴

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے اس میں جنس کی قید نہیں
جس حال میں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف
پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گزریگا؟ ہم اپنے روشن خیال
اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا
کوئی حق نہیں رکھتے

متفرقات

ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ پھر لکھنا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب
اور جناب مرزا محمود احمد صاحب قادیانی کے درمیان میں جو ناگوار اور افسوسناک مباحثہ چھڑا تھا
اور جس نے ایک نہایت ہی عبرتناک صورت اختیار کر لی تھی اُس کا سلسلہ اب تک جاری ہے

کیا سارے ہندوستان میں دس بیس نہیں تو دو چار بھی ایسے موقر اور ذی اقتدار بزرگ موجود نہیں ہیں جن کی فہمایش کا اثر فریقین قبول کر سکیں اور جو کسی نہ کسی طرح اس شرمناک قضیہ کو ختم کرا سکتے ہوں؟ دونوں بزرگوں کی شان کے بالکل خلاف ہے جو کچھ ہو رہا ہے۔ دونوں کے لئے بہت سے مفید کام موجود ہیں جن پر توجہ کرنا اس فضول قضیہ میں پڑ کر وقت خراب کرنے سے بدرجہا زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسے شرمناک جھگڑے سوا اس کے کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے کہ مخالفین کو ہنسنے اور آوازے کسنے کا موقعہ دیں۔ اللہ ہمارے حال زار پر رحم کرے۔

ایڈیٹر

"رپورٹ کمیشن تحقیقات متعلق بہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مدرسۃ العلوم علیگڈھ"

کے نام سے ۴۴ صفحہ کے حجم کا ایک رسالہ ہمارے دفتر میں موصول ہوا ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ہے مگر حضرت اکبر الہ آبادی کی تقلید میں جا و بیجا اُردو زبان میں انگریزی الفاظ بے محل اور بے ضرورت اس شدت اور اس کثرت کے ساتھ لائے گئے ہیں کہ دیکھ کر دم اُلجھنے لگتا ہے۔ اللہ ہم مسلمانوں کے حال زار پر رحم کرے۔ اور غریب اُردو زبان کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے اس وجہ سے کہ اس مظلوم کی جان پر دوستوں کی جانب سے بھی ایسے سفاکانہ حملے ہو رہے ہیں کہ سنگ دل دشمنوں کو بھی دیکھ کر ضرور رحم آ جانا چاہئے۔ مثال کے طور پر چند نمونے ایسے الفاظ کے پیش کئے جاتے ہیں جن کے لئے اچھے خاصے اُردو لفظ موجود ہیں مگر جنھیں استعمال کرنا ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔

مثلاً "انسٹی ٹیوشن" کی جگہ پر اس موقعہ پہ "انجمن" کا لفظ اچھی طرح استعمال کر سکتے تھے۔ اور اسی طرح "ایلکشن" کی جگہ پر "انتخاب" "کالج ڈسپلن" کی عیوض "ضوابط کالج

کا احترام" "اسٹاف کے ممبر" کے بجائے "ملازمین یا معلمین کالج" "ووٹ" کی جگہ پر "رائے" "گرانٹ کے بجائے "امداد" "اسکالرشپ" کی عیوض "وظیفہ" "ہسٹری کے بدلے "تاریخ" "میٹنگ" کے بجائے "جلسہ" یا "اجلاس" "میجارٹی" کے جگہ پر "کثرت آراء" "سرکلر لیٹر" کی جگہ پر "گشتی چٹھی" "ماٹو" کے بجائے "مقولہ" "کانفیڈنشل لیٹر" کی جگہ پر "خفیہ تحریر یا چٹھی" "پبلک سرونٹس" کی جگہ پر "ملازمان سرکار" وغیرہ وغیرہ الفاظ موجود ہیں اگر ہمیں صرف اس بات کا احساس ہو جائے کہ اردو زبان میں انگریزی زبان کا لانا کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ سقم ہے۔ مگر صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا ہے بلکہ "ایجیٹیشن پھیلانا" اور اور المامیٹر. ALMAMATER کے سے گرانبار الفاظ زبردستی اردو میں ڈھکیل کے زبان کو اندھے کو میں میں جھونک دینے کی راہ تلاش کی گئی ہے۔ اس پر ایک اور بھی طرہ یہ ہے کہ جہاں صحیح اردو لکھنے کی ضرورت تھی وہاں اس کی مطلق پرواہ نہیں کی گئی ہے مثلاً ALIGARH MOVEMENT. کا ترجمہ کرنے کی کوشش میں اس کی جگہ پر "علیگڈھ تحریک" اور ایک اور موقعہ پر الفاظ "سولہ صفحہ کا مطبوعہ التماس" لکھ کر بتا دیا گیا ہے کہ ٹکسالی اردو سے قطع نظر کر کے واقعی وہی زبان اختیار کی گئی ہے جو کسی زمانہ میں دیسی عیسائیوں کی زبان کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔

اسی رسالہ کے سب سے آخری صفحہ پر "بفضل خدا" کے زیر عنوان پورے ایک صفحہ کا اشتہار "سلسلہ کلیات خسروی" کی کتابوں کے تیار ہو جانے کی خوشخبری کا درج ہے جس کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ "کالج نے مدت العمر میں یہ اپنی قسم کا پہلا

علمی کام کیا ہے" اور یہیں بتایا گیا ہے کہ "محبانِ علم و حامیانِ ادب قومی کا فرض ہے" کہ اُسے خریدیں قیمت قسم اوّل پندرہ روپیہ قسم دوم آٹھ روپیہ اور قسم سوم چار روپیہ رکھی گئی ہے۔ کالج کو اس کی مدت العمر کا پہلا علمی کام" مبارک رہے مگر محبانِ وطن اور محبانِ قوم غریب اُردو کو کس مپرسی کی حالت میں پاکر متحیر ہیں کہ جتنا سرمایہ وقت اور دماغ اس کام میں خرچ کیا گیا ہے کاش اگر یہی وقت یہی دماغ اور یہی روپیہ کسی مفید مطلب انگریزی یا عربی کتاب کے اُردو میں ترجمہ کرنے میں صرف کیا گیا ہوتا تو کیسی اچھی بات ہوتی۔ کاش یہی سرگرم کام کرنے والے ادہر توجہ فرماتے تو سچے معنوں میں قوم اور زبان کے محسن کہلاتے۔ اُردو زبان کو اس ردی حالت میں چھوڑ کے فارسی زبان پر توجہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے گھر کو اندھیرا چھوڑ کر مسجد میں چراغ جلانے دوڑے جانا۔ اُردو زبان کی تو آپ حضرات یوں مٹی پلید فرما رہے ہیں۔ اور فارسی کے ساتھ یہ محبت اور یہ خلوص!

گل پھینکے ہیں غیروں کی طرف بلکہ ادہر بھی .... کچھ تو ادہر بھی!

تنقیدات

اخبار رہنما۔ ہفتہ میں دو بار۔ قیمت دو ۲ روپیہ سالانہ۔ ششماہی ایک روپیہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار رہنما مراد آباد۔

اخبار رہنما ہمارے پاس بغرض ریویو آیا ہے۔ یہ اخبار جنوری ۱۸ء سے محمد اشفاق حسین صاحب کی ایڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے۔ رہنما مختلف دلچسپ اور مفید

مدات پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہمیشہ انہی مدات کے تحت مضامین شائع ہوتے ہیں
بعض مدات رہنما نے ایسی قائم کی ہیں کہ فی زمانہ بہت ضرورت تھی۔ مثال کے
طور پر یہاں چند مدات درج کیجاتی ہیں۔

اسوۂ محمدی کا ایک صفحہ۔ معلومات۔ عجائبات۔ جواہر ریزے۔ مذہب۔
اصلاح تمدن و معاشرت۔ حسن ادب۔ تجارت و صنعت و حرفت۔ مضامین صحت۔

محمد اشفاق حسین صاحب ایڈیٹر رہنما ایک کہنہ مشق اور آزمودہ کار فرزند
قوم ہیں۔ آپ نو سال تک رسالہ ضیاء الاسلام کے منیجر رہے ہیں۔ اور المشیر مراد آباد
کی منیجری بھی چار سال تک کی ہے۔ اخبار البرید کے منیجر عرصہ تک رہے ہیں! اور
ایڈیٹر کی غیر حاضری کے زمانہ میں ایڈیٹر کی خدمات بھی انجام دیتے رہے ہیں۔
آپ نے چند مذہبی طبی تاریخی کتابیں تالیف کی ہیں۔ جن کی اشاعت کاغذ کی گرانی
کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ اور جنگ کے بعد چھپوانیکا ارادہ رکھتے ہیں۔

آپ کی یہ بیش قیمت خدمات بہرحال قابل قدر ہیں۔ اور ہر طرح حوصلہ افزائی
کے قابل ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ جن امیدوں کے ساتھ رہنما جاری کیا گیا ہے
وہ بار ور ہوں۔ اور رہنما قوم اور ملک کا سچا خادم ثابت ہو۔

صوفی جنتری۔ سفید کاغذ۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ
صوفی پنڈی بہاؤالدین۔ گجرات۔ پنجاب۔

یہ جنتری بہت سی مفید معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے
ازبس کارآمد اور مفید ہے۔

(ایڈیٹر)

ہم آنریبل سری نواس شاستری صاحب جانشین مسٹر گوکھلے آنجہانی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے براہ کرم اپنے معزز ہفتہ وار انگریزی اخبار "سرونٹ آف انڈیا" کا ناچیز "پیام امید" سے مبادلہ کرکے ہماری عزت افزائی فرمائی ہے۔

---(٭)---

مبارکباد

ہم اپنی معزز بہن مس خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب اور ان کے والدین کو اپنی معزز بہن کی شادی پر تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ اللہ کرے یہ شادی صحیح معنوں میں شادی خانہ آبادی ثابت ہو اور دولہا دولہن شادو آباد رہیں۔

آج مجبور ہو کر ہمیں "پیام امید" ماہ مارچ پرنئے کاتب صاحب کی عنایات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ صبر کی بھی آخر کوئی حد ہونا چاہیئے۔ اس پرچے کی اغلاط کتابت کی فہرست "غلط نامہ" کی صورت میں شائع کرنے پر ہمارے لئے نہ کوئی مفید مشغلہ ثابت ہو سکتا ہے اور نہ دلچسپ۔ مگر مجبوراً مارچ نمبر کی بعض شدید اور اہم اغلاط کتابت کی تصحیح بیحد ضروری معلوم ہوتی ہے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	شیطنت	سلطنت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸	۴	انگریزی مصنف	انگریزی تصنیف
۸	۱۰	سلطنت	شیطنت
۱۲	۱۶	قلم بنانے	قلم تھامنے
۱۴	۳	حکم	قلم
۲۰	۷	انعام	الہام

ہمارے ادبی نقاد نے آج کی اشاعت سے "حسنِ معاشرت" پر باقاعدہ تنقید نگاری شروع کر دی ہے۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ تنقید نگاری میں سخن پروری کو ذرا بھی راہ دی جائے۔ ہم مولوی بشیر الدین احمد صاحب اور ان کے احباب کو مدعو کرتے ہیں کہ اس مباحثہ میں حصہ لیں اور اگر ہمارے نقاد کی تنقید غلط ہے تو بے تامل تردید کریں۔ ہم ہر ایسے مضمون کو جو اس تنقید کے خلاف لکھا جائے گا بڑی خوشی کے ساتھ بلا عذر لفظ بہ لفظ شائع کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارا مقصد قوم اور زبان کی خدمت کرنا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ ہم اپنے نقاد کی رائے کو بے خطا نہیں خیال کرتے۔ اور اگر کسی معاملہ میں اُن کی رائے خطا پر ثابت ہو گی تو وہ بلا عذر اپنی غلطی تسلیم کر لیں گے۔

ہم نے کراستھویٹ گرلس ہائی اسکول الہ آباد کے متعلق اظہار خیالات کا وعدہ کیا تھا۔ کاغذات کے مطالعہ سے جہانتک ہم رائے قایم کرسکتے ہیں وہ بڑی

حدتک اسکول کے موافق ہے۔ ضروری حالات معزز بھائی ایشور سرن صاحب اپنے مضمون میں بیان فرما چکے ہیں۔ ناظرین کی واقفیت کے لئے ہمیں اتنا اور لکھنا ہے کہ فی الحال ہر لڑکی سے کرایہ مکان اور کھانے کی مجموعی فیس صرف چار روپیہ ماہوار لیجاتی ہے۔ تعلیم کی کوئی فیس نہیں لیجاتی۔ اس کے علاوہ ایک روپیہ ماہوار دودھ کی قیمت اور ۴ر ماہوار دھوبی کی اجرت کی مد میں لیا جاتا ہے۔ ایک ہی گھر کی دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں داخل کرنے کی حالت میں اس سے بھی کچھ تخفیف کر دی جاتی ہے۔ کچھ مقررہ تعداد نادار اور غریب لڑکیوں کی مخصوص کر دی گئی ہے جن سے خاص صورتوں میں کرایہ مکان اور کھانے کی فیس کے چار روپیہ نہیں لئے جاتے۔ ہر حالت میں اوڑھنے بچھانے اور پہننے کے کپڑے اور کتابیں وغیرہ لڑکیوں کو خود مہیا کرنا پڑتی ہیں۔

بیاہی لڑکیاں اور بیوائیں بھی داخل کیجا سکتی ہیں۔ بیماری کی حالت میں اُن کے علاج و معالجہ کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ تعلیم انٹرنس تک دیجاتی ہے معلمین میں ایک ہندو لیڈی پرنسپل صاحبہ ہیں جو بمبئی یونیورسٹی کی بی اے ہیں۔ ان کی مددگار ۱۳ اُستانیاں ہیں جن میں سے چار مسلمان اور باقی سب ہندو خواتین ہیں ان کے علاوہ پنڈت موتی لال صاحب نہرو بی اے وکیل ہائی کورٹ کی صاحبزادی شریمتی روپ کماری نہرو بلا تنخواہ تعلیم دیتی ہیں۔ حال میں کمبھ میلے کے موقعہ پر جو مقام اتصال گنگا و جمنا پر ہر سال ہوا کرتا ہے۔ اس اسکول کی چند زیر تعلیم ہندو لڑکیاں بھی بطور والنٹیر ادائے فرض خدمت کے شوق میں گئی تھیں انہیں سے ایک نے حال میں ایک مضمون بھی نہایت ہی پاکیزہ انگریزی زبان میں

اخبار .... میں شائع کرایا تھا۔ جس سے نہ صرف ان لڑکیوں کی اعلیٰ تربیت اور حُسنِ اخلاق ہی کا اندازہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کا بھی کہ حب وطن اور شوق خدمت کا تخم بھی اُن کے ننھے دلوں میں بویا جاتا ہے۔ جس محنت اور سرگرمی سے ان لڑکیوں نے اپنے عزیزوں سے چھوٹے اور پریشان بچوں کی خبر گیری کی ہے اور اُنہیں تسکین اور دلاسا دیکر پھر ان کے عزیزوں سے انہیں ملا دیا ہے سبق آموز ہے۔ اور اس کریم النفس اور حب وطن پیدا کرنے والی تربیت کے لئے لیڈی پرنسپل صاحبہ اور اُن کی مددگار معلمین ہر طرح قابل مبارک باد ہیں۔ ہمنے اوپر کے فقرات میں جن سے اظہار خیالات کا آغاز ہوا ہے کچھ مستثنیات داخل کر دی ہیں مگر ان سے ہمارا سوا اس کے کوئی مقصد نہیں ہے کہ ہمیں ابتک اس اسکول کے بچشم خود دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا ہے اور نہ ہمیں ابتک اس کے متعلق کوئی خاص ذاتی علم ہے۔ ہم نے جہانتک اظہار خیالات کیا ہے وہ اُنہیں معلومات کے اعتبار پر ہے جو کاغذات موصولہ کے ذریعہ سے ہمیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

ان سطور کے ناظرین کرام کے ہاتھ میں پہونچتے پہونچتے یا کیا عجب ہے کہ اس سے پہلے ہی "ہفتہ قومی تعلیم" کا آغاز ہو جائیگا جو بسر کردگی مسٹر آرنڈیل سارے ہندوستان میں جوش و خروش کے ساتھ سرگرم عمل ہوگا۔ ہم تہہ دل سے اس تحریک کے حامی ہیں۔ کسی قوم کو اگر عزت کی زندگی بسر کرنا ہے تو اپنے پاؤں کے بل پر کھڑے ہونا سیکھے۔ ہم حکومت (گورنمنٹ) کو مورد الزام ٹھہرانا نہیں چاہتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عالمگیر جنگ کے زمانہ میں ہماری تعلیم پر اب بھی گورنمنٹ

بدریغ کروروں روپیہ پھونک رہی ہے جو ہر طرح قابل شکرگزاری ہے۔ یہ تخم جواب بارور ہو رہا ہے حکومت ہی کا بویا ہوا ہے۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے (چاہے اب اُسے ہم کیسی ہی خام اور ناقص پاتے ہوں) کہ ہمیں اپنی حالت کا احساس ہونا شروع ہوا ہے اور ہم ترقی کے لئے ابھر رہے ہیں "قومی تعلیم" کی حمایت کسی طرح حکومت سے مخالفت کے ہم معنی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ حکومت کا کبھی کسی حال میں دلی منشاء ہو سکتا ہے کہ ہم ترقی نہ کریں۔ وہ خود آگے چل کر ہماری معین اور مددگار بنجائیگی۔ مگر آج ہمارا فرض اولین ہے کہ ہم سب مسلمان ہندو ملکر یکدل و یکزبان ہو جائیں اور اس "قومی تعلیم" کی تحریک کو ایک کامیاب تحریک بنادیں۔ اللہ ہماری مدد کرے۔

ایڈیٹر

پردہ

ہماری جنوری ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں معزز بھائی مسٹر ایشور سرن صاحب بی اے وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کا مضمون۔ عنوان بالا پر شائع ہوا تھا۔ اور اس بیش بہا مضمون کے متعلق جس کے لئے میں لایق مضمون نگار صاحب کی تہہ دل سے ممنون احسان ہوں جابجا اظہار خیالات کی ضرورت محسوس ہوئی تھی مضمون کی اشاعت کے بعد ہی لایق مضمون نگار صاحب نے اسی عنوان پر سطور ذیل بھیجی تھیں۔ مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے مجھے اس مضمون کی اشاعت

روک لینا پڑی۔ جس کے لئے مضمون نگار صاحب سے معافی چاہتی ہوں۔ اس مضمون میں بھی بعض امور کے متعلق مجھے اظہار خیالات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے امید کہ معزز مضمون نگار صاحب معاف فرمائیں گے۔

معزز بہائی صاحب اور آپ کی بیگم صاحبہ کی ذات کو معرض بحث میں لانا میرا منشاء نہ تھا اور نہ اب ہے۔ بیشک اُن کے خیالات ہی معرض بحث میں ہیں اور رہیں گے۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ عالم باعمل کی نصیحت بہت جلد سامعین کے دلوں پر گہرا نقش ڈال سکتی ہے۔ برخلاف اس کے ایسے عالم کی نصیحت جسکا فعل اس کے قول سے مختلف ہو سامعین کے دلوں پر اُس کی نصیحت کا کوئی اثر ڈال نہیں سکتی۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ "عمل اصول سے بہتر ہے" اسی بات کو پیش نظر رکھ کر میں نے معزز بہائی صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ کا ذکر کیا تھا۔ اگر اسے وہ ذاتیات سے بحث کرنے میں داخل سمجھتے ہیں تو میں ادب اور انکسار کے ساتھ معافی چاہتی ہوں۔ کیونکہ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ معزز بہائی صاحب کا اگر محض اتنا ہی منشاء ہے کہ ملکی خدمت انجام دینے کے لئے اسی شخص کو منتخب کرنا چاہیئے جو اُس خدمت کا اہل ہو۔ اور ایسے انتخاب کے وقت اُمیدوار کا مذہب نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُس میں ملکی خدمت کی کتنی قابلیت ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو اس صائب رائے سے کوئی سمجھدار آدمی اختلاف نہیں کر سکتا جو بات قابل گذارش ہے وہ صرف اتنی ہی ہے کہ اس مقصد کے ادا کرنے کے لئے جو الفاظ تجویز کئے گئے ہیں اُن سے بہت سی غلطیاں پیدا ہو رہی ہیں جیسا کہ اُردو اخبارات (مثلاً "البرید" کا منیجر وغیرہ) اس معاملہ میں اظہار خیالات کر چکے ہیں۔

میری رائے ناقص میں آپ کا یہ فرمانا کہ "تم پہلے ہندوستانی بن جاؤ اس کے بعد مسلمان" سرسری نظر سے دیکھنے والوں کے دلوں میں ضرور یہ غلط فہمی پیدا کریگا کہ آپ ہم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم اپنی قومیت سے دست بردار ہوجائیں ایسی صورت میں آپ کا کیا نقصان ہے کہ اگر اس مقصد کے ادا کرنے کے لئے آپ کوئی اور مناسب الفاظ تجویز کرلیں کیونکہ یہ الفاظ جب تک قائم ہیں ضرور غلط فہمیاں پیدا کرتے رہیں گے جیسا کہ اب کر رہے ہیں - اور یہ بات کوئی دانشمند گوارہ نہ کرے گا کہ الفاظ کے جھگڑے میں پڑ کر اصل مطلب بھی فوت ہوجانے دے -

میں معزز بہائی صاحب کے عنایت آمیز ہمت افزا الفاظ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں - مگر اپنے نزدیک میں نے کوئی ایسی قابل داد بات نہیں کی ہے - بلکہ وہی کیا ہے جو زمانہ حال کے ہر اخبار نویس کا ایک معمولی فرض تھا -

ایڈیٹر

پردہ

عنوان بالا پر میرا مضمون جو آپ کی بیش بہا رسالہ کی اشاعت جنوری ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا میری نظر سے گذرا - میں نے بے انتہا دلچسپی کے ساتھ اس مضمون پر آپ کی نکتہ چینی ملاحظہ کی - باوجود اس کے کہ آپ پردہ کے موافق ایسی رائے رکھتی ہیں جیسی کہ آپ کی تحریر سے پائی جاتی ہے آپ نے پردہ

کی ایسی سخت مخالفت پر میرا مضمون شائع کرکے اخبار نویسی کی بہترین روایات کو برقرار رکھا ہے جس کی داد دینے کی میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ زمانہ حال میں اختلاف آراء کو شمار انسانی ترقی کی اہم ترین اسباب میں کیا جاتا ہے اور یہ حالت نہایت ہی افسوسناک ہے کہ بعض اخباروں کے ایڈیٹر اپنے اہم فرائض کی غلط فہمی سے ہر ایسی رائے کو جو اُن کی ذاتی رائے سے لفظ بلفظ موافق نہ ہو اپنے اخبار میں نہ شائع ہونے دینا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کوئی شخص جس کے ہوش وحواس بجا ہوں کسی رسالہ کے ایڈیٹر کو اس کے مضمون نگاروں کی رائے کا ذمہ دار نہیں قرار دے سکتا۔

آپ نے میرے اور میری بیوی کا ذکر کیا ہے آپ مجھے معاف کرینگی اگر میں فوراً اس کے متعلق عرض حال کروں۔ اس معاملہ کو میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے البتہ میرے خیالات زیر بحث ہیں جو میں ظاہر کر چکا ہوں مگر آپ کی نکتہ چینی ایسی مخلصانہ اور مشفقانہ ہے کہ جس کے لئے مجھے لازماً آپ کا شکریہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

صرف دو ہی ایک باتیں ہیں جن کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی حاجت محسوس ہو رہی ہے۔ اور آپ کی اجازت سے میں انہیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان اور ہندو سب سے پہلے ہندوستانی ہیں اسکے بعد مسلمان یا ہندو جیسی کہ صورت ہو تو اس سے میرا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مذاہب سے دست بردار ہو جائیں۔ (معاف فرمایئے۔ یہاں پر میرا مقصد دو مذہب "سے نہیں تھا بلکہ "قومیت" سے۔ ایڈیٹر) میرا مقصد محض اسیقدر

ہے کہ تمام ایسے معاملات میں جن کا تعلق مذہب سے نہ ہو وہ ہندوستانی اور ملکی اتحاد نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اختیار کریں۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں فرض کیجئے کہ مجھے کاونسل کی ممبری کے لئے کسی ایک شخص کو نامزد کرنا پڑے۔ یہ بھی فرض کر لیجئے کہ دو امیدوار موجود ہوں جن میں سے ایک ہندو ہو اور دوسرا مسلمان۔ تو ایسی حالت میں نامزد کرتے وقت مجھے ان امیدواروں کے مذہب کا خیال نہ کرنا چاہئے اور محض یہی بات دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں امیدواروں میں سے کس میں ملکی خدمت انجام دینے کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ اور اس اعتبار سے ان دونوں میں سے کون ترجیح کے قابل ہے۔ انگلستان میں عیسائی مذہب کے دو فریق موجود ہیں۔ ایک رومن کیتھلک کہلاتے ہیں اور دوسرے پروٹسٹنٹ۔ مگر ہر ملکی معاملہ پر غور کرتے وقت وہ سب سے پہلے انگریز ہیں اس کے بعد رومن کیتھلک یا پروٹسٹنٹ ایک مسلمان ملکی اتحاد پر عقیدت رکھنے سے اپنی مذہبی عقیدت (معاف فرمایئے میرا سوال "قومیت" کا تھا نہ کہ مذہب کا۔ ایڈیٹر) سے دست بردار نہیں ہو جاتا اور نہ اس کا مذہبی جوش زایل ہو جاتا ہے بلکہ میری رائے میں وہ پہلے سے اچھا مسلمان بن جاتا ہے۔

آپ کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو میں ملکی اتحاد کا حامی بنتا ہوں اور دوسری جانب "پردہ" کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ نقیض پیدا کرتی ہیں کیونکہ پردہ ایک نہایت ہی قدیم رواج ہے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرونگا کہ انقلاب ایک لازمی شے ہے اور ہر منٹ ہمارے گرد و پیش انقلاب ہو رہا ہے۔

فیشن یا اوروں کی نقل اُتارنے کے خیال سے اگر کوئی تبدیلی کی جائے تو وہ شرمناک ہے۔ مگر اصلاح کی نظر سے اگر کوئی تبدیلی اختیار کی جائے تو وہ ہمیشہ مستحسن اور پسندیدہ ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ پردہ کا رواج کم سے کم تیرہ سو برس سے ہے۔ یہ ممکن ہے۔ مگر کسی بدی کی قدامت اُس کے قائم رکھے جانے کے لئے کوئی وجہ معقول نہیں بن سکتی (معزز بہائیصاحب مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں عرض کروں کہ ابھی تک اُنہوں نے پردہ کو "بدی" یا برائی کا ہم معنی ہونا ثابت نہیں فرمایا ہے۔ ابھی تک اُن کی تحریرات سے محض اتنا ہی ثابت ہوگا ہے کہ بدقسمتی سے وہ پردہ کے مخالف ہیں "پردہ" کی یہ کم بختی ہے کہ معزز بہائیصاحب کے سے تربیت یافتہ اور روشن خیال بزرگ اس کے مخالف ہوں۔ مگر یہ کم بختی اُسے بدی یا برائی کا ہم معنی نہیں بنا سکتی۔ معزز بہائیصاحب کا یہ فرمانا درست و بجا ہے کہ کسی بدی کی قدامت اُس کے قائم رکھے جانے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ یہ سچ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ شاید یہ بھی غلط نہیں ہے کہ کوئی قدیم رواج محض اس وجہ سے بُرا نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قدیم اور کرم خوردہ ہے۔ اور محض اس وجہ سے کہ وہ قدیم ہے ضرور ہے کہ بوسیدہ اور کرم خوردہ مان لیا جائے۔ اور اُس میں اصلاح کی ضرورت بتائی جائے۔ ایڈیٹر) جس امر کا ہمیں فیصلہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ آیا پردہ جس شکل وصورت میں کہ ہم لوگوں میں رائج الوقت ہو رہا ہے وہ ترقی کی راہ میں ہمارا معین ہے یا سدراہ بن رہا ہے (میں پہلے عرض کر چکی ہوں کہ یہ بالکل دوسری ہی بحث ہے کہ جس سختی اور شدت کے ساتھ موجودہ حالت میں ممالک متحدہ میں پردہ رائج ہے وہ اصلاح طلب ہے یا نہیں۔ یہ بحث پردہ کی قطعی مخالفت

کی بحث سے بالکل مختلف ہے جس کے معنی صرف یہی ہیں کہ پردہ ساری دنیا سے یک قلم اٹھا دیا جائے۔ جیسا کہ معزز بہائیصاحب اپنے پہلے مضمون میں صاف صاف فرما چکے ہیں۔ ایڈیٹر) اگر اول الذکر صورت ہے تو پردہ ضرور قائم رکھا جائے۔ اگر آخر الذکر صورت ہے تو اس کا قلع قمع ہونا چاہیئے۔ کسی قوم کی زندگی میں تیرہ سو برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہوسکتی۔ پردہ کی قدامت اس رواج کی رفتہ رفتہ بتدریج اٹھائے جانے کی بحث میں اس کی معین ہوسکتی ہے۔ میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کرونگا کہ ان قدیم رسم ورواج پر جو صدیوں سے رائج ہیں اصلاح کا ہاتھ اٹھانے میں پس وپیش کرنا ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کی رفتار ترقی کی سستی کی اصل وجہ ہے اور اسی پس وپیش کا علاج ہمارے مصلحان قوم کو کرنا ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ باوجود پردہ کے اگلے زمانے کی مسلمان خواتین عروج کمال پر پہونچگئی تھیں۔ میں عرض کرونگا کہ اگر ان کی رفتار ترقی میں پردہ سدراہ بنکر حائل نہ ہوا ہوتا تو وہ اس سے بھی بدرجہا زیادہ ترقی کریں (یہ آپ کا خیال ہے۔ مگر کیا آپ سے مختلف رائے رکھنے والے اسی طرح یہ بات بھی نہیں کہہ سکتے کہ کچھ عجب نہیں اگر یہ خواتین پردہ سے باہر نکال دیجائیں تو بجائے ترقی کے ان میں فوراً تنزل شروع ہوجاتا؟ آپ ہی انصاف فرمایئے۔ ایڈیٹر) میں آپ سے اور آپ کے معزز ناظرین سے مودبانہ عرض کرتا ہوں کہ "پردہ" کے سوال پر غور کرتے وقت وہ اس کی قدامت اور قدیم روایات سے قطع نظر کرکے غور فرمائیں اور محض یہی وجہ ہے جس پر عمل کرنے سے کوئی صحیح رائے قائم ہوسکتی ہے۔ (مگر ایسا کیا جائے تو معزز بہائیصاحب کے پہلے مضمون کے فقرات ذیل بالکل بے معنی ہوئے جاتے

ہیں " ہماری قدیم روایات - ہماری قدیم تہذیب اور شائستگی ہمیں نہ صرف عزیز ہی نہیں بلکہ ہم اُن کی تقدیس پر عقیدت رکھتے ہیں اور اُن کا دل سے احترام کرتے ہیں" (ایڈیٹر) مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے لئے اپنی سوسائٹی کو اپنی ایک قدیم رواج سے دست بردار ہوتے ہوتے دیکھنا ایک نہایت ہی تکلیف دہ نظارہ ہوگا۔ مگر ایسے مصلح قوم کو جو تہ دل سے اپنے ملک کی بھلائی چاہتا ہو ایسے ایسے بہت سے تکلیف دہ نظارے دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہئے - بہت سے معاملات میں تعمیر کا کام شروع کرنے سے پہلے انہدام کا کام شروع کرنا پڑتا ہے - آپ کو بہت سی بد نما دیواریں گرانا پڑیں گی اگر آپ کسی خوش قطع عالیشان محل کی تعمیر کی خواہش رکھتے ہیں۔

جس طرح یہ قاعدہ ایک مکان کی تعمیر کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح سوسائٹی کے انضباط میں بھی صحیح ہے (مگر خوف یہ ہے کہ یورپین نمونے کا عالیشان محل بنوانے کے شوق میں اگر آج ہم اپنا ٹوٹا پھوٹا قدیم آبائی گھر کھود کے پھینک دیں تو کہیں ایسا نہ ہو جو کل ہمیں خانہ بربادی پر نوحہ لکھنے کی ضرورت پیش آجائے۔ دوسرے الفاظ میں گویا معزز بہائی صاحب فرماتے ہیں کہ پردہ ایک بوسیدہ دیوار ہے جسے کھود کے گرا دینا ہمارا فرض ہی ہے۔ مگر اس پُرزور فقرہ کو قلم سے نکالتے ہی آپ فرض کر لیتے ہیں کہ آپ نے پردہ کو ایک بوسیدہ دیوار ثابت کر دیا۔ (ایڈیٹر)

ایشور سرن



ہمارا محکمۂ احتساب

ہم نے اکتوبر سنہ ۴۱ء کی اشاعت میں باقاعدہ تنقید شروع کرنے کا وعدہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ "سب سے پہلے ہم ایسی کتابیں اُٹھائیں گے جو بلا وجہ اور بے سبب اچھی سمجھی جاتی ہیں مگر جن کی اشاعت سے یا تو (۱) اُردو خواں پبلک کا اخلاق بگڑتا ہے یا (۲) مذاق خراب ہوتا ہے یا (۳) زبان پر بُرا اثر پڑتا ہے"

آج ہم اپنا وعدہ پُورا کرتے ہیں اور ایسی ہی کتاب اُٹھاتے ہیں جس سے ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ ہی یہ تینوں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں - اس کتاب کا نام

"حُسنِ معاشرت"

ہے اور اس کے مصنف ڈپٹی نظیر احمد صاحب مرحوم مغفور کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب ہیں۔ جنھوں نے اپنے پدرِ مرحوم کی شہرت سے بیجا فائدہ اٹھا کر زبردستی تالیف و تصنیف کے کوچہ میں قدم رکھا ہے مگر جو کسی طرح نہ اسکے اہل ہیں اور نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ناظرین کرام کی غلط فہمیاں دُور کرنے کے لئے ہمیں پہلے ہی سے یہ بات عرض کر دینے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہمیں اُن سے کوئی خلش کوئی عداوت کوئی پرخاش ہونے کی وجہ نہیں ہے اس؛ جیسے کہ ہم اُن کی صورت تک سے بھی واقف نہیں ہیں اور نہ ہمیں یہی معلوم ہے کہ وہ کالے ہیں یا گورے۔

ہمیں مصنف صاحب کی ذات سے کوئی بحث رکھنا منظور نہیں ہے - البتہ

اُس ذات کا جہانتک اس تصنیف سے واسطہ ہے محض اسی قدر ہے اتنی ہی معرض بحث میں لائی جائے گی۔ اس سے ایک انچ زیادہ نہیں۔

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے یہ کتاب ایسے شخص کی تصنیف ہے جن کے پدر مرحوم ایک مستند اہل زبان اور مقتدر اہل تصنیف ہونے کی عزت رکھتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ سے دور دور از مقامات اور خاص کر پنجاب میں یہ کتاب اور اسی کے ساتھ ہمارے معزز چھوٹے مولینا صاحب کی اور تصانیف یہ سمجھکر پڑہی اور ہمارے زیر تعلیم بچوں کے ہاتھ میں دیجاتی ہیں کہ ان کے مطالعہ سے دہلی کی ٹکسالی زبان سیکھی جائے گی اور پڑہنے والوں کے اخلاق پر اچھا اثر پڑیگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں نتیجہ برعکس نکلتا ہے۔ نومبر نمبر ۱۹۱۶ءمیں "میاں فرخندہ جمال کا دماغی چانڈو خانہ" کے عنوان سے مکرمی جناب صوفی عبد اللہ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اُس مضمون کو ہمارے اس مضمون کا مقدمہ یا حصۂ اوّل سمجھنا چاہئے۔

"پیام اُمید" پہلے کسی مضمون میں عرض کرچکا ہے کہ روکھے پھیکے تنقیدی مضامین اگر لکھے جائیں تو اُن کے پڑہنے والے کہاں سے بلائے جائیں؟ ہمیں تو نہیں مل سکتے۔ اسی ضرورت کو محسوس کرکے اس داروئے تلخ میں ظرافت کی چاشنی ملادیگئی ہے یا یوں کہئے کہ ان کڑوی گولیوں پر ظرافت کی شکر لپیٹ دی گئی ہے تاکہ آسانی سے حلق کے نیچے اُتر جائیں۔

میاں فرخندہ جمال سے مصافحہ

یہ کتاب کس مقصد سے لکھی گئی ہے ؟

اس سوال کا جواب کتاب کی لوح ثانی سے ملتا ہے۔ جہاں ارقام فرمایا گیا ہے کہ اس میں "پھوہڑ اور سلیقہ مند بیویوں کے حالات زندگی بالمقابلہ ایک نہایت دلچسپ نتیجہ خیز اور نصیحت آمیز پیرایہ میں صرف مخدرات عصمت مآب کے لئے لکھے گئے ہیں" اب آپ یہ سوال کریں گے کہ آیا یہ کوئی فرضی قصہ ہے یا اس کے واقعات کسی اصلیت پر مبنی ہیں؟ اس سوال کا جواب دیباچہ کے صفحہ ۳ پر ملتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ "جو کچھ سوچ بچار تھا وہ حصہ اول کا تھا۔ حصہ دوم تو آپ بیتی اور بیشتر میری زوجۂ مرحومہ کے من وعن حالات ہیں جو بہت تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ لکھے گئے ہیں جن کا لکھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ میرے لوحِ دل پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب میں نے شروع سے آخر تک بیس دن میں لکھ لی" یہانتک تو آپ ہی کے الفاظ تھے۔ مگر کتاب کا حصہ دوم کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ازدواج ثانی کے واقعات سے۔ اس حصہ اور پہلے حصہ کے واقعات کا سلسلہ اور قصہ ایک ہی ہے "فرخندہ جمال" جن کا یہاں عقد ثانی ہو رہا ہے وہی پرانے دوست فرخندہ جمال ہیں جن سے کتاب کے پہلے حصہ میں دوستی ہو چکی تھی اور خوب ہی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہی پرانے دوست فرخندہ جمال نواب سلیمان قدر کے لخت جگر اور نواب سردار بیگم کے نور نظر یہاں بھی جلوہ افروز ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ کتاب کے دوسرے حصہ میں آپ کے خانگی

حالات کی داستان سُنائی گئی ہے کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب اصلیت یہ ہے کہ ساری کتاب آپ ہی کے گھر کے حالات کی رام کہانی ہے؟

اس کتاب کی باقاعدہ تنقید شروع کرنے کے لئے ہم اپنے مضمون کو چند مختلف مدات پر تقسیم کرتے ہیں۔

مولینا کی نکتہ رسی اور سخن سنجی

ہم اپنے ناظرین کو بھی اس کتاب کی سیر کرائے جائیں گے۔ بڑے مزے کی کتاب ہے دُنیا یہ نہ سمجھے کہ معزز مولینا شاعر نہیں ہیں۔ آپ اپنی کتاب نظم ہی سے شروع فرماتے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد "عرض حال" کے عنوان سے آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اختصار کے خیال سے ہم صرف وہی اشعار سنائیں گے جو آپ کی خاص توجہ کے قابل ہیں۔

"دل خون رو رہا ہے اُس وقت سے برابر   سیّد کی جب سے آئی ہیگی یہاں سُنائی"

ہم کچھ نہ بولیں گے۔ آپ ہی ملاحظہ فرمالیں کہ "ہیگی" کے ساتھ جو کمال ہمہ دانی ... بہر قابلیت ظاہر فرمایا گیا ہے وہ قابل داد ہے یا نہیں؟ اور لیجئے

"ماتم بپا ہے کس کا گزرا جہاں سے کون   گر نام پوچھتے ہو ہے سیّد زمانی"

اس ماتم کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں تو اس کا بھی ماتم کرنا ہے کہ تقطیع کی سطح پر لیجاتے وقت "کون" کا "ن" اس بری طرح سیڑھی پر سے دھڑام سے نیچے گر پڑا کہ مولینا کے شعر کا کُولا اکھڑ گیا۔ اللہ رحم کرے۔ آپ چکرائیں گے کہ "سیّد زمانی" کے نام سے کیا سر سید مرحوم کی وفات کا نوحہ تو نہیں لکھا گیا ہے۔ مگر نہیں۔ آپ نے جس طرح

اپنے لئے "فرخندہ جمال" نام پسند کیا ہے اسی طرح اپنی اہلیہ مرحومہ کے لئے "سید زمانی" فرضی نام تجویز فرمایا ہے۔ اور سنئے۔

رونا مگر ہے اسکا اب ساری عمر مجھ کو — کیونکر بسر یہ ہوگی بے لطف زندگانی

مولینا نے یہاں پر "یہ" کا بجڑ بہت ہی خوب ٹھونکا ہے۔ ورنہ مصرعہ کی چول ڈھیلی رہگئی تھی۔ ہم بھی اس کاریگری کی داد دیتے ہیں۔ ناظرین اس مصرعہ کو تعیٹر والوں کے طبع زاد مصرعہ کے ساتھ پڑہیں۔

"کیسے زخم جگر کے یہ چرکے دکھائے جائیں گے"

ایک شعر اور سن لیجئے۔

"دل خون کیوں نہ روتے مرحومہ کے لئے پھر

ہے کون مثل اس کا۔ ہو کون اس کا ثانی"

ہم تو "کون" کے "ن" کے سیڑہی پر سے گر پڑنے کا نوحہ لکھنے والے تھے کہ ایک اور آفت ناگہانی نازل ہوگئی۔ "مرحومہ" کی "ہ" بھی اسی طرح دہم سے گر پڑی اور اس کی ناف ٹل گئی۔ وہ مولوی صاحب کی اس بیدردی پر بری طرح شور و اویلا مچا کر آسمان سر پر اٹھا رہی ہے۔ اس کی فریاد ہے کہ جب میرے لئے جگہ تھی ہی نہیں تو مجھے کیوں زبردستی ایسی جگہ ٹھونس دیا۔ کہ تقطیع ہوتے ہی میری شامت آگئی!

بھئی اگر وہ دلی کی بھٹیاریوں کی طرح مولوی صاحب کو کھڑی کوس رہی ہے تو اس میں اس گناہگار کا کیا گناہ ہے! اب اہل نظر کے لئے بڑے مزے کا موقع آتا ہے۔ ایسے مزے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ ذرا ادہر ملاحظہ فرمائیے۔

"سید کو یا خدایا جنت نصیب کیجو — سید کی یا الٰہی باقی رہے نشانی"

ہمیں خوف ہے کہ آپ کبھی یقین نہ مانیں گے اور اُسلئے مجھی کو صلواتیں سنانے پر تل جائیں گے ۔ بندہ پرور غصّہ نہ کیجئے ۔ نقل راچہ عقل ۔ میں ایک شعر کے کتاب سے نقل کر دینے کا بیشک گنہگار رہوں ۔ اگر آپ کو کچھ شک وشبہہ باقی رہے تو دیباچہ کا صفحہ ۲ خود ملاحظہ فرما لیجئے اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ کاتب کی غلطی ہے تو کتاب کے اخیر میں "غلطنامہ" ملاحظہ فرمالیں ۔ مولینا نے کتاب کی اشاعت کے بعد "غلطنامہ" مرتب کرتے وقت اِن اشعار کو بغور ملاحظہ فرمالیا ہے جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ اسی نظم میں "کیونکر بسر یہ ہوگی بے لطف زندگانی" لکھتے وقت "بیہ" کے نیچے صرف ایک ہی نقطہ لگایا گیا تھا ۔ مولانا نے چٹ سے اس کتابت کی غلطی کو درج "غلطنامہ" فرماکے بتا دیا کہ سطر ۳ میں لفظ "بہہ" غلط ہے ۔ بجائے اس کے "بیہ" سمجھنا چاہئے ۔ نظر ثانی تو ایسی سخت تھی کہ ایک نقطہ کی غلطی تک نظر انداز نہیں فرمائی گئی ۔ اب ایسی سخت نظر ثانی پر بھی جو کچھ باقی چھوٹ رہا اُس کا عذاب وثواب غریب کاتب کے ہی سر تھوپ دینا کیسی زبردستی ہے !

مولینا جب آپ کا علم اتنا وسیع ہے کہ "یا خدایا" کہتے ہوئے بھی آپ نہیں شرماتے ہیں اور آپ کو اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ "خدایا" کا آخری الف ندائی ہے اور خدایا کے معنی آپ ہی نا خدا ہیں تو پھر یا خدایا کے کیا معنی ہوسکیں گے تو آپ کیا کتاب لکھنے چلے ہیں اور کس دم دعوے پر !

اس دس شعروں کی مختصر سی نظم کے ذریعہ سے جو جو کمالات علم معزز مولینا نے ظاہر فرمائے ہیں ہمیں اُمید ہے کہ آپ ضرور اُن کی قدر فرمائیں گے ۔ مثل مشہور ہے کہ اوّل با آخر نسبتے دارد ۔ کتاب کے اخیر میں مولینا نے سگے ہاتھوں ایک مناجات بھی لکھ ڈالی ہے ۔ آئیے ذرا اُس کی بھی سیر کرتے چلیں ۔ یہ مناجات کس بحر میں ہے

اس کا پتہ دینے کے لئے ہم مطلع کا شعر سُناتے ہیں۔ سُنئے۔

اسے سبؔ اناؤں سے داتا   سارے تراناؤں سے توانا

بحر تو آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ اب اس مطلع کے بعد کا دوسرا شعر ملاحظہ فرمائیے۔
اور داد دیجئے۔

اسے بالاتر ہر بالا تر سے   چاند سے سورج سے ابنر سے

شعر پڑھتے ہی ہماری بیتاب نظر "غلطنامہ" پر دوڑتی ہے۔ یہ مناجات صفحہ ۱۲۲ پر ہے "غلطنامہ" میں اس صفحہ کے اندر کوئی غلطی قابل مصنف کو نظر ثانی کرتے وقت بھی نظر نہ آئی۔ مناجات ۱۲۳ صفحہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ غلطنامہ میں ان دونوں صفحوں کے اندر کوئی غلطی نہیں ہے۔ یعنی ان صفحات پر مصنف کی مہر تصدیق لگ چکی۔
اب اگر آپ اس شعر کا پہلا مصرعہ پڑھکر چیخ اُٹھیں کہ "ایک مصرعہ کی ٹرگھنی ہے دُم" تو یہ بھی بالکل ہی صحیح نہ ہوگا۔ اس وجہ سے کہ ہماری آپ کی معمولی استعداد کے آدمی کا کام نہیں ہے کہ اس مصرعہ کو موزوں کرکے پڑھ سکے۔ اس میں ہم آپ سخت معذور ہیں۔ اور جب تک مولینا مدظلہٗ کی شاگردی کا فخر نہ حاصل کریں اتنی استعداد بہم پہنچانا تو ہمارے فرشتوں کے بھی وہم و گمان میں نہیں آسکتا۔ اب دوسرا مصرعہ پڑھیئے۔ جس طرح پہلے مصرعہ کی تقطیع کرتے وقت عقل چرخ تھی اسی طرح یہاں "ابنر" کی معنی کے تلاش میں سوا عاجزی کے اعتراف کے اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ اور ہماری سمجھ تو اُس بالاتر نقطہ پر پہونچنے پر قاصر رہتی ہے جہاں اس لفظ "ابنر" کا مسکن ہے۔ کیونکہ پہلا مصرعہ بتا رہا ہے کہ اُس کا وطن مالوفہ ایسے کرّہ میں ہے جو چاند اور سورج سے بھی بالاتر ہے۔ بھلا اُس اوج تک ہم گنہگاروں کی رسائی کہاں!

اگر کہا جائے کہ "ابنر" کاتب کی غلطی ہے۔ مولوی صاحب نے "عنبر" فرمایا تھا تو بھی تک نہیں ملتا اس وجہ سے کہ کہاں بالاتر۔ کہاں چاند کہاں سورج اور کہاں عنبر! اور کہاں حمد اور مناجات!

یوں تو اس مرصع مناجات میں ایک سے ایک شعر بے نظیر اور لاثانی ہے۔ مگر اختصار کے خیال سے ہم مشتے نمونہ از خروارے پر بس کریں گے۔ مولینا اللہ میاں کو مخاطب کر کے یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

"اے رحمت اور ہیبت والے شفقت اور دباغنت والے"

مولینا نظامی گنجوی سکندر نامہ میں فرماتے ہیں۔

"دباغنت چناں داد این چرم را کہ برتابد آسیب و آزرم را"

ہمارے میاں جی مرحوم مغفور نے بھی دباغنت کے کچھ ایسے ہی معنی بتائے تھے۔ مگر یہ کسے معلوم تھا کہ اللہ میاں کی شفقت کے ساتھ ساتھ دباغنت بھی نتھی رہتی ہے۔ کسے اتنی سوجھ بوجھ تھی! ہمارے کرم چھوٹے مولینا ہی کے دماغ میں اتنی دباغنت ہے۔ ورنہ اور کون ہے جو اس کے معنی بھی سمجھ سکے اب تو اس مناجات سے جی اکتا گیا۔ جس طرح ہم نے آپ کو مطلع سنانے سے شروع کیا تھا اسی طرح مقطع سنا کر یہ رام کہانی ختم کرتے ہیں۔ سنیئے۔

"پاؤں تجھے ایک اک کو گنوا کر خاک میں جاؤں سب کو ملا کر"

اس شعر میں "گنوا کر" نے جان ڈال دی ہے۔ اے سبحان اللہ وصل علی! کیا زباندانی ہے۔ زباندانی نہیں اسے ہمہ دانی کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اول تو ہندی کا روزمرہ استعمال فرمایا گیا ہے اور پھر معنی اور مطلب کے اعتبار سے اس درجہ چسپت اور برمحل ہے کہ اللہ ہی پناہ!۔ اس کے بعد دوسرا مصرعہ بھی بڑے ہی مزے کا ہے۔ واہ کیا کہنا "خاک میں

جاؤں سب کو ملا کر" سب کو کہاں ملا کر اور کس چیز میں ملا کر؟ مطلب سمجھنے کے لئے دماغ چاہئے۔ مولینا کا کلام ہے۔ دل لگی نہیں ہے۔ بڑا حسن اس مصرعہ کا یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہی وہ مثل یاد آجاتی ہے کہ ایک بہرا بازار سے بیگن مول لے کر گھر جا رہا تھا۔ کوئی شناسا راہ میں مل گیا۔ اُس نے بہرے سے پوچھا "کہو گھر میں تو سب اچھے ہیں؟" بہرے نے فی البدیہہ جواب دیا "سب کا بھرتا کرونگا" "خاک میں جاؤں سب کو ملا کر" کے معنی اگر کچھ تھوڑے بہت سمجھ میں آتے ہیں تو اسی مزے دار فقرے سے "سب کا بھرتا کرونگا"

چونکہ ہم نے نظم ہی کے حصہ سے مولینا کی قابلیت اور جوہر دکھانا شروع کئے ہیں لہٰذا کچھ دیر اور یہی سلسلہ جاری رہنے دیجئے۔ یہ تو مولینا کی تصنیف اشعار کا حال تھا۔ اب کچھ تھوڑی سی سیر اس کی بھی دیکھ لیجئے کہ مولینا کس درجہ سخن فہم واقع ہوتے ہیں۔ استادوں کا کلام کیا خوب سمجھتے ہیں۔ اور جب اپنی تصنیف کے کسی حصہ میں ایسے کلام سے اقتباس فرماتے ہیں تو وہ اقتباس کیسا چست اور کتنا برمحل ہوتا ہے۔ ہم اس مد میں مشہور ضرب المثل اور فارسی اُردو کے مقولات جہاں جہاں آپ کی توجہ کے قابل پائیں گے پیش کرتے جائیں گے۔ ملاحظہ فرماتے جائیے۔

آپ اپنی ساس یعنی پہلی بیوی کی والدہ کی نسبت یوں تحریر فرماتے ہیں۔

"ایسے ماں بیٹوں کو جو شمع پر پروانہ ہوں چھڑا دینا یا تفرقہ ڈلوانے کی کوشش کرنا ناخن سے گوشت یا قالب سے روح کو جدا کرنا تھا جو کچھ آسان کام نہ تھا۔ دُلہن کی شیر اعظم اُن کی والدہ ماجدہ تھیں۔ وہ اپنا گھر تو غارت کر ہی چکی تھیں۔ اب بیٹی کی باری تھی ؎

"تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ بر آسماں نیز پرداختی"

اے سبحان اللہ کیا برمحل شعر پڑھ دیا ہے۔ ماشاء اللہ چشم بد دور۔ اور مزا یہ ہے کہ صرف شعر ہی نہیں پڑھ دیا بلکہ لگے ہاتھوں اصلاح بھی دیدی۔ اُستاد کا مصرعہ تھا ؎ "کہ با آسماں نیز پرداختی" مگر اس میں کچھ غلطی رہ گئی تھی جس کی آپ نے فوراً دُن سے اصلاح بھی فرمادی۔ آپ فرماتے ہیں "کہ بر آسماں نیز پرداختی"۔ پھر پہلی بیوی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ" وہ شوہر کے دلپر اطاعت اور فرماں برداری سے قبضہ جمانا نہیں چاہتی تھی بلکہ بدمزاجی مخالفت اور مخالفانہ طرز عمل سے حالانکہ" جو گڑ سے مرے تو زہر کیوں دے" عورت کے لئے حب کا عمل کہو۔ تسخیر کہو جو کچھ کہو ایک اطاعت ہے فرمایئے "جو گڑ سے مرے تو زہر کیوں دے" کتنا برمحل ہے! آپ ہی انصاف فرمایئے۔ پھر پہلی بیوی کے خرچ عادات کی تفصیل ان الفاظ میں فرما کے ایک شعر بھی رسید فرما دیتے ہیں۔

"بازار کا پوری حلوہ۔ مٹھریاں کچوریاں دال سیو۔ جلیبیاں۔ امرتیاں کھانے میں تھیں جو صبح سویرے چھپا کر کھالیتی تھیں۔ دن چڑھے کا چھن آئی تو اس کا محاصرہ کرلیا۔ امرود کچالو۔ شکرقند۔ کیلے۔ بھٹے۔ انار۔ ناسپاتی۔ بیر۔ الابلا لینا فرض تھا۔ قریب قریب ایک روپیہ روزانہ کے تو اس میں چٹنی ہو جاتا تھا۔ اور کہیں ملائی کی برف کی آواز کان میں پڑ گئی تو پھر ہنڈے کا ہنڈا خالی۔ پھر تیسرے پہر کا سودا الگ۔ بھلا جن کو ان چٹخاروں کا چسکا پڑ جائے اُن کے پاس کیا خاک پیسہ رہ سکتا ہے"۔ اب شعر سُنئے۔ کیسا برمحل ہے اور کتنا چسپاں

"قرار در کف آزادگاں نہ گیرد مال جو صبر در دل عاشق و آب در غربال"

خیر سے یہاں بھی چچا سعدی پر اصلاح دیگئی ہے۔ سعدی کا مصرعہ ثانی یوں ہے "نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال" مگر قابلیت اسی کا نام ہے۔ کسی ایسے ویسے کو صلاح نہیں دیتے۔ جنت یہاں سعدی پر اصلاح کا قلم اٹھایا جاتا ہے۔ آیا سمجھ کے پیچ میں! پھر

پہلی بیوی کے اوصاف حمیدہ ان الفاظ میں ارشاد ہوتے ہیں۔ جس کے بعد شعر آتا ہے۔

"مگر لاڈلی پر شیطان سوار تھا۔ وہ کس کی سننے والی تھی۔ نہ ساس کی اجازت نہ میاں کی پروانگی۔ یہ جا وہ جا۔ لڑکی کیا تھی آگ بگولا ہو گئی۔ گویا پہلے ہی سے دل میں ٹھان رکھا تھا کہ۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوا۔ ورنہ کچھ بات ایسی نہ تھی جو سسرال کو بیہودگی سے خیرباد کہا اور ذرا نہ سمجھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔" اب شعر آتا ہے۔

کہو بلبل سے لیجائے چمن سے آشیاں اپنا
لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوٹے خانماں اپنا

واہ مولینا واہ۔ کیا برمحل شعر سنایا ہے۔ جزاک اللہ! آگے چلئے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "فی الواقع انسان پر جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے۔ تب اسے نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے" ان فقرات اور ان خیالات کی سند میں پھر چچا سعدی سے گواہی دلوائی جاتی ہے۔ کیسی برمحل ہے۔

"قدر مصیبت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید" فقرہ جسقدر مطلب سے چھپاں ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ مگر یہاں بھی سعدی کو بے اصلاح نچھوڑا۔ اصلی فقرہ یوں ہے۔

"قدر عافیت مصیبت شخصے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید" اسی صفحہ پر ایک شعر مولانا ئے رومی کا بھی ملتا ہے۔ شکر ہے کہ وہ تو اصلاح سے بچ گیا مگر کتنا برمحل ہے ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں کہ

"مصیبت کے بعد انسان کی طبیعت میں ہمیشہ صلاحیت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور پہلے سے زیادہ سمجھدار اور تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ قدر نعمت بعد زوال۔ ایسی لاڈلی کو دیکھو کیسی شورہ پشت تھی۔ ناک پر مکھی بیٹھنے کی روادار نہ تھی۔ یا آج دیکھو کیسی منکسرالمزاج

مطلع و منقاد ہے ؎

آں کہ شیراں را کند روبہ مزاج　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

شعر کتنا برمحل اور چسپاں تھا۔ داد تو نہ دیجیگا۔

اس کے آگے صفحہ ۶۶ پر اپنی عبارت کے بعد استاد کا شعر سُنایا گیا ہے ۔ اور ش
پر اصلاح بھی دیگئی ہے ۔ یہ اس وقت کا حال بیان ہو رہا ہے جب آپ کی والدہ ماجد
اور پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا "ماں کا غم ایسا نہ تھا جو فرخندہ جیسا سعادت مند لڑکا
ماں پر حد سے زیادہ فریفتہ تھا مدۃ العمر بھلا سکتا۔ رخصت بھی ختم ہو گئی اور آخر کار یہ اپنی
نوکری پر بھی چلے گئے ۔ اب پہلے سے بھی زیادہ پریشان رہنے لگے ۔ دن ہوا کی طرح
گذرتے ہیں " اس کے بعد شعر معہ اصلاح ملاحظہ ہو۔

صبح سے شام ہوتی ہے　　　عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

"غلطنامہ" ملاحظہ فرمایئے ۔ صفحہ ۶۶ پر کوئی غلطی نہیں ہے ۔ مگر اس میں شک وش
کیا باقی رہ گیا! آخر یہ اصلاح بھی تو اسی مصنف کی ہے ۔ جس نے یہ شعر تصنیف کیا :

"اے بالاتر ہر بالاتر سے　　　چاند سے سورج سے 'نبر سے"

مولانا صاحب کی شاعری بحر اور تقطیع کی پابندیوں سے بالاتر ہے ۔ اور کیوں
نہ ہو جب کسی اُستاد کا کلام سامنے آ کے بے اصلاح بچکے نکلنے ہی نہیں پاتا! ایسے
بلند پایہ ادیب اور مستند قابلیت کے مصنف کے لئے یہ قیدیں اور پابندیاں نہیں
بنائی گئی ہیں ۔ یہ چھوٹی اُمت کے لئے ہیں ۔ اور آگے چلئے ۔ راہ میں آپ کو حافظ
شیرازی بھی ملتے ہیں ۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مصرعہ تھا کسی کونے سے دبک کے نکل گ
مولینا کی نظر چوک گئی ورنہ کیا مجال تھی کہ بے اصلاح جانے پاتا ۔ مگر پھر بھی آپ کی

شوخ تحریر کا جو فطری حسن ہے بھلا وہ کہاں جا سکتا ہے۔ آپ ہی ملاحظہ فرمائیے کیسا برمحل مصرع آیا ہے۔ میں بھی کچھ اصلاح دیکر حضرت محسن مرحوم کا کوروی کا ایک مصرع سُنائے دیتا ہوں "چوم لوں ہاتھ میں تیرے عجب اعجاز کیا ہاتھ" ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا ارشاد فرماتے ہیں۔

"دُنیا میں غم اور فکر سے کون خالی ہے۔ مرد وہ ہے جو ہمت اور استقلال سے مصائب کی برداشت کرے۔ کیونکہ خدا کی مرضی میں کچھ چارہ نہیں۔ اس کے بعد حافظ شیرازی کا مصرعہ سن لیجئے۔

"گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را"

جل جلالہٗ! ماشاء اللہ۔ چشم بد دور۔ کیا برمحل مصرعہ لکھا ہے کہ باید و شاید، اور پھر فلسفہ بھی کس زوروں کی سُنائی ہے کہ بقراط اور سقراط کے فرشتہ خاں کو بھی اتنی دُور کی نہ سوجھی۔ اس کے بعد صفحہ ۶۹ پر عنوان ذیل قائم فرمایا گیا ہے "دوسری بیوی ہو تو کیسی ہو" اس عنوان کی تحت میں یہ بحث ضبط تحریر میں لائی گئی ہے کہ "ڈپٹی صاحب" کو کس فیشن کس قماش کی کیسی بیوی کی تلاش تھی۔ مگر عنوان کے بعد مضمون شروع کرنے سے پہلے مولینا نے فوراً ایک شعر تصنیف کر ڈالا۔ اور عنوان کے نیچے چپکا دیا۔ شعر سُن لیجئے۔

"لبِ شہ نے خاک پایا لعل پایا یا گھر پایا مزاج اچھا اگر پایا تو سب کچھ اُسنے بھر پایا"

اس شعر کی داد دینے کے لئے کئی صفحے سیاہ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اور اتنے سادہ صفحے میرے لئے ایڈیٹر صاحبہ کہاں سے لائیں گی۔ لہذا اختصار سے کام لینا چاہئے۔ بس ایک ہی فقرہ کافی ہے کہ اہل نظر پڑھیں اور اس کے مزے لوٹیں۔ دوسرا!

ورق اُلٹ دیا۔ تو واللہ وہ فرا آ گیا کہ کیا کہنا صفحہ ۷ پر نیا عنوان ہے "نکاح پر آمادگی اور تلاش" اس باب سے پہلے مولینا فرما چکے ہیں کہ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد سے "فرخندہ" کی والدہ اور اعزا نکاح ثانی پر بارہا اصرار کر چکے تھے۔ مگر "فرخندہ" کبھی راضی نہ ہوئے۔ اب اس باب میں یہ ذکر ہے کہ "ڈپٹی صاحب" کے دوست احباب نے اُن پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالا۔ یہانتک کہ ایک دوست کہنے لگے کہ "اگر آپ نہ مانیں گے تو ہم زبردستی آپ کی شادی کر دیں گے" اب بیچارے ڈپٹی صاحب کیا کرتے! مجبور ہو کر چا۔ و ناچار اُنہیں بیاہ کرنا ہی پڑا۔ تو مضمون اس باب کا یہ ہے۔ یعنی پہلے ماں کے سمجھانے سے راضی نہ ہونا پھر دوستوں کی زبردستی سے نکاح کرنے پر راضی ہو جانا۔ عنوان ہے "نکاح پر آمادگی اور تلاش"

(باقی آیندہ) ہمارا ادبی نقاد

گردش زمانہ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

لڑکا۔ (نہایت بیباکی سے) میں یونہی چلا آیا۔ رام سنگھ دیکھو یہ شخص روتا ہے اسکے رونے پر رحم آتا ہے۔

وہی آدمی۔ (مجھ سے مخاطب ہو کر) جلد کھانا کھا لے۔ ہم کب تک تیرے پاس اپنا وقت ضائع کریں۔

پھر وہ آدمی اور لڑکا دروازہ بند کرتے ہوئے چلے گئے۔ اُس اندھیرے قید خانہ میں میں تنہا رہ گیا۔ سامنے کھانا رکھا ہوا تھا لیکن خواہش مطلق نہ تھی۔ اپنے دل میں لڑکے کی شیریں گفتاری اور لاثانی خوبصورتی پر غور کر رہا تھا کہ روشندان سے کوئی چیز آکر میرے سامنے گری۔ میں دیوار کی طرف ہٹ کر بیٹھ گیا اور گرنے والی چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ ایک بڑی آہنی کنجی تھی اور غالباً تین انچ لمبی۔ اس کے بعد روشندان سے ایک سر خون سے تر اور ایک تلوار میرے سامنے آکر گری۔ میں نے تعجب اور خوف کے ساتھ شناخت کی یہ سر اُسی آدمی کا ہے جو تھوڑی دیر پہلے مجکو دھمکا رہا تھا۔ خوف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پھر دیکھا کہ ایک کاغذ اُسی روشندان سے میرے سامنے گرا جس کو کھول کر میں نے پڑھا اور حسب ذیل مضمون پایا۔

"اگر جان بچانی ہو تو ذیل کی ہدایتوں پر فوراً عمل کرو۔ ہوش میں آکر عقل سے کام لو۔ شمال کی جانب دیوار پر جہاں کچھ لکھا ہوا ہے اُس تحریر کے بیچ میں ایک سوراخ ہے جو چونہ سے بند ہے۔ چھیلنے سے کنجی جانے کے لائق سوراخ پیدا ہو جاوے گا۔ کنجی کو سوراخ میں ڈال کر گھمانے سے آدمی کے گزرنے کے قابل راستہ نمودار ہوگا۔ تم کو چاہئے کہ سر کو کواڑوں کی چول میں رکھ دو اور تلوار لے کر ہوشیاری سے اس نئے راستے سے جو دیوار میں پیدا ہوگا نکل بھاگو۔ راستے میں تمکو بہت سے قید خانے ملیں گے ڈر نامت کیونکہ وہ سب خالی ہیں۔ سب سے آخر میں تم کو دروازے پر ایک آدمی پہرہ دیتا ہوا نظر آئے گا۔ نہایت ہوشیاری اور تیزدستی سے اُس کا سر اپنی تلوار سے کاٹ ڈالنا اور اُس کی وردی اُتار کر خود پہن لینا۔ جہاں یہ شخص پہرا دیتا ہوا تم کو ملیگا وہاں ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا ہے اُس پتھر کو ہٹاؤ گے تو ایک

راستہ ملیگا۔ بیخوف اُس کو جلدی سے طے کرنا۔ آخر کار جب تم صدر پھاٹک پر پہونچو گے تو ایک آدمی تمہارے پہننے کے لئے کپڑے لئے ہوئے وہاں کھڑا ہوگا۔ تلوار اور اُس سپاہی کی وردی جسے تم قتل کروگے اُس شخص کو دیدینا اور فوراً جنوب کی جانب روانہ ہونا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ بھول کر بھی اپنے باپ کے گھر مت جانا۔ نہیں تو پھر پکڑے جاؤ گے۔ اس سے زیادہ تکلیف اُٹھاؤ گے۔ رقعہ کو بعد ملاحظہ چاک کر ڈالنا۔ جلد نکلو دیر مت کرو۔"

اس رقعہ کو پڑھ کر مجھے جسقدر خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ پرمیشور کا شکر ادا کیا۔ رقعہ کے لکھنے والے کو دُعائیں دینے لگا۔ فوراً اُٹھا۔ سر کو موافق ہدایت کواڑوں کی چول میں رکھدیا۔ دیوار میں واقعی ایک سوراخ تھا جس میں کنجی ڈال کر گھماتے ہی ایک آدمی کے نکلنے کے لایق راستہ پیدا ہوگیا۔ میں تلوار ہاتھ میں لیکر اور نئے راستے سے گزر کر کئی کوٹھریاں طے کرتا ہوا اُسی دروازے پر پہونچا جہاں ایک آدمی پہرا دے رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اُس کا مُنھ دروازے کی جانب نہ تھا۔ قبل اس کے کہ اُسے میرے پہونچنے کا علم ہو میں نے اُس کا سر قلم کردیا اور اُس کے کپڑے خود پہن لئے۔ یہاں درحقیقت ایک پتھر رکھا ہوا تھا۔ پتھر کو ہٹایا راستہ نمودار ہوا اُس راستے کو طے کرنے کے بعد میں صدر دروازے پر پہونچا اور ایک شخص کو اپنا منتظر پایا۔ جس نے نہایت ادب سے سلام کیا اور کہا۔ "جہانتک ہو سکے جلد کپڑے پہن کر روانہ ہوجئے نہیں تو دشمنوں کی جان کی خیر نہیں ہے۔" میں نے اُس کے دئیے ہوئے کپڑے فوراً پہن لئے تلوار اور مقتول سپاہی کی وردی اُس کو دیدی۔ لیکن رقعہ اپنے پاس رہنے دیا۔ رخصت ہوتے وقت اُس شخص سے دریافت کیا کہ جس کی مہربانی سے میری جان بچی ہے کیا آپ اُس کا نام مجکو بتا سکتے ہیں؟

نامعلوم شخص۔ آپ کو نام جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً یہاں سے تشریف لے جائیے چاروں طرف جاسوس پھر رہے ہیں۔ اگر کسی نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو سینکڑوں آدمیوں کی جانیں مفت جائیں گی۔

میں نے اور کوئی سوال نہ کیا اور اپنا راستہ لیا۔

چوتھا باب

کیا گزرتی ہے مجھ آوارہ وطن پر پوچھوں
راہ پُرخوف ہے گھر دُور ہے دن آخر ہے

میں بغیر کسی طرف دیکھے ہوئے سرپٹ بھاگا جاتا تھا۔ جس سڑک پر جا رہا تھا اس کے دونوں طرف گنجان درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹہ تک اسی طرح دوڑنے کے بعد ایک بڑے برگد کے درخت کے نیچے سانس لینے کے لئے ٹھہر گیا۔ ازبسکہ تھک گیا تھا اور پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے چلنے سے جواب دینے لگے۔ کھڑا نہ رہ سکا بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد کچھ دُور فاصلہ سے یہ آواز آئی "ہمارے ہاتھ سے بچکر کہاں جاویگا" گو یہ الفاظ کچھ مہمل سے تھے۔ لیکن چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ میں صاف سمجھ گیا کہ یہ آواز ضرور میرے متعلق ہے۔ فوراً درخت پر چڑھ گیا اور پتوں سے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ دیکھا کہ کئی آدمی میری جانب آرہے ہیں۔ اُن میں سے میں سوائے سردار کے کسیکو نہ پہچان سکا۔ رفتہ رفتہ یہ سب آدمی اس درخت کے نیچے جس پر میں بیٹھا تھا آکر جمع ہوگئے۔ میں مارے خوف کے کانپنے لگا اور سمجھ لیا کہ ان کا شکار میں ہی ہوں۔

اُن میں یہ گفتگو ہونے لگی۔

سردار۔ اگر بر جبید رنہ ملا تو تم سب کی شامت آئیگی۔ حیرت ہے کہ اُس کمبخت کو پوشیدہ راستہ کس نے بتایا؟

سب ساتھی۔ ہم ابھی اُس کو تلاش کئے لیتے ہیں۔ کم بخت پانسو آدمیوں کی ہزار آنکھوں میں خاک جھونک کر کہاں جاسکتا ہی۔ یہیں کہیں چھپ گیا ہوگا۔

ان کا سردار میرا خسر تھا۔ جو کچھ عرصہ پہلے مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ باتیں کرتا تھا۔ اسی قسم کی کچھ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر یہ سب اُٹھ کر ایک جانب کو چلدیئے ان کو گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کچھ دُور فاصلہ سے گانے کی آواز آئی میں نے اُس طرف دیکھا تو وُہی مہ وش لڑکا جو قید خانہ میں میرا غمگسار بنا تھا عجیب متوالی چال سے آہستہ آہستہ آرہا ہے۔ اُس کو دیکھکر میری جان میں جان آئی۔ اور درخت پر بیٹھا ہوا دل سے اپنی آنے والی مصیبتوں کے متعلق سوال کرنے لگا۔ آخر کار اٹکھیلیاں کرتا ہوا میرا محسن لڑکا درخت کے نیچے پہنچا۔ اُس وقت رات ہوگئی تھی۔ مگر چودھویں رات کے چاند اور اُس لڑکے کی روشنئ حسن نے جنگل کو منگل بنادیا تھا۔ عجیب رونق معلوم ہوتی تھی لڑکے کے آنے سے میں اپنی تمام تکلیفیں بھول گیا۔ نہ معلوم کیوں اُسے دیکھ کر دل میں فرحت طبیعت میں ہمت اور جرات پیدا ہوگئی۔ جب لڑکے کی نگاہ مجھپر پڑی تو کہنے لگا:۔

لڑکا۔ میں نے تمھیں پہچان لیا اب بچکر کہاں جاسکتے ہو۔ تم دو خون کرکے جیلخانہ سے بھاگے ہو اور اب ہم لوگوں کے ڈر سے یہاں درخت پر چھپے بیٹھے ہو۔ تمھیں میں اپنے سردار کے پاس لیجاؤنگا بڑا انعام پاؤنگا۔

میں ۔آپ کی باتوں سے بوئے محبت آتی ہے ۔غالباً آپ ہی میرے رہا کنندہ اور نجات دہندہ ہیں آپ کی مہربانیوں کے عوض میں صرف نقد جان نذر کرسکتا ہوں ۔کیونکہ سوائے اس کے میرے پاس کچھ نہیں ہے ۔

لڑکا ۔ کیا خوب! جواب بہت ہی چست اور درست ہے اوترئیے خوف نہ کیجئے ۔آج تم خوب ہی بچے ۔

میں (درخت ہی پرسے) معاف کیجئے ۔ مجھے درخت پرسے اوترتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے کیونکہ آخر کو تم بھی اونہیں میں سے ایک شخص ہو ۔

لڑکا ۔تمہارا یہ خیال صحیح ہے ۔گر گرفتاری کے واسطے درخت کے اوپر نیچے دونوں حالتیں قریب قریب یکساں ہیں ۔جب دشمن سے سامنا ہی ہوگیا تو بچنے کی کیا امید ہوسکتی ہے ڈرو مت ۔میں تمہاری امداد کروں گا ۔

میں بغیر کچھ جواب دیئے درخت سے اوترآیا ۔جھک کر سلام کیا ۔

لڑکا ۔تم پر رحم آتا ہے ۔میں سمجھتا ہوں کہ تم نے دن بھر کچھ نہیں کھایا ہے ۔بہت نڈھال ہو رہے ہو ۔اب تھوڑا بہت کھالو ۔

کھانیکا نام سنکر اپنی سسرال اور وہ کھانا جس کو کھاتے ہی بیہوش ہوگیا تھا یاد آیا ۔میں نے اُس لڑکے سے کہا :۔

میں ۔ کھانے کی ضرورت نہیں ہے ۔تمہاری میٹھی باتوں ہی سے میرا پیٹ بھر گیا ۔ میں تمام عمر ممنون ومشکور رہونگا ۔اگر تم میری جان بچالوگے ۔

لڑکا ۔ دیکھو تم میرے قیدی ہو ۔ جو میں حکم دوں گا اوس کی تعمیل کرنا ہوگی ۔تمہارا جینا اور مرنا میرے ہاتھوں میں ہے ۔تقریر کی ضرورت نہیں ہے ۔جیسا میں کہتا ہوں ویسا

ہی کرو اپنی رائے کو دخل نہ دو۔

میں ۔ بہت اچھا۔ تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہوں۔

میرا یہ جواب سنکر اُس نے قریب کی جھاڑی سے دو تین پوٹلیاں نکالیں اور ایک لوٹہ پانی سے بھرا ہوا سامنے رکھکر کہا۔

لڑکا ۔ اس پانی سے ہاتھ منھ دھو ڈالو اور باقی اپنے پینے کے واسطے رہنے دو۔ دیر مت کرو۔ اور نہ کسی بات کا سبب دریافت کرو۔

مطابق حکم کے میں نے ہاتھ منھ دھو ڈالے ۔ لڑکے نے پوٹلی کھول کر تھوڑی سی پوریاں نکالیں اور مجھ سے کہا دو چار جو کچھ کھائی جاویں فوراً کھالو۔

میں اپنے دل میں غور کرنے لگا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ برہمن کا لڑکا ہو کر اس ناپاک کے ہاتھ کا دیا ہوا کھانا کھاؤں۔

میں ۔ (لڑکے سے مخاطب ہو کر) میں تمہارا نام نہیں جانتا اور نہ تمہاری ذات سے واقف ہوں ۔ تمہارے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا کیونکر کھا سکتا ہوں؟ راستہ تبلادو اور کھانے سے معاف ہی رکھو۔

لڑکا (غصہ سے) میری نصیحت پر عمل نہیں کرتے اور برابر ہر بات پر اعتراض کئے جاتے ہو۔ تم قیدی ہو اور قیدی کو مذہب سے کیا سروکار؟ جیسا میں حکم دوں اُس پر کاربند ہو۔ یہ تمہاری سسرال نہیں ہے۔

باوجود ان مصائب کے مجھے ہنسی آگئی اور بولا۔

میں ۔ بھائی میری سسرال تو قیدخانہ پر بھی شرف رکھتی ہے ۔ بہرحال تابعدار ہوں جو حکم دو گے اُس کی تعمیل کروں گا۔ میں تمہارے احسانوں سے اسقدر زیربار ہو گیا ہوں

کہ چون وچرا نہیں کرسکتا۔

آخر کار اُس کی مرضی کے مطابق میں نے درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھایا پانی پیا۔ کچھ طبیعت بشاش ہوئی۔ کیونکہ دن بھر کا بھوکا پیاسا تھا۔ اس کے بعد لڑکے نے ایک دوسری پوٹلی کھولی۔ اس میں زنانی پوشاک تھی۔ میرے سامنے رکھکر اور ہنس کر یوں کہنے لگا۔

لڑکا۔ اب تم کو عورت بننا ہوگا۔ اپنی دھوتی کو خوب کس کر اونچی باندھ کر اُس پر ساڑھی عورتوں کی طرح پہن لو۔

میں نے ساڑھی زنانی وضع پر باندھنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا

لڑکا (قہقہہ مارکر) بالکل صاحبزادے ہی رہے۔ کیا تم نے کسی عورت کو ساڑھی باندھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ خیر لاؤ میں ساڑھی باندھ دوں۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے خوف سے نہیں بلکہ جوش سے۔ ایک عجیب عالم میں تھا۔ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ چُپ چاپ کھڑا رہا اور لڑکے نے ساڑھی باندھ دی۔ پھر عورتوں کی مصنوعی چوٹی میرے سر پر رکھی اور تمام جسم کو زیور سے آراستہ کرکے اچھی خاصی عورت بنا دیا۔ ہنوز میرے مونچھیں اور ڈاڑھی نہیں نکلی تھی۔ وہاں آئینہ نہ تھا ورنہ ناظرین کو اُس وقت کی تصویر کھینچکر دکھاتا۔

لڑکا (مجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھکر) میرا کام ختم ہوا اب جو کچھ کہتا ہوں اُس کو غور سے سُنو اور یاد رکھو دوبارہ سمجھانے کا موقعہ نہیں ملیگا۔ تم سیدھے پچھم کی طرف روانہ ہو۔ راستہ کے خاتمہ پر جو جنگل ملے اُس میں بےخوف چلے جانا۔ اُس جنگل میں تم کو ایک بڑی نہر ملے گی۔ جس سے کچھ دُور فاصلے پر ایک عظیم الشان پھاٹک ہوگا۔ وہاں

منگلا نامی ایک بڑھیا رہتی ہے اُسے نانی کہہ کر پکارنا ۔ وہ بڑھیا ہمارے سردار کی ماں ہے اور بہت چالاک ہے جب بڑھیا تمہارا نام دریافت کرے تو بن لتا بتانا اور کہنا کہ میں تر ولتا کی چھوٹی بہن ہوں ۔ میں تم کو ایک قید سے رہا کر کے دوسری میں ڈالتا ہوں ۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں ۔ سوائے اس کے رہائی کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ چاروں طرف ڈاکو ہیں اور غلطی کا صرف اک یہی راستہ ہے ۔ اگر جان عزیز ہے تو مجھ پر بھروسہ کر کے میری باتوں پر عمل کرنا ۔ مالک تمہاری مشکل آسان کریگا ۔ آج کا (پاس ورڈ) پرول راما ہے ۔

اس گفتگو کے ختم ہونے کے بعد لڑکا نہایت تیزی سے ایک جانب جھاڑیوں میں غائب ہو گیا ۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا چاروں طرف دیکھتا رہ گیا اور بیساختہ میری زبان سے یہ نکلا ؎

رفتی و مرا خبر نہ کردی بر بیکسیم نظر نکردی

پانچواں باب

دام سے چھوٹے تو قفس میں رہے
جب بھی صیاد کے بس میں رہے

اُس سروش لڑکے کے چلے جانے کے بعد میں کچھ دیر درخت کے نیچے سکتے کے سے عالم میں کھڑا رہا ۔ اور مختلف خیالات دل میں پیدا ہوا کئے ۔ سب سے زیادہ جو چیز دریائے حیرت میں ڈالے ہوئے تھی وہ لڑکے کا لاثانی حسن تھا ۔ میں نے اپنی

گذشتہ زندگی اور سسرال کے واقعات یاد کئے جس بات کو سوچا تعجب ہی پیدا ہوتا تھا۔ دفعتاً یہ خیال آیا کہ میں اب بن تنا ہوں اور مجکو اپنے مہربان پری جمال لڑکے کے حکموں کی تعمیل کرنی چاہئے۔ یہ سوچکر اپنا راستہ لیا۔ کچھ دور چلا ہونگا کہ گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں۔ چمکتا ہوا چاند کالے بادلوں میں چھپ گیا۔ زمین و آسمان تیرہ و تار ہو گیا لیکن میں برابر آگے بڑھتا ہی گیا۔ آخرکار رہنر کو طے کرتا ہوا اک بڑے پھاٹک پر پہونچا جو اندر سے بند تھا۔ آواز دی۔ لیکن جواب نہ ملا۔ پھر بڑے زور سے میں نے نانی نانی کہہ کر پکارا۔ جواب میں آواز آئی "کون ہے"؟

میں۔ آپ کی نواسی ہوں۔ راستہ بھول گئی ہوں اس وجہ سے ناوقت ہو گیا۔ دروازہ کھولئے!۔

جواب ۔ چل دور ہو۔ نہیں تو آج کا پرول بتا۔

میں ۔ آج کا پرول راما ہے۔

فوراً دروازہ کھول دیا گیا۔ اور دروازہ کھولنے والی بڑھیا نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے اشارہ کیا۔ اس بڑھیا کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر بہت ہی خوف معلوم ہوا۔ لیکن اور چارہ ہی کیا تھا۔ مجبوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔ کئی دالان اور صحن طے کرتا ہوا زینے میں ہو کر بالاخانہ پر پہنچا۔ وہاں روشنی کافی تھی۔ اور کمرے کی سب چیزیں صاف معلوم ہوتی تھیں۔

بڑھیا۔ (مسکراتی ہوئی) بن تنا تو بانے پہنے ہوئے ہے۔ آنکھوں خاک اب تو سیانی ہو گئی۔ اس وقت کہاں سے آتی ہے؟

میں۔ (بلا سوچے سمجھے) سُنا تھا کہ آپ کی طبیعت علیل ہے۔ جی جی خود آنا چاہتی

تھیں۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بھیجا اور کہا جا بہت دن ہوگئے نانی کو دیکھ آ۔ آتے
آتے راستہ بھول گئی۔ اس وجہ سے رات ہوگئی۔ میں بہت تھک گئی ہوں اور سونا
چاہتی ہوں۔
بڑھیا۔ بیٹی ہر قسم کی عادت رکھنی چاہئے۔ کیا اتنی ہی دُور چلنے میں تھک گئی۔ مگر
ہاں تو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی ہے بیشک تھک گئی ہوگی۔ اچھا آ میرے
پیچھے پیچھے چلی آ۔

میں سایہ کی طرح بڑھیا کے ساتھ ہولیا۔ دو تین کمروں میں گذرنے کے بعد
وہ مجھے ایک مختصر سی کوٹھری میں لیگئی۔ جہاں پلنگ پر صاف سُتھرا بستر بچھا ہوا تھا
چھوٹی سی چوکی بھی پلنگ کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچکر بڑھیا نے کہا:۔
بڑھیا۔ جا اُس چوکی پر بیٹھ کر اپنا زیور اُتار ڈال اور بستر کے نیچے رکھدے۔ گرمی
اسقدر ہے کہ کپڑا ہی جسم پر وبال ہے زیور سے تیرا دم گھبراتا ہوگا۔ میں ابھی تیرے
لئے کھانا لیکر آتی ہوں۔
میں۔ کچھ ناشتہ کرکے چلی تھی اچھی طرح سے بھوک نہیں ہے۔
بڑھیا۔ بچی تھوڑا سا کھالے۔ خالی پیٹ پہاڑ سی رات کیونکر کٹے گی؟ میں نے اپنے
واسطے خستہ کچوریاں پکائی تھیں۔ طبیعت کے خراب ہو جانے کی وجہ سے نہ کھا سکی۔
تو اگر کھالے گی تو میری محنت ٹھکانے لگ جائیگی۔

میں نے جواب میں اچھا کہا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ بڑھیا باہر چلی گئی۔ پلنگ پر
پڑے پڑے عالم مثال سے عالم خیال میں پہنچا اور دل سے سوال کرنے لگا اب کیا
ہوگا یہاں کب تک رہونگا۔ اگر بڑھیا پر میرا راز کھل گیا تو کیا نتیجہ ہوگا؟ بڑھیا کی

حرکات سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس لئے میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس چڑیل کی دی ہوئی کوئی چیز نہ کھاؤں گا۔ اسی طرح کے خیالوں میں بہت دیر تک مصروف رہا۔ لیکن بڑھیا واپس نہ آئی۔ میں پلنگ پر سے اُٹھکر دبے پاؤں اُس کمرے میں پہنچا جہاں پہلے آیا تھا۔ لیکن ہر جگہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور میں نے کسی متنفس کو نہیں دیکھا۔ کسیقدر نڈر ہو کر زینہ سے نیچے اُترا تو یکایک ایک تیز روشنی مجھ پر پڑی مجھے یقین ہوا کہ ضرور کسی شخص نے دیکھ لیا۔ اُس وقت خوف کے مارے جو حالت تھی اُس کا اظہار احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ تیزی کے ساتھ لوٹا اور اپنی کوٹھری میں جا کر بستر پر لیٹ رہا۔ زنجیر بند کر لی۔ دل خوف سے کانپنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کوٹھڑی کے باہر آدمیوں کی آہٹ معلوم ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی مکان کے اندر گھُس آئے ہیں پھر یہ آواز آئی "کمبخت سچ بتا اس پری جمال لڑکی کو تونے یہاں کس کے لئے پھانس رکھا ہے"

بڑھیا۔ ارے یہ کیا بکتے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ اپنا منھ سنبھالو۔ یہ تو لتا کی چھوٹی بہن بِن لتا ہے جو مجھ سے ملنے کے لئے یہاں آئی ہے۔ میں اُسی کے واسطے کھانا لیئے جاتی ہوں۔

وہی شخص۔ اچھا دیکھیں کون ہے۔ ورنہ پھر تیری خیر نہیں ہے۔

میں نے پلنگ سے اُتر کر زنجیر تھام لی۔ یاس کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پھر معلوم ہوا کہ کوئی صدر پھاٹک پر کھڑا ہوا چلا رہا ہے۔

ڈاکو۔ (آواز کی طرف متوجہ ہو کر) تو کون ہے اور اس وقت یہاں کیوں آئی؟

آواز۔ بڑے ماموں آپ مجکو نہیں پہچانتے۔ میں اپنی نانی سے ملنے آئی ہوں راستہ

بھول گئی تھی اس وجہ سے رات ہو گئی۔

اتنے میں بڑھیا کی ایک چیخ سُنائی دی اور سب لوگ "کیا ہے۔ کیا ہے" کہتے ہوئے زینے سے نیچے اُتر گئے۔ میں نے شکر ادا کیا۔ سوچا کہ بڑی آفت سے چھٹکارا ہوا اگر تھوڑی دیر اور ہو جاتی تو پکڑا جاتا۔ جو آوازیں باہر سے آرہی تھیں اُن سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اصلی بن لتا آگئی ہے۔ بن لتا کا آنا اور بڑھیا کا واویلا کرنا ایک ہی وقت ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد خاموشی ہو جانے پر دریافت حال کا خیال پیدا ہوا۔ دروازہ کھولنا چاہا تو باہر سے بند پایا۔ مجکو یقین کامل ہو گیا کہ میں پھر قید کر دیا گیا۔ کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا کہ شاید وہ لڑکا یہاں بھی پہنچ گیا ہو ہمت دلاتا تھا۔ اسی کشمکش و پنج میں بیٹھا کہ نیند آگئی اور سو گیا۔ (باقی آیندہ)

دردِ دل

آزاد صاحب کو کئی سال تک شدت کے ساتھ دمہ کا زور و شور رہا۔ سخت سے سخت دورہ کی حالت میں بھی اُن کا قلم نہیں رُکتا تھا۔ ایک بار میں پنجاب میں تھی۔ آزاد صاحب اپنی ملازمت پر تھے۔ رات کو بڑے زور کا دورہ ہوا۔ عین دورہ کی تکلیف کی حالت میں مجھے خط لکھنا شروع کیا کہ خیال بٹے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُن کے قلم سے بعض یاس آمیز فقرات نکل گئے۔ میں نے تسکین وہ جواب بھیجا مگر میرے قلم سے بھی بعض مایوسانہ فقرات بے اختیار نکل گئے۔ اتفاق سے جس دن میرا جواب پہنچا ہے اُسی شب کو پھر ایک سخت دورہ ہوا۔ عین دورہ کی حالت میں ذیل کی غزل لکھی گئی تھی جس کے ذریعہ سے میرے مایوسانہ فقرات کا جواب دیا گیا تھا۔

ایڈیٹر

دُنیا سے رنج پا کر ناشاد ہم نہ ہوں گے
آبادہی رہیں گے برباد ہم نہ ہوں گے

اے چرخ گر مٹانا ہے ہمکو تو مٹا لے
کیا خاک رہگذر پر نقشِ قدم نہ ہوں گے!

رگ رگ میں نیش زن ہی مضرابِ دردِ قومی
اس ساز پر بھی مائل اہلِ کرم نہ ہوں گے!

بانگِ جرس ہی ہر اک تارِ نفس ہمارا
کیوں قافلہ کے آگے آگے ہی ہم نہ ہونگے

ہر ہر نفس سے سینے پر چل رہی ہیں آرے
پر حوصلوں کے ہرگز پیچھے قدم نہ ہونگے

اے ناوکِ بلا میں تیری خلش کے صدقے
تو ہی بتا کہ کب تک بیداد کم نہ ہوں گے!

دُنیا کی تلخکامی ہے جام میں ہمارے
ہنس ہنس کے پی رہے ہیں۔ ناشاد ہم نہ ہونگے

اٹھے اے ہمدمِ مشقت ہمت نہ ہار ہرگز
یہ تازیانے کھا کر پیچھے قدم نہ ہوں گے

تم آج دردِ دل کا سُنتے نہیں فسانہ کل ڈھونڈتے پھروگے آزاد ہم نہ ہونگے

آزاد

تشریحات

۵۱ و ۵۲ دمہ کے تنفس کی جانب اشارہ ہے۔

۵۳ اس "تلخکامی" میں اہل دُنیا کی سیکڑوں زیادتیاں اور بے انصافیاں جو اُن کے ساتھ ہوئی ہیں۔ ملازمت کے تلخ تجربات کثیر مالی نقصانات اور خرابی صحت کی شکایات شامل ہیں۔

۵۴ "ہمدم مشقت" کا خطاب عاجزہ سے ہے اس وجہ سے کہ "پیام امید" کے ابتدائے ظہور سے عموماً ہم دونوں معمولاً روزانہ دو ڈھائی بجے رات سے ایکساتھ بیٹھ کر محنت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔

آزاد بیگم

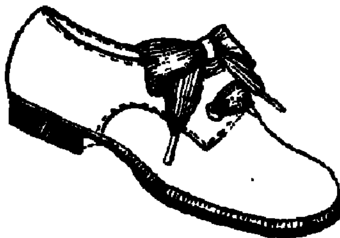
پاؤن باون ہیئر آئیل

جناب من! یونتو آپ نے باوں کے لگانے والے ہزاروں خوشبودار تیل دیکھے ہونگے لیکن یہ تیل بھی اپنے بیش قیمت اجزا اور عجائب و غرائب خواص کے لحاظ سے یگانہ روزگار ہے درد سر۔ نزلہ۔ زکام کو ---------- فوراً دور۔ بال سیاہ کرنے۔ گھنے اور گھنگو۔ یالے چمکدار ملایم بنانے میں اکسیر ثابت ہوا ہے۔ دماغی طاقت کو بڑھانا اس کا اصلی کام ہے۔ اسکی مہک اسقدر تیز ہے کہ شیشی کھولتے ہی خوشبو کی بے اندازہ لپٹیں آتی ہیں جس نے ایک تبہ اس پاؤن باون تیل کا استعمال کیا وہ ہمیشہ کیلئے اسکا شیدائی بن گیا۔ صرف آزمایش شرط ہے قیمت صرف بارہ آنہ (۱۲) محصول ڈاک ۴ر۔ ہر ایک شیشی کے ساتھ انعامی پیپرز ملفوف ہیں

المشتہر:۔ میسرز سلیمان اینڈ روز ۲۵ بار سٹریٹ رنگون

بچکانے اور زنانے شوز۔ بوٹ

اس کارخانہ میں صرف بچوں کے لئے اور بی بیوں کیلئے نہایت مضبوط آرام دہ اور خوبصورت جوتے تیار ہوتے ہیں ہر جوتے کے ساتھ خوبصورتی اور **مضبوطی کی گارنٹی دیجاتی ہے** اگر پسند نہ ہوں تو واپس کر لئے جاتے ہیں۔



پیر کا صحیح ناپ کاغذ پر پنسل سے کھینچکر بھیجنا چاہئے وضع یا شیپ اور ایڑی کے متعلق کافی ہدایت وصول ہونا ضروری ہے

مینیجر۔ گولڈن شوز فیکٹری قرول باڑہ آگرہ

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ سنہ ۱۹۱۱ء کی
کا نوری جنتری نہایت خوبصورت اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ
پر چھپی ہوئی۔ دس متفرق جگہ کے شریف لکھے پڑھے اشخاص
کے نام اور پورا پتہ لکھنے پر بلا محصول ڈاک بھیجی جاتی ہے

تندرستی کی گفتگو

اپنی اپنی صحت کو درست رکھنے کیلئے امیر سے غریب تک فکر میں رہتے
ہیں اور اپنی من مانی جسکو جیسی سوجھتی ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔
دولتمند گھی دودھ میوہ وغیرہ کھاتے ہیں اور قیمتی دوا تلاش کرتے ہیں
غریب کم خرچ جڑی بوٹی اور جنگل کی کھوج میں رہتے ہیں جاڑے کے موسم میں
چونکہ مقویات کا کھانا نہایت مفید ہوتا ہے اس فکر اور وقت کو دور
کرنیکی نہایت ہی آسان ترکیب ہے جسمیں نہ تو زیادہ پریشانی ہوتی
ہے اور نہ لیاقت سے باہر خرچ ہے۔ وہ

ڈاکٹر ایس کے برمن کی مقوی گولیاں

ہیں۔ آپ بھی آزمایش کر دیکھئے۔ یہ بھوک کو بڑھاتی ہیں اور
نیا خون پیدا کرتی ہیں جوانی میں بے اعتدالیوں کی وجہ
سے جو خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور جسے جوانی میں بڑھاپے
کی سی حالت ہو جاتی ہے یہ سب شکایتیں دور کر کے نیا خون
اور نیا جوش پیدا کرتی ہیں قیمت ۳۰ گولیوں کی شیشی ۱؎ محصولڈاک ۵؎
ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۱۵۰ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

(باہتمام منشی عبدالعزیز خاں پرنٹر عزیزی پریس آگرہ میں چھپا)

ضوابط رسالہ

اس رسالہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہونگے "پیام امید" تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا آرگن رکھا جاتا ہے۔ اسمیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اسکے مخاطب تمام روشن خیال مرد اور مستورات ہیں۔ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک میں ایجادات و اختراعات کا دور شروع ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اصلی کام کو ابھی سے فروغ نہیں کرایا جا سکتا۔ ہمیں سب سے پہلے اتحاد پیدا کرنا ہے جبتک ہندو مسلمان اور سکھ عیسائی آپس میں لڑتے رہینگے قوم اور ملک کی ترقی اصلی اور حقیقی معنوں میں بالکل ہی ناممکن ہے ہماری کوشش کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم (۱) مسلمان خریداران رسالہ سے تین روپیہ سالانہ قیمت لینگے اور اردو خواں ہندو خواتین کو رسالہ مفت تقسیم کرینگے جہاں تک اور جس حد تک کہ ہماری اشاعت اس بار کی برداشت کرنے کی قوت ہمیں دے سکیگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم ہندو خواتین سے متفق الرائے ہو جائیں تو مردوں کے خیالات اتنے جلد ملا لئے جا سکینگے کہ دنیا کو حیرت ہوگی (۲) قومی اور ملکی ترقی کی پہلی منزل زبان کی ترقی ہے۔ ہم اردو علم و ادب کی ترقی اور توسیع میں سعی بلیغ کرینگے اور وقتاً فوقتاً انعامی مضامین کا اعلان کرتے رہیں گے تاکہ لایق مضمون نگاروں کو اچھے اور مفید مضامین لکھتے رہنے کی ترغیب اور تحریص ہو۔ رسالہ کی اشاعت بڑھنے پر ہم کوشش کرینگے کہ مفید علمی کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے ہماری زبان میں کئے جائیں اور مناسب قیمت پر فروخت ہوں۔ (۳) ایسے بچے جو کافی طور پر علمی ترقی کر چکے ہیں اور ہر اہم مسئلہ پر ایک خاص رائے قائم کرنے کے متلاشی ہیں انہیں ان مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں خارجی مدد پہنچانے کی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ زمانہ انکے لئے نہایت نازک زمانہ ہے۔ اگر وہ کسی اہم مسئلہ پر کوئی غلط رائے قائم کر لینگے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کے دماغوں میں نشو و نما پاکر وہ غلط رائے جم جائیگی تو ان کی ساری عمر برباد کر دینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہوگی ہم انہیں ایسی خارجی مدد عین وقت پر پہنچا دینگے تاکہ آگے چلکر وہ بھی ترقی کی رفتار میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھیں۔

اُجرت اشتہارات

ترقی اشاعت رسالہ کے ساتھ اجرت اشتہارات میں تخفیف ہوتی جائیگی موجودہ شرح حسب ذیل ہے مگر ہمیں یہ ہرگز منظور نہیں ہے۔ اشتہار مخرب اخلاق کے لئے ہر استفسار ہونے پر کوئی جواب دیا جائیگا۔

[illegible]	یکبار	سہ ماہی	ششماہی	سالانہ
[illegible]	1/	2/8/	4/4/	7/8/
[illegible]	2/	5/	9/	15/
[illegible]	4/	10/	19/	30/

[illegible] اجرت اشتہار پیشگی وصول ہونا چاہئے۔ منیجر رسالہ

نمبر ۳۲ رجسٹرڈ نمبر رسالہ اے ۷۳۹ جلد ۴

امید کا پیام ——— اٹھو ——— اٹھو ——— اور آگے بڑھو"

پیام امید

محمود آباد ـ سیتاپور (اودھ) مئی ۱۹۱۸ء

ایک علمی ـ ادبی ـ اخلاقی ـ تمدنی (سوشل) رسالہ

ایڈیٹر بیگم اظہر علی آزاد

اہلیہ ـ اظہر علی صاحب آزاد ـ ایم ـ آر ـ اے ـ ایس لنڈن

باہتمام منشی عبدالعزیز خاں پرنٹر

عزیزی پریس آگرہ میں چھپا

فہرست مضامین مئی نمبر ۱۹۱۸ء

نوٹ - ان دنوں آگرہ میں طاعون اور فصلی بخار کی ایسی شدت رہی ہے کہ خدا کی پناہ - سیکڑوں گھر خالی ہوگئے ہر طرف سناٹے کا عالم ہے - کاروبار اور کارخانے بند پڑے ہیں - اس خاص سبب سے اگر "پیام امید" ماہ مئی (یعنی پرچہ ہذا) کی اشاعت کسی قدر دیر میں ہو تو ہمیں امید ہے کہ قدردانان رسالہ معاف فرمائیں گے۔

مینجر عزیزی پریس آگرہ

امید کا پیام ۔۔۔۔۔ اُٹھو ۔۔۔۔۔ اُٹھو ۔۔۔۔۔ اور آگے بڑھو!

امید

نمبر ۳۳ ‖ محمود آباد ۔ سیتاپور (اودھ) مئی ۱۹۱۸ء ‖ جلد ۴

ایک عام غلط فہمی کی اصلاح "پیام امید" کا مخاطب تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ہے اس میں جنس کی قید نہیں ، جس حال میں کہ ہزاروں اخبار اور رسالے مردوں کی ایڈیٹری سے نکلے ہوئے ہم مستورات بے تکلف پڑھ رہی ہیں تو کیا ایک چھوٹے سے ماہوار رسالہ کا پڑھنا مردوں کو گراں گزریگا؟ ہم اپنے روشن خیال اور تربیت یافتہ مردوں کے خلاف جو ہمارے ملک کا بہترین طبقہ ہے ایسی رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے

متفرقات

حضرت صفی لکھنوی نے حضرت مجتہد العصر شمس العلما ۔ جناب مولینا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مدظلہ کی تہنیت غسل صحت کی تقریب میں ایک قطعہ تاریخ تصنیف فرمایا

تھا جو شیعہ کالج نیوز کی اشاعت مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔
اس قطعہ میں مصرعہ ذیل سے مادہ تاریخ ۱۳۳۶ھ نکلتا ہے۔ ع

"ہوا آب بقا سے غسل محبوب"

اس مصرعہ پر نظر پڑتے ہی ہمارا جی چاہا تھا کہ اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کریں۔ مگر بعض وجوہ سے ہمیں سکوت کرنا پڑا مناسب معلوم ہوا۔ اب دیکھتے ہیں کہ اخبار "اثنا عشری" دہلی نے اپنی اشاعت مورخہ یکم اپریل میں قریب قریب وہی خیالات ظاہر کر دیئے ہیں جو ہمارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہم تو صرف اتنا ہی سمجھ رہے تھے کہ "محبوب" کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔ اور بجائے اس کے کہ اس لفظ سے کوئی لطف پیدا ہو ایک کراہت پیدا ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ہم ایسے حضرت مجتہد العصر قبلہ مدظلہٗ کی شان میں ایک گستاخی خیال کرتے تھے گو بالارادہ سرزد نہ ہوئی ہو۔ مگر "اخبار" اثنا عشری" کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آج سے دو برس پہلے جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر نے حضرت مجتہد العصر قبلہ و کعبہ کے درد قولنج سے صحت یاب ہونے کے موقع پر قطعہ تہنیت تصنیف فرمایا تھا۔ جس میں مصرعہ ذیل سے مادہ تاریخ ۱۳۳۴ھ اخذ ہوتا تھا۔

"ہوا آب بقا سے غسل جناب"

اخبار مذکور کا یہ بھی بیان ہے کہ یہ قطعہ ایک مجمع عام میں پڑھا گیا تھا اور شاید کسی اخبار میں بھی شائع ہو چکا ہے ایسی صورت میں سرقہ کا الزام اور بھی مستزاد ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ایسے توارد کو کوئی مان نہیں سکتا۔

حضرت صفی کی تصانیف میں "جذبہ اسلام" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی

نظم آٹھ دس شعروں کی دیکھی گئی جو بلاشبہ ایسی نظم ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے - اور یہ نظم جب تک اُردو زبان دُنیا میں قائم ہے فنا نہیں ہوسکتی - مگر اس کے بعد یا اس سے پہلے آپ کی تصانیف میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں ملا جو معمولی شاعری کی سطح سے بالاتر سمجھا جاسکتا ہو -

---

فن نعت گوئی کے بادشاہ حضرت محسن کاکوروی مرحوم و مغفور کا کلام ایک عرصہ سے نایاب ہو رہا تھا - شکر کا مقام ہے کہ آپ کے صاحبزادے جناب مولوی نور الحسن صاحب بی اے وکیل نے اپنے خاص اہتمام سے صحت کرا کے "کلیات محسن" کے نام سے آپ کا لی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام یکجا کر کے شائع کرا دیا ہے - ہم چاہتے ہیں کہ جس قدر اور عزت کی نگاہ سے مولوی صاحب مرحوم کا کلام ہماری صوبہ میں دیکھا جاتا ہے اسی طرح پنجاب میں بھی یہ کلام ہر دلعزیز اور مقبول عام ہو جائے "مخزن" ایجنسی میں "کلیات محسن" موجود ہے - اور شائقین وہاں سے منگا سکتے ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح مرثیہ گوئی کو جناب انیس مرحوم نے ایک فن بنا دیا تھا اور فن بنا کے اُس فن کو عروجِ کمال پر پہنچا گئے تھے اسی طرح حضرت محسن مرحوم نے بھی نعت گوئی کو ایک فن بنا دیا اور اس فن کو عروج کمال پر پہنچا گئے - جس طرح آجتک مرثیہ گوئی حضرت انیس مرحوم کے نام پر ختم رہی - اسی طرح فن نعت گوئی کا بھی حضرت محسن ہی کے نام نامی پر خاتمہ ہے - آپ نے ساری عمر نعت گوئی ہی میں صرف کی اور سوا نعت کے کچھ نہیں لکھا - نعت لکھتے وقت آپ باوضو ہو کر جانماز پر بیٹھتے تھے اور جو کچھ لکھتے لکھتے حضور قلب کیسا تھ

بکلتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں ایک مقناطیسی کشش ہے۔ ہر ہر لفظ دل سے نکلا ہوا ہے اور دل ہی میں پہنچکر اپنا گھر بنا لیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل نعت گوئی بے فکروں کا ایک عام مشغلہ ہو گیا ہے۔ اور جس شخص کو چار سطر سیدھی سادی نثر لکھنے کا بھی سلیقہ نہیں وہ بھی خواہ مخواہ زبردستی کچھ نہ کچھ لکھ مارتا ہے۔ بعض صورتوں میں نعت کے نام سے جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ عام اس سے کہ ادبی حیثیت سے پوچ گوئی کی حد سے آگے نہیں بڑھتا اس میں ایک بڑا سخت عیب یہ بھی ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ جناب سرور کائنات کی تعریف ہو آپ کی ذات پاک کے ساتھ بے ادبی کی جاتی ہے۔ جس کے پڑھنے میں بجائے اس کے کہ ثواب حاصل ہو اور الٹا عذاب ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل "پیام امید" پہلے کرچکا ہے "ہماری نعتیہ نظمیں اور میلاد شریف" کے عنوان والا مضمون ملاحظہ طلب ہے۔ مومنین اگر نعت پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں تو "کلیات محسن" پڑھیں۔ ہمارے عام بے فکرے اگر نعت گوئی کا شوق رکھتے ہیں تو اس کلیات کو دیکھیں کہ نعت اسے کہتے ہیں پوچ گوئی کا نام نعت گوئی نہیں ہے۔ ممالک متحدہ میں کلیات محسن "الناظر" اور "ہمدم" بک ایجنسی میں موجود ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم توجہ دلاتے ہیں کہ "الناظر بک ایجنسی" نے حال میں بڑی ترقی کی ہے اور نہایت ہی نفیس ذخیرہ عمدہ عمدہ کتابوں کا جمع کیا ہے۔ اسیطرح "الناظر" پریس نے بھی قابل قدر ترقی کی ہے۔ اور اس مطبع کے مطبوعات بہت صاف اور خوشخط پائے جاتے ہیں۔ علی ہذا عزیزی پریس آگرہ کا کام بھی ہر طرح قابل ہمت افزائی ہے "الناظر" پریس کے مطبوعات کی خصوصیت صفائی ہے

اور ایسی صفائی کہ ہمارے صوبہ میں سوا رحمت اللہ رعد کے "نامی پریس" کے اور کہیں اس کی نظیر نظر نہیں آتی۔ عزیزی پریس کی ایک خصوصیت ہمیں اس وجہ سے معلوم ہے کہ ایک مدت سے ہمیں اس کا ذاتی تجربہ ہو رہا ہے۔ اور وہ خصوصیت معاملت کی صفائی اور قابل عزت دیانت داری ہے۔ اس کے متعلق ہمیں کسی اور مطبع کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس وجہ سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ باقی اور مطابع دیانت سے کام نہیں کرتے۔

"آتش و غالب" کے عنوان سے ایک نہایت ہی پُر مغز اور قابل قدر مضمون حضرت آزردہ سیتاپوری نے رسالہ "مخزن" کے مارچ نمبر ۱۹۳۰ء میں شائع کرایا ہے۔ ایسے مضامین کسی شخص واحد کی ملک نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ یہ ہمارے ادبی بیت المال کی ملک ہیں اور ان کی اشاعت ہم سب پر یکساں فرض ہے۔ بہرحال مکرمی تاجور صاحب اسے چوری قرار دیں یا سینہ زوری ہم تو اس کی نقل شائع کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ حضرت آزردہ بلاشبہ مذاق صحیح رکھتے ہیں۔ اور ہمیں ایسے ہی تربیت یافتہ اہل مذاق سلیم کی اشد ضرورت ہے۔ اس مضمون میں جہاں جہاں جو جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ہمیں ان سے نقطہ بہ نقطہ اتفاق ہے کاش اسی آنکھ سے آغا حشر صاحب کا کلام بھی دیکھا گیا ہوتا تو کیسا اچھا ہوتا۔

اسی مارچ نمبر کے صفحہ ۴۴ پر حضرت تاجور شعرائے پنجاب پر ایک تبصرہ لکھنے کا ارادہ ظاہر فرما رہے ہیں اور منصفانہ تنقید لکھنے کا وعدہ فرماتے ہیں جس میں

محاسن اور اسقام دونوں دکھائے جائیں گے۔ ہم بھی بے صبری سے اس کتاب کے منتظر رہیں گے۔

ہمزاد ادبی نقاد

کوئی فرقہ "قوم۔ قوم" کی رٹ لگا کر "قوم" نہیں بن سکتا جب تک وہ دُنیا پر پہلے یہ ثابت نہ کرلے کہ وہ ایک زندہ۔ بیدار۔ جیتی جاگتی ہستی ہے۔ اردو خواں دنیا دیکھے کہ دنیا کی زندہ قومیں اپنے اخباروں کو کس طرح چلا رہی ہیں۔ ہم ذیل کی فہرست میں دکھاتے ہیں کہ انگلستان فرانس اور امریکہ میں قومی اخباروں کی کتنی اشاعت ہے۔

نام اخبار	تعداد اشاعت
برطانیہ عظمیٰ	
ڈیلی میل	سات لاکھ پندرہ ہزار
ڈیلی اکسپرس	چھ لاکھ
ڈیلی کرانیکل	چار لاکھ
ڈیلی ٹیلیگراف	دو لاکھ
لنڈن ٹائمز	ڈیڑھ لاکھ
ایوننگ اسٹینڈرڈ	تین لاکھ
ویسٹ منسٹر گزٹ	تین لاکھ
ڈیلی مرر	۹ لاکھ پانچ ہزار

نام اخبار	تعداد اشاعت
(فرانس)	
فیگرو (روزانہ)	بارہ لاکھ سے سولہ لاکھ تک
نیویارک ہرلڈ (پیرس ایڈیشن)	دس لاکھ
(امریکہ)	
نیویارک ہرلڈ (امریکہ میں)	بیس لاکھ سے پچیس لاکھ تک
ورلڈ	دس لاکھ سے بارہ لاکھ تک

(ماخوذ از اخبار "مدینہ")

نوٹ - بادی النظر میں ہیں لندن ٹائمس کی تعداد اشاعت صحیح نظر نہیں آتی - اس وجہ سے کہ ٹائمس بلاشبہ ساری دنیا کے اخباروں کا بادشاہ کہا جاتا ہے ۔

یہ ہے حال دنیا کی زندہ قوموں کا - اُن کا تو یہ حال ہے اور ہم مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اس سارے صوبہ ممالک متحدہ بھر میں ایک موقر اُردو روزانہ اخبار بھی ہمارے چلائے نہیں چلتا - صوبہ بھر میں یقینی سب سے زیادہ اشاعت ہمارے اسلامی اُردو روزانہ اخباروں میں معزز ہمعصر "ہمدم" کی ہے - اور یہی بلاشبہ ہمارا بہترین قومی روزانہ اخبار ہے جو ہمیشہ وقت پر شائع ہوتا ہے اور جس کا اڈیٹر بھی تجربہ کار ہوشیار اور لایق ہے - مگر باوجود اس کے ابھی تک اس کی مالی حالت خاطر خواہ طور پر قابل نہیں ہے - ہمارے معزز فرزند قوم شاہ حسین صاحب نے ایثار کی انتہائی قوت صرف کرکے اسے جاری کیا اور کافی عرصہ تک چلایا - اب آنریبل راجہ صاحب بہادر محمود آباد اور دیگر حضرات کا قومی جوش ایسے چلا رہا ہے - مگر مالی مشکلات

کی پیچیدگیاں ابھی تک دور نہیں ہونے پائی ہیں - کیا وہ قوم جس کے ......
چلائے اس پایہ کا ایک روزانہ اردو اخبار بھی اچھی طرح نہ چل سکے کبھی قوم
...... کہے جانے کے قابل ہو سکتی ہے ؟ اور یہ حال ہے ہمارے صوبہ کے
مسلمہ بہترین اردو روزانہ اخبار کا اس کے بعد ہفتہ وار اخباروں اور ماہوار رسالوں
کا حال انہیں اخبار اور رسالوں کے مالکوں اور ایڈیٹروں کے دل سے پوچھئے
بات کیا ہے ؟ جب ہمارے ہونہار تربیت یافتہ طبقہ سے سوال کیا جاتا ہے کہ
آخر آپ ادھر کیوں نہیں توجہ فرماتے ؟ تو جواب ملتا ہے کہ ہم صاحب لوگ ہیں - اردو
اخبار پڑھنا ہماری توہین ہے - اس پر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی بات ہے تو
آپ سب مل کر ایک زبردست روزانہ انگریزی اخبار ہی کیوں نہیں پیدا کر لیتے ؟
ایک وہ زمانہ تھا کہ "کامریڈ" مرحوم زندہ تھا - اور مسٹر محمد علی کے سامنے یہ سوال
پیش کیا گیا تھا کہ آپ اپنے ہفتہ وار اخبار کو روزانہ کی صورت میں تبدیل کر دیجئے
لیک معقول مدت کی غور و فکر اور تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ
اگر روزانہ انگریزی اخبار نکالا جائے تو کافی خریدار بہم نہیں پہونچ سکتے - تو آخر اب
کیا نتیجہ نکلتا ہے ؟ انگریزی قومی اخبار اگر نکالا جائے تو آپ اُسے چلا نہیں سکتے
اردو روزانہ اخبار کی آپ مدد نہ کریں گے محض اس وجہ سے کہ وہ اردو اخبار ہے
اور آپ صاحب لوگ ہیں - یورپین اور امریکن اخباروں کا تو نام لینا ہی فضول ہے
ہندو بھائیوں کے انگریزی اخباروں کا ذکر کرنا بھی لاحاصل ہے - مگر کیا
ہمیں اتنا بھی عرض کر لینے دیجیگا کہ ہندی ماہوار رسالوں سے اردو ماہوار رسالوں
میں سے مقابلہ کر کے ذرا دیکھ لیجئے - ایک ہندی ماہواری رسالہ "دو سرسوتی" ..

کا مقابل   سارے ہندوستان کے اُردو ماہواری رسالوں میں سے تلاش
کرکے صرف ایک ہی ہمارے سامنے لاکے دھر دیجئے جو اس کا مقابلہ کرسکتا ہو۔
مضامین کی عمدگی میں۔ کاغذمیں۔ چھپائی میں۔ اس کی رنگا رنگ تصاویر اور بیل بوٹوں
کی دل آویزی میں۔ جس اعتبار جس پہلو سے چاہئے مقابلہ کرکے دیکھ لیجئے۔ کیا
ہمارے ہندو بھائی انگریزی خواں نہیں ہیں۔ کیا دنیا میں ایک اکیلے آپ ہی عالم
ہیں اور باقی سب جاہل ہیں؟ کیا اُنہوں نے آپ سے انگریزی میں کم تعلیم پائی
ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ تو ہندی کو اپنی قومی زبان سمجھ کر دل وجان سے
اُس کی حمایت پر مرے مٹے ہوئے ہیں اور آپ ہیں کہ اُردو زبان سے زبانی
ہمدردی تو ضرور رکھتے ہیں مگر جب جیب میں ہاتھ ڈالنے کا وقت آتا ہے تو آپ
چاہتے ہیں کہ یہاں آپ کی جگہ پر کوئی اور ہی ہوتا تو اچھا تھا۔ ہمیں اپنے بھائی
بہنوں سے صاف صاف کہہ دینا ہے کہ ان باتوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں
ہوسکتا۔ یا تو آپ دل وجان سے اُردو کی حمایت پر کمربستہ ہوجائے۔ اُردو کتابیں
پڑھنا۔ اپنے گھر میں اُن کا مختصر سا کتب خانہ جمع کرنا۔ اُردو اخباروں کی ہر طرح
دامے درمے سخنے قدمے اعانت کرنا شروع کردیجئے۔ اور اگر آپ یہ نہیں
کرسکتے ہیں تو قومی عروج اور قومی ترقی کے خواب دیکھنا چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ ایسے
لایعنی خوابوں کی تعبیر ہمیشہ دلشکن اور یاس انگیز ہوتی ہے۔

---

۳۰ مارچ کے "تہذیب نسواں" میں مکرمی جناب راشد الخیری صاحب
کے قلم کی چند سطور نظر سے گزریں جو اُن کی رسالہ "عصمت" سے نقل کی گئی تھیں۔

ہماری جس تحریر کا حوالہ ہمارے معزز ہمعصر نے دیا ہے اُس سے ہمارا منشاء "خواہ مخواہ کی لپیٹ نہ تھا" یہ اُس زمانہ کا ذکر تھا جب جناب شیخ محمد اکرام صاحب "عصمت" کے ایڈیٹر تھے۔ معزز ہمعصر کو "پیام امید" کے مضامین "ادق اور پیچیدہ" نظر آنے کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ ہم سائنس۔ فلسفہ۔ طب۔ انجینیری یا حکمت کے اصطلاحات کی بھرمار کرتے ہیں۔ نہ انگریزی۔ فارسی۔ عربی لغات کے گرانبار الفاظ سے رسالہ کی عبارت مشکل فہم بنانے کی کوئی کوشش کرتے ہیں۔ رسالہ کی عبارت ہمیشہ صاف سلیس اور سادہ ہوتی ہے۔ اور یہی رائے رسالہ کے معزز ناظرین کی ہے۔ بیشک جس زمانہ میں تعلیم نسواں کا آغاز ہوا تھا ویسے ہی مضامین کی ضرورت تھی جیسے مضامین بعض زنانہ اخبارات اور رسالوں میں ابتک نکل رہے ہیں۔ مگر یہ رائے قائم کرلینا کہ دنیا کبھی ترقی نہ کرے گی اور ہمیشہ اُس ابتدائی حالت ہی پر قائم رہجائے گی اگر صحیح ہوتا تو یہ بھی صحیح ہوسکتا تھا کہ ہندوستان کی مسلمان خواتین کبھی ترقی نہ کریں گی اور اُس ابتدائی نقطہ پر ہمیشہ قائم رہے گی جس نقطہ پر کہ وہ پہلے تھیں۔ ہر شخص جس نے دُنیا کی حالت پر تھوڑا سا غور کیا ہے دیکھ سکتا ہے کہ جو لڑکی آج الف بے شروع کرتی ہے وہ اب سی تین برس بعد اُردو اور معمولی فارسی کی استعداد ضرور پیدا کرلیتی ہے۔ پھر اور دو برس کے مزید مطالعہ سے اُس کے معلومات میں وسعت آجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اُس کا مطالعہ بھی ویسا ہی عمیق ہوتا جاتا ہے جیسے اُس کی علمی معلومات بڑھتی جاتی ہیں۔ ہم نے مانا کہ اگر ایسی لڑکیوں کے مطالعہ کے لئے جو محض برس ہی ڈیڑھ برس سے کچھ شُد بُد سیکھ رہی ہیں وہ پرانی قطع کے اخبار اور رسالے کارآمد ہوسکتے ہیں جنہیں

سو ایسی باتوں کے جن کو ہر بچہ بچہ جانتا ہو کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ جو پڑھنے والے کے دماغ اور قوائے ذہنی کے لئے کوئی مفید مشق بہم نہیں پہنچا سکتے۔ تو کیا وہی اخبار اور رسالے پڑھی لکھی بیویوں یا قریب فارغ التحصیل لڑکیوں کے لئے بھی کارآمد ہو سکیں گے؟۔ کیا ہم سے یہ کہا جائیگا کہ ایسی فارغ التحصیل لڑکیاں یا بیویاں ہم میں ہیں کہاں؟ جناب اگر ہیں نہیں تو یہ لیڈیز کانفرنس کون کر رہا ہے؟ کیا یہ وہی قواعد بغدادی پڑھنے والی لڑکیاں ہیں؟ جب یہ صورت ہے تو کیا یہ بات ضروری ہے کہ جو اخبار اور رسالے پاخانہ کے لوٹے کی صفائی پر مضمون لکھنے کی حد سے آگے بڑھیں اُن کے لئے صاف یہی کہہ دیا جائے کہ یہ تو مردانہ رسالے بن گئے؟۔ انصاف کرنا چاہیئے۔ پُرانے زمانے کے ہندو بھائیوں کا عقیدہ تھا کہ شودر ذات والے لوگ ساری عمر انسانی ترقی کے اسی ابتدائی نقطہ پر جمے رہیں گے جس پر وہ ابتدائے آفرینش میں جمے ہوئے پائے گئے تھے۔ کیا ہمارے معزز فرزندان قوم اور ہمدردان وطن کی ایسی ہی رائے ہمارے غریب طبقہ نسواں کے متعلق بھی ہے؟ کیا ایسی یک طرفہ غیر منصفانہ غیر فیاضانہ اور غیر ہمدردانہ رکھنا مظلوم فرقۂ اناث پر ایک شدید ظلم نہیں ہے؟ انصاف آپ ہی کے ہاتھ ہے۔

"پیام امید" روز اوّل ہی سے تربیت یافتہ اور روشن خیال طبقہ کا آلہ ہے بنایا گیا تھا جس میں جنس کی قید نہیں تھی۔ پچھلے پرچے ملاحظہ فرمالئے جائیں۔ وہ دونوں کے مفید مطلب مضامین ابتداء ہی سے شائع کر رہا ہے۔ اُسکے اصول عمل میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے۔ برابر اسی پُرانے اصول پر چلایا جا رہا ہے

ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس کے مضامین مستورات کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مثال کے طور پر ہم "خانہ آبادی" والے مضمون کا سلسلہ لیتے ہیں۔ جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ازبس کارآمد ہے۔ کیا کوئی بزرگ ہمیں براہ کرم بتادیں گے کہ اس سلسلہ مضامین میں ایک لفظ بھی ایسا ہے جو ہماری مستورات کی سمجھ سے بالاتر ہو؟ ہم بڑے ہی احسان مند ہوں اگر ہمیں بتا دیا جائے۔ یہ مضمون مردوں سے بدرجہا زیادہ مستورات کے لئے کارآمد ہے اور ابتدا سے آجتک جس حصہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے وہ بالخصوص مستورات ہی سے متعلق ہے۔ ہم بیحد مشکور ہوں گے اگر کوئی بزرگ ہمیں بتادیں گے کہ اس سے زیادہ مفید نسواں کون سا مضمون کس اردو رسالہ نے شائع کیا تھا اور کب شائع کیا تھا۔ بڑی مہربانی ہو اگر ہمیں پورا پتہ بتا دیا جائے۔ باقی مضامین کے متعلق مفصل حال ہمارے مارچ نمبر ۱۹۳۸ء میں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

ہمارے کرم محترم فخر قوم بزرگوار اور طبقہ نسواں کے سچے اور حقیقی دلی غمخوار "پیام" کے مضامین کو "ادق" بتلاتے ہیں اور اُن کی رائے مبارک میں یہ مضامین ہماری مستورات کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ایک طرف تو اُن کے یہ خیالات ہیں اور دوسری طرف ہم یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں کہ یہی "ادق" مضامین جو "مستورات کی سمجھ سے بالاتر" ہیں ایک بار نہیں کئی بار بعض زنانہ اخبارات نے خود نقل کر کے شائع کئے ہیں۔ اگر یہ مضامین "ادق" تھے اور مستورات انہیں سمجھ بھی نہیں سکتی تھیں تو ہم نہیں سمجھے کہ ایسے مضامین کی نقل شائع کرنے سے کیا مقصد تھا اور کیا سوچ کر ایسا کیا گیا تھا؟ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جن مضامین کو ہمارے کرم محترم اور فخر قوم بزرگ "ادق" اور طبقہ نسواں کی فہم ناقص سے بالاتر بتلاتے ہیں

بدقسمتی سے وہ مضامین ہمارے اپنے نہیں ہیں۔ وہ مشاہیر یورپ کی مسلمہ بہترین اور مفید نسواں کتابوں کے ترجمے ہیں۔ جو بالخصوص طبقہ نسواں ہی کی فلاح کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اور یہی بنا ہے جس پر ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ اس طبقہ کے مفید مطلب مضامین کب اور کس نے شائع کئے تھے؟ ہم اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ روپیہ صرف کرتے ہیں۔ یورپ کے بہترین دماغوں کا نتیجہ فکر اپنے خون جگر سے لکھ لکھ کے قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور ہمارا یہ دلشکن انعام ہے کہ یہ مضامین مستورات کے مفید مطلب نہیں۔ اور مستورات کے مفید مطلب کیا ہے؟ پاخانے کے لوٹے کی صفائی پر مضمون۔ "قدر دانی عالم بالا معلوم شد"

گر ہمیں مکتب وہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد بود

"شیعہ کالج نیوز" کی اشاعت مورخہ ۵ راپریل ۱۹۱۸ء میں "جوائنٹ سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس کے" عنوان کے تحت میں فقرہ ذیل نظر سے گذرا "یہ امید رکھنا فضول ہے کہ کوئی قابل شیعہ اس جگہ پر مقرر ہو سکیگا" ہمارے معزز بھائی کی شکایت بالکل بجا اور حق بجانب ہے۔ ہم نے مانا کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے انتخاب میں شیعہ و سنی کا سوال پیدا کیا ہی نہیں جاتا۔ یہ صحیح ہے۔ مگر ہمارے شیعہ بھائیوں کو ایک مدت سے ایسی شکایات ہیں۔ اور ایک حد تک ان کا یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ یہی شکایات ان کے ایک علیحدہ کالج قائم کرنے کی محرک ہوئیں۔ مگر کیا قوم یہ نظارہ دیکھنا پسند کریگی کہ شیعہ اور سنی قومیں رفتہ رفتہ مستقل جداگانہ مرکزوں پر منقسم ہو جائیں۔ ہم پہلے بھی اسکے متعلق ایک مضمون لکھ کر اس ضرورت کو اچھی طرح قوم کے ذہن نشین کر چکے ہیں اور

پھر عرض کرتے ہیں کہ ایسی شکایتیں نہ پیدا ہونے دیجائیں۔ شیعہ اور سنّی قوتوں کی علیحدگی کے ہمیشہ صرف ایک ہی معنی ہوں گے یعنی قومی شیرازہ کی پراگندگی۔ ہمارے نزدیک اس عظیم نقصان سے قوم کو بچانا ایک بڑے سے بڑی اور اہم سے اہم قومی خدمت ہے۔ اللہ ہماری آنکھیں کھول دے اور ہم دیکھ سکیں کہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے اور واقعی کیا ہونے کی ضرورت ہے۔

ہمارے محکمۂ احتساب میں جناب مولوی بشیر الدین صاحب خلف شمس العلماء جناب ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم کی کتاب "حسن معاشرت" کا معاملہ درپیش تھا۔ یہاں یہ بحث پیش کی گئی کہ یہ مقدمہ قانون ظرافت ہند کے احکام کے تابع ہے۔ اور اس قانون کے زیر اثر اس محکمہ کے اختیارات سماعت ساقط ہیں۔ اس بحث کی معقولیت تسلیم کر کے ہم نے اس معاملہ کی سماعت عدالت مجاز یعنی معزز ہمعصر ظریف الدولہ "اودھ پنچ" بہادر کے سپرد کر دی۔ "پنچ" بہادر کے اجلاس میں اس مقدمہ کی پہلی پیشی نمبر ۱۲ پر ۵ار اپریل ۱۹۱۴ء کو ہوئی تھی۔ جس کی باضابطہ رپورٹ "پنچ" میں موجود ہے۔ معزز مصنف صاحب اگر چاہیں تو بحیثیت مدعا علیہ اسی عدالت مجاز میں اپنے مقدمہ کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اب یہاں اس مقدمہ کی سماعت نہ ہو گی۔ آیندہ پیشیاں اسی اجلاس میں ہوں گی۔

ہم بارہا اس بات پر افسوس ظاہر کر چکے ہیں کہ جس طرح اور زندہ قوموں کی سچی ایثار کے جیتے جاگتے نمونے ہمارے پیش نظر ہیں ہماری قوم ایسے وہ ایک

نمونے بھی اب تک پیش نہ کرسکی بسٹر گوکہلے آ بھائی کی انجمن خدام ہند نے ملک میں
بہت سے خود فراموش افراد پیدا کر دیئے۔ مگر ہم ہندی مسلمانوں میں اب ایک
نمونہ بھی اب تک موجود نہ تھا۔ آنریبل جسٹس شاہ دین صاحب بالقابہ کے صاحبزادے
میاں بشیر احمد صاحب بی اے۔ بیرسٹرایٹ لا ہماری قوم کے سب سے پہلے
فرد فرید ہیں جنھوں نے اپنی خدمات بلامعاوضہ اسلامیہ کالج لاہور کے نذر کردی ہیں۔
ساری قوم کا فرض اولین ہے کہ انہیں سر آنکھوں پر جگہ دے۔ ہم نہ صرف اُنہیں یا
اُن کے سارے خاندان ہی کو بلکہ ساری قوم کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔
اور دُعا کرتے ہیں کہ اولیت کا سہرا ہمارے ہونہار بھائی کو سزاوار ہو اور یہ پہلا
نمونہ پیش خیمہ ثابت ہو بہت سے ایسے ہی قابل تقلید نمونوں کا جو ستاروں کی
طرح ہماری قومی ترقی کے آسمان پر چمکتے نظر آئیں۔ آمین۔

مسٹریز آف لنڈن

رینالڈس کے اس معرکہ آرا ناول کا ترجمہ (اُردو) آٹھ جلدوں میں قیمت
ساڑھے سات روپیہ معہ محصول ڈاک۔
تمدن، اخلاق اور اشتراکیت کا بعید میں موقع۔

پتہ

لال برادرس بے پارسنز روڈ نولکھا لاہور

مذہب اور سائنس

(سلسلہ کے لئے مارچ نمبر ۱۹۱۸ء ملاحظہ ہو)

چھوٹے چھوٹے واقعات کی اہمیت

خلقت کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہے۔ بلکہ خلاف معمولی طور پر بعید وسیع اور بعید اہم چیز ہے۔ اگر کوئی واقعہ دراصل سچا ہے تو وہ آدھا سچا اور آدھا جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ اور نہ وہ اس قسم کا واقعہ ہوسکتا ہے جو کبھی سچا ٹھہرتا ہو اور کبھی جھوٹا۔ ایک واقعہ اگر درحقیقت سچا ہے تو وہ ہر موقعہ اور ہر حالت میں سچا ہی رہیگا۔ ہماری تحقیقات میں اگر ہمیں کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی سلے جو درحقیقت سچا ہو تو وہ حد سے زیادہ اہم ہے۔ مجھے بارہا اس امر پر غور کرنے کا اتفاق پڑ چکا ہے کہ پارلیامنٹ کے قوانین میں محض چند ہی الفاظ کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ محض اسی بات کی بنا پر کہ کسی خاص قانون کے اندر کوئی خاص لفظ قائم رکھا جائے یا نکال دیا جائے پارلیامنٹ کے معزز ممبر کتنا وقت اس بحث میں صرف کردیتے ہیں اور مباحثہ کے وقت فریقین میں کتنا جوش پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ زیر بحث لفظ قائم رہجاتا ہے تو کوئی خاص پیشہ کوئی خاص حرفہ یک زبان ہوکر چلا اٹھتا ہے کہ "اگر یہ لفظ قائم رہگیا تو ہم مرے"!

قوانین پارلیامنٹ سے ایسے ایسے اہم نتائج مترتب ہوتے ہیں جن کا بیشتر سے ہمیں علم نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر قانون "پنشن عالم ضعیفی" یا اور ایسے ہی قوانین پر غور فرمائیے جن کے رائج ہونے سے بعض آدمیوں کی زندگی میں کیسی کیسی

اہم تبدیلیاں واقع ہوگئیں! چھوٹی چھوٹی باتوں کے انجام بڑے اور اہم ہوتے ہیں۔ رہیں بڑی بڑی باتیں تو ان سے بعض ایسی بڑی ہیں کہ بعض وقت وہ ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتیں۔ ان کی شان وشوکت ہم اپنے پیش نظر رکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر وہ باتیں ہمیں اچھی طرح صاف صاف نظر آنا شروع ہوجائیں تو وہ ہمیں مغلوب کردیں۔ وہ ہمیں اندھا بنادیں۔ اور ہمیں اس قابل باقی نہ چھوڑیں کہ ہم اپنے روزانہ کاروبار کو انجام دے سکیں۔ دنیا ہمارا میدان عمل ہے اور ہم یہاں عملی خدمات انجام دینے کے لئے آتے ہیں۔ ہمارے حال پر رحم کرکے ہم کسی قدر اندھے بنا دیئے گئے ہیں۔ موجودات کا پرشوکت نظارہ اُس کی ہیئت اصلی میں ہم نہیں دیکھ سکتے اس وجہ سے کہ ہمارے اور اس کے درمیان میں ایک حجاب حائل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اپنے روزمرہ کے کاروبار زندگی میں مصروف نہیں رہ سکتے تھے۔ ہمارے گھروں کا نظام درست نہیں رہ سکتا تھا۔ گاڑھی مشقت کرکے فکر معاش میں ہم مصروف نہیں رہ سکتے تھے۔ مگر ان باتوں کی نظر بحالات موجودہ ہمیں ضرورت تھی کیونکہ انہیں کی بحالی پر ہمارا دنیاوی زندگی کے مقاصد میں انجام عمل کا مدار تھا۔

(باقی آئندہ)

مترجم

ڈاکٹر اسمائیلس کیریکٹر

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

جوہر دنیا میں کوئی نایاب شے نہیں ہے۔ اور نہ فوق العادت ذہانت ہی۔ مگر کیا جوہر بھروسہ کے قابل ہے؟ یا فوق العادت ذہانت ہی؟ دونوں قابل اعتماد نہیں ہیں تاوقتیکہ اُن کی بناء راست بازی پر۔ صداقت پر نہ ہو۔ یہی ایک شے ہے جس کی ہر اور شے سے زیادہ قدر و منزلت کیجاتی ہے اور جس پر دوسرے اعتماد رکھتے ہیں۔ راست بازی ذاتی خوبیوں کی بنا ہے۔ یہ انسان کے اعمال سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے معنی راست روی اور صداقت بالعمل ہیں اور اس کی جھلک انسان کے ہر قول و فعل سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا مقصد دیانت داری ہے۔ اور دوسروں کو اطمینان دلاتی ہے کہ یہ قابل اعتماد ہے۔ اور جب یہ بات معلوم ہو جاتے کہ یہ آدمی قابل اعتبار ہے تو وہ دنیا کے بڑے کام کا ہے۔ ایسا شخص جب کہتا ہے کہ میں اس بات کو جانتا ہوں تو وہ ضرور اسے جانتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ میں یہ کام کروں گا تو ضرور وہ کام کر سکتا ہے اور کرکے دکھا دیتا ہے۔ اس طریق پر اس شخص کی دیانت داری ایک پروانہ راہداری بنجاتی ہے اور دنیا اس کی عزت اور اسپر بھروسہ کرنے لگتی ہے۔

دنیاوی یا کاروباری زندگی میں ذہانت اتنی کارآمد نہیں ہے جتنا کیریکٹر[۱] ہے

---

[۱] لفظ کیریکٹر کے متعلق جون نمبر ۱۹۲۸ء کا صفحہ ۱۲ ملاحظہ طلب ہے۔ اس لفظ کا مفہوم اتنا وسیع اور اتنے معانی پر حاوی ہے کہ خود مصنف کو اسکی تاویل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عاجز کو اردو زبان میں کوئی لفظ اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے میسر نہیں آیا۔ (مترجم)

دماغ کا اتنا زیادہ کام نہیں ہے جتنا دل کا ہے۔ فوق العادت ذہانت اتنی مفید نہیں ثابت ہو سکتی جتنا تحمل۔ صبر اور انضباط۔ جو اجتہاد کے توسل سے کام میں لائے جا سکیں یہی وجہ ہے اپنی ذاتی کاروباری زندگی میں ہو یا قومی اور ملکی خدمت میں دونوں صورتوں میں اوسط درجہ کی فہم و فراست درکار ہے جس کی اصلاح کے لئے راست بازی اور راست روی اس کی شریک حال ہو۔ فہم و فراست جو تجربہ سے راہ راست پر لائی گئی ہو اور جس کی سرشت نیکی ہو انہیں قوتوں کے باقاعدہ انضباط کا نام دانشمندی بالعمل ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ نیکی ایک حد تک دانشمندی کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ یہی اعلےٰ درجہ کی دانشمندی ہے یا دوسرے الفاظ میں دنیاوی اور دینی خوبیوں کا اتحاد۔ سر ہنری ٹیلر کا قول ہے کہ "دانشمندی اور نیکی کا باہمی تعلق نہایت ہی گہرا ہے" اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ساتھ ہی ساتھ چلتی ہیں۔ انسان اپنی دانشمندی سے نیک نہیں بن جاتا بلکہ اس کی نیکی اسے دانشمند بنا دیتی ہے۔ (باقی آئندہ)

مترجم

خانہ آبادی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

ایک ہی موقع اور محل ہے جو ہمیں اپنے وابستگان زندگی کے ساتھ اظہار ہمدردی کی کمی بری طرح یاد دلاتا ہے۔ اور اگر ہم نے اس فرض میں کمی کی ہے اور

خلوص اور محبت سے پیش نہیں آتے ہیں تو اس صدمہ کا داغ حسرت ہمیشہ کے لئے ہمارے کلیجہ پر پڑ جاتا ہے۔ رسکن کا قول ہے کہ " وہ شخص جس نے کسی حسرت نصیب متوفی عزیز کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر وہ زمانہ یاد کیا ہو جبکہ متوفی بقید حیات تھا۔ اسی کے دل سے پوچھنا چاہئے کہ اس زمانۂ ماضیہ کی سرد مہریوں کی تلافی کا اسوقت کون سا ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے جس کے اختیار کرنے سے اس کا لبد خاکی سے جدا شدہ روح کو کوئی سکون۔ کوئی طمانیت پہونچ سکے "۔ مگر افسوس! اس حقیقت کا احساس پیدا کرنے میں ہم کس درجہ کاہل ہیں!۔

زوجۂ متوفی کی قبر پر پھول چڑھانا بے سود ہے اگر اس کے عالم حیات میں اسکی راہ میں پھول بچھانا ہم سے نہ ہو سکا جس حال میں کہ انسانی زندگی کی گرانبار ذمہ داریوں سے شل ہو کر وہ میدان حیات میں افتاں و خیزاں چل رہی تھی۔ آج ہر کان میں اسکی مدح و ثنا کی صدا اٹھانا عبث ہے۔ اس کی خوبیوں۔ اس کی نیکیوں کی مدح سرائی لاحاصل ہے اگر اس کی زندگی کی حالت میں ہم نے اس کے اوصاف حمیدہ کی داد دے کر اس کا دل کبھی نہیں بڑھایا۔ اس کی کسی قابل قدر خدمت یا خوبی کے اعتراف میں کوئی محبت آمیز شکریہ نہیں ادا کیا جس سے وہ معلوم کر سکتی کہ ہمارے دل میں اس کی کتنی وقعت یا اس کی خوبیوں کی کتنی منزلت ہے۔

محبت اور اخلاص کے اظہار کا تب ہی موقع ہے جب اس کی ضرورت ہو۔ اگر ایسے موقعہ پر ہم سے کچھ نہ ہو سکا تو اس فرض کے ادا کرنے کا وقت گیا اور ہمیشہ کے لئے گیا۔ فکر۔ رنج۔ مصیبت یا افکار کی تاریک گھڑیاں جن کا محبت کی تجلی پا کر جگمگا اٹھنا ممکن تھا وہ تو گذر گئیں۔ اس غفلت کی آج تلافی کیونکر ممکن ہے۔ گیا

وقت پھر واپس آ نہیں سکتا۔ آج محبت کا جوش و خروش دکھانا "عید کے پیچھے ٹر" یا "مشتے کہ بعد از جنگ" کا مضمون ہے۔

شوہر کی محبت کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کی عزت کرے۔ میاں بیوی کا رشتہ سارے دنیا دی رشتوں میں قریب ترین اور مقدس ترین ہے۔ شوہر نے اپنی زندگی بیوی کی زندگی کے ساتھ وابستہ کر لی ہے۔ اور آج سے پہلے جو بات صرف ایک ہی پر اثر ڈال سکتی تھی اب آج سے دونوں پر یکساں اثر ڈالے گی۔ دونوں میں اگر ایک کو عزت نصیب ہو تو دوسرے کے اعزاز میں ترقی ہوگی۔ اگر ایک کی بے عزتی ہو تو دوسرے کی بھی اسی کے ساتھ ہی ذلت ہوگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شوہر کو اپنے شریک عزت و ذلت کی اتنی ہی عزت کرنا چاہیے جتنی عزت کا وہ خود اپنے کو مستحق سمجھتا ہے۔

اس عزت کے اظہار کے بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً اس کی ضروریات زندگی کے لئے اپنی حیثیت کے موافق فیاضی سیر چشمی اور فراخ حوصلگی سے سامان مہیا کرنا۔ اپنی زندگی کے مقاصد میں اس کو شریک حال بنانا۔ اپنے کاروبار میں اس کو شریک مشورہ کرنا۔ اپنے منصوبوں میں اس سے رائے لینا۔ اور کاروباری زندگی کے ہر ہر مرحلہ میں اُسے رازدار بنانا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جاننا چاہئے کہ ایک خلوص شعار بیوی بالکل بچہ ہی نہیں ہوتی۔ کاروباری زندگی کی پیچیدگیاں سمجھنے کے لئے چاہے اس میں ہماری برابر عقل نہ ہو مگر پھر بھی وہ بہت سی ایسی تدبیریں بتا سکتی ہے جو بیش قیمت ثابت ہو سکتی ہیں۔ عورت کی فطری زود فہمی اکثر پہلی ہی نظر میں اس نقطہ تک پہنچ جاتی ہیں جہاں مرد کی سست منطق

کو پہونچنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ بہت سے مرد اپنی کامیابی کے معتد بہ حصہ کے لئے اپنی بیوی کی نیک مشورت کے ممنون احسان ہیں۔ بہت سے مرد ایسے بھی ہیں جنھیں بہت ہی زیادہ کامیابی ہوئی ہوتی یا جنھیں ناکامی کی صورت دیکھنا نہ پڑتی اگر انھوں نے اپنی بیوی سے مشورت کر لی ہوتی یا اس کے مشورہ پر عمل کیا ہوتا۔

اگر بیوی میں اتنی صلاحیت موجود نہیں ہے کہ کاروباری زندگی کی تدابیر کے متعلق کوئی اہم یا قابل قدر مشورہ دے سکے۔ لیکن پھر بھی وہ شوہر سے سچی محبت رکھنے والی۔ اس کی دلی بہی خواہ اور سچی خیر اندیش ہے اور ہر ہر کام کی کامیابی یا ناکامی میں اس کا بھی حصہ ہے۔ شوہر کے اُسے اپنے کاموں میں شریک مشورت کر لینے سے اس کا دل بڑھتا ہے اور اُسے روحی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ کاروباری افکار کی کشمکش میں اُسے شریک حال بنا لینے سے اس کے دل کو تقویت پہونچتی ہے۔ اس کا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتی ہے کہ شوہر سے تقرب واختصاص میں اس کا پایہ روز بروز بلند ہوتا جاتا ہے۔ اس حق الیقین کا نہایت ہی عمدہ اثر خود بیوی پر اور اس کے بچوں اور نوکروں پر پڑتا ہے۔ اور میاں بیوی کی محبت تکمیل اتحاد کے نقطہ سے روز بروز قریب تر پہنچتی جاتی ہے۔ شوہر کے دل کو تقویت پہونچتی ہے اور اس کا دل سرگرمی اور مشقت کے ساتھ اپنے کام کی جانب رجوع ہوتا ہے۔ اور اس مشقت اور سرگرمی کا سرچشمہ بیوی کی محبت آمیز ترغیب اور خلوص آمیز ہمدردی ثابت ہوتی ہے۔ اس محبت آمیز تحریص کی گرم غذا پا کر شوہر کے دماغ سے افکار کا تکان دور ہو جاتا

ہے اور وہ تازہ دم ہو کر نئے جوش و خروش سے پھر مشقت میں مصروف ہو جاتا ہے
انہیں وجوہ سے چاہے سارے دن کی مشقت کا انجام شکست پر ہوا ہو یا فتح پر۔
ناکامی پر یا کامیابی پر مگر شوہر کو چاہئے کہ شام کو گھر آ کر سارا واقعہ بیوی سے ضرور
بیان کر دے۔ اگر سارے دن کی مشقت کا انجام کامیابی پر ہوا ہے تو بیوی کو اسکی
خوشی میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر ناکامی پر ہوا ہے تو وہ ایک مخلص بیوی
ہے۔ وہ شوہر کے افکار کا بوجھ ہلکا کرے گی اور تسکین بخش الفاظ سے اپنے شوہر
کا دل بڑھائے گی۔ بیوی کو اپنی کاروباری زندگی کے افکار سے علیحدہ رکھ کر شوہر
نہ صرف اپنی بیوی ہی کی عزت کرنے میں کمی کرتا ہے بلکہ اسی کے ساتھ
ہی وہ اپنے آپ کو اس محبت آمیز غمخواری۔ تسکین بخش دردمندی اور
ترغیب و تحریص سے محروم رکھتا ہے جو سوا بیوی کی ذات کے اُسے کسی اور
سے کبھی کسی طرح۔ کسی حال میں نصیب ہو ہی نہیں سکتی۔ (باقی آئندہ)

مترجم

آتش و غالب

مرزا یاس نے رسالہ خیال بابت ماہ نومبر ۱۹۱۵ء میں آتش و غالب کی
شاعری پر ایک قول فیصل شائع کیا تھا اور اس کے قبل رسالہ چراغ سخن میں
بھی اس مبحث پر کچھ لکھا تھا۔ ان تحریروں کا اثر جو ہونا چاہئے تھا وہ ہوا۔ انصاف
پسند اور صحیح المذاق طبیعتوں نے سبق لیا مگر مخالفین کے دلوں میں پنکھے لگ گئے

اور غالب کی مغلوبیت کا اندازہ کر کے نہایت چراغ پا ہوئے۔ صلائے عام۔ تمدّا شعلہ۔ مخزن اور خیال میں بزعم خود مرزا یاس کی تحریر کا جواب بے سر و پا لکھ کر داغ خوش کر لیا۔ عوام کے فریب دینے کے لئے تو یہ کہدینا کافی ہوا کہ مرزا کی ایک تحریر کے جواب میں متعدد مضامین نکلے مگر اہل فن پر ان ہفوات کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ یاس صاحب کے جواب میں جو قلم فرسائی کی گئی وہ اہل فن کے نزدیک کوئی وقعت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ اِن ہفوات کو دیکھ کر اہل فن کو یہی کہنا پڑ کہ ہر کہ تنگ آید بجنگ آید۔ مرزا یاس کے مخالفین نے بجائے اس کے کہ اعتراض کا جواب معقول دیتے سخت کلامیوں سے دل کا بخار نکالا۔ بجائے اس کے کہ حضرت غالب کے دامن شاعری سے مضامین مضحک کا دھبا مٹاتے المعنی فی بطن الشاعر کے عیب کو تسلیم کرتے انہیں اشعار مضحک میں معنی پہنانے کی کوششیں کیں مگر اس پر بھی وہ اشعار مضحک ہی رہے اور مرزا یاس کا یہ فقرہ دہوئے نہ مٹا کہ جتنا چھانو اُتنا ہی کر کرا۔ سلامتی سے جن لوگوں نے مرزا یاس کی تحریر پر قلم فرسائی کی وہ ایسے ہیں جن کا وجود دُنیائے شاعری میں صفر محض ہے۔ یہ مضامین لایعنی لکھکر مخالفین یاس نے غالبًا یہ خیال کیا ہوگا کہ چلو اچھا تو ہے تھوڑے دنوں یاس سے چخ پخ رہے گی اخباروں کے کالم سیاہ ہوں گے فرصت آجائیں گے مگر مرزا یاس کو کیا ضرورت تھی کہ ہر کس و ناکس سے اُلجھتے یا جواب الجواب لکھتے۔ مرزا یاس کی تحریر اپنی جگہ مکمل تھی زیادہ توضیح و تشریح بحث و مباحثہ کی محتاج نہ تھی جو کچھ کہنا تھا وہ کہ گذری مانو نہ مانو تم جانو۔ واضح ہو کہ کوئی شخص شاعری کے معاملہ میں مرزا یاس کو اپنے مرکز خیال سے ہٹا نہیں سکتا۔ کیونکہ مرزا یاس

مولینا شاد عظیم آبادی سے تعلیم پائی ہے۔ غالب کی شاعری پر برسوں کی غور وفکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر لکھا ہے جو کچھ لکھدیا ہے پتھر کی لکیر ہے۔ غالب کی شاعری پر مرزا یاسؔ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ شخص واحد کے خیالات نہیں ہیں بلکہ اکثر اہل فن ان کے ہمخیال ہیں۔ مرزا یاس کی شاعری کو جن لوگوں نے نظر تعمق سے ملاحظہ کیا ہے وہ ہرگز اس امر کا یقین نہیں کرسکتے کہ یاس سا شخص غالب ایسے اُستاد کا مخالف ہو۔ یاس کی شاعری پر نظر رکھ کر یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ وہ غالب کی شاعری کے ہمہ تن منکر ہوں۔ جناب والا۔ اس کی تہ میں کچھ اور باتیں ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ غالب مغفور کے مقلدین جوشِ عقیدت میں حد سے تجاوز کرکے غالب کو غالب علے کُلِ غالب کہنے لگے۔ مرزا یاس نے اس غلو کو بیجا ثابت کرکے متنبہ کردیا۔ اور مقتضائے وقت بھی یہی تھا کیونکہ غالب کی اندھی تقلید میں لوگ گمراہ ہو چلے تھے۔ مرزا یاس نے اپنے کلام میں آتش کی عارفانہ فلسفیانہ اور اخلاقی شاعری کے نمونے پیش کرکے دکھادیا کہ غزل اسے کہتے ہیں۔ آتش کا فطری مذاق عارفانہ ہے اور یہی مذاق اہلِ عجم کا ہے۔ مرزا یاس نے آتش کے اسی رنگ خاص کی تقلید کی۔ آتش کے ان اشعار پر ہرگز توجہ نہیں کی جو ناسخ کے رنگ میں مجبوراً کہے گئے ہیں۔ اسی طرح مرزا یاس نے غالب کے فلسفیانہ خیالات کی مخالفت کبھی نہیں کی ہاں انکی پیچیدہ ترکیبوں اور بعض دور از کار نازک خیالیوں سے نفرت ظاہر کی مرزا یاس نے اپنی تحریروں میں اگر غالب پر نکتہ چینی کی ہے تو مدح سرائی میں بھی کمی نہیں کی ہے مگر مقلدین غالب محض نکتہ چینی کا اثر لیکر یاس کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے

مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یاس نے غالب پر نکتہ چینی کی ہے تو داد انصاف بھی دی ہے چنانچہ خود لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ غالب کے ہاں تھوڑے سے اشعار ایسے بھی ہیں جن پر اردو کی شاعری جتنا ناز کرے بجا ہے۔ یہ وہی اشعار ہیں جن میں قوت متخیلہ اور قوتِ ممیزہ کی حکومت ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے" کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ مرزا یاس غالب کی شاعری کے ہمہ تن مخالف ہیں ہرگز نہیں۔ افسوس ہے کہ مقلدینِ غالب اس کا کچھ اثر نہیں لیتے اور محض نکتہ چینی پر خفا ہیں۔ یہ کون سا انصاف ہے۔ حق یہ ہے کہ مرزا یاس نے جہاں غالب پر نکتہ چینی کی ہے وہ بھی اہل فن کے نزدیک حق بجانب ہے مرزا یاس نے غالب کی معرکۃ الآرا غزلوں پر یا چیدہ و منتخب اشعار پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی برخلاف اس کے مخالفین نے جوشِ حسد میں آتش کے اُن اشعار پر اعتراضات لایعنی وارد کیے جو اردو زبان کے لئے کارنامہ ہیں۔ غالب مغفور کی اُستادی سے مرزا یاس کو انکار رہے نہ ہوگا مگر عوام الناس کوتاہ نظر کی طرح غالب کو علی کل غالب کہدینا مرزا یاس سے قطعاً ناممکن ہے۔ غالب علی کل غالب اگر کہا جا سکتا ہے تو بس ایک شخص یعنی خدائے سخن میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ۔ یہ ایک ایسا شخص گذرا ہے جس کی قوتِ تخیل اور حیرت انگیز اندازِ بیان کی مثال ذہن میں نہیں آتی۔ مرزا یاس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ غالب و آتش کی شاعری کا موازنہ کرنا عین بدمذاقی کی دلیل ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ معترضین نے ذرا بھی اس بات پر غور نہ کی کیا مرزا یاس اتنا بھی نہیں جانتے کہ آتش و غالب کے رنگ میں نمایاں فرق ہے۔ جانتے ہیں اور ضرور جانتے ہیں کہ ہر شاعر کا رنگ جُدا گانہ ہوتا ہے مگر

ذرا سوچیئے تو سہی کہ موازنہ کیا گیا ہے تو کس اعتبار سے؟ موازنہ اس اعتبار سے کیا گیا ہے کہ میر و آتش جو کچھ کہتے ہیں اس کا انداز اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہوتا ہے کہ ذہن سامع کو تکلیف نہیں ہوتی بلکہ انبساط حاصل ہوتا ہے۔ بلند سے بلند اور پست سے پست خیالات کو یہ بزرگوار اپنے زمانے کی مروجہ زبان میں ادا کرنے پر قادر تھے برخلاف اس کے غالب میں یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ خواہ مخواہ بھی انداز بیان میں الجھن پیدا کرکے زبان کی مٹی خراب کرتے ہیں اسی وجہ سے مرزا یاس نے غالب کی زبان کو دیوزاد کی زبان سے تعبیر کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آتش و غالب کی شاعری کا موازنہ انداز بیان کی صفائی اور قادر الکلامی کے اعتبار سے کیا گیا ہے نہ بہ اعتبار تخیل۔ اس زمانے میں مولینا شاد عظیم آبادی۔ مولانا اکبر الہ آبادی اور مولانا نظم طباطبائی کے مقابلہ میں شاعری کے متعلق اور کسی کی رائے زیادہ مستند نہیں مانی جا سکتی۔ کوئی ان لوگوں سے آتش و غالب کی شاعری کا فرق مراتب دریافت کرے مگر شرط یہ ہے کہ ان حضرات کے دل چیر کر دیکھیے کیونکہ یہ حضرات بھی اس معاملہ میں اگر اپنی صحیح رائے کا اظہار کریں تو ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو مرزا یاس کے ساتھ ہوا۔ خواجہ آتش کی شاعری پر کسی نکتہ رس نے کیا خوب کہا ہے کہ دیوان آتش عاشق و عارف کے مطالعہ کے قابل ہے یعنی آتش کی شاعری کا سرچشمہ دل ہے۔ دماغی قوت اور علم و فضل کے زور سے کوئی شخص آتش کے رنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی نکتہ رس کا قول ہے کہ غالب کا دیوان بس اس قابل ہے کہ اسکول کے طلبا اس کے مطالعہ سے چیستان فہمی کی قوت بڑھائیں۔ پھر کہتا ہے کہ اہل علم اپنی دماغی قوتوں کی بدولت غالب کی شاعری کا

تتبع کر سکتے ہیں مگر آتش کی شاعری پر علم وفضل کے زور سے قابو نہیں پا سکتے - میرے خیال میں اس سے بہتر فیصلہ نہیں ہو سکتا - آئیے - آتش و غالب کی ایک غزل کا موازنہ کریں پھر اور کچھ باتیں ہوں گی ؎

آتش

بہارِ لالہ وگُل سے لگی ہے آگ گلشن میں
گریباں پھاڑ کے چل بیٹھئے صحرا کے دامن میں

خواجہ آتش علیہ الرحمتہ نے اس قیامت خیز مطلع میں جو وحشت انگیز سماں دکھایا ہے - وہ بیان سے باہر ہے - اس مطلع کو سُن کر دل کو جو وجدانی کیفیت حاصل ہوتی ہے اُس کی شرح اگر کی جائے تو ہرگز وہ لطف حاصل نہیں ہو سکتا جو فی نفسہٖ شعر کے سننے اور پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے - شعر کی ایک تعریف یہ بھی کہ ع

دانستنی است و گفتنی نیست

شعر وہی ہے جس کی لذت بیان نہ ہو سکے - اسی وجہ سے میرزا آتش کی شاعری کبھی محتاجِ شرح نہ ہوئی - برخلاف اس کے غالب کے اشعار اکثر جگہ تاویل کے محتاج ہیں - جب تک شرح نہ کی جائے تاویلاتِ باردہ سے کام نہ لیا جائے شعر کے معنی تک سمجھ میں نہیں آتے لذت تو کجا - میرزا آتش کے اشعار کی اگر شرح کی جائے تو کلام کا سارا مزہ خاک میں مل جاتا ہے

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شعر وہی ہے جو اپنے محاسن آپ بیان کرے نہ یہ کہ شرح کا محتاج ہو - مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید - غالب کے دیوان کی اکثر شرحیں لکھی گئی ہیں بعض لوگ اسے غالب کے کمال پر محمول فرماتے ہیں حالانکہ یہی بات دلیل

نقص ہے۔ کلام کی شرح وہاں بکار آمد ثابت ہوتی ہے جہاں کوئی قصہ طلب بات یا کوئی علمی مسئلہ شاعرانہ انداز سے نظم کیا گیا ہو۔ اور اگر شرح کے بعد بھی کوئی معقول نتیجہ نہ نکلا۔ کسی علمی مسئلہ کا انکشاف نہ ہوا محض معمولی اور پیش پا افتادہ بات نظر آئی۔ کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثل صادق آئی تو یہی کہا جائیگا کہ شعر میں کچھ نہ تھا معمولی بات کو حد سے زیادہ پیچ دے کر نظم کرنا (اس طریقہ پر کہ نہ معنی وبیان کی کوئی خوبی پیدا ہو نہ شعر کی لذت میں اضافہ ہو) کوئی کام کی بات نہیں ہے۔ ہاں مسائل علمیہ یا معانی بیگانہ کو قلمبند کرنے میں شعر اگر دقیق ہو جائے اور شرح کا محتاج ٹھہرے تو ایسی حالت میں کوئی عیب کی بات نہیں ہے سعدی۔ حافظ اور حکیم شفائی بھی غزل گو ہیں۔ نظیری ظہوری بھی غزل گو ہیں۔ مگر اول الذکر حضرات کی غزلیں جیسی پرنمک ہیں وہ بات نظیری وظہوری کو کہاں نصیب۔ سعدی وحافظ وشفائی کا کلام اپنے محاسن آپ بیان کرتا ہے۔ اور ظہوری ونظیری کا کلام محتاج شرح ٹھہرا۔ مرزا یاس نے مرزا صائب کی کیا روشن مثال پیش کی ہے کہ اگر مضامین بلند وخیالات عرش پیما کو قید نظم میں لانا چاہو تو ملا صائب کے دیوان سے سبق لو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اہل عجم نے ملا صائب کو بالاتفاق قافلہ سالار اہل معانی تسلیم کیا ہے جس کی بلندی تخیل کی کوئی حد نہیں مگر اس تخیل عرش پیما کے ساتھ انداز بیان میں، وہ جدت وہ صفائی دکھائی ہے۔ کہ سبحان اللہ۔ ملا صائب رموز فطرت کا اتنا بڑا ماہر ہے اور واقعات عالم کا ایسا وسیع تجربہ رکھتا ہے کہ محض پیش پا افتادہ باتوں سے حیرت انگیز نتیجے نکال لیتا ہے اور سننے والوں کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی بھولی ہوئی

بات یاد آگئی دیکھیے علامہ آزاد بلگرامی سا شخص ملا صائب کے باب میں کیا لکھتا ہے۔

صائب - مرزا محمد علی اصفہانی امیر الامراء کلام است و افرازندۂ رایات عالیات اقلام - امام ائمہ معانی و مجتہد علماء سخندانی - اگر او را ربع رسل ثلاثہ شعرا گویند بجاست (از خزانۂ عامرہ) پھر فرماتے ہیں۔

صائب - مرزا محمد علی اصفہانی - امام غزل طرازاں و علامہ سخن پردازان است ازاں صبحے کہ آفتاب سخن در عالم شہود پرتو افشاندہ معنی آفرینی بایں اقتدار سپہر دوار ہم رساندہ حامل لوائے فصاحت - منشاء اعلاء کلمۂ بلاغت نور نجابت از ناصیہ کلامش پیدا و لمعۂ شرافت از سیمائے بیانش ہویدا - فوج فوج مضامین برجستہ منقاد جنابش خیل خیل معانی بیگانہ بندۂ حاضر جوابش ذوق سلیم در حدیقۂ اشعارش بنوبر کردن سرور - ذہن صحیح در خزینۂ افکارش بدولت تازہ اندوختن مغرور - فکر بیرنگش موجد عبارات رنگین - حبل لسیطش مخترع تراکیب دلنشین - زلال تقریرش در کمال روانی لالی تعبیرش در نہایت غلطانی - باے دقت خیال باوج کمال سائید و معہذا اصلا اثر تکلف گرد کلامش نہ گردیدہ و ایں کیفیت در کلام فصحاء دیگر کمتر تواں یافت (از سرو آزاد)

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ مرزا صائب نے باوجود اس دقت پسندی و معنی آفرینی کے اپنے کلام کو اثر تکلف سے اتنا پاک و صاف رکھا جیسا چاہیئے - کمال شاعری یہی ہے کہ خیالات دقیق و معانی بیگانہ بے تکلفی سے ادا ہو جائیں - انداز بیان میں اگر تکلف پیدا ہو گیا تو شاعر کا عجز ثابت ہوتا ہے - غالب مغفور چونکہ خیالات دقیق کو بے تکلفی سے نظم کرنے پر کافی قدرت نہیں رکھتے تھے اسیوجہ سے ان کے کلام میں

یہ اُلجھنیں پائی جاتی ہیں جو قادر الکلام کی شان کی منافی ہیں۔ یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے اور غور کرنے کے قابل ہے کہ میرؔ و آتشؔ اور جمیع شعرائے فصاحت شعار کی دقت پسندیوں کی طرف لوگوں نے اچھی طرح غور نہیں کی یہ لوگ بھی حد درجہ دقت پسند تھے مگر بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی دقت پسندیوں کا راز ذہنِ سامع پر کھلنے ہی نہ دیا اس کے اثر کو اپنے دل و دماغ تک محدود رکھا۔ اُس کی بدولت ایک ایک مصرع لگانے میں نہ معلوم کہ قدر خونِ جگر کھپایا۔ اس کا اندازہ کچھ انھیں لوگوں کو ہو سکتا تھا یا وہ لوگ جانتے ہیں جو اس دقت پسندی کے راز سے واقف ہیں۔ سامع کو اس کا پورا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سامع کے آگے جب کوئی شعر پیش کیا گیا وہ ہر پہلو سے ایسا سڈول نکلا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی حالانکہ یہ صفائی روانی بڑی جانکاہی سے پیدا ہوتی ہے جو لوگ سہل الممتنع کی خوبیوں سے واقف ہیں وہ ان دقتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں برخلاف اس کے غالبؔ مغفور کی دقت پسندیوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لئے وہ الفاظ ہی نہیں لا سکتے جن سے اُن کی دقت پسندیوں کا راز مخفی رہ سکے۔ میرؔ و آتشؔ کی دقت پسندیوں کا راز سامع کے ذہن پر کھلنے ہی نہیں پاتا اور مرزا غالبؔ کی دقت پسندی، سامع پر فقط ظاہر ہی نہیں ہو جاتی بلکہ عجزِ طبیعت کو صاف ظاہر کر دیتی ہے۔"

مرزا یاسؔ نے مرزا غالبؔ اور میرؔ و آتشؔ کی مشکل پسندیوں کا فرق مختصر لفظوں میں جو بیان کیا اور ملا صائبؔ کی دقت پسندی و قادر الکلامی کی طرف جو اشارہ کیا ہے آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور درحقیقت یہ مبحث ایک جداگانہ مضمون کا محتاج ہے کہ شرح و بسط کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی جائے مگر افسوس

ہے کہ اس مقام پر اس کی گنجائش نہیں عاقل کے لئے اشارہ کافی ہے۔ اہل نظر آتش کے مصرع لگانے کے انداز پر غور کریں گے تو اس وقت پسندی کا راز سمجھ میں آجائے گا۔

مرزا یاسؔ چراغِ سخن میں تحریر فرماتے ہیں کہ "جذبات وتخیلات کا تلاطم تو انسان کے دل ودماغ پر اتنا ہوتا ہے کہ دیوانہ بنا دیتا ہے انسان آپ سے باہر ہو جاتا ہے مگر تمام جذبات وتخیلات کو عالم شہود میں لانا اپنے قابو کی بات نہیں ہے۔ لاکھوں جذبات کروڑوں تخیلات جن کے لئے الفاظ نہیں ملتے جن کا اثر دل ودماغ کو محسوس ہوتا ہے مگر زباں تک نہیں آسکتے وہ فقط کیفیت یا حال سے موسوم کئے جاتے ہیں قال میں نہیں آسکتے۔ بس شعر وہی ہے کہ جذبات وتخیلات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکے۔ اور اگر جامہ الفاظ ہی قطع نہ ہوسکا یا قطع ہوا مگر ٹھیک نہ اترا تو وہ شعر نہیں ہے۔ اسی بنا پر خوبی الفاظ کا التزام مقدم ہے۔ اگر اظہار جذبات کے لئے الفاظ مناسب نہ ملیں تو بگڑی ہوئی صورت میں پیش نہ کرنا چاہئے۔ ایسے وجود ناقص سے حالت عدم ہی بہتر ہے غالبؔ کی شاعری میں یہ عیب بہت نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ جو پہناتے ہیں وہ نہایت مضحک ہوتا ہے یا اتنا تنگ ہوتا ہے کہ معنی سما نہیں سکتے۔"

مرزا یاسؔ کی اس رائے سے کوئی اہل فہم انکار نہیں کرسکتا۔ ہندوستان کے اردو گویوں میں فقط مرزا غالب ہی کا کلام ایسا ہے جہاں یہ عیب بہت نمایاں ہے ورنہ شیخ ناسخؔ مرزا غالب سے بلندی تخیل میں کم ہیں نہ معنی آفرینی میں مگر فرق ہی ہے کہ ناسخؔ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہر شخص کی سمجھ میں آجاتا ہے (اگرچہ اکثر مضحک

ہی ہوتا ہے) اور غالب کے اکثر اشعار مضحک بھی ہوتے ہیں اور الجھن تو اتنی ہوتی ہے کہ الٰہی توبہ۔ غالب نے ناسخ کے تتبع میں جو کچھ کہا وہ سراسر مضحک ٹھہرا اور آخر عمر میں میر کے تتبع میں جو کچھ کہا وہ اردو کے لئے مایہ ناز ٹھہرا۔ بعض حضرات کو تعجب ہوگا کہ غالب نے ناسخ کی تقلید کب کی۔ مگر اہل نظر دیوان غالب کو اگر غور سے ملاحظہ کریں تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ابتدا میں ناسخ کی تقلید ضرور کی مگر آخر میں میر کے رنگ پر اتر آئے۔ دیوان ناسخ جس زمانے میں دہلی پہنچا تو غالب مومن وغیرہ نے اس رنگ پر طبع آزمائی کی چنانچہ غالب نے اپنے کسی خط میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ خواجہ آتش مغفور بھی ناسخ کی ہوا بندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مگر چونکہ وہ فطری شاعر اور صاحب زبان تھے اس وجہ سے ناسخ کی خشک کلامی اور غالب کی چیستان گوئی سے محفوظ رہے۔ خواجہ آتش نے اپنے رنگ خاص میں اور میرزا صائب کے رنگ میں جو زورِ قلم دکھایا ہے وہ ایسا ہے کہ اردو دنیا میں آپ اپنی مثال ہے۔ غالب مغفور اکثر مقامات پر ناسخ کی طرح واقعیت و اصلیت سے بہت دور ہٹ گئے ہیں اور محض خیالی باتوں میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ جس سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور زبان ایسی ناقص کہ الٰہی توبہ ؎

آتش
بہارِ لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں،
گریباں پھاڑ کے چل بیٹھئے صحرا کے دامن میں

غالب
نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

کوئی صحیح المذاق اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ خواجہ صاحب کے مطلع

کے سامنے غالب کا یہ مطلع کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہے۔ رشتہ چشم سوزن میں تارِ اشکِ یاس ہوگیا یعنی سوئی کو زخم کی بخیہ گری کی طرف سے ایسی مایوسی ہوئی کہ اس کی (یعنی سوئی کی) آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے رونے کا ثبوت کیا ہے وہی تاگا جس کو تارِ اشکِ یاس قرار دیا ہے۔ مگر کیا یہ تخیل اور یہ طرزِ بیان کسی وہبی شاعر کا طرزِ استدلال کہا جا سکتا ہے ہرگز نہیں۔ محض مبالغہ آمیز خیال اصلیت سے کوسوں دور جس سے کوئی اپنا ما قلبی حاصل نہیں ہوتا خصوصاً لفظ درخور بالکل دہقانی ہے۔ درخور۔ کی جگہ اگر لایق یا قابل کہتے تو فصاحت میں خلل نہ آتا مگر وہاں تو فارسیت غالب تھی۔ کیا خواجہ آتش نے فارسی ترکیبوں سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کون کون سی فارسی ترکیبیں اردو کے لئے مستحسن ہیں اور کون کون سی ترکیبیں اردو میں اکثر مضحک اور غیر فصیح ہو جاتی ہیں یہی لفظ درخور فارسی میں نہایت فصیح اردو میں نہایت قبیح خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس کا مترادف لفظ قابل یا لایق موجود ہے اور روزمرہ میں داخل ہے ؎

ہوتے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں
غالب

نثر:۔ اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے جوہر آئینے میں پرافشاں ہوتے جیسے ذرے روزن میں (پرافشاں ہوتے ہیں) مگر اہلِ زبان سمجھ سکتے ہیں کہ اس مقامِ خاص پر "مثلِ ذرہ روزن میں" کی جگہ "جیسے ذرہ روزن میں" ہونا چاہیے (پرافشاں جوہر آئینے میں جیسے ذرے روزن میں) دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ "جوہر پرافشاں ہوتے" میں لفظ "ہوتے" مصرع اولیٰ کے ایک سرے پر

اور پُرافشاں دوسرے مصرع کے سرے پر مبتدا اور خبر میں یہ فاصلہ بعید۔ یہ تعقید قبیح نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ تعقید سے کسی کا کلام خالی نہیں ہو سکتا مگر تعقید قبیح و تعقید ملیح میں فرق ہے ؎

ہو جائے حُسن معنی بے صورت آشکار
(آتش)
روئے حقیقت اُٹھ لئے جو پردہ مجاز کا

خواجہ آتش کے اس شعر میں "ہو جائے" اور آشکار میں کسی قدر بُعد ہو گیا ہے مگر اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ یہ تعقید ملیح ہے اور وہ تعقید قبیح۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ بعض مقام پر تعقید عین بلاغت ہے مگر اس کے محل ہوتے ہیں۔ جہاں کسی لفظ پر زور دینا مقصود ہو تو وہاں تعقید مذموم نہیں ہوتی بلکہ عین بلاغت متصور ہوتی ہے۔ خیر یہ تعقید تو الگ رہی اب اور حشو و زوائد پر غور کیجئے۔

"معشوق کے جلوۂ تمثال کے آگے جوہر آئینے میں افشاں ہو گئے" مطلب تو بس اتنا ہے کہ معشوق کے جلوے کے آگے جوہر آئینے میں پر افشاں ہو گئے مگر لفظ تمثال کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ دیکھنے میں تو لفظ تمثال بہت شاندار ہے مگر اس شعر میں کوئی خاص معنوی خوبی نہیں پیدا کرتا بلکہ صرف وزن برابر کرنے کے لئے بیچ میں ٹھونس دیا گیا ہے لہٰذا حشو ہے ملاحظہ ہو ؎

ہست از پیشانیِ عاشق ہویدا حالِ عشق
(قاسم مشہدی)
میکشد مجنوں مصور چوں کشد تمثالِ عشق

آج تک واقف نہیں کوئی ہمارے حال سے
(آتش)
سامنا آئینے کا ہے عالمِ تمثال سے

اگر ان اشعار سے لفظ تمثال نکال ڈالا جائے تو مطلب فوت ہو جائے گا۔
لیکن غالب کے اس شعر سے یہ لفظ نکال ڈالیے تو معنی میں کوئی نقص نہیں رہتا۔
یہاں تک سلیقۂ نظم کی گفتگو تھی اب اس شعر کے معنی ملاحظہ کیجیے۔ جناب حسرت موہانی
اپنی شرح میں پُرافشاں کے معنی پر زن لکھتے ہیں مگر ایسی شرح سے کیا فائدہ کہ
ایک لفظ فارسی کے عوض دوسرا لفظ فارسی نہ کہہ دیا گیا۔ اس کے سوا جناب حسرت
نے اس شعر کے متعلق اور کچھ نہ لکھا اور لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ معنی اس شعر
کے اگرچہ مضحک ہیں مگر صاف ہیں یعنی معشوق کے جلوے کے سامنے جوہروں میں
ویسی ہی تڑپ پیدا ہو گئی ہے جیسے آفتاب کے پرتو سے ذرہ ہائے روزن میں
پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر میں وہی بات کہوں گا کہ سستی بندش کی بدولت شعر شعر
نہ۔ ہا ٹیسو ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ اس شعر کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ تخیل ناسخ کی
اور زبان غالب کی پھر کیا کہنا ہے سبحان اللہ۔

ہوتی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں
(غالب)

مطلب یہ ہے کہ کفِ سیلاب نے روئی بن کر روزن کو بند کر دیا ہے اس وجہ
سے سیر و تماشہ سے بھی محروم ہوں۔ کفِ سیلاب کو شعرا پنبہ سے تعبیر کرتے ہیں
مگر یہاں غالب نے یہ جدت کی ہے کہ اس پنبۂ خانہ ساز کو روزن میں ٹھونسا ہے
جس کی وجہ سے سیر و تماشا دشوار ہے۔ جدت تو ضرور ہے مگر شعر ٹیسو ہو گیا محض مبالغہ
آمیز خیال ہے اصلیت و جوش کا نام نہیں۔ ہاں لفظیں بڑی بڑی ہیں۔ جو لوگ
فن شاعری کی ماہیت سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ مبتدی جب کسی مضمون کو گانٹھنا

چاہتے ہیں تو اسی طرح تک بندی کر لیتے ہیں۔ مگر ایسی تک بندی پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ملٹن کے نزدیک شعر کی تعریف یہ ہے کہ سادہ ہو جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ تین شرطوں میں سے ایک بھی اس شعر میں نہیں پائی جاتی۔ اگر غالب کے مرتبہ کی بہت رعایت کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شعر بھی ناسخ کے رنگ کا ایک شعر ہے

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شب مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

پہلا مصرع تو خاصہ ہے مگر دوسرے مصرع میں پھر وہی پنبہ والا مضمون ٹھونسا گیا ہے اور حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے یعنی اگر روزن دیوار میں روئی بھی رکھدی جائے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ چاندنی کھل گئی۔ بالکل طفلانہ اور مضحکہ انگیز بات ہے۔ مبالغہ بھی ایسا جو غیر عادی ہے مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ وہ ظلمت کیا جو ذرا سی روئی سے کافور ہو جائے۔ اس شعر میں بھی سادگی جوش اور اصلیت کا نام نہیں ہے ناسخ کے رنگ کا شعر ہے۔ دیکھئے اسی قافیہ کو حضرت آتش نے کیونکر کہا ہے۔

پریشاں عاشقوں کی خاک کے ذرّے تو ہیں دیکھیں
جگہ کس کس کو دے دیوار قصر یار روزن میں

مذاق سلیم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ خواجہ آتش کا شعر شاعر کا نتیجہ فکر معلوم ہوتا ہے اور غالب کے یہ تینوں شعر اچھے خاصے دہقانی کا نتیجہ فکر معلوم ہوتے ہیں۔

نہیں روزن جو قصر یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں

تصور صادق کی معجز نمائی کو کن پاکیزہ الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ نگاہ شوق کے آگے

کتنے ہی حجاب حائل ہوں مگر تصور صادق حاصل ہے تو سب حجاب باطل ہیں۔ یہ ہیں اعلیٰ جذبات عشق۔ اُستادی یہ ہے کہ ایسے مضامین عالیہ اس صفائی اور برجستگی سے نظم ہو جاتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔

نکوہشِ مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

یہ شعر چونکہ حضرت غالبؔ کا ہے سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ واہ واہ سبحان اللہ غالب ایسے غالب ویسے مگر اور کوئی ایسا شعر کہے تو یارانِ زندہ دل قہقہے لگائیں۔ احباب کی ملامت شورِ جنوں کو مانع آئی (یعنی مانع ہوئی) یاروں کی خندہ زنی و ملامت نے جیب و دامن کے لئے بخیہ کا کام کیا کیونکہ خوف ملامت سے ہم جیب و دامن کو چاک نہ کر سکے خیال تو جیسا ہے وہ ظاہر ہے مگر اندازِ بیان میں بالکل تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ اسی مضمون کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرتے تو کیا قباحت تھی۔ شاعر کو یہ سوچنا چاہئے کہ سادگی بیان کا محل کون سا ہے اور تکلف کہاں زیبا ہے۔ سادگی و تکلف کے محل کو جو شخص نہیں جانتا وہ شاعر کب ہے۔ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ اس کے بعد نکوہش کے لئے لفظ ملامت موجود تھا جو زبان اردو میں کثرت سے مستعمل ہے بلکہ روزمرہ میں داخل ہے مگر حضرت غالبؔ کو نکوہش ہی پسند ہے تو اس میں کسی کا اجارہ نہیں۔ آگے چلئے۔ مصرع اولیٰ میں لفظ بے ربطی کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ "ملامت یا نکوہش شورِ جنوں کو مانع ہوئی،، کہہ دینا کافی تھا لہٰذا لفظ بے ربطی سے کوئی خاص معنوی خوبی ظاہر نہیں ہوتی صرف وزن برابر کرنے کے لئے لایا گیا ہے پھر یہ حشو نہیں ہے تو اور کیا ہے

تیسری بات "نکوہش مانع آئی" مانع آمد کا ترجمہ ہے مگر اردو کے روزمرہ کے خلاف ہے
اردو میں مانع ہونا بولتے ہیں مانع آنا نہیں بولتے خلاصہ یہ ہے کہ یہ شعر بھی بے تکا سا ہے
یعنی تخیل ناسخ کی اور زبان غالب کی۔ نورٌ علیٰ نور۔

(آتش) طریق عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گذریگا
گریباں میں بجھی ہے جب لگی ہے آگ دامن میں

یہ شعر ایسا ہے کہ اگر حاسد داد نہ دے تو اہل انصاف گھونسے مار مار کر داد لے سکتے
ہیں۔ اگر گھونسوں پر بھی نہ مانے تو اور طرح خبر لی جائے۔ سادگی اصلیت جوش۔ زبان
کا بانکپن مصرعوں کی آمد کس کس بات کی تعریف کی جائے خاموشی از ثنائے تست۔
ہر ہر لفظ وجدانی کیفیتوں سے لبریز ہے "گریباں میں بجھی ہے جب لگی ہے آگ دامن میں"
یہ مصرع پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ جلالت تخیل آتش ہی کا حصہ ہے اور اس پر مصرع
لگانا بھی انہیں کا کام ہے اس میدان میں اور کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔ آتش کا
خاص رنگ یہی ہے۔

(غالب) نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

اس شعر کو برا تو نہیں کہہ سکتے مگر "نہ جانوں" پرانی زباں ہے۔

(آتش) جنوں کے جوش میں یکجا نہیں دم بھر قرار آتا
کبھی گلشن سے صحرا میں کبھی صحرا سے گلشن میں

جوش وحشت کی تصویر کھینچی ہے۔ محاکات اسے کہتے ہیں۔

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگین نام شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

مضمون اچھا ہے مگر بندش سست ہے۔ لفظ "مرے" (مضاف الیہ) اور "تن" (مضاف) کے درمیان میں "ہر قطرہ خون" کے ٹکڑے سے تعقید قبیح پیدا ہوگئی ہے اس کی نثر غالباً یوں ہوگی "مرے تن میں ہر قطرۂ خون نگین نام شاہد ہے" دیوان غالب کے کئی نسخے میں نے دیکھے ہر نسخے میں لفظ "مرے" پایا گیا۔ اگر "مرے" کی جگہ "مرا" ہوتا تو قطرۂ خون کی طرف اضافت سمجھی جاتی اور تعقید کا عیب لازم نہ آتا مگر کسی نسخے میں لفظ "مرا" پایا نہ گیا ایسی حالت میں "مرے" کی اضافت سوائے "تن" کے اور کسی طرف نہیں ہو سکتی لہٰذا تعقید قبیح لازم آتی ہے۔ اس کے علاوہ "مرے اور "تن" کے درمیان میں "ہر قطرہ خون" کا ٹپک پڑنا اور پھر اس قطرۂ خون میں فک اضافت کے عیب نے زبان اردو کی مٹی پلید کر دی ہے۔

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجکو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

مضمون بھی تازہ بندش بھی صاف ایسے شعر پر ایراد کرنا گویا کھڑی گاڑی میں کیڑے ڈالنا ہے ہم سخن سنج ہیں غالب سے عداوت نہیں رکھتے۔ مگر یہاں بھی ہر قطرہ خون میں فک اضافت روزمرہ اردو کے خلاف ہے خیر خوبی مضمون کے آگے ایسی فرد گذاشت کوئی جرم نہیں ہے۔

اسد زندانیِ تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

دوسرا مصرعہ تو خاصہ ہے مگر پہلا مصرع بالکل سست اسے اہلِ فن بہتر سمجھ سکتے ہیں لفظ "زندانی" کے عوض لفظ "اسیر" سے مصرع لگایا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا:

اور لفظ تاثیر بھی محض ٹھوس ٹھانس ہے وزن برابر کرنے کے لئے لایا گیا ہے "زندانی تاثیر الفت ہائے خوباں" اتنی جگہ میں کچھ کم وسعت نہ تھی کوئی اہل زبان ہوتا تو معلوم یہاں کیسے معنی خیز الفاظ رکھدیتا کیا گل کھلاتا فیصلہ اس کا مذاق سلیم پر ہے ؎

یہ سوداے شہادت ہے ہمارے سر کو اے قاتل
(آتش)
تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو رگ ہے گردن میں

کیا شوق شہادت ہے سبحان اللہ۔ اس "دم بھرنا" کے مزے کو اہل زبان سے پوچھئے خواجہ آتش کے خصوصیات میں یہ خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے کہ کلام مردانہ ہوتا ہے ہندوستان کے اور شعرا میں یہ بات نہیں پائی جاتی مرزا یاس کا یہ قول بھی کتنا دلنشین ہے کہ آتش کا کلام ہمہ تن آمد اور کمتر آورد اور غالب کا کلام کمتر آمد اور ہمہ تن آورد۔ شعر کی تعریف یہی ہے کہ بجلی کا اثر رکھتا ہو کہ سنتے ہی دل پھڑک جائے نہ یہ کہ سوچتے سوچتے دماغ چکرا جائے اور پھر بھی کچھ مزہ نہ ملے۔

پلاتا مے نہیں ہوں دوستی سے اس ستمگر کو
(آتش)
چھری دیتا ہوں اپنے ذبح کو میں دست دشمن میں

مے اور چھری دو مختلف چیزیں ہیں مگر قوت متخیلہ نے دونوں میں کیا اچھی وجہ شبہ پیدا کی ہے یعنی مے اور چھری دونوں چیزیں انسان کو آمادۂ ظلم کرتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے میں نے معشوق کو (جو ظالم و سفاک ہے) جو مے پلائی تو گویا اپنے حق میں دشمنی کی یعنی اپنے قتل کے لئے ایک چھری اس کے ہاتھ میں دیدی ہے کیا اچھا خیال ہے نئی بات کہو تو ایسی کہو جو کہنے اور سننے کے قابل ہو ورنہ خشکہ و گندہ بیروزہ کی سی جدت ہوئی تو کس کام کی ؎

عذابِ گورکا واں سامنا یاں رنج دنیا کا
نہ گھر میں چین نہ ان کو نہ مُردوں کو ہی مدفن میں

گوارا تا گوارا بھی ہے بدگردیِ دوراں سے
آبالی پر قناعت کرتے ہیں سب تمھارے رغن میں

شریعت کعبہ کو کعبہ مبارک ہم تو اے آتش
بتوں کے گھورنے کو جاتے ہیں ہر برہمن میں

گھورنا ٹھیٹ ہندی لفظ ہے۔ اس لفظ کی معنویت اور شوخی کسی دوسرے لفظ میں سما نہیں سکتی اہل زبان اسے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ناظرین آتش اور غالب کی اس غزل کو اگر بہ نظر انصاف ملاحظہ کریں گے تو غالب کا کوئی شعر اس غزل میں ایسا نہ پائیں گے جو آتش کے کسی شعر کے برابر ہو سکے۔ حق یہ ہے کہ خواجہ آتش باعتبار نفس غزل گوئی آپ اپنی نظیر ہے بقول نواب اصغر علی خاں نسیم دہلوی ؎

اپنے اشعار کا آتش نے دیا آپ جواب
معترض ہو جسے تو قابلِ ایراد ہیں سب

(باقی آیندہ)

(آزردہ سیتاپوری)

تنقیدی یادداشت

"دیوان غالب اردو" لکھائی چھپائی عمدہ صاف واضح خوش خط۔ کاغذ سفید قسم اعلیٰ۔ حجم ۲۲۴ صفحہ قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

لوح پر سنہرے رنگ کی موٹی جدول ہے۔ حاشیہ پر سنہرے بیل بوٹے ہیں۔ لوح دبیز کاغذ کا ہے۔ ابتدا میں ایک مختصر سی تمہید ہے جس کے بعد مصنف

کی مختصر سوانح عمری ہے۔ اور اس کے بعد حضرت غالب مرحوم کی ہاف ٹون تصویر ہے جو بہت صاف ہے اور یادگار کے طور پر رکھنے کے قابل ہے۔ کتابت۔ صحت صفائی اور خوش خطی کا یقیناً خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ جو ہر طرح قابل داد ہے۔ نظرثانی کے وقت جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں ہیں فہرست اغلاط کی صورت میں کتاب کے اخیر میں جمع کر دی گئی ہیں تاکہ پڑھنے سے پہلے اصلاح کر لی جا سکے۔ کتابیں انگریزی اشارات املائی میں سے علامت استفہام اور ڈیش کا برابر استعمال ہوا ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ استعمال ہوا ہے گویہ دوسری بات ہے کہ عموماً فی صدی تنانوے نہیں قریب قریب سو میں سو حالتوں میں تو ان کا صحیح اور باقاعدہ استعمال اردو میں نہیں دیکھا گیا۔ اس اعتبار سے اگر یہی خامی اس کتاب میں بھی ہے تو نہ کوئی تعجب کی بات ہے۔ نہ خلاف معمول ہے اور نہ چنداں جائے شکایت ہے۔ مثال کے طور پر لیجئے اردو اخباروں میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی مقرر کی جلسہ عام میں تقریر کی رپورٹ شائع کریں گے تو "حضرات" یا "حاضرین جلسہ" یعنی الفاظ خطابیہ جن سے تقریر کا آغاز ہوتا ہے ان کے بعد علامت استعجاب ضرور لگائیں گے (حاضرین جلسہ!) اس طرح کسی چٹھی کی نقل شائع کرینگے تو وہی علامت "جناب من" کے ساتھ بھی ضرور ہی اضافہ کر دیں گے۔ (جناب من!) حالانکہ انگریزی رسم تحریر کے اعتبار سے ایسا کرنا انتہا درجہ کی بے تمیزی سمجھی جاتی ہے۔ علیٰ ہٰذا اگر علامت استفہامیہ لگانا ہے تو انگریزی رسم تحریر کے موافق یہ علامت فقرہ ختم ہونے پر سب کے اخیر میں لگائی جاتی ہے۔ مگر اردو میں یہ عام بات ہے کہ فقرہ کے ہر ہر ناتمام حصہ پر یہ علامت لگاتے جائیں گے (باقی آئندہ)

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹۱۸ء

کافوری جنتری ۱۹۱۸ء

کی نہایت خوبصورت اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپ رہی ہے اور جنوری ۱۹۱۸ء کے پہلے ہفتہ سے بلا قیمت و محصول ڈاک قدر دانوں کے پاس بھیجی جائیگی اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ پر دس متفرق جگہ کے لکھے پڑھے شریف اشخاص کے نام اور پتہ لکھکر بھیجدیجئے مذکورہ بالا جنتری وقت پر آپکے پاس روانہ کردیجائیگی۔

ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

آپ جانتے ہیں انسان کی زندگی خون سے ہے اس سے خون صاف رکھنا ضرور ہے۔ اسکی ترکیب آسان ہے ڈاکٹر برمن کا آئی اوڈائز سالسہ مفید ثابت ہوا ہے اسمیں کسی چیز کا پرہیز نہیں ہے یہ سالسہ صاف کر اس میں پوٹا اسی روڈ اینڈ وغیرہ کسی ایک آزمودہ ادویات ملاکر بنتا ہے اس لئے تمام سالسوں سے زیادہ مفید ہے گرمی آتشک گٹھیا وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ گیا ہو تو اُس کو استعمال کیجئے خون بگڑنے کی دو وجہ ہے آتشک وگٹھیا ایسے عارضے میں پارہ ملی ہوئی ادویات استعمال کرنے سے خون بگڑ جاتا ہے پوری حالت فہرست منگاکر دیکھئے قیمت ۲ محصول ۱ر

مُسافر حیران ہوگئے

جب اُنھوں نے کولاٹانک کی تاثیر دیکھی۔ سفر میں گھوڑی کی سواری ہوئی مگر کچھ بھی تھکن معلوم نہوئی۔ پہاڑوں پر میلوں چڑھے اُترے لیکن ذرا بھی سانس نہ چڑھا کشتی کے لئے سفر کرنے والے پہلوان۔ ناچنے گانیوالے مسافر۔ لکچرار۔ واعظ۔ ایڈیٹیک مُسافری ہیں کولاٹانک ساتھ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اسکے استعمال سے انکے پھیپھڑے کی قوت بنظیر ہوجاتی ہے اور انکے کام میں آخر تک سانس قائم رہتا ہے۔ شراب اور افیون کی عادت کولاٹانک بھی چھڑا سکتا ہے قیمت ۲۲ خوراک کی شیشی عہ۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی دوائیاں ہر جگہ کے دکانداروں کے یہاں ملتی ہیں پتہ۔ ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ سے منگائیے

پاؤن باون ہیر آئیل

جنابمن! یوں تو آپ نے بالوں کے لگانے والے ہزاروں خوشبودار تیل دیکھے ہونگے لیکن یہ تیل بہی بہ نظر بیش قیمت اجزا اور عجائب وغرائب خواص کے لحاظ سے یگانۂ روزگار ہے۔ دردسر۔ نزلہ۔ زکام فوراً دور۔ بال سیاہ کرنے۔ گھنے اور گھنگریالے چمکدار ملائم بنانیں اکسیر ثابت ہوا ہے۔ دماغی طاقت کو بڑہانا اسکا اصلی کام ہے اس کی مہک اسقدر تیز ہے کہ شیشی کہولتے ہی خوشبو کی بے اندازہ لپٹیں آتی ہیں جس نے ایک مرتبہ اس پاؤن باون تیل کا استعمال کیا وہ ہمیشہ کے لئے اسکا شیدائی بن گیا۔ صرف آزمائش شرط ہے قیمت صرف (۱۲) محصولڈاک ۸ ہر ہر ایک شیشی کے ساتھ انعامی چیزیں ملفوف ہیں

المشتہر:۔ میسرز سلیمان اینڈ روزنہ ۲ ۵ بار سٹریٹ رنگون

بچکانے اور زنانے (مبیانے) شوز وبوٹ

اس کارخانہ میں صرف بچوں کیلئے اور بیبیوں کے لئے نہایت مضبوط آرام دہ خوبصورت جوتے تیار ہوتے ہیں ہر جوتے کے ساتھ خوبصورتی اور مضبوطی کی گارنٹی دیجاتی ہے اگر پسند نہوں تو واپس کر لئے جاتے ہیں۔ چمڑہ نہایت نرم خوشنما اور پائدار استعمال کیا جاتا ہے

قیمتیں بالکل واجبی لیجاتی ہیں۔ ایک مرتبہ کی آزمائش شرط ہے

پیر کا صحیح ناپ کاغذ پر پنسل سے کھینچکر بھیجنا چاہئے

وضع یا شیپ اور ایڑی کے متعلق کافی ہدایت

وصول ہونا ضروری ہے۔

نوٹ:۔ زیادہ اطمینان درکار ہو تو ایڈیٹر صاحب پردہ نشین آگرہ سے تصدیق فرمالیں۔

منیجر۔ گولڈن شوز فیکٹری قرول باڑہ آگرہ